جلد اوّل

ہادیِ عالم ﷺ کی سیرت سے ماخوذ، عصرِ حاضر کے
تقاضوں سے ہم آہنگ دروس و عبر اور فوائد و ثمرات

سیرت النبی ﷺ

دار السلام
DARUSSALAM

دکتور علی محمد صلابی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- **کتاب وسنت ڈاٹ کام** پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- **مجلس التحقیق الاسلامی** کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- **دعوتی مقاصد** کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

بسم الله الرحمن الرحيم

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت رحم کرنے والا خوب مہربان ہے۔

مدحت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وَأَحْسَنُ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِي
وَأَجْمَلُ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ
كَأَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

اور آپ کی ذاتِ اقدس سے زیادہ حسین میری نگاہ نے کبھی کوئی دیکھا ہی نہیں
اور آپ سے زیادہ حسن و جمال والا کبھی کسی ماں نے جنا ہی نہیں
آپ ہر قسم کے عیب سے پاک صاف پیدا کیے گئے ہیں
گویا آپ کی ذاتِ اقدس کو آپ کے منشا کے عین مطابق بنایا گیا ہے

ہادی عالم ﷺ کی سیرت سے ماخوذ، عصر حاضر
کے تقاضوں سے ہم آہنگ دروس وعبر اور فوائد وثمرات

سیرت النبی ﷺ

1

جملہ حقوق اشاعت برائے دارالسلام محفوظ ہیں

© مكتبة دار السلام، ١٤٣٣ هـ
فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
الصلابي، علي محمد
سيرة النبي صلى الله عليه وسلم / علي محمد الصلابي - الرياض، ١٤٣٣ هـ
ص: ٦٧٠ مقاس: ٢١×١٤ سم
ردمك: ٨-٠٩١-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (مجموعة)
٥-٠٩٢-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (ج ١) (النص باللغة الاردية)
١. السيرة النبوية أ. العنوان
ديوي ٢٣٩ ١٤٣٣/٢٧٦٣

رقم الإيداع: ١٤٣٣/٢٧٦٣
ردمك: ٨-٠٩١-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (مجموعة)
٧-٠٥٦-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (ج ١)

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

شاہ عبدالعزیز بن جلاوی سٹریٹ پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب
فون: 00966 1 4043432-4033962 فیکس: 4021659 www.darussalamksa.com
Email: darussalam@awalnet.net.sa info@darussalamksa.com

الریاض • [illegible] فون: 00966 1 4614483 فیکس: 4644945 • [illegible] فون: 00966 1 4735220 فیکس: 4735221
• [illegible] فون: 00966 1 4286641 • [illegible] فون/فیکس: 00966 1 2860422
جدہ فون: 00966 2 6879254 فیکس: 6336270 مدینہ منورہ فون: 00966 4 8234446,8230038 فیکس: 04 8151121
الخبر فون: 00966 3 8692900 فیکس: 00966 3 8691551 خمیس مشیط فون/فیکس: 00966 7 2207055
ینبع البحر فون: 0500887341 فیکس: 8691551 قصیم (بریدہ) فون: 0503417156 فیکس: 00966 6 3696124

امریکہ • نیویارک فون: 001 718 625 5925 • ہیوسٹن: 001 713 722 0419 کینیڈا • [illegible] فون: 001 416 4186619
لندن • [illegible] فون: 0044 20 85394885-0044 20 77252246 • برمنگھم: 0044 0121 7739309
متحدہ عرب امارات • شارجہ فون: 00971 6 5632623 فیکس: 5632624 فرانس فون: 0033 01 480 52928 فیکس: 0033 01 480 52997
انڈیا • [illegible] فون: 0091 44 45566249 موبائل: 0091 98841 12041 • [illegible] فون: 0091 22 2373 4180
• [illegible] فون: 0091 40 2451 4892 موبائل: 0091 98493 30850 • [illegible] فون: 0091 44 42157847
سری لنکا • [illegible] فون: 0094 115 358712 • [illegible] فون: 0094 114 2669197

پاکستان ہیڈ آفس و مرکزی شوروم

لاہور 36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ لاہور فون: 0092 42 373 240 34,372 400 24,372 32 4 00 فیکس: 042 373 540 72
• غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 0092 42 371 200 54 فیکس: 042 373 207 03
• Y بلاک، گول کمرشل مارکیٹ، دکان: 2 (گراؤنڈ فلور) ڈیفنس، لاہور فون: 0092 42 356 926 10

کراچی مین طارق روڈ، ڈاؤمین مال سے (بہادر آباد کی طرف) دوسری گلی کراچی فون: 0092 21 343 939 36 فیکس: 0092 21 343 939 37

اسلام آباد F-8 مرکز، اسلام آباد فون/فیکس: 0092 51 22 815 13

ہادیِ عالم ﷺ کی سیرت سے ماخوذ، عصرِ حاضر
کے تقاضوں سے ہم آہنگ دروس وعبر اور فوائد و ثمرات

سیرت النبی ﷺ

تالیف:

دکتور علی محمد صلابی

مترجمین:

مولانا محمد یونس بٹ

مولانا محمد ادریس سلفی **مولانا محمد ندیم شہباز**

دارالسلام
DARUSSALAM

اللهم صل على
محمد
وعلى آل محمد كما صليت على ابراهيم
وعلى آل ابراهيم انك حميد مجيد
اللهم بارك على محمد وعلى آل محمد
كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم
انك حميد مجيد

فہرست (جلد اول)

عرض ناشر 29

ہدیۂ عقیدت 33

مقدمہ 34

حصہ 1: قبل از پیدائش اہم تاریخی واقعات

باب 1: پیدائش کے وقت بالادست تہذیبیں اور مذاہب 51

- رومی بادشاہت 51
- ایرانی بادشاہت 52
- ہندوستان 54
- بعثت نبوی سے پہلے دنیا کی دینی حالت 56
  - یہودیت 57
  - عیسائیت 58
  - مجوسیت 59
  - بدھ مت 60

✳ ہندو مت 61

باب:2 عرب اقوام اور ان کی تہذیبیں 63

● عرب اقوام 63

✳ عرب بائدہ 63

✳ عرب عاربہ 63

✳ عدنانی عرب 63

● جزیرہ نمائے عرب کی تہذیبیں 67

✳ یمن میں سبا کی تہذیب 67

✳ احقاف میں قوم عاد کی تہذیب 68

✳ حجاز میں قوم ثمود کی تہذیب 69

باب:3 عربوں کی دینی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی حالت 71

● عربوں کی دینی حالت 71

● عربوں کی سیاسی حالت 76

● عربوں کی اقتصادی حالت 79

● عربوں کی معاشرتی حالت 82

① حسب نسب کی بنیاد پر اظہار فخر 82

② شعر و کلام کی برتری اور اس کا اظہار 82

③ عرب معاشرے میں عورت کا مقام 82

④ نکاح 85

⑤ طلاق 88

⑥ لوٹ مار، حملے اور لڑائیاں 90

✳ جنگ بسوس 90

※ جنگِ داحس 91

※ اوس وخزرج کی باہمی جنگیں 91

⑦ علم وخواندگی 92

◆ اخلاقی حالت 92

● ذہانت وفطانت 93

● جود وسخا 94

● بہادری، مردانگی اوردلیری 94

● حریت پسندی اور ذلت وظلم سے نفرت 95

● ایفائے عہد، صاف گوئی اور سچائی 96

● صبر وقناعت اور قوت برداشت 98

● جسمانی قوّت اور بلند حوصلے 99

● معاف کردینے اور پناہ دے کر حفاظت کرنے کے اوصاف 99

● اسلام کے لیے عرب معاشرے کا انتخاب؟ 100

حصہ 2: | ولادت باسعادت تا بعثت نبوی

باب 1: قبل از ولادت رونما ہونے والے واقعات اوران کی حکمتیں 103

● چاہ زمزم کی کھدائی 104

※ آبِ زم زم کے فضائل 107

● اصحابِ فیل کا واقعہ 108

※ واقعۂ فیل کی جانب نبوی اشارے 108

● اصحاب الفیل کے واقعے سے حاصل ہونے والے اسباق 115

✳ کعبۃ اللہ کا شرف و فضل 115

✳ مکہ اور اہل عرب سے عیسائیوں کا حسد 115

✳ مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے جذبۂ قربانی 116

✳ قومی غداروں کی رسوائی 116

✳ اللہ تعالیٰ کے خلاف معرکہ آرائی کی حقیقت 117

✳ بیت اللہ اور اس کے متولیوں کی تعظیم 117

✳ واقعۂ فیل نبوت کی دلیل 118

✳ بیت اللہ اور حفاظت الٰہی 120

✳ واقعۂ فیل سے عربوں کی نئی تاریخ کا آغاز 121

باب 2: ولادت باسعادت سے حلف الفضول تک کا سفر 122

● نبی کریم ﷺ کا نسب 122

● جناب عبداللہ بن عبدالمطلب کا نکاح اور آمنہ کا خواب 126

● دعائے ابراہیم علیہ السلام 127

● بشارتِ عیسیٰ علیہ السلام 128

● ولادت مصطفیٰ ﷺ 129

● نبی کریم ﷺ کو دودھ پلانے اور پرورش کرنے والی خواتین 131

✳ ثویبہ 131

✳ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا 132

✳ حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا 132

● حکمتیں اور فوائد 138

- ※ حضرت حلیمہ سعدیہ کے لیے نبی کریم ﷺ کی برکات 138
- ※ اللہ کا فیصلہ بابرکت اور افضل ہوتا ہے 139
- ※ دیہی ماحول کے اثرات 139

❁ شق صدر 140

- ※ دروس و حکمتیں 141

❁ والدہ محترمہ کا انتقال 142

❁ دادا جان کی آغوش محبت میں 143

❁ چچا جان کی کفالت میں 144

❁ گلہ بانی 145

❁ گلہ بانی کے تربیتی اثرات 146

① صبر 146

② تواضع 147

③ بہادری وشجاعت 147

④ رحمت وشفقت 148

⑤ محنت سے روزی کمانے کا جذبہ 148

❁ بعثت سے قبل نبی ﷺ کی شرک وغیرہ سے حفاظت کا اہتمام 151

❁ بَحیرا راہب سے ملاقات 154

- ※ بَحیرا راہب کے واقعے سے ماخوذ اہم نکات 155

❁ جنگِ فِجار 156

❁ حِلف الفُضُول 158

✳ درس وعبرت اور فوائد 160

باب 3: تجارتی سفر، نکاح اور بعثت سے قبل اہم واقعات 163

● سفر تجارت اور خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح 163

✳ درس وعبرتیں اور فوائد 165

● بیت اللہ کی تعمیر میں رسول اللہ ﷺ کی شرکت 169

✳ درس وعبرت اور فوائد 171

◆ نبوت محمدیہ کے استقبال کی تیاری 174

● حضرت محمد ﷺ کے متعلق انبیاء علیہم السلام کی بشارتیں 174

● بعثت نبوی کے متعلق علمائے اہل کتاب کی بشارتیں 179

● لوگوں کی عمومی صورت حال 182

● بعثت سے قبل علامات واشارات نبوت 184

✳ بعثت سے قبل پتھر کا آپ علیہ السلام کو سلام کہنا 184

✳ سچے خواب دیکھنا 184

✳ گوشہ نشینی اور خلوت 184

حصہ 3: | وحی کا نزول اور خفیہ دعوت کا آغاز

باب 1: رسول اللہ ﷺ پر وحی کا نزول 187

● اچھے خواب 190

● غار حرا میں گوشہ نشینی 192

● غار حرا میں حق کی آمد 194

● وحی کی کیفیت اور نزول وحی کی شدت 196
● وحی کی اقسام 201
① سچے خواب 201
② الہام 201
③ صدائے جرس کی طرح وحی کا نزول 201
④ اللہ تعالیٰ کا براہِ راست نبی ﷺ کو وحی کرنا 202
⑤ فرشتے کا اپنی اصلی شکل میں آکر وحی کرنا 202
⑥ فرشتے کا انسانی صورت میں آنا 202
● میدانِ دعوت میں نیک بیوی کا کردار 204
● نبی کریم ﷺ کی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ وفا شعاری 209
● رسولوں کی تکذیب کا سلسلہ 211
● وحی کی بندش 212
باب:2 خفیہ دعوتی سرگرمیاں 214
● پیغامِ الٰہی کی تبلیغ کے لیے حکم ربانی 214
● حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا قبول اسلام 217
● حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام 218
● حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کا قبول اسلام 219
● دختران نبی ﷺ کا قبول اسلام 220
● حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام 224
● سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی دعوت 226
● صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا دوسرا گروہ 228

- صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا تیسرا گروہ 229
- دعوت وتبلیغ کا تسلسل 234
- سلامتی کی تدابیر 235
- دارارقم ایک مرکز قیادت 241
- رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ ہراول دستے کی اہم خصوصیات 242
  - وحی الٰہی کے سامنے سرِتسلیم خم کر دینا اور سرمو انحراف نہ کرنا 242
  - ایمان اور وحی کا دلوں میں اُتر جانا 245
- صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہراول دستے کے اوصاف 247
  - صبر 248
  - دعاؤں کا بکثرت اہتمام 249
  - اخلاص 250
  - عزم واستقلال 250
- نبی کریم ﷺ کی شخصیت اور اثر انگیز قیادت 252
- دارارقم کے تدریسی مضامین 256
- دارارقم کو مرکز قرار دینے کی وجوہات 257
- قبائلِ قریش میں دعوت دین کا فروغ اور اس کی عالمگیریت 258

حصہ 4: مکی دور اور تعلیم وتربیت کا اہتمام

باب 1: مکی دور میں عقائد ونظریات کی تعمیر واصلاح 265

- قوانین قدرت کے ساتھ طرز عمل میں دانشمندانہ اسلوب نبوی 265

- تبدیلی کا اسلوب اور اس کا عقائد سے تعلق 271
- صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عقائد کی اصلاح 274
- قرآن کریم میں جنت کا بیان اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر اس کے اثرات 284
  - جنت کا بے مثال ہونا 287
  - جنت کے درجات 287
  - جنت کی نہریں 288
  - جنت کے چشمے 289
  - جنت کے درخت 290
    - سدرۃ المنتہیٰ 291
    - شجر طوبیٰ 291
  - اہل جنت کی خوراک اور مشروبات 292
    - اہل جنت کی شراب 293
    - اہل جنت کا کھانا پینا کسی غلاظت کا سبب نہیں بنے گا 293
  - اہل جنت کے ملبوسات، زیورات اور عود دان 295
  - اہل جنت کی گفتگو اور محفلیں 296
  - اہل جنت کی بیویاں 298
    - حیران کن حد تک حسین وجمیل عورتیں 298
  - اہل جنت کے لیے دیدار الٰہی کا عظیم انعام 301
  - اہل جنت کی دعاؤں کے اختتامی کلمات 302
- قرآن کریم میں جہنم کا بیان اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر اس کے اثرات 304

✳ اہل جہنم کا کھانا پینا 306

✳ اہل جہنم کے لباس 308

✳ اہل جہنم کو دیے جانے والے عذاب کی اقسام 309

✳ اہل جہنم کا چہروں کے بل اٹھایا جانا اور آگ کا چہروں کو جھلسانا 310

✳ اہل جہنم کا گھسیٹا جانا 311

✳ اہل جہنم کے چہروں کا سیاہ ہونا 311

✳ آگ کا کافروں کو ہر جانب سے گھیر لینا 312

✳ جہنم کی آگ کا دلوں تک پہنچ جانا 313

✳ اہل جہنم کو جکڑنے والی زنجیریں اور طوق 314

✳ اہل جہنم کی چیخ و پکار اور اظہارِ ندامت 315

● قضاء وقدر کا صحیح مفہوم اور صحابۂ کرام پر اس کے اثرات 319

✳ مراتب قضاء وقدر 319

✳ پہلا مرتبہ 319

✳ دوسرا مرتبہ 320

✳ تیسرا مرتبہ 320

✳ چوتھا مرتبہ 321

● صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا انسان کی حقیقت کو جان لینا 322

✳ اللہ تعالیٰ کا انسان کو اپنے ہاتھوں سے تخلیق فرمانا 325

✳ متوازن جسم اور حسین صورت 326

✳ انسان کے لیے قوت گویائی اور عقل و دانش کا عطیہ 327

- ٭ زمین و آسمان کی اشیاء کا انسان کے لیے مُسَخَّر ہونا 327
- ٭ انسان کی دیگر مخلوقات پر فضیلت 328
- ٭ انبیاء اور رسولوں کی بعثت کے ساتھ انسان کی عزت افزائی 328
- ٭ اللہ تعالیٰ کی انسان سے محبت اور ملاء اعلیٰ میں اس کا تذکرہ 330
- ٭ انسان کی حفاظت اور نگرانی 331
- ● آدم علیہ السلام اور شیطان کی کشمکش کا صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاں تصور 331
- ٭ نسل انسانی کی ابتدا آدم علیہ السلام سے ہوئی 335
- ٭ صرف اللہ کی غیر مشروط اطاعت، اسلام کا بنیادی اصول 335
- ٭ انسان خطا کا پتلا ہے 336
- ٭ آدم علیہ السلام کا نِسیان توکل علی اللہ کی تعلیم ہے 337
- ٭ توبہ و استغفار کی ضرورت و اہمیت 339
- ٭ حسد اور تکبر سے اجتناب 339
- ٭ تکبر کی حقیقت 340
- ٭ ابلیس بنی آدم کا پہلا دشمن ہے 341
- ● صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا آپس میں گفتگو کا انداز 342
- ● کائنات کے متعلق صحابہ کا نظریہ 346

باب:2 مکی دور میں عبادات اور اخلاق عالیہ کی تعلیم و تربیت 358
- ● اُمت کے ہراول دستے کا عبادات کے ذریعے تزکیۂ نفس 358
- ٭ علم الٰہی پر غور و فکر 359
- ٭ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے مقاصد 360

✳ احکام الٰہیہ کی فوری تعمیل اور اظہار بندگی 363

✳ بندے کی اپنے رب سے مناجات 366

✳ دلی اطمینان اور راحت وسکون 367

✳ نماز گناہوں سے بچاتی ہے 368

● عقلی تربیت 374

● جسمانی تربیت 379

● مکارم اور رذائل کے متعلق صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت 384

✳ حفاظت دین 396

✳ حفاظت نفس 397

✳ حفاظت نسل 397

✳ حفاظت مال 398

✳ حفاظت عقل 398

● قرآنی قصص سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عمدہ اخلاقی تربیت 403

● حکمران کے اوصاف 404

✳ شہوتِ نفسانی سے بچنا 404

✳ بردباری 405

✳ نرمی اور سختی کا درست استعمال 405

✳ اپنے رب پر بھروسا کرتے ہوئے خود اعتمادی کا حصول 405

✳ قوت حافظہ 406

✳ خیالات اور تصورات کی عمدگی 406

✳ استعداد، علم سے محبت اور اس میں پختگی 406

- شفقت، عجز اور انکسار 407
- عفو و درگزر 407
- اپنے قبیلے کا اکرام کرنا 407
- قوت گویائی اور فصاحت 408
- حسن تدبیر 408
  - قانون سازی 410
  - معاشرتی استحکام 410
  - ریاستی اقتدار 411

حصہ 5: علانیہ دعوت اور مشرکین کی چالیں

باب 1: علانیہ دعوت 415

- مشرکین کے اہم اعتراضات 420
  - اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک 420
  - مشرکین کا آخرت سے انکار 423
  - مشرکین کا رسول اللہ ﷺ کے بشر ہونے پر اعتراض 427
  - مشرکین کا قرآن کریم کے بارے میں نظریہ 431
- مکی دور میں اسلامی دعوت ٹھکرانے کے اسباب 435
  - جزیرہ نمائے عرب میں نبوت کی عدم پذیرائی 435
  - باپ دادا کی طرف سے حاصل ہونے والی عصبیت 436
  - بت پرستی کی تائید میں اہل کتاب کا کردار 440

✳ قبائلی عادات واطوار کا غلبہ 441

✳ اہل مکہ کی عرب قبائل پر برتری 442

باب:2 قانونِ ابتلا 444

● ابتلا کی حکمت اور اس کے فوائد 446

✳ اچھے برے کا امتیاز 446

✳ تربیت 446

✳ دلوں کے راز آشکار ہونا 446

✳ امانت کا بوجھ اٹھانے کی حقیقی تیاری 447

✳ حقیقت نفس کی پہچان 447

✳ دعوت کی قدر واہمیت کا شعور 448

✳ قبول اسلام کا سبب بننا 448

✳ بعض بااثر افراد کا دعوت اسلامی کی طرف مائل ہونا 448

✳ اللہ تعالیٰ کے ہاں درجات کی بلندی اور گناہوں کا کفارہ 449

✳ ابتلاء کے دیگر فوائد 449

باب:3 اسلامی دعوت کے خلاف مشرکین کی محاذ آرائی 451

● ابوطالب کو نبی ﷺ کی حمایت سے دور رکھنے کی کوشش 451

● دعوت اسلامی میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش اور نتائج 456

✳ ضِمَاد اَزدی رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام 460

✳ سیدنا ضماد رضی اللہ عنہ کے قصے سے حاصل شدہ اسباق ونتائج 461

✳ عَمرو بن عَبَسَہ رضی اللہ عنہ اسلام کی چھاؤں میں 463

✲ قصۂ عمرو بن عبسہ سے حاصل ہونے والے نتائج 465

✲ طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام 467

✲ عمران رضی اللہ عنہ کے والد حصین رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام 468

✲ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اسلام کے سایۂ عاطفت میں 471

✲ قصۂ ابوذر رضی اللہ عنہ سے حاصل ہونے والے نتائج اور فوائد 472

● نبی ﷺ کو پہنچنے والی تکالیف 478

① ابوجہل کی ایک ناکام کوشش 479

② سجدے کی حالت میں آپ ﷺ پر گندگی کا بوجھ پھینکنا 480

③ قریشی سرداروں کا نبی ﷺ پر حملہ آور ہونا 481

◆ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو پہنچنے والی تکالیف 486

● سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پہنچنے والی تکالیف 486

● نصائح اور نتائج 488

✲ شخصیات اور معلومات کو پوشیدہ رکھنا 489

✲ معلومات فراہم کرنے کے لیے موقع کی تلاش 489

✲ ام الخیر کے جذبۂ شفقت کو ابھارنے کے لیے ام جمیل کا کردار 490

✲ ام جمیل کی احتیاطی تدابیر 490

✲ مہم سر کرنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار 491

✲ مشقت کے بعد انعام کا ضابطہ 491

● سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو پہنچنے والی تکالیف 492

● سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غلاموں کو آزاد کروانا 494

- عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما اور ان کے والدین کی آزمائش 498
- سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی آزمائش 501
- مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی آزمائش 503
- خَبَّاب بن اَرَت رضی اللہ عنہ کا دورِ ابتلا 506
- عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی آزمائش 511
  - ✳ سب سے پہلے بلند آواز سے قرآن مجید پڑھنے کی سعادت 512
- خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کی آزمائش 514
- عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی آزمائش 515
- مکہ میں قتال سے اجتناب کی حکمت اور کردار سازی کا اہتمام 518
- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بلند ہمتی میں قرآن مجید کی اثر آفرینی 530
- مذاکرات کا اسلوب 537
- درس و عبرت 539
- تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین 544
- کفار کے ساتھ بحث و مباحثہ 550
  - ✳ تقابلی انداز 550
  - ✳ اقرار کروانا 551
  - ✳ مخالفین کے ثانوی دلائل نظر انداز کر کے ان کا ابطال کرنا 553
- مکی دور میں یہود کا کردار اور مشرکین مکہ سے تعاون 561

باب 4: اقتصادی و معاشرتی بائیکاٹ (شعب ابی طالب) 574

- دروس و نصیحتیں 578

حصہ 6: ہجرت حبشہ، سفرِ طائف اور معراج

باب 1: آنحضرت ﷺ کا قانون ''اختیارِ ذرائع'' پر عمل 591

- اللہ تعالیٰ پر بھروسا اور ذرائع اختیار کرنا 594
- شریعت کی نظر میں قانون اختیار ذرائع کا خلاصہ 596

باب 2: ہجرت حبشہ 599

- ہجرت حبشہ کے اسباب 600
  - دین اسلام کی نشر و اشاعت 602
  - بیرونِ مکہ دعوتِ دین کو پھیلانا 603
- ہجرت کے لیے حبشہ کا انتخاب کیوں؟ 605
  - نجاشی کا عادل ہونا 605
  - نجاشی کا نیک ہونا 605
  - حبشہ کا قریش کے لیے مرکز تجارت ہونا 606
  - حبشہ کا پر امن ہونا 606
  - نبی ﷺ کی سرزمین حبشہ سے واقفیت و محبت 607
- ہجرتِ حبشہ کب ہوئی؟ اور مہاجرین کی تعداد کتنی تھی؟ 608
- حبشہ کی جانب پہلی ہجرت کرنے والوں کے نام 608
- قصۂ غرانیق 610
  - من گھڑت قصے کا رد 613
  - عقلی اعتبار سے قصے کا باطل ہونا 614
  - لغوی اعتبار سے قصے کا باطل ہونا 615

* مہاجرینِ حبشہ کی واپسی کے حقیقی اسباب 615
- دوسری ہجرتِ حبشہ 618
- مہاجرین حبشہ کی واپسی کے لیے قریش کی کوشش 619
- حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور نجاشی کے درمیان گفتگو 621
- نجاشی اور مہاجرین کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کی ایک اور سازش 623
- نجاشی کا اسلام لانا 624
* درس وعبرت 625

باب:3 عام الحزن اور سفرِ طائف 642
- ابو طالب کی وفات 642
- سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات 643
- سفرِ طائف 644
* رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کو کیوں منتخب فرمایا؟ 646
* طائف کا مرکزِ اقتدار کہاں تھا؟ 647
- دعا اور گریہ وزاری 650
- عفوو درگزر 652
- دعوتی منصوبہ بندی میں تبدیلیاں 654
- عدّاس کا قصۂ قبولِ اسلام 662
- جنات کا مسلمان ہونا 664

باب:4 اسراء ومعراج 669
- پس منظر 669
- اسراء ومعراج کے مقاصد 670

- اسراء ومعراج احادیث کی روشنی میں 671
- دروس وعبرتیں 680

حصہ 7: دعوت اسلام اور صحابہ کی ہجرت مدینہ

باب 1: قبائل کو دعوت اور نصرت وحمایت کی طلب 697

- مختلف قبائل کے پاس طلبِ امداد کے لیے جانا 697
- قبائل کو دعوت اور ابوجہل ومشرکین کے ہتھکنڈوں کا دفاع 700
  - قبائل سے رات کے اندھیرے میں ملاقات 700
  - رسول اللہ ﷺ کا اہل قبائل کی رہائش گاہوں میں تشریف لے جانا 700
  - مددگاروں کو ساتھ رکھنا 700
  - آپ ﷺ کا ہر قبیلے سے حمایت کا وعدہ لینا 701
- بنو عامر سے مذاکرات 701
- بنوشیبان سے مذاکرات 702
  - درس وعبرت 705

باب 2: کاروانِ خیر وبرکت اور نورانی دستے 709

- انصار کے ساتھ ابتدائی تعلقات 710
- سُوَید بن صامت رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام 710
- اِیاس بن معاذ رضی اللہ عنہ اسلام کی چھاؤں میں 711
- انصار میں اسلام کی ابتدا 712
- پہلی بیعت عقبہ 714

● أسید بن حضیر اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما کا قبولِ اسلام 717
✳ درس و عبرت 720
باب:3 بیعت عقبہ ثانیہ 726
✳ درس و عبرت 730
● براء بن معرور رضی اللہ عنہ کا بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا 732
باب:4 صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ہجرتِ مدینہ 739
● ہجرت کی ابتدائی تیاریاں 739
● مہاجرین کی تیاری 739
● یثرب میں حمایت اسلام 741
● سورۂ عنکبوت کے توجہ طلب مقامات 741
● مہاجرین کے قافلے 745
● ہجرتِ مدینہ اور قریش کی رکاوٹیں 747
● ابوسلمہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما کی ہجرت 747
● زبردستی مدینہ سے واپس لانا 751
● مومنین کو قید میں رکھنا 756
● مسلمانوں سے مال واسباب چھین لینا 757
● انصاری بابرکت گھرانے 759
● حبشہ میں قائم اسلامی معاشرے اور مدنی معاشرے میں فرق 764
● دارالحکومت کے لیے مدینہ منورہ کا انتخاب؟ 766
● فضائل مدینہ 768

- ناموں کی کثرت 768
  - یثرب 768
  - طابہ 769
  - المدینہ 769
- نبی ﷺ کی مدینہ سے محبت اور اس کی وبا دور کرنے کے لیے دعا 770
- مدینہ کے لیے دوگنی برکت کی دعائے نبوی 771
- مدینہ طیبہ کا دجال اور طاعون سے محفوظ ہونا 772
- مدینہ کی سختی پر صبر کرنے کی فضیلت 772
- مدینہ طیبہ میں موت کی فضیلت 772
- ایمان کی پناہ گاہ اور پلیدی سے پاک 773
- مدینہ برے لوگوں کو ختم کرنے والا ہے 774
- اللہ تعالیٰ کا مدینہ طیبہ کو ہر برے آدمی کے شرّ سے محفوظ رکھنا 774
- مدینہ طیبہ کی حرمت 775

اجمالی فہرست ونقشہ جات

حصہ:1 قبل از پیدائش اہم تاریخی واقعات 49
حصہ:2 ولادت باسعادت تا بعثت نبوی 101
حصہ:3 وحی کا نزول اور خفیہ دعوت 185
حصہ:4 مکی دور اور تعلیم وتربیت کا اہتمام 263
حصہ:5 علانیہ دعوت اور مشرکین کی چالیں 413
حصہ:6 ہجرتِ حبشہ، سفر طائف اور معراج 589
حصہ:7 دعوتِ اسلام اور صحابہ کرام کی ہجرت مدینہ 695

نقشہ:1 جزیرہ نمائے عرب کی اور روم وفارس کی سلطنتیں 53
نقشہ:2 عرب قبائل اور ان کے علاقے 65
نقشہ:3 جزیرہ نمائے عرب کی سلطنتیں، قبائل اور مذاہب 73
نقشہ:4 ابرہہ حبشی کا مکہ پر ناکام حملہ 111
نقشہ:5 شجرۂ طیبہ امام الانبیاء ﷺ 123
نقشہ:6 حلیمہ سعدیہ کا سفر 135
نقشہ:7 ہجرتِ حبشہ 601
نقشہ:8 سفر طائف اور نصیبین کے علاقے کی وضاحت 645

عرضِ ناشر

سیرت نگاری کے مختلف اسالیب میں ایک اسلوب وہ ہے جس میں واقعاتِ سیرت کا احاطہ تو کیا ہی جاتا ہے، اس کے ساتھ واقعاتِ سیرت پر تدبر کرنے کے بعد جو اہم نکات اور احکام و مسائل معلوم ہوتے ہیں، سیرت نگاری کے اِس منفرد اسلوب میں اُن اہم نکات کو بھی مناسب جگہ دی جاتی ہے۔ اصطلاح میں کتابِ سیرت کے ایسے طرزِ نگارش کو فقہُ سیرت نگاری کہا جاتا ہے۔ فقہُ سیرت نگاری کی داغ بیل یوں تو ابتدائی زمانے کے محدثین نے ڈالی۔ بالخصوص امام بخاری، امام ترمذی اور امام نسائی رحمہم اللہ نے کتبِ حدیث میں احادیث جمع کرنے کے علاوہ اُن سے معلوم ہونے والے احکامات اور اہم نکات بھی بیان کیے، تاہم خاص فنِ سیرت میں فقہُ سیرت نگاری کی تدوین کا سہرا غالباً امام ابن قیم رحمہ اللہ کے سر ہے۔ امام ابن قیم، آٹھویں صدی ہجری میں کتاب و سنت کے عظیم شارح، بڑے پائے کے محدث، مورخ، فقیہ و مفسر اور بہت بڑے عالمِ دین تھے۔ فقہُ سیرت پر انھوں نے زادالمعاد کے عنوان سے ایک کتاب تحریر فرمائی جسے شہرت دوام حاصل ہوئی۔ امام ابن قیم کے بعد جن سیرت نگاروں نے فقہُ سیرت پر قلم اٹھایا وہ زیادہ تر زادالمعاد ہی کے مرہونِ منت ہوئے۔

کتبِ حدیث میں جس طرح فقہ سیرت کے ذریعے سیرت کے موضوع کو موجودہ دور سے ہم آہنگ کرنا اہمیت کا حامل ہے، اسی طرح سیرت النبی ﷺ سے متعلقہ روایات کی استنادی حیثیت کی جانچ پرکھ بھی نمایاں اہمیت رکھتی ہے۔

معاصر سیرت نگاروں میں جن اصحابِ علم و فضل نے فقہ سیرت کو اپنا موضوعِ تحریر قرار دیا اُن میں معروف مصری عالم و مصنف محمد غزالی اور مشہور شامی سیرت نگار ڈاکٹر محمد سعید رمضان بوطی کے نام نمایاں ہیں۔ ان دونوں حضرات کا کام اپنی جگہ بے حد اہمیت کا حامل ہے، تاہم دونوں فاضل مصنفین نے ثانوی مراجع یا معاصرین کی تحریروں سے بہت کم استفادہ کیا ہے۔

اور جن معاصر سیرت نگاروں نے سیرت کے موضوع پر استنادی حیثیت کو اہمیت دی ان میں بھی دو نام گل سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں: ① ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری ② ڈاکٹر مہدی رزق اللہ۔ الحمد للہ دارالسلام کی طرف سے ڈاکٹر مہدی رزق اللہ حفظہ اللہ کی اُردو میں ''سیرت نبوی'' دو جلدوں میں شائع ہو کر قارئین سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔

زیر نظر کتاب کے مصنف ڈاکٹر علی محمد محمد صلابی حفظہ اللہ نے مذکورہ دو باتوں پر خاص توجہ دی ہے۔ ایک تو انھوں نے فقہ سیرت کے نکات نہایت تفصیل سے اور بڑی راست فکری کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے کم و بیش 350 کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے جن میں قدیم کتبِ تاریخ و سیرت کے علاوہ معاصر مصنفین کی تحریریں بھی بڑی تعداد میں شامل ہیں۔ اور ہر متعلقہ فن پر ہونے والے کام سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اور کتبِ سیرت میں پائے جانے والے تاریخی اختلافات اور دیگر مباحث کو سمیٹنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ دوسرے اُنھوں نے واقعاتِ سیرت کے بیان میں بڑی حد تک قابل قبول روایات پر اعتماد کیا ہے اور سخت ضعیف روایات کے اندراج سے بہر طور اجتناب کیا ہے۔

سیرت کے متعدد پہلوؤں پر مستشرقین نے جو بے جا اعتراضات کیے ہیں، ڈاکٹر صلابی نے اُن اعتراضات کا بھرپور جائزہ لیا اور نہایت مدلل انداز سے اُن کا قلع قمع کیا ہے۔ انھوں نے اسلامی نظام حیات اور اسلام کے سیاسی و اقتصادی نظام کے خدو خال بڑی شرح وبسط سے واضح کیے ہیں۔ انھوں نے قرآن مجید کی روشنی میں نقوشِ سیرت کو نہایت خوبصورتی سے اجاگر کیا اور جابجا آیات قرآنی سے استدلال کیا ہے۔ اس اسلوب سے «كان خلقه القرآن» کی بھرپور سمجھ آتی ہے۔ یوں فقۂ سیرت کے باب میں یہ اپنی نوعیت کی بے حد جامع، مفصل اور منفرد کاوش ہے۔

کتاب کے فاضل مصنف جناب ڈاکٹر علی محمد صلابی 1383ھ / 1963ء میں لیبیا کے معروف شہر اور صوبائی دارالحکومت بنغازی میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے مدینہ منورہ اور ام درمان (سوڈان) کی یونیورسٹیوں میں دینیات کی اعلیٰ تعلیم پائی اور اسلامی تاریخ نگاری میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ مختلف دینی و تاریخی موضوعات پر لگ بھگ دو درجن کتابیں ترتیب دے چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ دارالسلام اس سے قبل اُن کی اِس اہم کتابِ سیرت کا انگریزی ایڈیشن شائع کر چکا ہے جسے یورپ و امریکہ میں بے حد پذیرائی ملی۔ اب اس کا اردو ایڈیشن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اصل کتاب عربی میں لکھی گئی ہے۔

دارالسلام کی جانب سے اس کتابِ سیرت کے اُردو ترجمے کی سعادت مولانا محمد یونس بٹ، مولانا ندیم شہباز اور مولانا محمد ادریس سلفی حفظہم اللہ نے حاصل کی۔ مذکورہ تینوں شخصیات جامعہ سلفیہ فیصل آباد جیسی عظیم دانش گاہ کے اساتذۂ کرام ہیں۔ جناب محسن فارانی اور جناب حافظ قمر حسن نے اُردو ترجمے کی نوک پلک سنوارنے کا اہم کام سرانجام دیا۔ مولانا حافظ نعمان فاروقی اور اُن کے رفقائے کار مولانا حافظ محمد فاروق اور مولانا حافظ سیف اللہ نے عربی متن کو سامنے رکھ کر اُردو ترجمے کی نظر ثانی اور حتمی پروف خوانی کی ذمے داری

بھرپور طریقے سے نبھائی۔ کمپوزنگ کرنے والوں میں عبدالرافع، رمضان شاد اور خرم شہزاد کے نام آتے ہیں جبکہ آرٹ ڈائریکٹر جناب زاہد سلیم چودھری، آرٹ ڈائریکٹر صفت الٰہی اور سینئر ڈیزائنر عبدالواسع، ہارون الرشید اور اسد علی نے کتاب کو ڈیزائننگ کی دلآویزیوں سے آراستہ کیا۔ میں ان تمام صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کتاب کی اشاعت و طباعت کے یہ تمام مراحل دارالسلام، لاہور کے مدیر عزیزم حافظ عبدالعظیم اسد کے زیر نگرانی پایۂ تکمیل کو پہنچے جن کا میں تہ دل سے شکرگزار ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں پیغام سیرت کے سمجھنے اور اُس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خادم کتاب و سنت

عبدالمالک مجاہد

الریاض، سعودی عرب

صفر 1433ھ / جنوری 2012ء

ہدیۂ عقیدت

میں یہ کتاب بطور ہدیۂ عقیدت باعمل علماء، مخلص داعیانِ حق، علم کے متوالوں اور غیور فرزندانِ ملتِ اسلامیہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اور اللہ عزوجل سے اس کے اسمائے حُسنٰی اور صفات عُلیا کے واسطے سے دعا گو ہوں کہ اس کتاب کو اپنی بارگاہ میں یوں شرفِ قبولیت بخشے کہ یہ ہر آلائش سے پاک ہو اور خالصتاً اس کی خوشنودی کے لیے ہو۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝﴾

”پھر جو شخص کہ اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو تو وہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرائے۔“①

---

① الکہف 110:18.

مقدمہ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهُ، وَ نَسْتَعِينُهُ، وَ نَسْتَغْفِرُهُ، وَ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَ مَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ

اے پروردگار! ہم صرف تیری ہی حمد بیان کرتے ہیں اس انداز میں جو تیری عالی مرتبت ذات اور عظیم فرمانروائی کے لائق ہے، تیری خوشنودی کے حصول تک ہم تیری حمد بیان کرتے رہیں گے، جب تو راضی ہوجائے گا تب بھی تیری حمد بیان کریں گے اور تیری رضا کے حصول کے بعد بھی صرف تیری ہی حمد بیان کریں گے۔

سیرت نبوی کا مطالعہ یقیناً ہر مسلمان کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہ بہت سے اہداف کو حقیقت کا روپ دیتا ہے۔ ان میں سے اہم ترین ہدف رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ سیرت کے مطالعے سے جہاں آپ ﷺ کی شخصیت کی معرفت حاصل ہوتی ہے وہاں آپ کے معمولات وفرمودات اور ان امور و اعمال سے بھی واقفیت ہوتی ہے جنھیں آپ ﷺ نے دیکھ کر پسند فرمایا اور برقرار رکھا۔

مطالعۂ سیرت ایک مسلمان کے دل میں محبت رسول ﷺ پیدا کرتا ہے، اس محبت کو پروان چڑھاتا ہے اور اسے پختہ کر کے دل میں جاگزین رکھتا ہے، نیز مطالعۂ سیرت ہمیں

ان صحابۂ کرام کی زندگیوں سے بھی متعارف کرواتا ہے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں جہاد کیا، اسی طرح یہ مطالعہ ہمیں اصحابِ رسول ﷺ سے محبت کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور ان کے طرزِ زندگی کو اپنانے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی پیدائش سے وفات تک کے تمام مراحل یعنی بچپن، جوانی، بعثت، دعوتِ دین، جہاد، مشکلات پر صبر اور دشمن پر فتح یابی جیسے امور کو آشکار کرتے ہوئے حیاتِ طیبہ کی چھوٹی بڑی تمام جزئیات کی تفصیل سیرت نبوی کی بدولت ہمارے سامنے آتی ہے اور یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ آپ شوہر بھی تھے اور باپ بھی، رہنما بھی تھے اور سپاہی بھی، حکمران بھی تھے اور سیاستدان بھی، مربی بھی تھے اور داعی بھی، زاہد بھی تھے اور قاضی بھی۔ غرضیکہ ہر مسلمان کو اپنا مطلوب سیرت طیبہ میں مل جاتا ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں ایک داعی کو دعوت کے کئی اسلوب اور سلسلہ وار مراحل ملیں گے اور ہر مرحلے کے لیے مناسب وسائل کا علم حاصل ہوگا جو اس کے لیے لوگوں کے ساتھ میل جول اور انھیں اسلام کی دعوت دینے میں مفید ثابت ہوگا۔ مطالعہ سیرت سے وہ اس عظیم جدوجہد کا اندازہ کر سکے گا جو رسولِ کریم ﷺ نے اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر کی اور اسے معلوم ہوگا کہ رکاوٹوں، دشواریوں اور مشکلات کے سامنے آپ کا طرزِ عمل کیا تھا، نیز تکالیف اور آزمائش کے موقع پر ایک داعی کا صحیح کردار کیا ہونا چاہیے۔

نبی ﷺ کی سیرت میں ایک مربی کو عام لوگوں کی تربیت اور اس سلسلے میں موثر کردار ادا کرنے کے لیے رہنمائی ملے گی اور خصوصاً ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے کردار و عمل سے آگاہی ہوگی جن کی تربیت آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے فرمائی اور انھیں ہر نوع کی آلائشوں سے محفوظ رکھنے کا خاص اہتمام فرمایا۔ یوں قرآن کے مقصود کے مطابق آپ نے ایک بے مثال جماعت تشکیل دی اور لوگوں کی رہنمائی کے لیے ایک بہترین گروہ تیار کیا تاکہ وہ اچھے کاموں کا حکم دے اور بُرے کاموں سے منع کرے اور صرف اللہ پر یقین

---

[1] السيرة النبوية للدكتور محمد أبي فارس، ص: 50.

رکھے، نیز انھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعے آپ نے ایک ایسی سلطنت قائم کی جس نے دنیا کے مشرق و مغرب میں عدل و انصاف کا بول بالا کیا۔

نبی ﷺ کی سیرت میں فوج کی قیادت، قبیلے یا خاندان کی سربراہی یا زمام حکومت سنبھالنے کے اصول وضوابط جاننے کے لیے ایک مضبوط نظام اور مستحکم اسلوب ملے گا۔ منصوبہ بندی کے لیے واضح ہدایات اور ان کی تنفیذ کے لیے مکمل احتیاط و ہنرمندی نظر آئے گی، نیز انصاف کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے اور حاکم ومحکوم اور امراء ولشکر کے درمیان مشاورت کی بنیاد قائم کرنے کا جذبہ عیاں ہوگا۔

سیرت طیبہ کے مطالعے سے ایک سیاستدان کو معلوم ہوگا کہ آپ ﷺ اپنے مخالفین کے ساتھ کیسا سلوک کرتے تھے۔ رئیس المنافقین عبد اللہ بن اُبَی ابن سَلُول جس نے اسلام کا اظہار تو کیا مگر دل میں کفر اور بغض چھپائے رکھا اس نے رسول اللہ ﷺ کو کمزور کرنے کے لیے اور لوگوں کو آپ سے دور کرنے کے لیے افواہیں پھیلائیں جو آپ کے لیے اذیت کا باعث تھیں۔ وہ آپ ﷺ کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتا مگر آپ ﷺ ان پر صبر کرتے اور اس کے بغض کو برداشت کرتے، یہاں تک کہ لوگوں کے سامنے حقیقتِ حال واضح ہوگئی، پھر سب نے اسے نظر انداز کر دیا بلکہ اُس کے قریبی ساتھی بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے، اس سے نفرت کرنے لگے اور نبی کریم ﷺ کی قیادت پر سب کا اتفاق ہوگیا۔

سیرت مطہرہ میں علماء کو ایسی باتیں ملیں گی جو قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے ان کی معاونت کریں گی کیونکہ سیرت ہی عملی لحاظ سے قرآن حکیم کی تفسیر ہے۔ اس میں بہت سی آیات کی تفسیر اور ان کے اسباب نزول موجود ہیں جو آیات کی تفہیم، ان سے استنباط کرنے اور حالات و واقعات کو اچھی طرح سمجھنے میں علماء کی معاونت کرتے ہیں۔ علماء انھی کی بنیاد پر شرعی احکام اور اسلامی سیاسی نظام کے اصولوں کا استخراج کرتے ہیں، اسی سے انھیں اسلام کے مختلف علوم کی صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے، ناسخ و منسوخ اور دیگر علوم حاصل

ہوتے ہیں اور وہ اسلام کی روح اور اس کے اعلیٰ مقاصد سے آشنا ہوتے ہیں۔

سیرت پاک سے زاہدوں کو زہد کا مفہوم، اس کی حقیقت اور اس کے مقاصد کا علم حاصل ہوتا ہے۔ سیرت طیبہ سے تاجر حضرات تجارت کے مقاصد، اس کے اصول اور طریقے معلوم کرتے ہیں۔ آزمائش میں مبتلا لوگوں کو صبر وثبات کے اعلیٰ درجات کا علم سیرت نبوی سے حاصل ہوتا ہے جو دعوتِ اسلام کے راستے پر چلنے کے لیے ان کے عزائم کو تقویت پہنچاتا ہے، اللہ عزوجل پر ان کے اعتماد کو بڑھاتا ہے اور انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ حُسنِ انجام صرف متقین کے لیے ہے۔[1]

اعلیٰ آداب، عمدہ اخلاق، شفاف عقائد، صحیح عبادات، اعلیٰ اوصاف، دل کی پاکیزگی، جہاد سے محبت اور شہادت کا جذبہ امت کو سیرت طیبہ ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ علی بن حسن فرماتے ہیں: ”جس طرح ہمیں قرآن کی ایک سورت کی تعلیم دی جاتی تھی اسی طرح ہمیں غزوات النبی ﷺ بھی سکھائے جاتے تھے۔“

واقدی کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن عبداللہ کو سنا، وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے اپنے چچا زہری کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”غزوات کے علم میں دنیا و آخرت کا علم ہے۔“

اسماعیل بن محمد بن سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں: ”میرے والد ہمیں رسول اللہ ﷺ کے غزوات کی تعلیم دیا کرتے تھے اور ہمارے سامنے انھیں شمار کرتے ہوئے فرماتے کہ یہ تمھارے آباء واجداد کے کارہائے نمایاں ہیں تم انھیں بھلا نہ دینا۔“[2]

قوم کی تربیت اور قیامِ حکومت کے سلسلے میں سیرت نبوی کا مطالعہ، اسلام کے فروغ اور مسلمانوں کے استحکام کا راستہ معلوم کرنے کے لیے علماء، فقہاء، قائدین اور حکمرانوں کی معاونت کرتا ہے۔ اس سے ترقی کے عوامل اور زوال کے اسباب سے آگاہی ہوتی ہے، نیز افراد کی تربیت، امتِ مسلمہ کی تعمیر، معاشرے میں زندگی کی روح پھونکنے اور حکومت کے

---

[1] مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص: 14. [2] البداية والنهاية: 2/242.

قیام کے لیے نبی کریم ﷺ کے دانش مندانہ اسلوب کا علم ہوتا ہے۔ ایک مسلمان دیکھتا ہے کہ دعوتِ دین اور اس کے تمام مراحل میں آپ کس قدر سرگرم تھے اور اسلامی دعوت کے مقابلے میں مشرکین کی سرگرمیوں کے سدباب کے لیے آپ نے کن صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ہجرتِ حبشہ کے لیے آپ نے کیسی مستحکم منصوبہ بندی کی۔ اہل طائف اور مختلف مواقع پر دیگر قبائل کے سامنے دعوت پیش کرنے کے لیے آپ نے کس قدر جدوجہد کی، کس خوبی کے ساتھ آپ نے انصار کو مرحلہ وار دعوت دی اور پھر بتدریج مدینہ کی طرف ہجرت کا آغاز ہو گیا۔

جو شخص واقعہ ہجرت پر غور وفکر کرتا ہے، ہجرت کی ابتدا سے انتہا تک، اس کی تیاری سے اس کے دور رس نتائج کے حصول تک ٹھوس منصوبہ بندی اور اس پر مکمل عمل درآمد کو گہری نگاہ سے دیکھتا ہے تو اسے یہ ادراک ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں وحی الٰہی کی بدولت درست منصوبہ بندی ہوتی تھی، نیز منصوبہ بندی کرنا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے اور یہ ان فرائض کی تعمیل ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان کو حکم دیا ہے۔

ایک مسلمان منہج نبوی سے سیکھ سکتا ہے کہ باطل کے ساتھ کشمکش میں کامیابی حاصل کرنے کے کیا ذرائع ہیں اور وہ تمام مراحل کے نظم ونسق کو چلانے اور ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں منتقل ہونے کی مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ مطالعۂ سیرت سے اسے معلوم ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے کس طرح یہود و نصاریٰ اور کفار و منافقین جیسی دشمن طاقتوں کا مقابلہ کیا اور اللہ تعالیٰ کی توفیق اور قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی حصولِ فتح ونصرت کی شروط اور اسباب کی پابندی کے ساتھ کس طرح ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میرا پختہ یقین ہے کہ اس امت کا اقتدار اور عظمتِ رفتہ کی بحالی رب ذوالجلال کے دین کے نفاذ اور اسوۂ رسول کی اتباع میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا ط﴾

”اور اگر تم اس (رسول) کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے۔“ [1]

اس آیت کریمہ نے واضح کر دیا کہ حصول اقتدار کا راستہ نبی کریم ﷺ کی اتباع میں ہے اور اس کے بعد کی آیات بھی حصولِ اقتدار کی شرائط واضح کر رہی ہیں، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾

”جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور خلافت دے گا۔“ [2]

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ نے شرائط اقتدار کی عملی تطبیق کی طرف خاص توجہ دی۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایمان اور اس کے تمام مفاہیم و ارکان کو حقیقت کا جامہ پہنایا، ہر اچھے کام کو اپنے کردار کا حصہ بنایا اور ہر قسم کی خیر و بھلائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کی کہ اس کی بندگی ان کی زندگی کے ہر پہلو پر چھا گئی۔ اور انھوں نے شرک کی تمام ظاہری و مخفی صورتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اقتدار کے مادی و معنوی ذرائع کو افراد اور جماعت نے ہر سطح پر اختیار کیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے مدینہ میں ایک حکومت قائم کر لی اور اس کے ذریعے اللہ کے دین کو سب قوموں اور امتوں میں پھیلا دیا۔

آج مسلمانوں کا اقوامِ عالم کی قیادت سے پیچھے رہ جانا اُس قوم کے طرزِ عمل کا منطقی نتیجہ ہے جس نے اپنے مشن کو فراموش کر دیا ہو اور خود ہی اپنے مقام سے نیچے گر گئی ہو۔ اس نے علم و عمل کے میدانوں اور اپنے قیمتی ورثے میں کثافتوں کے بڑے بڑے انباروں کی آمیزش کر لی ہو، سنتِ الٰہیہ سے بے اعتنائی برتی ہو اور سمجھ لیا ہو کہ اقتدار خوابوں اور تمناؤں سے حاصل ہو جاتا ہے۔

یہ ایمانی کمزوری، روحانیت کا فقدان، فکری بے راہ روی، دلی اضطراب، ذہنی انتشار اور

---

[1] النور 54:24. [2] النور 55:24.

اخلاقی گراوٹ جو مسلمانوں کو لاحق ہوئی ہے، اس کا سبب وہ بہت بڑی خلیج ہے جو امت مسلمہ اور قرآن وحدیث، خلافت راشدہ اور درخشندہ اسلامی تاریخ کے درمیان حائل ہے۔

میرے ساتھ ساتھ آپ بھی دیکھتے ہوں گے کہ بہت سے لوگ اسلام کے ترجمان بن کر سامنے آرہے ہیں، حالانکہ وہ قرآن کریم، سیرت نبوی اور سیرتِ خلفائے راشدین سے کوسوں دور ہیں۔ مغربی تہذیب کے سامنے نفسیاتی شکست کے نتیجے میں انھوں نے اپنی گفتگو میں نئی اصطلاحات اور بے بنیاد نظریات داخل کر لیے ہیں اور الفاظ کو کھلونا بنا کر ان کا ہیر پھیر شروع کر دیا ہے۔ وہ گھنٹوں گفتگو کرتے ہیں، پُرکشش مضامین لکھتے ہیں لیکن نہ ان کی گفتگو سے محسوس ہوتا ہے اور نہ ان کے مضامین میں ہمیں نظر آتا ہے کہ انھوں نے گہری نگاہ سے قرآن کریم، منہج نبوی، دعوتِ انبیاء و رسل اور تاریخ اسلام کی روشنی میں یہ جائزہ لینے کی کوشش کی ہو کہ دنیا میں غلبہ حاصل کرنے کے اصول کیا ہیں اور قوموں کے انقلاب اور تعمیرِ سلطنت میں قانون الٰہی کا مقام کیا ہے۔ وہ جب ہمیں نور الدین محمود زنگی، صلاح الدین ایوبی، یوسف بن تاشفین، محمود غزنوی اور سلطان محمد فاتح کی کامیابی کے اسباب بتاتے ہیں جنھوں نے اُمت کی تربیت اور قیامِ حکومت کے لیے منہج نبوی کو اختیار کیا تو ایسا کرتے ہوئے ان مشرق و مغرب کے فرزندانِ تہذیب، مفکرین اور سیاستدانوں کے اقوال بطور دلیل پیش کرتے ہیں جو خود وحی الٰہی اور منہج ربانی سے کوسوں دور ہیں۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اقوام ومِلل کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی مخالفت کرتے ہیں۔ حکمت تو مومن کی متاعِ گم گشتہ ہے۔ جہاں بھی ملے وہ اسے لینے کا زیادہ حقدار ہے۔ لیکن میں ان لوگوں کا مخالف ہوں جو منہج ربانی سے ناواقف ہیں یا ناواقف بن گئے ہیں اور انھوں نے امت کے ان تاریخی تذکروں کو فراموش کر دیا ہے جو دروس وعبر اور نصیحتوں سے لبریز ہیں۔ اس کے باوجود وہ چاہتے ہیں کہ اپنی ادنیٰ خواہشات اور قرآن وحدیث کے نور سے بے بہرہ افکار کے ساتھ مسلمانوں کی قیادت کریں۔ علامہ

ابن قیم رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے:

وَاللّٰهِ مَا خَوْفِي الذُّنُوبَ فَإِنَّهَا   لَعَلٰى طَرِيقِ الْعَفْوِ وَالْغُفْرَانِ
لٰكِنَّمَا أَخْشَى انْسِلَاخَ الْقَلْبِ عَنْ   تَحْكِيمِ هٰذَا الْوَحْيِ وَالْقُرْآنِ
وَ رِضًا بِآرَاءِ الرِّجَالِ وَ خَرْصِهَا   لَا كَانَ ذَاكَ بِمِنَّةِ الرَّحْمٰنِ

> ''اللہ کی قسم! مجھے گناہوں کا کوئی خوف نہیں ہے کیونکہ گناہ تو معافی اور بخشش کی وجہ سے مٹ جائیں گے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں دل اس وحی اور قرآن کے کنٹرول سے باہر نہ ہوجائے اور لوگوں کی آراء اور ظن و قیاس پر مطمئن نہ ہوجائے۔ اللہ کے فضل وکرم سے ایسا کبھی نہیں ہوگا۔''

ہمیں یہ جاننے کی سخت ضرورت ہے کہ تربیتِ اقوام اور قیامِ حکومت کے سلسلے میں طریق نبوی کیا تھا اور اقوام و مِلل اور حکومتوں کے بارے میں سنتِ الٰہی کیا ہے؟ اور نبی کریم ﷺ نے جب انسانی دنیا میں دعوت الٰہی کا آغاز کیا تو آپ ﷺ نے ان اقوام کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کیا تاکہ ہم اپنی دعوت اور اپنے دین کے استحکام کے لیے آپ کی سیرت طیبہ سے صحیح رہنمائی حاصل کرسکیں اور اپنی عمارت اُس منہجِ سلیم پر استوار کرسکیں جس کے اصول و فروع کتاب وسنت سے ماخوذ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

''یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ (ﷺ کی زندگی) میں بہترین نمونہ ہے۔''[1]

قوم کی تربیت اور قیامِ حکومت کے لیے نبی کریم ﷺ کا طریقہ متوازن، ہمہ گیر، ہمہ جہت اور اس نظامِ الٰہی کے ماتحت تھا جو معاشروں کے استحکام، قوموں کی زندگی اور حکومتوں کی تعمیر میں کارفرما رہا ہے۔ آپ ﷺ نے اس سلسلے میں انتہائی حِکمت اور اعلیٰ

---

[1] الأحزاب 21:33.

درجے کی ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ درجہ بدرجہ آگے بڑھنے کا معاملہ ہو یا باہمی کشمکش اور ابتلا کا، ذرائع کے حصول کی بات ہو یا افراد میں تبدیلی لانے کی، آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کے دلوں میں اللہ کے دین کا پودا اس کے تمام تر مفاہیم اور اقدار ونظریات سمیت کاشت کیا۔ اور اللہ تعالیٰ، انسان، کائنات، زندگی، جنت، جہنم اور قضا و قدر کے بارے میں صحیح تصورات ان کے دلوں میں راسخ کیے۔

آپ ﷺ کے صحابہ بھی آپ کے منہجِ تربیت سے بہت زیادہ اثر لیتے تھے اور آپ کی ہدایات کی پابندی کرنے کی مکمل کوشش کرتے تھے۔ باہر جانے والا جب پلٹ کر آتا تو اپنے ساتھیوں سے پوچھتا کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ کے کیا کیا معمولات دیکھے، آپ نے کیا تعلیمات و ہدایات دیں اور میری غیر موجودگی میں کون کون سی آیات نازل ہوئیں۔ وہ ہر چھوٹے بڑے کام میں رسول اللہ ﷺ کے نقشِ قدم کی اتباع کرتے۔ یہ نہیں کہ دینی معلومات حاصل کرنے کا اس قدر اہتمام ان کی اپنی ذات تک محدود تھا بلکہ وہ اپنی اولاد اور دیگر احباب کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔

اس کتاب میں سیرت کے احداث و واقعات کو جمع کیا گیا ہے جن سے ایک محقق کے سامنے یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ بعثت سے پہلے دنیا کی حالت کیا تھی؟ اور بعثت کے وقت کن تہذیبوں کو بالادستی حاصل تھی اور ان کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی صورتِ حال کیا تھی؟ نبی کریم ﷺ کی ولادت سے قبل کون سے اہم واقعات رونما ہوئے؟ وحی کا نزول کیسے ہوا؟ دعوتِ دین کو کن کن مراحل سے گزرنا پڑا؟ عہد مکی میں نظریاتی، اخلاقی اور اطاعت و بندگی کی بنیادیں کیا تھیں؟ دعوت کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے مشرکین نے کون کون سے حربے اختیار کیے؟ مسلمانوں نے حبشہ کی جانب ہجرت کیوں اور کیسے کی؟ نبی ﷺ کو سفرِ طائف میں کیا کیا صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں؟ اسراء و معراج کی صورت میں کیا کیا انعامات حاصل ہوئے؟ تبلیغی دورے کیسے ہوئے اور ان کے نتائج کیا

نکلے؟ اہل یثرب کی جانب سے خیر کے کاروان کیونکر چلے اور روشنی کی کرنیں کس طرح نمودار ہوئیں؟ کن کن مراحل سے گزر کر ہجرت نبوی کی تکمیل ہوئی؟

یہ کتاب، پڑھنے والے کو واقعات کے ساتھ ساتھ ان سے حاصل ہونے والے دروس، نصیحتوں اور نتائج سے بھی باخبر کرے گی تاکہ موجودہ بین الاقوامی حالات میں مسلمان اس سے مستفید ہوسکیں۔ ایک محقق نبی کریم ﷺ کی مدینہ آمد اور دارِآخرت کی طرف رحلت تک مکمل مدنی زندگی سے بخوبی آگاہ ہوگا اور آپ ﷺ کی خداداد صلاحیتوں کو جان لے گا کہ آپ نے کس طرح معاشرے کو ٹھوس بنیادوں پر استوار کیا، تربیت کیسے کی، قیامِ حکومت کے لیے کن کن وسائل کو اختیار کیا اور داخلی و خارجی دشمنوں کا کس طرح مقابلہ کیا۔ جستجو کرنے والا یقیناً نبی کریم ﷺ کی اس ذہانت وفطانت سے روشناس بھی ہوگا جس کا مظاہرہ آپ ﷺ نے معاشرے کو سنوارنے، اہل کتاب کے ساتھ تحریری معاہدے کرنے، جہادی تحریک پیدا کرنے اور معاشی گتھیاں سلجھانے میں کیا۔ اور کس احسن انداز میں آپ نے اس دین کے تمام تصورات کو مسلمانوں کے دل و دماغ میں پختہ کیا جو انسانیت کو گمراہی کے اندھیروں سے نکالنے، بتوں کی عبادت سے نجات دلانے اور حکیم و برتر ذات کے عطا کردہ ضابطۂ حیات پر لانے کے لیے آیا تھا۔

سیرت نبوی میں اختصار کے باعث فرزندان اسلام کے ذہنوں میں جو سوالیہ نشان رہ جاتے ہیں، ایک محقق ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ گزشتہ ادوار میں سیرتِ نبوی کے موضوع پر بہت سی عمدہ تحقیقی کتب منظر عام پر آئی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے شرفِ قبولیت عطا کیا اور انھیں خوب پذیرائی حاصل ہوئی، مثلاً: مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی ''الرحیق المختوم'' الشیخ محمد غزالی کی ''فقہ السیرہ'' دکتور محمد رمضان بُوطی کی ''فقہ السیرۃ النبویہ'' اور مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی ''السیرۃ النبویہ۔''

یہ کتب اختصار کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ ان میں سیرت کے تمام واقعات شامل نہیں

ہیں۔ بعض یونیورسٹیوں نے انھی کتب پر انحصار کیا ہے، جبکہ کچھ طالبانِ علم بھی یہ سمجھنے لگے کہ جس نے ان کتب کو پڑھ لیا گویا اس نے مکمل سیرت نبوی کا مطالعہ کرلیا، حالانکہ یہ سیرت مطہرہ کے سلسلے میں بہت بڑی اور خطرناک غلطی ہے جو کہ بہت سے ائمۂ مساجد اور اسلامی تحریکوں کے ذمہ داران میں بھی سرایت کرچکی ہے اور اس کا اثر ان کے متبعین پر بھی پڑا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگوں کے ہاں سیرت کا نہایت ناقص تصور پایا جاتا ہے۔

فضیلۃ الشیخ محمد الغزالی اپنی کتاب فقہ السیرہ کے آخر میں اس تصور کی سنگینی پر متنبہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ لوگ نبی کریم ﷺ کی پیدائش سے وفات تک کے واقعات پڑھ کر سمجھنے لگتے ہیں کہ انھوں نے آپ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کر لیا ہے، حالانکہ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ کوئی بھی شخص اس وقت تک کما حقہ سیرت کو نہیں سمجھ سکتا جب تک قرآن کریم اور سنت مطہرہ کا مطالعہ نہ کرے۔ جس قدر کوئی ان کا مطالعہ کرے گا اسی قدر اس کا نبی کریم ﷺ سے تعلق پیدا ہوگا۔[1]

زیر نظر کتاب کا مطالعہ کرنے والا محسوس کرے گا کہ فہمِ قرآن کی گہرائی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اس میں وافر رہنمائی موجود ہے کیونکہ قرآن کا سیرت نبوی کے ساتھ گہرا تعلق ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ احزاب، غزوۂ بنی نضیر، صلح حدیبیہ اور غزوۂ تبوک کا تذکرہ موجود ہے اور اسے سمجھنے کے لیے سیرت کے مطالعے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کتاب سے واضح ہوگا کہ ان واقعات میں ہمارے لیے کیا درس اور نصیحتیں ہیں، فتح و ناکامی سے متعلق اللہ تعالیٰ کا کیا ضابطہ ہے اور قرآن حکیم نے مختلف حوادث و واقعات کے دوران امراضِ قلوب کا علاج کس انداز سے کیا ہے۔

سیرت نبوی میں ہر قوم کے لیے ایسی رہنمائی موجود ہے جس سے وہ اچھے انداز میں زندگی گزار سکے۔ یہ ہر زمان و مکان میں کارگر ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاحِ احوال کی

---

[1] فقه السيرة للغزالي، ص: 476.

صلاحیت سے مالا مال ہے۔

راقم نے اپنی زندگی کا ایک حصہ قرآن حکیم اور سیرت نبوی کے مطالعے میں بسر کیا اور وہ میری زندگی کے بہترین ایام تھے۔ اس جستجو میں نہ مجھے وطن سے دوری کا احساس ہوا اور نہ اجنبیت کا۔ میں نے اُمّہات الکتب (بنیادی کتابوں) میں چھپے ہوئے خزانوں اور قیمتی موتیوں پر دسترس حاصل کی، پھر انھیں مرتب کر کے عمدہ انداز میں پیش کرنے کے لیے کام کیا تاکہ امت کے عظیم سپوتوں کے لیے انھیں حاصل کرنا آسان ہو جائے۔

دریں اثنا میں نے یہ بات ملاحظہ کی کہ واقعات، نتائج، نصیحتوں اور دروس کا ذکر کرنے میں قدیم اور جدید سیرت نگاروں میں خاصا فرق ہے۔ بعض اوقات ابن ہشام رحمہ اللہ ایک بات بیان کرتے ہیں مگر امام ذہبی اسے بیان نہیں کرتے۔ کبھی ابن کثیر رحمہ اللہ ایسی چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں جنھیں اصحاب السنن نے بیان نہیں کیا ہوتا۔ یہ تو قدیم سیرت نگاروں کی بات تھی۔ جدید سیرت نگاروں میں بھی یہ چیز موجود ہے کہ علامہ سباعی نے وہ باتیں بیان کی ہیں جو شیخ غزالی نے بیان نہیں کیں اور دکتور محمد رمضان بُوطی نے وہ کچھ بیان کیا ہے جو دکتور منیر غضبان نے نہیں کیا۔ اسی طرح میں نے کتب تفسیر، شروحِ حدیث، مثلاً: فتح الباری، شرح نووی اور فقہاء کی کتابوں میں بہت سی ایسی باتیں پائیں جو قدیم وجدید سیرت نگاروں نے بیان نہیں کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ اعزاز بخشا کہ میں نے ان دروس ونصائح اور ثمرات کو جمع کیا، انھیں خوبصورت انداز میں ترتیب دیا اور آسان اسلوب کے ساتھ پیش کیا تاکہ قارئین کرام ان سے بہ آسانی فائدہ حاصل کر سکیں۔

اس کتاب میں علمی نتائج اور عمدہ نکات ہیں جو میں نے سینکڑوں مصادر ومراجع سے حاصل کیے۔ میری اس کاوش میں بہت سے بھائیوں کا حصہ ہے جن کا تعلق لیبیا، یمن، عراق، مصر، سوڈان، سعودی عرب، عرب امارات، قطر اور شام کے علاقوں سے ہے۔ ان ارباب علم وتحقیق نے علمی گفتگو، بحث وتمحیص اور علمی مجالس کے ذریعے تعاون کیا۔ بعض

نے نایاب مصادر و مراجع کی نشاندہی کی اور ان کی فراہمی کے لیے کوشش کی، بعض نے رہنمائی کی کہ ان قواعد و ضوابط کو مرکزی اہمیت دی جائے جو آپ ﷺ نے اپنی مبارک تحریک میں اختیار کیے، جیسا کہ موقع سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ جسے قانون فرصت کہا جاتا ہے جو آپ نے فتح خیبر اور فتح مکہ میں اختیار کیا۔ بعض نے تاریخی یا واقعاتی سیرت اور عملی سیرت میں ربط کی اہمیت کی جانب توجہ دلائی۔ عملی سیرت سے مراد وہ سیرت ہے جو نبی کریم ﷺ کے فرامین و معمولات کا مجموعہ ہے۔ اور وہ سیرت جس کا قرآن متقاضی ہے اسے ایک مرتب طرزِ زندگی کی صورت میں پیش کرنے سے قوم کے نونہالوں کو وافر علم، عَمیق فقاہت اور توانا دینی جذبہ حاصل ہوگا، اس سے روح کو غذا حاصل ہوگی، عقلوں کی اعلیٰ تربیت ہوگی، دلوں کو زندگی ملے گی اور نفوس کو پاکیزگی حاصل ہوگی۔

دعوتِ اسلامیہ کی نشر و اشاعت کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے اس کے ہر پہلو کے لیے سیرت نبوی میں رہنمائی موجود ہے۔ نبی کریم ﷺ نے رفیق اعلیٰ کے پاس جانے سے پہلے ہر اس انسان کے لیے بے شمار نمونے چھوڑے ہیں جو آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہو، خواہ وہ دعوت و تربیت کا میدان ہو یا تعلیم و ثقافت کا، جہادی امور ہوں یا زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والے معاملات ہوں۔

سیرتِ رسول کا گہرائی سے مطالعہ خُلقِ عظیم کے اُس خزانے تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہوگا جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ ہر انسان سے ممتاز ہیں، اسی طرح آپ کے ان اوصافِ حمیدہ کی معرفت بھی حاصل ہوگی جن سے آراستہ رہ کر آپ نے اس دنیا میں زندگی بسر کی۔ آپ ﷺ کی سیرت ان اشعار کا مصداق نظر آئے گی:

وَ أَحْسَنَ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِي وَ أَجْمَلَ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِّنْ كُلِّ عَيْبٍ كَأَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

”تجھ سے زیادہ حسین میری آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا۔ اور تجھ سے زیادہ خوبصورت،

عورتیں پیدا نہ کر سکیں۔ تجھے ہر عیب سے پاک پیدا کیا گیا گویا کہ تیری تخلیق تیری پسند اور چاہت کے مطابق ہوئی۔‘‘

مجھے یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ میں نے کوئی ایسی چیز پیش کی ہے جو پہلے لوگوں کی استطاعت سے باہر تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی شان تو بہت بلند ہے اور آپ کی سیرت کے بہت سے نمایاں پہلوؤں کو روشناس کروانے کے لیے ایسے شخص کی ضرورت ہے جو رقیق القلب ہو، زود فہم ہو، اعلیٰ ذہانت کا مالک اور پختہ ایمان کا حامل ہو۔ اور میرا یہ دعویٰ بھی نہیں ہے کہ میری یہ جدوجہد اکمل اور ہر عیب سے پاک ہے کیونکہ یہ تو انبیاء اور رسولوں کا مقام ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ اس نے تمام علوم کا احاطہ کر لیا وہ جاہل ہے۔ اللہ نے سچ فرمایا ہے:

﴿وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝﴾

’’اور تمھیں تو بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔‘‘[1]

علم تو بحرِ بے کراں ہے۔ ایک شاعر نے کتنی سچی بات کہی ہے:

وَ قُلْ لِّمَنْ يَّدَّعِي فِي الْعِلْمِ فَلْسَفَةً حَفِظْتَ شَيْئًا وَّ غَابَتْ عَنْكَ أَشْيَاءُ

’’جو شخص علم میں کسی حکمت و تبحر کا دعویٰ کرتا ہے اسے کہیے کہ تو نے ایک چیز محفوظ کی ہے اور بہت سی چیزیں تجھ سے چھپی ہوئی ہیں۔‘‘

ثعالبی کہتے ہیں کہ جب بھی کوئی شخص کتاب لکھتا ہے تو صرف ایک رات گزرنے کے بعد وہ چاہتا ہے کہ اس کتاب میں کچھ اضافہ کر دے یا کوئی چیز حذف کر دے۔ یہ کیفیت تو صرف ایک رات گزرنے پر ہے کئی برسوں کے بعد کیا کیفیت ہوگی؟

عماد اصبہانی کا قول ہے: ’’میں نے دیکھا ہے کہ ایک انسان آج ایک کتاب لکھتا ہے تو اس سے اگلے دن وہ کہتا ہے کہ اگر اس میں تبدیلی ہو جائے تو زیادہ اچھا ہو، اگر یہ اضافہ کر دیا جائے تو اسے مستحسن سمجھا جائے گا، اگر فلاں عبارت مقدم کر دی جائے تو بہت

---

[1] بني إسرآئيل 85:17.

بہتر ہوگا، اگر اس کو حذف کردیا جائے تو زیادہ اچھا ہوگا …… دراصل یہ ایک عظیم نصیحت ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی بھی انسان نقص سے پاک نہیں۔

میں آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ میرا یہ عمل خالص اس کی ذات کے لیے ہو اور اس کے بندوں کے لیے نفع مند ہو۔ اور اللہ تعالیٰ مجھے ہر حرف پر اجر عطا فرمائے اور اسے میری نیکیوں کی میزان میں رکھے اور میرے ان بھائیوں کو بھی اجر عطا فرمائے جنھوں نے اس کتاب کی تکمیل کے لیے مجھ سے ہر ممکن تعاون کیا۔ شاعر کہتا ہے:

أَسِيرُ خَلْفَ رِكَابِ الْقَوْمِ ذَا عَرَجٍ   مُؤَمِّلًا جَبْرَ مَا لَاقَيْتُ مِنْ عِوَجِ
فَإِنْ لَّحِقْتُ بِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا سَبَقُوا   فَكَمْ لِرَبِّ السَّمَا فِي النَّاسِ مِنْ فَرَجِ
وَ إِنْ ظَلَلْتُ بِقَفْرِ الْأَرْضِ مُنْقَطِعًا   فَمَا عَلَى عَرَجٍ فِي ذَاكَ مِنْ حَرَجِ

”میں لنگڑے پن کے ساتھ عظیم لوگوں کی سواریوں کے پیچھے چل پڑا ہوں، اس امید سے کہ ٹیڑھے پن کی وجہ سے لاحق ہونے والی کوتاہیوں کی تلافی کرلوں گا۔ اگر میں ان کے سبقت لے جانے کے بعد بھی ان سے جاملا تو (حیران ہونے والی بات نہیں) آسمان والے رب کی لوگوں پر کتنی وسعتیں (انعامات) ہیں۔ اور اگر میں بے آب وگیاہ زمین میں خالی ہاتھ (زادِراہ اور سواری سے محروم) ہوکر ہلاک ہوجاؤں تو ایسا ہو جانا لنگڑے پن کے ہوتے ہوئے کوئی عیب نہیں۔“

«سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ! وَبِحَمْدِكَ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ، وَ أَتُوبُ إِلَيْكَ» ”اے اللہ! تو ہر عیب سے پاک ہے اور تیری ہی تعریفیں ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں تجھ سے مغفرت چاہتا ہوں اور تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔“

فقیر الی اللہ: علی محمد محمد الصلابی

1422ھ بمطابق 2001ء

حصہ 1

قبل از پیدائش اہم تاریخی واقعات

باب : 1 پیدائش کے وقت بالادست تہذیبیں اور مذاہب

باب : 2 عرب اقوام اور ان کی تہذیبیں

باب : 3 عربوں کی دینی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی حالت

وَاِنْ
كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

”حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ واضح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔“

(آل عمران 3 : 164)

باب 1

پیدائش کے وقت بالادست تہذیبیں اور مذاہب

رومی بادشاہت

روم کی مشرقی بادشاہت بازنطینی بادشاہت کے نام سے معروف تھی۔ اس کی حکمرانی یونان، بلقان، ایشیا، شام، فلسطین، پورے بحیرۂ روم، مصر اور اسی طرح شمالی افریقیہ کے تمام علاقوں پر قائم تھی۔ اس کا پایۂ تخت قسطنطنیہ تھا۔ یہ ایک ظالم حکومت تھی جو اپنے ماتحت عوام کے ساتھ مسلسل ظلم و تشدد اور ناانصافی کا رویہ اپنائے ہوئے تھی۔ اس نے کئی گنا ٹیکس عائد کر رکھے تھے۔ فسادات، ہنگامے اور انقلابات رونما ہوتے رہتے تھے، جبکہ عام زندگی طرح طرح کے لہو ولعب، موج مستی، عیاشی اور آسودگی پر مبنی تھی۔

مصر مذہبی ظلم و جبر اور سیاسی آمریت کا شکار تھا۔ بازنطینی حکمرانوں نے اسے دودھ دینے والی بکری بنا رکھا تھا جس سے وہ دودھ تو لیتے مگر کھانے کو کچھ نہ دیتے تھے۔

شام میں بھی ظلم و جبر بڑھ گیا تھا۔ حکمران عوام کے ساتھ برتاؤ میں طاقت اور شدید جبر پر انحصار کرتے تھے۔ یہ علاقہ بھی رومی خواہشات کا نخچیر بن گیا تھا۔ حکمرانی اغیار کی تھی جو صرف طاقت استعمال کرنا جانتے تھے اور اپنے محکوم عوام کے لیے کوئی نیک جذبہ نہیں رکھتے تھے۔ اکثر اہل شام اپنے قرضوں کی ادائیگی کے لیے اپنے جگر گوشے فروخت کر دیا کرتے تھے۔①

رومی معاشرہ تضادات اور افراتفری سے بھرا ہوا تھا جس کی عکاسی کتاب الحضارۃ

---

① السيرة النبوية للندوي، ص:31.

ماضیھا و حاضرھا میں اس طرح کی گئی ہے:

”بازنطینیوں کی معاشرتی زندگی میں زبردست تضادات تھے۔ مذہبی رجحانات ان کے ذہنوں میں راسخ تھے۔ رہبانیت عام تھی اور ملک کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک عام آدمی بھی دین کی گہری اور نازک بحثوں میں دخل اندازی کرنے لگا اور عوامی جھگڑوں میں مشغول ہوکر رہ گیا۔ ان کی عام زندگی پر مذہب کی چھاپ تھی لیکن جب ہم ان کی معاشرتی زندگی دیکھتے ہیں تو یہ لوگ ہر قسم کے لہو ولعب اور مستی و عیاشی کے دلدادہ تھے۔ ان کے ہاں بڑے بڑے وسیع کھیلوں کے میدان (ایمفی تھیٹر جیسے) تھے۔ ہر ایک میں اسّی اسّی ہزار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ ایمفی تھیٹر میں بیٹھ کر کبھی وہ انسانوں کی باہمی کشتی کا تماشا دیکھتے اور کبھی انسانوں اور جنگلی درندوں کی کشتی کا۔

عوام دو طبقوں میں منقسم تھے: سفید فام اور گندمی (سانولے) رنگ کے۔ رومی حسن و جمال کے شوقین تھے۔ تشدد پسند اور وحشت کے خوگر تھے۔ ان کے اکثر کھیل خونخواری اور درندگی پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان کی سزائیں بڑی خوفناک ہوتی تھیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ان کے امراء اور بڑوں کی زندگی بے حیائی، عیاشی، باہمی سازشوں، حد سے زیادہ طبقاتی امتیازات، بداعمالیوں اور بُری عادتوں کا مجموعہ تھی۔[1]

ایرانی بادشاہت

ایرانی بادشاہت سلطنت فارس یا سلطنت کسریٰ کے نام سے معروف تھی۔ یہ روم کی مشرقی بادشاہت سے زیادہ بڑی اور طاقتور تھی۔ یہاں مجوسیت (آتش پرستی) اور مانویت جیسے بگڑے ہوئے دین بکثرت پائے جاتے تھے۔ مانویت کی بنیاد تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں ”مانی“ نے رکھی۔ (مانی کی دعوت ایران میں بڑھتے ہوئے شدید شہوانی رجحان کے ردّعمل کے طور پر رُونما ہوئی۔ اس نے کنوارے پن کی زندگی اختیار کرنے کی

---

[1] السيرة النبوية للندوي، ص:31.

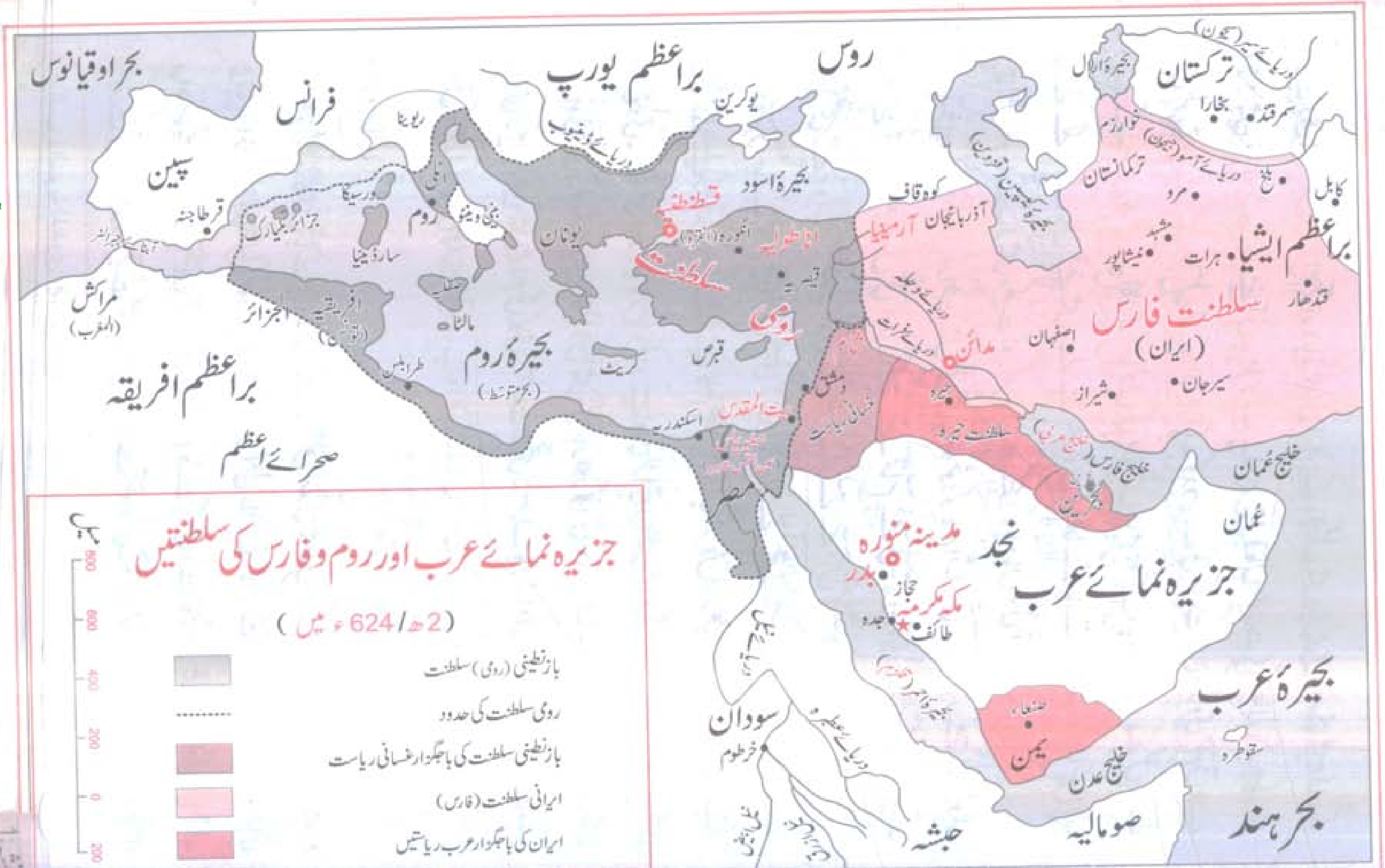

جزیرہ نمائے عرب اور روم و فارس کی سلطنتیں

(2ھ / 624ء میں)

بحر اوقیانوس
فرانس
براعظم یورپ
روس
ترکستان
دریائے سیر (سیحون)
بحیرۂ ارال
بخارا
سمرقند
خوارزم
دریائے آمو (جیحون)
ترکمانستان
بلخ
مرو
کابل
بحیرۂ کیسپین (قزوین)
کوہ قاف
آذربائیجان
آرمینیا
مشہد
نیشاپور
ہرات
براعظم ایشیا
قندھار
سلطنت فارس
(ایران)
اصفہان
سیرجان
شیراز
دریائے دجلہ
دریائے فرات
مدائن
حیرہ
سلطنت حیرہ
خلیج فارس
بحرین
خلیج عمان
عمان
سپین
قرطاجنہ
جزائر بلیارک
کورسیکا
سارڈینیا
روم
وینس
یونان
دریائے ڈینیوب
یوکرین
بحیرۂ اسود
قسطنطنیہ
انقرہ (انگورہ)
اناطولیہ
قیصریہ
سلطنت رومی
قبرص
کریٹ
مالٹا
بحیرۂ روم
(بحر متوسط)
طرابلس
افریقیہ
(تیونس)
الجزائر
مراکش
(المغرب)
براعظم افریقہ
صحرائے اعظم
اسکندریہ
مصر
بیت المقدس
دمشق
غسانی ریاست
مدینہ منورہ
نجد
بدر
حجاز
مکہ مکرمہ
جدہ
طائف
جزیرہ نمائے عرب
بحیرۂ احمر
دریائے نیل
سوڈان
خرطوم
صنعاء
یمن
خلیج عدن
سقوطرہ
بحیرۂ عرب
صومالیہ
حبشہ
بحر ہند
بازنطینی (رومی) سلطنت
رومی سلطنت کی حدود
بازنطینی سلطنت کی باجگزار غسانی ریاست
ایرانی سلطنت (فارس)
ایران کی باجگزار عرب ریاستیں
میل
800
600
400
200
0
200

دعوت دی اور نکاح کو حرام قرار دیا۔) مانی ازم کے ردِّعمل میں پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں مَزْدَکِیَّت سامنے آئی۔ مَزْدَک نے ہر چیز (مال، عورت) کو حلال کر دیا۔ جو جس طرح چاہے انھیں حاصل کرے اور ہر ایک کو دوسرے کی ملکیت میں مساوی حقوق دے دیے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسانوں کی بغاوتیں عام ہوگئیں، بادشاہوں کے محل لوٹے جانے لگے۔ لوگ مال قبضے میں لے لیتے، عورتوں کو اٹھا لے جاتے، املاک اور جائیدادوں پر قابض ہو جاتے۔ زمین، کھیت اور گھریوں ہوگئے، گویا وہاں کوئی آباد ہی نہ تھا۔

بادشاہوں کو حکمرانی وراثت میں ملتی تھی۔ وہ خود کو عام انسانوں سے بالا رکھتے تھے کیونکہ وہ اپنے آپ کو معبودوں کی اولاد سمجھتے تھے۔ تمام خطے کی آمدن ان بادشاہوں کی ملکیت ہوتی تھی جسے وہ ایسے متکبرانہ انداز میں صرف کرتے تھے جس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری جانب عوام حیوانوں جیسی زندگی بسر کرتے تھے۔ ٹیکسوں اور فوجی خدمت سے بچنے کے لیے زمینداروں نے اپنے کام چھوڑ کر گرجا گھروں اور عبادت گاہوں میں رہنے کو ترجیح دی۔ تباہ کن اور ریزہ ریزہ کر دینے والی لڑائیوں میں عوام کی حیثیت ایک حقیر ایندھن کی ہوتی تھی۔ وہ لڑائیاں جو تاریخ میں کئی بار اور کئی کئی سال تک رومیوں اور ایرانیوں میں جاری رہیں، ان میں عوام کی کوئی مصلحت نہ تھی۔ صرف بادشاہوں کی خوش طبعی اور ان کے شوق کو پورا کرنا مقصود ہوتا تھا۔[1]

ہندوستان

مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ چھٹی صدی عیسوی سے جو زمانہ شروع ہوتا ہے وہ مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے اس علاقے کا پست ترین دور تھا۔ بے حیائی عام ہوچکی تھی یہاں تک کہ فحاشی کو تقدس دے کر عبادت گاہوں تک پھیلا دیا گیا تھا۔ عورت کی کوئی قدر و قیمت تھی نہ اس کی عزت محفوظ تھی۔ جس عورت کا خاوند فوت ہو جاتا،

---

[1] السيرة النبوية للندوي، ص:33,32.

اسے اپنے خاوند کے ساتھ زندہ جلا دینے کی رسم (سَتی) عام تھی۔ دنیا بھر کے ملکوں میں ہندوستان کو اب بھی یہ امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ یہاں کے باشندوں میں ناقابلِ تسلیم حد تک ذات پات کی مذموم درجہ بندی پائی جاتی ہے جسے مذہبی، سیاسی اور سول قانون کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس قانون کو ان ہندوستانی قانون سازوں نے وضع کیا جنھیں مذہبی مقام بھی حاصل تھا، اس لیے یہ ان کا دستورِ زندگی اور معاشرتی قانون بن گیا۔

اُس وقت ہندوستان بدامنی اور انتشار کا شکار تھا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آگئی تھیں اور ان میں تباہ کن لڑائیوں کی آگ کے شعلے بھڑکتے رہتے تھے۔ یہ خطہ دیگر ممالک میں رونما ہونے والے واقعات سے منقطع اور الگ تھلگ تھا۔ اپنی شان و شوکت بڑھانے کا جنون، رسم و رواج میں مبالغہ آرائی، طبقاتی اختلاف اور نسبی و خاندانی تعصب جیسی بیماریوں کا غلبہ تھا۔ ایک بھارتی مؤرخ، جو بھارت کی ایک یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں، ہندوستان میں اسلام کی آمد سے پہلے کے زمانے کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اہل ہند دنیا سے کٹے ہوئے تھے، اپنے آپ میں مگن تھے، بین الاقوامی حالات کی انھیں کوئی خبر نہ تھی۔ اس جہالت نے ان کی پوزیشن کو کمزور کر دیا، ان میں جمود پیدا ہوگیا تھا، انحطاط و زوال کی علامتیں عام ہونے لگی تھیں۔ اس زمانے کا ادب روح سے خالی تھا اور یہی حالت فنِ تعمیر، مصوری اور دیگر فنونِ لطیفہ کی تھی۔''[1]

ہندوستانی معاشرے پر جمود طاری تھا۔ معاشرتی طبقات میں بہت زیادہ تفاوت تھا، خاندانوں کے درمیان معیوب قسم کے امتیازات تھے۔ بیوہ کو شادی کی اجازت نہ تھی۔ کھانے پینے کے معاملے میں وہ اپنے آپ پر پابندیاں لگا لیتے اور سختیاں جھیلتے۔ اچھوتوں کو شہروں میں رہنے کی اجازت نہ تھی، وہ شہر سے باہر رہتے تھے۔[2]

---

[1] السيرة النبوية للندوي، ص: 38. [2] السيرة النبوية للندوي، ص: 39.

اہل ہند چار طبقات میں منقسم تھے:

① بَرْہَمَن: یہ مذہبی لوگ اور مذہبی رہنما ہیں۔

② کھتری: یہ سپاہی اور جنگ کرنے والے لوگ ہیں۔

③ وِیش: یہ زراعت سے وابستہ اور تجارت پیشہ لوگ ہیں۔

④ شُودَر: یہ خدمت گار لوگ ہیں اور سماج کا سب سے حقیر طبقہ ہیں۔

ہندوؤں کے نظریے کے مطابق خالق کائنات نے شُودَرُوں کو اپنے پاؤں سے پیدا کیا۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ باقی تین طبقات کی خدمت کریں اور انھیں راحت پہنچائیں۔ اس قانون نے برہمنوں کو وہ اہمیت اور مقام دے دیا جس میں کوئی اور ان کا شریک نہیں۔ برہمن کے لیے عام معافی ہے اگرچہ وہ تینوں طبقات کو اپنے گناہوں اور افعال کے ساتھ برباد کردے۔ اس پر کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا جاسکتا اور نہ کسی صورت میں اسے قتل کی سزا دی جاسکتی ہے لیکن شودر کو مال و دولت جمع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ کسی برہمن کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں نہ اسے اپنا ہاتھ لگا سکتے ہیں اور نہ مقدس کتب کی تعلیم حاصل کرسکتے ہیں۔[1]

بعثت نبوی سے پہلے دنیا کی دینی حالت

طلوعِ اسلام سے قبل انسانیت دینی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی لحاظ سے اپنی تاریخ کے انتہائی گھٹیا دور سے گزر رہی تھی۔ زندگی کے ہر شعبے میں عمومی انتشار تھا۔ عقائد و افکار اور نظریات و تصورات پر جاہلی طرزِ عمل کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ ناخواندگی، نفس پرستی، فساد، بے حیائی، سرکشی اور ظلم و تشدد اس جاہلانہ زندگی کے نمایاں خدوخال بن چکے تھے جو اِنسانی دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔[2]

آسمانی مذاہب کی تاثیر ختم ہو چکی تھی یا ختم ہو رہی تھی کیونکہ یہ مذاہب اپنے اندر تحریف

---

[1] منوشاستر، باب:10,9,8,2,1 بحوالہ السیرۃ النبویۃ للندوي، ص:38. [2] الغرباء الأولون للدکتور سلمان العودۃ، ص:57.

اور تغیر وتبدل آ جانے کی وجہ سے اپنی اہمیت کھو چکے تھے۔ مذہب کی ایسی حیثیت نہ رہی تھی کہ یہ خالق کا اپنی مخلوق کے لیے ایک پیغام ہے۔ ان مذاہب کے ماننے والے لا ینحل فکری کشمکش میں کھوئے ہوئے تھے جس کا سبب یہ تھا کہ انسانی افکار اور باطل نظریات ان میں سرایت کر چکے تھے یہاں تک کہ یہ کشمکش انھیں باہمی تباہ کن جنگ و جدال کی جانب لے گئی تھی، مذہبی تحریف سے بچنے والے لوگ بہت کم تھے۔ انھوں نے انسانی دنیا سے الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دی۔ اصلاح سے ناامید ہوکر اور اپنے آپ کو بچانے کے لیے انھوں نے خلوت اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اس طرح بگاڑ بلا استثنا تمام انسانی طبقات اور زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہوگیا۔ قوموں کی مذہبی حالت یہ ہوئی کہ لوگ مرتد ہوگئے یا دین چھوڑ بیٹھے یا انھوں نے دین کو بالکل اختیار ہی نہیں کیا یا پھر آسمانی دین میں تحریف شروع کر دی۔

جہاں تک شرعی قوانین کا تعلق ہے تو لوگوں نے اللہ کی شریعت کو پسِ پشت ڈال دیا، اپنی پسند کے قوانین وضع کیے اور ایسی شریعت بنالی جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی۔ ان کی وضع کردہ شریعت خلافِ فطرت اور عقل سے متصادم بھی تھی۔ اس فساد کو پھیلانے کی قیادت قومی و سیاسی رہنماؤں، راہبوں، پادریوں، چودھریوں اور بادشاہوں نے کی۔ ساری دنیا کفر وشرک کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوب گئی اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ضابطۂ حیات سے بہت دور ہٹ گئی۔

یہودیت: یہودیت رسوم و رواج کا مجموعہ بن گئی تھی جس میں روح تھی اور نہ زندگی کی کوئی رمق۔ یہود اپنے پڑوس میں اور ماتحت رہنے والی قوموں کے عقائد سے متاثر ہوئے، ان کے عقائد کو اپنے اندر پختہ کرلیا اور ان کے جاہلی اور بُت پرستی کے طور طریقے اختیار کر لیے جس کا اعتراف یہودی مؤرخین کو بھی ہے۔[1]

یہودی انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ بت پرستی پر انبیاء کی ناراضی اور غیظ وغضب اس

---

[1] السيرة النبوية للندوي، ص: 20.

بات کی دلیل ہے کہ بت پرستی اسرائیلیوں کے دلوں میں سرایت کر چکی تھی اور مصر سے جلاوطنی کے بعد اور بابل سے واپسی تک اسے جڑ سے نہیں اکھاڑا جاسکا تھا۔ ان لوگوں نے بیہودہ اور مشرکانہ عقائد اختیار کر رکھے تھے۔

تلمود بھی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ یہودیوں کے لیے بت پرستی میں خاص کشش تھی۔[1]

بعثت نبوی سے قبل یہودی معاشرہ عقلی انحطاط اور دینی ذوق کے انتہائی بگاڑ تک جا پہنچا تھا۔ اگر آپ بابلی تلمود کا مطالعہ کریں، جسے یہودی انتہائی مقدس سمجھتے ہیں اور جو چھٹی صدی عیسوی میں یہودیوں کے ہاں متعارف ہوئی، تو آپ اس میں فکری انحطاط، بیہودہ گفتگو، اللہ تعالیٰ کی شان میں جسارتوں، حقائق کو خلط ملط کرنے اور دین و عقل کو کھیل تماشا بنانے کے عجیب و غریب نمونے دیکھیں گے۔[2]

عیسائیت: عیسائیت حد سے تجاوز کرنے والوں کی تحریف اور جاہلوں کی تاویل کی وجہ سے تختۂ مشق بنی ہوئی تھی۔ توحید کا نور اور عبادت الٰہی کا اخلاص مشرکانہ عقائد کے گہرے بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ مسیح کی حقیقت اور فطرت کے بارے میں مصر کے عیسائیوں اور شام و عراق کے عیسائیوں کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ گھر، اسکول اور گرجے ایک دوسرے کے خلاف فوجی کیمپوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ مختلف شکلوں میں بت پرستی مسیحی معاشرے میں پھیل چکی تھی۔ عصرِ حاضر کی تصانیف میں عیسائیت کی تاریخ یوں بیان کی گئی ہے:

''کھلی بت پرستی اگرچہ ختم ہوگئی تھی مگر اس کا قلع قمع نہ ہوسکا کیونکہ وہ دلوں میں پختہ ہو چکی تھی۔ جلد ہی مسیحیت کے لبادے میں بُت پرستی ازسرنو شروع ہوگئی۔ جو لوگ باطل معبودوں اور دیوتاؤں سے لاتعلق ہوکر انھیں چھوڑ چکے تھے انھوں نے کسی اپنے شہید کا

---

[1] السيرة النبوية للندوي، ص:20. [2] السيرة النبوية للندوي، ص:21.

انتخاب کرکے اسے خدائی اوصاف سے نوازا، پھر اس کا مجسمہ بنالیا۔ یوں شرک اور بت پرستی ان مقامی شہداء کی جانب منتقل ہوگئی۔ ابھی ایک صدی ختم نہ ہوئی تھی کہ شہداء اور اولیاء کی عبادت عام ہوگئی اور ایک نئے عقیدے نے جنم لے لیا کہ اولیاء بھی صفاتِ الوہیت کے حامل ہوتے ہیں، اس طرح یہ اولیاء اور بزرگ، اللہ اور انسان کے درمیان ایک ایسا واسطہ بن گئے جو اریسیوں کے عقائد کے مطابق وصف الوہیت کے حامل تھے۔ قرون وسطیٰ کے اولیاء، ورع، طہارت اور تقدس کی علامت بن گئے۔ بت پرستی کے تہواروں کو نئے نام دے دیے گئے۔ 400ء میں سورج دیوتا کا قدیم تہوار عید میلاد المسیح (کرسمس) میں تبدیل ہوگیا۔''[1]

جدید کیتھولک انسائیکلوپیڈیا میں مرقوم ہے کہ چوتھی صدی عیسوی کے آخری رُبع میں یہ عقیدہ عیسائی دنیا کے دل و دماغ میں پختہ ہوگیا کہ اللہ اقانیم ثلاثہ سے مرکب ہے۔ یہی ان کا مسلّمہ رسمی عقیدہ رہا جس پر پوری مسیحی دنیا میں اعتماد کیا جاتا تھا۔ اس عقیدۂ تثلیث کے راز اور اس میں تبدیلی سے پردہ صرف انیسویں صدی عیسوی کے آخری نصف میں اُٹھا۔[2]

عیسائیوں کے درمیان لڑائیوں کے شعلے بھڑکتے رہے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو کافر کہا، ایک دوسرے کا خون بہایا۔ بجائے اس کے کہ بگاڑ کے خلاف جنگ کرتے، اصلاحِ احوال کے لیے کوشش کرتے اور انسانیت کی بھلائی سے لبریز دعوت قوموں کے سامنے پیش کرتے، عیسائی آپس میں ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے۔[3]

مجوسیت: مجوسی زمانۂ قدیم سے طبعی عناصر کی عبادت کے ساتھ معروف ہیں۔ سب سے بڑا عنصر (ان کا معبود) آگ ہے۔ سلطنت فارس کے طول و عرض میں آتش کدے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ آگ کی عبادت میں مشغول رہتے۔ اس کے لیے انھوں نے عبادت گاہیں اور عمارتیں تعمیر کر رکھی تھیں۔ عبادت گاہوں کے اندر خاص آداب اور ضوابط تھے مگر

---

[1] السيرة النبوية للندوي، ص: 23. [2] دائرة المعارف الكاثوليكية: 395/14. [3] فتح العرب لمصر للدكتور محمد أبو حديد، ص: 37,38و48.

عبادت گاہوں سے باہر یہ لوگ پابندی سے آزاد تھے۔ وہ اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گزارتے۔ ان میں اور کسی بے دین میں کوئی فرق نہ تھا۔

ڈنمارک کا ایک مؤرخ اپنی کتاب ''ایران ساسانی عہد میں'' میں بیان کرتا ہے کہ مجوسیوں کے ہاں مذہبی رہنماؤں کا مقام اور ذمہ داریاں کیا تھیں؟ وہ کہتا ہے کہ ان کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ دن میں چار مرتبہ سورج کی پوجا کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ چاند، آگ اور پانی کی بھی عبادت کریں۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ سوتے وقت، بیدار ہوتے وقت، غسل کرتے وقت، جنیو (ان کے ہاں مقدس دھاگہ) پہنتے وقت، کھاتے وقت، چھینک آنے پر، بال منڈاتے وقت، ناخن کاٹتے وقت، قضائے حاجت کے وقت اور چراغ جلاتے وقت مخصوص دعائیں پڑھیں۔ انھیں اس بات کا حکم تھا کہ آگ بجھنے نہ دیں اور نہ ہی آگ اور پانی کا ایک دوسرے سے ملاپ ہونے دیں اور کوئی دھات بھی زنگ آلود ہونے نہ پائے کیونکہ دھاتیں ان کے ہاں مقدس ہوتی ہیں۔

اہل ایران اپنی عبادت میں آگ کی طرف رخ کرتے تھے۔ یزدگرد جو ساسانیوں کا آخری بادشاہ تھا، اس نے ایک مرتبہ سورج کی قسم کھاتے ہوئے یہ الفاظ کہے: ''میں سورج کی قسم اٹھاتا ہوں کہ یہ سب سے بڑا معبود ہے۔''

مجوسی ہر زمانے میں دو خداؤں کے قائل رہے ہیں۔ اور یہ ثنویت یعنی دو خداؤں کو ماننا ان کا امتیازی نشان ہے۔ وہ دو معبودوں کو مانتے تھے۔ ایک نور یا بھلائی کا معبود اور دوسرا اندھیرے یا شر کا معبود۔[1]

بدھ مت: بدھ مت ہندوستان اور وسطی ایشیا میں بت پرستی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ یہ لوگ جہاں جاتے بت ساتھ لے کر جاتے اور عبادت گاہیں تعمیر کرتے، جہاں ٹھہرتے وہاں بدھا کے مجسمے نصب کر دیتے۔

---

[1] إيران في عهد الساسانيين لآرثر كريستنسن، ص: 155 بحواله السيرة النبوية للندوي، ص: 27.

ہندومت: برہمنیت یا ہندومت ہندوستان کا اصل دین ہے۔ اس مذہب کے بے شمار معبود ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی میں اس دین کو عروج حاصل ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندومت اور بدھ مت یکساں طور پر بت پرستی کے مذہب ہیں۔

طلوع اسلام کے وقت بحر اوقیانوس سے بحر الکاہل تک بسنے والی دنیا کے لوگ بت پرستی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ عیسائیت، یہودیت، بدھ مت اور ہندومت بتوں کی تعظیم و تقدیس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں تھے، گویا وہ شرط لگے گھوڑے تھے جو ایک ہی میدان میں دوڑ رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے اس عمومی بگاڑ کی طرف اشارہ فرمایا جو بلا استثنا ہر طبقے اور ہر میدان میں پھیلا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے ایک دن اپنے خطبے میں فرمایا:

«أَلَا إِنَّ رَبِّي أَمَرَنِي أَنْ أُعَلِّمَكُمْ مَّا جَهِلْتُمْ مِّمَّا عَلَّمَنِي يَوْمِي هٰذَا، كُلُّ مَالٍ نَّحَلْتُهُ عَبْدًا حَلَالٌ، وَّ إِنِّي خَلَقْتُ عِبَادِي حُنَفَاءَ كُلَّهُمْ، وَ إِنَّهُمْ أَتَتْهُمُ الشَّيَاطِينُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِينِهِمْ، وَ حَرَّمَتْ عَلَيْهِمْ مَا أَحْلَلْتُ لَهُمْ، وَ أَمَرَتْهُمْ أَنْ يُّشْرِكُوا بِي مَا لَمْ أُنْزِلْ بِهٖ سُلْطَانًا، وَّ إِنَّ اللّٰهَ نَظَرَ إِلٰى أَهْلِ الْأَرْضِ فَمَقَتَهُمْ عَرَبَهُمْ وَ عَجَمَهُمْ إِلَّا بَقَايَا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ»

”متوجہ ہو جاؤ! بے شک میرے رب نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں تمھیں ان باتوں کی تعلیم دوں جن کا تمھیں علم نہیں اور وہ آج اس نے مجھے سکھائی ہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے: ہر وہ مال جو میں کسی بندے کو عطا کر دوں، حلال ہے۔ میں نے اپنے بندوں کو فطرتاً توحید آشنا پیدا کیا ہے، پھر ان کے پاس شیاطین آتے ہیں اور انھیں ان کے دین سے دور کر دیتے ہیں۔ وہ (شیاطین) ان کے لیے وہ چیزیں حرام

باب 2

عرب اقوام اور ان کی تہذیبیں

عرب اقوام

مؤرخین نے عرب اقوام کی تین اقسام بیان کی ہیں، جن سے ان کا نسلی سلسلہ جاری ہوا۔[1]

① **عرب بائدہ:** ان میں عاد، ثمود، عَمالقہ، طَسْم، جَدِیس، اُمیم، جُرہم اور حضرمَوت وغیرہ کے قبائل شامل ہیں۔ اسلام سے قبل ہی ان اقوام کے آثار ناپید اور معدوم ہو چکے تھے۔ ان میں بادشاہی نظام تھا اور ان کی بادشاہت شام اور مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔[2]

② **عرب عاربہ:** یہ وہ عرب ہیں جو یعرُب بن یشجُب بن قحطان کی نسل سے ہیں۔ انھیں قحطانی عرب کہا جاتا ہے۔[3] یہ جنوب میں بسنے والے عرب ہیں۔[4] یمن کے بادشاہ انھی میں سے تھے۔ مَعین، سَبا اور حِمْیَر کی بادشاہت بھی انھی کی تھی۔[5]

③ **عدنانی عرب:** ان کی نسبت عدنان کی طرف ہے جس کا نسب حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام تک پہنچتا ہے۔ یہ عرب مُستعرِبہ کے نام سے معروف ہیں، یعنی وہ لوگ جن میں غیر عربی خون شامل ہوا، پھر عجمی و عربی خون آپس میں مدغم ہو گئے اور عربی لغت نئی مخلوط نسل کی زبان بن گئی۔

---

① فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص:45. ② السيرة النبوية لأبي شهبة، ص:1/46. ③ فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص:45. ④ مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص:98. ⑤ السيرة النبوية لأبي شهبة، ص:1/47.

باب 2

عرب اقوام اور ان کی تہذیبیں

عرب اقوام

مؤرخین نے عرب اقوام کی تین اقسام بیان کی ہیں، جن سے ان کا نسلی سلسلہ جاری ہوا۔[1]

① **عرب بائدہ:** ان میں عاد، ثمود، عَمالقہ، طَسْم، جَدِیس، اُمیم، جُرہم اور حضرمَوت وغیرہ کے قبائل شامل ہیں۔ اسلام سے قبل ہی ان اقوام کے آثار ناپید اور معدوم ہو چکے تھے۔ ان میں بادشاہی نظام تھا اور ان کی بادشاہت شام اور مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔[2]

② **عرب عاربہ:** یہ وہ عرب ہیں جو یعرُب بن یشجُب بن قحطان کی نسل سے ہیں۔ انھیں قحطانی عرب کہا جاتا ہے۔[3] یہ جنوب میں بسنے والے عرب ہیں۔[4] یمن کے بادشاہ انھی میں سے تھے۔ مَعِین، سَبَا اور حِمْیَر کی بادشاہت بھی انھی کی تھی۔[5]

③ **عدنانی عرب:** ان کی نسبت عدنان کی طرف ہے جس کا نسب حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام تک پہنچتا ہے۔ یہ عرب مُستَعرِبہ کے نام سے معروف ہیں، یعنی وہ لوگ جن میں غیر عربی خون شامل ہوا، پھر عجمی و عربی خون آپس میں مدغم ہو گئے اور عربی لغت نئی مخلوط نسل کی زبان بن گئی۔

---

① فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص:45. ② السيرة النبوية لأبي شهبة، ص:1/46. ③ فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص:45. ④ مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص:98. ⑤ السيرة النبوية لأبي شهبة، ص:1/47.

یہ شمالی عرب ہیں جن کا اصل وطن مکہ ہے۔ یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بنو جُرہم سے عربی زبان سیکھی اور اسی خاندان میں ان کی شادی ہوئی۔ آپ کی اولاد نے عربوں ہی کی طرح نشو ونما پائی۔ اولاد اسماعیل میں سے اہم ترین شخصیت نبی کریم ﷺ کے جد اعلی عدنان کی ہے۔ عدنان ہی سے عرب قبائل اور خاندان چلے۔ عدنان کے بعد اس کا بیٹا معدّ، پھر اس کا بیٹا نزار، پھر اس کے دو بیٹے مُضَرْ اور ربیعہ معروف ہوئے۔

ربیعہ بن نزار کی نسل سے وجود میں آنے والوں نے مشرقی عرب کو اپنا مسکن بنایا۔ بنوعبدالقیس بحرین میں، بنوحنیفہ یمامہ میں اور بنوبکر بن وائل بحرین اور یمامہ کے درمیان جا بسے۔ بنوتغلب دریائے فرات عبور کر گئے اور دریائے دجلہ اور فرات کے درمیان الجزیرہ میں قیام پذیر ہوئے۔ بنوتمیم نے بصرہ کے نواح میں سکونت اختیار کی۔[1]

مضر بن ربیعہ کی اولاد میں سے بنو سُلیم قُربِ یثرب (مدینہ) میں ٹھہرے، بنوثقیف نے طائف میں اقامت اختیار کی۔ بنوہوازن نے مکہ کے مشرقی علاقے کو اپنا وطن بنایا، بنواسد نے تیماء کے مشرق سے کوفے کے مغرب تک کے علاقے میں سکونت اختیار کی۔ بنوذبیان اور بنوعبس نے تیماء سے حوران تک کے علاقے کو اپنا مسکن بنایا۔[2]

علمائے انساب اور دیگر اہل علم کی اکثریت نے عربوں کی دو قسمیں بتائی ہیں: عدنانی اور قحطانی۔ جبکہ بعض علماء کی یہ رائے بھی ہے کہ عدنانی اور قحطانی دونوں کا نسب حضرت اسماعیل علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔[3]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب صحیح البخاری میں اس مقصد کے لیے ایک عنوان: باب نسبة اليمن إلى إسماعيل عليه الصلاة والسلام.....) قائم کیا ہے۔ انھوں نے اس باب میں حضرت

---

[1] مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص:99,98. بنوتمیم دراصل نجد اور عراق کے درمیانی علاقے میں آباد ہوئے۔ [2] الطريق إلى المدائن لعادل كمال، ص:40. [3] السيرة النبوية لأبي شهبة، ص:48/1.

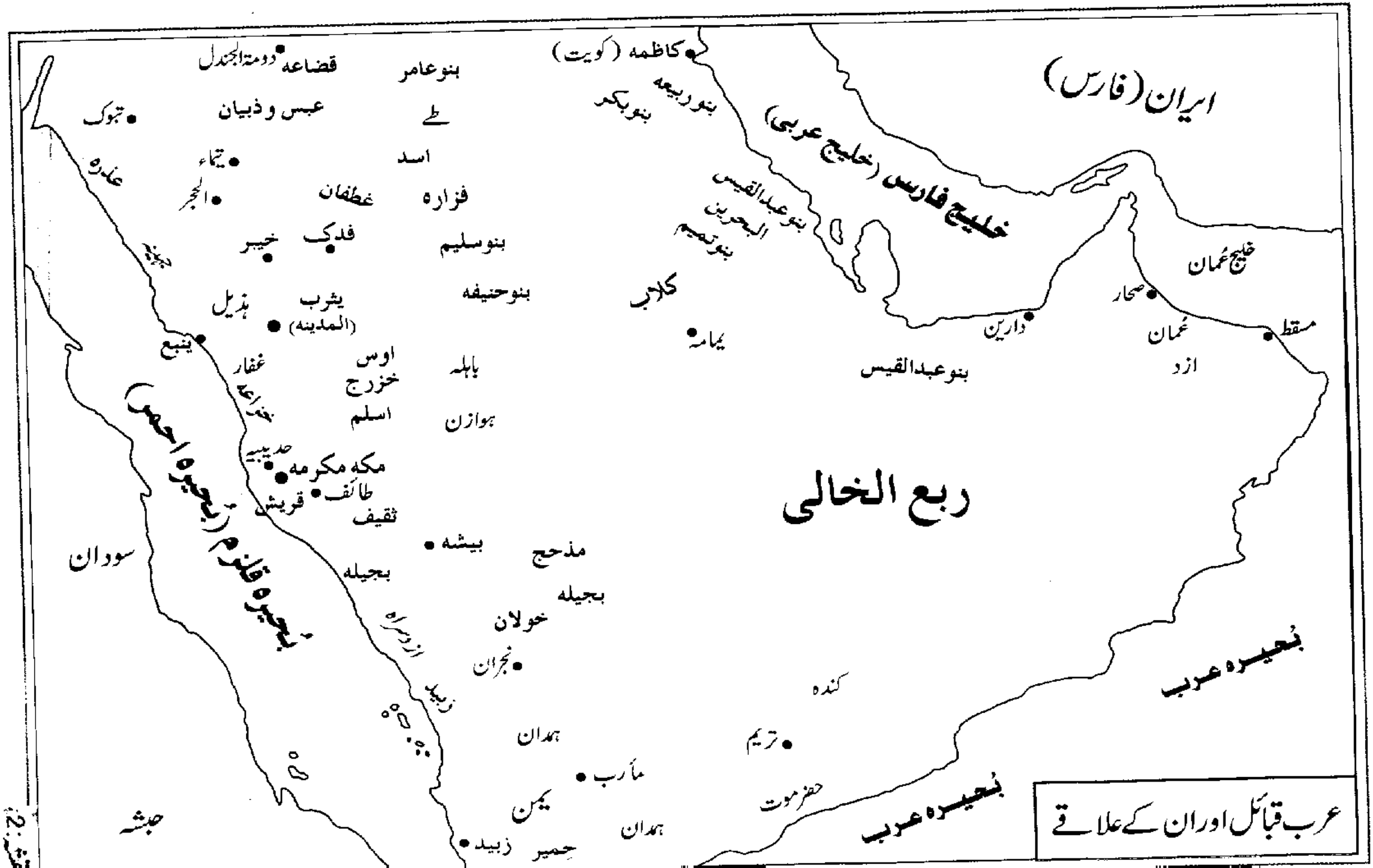
ایران (فارس)
خلیج فارس (خلیج عربی)
خلیج عُمان
مسقط
صُحار
عُمان
ازد
دارین
بنو عبدالقیس
ربع الخالی
بُحیرہ عرب
بُحیرہ عرب
کندہ
تریم
حضرموت
ہمدان
کاظمہ (کویت)
بنو ربیعہ
بنو بکر
بنو عبدالقیس
البحرین
بنو تمیم
کلاب
یمامہ
قضاعہ
دومۃ الجندل
بنو عامر
عبس و ذبیان
طے
تبوک
اسد
تیماء
عذرہ
الحجر
غطفان
فزارہ
فدک
خیبر
بنو سلیم
جہینہ
یثرب
(المدینہ)
ہذیل
بنو حنیفہ
ینبع
غفار
اوس
خزرج
باہلہ
خزاعہ
اسلم
ہوازن
حدیبیہ
مکہ مکرمہ
طائف
قریش
ثقیف
بُحیرہ قلزم (بُحیرہ احمر)
بیشہ
مذحج
سوڈان
بجیلہ
بجیلہ
خولان
ازد سراہ
نجران
زبید
ہمدان
مأرب
یمن
حبشہ
زبید
حمیر

عرب قبائل اور ان کے علاقے

نقشہ: 2

سلمہ ؓ سے ایک روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک قوم کے پاس آئے جو بازار میں تیر اندازی کا مقابلہ کر رہی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِرْمُوا بَنِي إِسْمَاعِيلَ! فَإِنَّ أَبَاكُمْ كَانَ رَامِيًا وَّ أَنَا مَعَ بَنِي فُلَانٍ»

”اے اولادِ اسماعیل! تیر اندازی کرو، تمھارا باپ بھی تیر انداز تھا اور (دو فریقوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:) میں فلاں لوگوں کے ساتھ ہوں۔“ تو دوسرے فریق نے اپنے ہاتھ روک لیے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «مَا لَهُمْ؟» ”انھیں کیا ہو گیا ہے؟“ انھوں نے کہا کہ ہم کیسے تیر چلائیں، آپ تو فلاں لوگوں کے ساتھ ہیں۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا: «اِرْمُوا وَأَنَا مَعَكُمْ كُلِّكُمْ» ”تم تیر چلاؤ، میں تم سب کے ساتھ ہوں۔“[1]

امام بخاری ؒ فرماتے ہیں کہ اسلم بن افصٰی بن حارثہ بن عمرو بن عامر بنوخُزاعہ سے ہے، یعنی بنوخزاعہ سبا کے ان قبائل کا ایک حصہ ہیں جو اللہ کی طرف سے بھیجے گئے سیلاب (سیلِ عَرِم) کی آمد پر بکھر گئے تھے۔[2]

رسول اللہ ﷺ قبیلہ مُضَر میں پیدا ہوئے۔ امام بخاری ؒ نے کُلَیب بن وائل سے روایت بیان کی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی ربیبہ (بیوی کی پہلے خاوند سے بیٹی) زینب بنت ابی سلمہ ؓ سے پوچھا کہ کیا نبی ﷺ مضر قبیلے سے تھے؟ تو انھوں نے کہا: اگر مُضَر قبیلے سے نہیں تھے تو کس قبیلے سے تھے؟ آپ (آلِ مضر میں) نضر بن کنانہ کی اولاد ہی سے ہیں۔“[3]

قریش کنانہ کی نسل سے ہیں اور یہ فہر بن مالک بن نُضر بن کنانہ کی اولاد ہیں۔ قریش کے بہت سے قبائل ہیں۔ مشہور قبائل کے نام یہ ہیں: جُمَح، سہم، عدی، مخزوم، تَیم، زُہرہ اور قُصَی بن کلاب کے خاندان۔ اور وہ یہ ہیں: عبدالدار بن قُصَی، اسد بن عبدالعزیٰ بن قُصَی، عبدمناف بن قُصَی۔

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3507. [2] صحيح البخاري، قبل الحديث: 3507، باب: (4).

[3] صحيح البخاري، حديث:3491.

عبد مناف کے چار بیٹے ہوئے: عبد شمس، نوفل، مطلب اور ہاشم۔ ہاشم کا گھرانہ وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم ﷺ کا انتخاب فرمایا۔[1]

نبی ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اصْطَفٰى كِنَانَةَ مِنْ وَّلَدِ إِسْمَاعِيلَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ، وَاصْطَفٰى قُرَيْشًا مِّنْ كِنَانَةَ، وَاصْطَفٰى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِي هَاشِمٍ، وَاصْطَفَانِي مِنْ بَنِي هَاشِمٍ»

”بے شک اللہ تعالیٰ نے اولاد اسماعیل میں سے کنانہ کا انتخاب فرمایا، پھر کنانہ میں سے قریش کا، پھر قریش میں سے بنو ہاشم کا اور بنو ہاشم میں سے میرا انتخاب فرمایا۔“[2]

جزیرہ نمائے عرب کی تہذیبیں

زمانہ قدیم ہی سے جزیرہ نمائے عرب (Arabian Peninsula) میں اعلیٰ اور عمدہ تہذیب وتمدن نے جنم لیا۔ جزیرہ نمائے عرب کی مشہور تہذیبیں درج ذیل ہیں:

یمن میں سبا کی تہذیب: قرآن حکیم نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اہل سبا نے بارشوں اور سیلابوں کے پانی سے، جو ریت میں جذب ہو جاتا تھا یا سمندر میں جا گرتا تھا، فائدہ اٹھایا اور جدید انجینئرنگ کے اصولوں کے مطابق اس کے لیے حوض اور بند بنائے۔ مشہور ترین بند سد مأرب (مأرب ڈیم) ہے۔[3] انھوں نے اس کا پانی مختلف انواع کے کھیتوں، بلند و بالا درختوں اور لذیذ پھلوں والے باغات کی آبپاشی میں استعمال کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

---

[1] فقہ السیرۃ النبویۃ للدکتور الغضبان، ص: 47. [2] صحیح مسلم، حدیث: 2276. [3] مسعودی کے بقول مأرب کے پاس ایک آبی بند سبا بن یشجب بن یعرب نے بنانا شروع کیا تھا مگر اس کی تکمیل سے پہلے وہ فوت ہو گیا اور پھر حمیر کے بادشاہوں نے اسے مکمل کیا۔ ڈاکٹر محمد عبدالقادر بافقیہ ”تاریخ الیمن القدیم“ میں رقمطراز ہیں: ”مأرب کا عظیم بند اس وادی پر واقع ہے جس کے شمالی دہانے پر مأرب کا شہر بنا ہوا ہے۔ اس وادی کے دہانے پر مکربون (ملوک سبا) کے زمانے میں اہل سبا نے مٹی کی ایک موٹی دیوار کھڑی کی تھی جس کو انھوں نے سیلاب کی جانب سے بڑی بڑی چٹانوں سے ڈھانک دیا تھا۔ اس مٹی کی »

﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۬ ڛ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ○﴾

”سبا (قوم) کے لیے ان کی بستی میں یقیناً ایک عظیم نشانی تھی، دائیں اور بائیں طرف دو باغ تھے، (ہم نے کہا:) تم اپنے رب کے رزق سے کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو، (یہ) پاکیزہ شہر ہے اور رب بڑا بخشنے والا ہے۔“ [1]

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ زمانۂ ماضی میں یمن سے براستہ حجاز، شام تک کے علاقوں میں قریب قریب بستیاں آباد تھیں۔ یمن سے شام تک سفر کرنے والے قافلے کہیں بھی سایہ دار جگہوں اور کھانے پینے کے سامان سے محروم نہیں رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ۭ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ○﴾

”اور ہم نے ان (اہل سبا) کے اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت رکھی تھی، کئی بستیاں باہم متصل (سرِ راہ آباد) رکھی تھیں اور ان میں ہم نے چلنے (آنے جانے) کی منزلیں مقرر کر دی تھیں، (ہم نے کہا:) تم ان میں راتوں اور دنوں کو امن سے سفر کرو۔“ [2]

احقاف میں قوم عاد کی تہذیب: قوم عاد حضر موت کے شمال کی جانب آباد تھی۔ [3] یہ وہی قوم ہے جس کی جانب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔

« دیوار یا بند کی لمبائی 1800 فٹ تھی، اس کی بلندی اس کے آخری دور میں 42 فٹ تک پہنچ گئی تھی۔“ پرانے سد مأرب سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر نیا سد مأرب تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کا افتتاح ستمبر 1987 کو عمل میں آیا۔ (اطلس القرآن اردو (دارالسلام لاہور) ص: 259,258) [1] سبا 15:34. [2] سبا 18:34.

[3] اس عربی قبیلے کی رہائش عُمان اور حضر موت (یمن) کے درمیان ریت کے ٹیلوں والے علاقے احقاف میں تھی۔ یہ علاقہ سمندر کے کنارے پر واقع تھا جو شُحر کے نام سے معروف تھا اور ان کی وادی کا نام مغیث تھا۔ (قصص الأنبیاء (دارالسلام، لاہور)، ص: 107)

یہ قوم بڑے عالی شان مکانات، محلات، باغات، کھیتوں اور چشموں کی مالک تھی۔[1]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاتَّقُوا الَّذِیْٓ اَمَدَّکُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝ۚ اَمَدَّکُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِیْنَ ۝ۙۚ وَجَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ۝ ﴾

”اور تم اس ذات سے ڈرو جس نے تمھیں ان چیزوں میں بڑھایا (امداد دی) ہے جو تم جانتے ہو، اس نے تمھیں بڑھایا ہے مویشیوں اور بیٹوں میں اور باغوں اور چشموں میں۔“[2]

حجاز میں قوم ثمود کی تہذیب: قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ حجر کے علاقے میں ایک تہذیب موجود تھی اور اشارہ کیا ہے کہ وہ پہاڑوں کو تراش کر گھر بنانے جیسی قوتوں کے مالک تھے۔[3] اور ان کے علاقے میں کثرت سے چشمے، باغات اور کھیت موجود تھے۔[4]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَتُتْرَکُوْنَ فِیْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِیْنَ ۝ۙ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ۝ۙ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِیْمٌ ۝ۚ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ ۝ ﴾

”کیا تمھیں یہاں کی چیزوں میں پرامن چھوڑ دیا جائے گا، (یعنی) باغوں اور چشموں میں اور کھیتوں اور کھجوروں میں جن کے خوشے نرم و نازک ہیں اور تم اتراتے ہوئے پہاڑوں سے گھر تراشتے ہو۔“[5]

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 50/1. [2] الشعرآء 26:132-134. [3] قوم ثمود کی رہائش تبوک اور حجاز کے درمیان حجر کے مقام پر تھی جسے مدائن صالح بھی کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ خلیج عقبہ کے مشرق میں واقع شہر، مدین کے جنوب مشرق میں ہے۔ قوم ثمود کے مکانات اس علاقے کے پہاڑوں میں صاف کھدے نظر آتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ تبوک جاتے وقت اس مقام سے گزرے تھے۔ (قصص الانبیاء، دارالسلام، لاہور، ص: 133) [4] السيرة النبوية لأبي شهبة: 51/1.

[5] الشعرآء 26:146-149.

یہ سب کچھ عرصہ دراز سے ختم ہو چکا ہے۔ چند آثار، نشانات اور علامات باقی رہ گئی ہیں۔ بستیاں اور شہر معدوم ہو گئے۔ مکانات و محلات ویران ہو گئے۔ چشمے خشک ہو گئے۔ درخت سوکھ گئے اور کھیتیاں اور باغات بنجر زمین میں تبدیل ہو گئے۔[1]

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة:51/1.

باب 3

عربوں کی دینی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی حالت

عربوں کی دینی حالت

عرب قوم بتدریج شدید قسم کی دینی پسماندگی، بت پرستی، اخلاقی اور معاشرتی بے اعتدالی اور سیاسی و قانونی بدامنی کا شکار ہوگئی جس وجہ سے ان کی اہمیت ختم ہوکر رہ گئی اور وہ تاریخ کے ایک کنارے پر رہ کر الگ تھلگ زندگی گزارنے لگے۔ اپنی حالت کو سنوارنے کے لیے اتنا بھی نہ کرسکے کہ ایرانی یا رومی حکومت کی اتباع کرلیتے۔ ان کے دل اپنے اپنے آباء و اجداد کی میراث کی عظمت سے بھرے ہوئے تھے۔ انھی کے طریقے پر چلنا ان کا مطمحِ نظر تھا، خواہ وہ طریقہ گمراہی، بے اعتدالی اور کجی والا ہی کیوں نہ ہو، اسی وجہ سے انھوں نے بتوں کی پوجا شروع کردی۔ ہر قبیلے کا ایک مخصوص بت تھا۔

بنو ہُذَیل بن مُدرِکہ کا بت سُواع تھا۔ بنو کلب وَدّ نامی بت کو پوجتے تھے۔ بنو مَذْحِج نے یَغوث کو معبود بنا رکھا تھا۔ بنو خَیوان یعوق کے پجاری تھے۔ بنو حمیر کا بت نَسر تھا۔ بنو خُزاعہ اور قُریش اِساف اور نائلہ کی عبادت کرتے تھے۔

مناۃ نامی بت ساحلِ سمندر پر نصب تھا۔ سارا عرب، خاص طور پر اوس و خزرج اس کی تعظیم کرتے تھے۔ لات بنو ثقیف میں پوجا جاتا تھا۔ عُزّیٰ ذاتِ عِرق سے اوپر (وادی نخلہ) کے علاقے میں تھا اور قریش کے ہاں سب سے بڑا اور عظیم بت تھا۔①

---

① الغربا، الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 60.

ان بڑے بڑے بتوں کے ساتھ ساتھ بے شمار چھوٹے چھوٹے بت تھے۔ جنھیں سفر میں ساتھ لے جانا اور گھر میں رکھنا آسان ہوتا تھا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ابورجاء العطاردی سے بیان کیا ہے کہ ہم پتھر کی پوجا کیا کرتے تھے۔ جب ہمیں اس سے عمدہ پتھر مل جاتا تو ہم پہلا پتھر پھینک دیتے اور دوسرا لے لیتے تھے۔ اگر ہمیں کوئی پتھر نہ ملتا تو ہم مٹی کی ایک ڈھیری بناتے، اس پر بکری کا دودھ دوہتے اور اس کا طواف شروع کر دیتے تھے۔[1]

یہی بت پرستی عربوں کے لیے رکاوٹ بن گئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کریں اور صحیح معنی میں اس کی تعظیم و توقیر کریں، نیز اس پر اور یوم آخرت پر ایمان لائیں۔ اگرچہ ان کا خیال تھا کہ یہ ہمارے اور اللہ کے درمیان واسطے ہیں مگر (حقیقت یہ ہے کہ) یہ خودساختہ معبود ان کے دلوں اور اعمال و کردار، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو چکے تھے اور ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی قدر و منزلت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ ۘ وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ○﴾

”حق کو قبول تو صرف وہ کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور جو مردے ہیں، اللہ انھیں اٹھائے گا، پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔“[2]

دین ابراہیم کے باقی ماندہ پیروکار بھی تحریف اور تغیر و تبدّل کا شکار ہو چکے تھے۔ حج ایک ایسا معاملہ بن گیا تھا کہ جس میں وہ خاندانی، نسلی یا اپنے کارہائے نمایاں کے لحاظ سے ایک دوسرے پر فخر کا اظہار کرتے تھے۔ توحید کے عقائد و نظریات اپنی حقیقت کھو چکے تھے اور بہت سی خرافات اور من گھڑت کہانیاں اس میں شامل ہو چکی تھیں۔

کچھ ایسے موحدین ضرور تھے جنھوں نے بت پرستی اور اس سے متعلقہ امور کو ٹھکرا دیا

---

[1] صحیح البخاري، حدیث:4376. [2] الأنعام6:36.

جزیرہ نمائے عرب کی سلطنتیں، قبائل اور مذاہب

(قبل از اسلام)

① عمان، بحرین اور حیرہ کی عربی ریاستیں سلطنت فارس کے ماتحت تھیں۔

② غسانی عرب ریاست سلطنت روم کی باجگزار تھی۔ غسانی دارالحکومت بصریٰ تھا جبکہ دمشق رومی صوبہ شام کا صدر مقام تھا۔ ③ یمن ایران کا ایک صوبہ تھا۔

④ کندہ قبل اسلام کے عربی تمدن کا مرکز اور ایک آزاد ریاست تھی۔ کندہ کا دارالحکومت الفاؤ جو آج چھوٹی سی بستی ہے جزیرہ نمائے عرب کے جنوب سے شمال اور شمال مشرق کو جانے والے قافلوں کی اہم تجارتی شاہراہ پر واقع تھا جو سبا 'معین' قتبان 'حضرموت اور حمیر سے آتے تھے۔ دارالحکومت ہونے کے باعث الفاؤ کی بڑی شہرت تھی۔ یہ سلطنت 100 سال سے زیادہ عرصے تک پھلی پھولی۔ دولت کندہ کے اس عہد عروج میں عظیم شاعر امرؤ القیس نے شہرت پائی۔

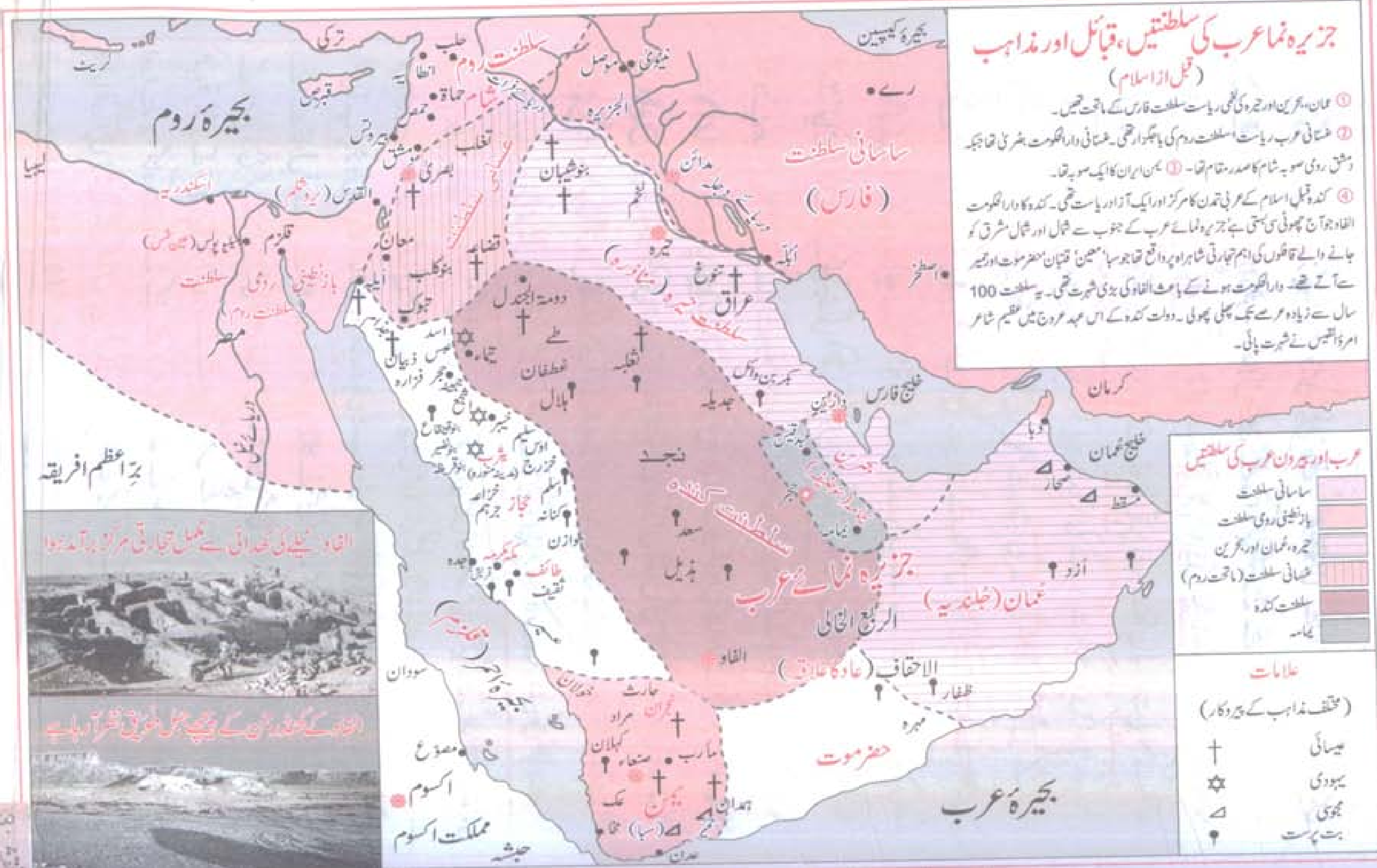
عرب اور بیرون عرب کی سلطنتیں
ساسانی سلطنت
بازنطینی رومی سلطنت
حیرہ، عمان اور بحرین
غسانی سلطنت (ماتحت روم)
سلطنت کندہ
یمامہ
علامات
(مختلف مذاہب کے پیروکار)
عیسائی
یہودی
مجوسی
بت پرست
ساسانی سلطنت
(فارس)
سلطنت روم
بحیرۂ روم
بحیرۂ کیسپین
بحیرۂ عرب
خلیج فارس
خلیج عمان
بحیرۂ احمر
بحر قلزم
برّ اعظم افریقہ
جزیرہ نمائے عرب
سلطنت کندہ
نجد
الربع الخالی
الاحقاف
(عاد و عاد ثانی)
حضرموت
مہرہ
ظفار
عمان (خلندیہ)
ازد
صحار
مسقط
کرمان
اصطخر
رے
نینوی
موصل
الجزیرہ
حلب
انطاکیہ
حماۃ
حمص
بیروت
دمشق
بصریٰ
تغلب
القدس (یروشلم)
قلزم
معان
ایلہ
تبوک
قضاعہ
بنو کلب
دومۃ الجندل
طے
تیماء
غطفان
ہلال
ثعلب
جدیلہ
بکر بن وائل
دارین
ہجر
یمامہ
بنو شیبان
لخم
حیرہ
مدائن
ابلہ
تنوخ
عراق
یثرب (مدینہ منورہ)
خیبر
اوس
خزرج
بنو نضیر
بنو قریظہ
حجاز
اسلم
کنانہ
ہوازن
مکہ مکرمہ
جدہ
طائف
ثقیف
ہذیل
سعد
نجران
حارث
مراد
کہلان
صنعاء
مأرب
ہمدان
یمن
(سبا)
عک
عدن
مخا
مصوع
اکسوم
مملکت اکسوم
حبشہ
سوڈان
مصر
اسکندریہ
لیبیا
قبرص
کریٹ
ترکی
الفاؤ: ٹیلے کی کھدائی سے مکمل تجارتی مرکز برآمد ہوا
الفاؤ کے کھنڈرات کے پیچھے ریگ زار نظر آرہا ہے

تھا۔ ان لوگوں میں ایک زید بن عمرو بن نُفَیل تھے [1] جو بتوں کے نام پر جانور ذبح نہیں کرتے تھے۔ اور نہ مردار اور خون کو حلال سمجھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے:

أَرَبًّا وَّاحِدًا أَمْ أَلْفَ رَبٍّ؟ أَدِينُ إِذَا تُقُسِّمَتِ الْأُمُورُ؟
عَزَلْتُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى جَمِيعًا كَذٰلِكَ يَفْعَلُ الْجَلْدُ الصَّبُورُ
فَلَا عُزّٰى أَدِينُ وَلَا ابْنَتَيْهَا وَلَا صَنَمَيْ بَنِي عَمْرٍو أَزُورُ
وَلَا غَنَمًا أَدِينُ وَ كَانَ رَبًّا لَّنَا فِي الدَّهْرِ، إِذْ حُلْمِي يَسِيرُ
وَلٰكِنْ أَعْبُدُ الرَّحْمٰنَ رَبِّي لِيَغْفِرَ ذَنْبِي الرَّبُّ الْغَفُورُ

”کیا میں ایک رب کی بندگی اختیار کروں یا ہزاروں آقاؤں کی جب امور تقسیم کر دیے جائیں؟ میں نے لات وعُزّٰی سب کو چھوڑ دیا ہے۔ ایک باہمت اور جفاکش کا انداز یہی ہونا چاہیے۔ میں نہ تو عزّٰی کی عبادت کروں گا اور نہ اس کی دونوں بیٹیوں (لات ومناۃ) کی اور نہ ہی بنوعمرو کے دونوں بتوں کی زیارت کروں گا۔ نہ میں غنم کی پوجا کروں گا، اگرچہ ایک عرصہ ہم نے اسے رب بنائے رکھا جس وقت ہم زیادہ دوراندیش نہ تھے۔ میں تو صرف رحمٰن کو اپنا پروردگار بنا کر اس کی عبادت

---

[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ”صحیح“ میں زید بن عمرو بن نفیل کا واقعہ بیان کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ ایک دفعہ زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ سے بلدح کے دامن میں ملے ابھی آپ پر نزول وحی کا آغاز نہ ہوا تھا۔ وہاں جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھانا پیش کیا گیا تو آپ نے اسے تناول فرمانے سے انکار کر دیا۔ پھر زید رضی اللہ عنہ نے بھی کہا کہ میں وہ چیز نہیں کھاتا جو تم اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے ہو۔ میں تو صرف وہی کھاتا ہوں جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو۔ نیز زید بن عمرو قریش کے ذبیحہ پر اعتراض کرتے تھے اور مشرکین کے ان ذبیحوں پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اور اسے بڑا گناہ سمجھتے ہوئے کہتے تھے کہ بکری کو اللہ نے پیدا کیا، اسی نے اس کے لیے آسمان سے پانی اتارا اور اپنی زمین میں گھاس پیدا فرمائی، پھر تم اسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہو؟ (صحيح البخاري، حديث: 3826)

کروں گا تاکہ معاف کر دینے والا رب میرے گناہ معاف فرما دے۔"[1]

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے دین کے پیروکاروں میں سے قُس بن ساعدہ ایادی بھی ہے۔ یہ اپنی قوم کا خطیب، دانا اور سمجھ دار شخص تھا۔ بڑا زیرک اور صاحب فضیلت انسان تھا۔ بت پرستی چھوڑنے اور وحدانیت، یعنی ایک اللہ کی بندگی اختیار کرنے اور اس کی عبادت کرنے کی دعوت دیا کرتا تھا۔ بعث بعد الموت پر ایمان رکھتا تھا۔ اس نے نبی کریم ﷺ کی آمد کی بشارت بھی دی تھی۔ ابو نُعیم نے اپنی کتاب دلائل النبوہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ قُس بن ساعدہ اِیادی نے عُکاظ کے میلے میں اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: "اس جانب سے (اپنے ہاتھ سے مکہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) حق نمودار ہوگا۔" لوگوں نے پوچھا: "وہ حق کیا ہے؟" اس نے جواب دیا: "لؤی بن غالب کی نسل سے ایک آدمی تمھیں کلمۂ توحید، غیر فانی زندگی اور لازوال نعمتوں کی جانب بُلائے گا، اگر وہ تمھیں دعوت دے تو اس کی دعوت کو قبول کرنا۔ اگر مجھے معلوم ہو کہ میں اس کی بعثت تک زندہ رہوں گا تو میں پہلا شخص ہوں گا جو اس کی جانب بڑھ کر اس کی دعوت قبول کرے گا۔" قُس نے نبی ﷺ کا زمانہ تو پایا مگر آپ کی بعثت سے قبل ہی فوت ہو گیا۔[2]

وہ اپنے یہ شعر پڑھا کرتا تھا:

فِي الذَّاهِبِينَ الْأَوَّلِيـ نَ مِنَ الْقُرُونِ لَنَا بَصَائِرْ
لَمَّا رَأَيْتُ مَوَارِدًا لِّلْمَوْتِ لَيْسَ لَهَا مَصَادِرْ
وَ رَأَيْتُ قَوْمِي نَحْوَهَا يَمْضِي الْأَصَاغِرُ وَالْأَكَابِرْ
لَا يَرْجِعُ الْمَاضِي إِلَـ يَّ وَلَا مِنَ الْبَاقِينَ غَابِرْ
أَيْقَنْتُ أَنِّي لَا مَحَالَةَ حَيْثُ صَارَ الْقَوْمُ صَائِرْ

---

[1] السيرة النبوية لابن كثير: 163/1. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 80/1.

> ”گزشتہ نسلوں کے (اس دنیا سے) چلے جانے میں ہمارے لیے بے شمار عبرتیں ہیں۔ جب میں نے دیکھا کہ موت کے راستوں سے واپسی کا کوئی ذریعہ نہیں اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ میری قوم کے چھوٹے بڑے سب اس (موت) کی طرف جا رہے ہیں۔ نہ تو جانے والا میری طرف پلٹتا ہے اور نہ باقی رہنے والا (موت سے) بچتا ہے تو میں نے یقین کر لیا کہ میں بھی اس (آخرت کی) طرف جانے والا ہوں جس کی طرف (مرنے والے) لوگ جا چکے ہیں۔“ [1]

کچھ عربوں نے عیسائیت اختیار کر لی تھی اور کچھ نے یہودیت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا مگر ان میں سے اکثر بتوں کے پجاری تھے۔

عربوں کی سیاسی حالت

جزیرہ نمائے عرب کے لوگ متمدن اور غیر متمدن دو حالتوں میں منقسم تھے اور ان میں قبائلی نظام رائج تھا۔ یہ نظام جزیرہ نمائے عرب کے جنوب میں مملکتِ یمن، شمال مشرق میں سلطنتِ حیرہ اور شمال مغرب میں غسانی ریاست جیسی تہذیب یافتہ مملکتوں میں رائج تھا۔ یہ سب عربی قبائل ایک قوم میں تو نہ ڈھل سکے، البتہ ایک مربوط اتحاد کی شکل اختیار کر گئے۔ عرب قوم لوگوں کا ایک ایسا اتحاد تھی جنھیں نسب اور نسل کی وحدت آپس میں جوڑے ہوئے تھی۔ اسی وحدت سے اس رسمی قانون نے جنم لیا جو فرد اور جماعت کے مابین رشتوں کو ان کے حقوق و فرائض کے باہمی ربط کی بنیاد پر منظم کرتا تھا اور عرب قوم اپنے سیاسی و معاشرتی نظام میں اسی رسمی قانون کو مضبوطی سے اختیار کیے ہوئے تھی۔ [2]

قبائلی مقام و مرتبہ، شجاعت، جوانمردی اور سخاوت جیسے ذاتی اوصاف قبیلے کے سردار کو قیادت کا اہل ثابت کرتے تھے۔ قبائلی سردار کو سماجی اور مالی حقوق حاصل ہوتے تھے۔ سماجی حقوق میں سے اہم ترین امور یہ تھے:

---

[1] السیرة النبویة لأبي شهبة:81/1. [2] السیرة النبویة لأبي شهبة:60/1.

قبائلی سردار کی تعظیم و تکریم کی جاتی۔

اس کے حکم کی تعمیل ہوتی۔

اسے اپنا قاضی و جج تسلیم کیا جاتا۔

سردار کے مالی حقوق میں یہ چیزیں شامل تھیں:

مال غنیمت میں سے اسے ایک چوتھائی حصہ ملتا تھا۔

اسے یہ حق تھا کہ مال غنیمت کی تقسیم سے قبل جو چیز چاہے اپنے لیے پسند کر لے۔

جنگ سے قبل دشمن کا جو مال ہاتھ لگ جاتا اس پر سردار کے سوا کسی کا حق نہ تھا۔

مال غنیمت میں جو چیز ناقابل تقسیم ہوتی اس پر بھی سردار کا حق تھا۔

ایک عربی شاعر نے اسے بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے:

> ”(اے سردار!) تجھے مال غنیمت کا چوتھائی حصہ دینا، تجھے تیری پسندیدہ چیز دینا، تیرا حکم ماننا، جنگ سے قبل حاصل ہونے والا دشمن کا مال تیرے حوالے کرنا اور ناقابل تقسیم اشیاء تیرے سپرد کر دینا ہمارے فرائض میں ہے۔“[1]

ان حقوق کے مقابلے میں سردار کے بھی کچھ فرائض اور ذمہ داریاں ہوتی تھیں۔ وہ حالتِ امن میں مجسمۂ جود و سخا ہوتا اور حالتِ جنگ میں سب سے آگے رہتا، عہد و پیمان اور صلح کے معاہدے کرتا۔

قبائلی نظام میں حریت یا آزادی ہر چیز پر غالب تھی۔ ایک عربی آزاد فضا اور آزاد معاشرے میں جنم لیتا اور اس میں نشوونما پاتا تھا، اسی وجہ سے آزادی عربوں کی اہم خصوصیات میں سے ہے۔ وہ آزادی کو عشق کی حد تک چاہتے تھے۔ ظلم و ذلت تسلیم نہیں کرتے تھے۔ قبیلے کا ہر فرد اپنے قبیلے کی خاطر انتقام لیتا، اس کے کارہائے نمایاں کو بلند کرتا، اس کی تاریخ روشن کرتا اور قبیلے کے ہر فرد کی مدد کرتا، خواہ وہ حق پر ہوتا یا باطل پر،

---

[1] مكة والمدينة في الجاهلية و عصر الرسول ﷺ للأستاذ أحمد الشريف، ص:31.

یہاں تک کہ ان کا بنیادی اصول بن گیا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ ایک شاعر کہتا ہے:

> ”(اہل عرب تو ایسے ہیں کہ) جب ان کا بھائی کسی مصیبت میں انھیں مدد کے لیے پکارتا ہے تو یہ اس سے کسی دلیل کا تقاضا نہیں کرتے۔“

قبیلے کا ہر فرد جماعت کے تابع ہوتا تھا۔ اپنی جماعت کی رائے پر کاربند رہنے کا جذبہ اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ فرد اپنے وجود کو جماعت کے وجود میں گم کر دیتا تھا۔ دُرید بن صِمَّہ کہتا ہے:

> ”میری حیثیت تو صرف یہ ہے کہ میں (قبیلہ) غُزِیَّہ کا ایک فرد ہوں۔ اگر وہ غلط راستہ اختیار کرے تو میں بھی وہی راستہ اختیار کروں گا۔ اگر وہ صحیح راستے پر چلے تو میں بھی صحیح راستہ اختیار کروں گا۔“ [1]

عرب قبائل میں سے ہر قبیلے کا ایک سیاسی مقام تھا۔ اپنی اسی سیاسی حیثیت سے وہ دوسرے قبائل سے معاہدے کرتا اور اسی لحاظ سے اس پر جنگ مسلّط کی جاتی۔ عرب قبائل کے مابین ہونے والے معاہدوں میں مشہور ترین معاہدہ حلف الفضول کا ہے۔ [2]

قبائل کے مابین لڑائیاں بڑی طویل اور شدید ہوتی تھیں۔ ان میں مشہور ترین لڑائی حربِ فجار ہے۔ ان بڑی لڑائیوں کے علاوہ بھی قبائل میں لوٹ مار کے واقعات ہوتے رہتے تھے جو شخصی وجوہات کی بنا پر ہوتے تھے یا آسائشِ زندگی کے حصول کے لیے۔ کچھ قبائل تو ایسے تھے جن کی روزی کا بیشتر حصہ تلوار کی دھار میں پوشیدہ ہوتا تھا۔ اس وجہ سے ہر قبیلے پر یہ خوف طاری رہتا تھا کہ کوئی دوسرا قبیلہ دن یا رات کے کسی بھی لمحے میں ان کے مال مویشی چھیننے کے لیے معاہدہ توڑ سکتا ہے اور ان کی آبادیوں کو یوں برباد کر سکتا ہے

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 61/1. [2] دراسة تحليلية لشخصية الرسولﷺ للدكتور قلعجي، ص: 31.

جیسے وہاں کوئی آباد ہی نہ تھا۔ [1]

عربوں کی اقتصادی حالت

جزیرہ نمائے عرب کا اکثر علاقہ وسیع اور دور تک پھیلے ہوئے صحراؤں پر مشتمل ہے، اس لیے وہاں زراعت نہ ہوسکی، سوائے اطراف واکناف کے علاقوں کے، خاص طور پر یمن اور شام کے علاقوں میں زراعت بہت اچھی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں کچھ نخلستان ہیں جو جزیرہ نمائے عرب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دیہاتی زندگی میں بڑا کام اونٹوں اور بکریوں کا پالنا تھا۔ گھاس (اور چارے) کی تلاش میں قبائل سرگردان رہتے تھے۔ اپنے خیموں کے سوا ان کے لیے کہیں قرار نہ تھا۔

صنعت وحرفت کے میدان میں عرب سب اقوام سے پیچھے تھے۔ وہ صنعت وحرفت کو حقیر سمجھتے تھے، اس لیے صنعت وحرفت کا کام عجمیوں اور غلاموں کے سپرد کیے ہوئے تھے، یہاں تک کہ جب بیت اللہ کی تعمیر کا معاملہ پیش آیا تو بھی ایک قبطی آدمی سے معاونت لی گئی جو جدّہ کے پاس سمندر میں ڈوب جانے والے جہاز سے زندہ بچ گیا تھا اور مکہ میں مستقل رہائش اختیار کر چکا تھا۔ [2]

جزیرہ نمائے عرب اگرچہ زراعت اور صنعت کی نعمتوں سے محروم تھا مگر افریقیہ (شمالی افریقہ) اور مشرق میں ایشیا کے درمیان ایک اہم اور مناسب جغرافیائی محل وقوع نے اسے اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اس دَور کی بین الاقوامی تجارت کی ایک کامیاب منڈی بن گیا۔

جزیرہ نمائے عرب کے وہ لوگ جو تجارت سے منسلک تھے ان کا تعلق شہری آبادی سے تھا، خاص طور پر اہلِ مکہ کو تجارت میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ چونکہ وہ سرزمینِ حرم کے رہنے والے تھے، اس لیے عربوں کے دلوں میں ان کی بڑی قدر ومنزلت تھی۔ اسی وجہ سے

---

[1] دراسة تحليلية لشخصية الرسولﷺ للدكتور قلعجي، ص: 33-35. [2] فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 60.

وہ مکہ والوں کے ساتھ بُرائی سے پیش آتے نہ ان کی تجارت میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اہلِ مکہ پر اس بات کا احسان یوں جتلایا ہے:

﴿اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّا جَعَلۡنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنۡ حَوۡلِہِمۡ ؕ﴾

”کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک ہم نے حرم (مکہ) کو پرامن بنایا ہے، جبکہ لوگ اس کے اردگرد سے اچک لیے جاتے ہیں۔“[1]

قریش کے دو بڑے تجارتی قافلے مشہور تھے۔ ایک موسم سرما میں یمن کی طرف جاتا تھا اور دوسرا موسم گرما میں شام کی طرف۔ قریش بڑا پُرامن سفر کرتے تھے، جبکہ ان کے اردگرد سے لوگ اغوا ہو جایا کرتے۔ یہ دونوں تجارتی قافلے ان تجارتی قافلوں کے علاوہ تھے جو سارا سال جاری رہتے تھے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ۙ○ اٖلٰفِہِمۡ رِحۡلَۃَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیۡفِ ○﴾

”قریش کے مانوس ہونے کی وجہ سے۔ (یعنی) ان کے سردی اور گرمی کے سفر سے مانوس ہونے کی وجہ سے۔“[2]

تجارتی قافلے لوبان، عود (خوشبوؤں کے لیے آگ میں جلانے والی اشیاء)، گوند، گرم مسالے، کھجوریں، عطریات، لکڑی کا سامان، ہاتھی دانت، آبنوس، پتھر کے نگینے، چمڑا، یمنی چادریں، ریشمی لباس اور اسلحہ وغیرہ، جو عرب میں ملتا تھا یا باہر سے درآمد کیا جاتا تھا، حاصل کرتے اور شام اور فلسطین لے جاتے، پھر وہاں سے گندم، اناج، منقّٰی، زیتون اور شام کے بنے ہوئے کپڑے لے کر آتے۔

یمنی لوگ تجارتی کاروبار میں مشہور تھے۔ ان کی تجارتی سرگرمیاں برّی اور بحری دونوں علاقوں میں تھیں۔ وہ افریقیہ کے ساحلوں تک سفر کرتے تھے اور ایشیائی ممالک میں ہندوستان، سوماٹرا (انڈونیشیا) اور بحرِ ہند کے جزائر کا سفر اختیار کرتے۔ اسلام قبول کرنے

---

[1] العنکبوت 29:67. [2] القریش 106:1,2.

کے بعد ان علاقوں میں دین اسلام کی نشر و اشاعت میں یمنیوں کا بہت بڑا کردار ہے۔

جزیرہ نمائے عرب میں سودی لین دین بھی عام تھا۔ شاید یہ ہلاکت خیز وبا یہودیوں سے عربوں کی جانب آئی ہو۔[1]

بڑے بڑے لوگ سودی کاروبار کرتے تھے۔ بعض اوقات شرح سود سو فیصد بھی ہو جاتی تھی۔[2]

عرب میں کئی مشہور منڈیاں اور بازار لگتے تھے، مثلاً: عکاظ، مَجَنَّہ، ذُوالمجاز۔ مکہ کے بارے میں بعض مؤلفین نے ذکر کیا ہے کہ عرب لوگ ذوالقعدہ کے آغاز میں عکاظ کا تجارتی بازار لگاتے، پھر ذوالقعدہ کے بیس دن گزرنے کے بعد مَجَنَّہ چلے جاتے اور ذوالحجہ کا چاند نظر آتے ہی ذوالمجاز کا رُخ کرتے۔ وہاں آٹھ راتیں قیام کرتے، پھر میدانِ عرفات چلے آتے۔ عرفات اور منیٰ کے ایام میں وہ خرید و فروخت نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ اسلام نے اسے جائز قرار دیا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ ﴾

”تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم (حج کے دوران) اپنے رب کا فضل تلاش کرو، پھر جب تم عرفات سے لوٹو تو مشعرالحرام کے پاس اللہ کو یاد کرو۔“[3]

زمانۂ اسلام میں بھی یہ بازار یا میلے ایک عرصے تک برقرار رہے، پھر آہستہ آہستہ ختم ہوگئے۔ یہ محض تجارتی بازار نہ تھے بلکہ شعر و ادب اور خطابت کے مراکز بھی تھے۔ بڑے بڑے شعراء اور فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کرنے والے خطیب ان میلوں میں جمع ہوتے۔ وہ اپنے حسب نسب اور آباء و اجداد اور قبیلے کے قابل تحسین کارہائے نمایاں کا ذکر اور اظہارِ فخر میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے۔ اس طرح یہ بازار کاروبار کے فروغ

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 1/98-101. [2] دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص: 19. [3] البقرة 2:198.

کے ساتھ ساتھ عربی زبان و ادب کو بھی قیمتی سرمایہ فراہم کرتے تھے۔ [1]

عربوں کی معاشرتی حالت

عربوں کی زندگی پر رسم و رواج اس طرح غالب تھے کہ وہ امورِ حیات میں رسمی قانون کی حیثیت اختیار کر چکے تھے، خواہ اُن امور کا تعلق ان کے حسب نسب سے ہو یا قبائل کے باہمی تعلقات سے، یا افراد کے باہمی میل ملاپ سے۔ اُن کی معاشرتی حالت کو اجمالاً یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

① **حسب نسب کی بنیاد پر اظہارِ فخر:** عرب اپنے نسب کو محفوظ بنانے کی انتہائی کوشش کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے سوا کسی دوسری قوم سے سُسرالی رشتہ قائم نہیں کرتے تھے۔ اسلام نے اس چیز کو ختم کیا اور واضح کیا کہ باہمی شرف و منزلت کی بنیاد صرف تقویٰ اور نیک عمل ہے۔

② **شعر و کلام کی برتری اور اس کا اظہار:** فصیح کلام اور بلیغ انداز عربوں کے دلوں کو موہ لیتا تھا اور شاعری ان کے قابل فخر کارناموں اور حسب نسب کی دستاویز ہوتی تھی۔ ان کے علوم کا ذخیرہ اور جذبات و میلانات کے اظہار کا ذریعہ بھی یہی شاعری ہوتی تھی، اسی لیے ان میں فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کرنے والے خطباء اور بہترین شعراء کا پیدا ہونا کوئی تعجب انگیز نہیں تھا۔ صرف ایک شعر قبیلے کی شان بلند کر دیتا تھا اور کبھی کبھار ایک ہی شعر کسی قبیلے کی ذلت کے لیے کافی ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قبیلے میں ایک شاعر کے پیدا ہونے پر وہ اس قدر خوش ہوتے کہ کسی اور چیز پر انھیں اتنی خوشی نہ ہوتی تھی۔

③ **عرب معاشرے میں عورت کا مقام:** اکثر قبائل میں عورت حقیر ساز و سامان کی طرح تھی اور بطور ترکہ تقسیم ہوتی تھی۔ بڑے بیٹے کا یہ حق تھا کہ اپنے باپ کی وفات کے بعد اس کی منکوحہ (اپنی سوتیلی ماں) سے شادی کر لے یا اسے کہیں اور شادی کرنے سے روک

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 102/1.

دے۔ اسلام نے سوتیلی ماں سے شادی کو حرام قرار دیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان نازل ہوا:

﴿وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾

”اور جن عورتوں سے تمھارے باپوں نے نکاح کیا ہو، ان سے تم نکاح نہ کرو۔“ [1]

عربوں کے ہاں حقیقی ماں، صلبی بیٹی، بہنوں، خالہ اور پھوپھی سے نکاح کرنا حرام تھا۔ [2]

اہل عرب بیٹیوں، بیویوں اور چھوٹے بچوں کو میراث نہیں دیتے تھے۔ صرف اسی شخص کو میراث دیتے تھے جو مالِ غنیمت حاصل کرتا ہو اور گھوڑے پر سوار ہو کر لڑ سکتا ہو۔ بچوں اور عورتوں کی میراث سے محرومی کے ضابطے پر عمل ہوتا رہا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں حضرت اوس بن ثابت ؓ کا انتقال ہوا۔ ان کی اولاد میں دو بیٹیاں تھیں جو کہ خوبصورت نہ تھیں اور ایک چھوٹا بیٹا تھا۔ اُوس بن ثابت ؓ کے چچا کے دو بیٹے تھے جو ان کے عصبہ تھے، انھوں نے تمام میراث لے لی۔ اوس بن ثابت ؓ کی بیوہ نے ان سے کہا کہ دونوں بیٹیوں سے شادی کر لو تو انھوں نے ان کے خوبصورت نہ ہونے کی وجہ سے انکار کر دیا۔ اوس بن ثابت ؓ کی بیوہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور عرض کرنے لگی کہ اللہ کے رسول! میرا خاوند فوت ہو گیا ہے، اس کا ایک چھوٹا بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ اوس کے چچا زاد بھائیوں سُوَید اور عُرفُطَہ نے ساری میراث لے لی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ اوس کی دونوں بیٹیوں سے شادی کر لو مگر وہ نہیں مانے۔ تو آپ ﷺ نے ان دونوں کو پیغام بھیجا کہ میراث میں سے کوئی بھی چیز دوسری جگہ منتقل نہ کرنا۔ [3]

تب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝﴾

---

[1] النسآء 4:22. السيرة النبوية لأبي شهبة: 1/87. [2] دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص: 22-24. [3] تفسير القرطبي: 5/45.

”مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے اس مال میں جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں، (یہ چھوڑا ہوا مال) تھوڑا ہو یا زیادہ، اس میں ہر ایک کا مقرر کیا ہوا حصہ ہے۔“ [1]

عربوں کے لیے بیٹیاں باعثِ عار تھیں کیونکہ بیٹی جنگ کے لیے جا سکتی تھی نہ حملے کی صورت میں مرکز کا دفاع کر سکتی تھی اور نہ مردوں کی طرح محنت کر کے مال کما سکتی تھی۔ اور اگر دشمن کی قید میں چلی جاتی تو کئی ہاتھوں کا کھلونا بن جاتی بلکہ بعض اوقات اسے عصمت فروشی پر مجبور کیا جاتا اور اس کا آقا عصمت فروشی سے حاصل ہونے والے مال کے ساتھ اپنی دولت میں اضافہ کرتا۔ یہ بات عربوں کے ہاں کوئی جرم نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اگر کسی کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی تو وہ باپ کے لیے غم، پریشانی اور شرمندگی کا سبب بنتی۔ قرآن حکیم نے ہمیں اس شخص کی کیفیت بتائی ہے جس کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝﴾

”اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی بشارت دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غم و غصے سے بھرا ہوتا ہے۔“ [2]

اکثر تو یہی فیصلہ کرتے کہ بیٹی کو زندہ مٹی میں دبا دیں۔ اس کا جرم اس کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ وہ لڑکی ہے۔ [3]

اس لیے قرآن حکیم نے ان کے اس رویے کی سخت مذمت کی ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝﴾

”اور جب زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا، کس گناہ کی وجہ سے وہ قتل کی گئی؟“ [4]

---

[1] النسآء 7:4. [2] النحل 58:16. [3] دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص:26,25. [4] التكوير 9,8:81.

بعض عرب لوگ اپنی اولاد کو فقر و فاقہ یا اس کے اندیشے ہی سے قتل کر دیا کرتے تھے۔ اسلام نے اسے بھی حرام قرار دیا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ﴾

''اور اپنی اولاد کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں بھی اور انھیں بھی رزق دیتے ہیں۔''[1]

اور قبائل میں سے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اس منحوس فعل کو بہت قبیح سمجھتے تھے اور وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور نہیں کرتے تھے۔ ان میں سے ایک زید بن عمرو بن نفیل تھے۔[2]

بعض قبائل عورت کا احترام بھی کرتے تھے۔ شادی کے معاملات میں اس سے رائے لیتے تھے۔ آزاد عرب عورت اپنے شوہر کے سوا کسی اور کی آغوش کو نہایت ناپسند کرتی تھی۔ عورتوں میں بھی شجاعت کے جوہر پائے جاتے تھے۔ وہ جنگ کرنے والے مردوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں جاتیں، لڑائی کے لیے ان کے جذبات کو ابھارتیں اور بوقت ضرورت جنگ میں عملی طور پر شریک بھی ہوتیں۔ دیہاتی عرب عورت اپنے خاوند کے ساتھ مل کر جانوروں کی دیکھ بھال کرتی اور انھیں پانی پلانے کے لیے لے جاتی۔ روئی اور اون کاتتی، کپڑے بُنتی، چادریں اور لباس بناتی مگر عزت و ناموس پر آنچ نہ آنے دیتی۔[3]

④ **نکاح:** عربوں کے ہاں کئی قسم کے نکاح رائج تھے۔ ان میں سے کوئی بھی طریقۂ نکاح اختیار کر لیا جاتا تھا اور اسے عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔ سیدہ عائشہ ؓ نے ان اقسام کا ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں:

''جاہلیت میں چار قسم کے نکاح تھے۔ ایک نکاح تو وہی تھا جو آج کل لوگ کر رہے ہیں۔ ایک شخص کسی دوسرے کو اس کی بیٹی یا اس کے زیر کفالت لڑکی سے شادی کرنے کا پیغام بھیجتا، پھر (اس کی رضامندی کے بعد) اسے مہر دے کر اس سے نکاح کر لیتا۔

---

[1] الأنعام 151:6. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة:92/1. [3] السيرة النبوية لأبي شهبة:88/1.

دوسرا طریقۂ نکاح یہ تھا کہ عورت جب حیض سے پاک ہو جاتی تو اس کا خاوند اس سے کہتا کہ فلاں شخص سے ازدواجی تعلقات قائم کرو اور خود اس سے الگ ہو جاتا اور ازدواجی تعلق برقرار نہ رکھتا، پھر جب دوسرے شخص سے اس کا حاملہ ہو جانا واضح ہو جاتا تو خاوند اگر چاہتا تو اس سے ازدواجی تعلق قائم کر لیتا۔ یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا جاتا تھا تاکہ پیدا ہونے والا بچہ اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہو (اس مقصد کے لیے اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک شخص کا انتخاب کیا جاتا تھا) اس نکاح کو نکاح اِستِبضَاع (اعلیٰ نسل کی اولاد کے حصول کا ذریعہ) کہا جاتا تھا۔

تیسرا نکاح یہ تھا کہ مردوں کی جماعت جن کی تعداد دس سے کم ہوتی تھی ایک عورت سے ازدواجی تعلقات قائم کرتے۔ جب بچے کی پیدائش ہوتی تو وہ عورت ان تمام مردوں کو بلاتی اور کوئی مرد آنے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ جب سب مرد اس کے ہاں جمع ہو جاتے تو وہ ان سے کہتی کہ تمھارا میرے ساتھ جو تعلق تھا تم اس سے بخوبی واقف ہو۔ میرے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے، پھر جس مرد کا وہ چاہتی نام لے کر کہتی کہ یہ بچہ تمھارا ہے۔ اس طرح اس بچے کا نسب اس مرد سے جوڑ دیا جاتا اور وہ مرد اس کا انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

چوتھا طریقۂ نکاح یہ تھا کہ بعض عصمت فروش عورتیں اپنے گھروں کے باہر بطور علامت جھنڈے لگا دیا کرتی تھیں۔ بہت سے لوگ ان کے پاس (بدکاری کے لیے) آتے۔ وہ کسی کو نہ روکتیں، ہر کوئی ان کے پاس آ سکتا تھا۔ جب ان میں سے کسی عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تو اس عورت کے پاس آنے والے تمام مردوں کو جمع کیا جاتا اور ایک قیافہ شناس کو بلایا جاتا جو بچے اور باپ کی مشابہت دیکھ کر فیصلہ کرتا، پھر جس شخص کے بارے میں وہ فیصلہ کر دیتا، اس بچے کا نسب اس کے ساتھ ملا دیا جاتا۔ اسے اسی کی اولاد سمجھا جاتا اور وہ شخص راہ فرار اختیار نہیں کر سکتا تھا۔

جب محمد رسول اللہ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا گیا تو آپ نے جاہلیت کے تمام

نکاحوں کو ختم کر دیا، صرف اس طریقۂ نکاح کو باقی رکھا جس پر آج لوگ عمل کر رہے ہیں۔“ [1]

بعض علماء نے نکاح کی کچھ اور اقسام بھی بیان کی ہیں جن کا تذکرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نہیں کیا۔ ان میں سے ایک طریقہ خفیہ دوستی کا تھا جس کی طرف اس فرمان الٰہی میں اشارہ موجود ہے:

﴿وَلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ﴾

”اور نہ چھپے یار بنانے والیاں ہوں۔“ [2]

لوگ کہا کرتے تھے یہ دوستی (آشنائی) چھپی رہے تو کوئی حرج نہیں لیکن ظاہر ہو جائے تو باعثِ ملامت ہے۔ اس طریقۂ نکاح کو نکاح کے بجائے زنا کہنا زیادہ درست ہے۔

ایک طریقہ نکاحِ مُتعہ کا تھا۔ یہ نکاح محدود مدت کے لیے کیا جاتا تھا۔

ایک طریقہ نکاح بدل کا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں ایک آدمی دوسرے سے کہتا کہ تم میری خاطر اپنی بیوی سے دستبردار ہو جاؤ۔ میں تمھارے لیے اپنی بیوی سے دستبردار ہو جاتا ہوں بلکہ اس سے بڑھ کر تجھے کچھ مال بھی دوں گا۔ [3]

باطل نکاحوں میں سے ایک وٹہ سٹہ کا نکاح بھی تھا کہ ایک آدمی اپنی بیٹی (یا زیر ولایت لڑکی) کا نکاح دوسرے شخص سے اس شرط پر کرتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی (یا زیر ولایت لڑکی) کا نکاح پہلے شخص سے کر دے گا، (اس شرط کے سوا) ان کے درمیان کوئی حق مہر نہ ہوتا تھا۔ [4]

عربوں کے ہاں (ایک آدمی کے) نکاح میں دو بہنوں کا یکجا ہونا جائز تھا۔ وہ اسے بھی جائز سمجھتے تھے کہ ایک آدمی اپنے نکاح میں بغیر کسی تعداد کی پابندی کے جتنی عورتیں چاہے جمع کر لے۔ اور عرب معاشرے میں ایسے لوگ بے شمار تھے جن کی چار سے زائد بیویاں تھیں۔ [5]

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 5127. [2] النسآء 25:4. [3] فتح الباري: 150/9. [4] السيرة النبوية لأبي شهبة: 90/1. [5] دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص: 25,24.

جب اسلام آیا تو کسی کے پاس دس بیویاں تھیں، کسی کے پاس اس سے بھی زیادہ تھیں اور کسی کے پاس اس سے کم تھیں۔ اسلام نے بیویوں کی تعداد چار تک محدود کر دی۔ وہ بھی اس شرط پر کہ خاوند کو یقین ہو کہ وہ ان سب کے اخراجات برداشت کر سکتا ہے اور ان میں انصاف سے کام لے سکتا ہے۔ اگر خاوند کو ڈر ہو کہ وہ عدل قائم نہیں کر سکے گا تو اسے حکم دیا کہ صرف ایک پر اکتفا کرے۔

عہد جاہلیت میں عرب لوگ بیویوں کے درمیان انصاف نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے ساتھ بُرا سلوک کرتے اور ان کے حقوق غصب کرتے۔ اسلام نے بیویوں کو انصاف دلایا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی نصیحت کی اور ان کے لیے ایسے حقوق مقرر کیے جو کبھی ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔ [1]

⑤ طلاق: عرب کثرت سے طلاق دینے کے عادی تھے۔ ان کے ہاں طلاق دینے کے لیے کوئی تعداد متعین نہ تھی۔ ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا، پھر اس سے رجوع کر لیتا، پھر طلاق دے دیتا، پھر رجوع کر لیتا۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا۔ (نہ عورت کو حقوقِ زوجیت حاصل ہوتے اور نہ آزادی کہ دوسری جگہ نکاح کر سکے) اسلام کے آغاز تک یہی طریقہ جاری رہا۔ [2]

آخر کار اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ص فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ط وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ط فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ لا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ط تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ج وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○﴾

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 1/88. [2] دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص: 25.

”طلاق (رجعی) دو مرتبہ ہے، پھر یا تو (عورت کو) دستور کے مطابق روک لیا جائے یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دیا جائے اور تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم انھیں جو دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لو الا یہ کہ دونوں کو ڈر ہو کہ وہ اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے۔ پس اگر تمھیں ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ عورت فدیے میں وہ مال دے (کر خلع حاصل کر لے۔) یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو تم ان سے آگے نہ بڑھو اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے تجاوز کرتے ہیں، وہی ظالم ہیں۔“[1]

اسلام نے طلاقوں کی تعداد متعین کر دی اور خاوند کو یہ موقع دیا کہ اگر طلاق دے کر اس نے غلط فیصلہ کیا ہے تو اس کی تلافی کر سکے اور اسے اپنی (مطلقہ) بیوی کے ساتھ دو مرتبہ رجوع کا حق دیا۔ اگر وہ تیسری بار طلاق دے دیتا ہے تو رشتۂ نکاح مکمل طور پر منقطع ہو جائے گا۔ یہ عورت اپنے سابقہ خاوند کے لیے حلال نہیں رہے گی، سوائے اس صورت کے کہ وہ کسی اور شخص سے نکاح کرے اور رخصتی کے بعد اتفاقاً وہ خاوند فوت ہو جائے یا اس عورت کو طلاق دے ڈالے تو یہ دوبارہ پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ط فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ أَنْ يَّتَرَاجَعَآ إِنْ ظَنَّآ أَنْ يُّقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ ط وَتِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُونَ ○﴾

”پھر اگر وہ (خاوند) اسے (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ (عورت) اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے، پھر اگر وہ بھی اسے طلاق دے دے تو ان دونوں (سابقہ میاں بیوی) پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں رجوع کر لیں اگر وہ دونوں خیال کریں کہ اللہ کی حدیں

---

[1] البقرة 2:229.

> قائم رکھ سکیں گے اور یہ اللہ کی حدیں ہیں، وہ انھیں ان لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں۔“[1]

طلاق کی طرح ایک صورت ظہار کی تھی جس سے بیوی اپنے خاوند کے لیے حرام ہو جاتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ خاوند اپنی بیوی سے کہتا کہ تو میرے لیے میری ماں کی طرح ہے۔ (جاہلیت میں) یہ حرمت دائمی ہوتی تھی۔ اسلام نے اسے غیر معقول اور جھوٹی بات قرار دیا اور کفارے کے ذریعے خاوند کو اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا راستہ دیا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ ﴾

> ”تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ”ظِهَار“ کرتے ہیں، وہ ان کی مائیں نہیں، ان کی مائیں تو وہی ہیں جنھوں نے انھیں جنا اور بے شک وہ ناگوار بات اور جھوٹ کہتے ہیں۔“[2]

⑥ **لوٹ مار، حملے اور لڑائیاں:** عربوں میں نہایت معمولی معمولی باتوں پر لڑائیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ وہ اپنے خودساختہ معاشرتی اصولوں کی خاطر جن کی کوئی اہمیت بھی نہ ہوتی، بے دریغ انسانی خون بہاتے اور لڑائیاں چھیڑ دیتے تھے۔

تاریخ ہمارے سامنے عربوں کے جاہلی زمانے کے واقعات کا ایک ایسا سلسلہ بیان کرتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دلوں پر جنگی جنون پوری طرح مسلّط تھا جو ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں پر بھی حاوی تھا۔ ان واقعات میں ایک واقعہ جنگ بَسُوس کا ہے۔

جنگ بسوس: جنگ بسوس دو قبیلوں بنوبکر اور بنوتغلب کے درمیان ہوئی جس کا سبب جَرمی نامی شخص کی اونٹنی تھی۔ جرمی بَسُوس بنت منقذ کا پڑوسی تھا اور بَسوس جَسّاس بن مُرّہ کی

---

[1] البقرة 2:230. [2] المجادلة 58:2. السيرة النبوية لأبي شهبة: 1/91.

خالہ تھی۔ بنو تغلب کے سردار کلیب نے اپنے اونٹوں کے لیے ایک خاص چراگاہ بنائی تھی۔ کلیب نے اپنی چراگاہ میں جرمی کی اونٹنی کو دیکھ کر اسے تیر مار دیا جس پر جرمی اور بَسوس نے چیخ و پکار شروع کر دی۔ جساس نے کلیب کو قتل کرنے کے لیے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اسے قتل کر ڈالا۔ اس وجہ سے دونوں قبیلوں میں چالیس سال تک زبردست لڑائیاں ہوتی رہیں۔[1]

جنگِ داحِس: اسی طرح جنگِ داحس وغَبراء ہے جس کا سبب دو گھوڑوں داحس اور غبراء کے درمیان ہونے والا دوڑ کا مقابلہ بنا۔ داحس قیس بن زہیر کے گھوڑے کا نام تھا اور غبراء حذیفہ بن بدر کی گھوڑی تھی۔ حذیفہ نے ایک آدمی کو چپکے سے اشارہ کیا کہ وہ وادی میں کھڑا ہو جائے۔ اگر وہ داحس گھوڑے کو آگے بڑھتا دیکھے تو اسے روکے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ گھوڑے کو دھکا دیا اور اسے پانی میں گرا دیا۔ اس طرح غبراء آگے بڑھ گئی۔ اس پر خوب قتل و غارت ہوئی اور دو قبیلوں بنو عبس اور بنو ذبیان میں جنگ چھڑ گئی۔[2]

اوس وخزرج کی باہمی جنگیں: اسی طرح جاہلیت کے زمانے میں اوس اور خزرج کے درمیان خاصی لڑائیاں ہوئیں، حالانکہ وہ چچا زاد بھائی تھے۔ اوس اور خزرج حارثہ بن ثعلبہ ازدی کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کے درمیان مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخری لڑائی جنگ بُعاث ہے۔ اس میں قبیلہ اوس کے حلیف یہودیوں نے ان سے مدد کرنے کے معاہدے کی تجدید کی تھی۔ اوس اور خزرج میں ہونے والی اکثر لڑائیوں کی آگ یہودیوں نے بھڑکائی تاکہ دونوں قبیلے کمزور ہو جائیں اور سرداری ان (یہودیوں) کو حاصل ہو جائے۔ ہر فریق نے اپنے حلیف ہمسایہ قبائل سے مدد حاصل کی۔ اس طرح ان کے درمیان شدید جنگ ہوئی جو آخر کار اوس کے ایک باصلاحیت شخص کے ہاتھوں مصالحت پر ختم ہوئی۔[3]

بعض قبائل صرف اس مقصد کے لیے حملے کرتے تھے کہ دوسروں کا مال چھینیں اور آزاد

---

[1] الكامل في التاريخ لابن الأثير:312/1. [2] الكامل في التاريخ لابن الأثير:343/1. [3] التاريخ الإسلامي للحميدي:55/1.

لوگوں کو قیدی بنا کر فروخت کریں۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما ایک آزاد عربی النسل تھے اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ آزاد فارسی النسل تھے۔ (ان دونوں کو غلام بنا کر فروخت کیا گیا تھا) اسلام نے اس لوٹ مار اور غارت گری کا خاتمہ کیا اور اس طرح امن و امان قائم کیا کہ ایک اکیلا مرد اور ایک اکیلی عورت صنعاء سے حضر موت شہر تک سفر کرتے تھے مگر انھیں اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوتا تھا سوائے اس کے کہ انھیں اپنی بکریوں پر بھیڑیے کے حملے کا خوف ہوتا تھا۔[1]

⑦ **علم و خواندگی:** عرب لوگ یہود و نصاریٰ کی طرح اہل کتاب تھے نہ ہی اہل علم بلکہ ان پر جہالت اور ناخواندگی غالب تھی۔ قدیم روایات، اگرچہ وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہوتیں، ان کی تقلید اور ان پر جمود طاری تھا۔ عرب قوم لکھنا جانتی تھی نہ علم حساب سے واقف تھی۔ اکثر لوگوں کی یہی حالت تھی۔ بہت تھوڑے لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اپنی جہالت اور محدود معلومات رکھنے کے باوجود عرب لوگ ذہانت و فطانت، زُود فہمی، خوش ذوقی، ذکاوت حِس، حُسنِ استعداد، علم و معرفت اور درست رہنمائی قبول کر لینے پر آمادگی میں مشہور تھے۔ اسی وجہ سے اسلام (قبول کر لینے) کے بعد وہ بہترین عالم، دانشور اور فقیہ بنے۔ جہالت کا خاتمہ ہوا۔ علم و معرفت ان کے خصوصی اوصاف بن گئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے علم قیافہ (نشانات کے ذریعے سے حقیقت کا کھوج لگانا) میں مہارت حاصل کی۔ کچھ طبیب تھے، مثلاً حارث بن کلدہ۔ ان کی طب کی بنیاد روز مرہ زندگی سے حاصل ہونے والے تجربات تھے۔[2]

اخلاقی حالت

عربوں کے اخلاق اچھے نہیں تھے۔ شراب اور جوئے کے رسیا تھے۔ قافلوں پر حملے اور لوٹ مار، عصبیت، ظلم، خونریزی، جذبہ انتقام کی تسکین، مال غصب کر لینا، یتیموں کا مال

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة:93/1. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة:93/1.

کھانا، سودی لین دین، چوری اور زنا جیسے جرائم عام تھے۔ یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ زنا صرف لونڈیوں میں تھا یا خاص قسم کی ان بدکار عورتوں میں تھا جنھوں نے (اپنے گھروں پر) علامتی جھنڈے لگائے ہوئے تھے۔ آزاد عورتوں میں یہ مرض بہت شاذ و نادر تھا۔ اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ جب فتح مکہ کے بعد نبی کریم ﷺ نے عورتوں سے اس بات پر بیعت لی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی، نہ چوری کریں گی اور نہ زنا کریں گی۔ تو ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے کہا: کیا آزاد عورت بھی زنا کرسکتی ہے؟"[1]

تمام عرب ایسی اخلاقی گراوٹ کا شکار نہیں تھے بلکہ ان میں بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو زنا کرتے تھے نہ شراب پیتے تھے، خون بہاتے تھے نہ کسی پر ظلم کرتے تھے بلکہ یتیموں کا مال کھانے کو گناہ سمجھتے تھے اور سودی کاروبار سے دور رہتے تھے۔[2] ان میں بہت سی اچھی صفات و عادات تھیں جن کی وجہ سے وہ اس بات کے اہل بنے کہ اسلام کے جھنڈے کو دنیا میں لہرا سکیں۔ اور وہ خوبیاں یہ تھیں:

ذہانت و فطانت

عربوں کے دل بڑے شفاف تھے۔ ان پر ہندوستانی، رومی، یونانی اور ایرانی معاشروں کی طرح فلسفے، دیومالائی اور بے سروپا افسانے اثرانداز نہیں ہوتے تھے جن کے اثرات کو کھرچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے دلوں کو اسی مقصد کے لیے تیار کیا گیا ہو کہ وہ اس کائنات کے سب سے عظیم مشن یعنی اسلام کی لازوال دعوت کی ذمہ داریاں اٹھا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام اقوام سے بڑھ کر قوتِ حافظہ کے مالک تھے۔ ان کی ذہنی صلاحیتیں اسلام کی حفاظت کے لیے استعمال ہوئیں۔ ان کی فکری قوتیں اور فطری صلاحیتیں خیالی فلسفوں، بے فائدہ رومی تنازعات اور منطق کی پیچیدگیوں میں ضائع نہیں ہوئی تھیں۔[3]

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة:94/1، عورتوں کی بیعت کا واقعہ صحیح بخاری میں بھی ہے، ملاحظہ کیجیے: صحیح البخاري، حديث:4895. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة:94/1. [3] السيرة النبوية للندوي، ص:12.

عربوں کی لغت کا وسیع ہونا ان کی ذہانت اور قوتِ حافظہ کی دلیل ہے۔ عربی میں شہد کے 80، لومڑی کے 200، شیر کے 500 اور اونٹ کے 1000 نام ہیں۔ اتنے ہی نام تلوار کے ہیں۔ حوادث و آفات کے لیے تقریباً 4000 نام ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنے ناموں کے احاطے کے لیے ایک روشن، بیدار اور مضبوط حافظے کی ضرورت ہوتی ہے۔[1]

اہل عرب کی ذہانت و فطانت اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ کلام تو بہت دور کی بات تھی، محض اشارے سے بات سمجھ جاتے تھے اور اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔[2]

جود و سخا

یہ عربوں کا بنیادی وصف تھا۔ اگر کسی شخص کے پاس صرف ایک ہی اونٹنی ہوتی تو مہمان کی آمد پر اسے ذبح کر دیتا۔ بعض لوگ انسانوں کو تو کیا جنگلی جانوروں اور پرندوں کو بھی کھلاتے تھے۔ حاتم طائی کی سخاوت زبانِ زد عام تھی اور اس کی مثالیں بیان کی جاتی تھیں۔[3]

بہادری، مردانگی اور دلیری

عرب لڑائی کی موت کو باعث فخر اور بستر پر آنے والی موت کو باعثِ ذلت سمجھتے تھے۔ ایک شخص کو جب اس کے بھائی کے قتل کی خبر ملی تو اس نے کہا: ''اگر وہ قتل ہوگیا ہے تو (کوئی نئی بات نہیں) اس کا باپ، بھائی اور چچا بھی قتل ہوئے تھے۔ اللہ کی قسم! ہم میں سے کوئی بھی طبعی موت نہیں مرتا۔ ہم تو نیزوں کی انیوں اور تلواروں کے سائے میں مرتے ہیں ؎

> ''ہمارا کوئی سردار طبعی موت نہیں مرا اور نہ کبھی ایسا ہوا ہے کہ ہم میں سے کوئی قتل ہو اور اس کا قصاص نہ لیا جائے۔ ہمارے خون تلواروں کی دھار پر بہتے ہیں۔ تلواروں کی دھار کے سوا کسی اور چیز پر نہیں بہتے۔''

اہل عرب چادر، چار دیواری اور عزت و ناموس کی حفاظت پر کسی چیز کو مقدم نہیں سمجھتے تھے اور اس مقصد کے لیے اپنی جانیں بھی قربان کر دیتے تھے۔ مشہور شاعر عنترہ کہتا ہے:

---

[1] بلوغ الأرب للآلوسي:40,39/1 [2] مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص:80,79.

[3] السيرة النبوية لأبي شهبة:95/1.

> ”وہ مجھے یوں مرنے سے ڈرانے لگی جیسے میں مرنے سے دور ہوں۔ میں نے اسے جواب دیا کہ بے شک موت ایک ایسا گھاٹ ہے جس کا پیالہ مجھے ضرور پلایا جائے گا۔ تیرا باپ نہ رہے! تو اپنی حیا کو تھام کر رکھ اور جان لے کہ میں اگر قتل نہ بھی کیا جاؤں تو بھی موت ضرور آنی ہے۔“ [1]

وہ مزید کہتا ہے:

> ”مجھے ذلت کے ساتھ آبِ حیات نہ پلا بلکہ عزت کے ساتھ (کڑوا) اندرائن کا پیالہ پلادے (میں بخوشی پی لوں گا۔) ذلت کے ساتھ آبِ حیات پینا ایسے ہے جیسے جہنم میں جلنا اور اگر جہنم میں عزت محفوظ ہو تو جہنم بہترین جگہ ہے۔“ [2]

عرب لوگ فطری طور پر دلیر اور خوددار تھے۔ وہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ طاقتور کسی کمزور، عاجز، بوڑھے یا صنفِ نازک پر زیادتی کرے۔ اگر کوئی ان سے مدد طلب کرتا تو اس کی مدد کرتے اور پناہ لینے والے کو بے یار و مددگار چھوڑ دینا کمینگی سمجھتے تھے۔

حریت پسندی اور ذلت و ظلم سے نفرت

ایک عربی فطری طور پر آزادی سے عشق کی حد تک محبت کرتا تھا۔ اسی کے لیے اس کا جینا اور مرنا تھا۔ وہ آزاد فضا میں اس طرح نشوونما پاتا کہ اس پر کسی کا تسلّط نہ ہوتا۔ وہ اس بات کو ناپسند کرتا تھا کہ ذلت والی زندگی گزارے یا کوئی اس کی عزت و ناموس پر ہاتھ ڈالے، خواہ ساری زندگی تکلیفوں میں گزارنی پڑے۔ [3] عرب لوگ ذلت قبول نہیں کرتے تھے، ذرا سی بے قدری اور توہین یا ذلت ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی تھی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے: سلطنتِ حیرہ کا بادشاہ عمرو بن ہند اپنے ہم نشینوں میں بیٹھا ان سے پوچھ رہا تھا کہ تم عربوں میں کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جس کی ماں میری ماں کی خدمت کرنا ناپسند کرے؟ انھوں نے جواب دیا: ”ہاں! ایک غریب شاعر عمرو بن کلثوم ہے، اس کی والدہ ایسی ہے۔“

---

[1] ديوان عنترة لفاروق الطباع، ص: 252.

[2] ديوان عنترة لفاروق الطباع، ص: 82.

[3] السيرة النبوية لأبي شهبة: 1/95.

بادشاہ نے عمرو بن کلثوم کو ملاقات کی دعوت دی اور اس کی والدہ کو بھی اپنی والدہ سے ملنے کی دعوت دی۔ بادشاہ نے اپنی والدہ سے یہ بات پہلے ہی طے کر لی تھی کہ کھانا کھانے کے بعد وہ عمرو بن کلثوم کی والدہ سے کہے گی کہ تمھاری طرف جو پلیٹ پڑی ہے مجھے پکڑاؤ، چنانچہ جب اس نے عمرو بن کلثوم کی والدہ سے یہ بات کہی تو اس نے جواب دیا کہ ضرورت مند خود اٹھ کر اپنی ضرورت پوری کرے۔ بادشاہ کی والدہ نے دوبارہ یہ بات کہی اور اصرار بھی کیا تو عمرو بن کلثوم کی والدہ لیلیٰ چلائی: ”اے بنو تغلب! مدد کے لیے آؤ، ہائے میں ذلیل ہوگئی!“ اس کے بیٹے نے یہ سنا تو غصے میں تیزی سے دوڑا اور سائبان میں بادشاہ کی لٹکی ہوئی تلوار دیکھی۔ اس نے وہی تلوار لے کر بادشاہ عمرو بن ہند کا سر تن سے جدا کر دیا اور بنو تغلب کو آواز دی۔ سب نے جو کچھ سائبان میں تھا لوٹ لیا، پھر عمرو بن کلثوم نے بادشاہ کی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

> ”اے عمرو بن ہند (کی قوم!) ہم کیونکر تمھارے بادشاہ کے غلام بنیں۔ اے عمرو بن ہند (کی قوم!) تم کس مقصد کے لیے ہمارے مخالفین کی بات مانتے ہو اور ہمیں حقیر سمجھتے ہو۔ تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو اور خوفزدہ کرتے ہو۔ باز آجاؤ۔ ہم کب تمھاری ماں کے غلام (خادم) تھے۔ جب بادشاہ ہی لوگوں کو ذلیل کرنے لگ جائے تو ہم اس ذلت میں رہنا کبھی قبول نہیں کریں گے۔“[1]

ایفائے عہد، صاف گوئی اور سچائی

عرب جھوٹ سے نفرت کرتے اور اسے عیب خیال کرتے تھے۔ وہ وفادار تھے، اسی لیے اسلام میں داخل ہونے کے لیے صرف زبان سے شہادت دینا کافی تھا۔ جھوٹ سے ان کی نفرت کی دلیل ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) اور شاہِ روم ہرقل کا واقعہ ہے۔ ہرقل نے ابوسفیان سے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کئی سوالات پوچھے تھے، جبکہ قریش مکہ اور مسلمانوں کے درمیان کئی لڑائیاں ہو چکی تھیں اور اب وہ حالت صلح میں تھے۔ ابوسفیان کہتا ہے کہ

---

[1] شرح المعلقات للحسين الزوزني، ص:196-204.

اگر مجھے یہ شرم نہ ہوتی کہ میری قوم کے جن لوگوں کو میرے پیچھے میری تکذیب یا تصدیق کرنے کے لیے بٹھایا گیا ہے، وہ میری طرف جھوٹ کی نسبت کریں گے تو میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں ضرور جھوٹ بولتا۔[1]

نعمان بن منذر نے عربوں کی وفاداری کے بارے میں ایران کے بادشاہ کسریٰ سے کہا تھا: ''ایک عرب اگر آنکھ کے اشارے ہی سے کچھ کہہ دے تو وہ ایسا عہد و پیمان بن جاتا ہے جسے موت ہی ختم کر سکتی ہے۔ ان میں سے کوئی ایک زمین سے لکڑی اٹھاتا تو یہی اس کے قرض کے لیے رہن بن جاتی ہے۔ اس کی رہن شدہ چیز کو غصب کرنے کی نوبت آسکتی ہے نہ اس کی امان کو توڑا جاسکتا ہے۔ اگر عرب کے کسی باشندے نے کسی کو پناہ دی ہو اور وہ اس سے دور ہو۔ اسی اثنا میں پناہ لینے والے پر کوئی زیادتی ہو جائے تو پناہ دینے والے کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک وہ تکلیف کا باعث بننے والے قبیلے کو ختم نہ کر دے یا اس کا اپنا قبیلہ انتقام لیتے لیتے فنا ہو جائے کہ اس کی امان کو توڑا کیوں گیا ہے۔ اور اگر کوئی مجرم جان پہچان اور رشتے داری کے بغیر ان سے حفاظت طلب کرتا ہے تو یہ اس کی جان بچانے کے لیے اپنی جانیں اور اس کا مال بچانے کے لیے اپنے اموال قربان کر ڈالتے ہیں۔''[2]

وفاداری عربوں کا بنیادی وصف تھا۔ اسلام نے اسے صحیح سمت عطا کی۔ اس انسان پر سختی کی جو کسی مجرم کو پناہ دیتا تھا، خواہ وہ کتنے ہی مرتبے والا ہو یا اس سے کیسی ہی رشتے داری کیوں نہ ہو، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ آوٰى مُحْدِثًا»

''اللہ اس انسان پر لعنت بھیجتے ہیں جو کسی جنایت کار (فسادی) کو پناہ دیتا ہے۔''[3]

وہ واقعات جو عربوں کی وفاداری پر دلالت کرتے ہیں ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ حارث بن عباد نے بنوبکر کے قبائل کی قیادت کی تاکہ وہ بنوتغلب اور ان کے سردار مہلہل سے لڑائی کریں جس نے حارث کے بیٹے کو جنگ بسوس میں قتل کر دیا تھا اور اس

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 7. [2] بلوغ الأرب للآلوسي: 150/1. [3] صحيح مسلم، حديث: 1978.

سے کہا تھا کہ کلیب کے جوتوں کے تسمے کے برابر ہو جا۔ حارث نے مہلہل کو گرفتار کر لیا لیکن وہ اسے پہچانتا نہ تھا، (چنانچہ اسی سے) کہنے لگا: ''مجھے مہلہل بن ربیعہ کے متعلق بتادو۔ میں تمھیں چھوڑ دوں گا۔ اس نے کہا کہ اگر میں تمھیں اس کے متعلق بتادوں تو تم عہد کرتے ہو (کہ مجھے چھوڑ دو گے؟) حارث نے کہا: ''ہاں!'' تب مہلہل بولا کہ وہ میں ہی ہوں۔ حارث نے اپنے بال نوچے اور اسے چھوڑ دیا۔ یہ بے مثال وفاداری و بہادری ہے اور ان اوصاف کے حامل ہی سیادت و قیادت کے حقدار ہیں۔[1]

عربوں کی وفاداری کا ایک منفرد واقعہ یہ بھی ہے کہ جب نعمان بن منذر نے اپنی بیٹی کی شادی کسریٰ کے ساتھ کرنے سے انکار کیا تو اسے اپنی جان کا خوف محسوس ہوا، وہ اپنا اسلحہ اور قیمتی اشیاء ہانی بن مسعود شیبانی کے حوالے کر کے کسریٰ کے پاس چلا گیا۔ اس نے اسے پکڑ لیا اور ہانی کو پیغام بھیجا کہ نعمان کی تمام امانتیں میرے حوالے کر دو۔ اس نے انکار کر دیا۔ کسریٰ نے ہانی سے جنگ کرنے کے لیے لشکر بھیجا تو اس نے اپنی قوم بنو بکر کو جمع کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''اے آل بکر! مجبوری کی حالت میں مرجانے والا اس بھگوڑے سے اچھا ہوتا ہے جو اپنی جان بچالے۔ احتیاط تقدیر سے نہیں بچا سکتی۔ (تکلیف پر) صبر کامیابی کے اسباب میں سے ہے۔ موت ذلت سے بہتر ہے۔ موت کو سینے سے لگانا اس سے بہتر ہے کہ وہ پیچھے سے آلے۔ پُشتوں پر نیزوں کے زخم لگوانے کی نسبت سینوں پر زخم لگوانے میں زیادہ عزت ہے۔ اے آل بکر! جنگ میں کود پڑو۔ موت سے چھٹکارا ممکن نہیں۔''[2] اس ایک شخص کی وجہ سے جس نے ذلت و رسوائی کی زندگی کو حقیر سمجھتے ہوئے اور ایفائے عہد کرتے ہوئے موت کی پروا نہ کی، بنو بکر کو حوصلہ ملا اور انھوں نے ذی قار میں ایرانی لشکر کو شکست سے دو چار کیا۔

صبر و قناعت اور قوت برداشت

عرب لوگ یہ کہتے ہوئے دسترخوان سے اٹھ کھڑے ہوتے تھے کہ بسیار خوری ہوشیاری

---

[1] مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيى اليحيى، ص:91. [2] تاريخ الطبري:2/207.

کو ختم کر دیتی ہے۔ اور وہ زیادہ کھانے والے لالچی شخص کو اچھا نہیں جانتے تھے۔ ایک عرب شاعر کہتا ہے:

> ''جب ہاتھ کھانے کی طرف بڑھتے ہیں تو میں جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرتا کیونکہ جو لوگوں میں سے زیادہ حریص ہو وہی جلد باز ہوتا ہے۔''[1]

مشکلات سہنے اور تکالیف برداشت کرنے میں انھیں عجیب قدرت حاصل تھی۔ شاید انھوں نے اپنے خشک اور بے آب و گیاہ صحراؤں کے مزاج سے یہ چیز حاصل کی تھی۔ وہ دشوار گزار پہاڑوں کو عبور کرنے اور دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں سفر کرنے کے عادی تھے۔ وہ گرمی سے متاثر ہوتے نہ سردی سے، دشوار گزار راستوں سے نہ طویل سفروں سے اور بھوک سے نہ پیاس سے۔ اور جب وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تو انھوں نے صبر و تحمل کی بہترین مثالیں قائم کیں۔ وہ معمولی چیز پر راضی ہو جاتے تھے۔ کمر سیدھی رکھنے کے لیے چند کھجوروں اور حلق تر رکھنے کے لیے پانی کے چند گھونٹوں کے ہوتے ہوئے ایک عربی کئی کئی دن تک سفر جاری رکھتا۔[2]

جسمانی قوّت اور بلند حوصلے

عرب حوصلے کی بلندی اور دل کی مضبوطی کے ساتھ جسمانی قوت و بہادری میں بھی معروف تھے۔ جب روحانی اور جسمانی قوتیں یکجا ہو جائیں تو پھر عجیب و غریب نتائج برآمد ہوتے ہیں اور ان کے اسلام قبول کرنے کے بعد یہی کچھ ہوا۔

معاف کر دینے اور پناہ دے کر حفاظت کرنے کے اوصاف

عرب اپنے مخالفین اور ہمسروں کو مقابلے کی دعوت دیتے تھے، پھر جب ان پر دسترس حاصل کر لیتے تو انھیں معاف کر دیتے اور چھوڑ دیتے۔ وہ زخمیوں کو مارنے سے اجتناب کرتے۔ ہمسائیگی کے حقوق کا خیال رکھتے، خاص طور پر چادر اور چار دیواری کا تحفظ کرتے تھے۔ ان کا شاعر کہتا ہے:

---

[1] بلوغ الأرب للآلوسي: 1/377. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 1/96.

وَأَغُضُّ طَرْفِي إِنْ بَدَتْ لِي جَارَتِي   حَتّٰى يُوَارِيَ جَارَتِي مَأْوَاهَا

"اگر میری پڑوسن سامنے آجائے تو جب تک وہ چار دیواری میں چلی نہیں جاتی
میں اپنی آنکھیں نیچی رکھتا ہوں۔"

جب کوئی بھی ان سے پناہ طلب کرتا تو وہ اسے پناہ دے دیتے اور کبھی اس مقصد کے لیے اپنی جان، اولاد اور مال بھی قربان کر دیتے تھے۔

اسلام کے لیے عرب معاشرے کا انتخاب؟

مذکورہ فضائل اور اخلاق حمیدہ عربوں کا قیمتی سرمایہ تھے۔ اسلام نے ان کی نشوونما کی، انھیں جلا بخشی اور درست راستے پر گامزن کیا۔ اس لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ جب عرب پاکیزہ فرشتوں کے روپ میں صحراؤں سے نکل کر ساری زمین پر پھیلے تو انھوں نے کفر سے بھری زمین کو ایمان سے لبریز کر دیا، ظلم وجور سے اٹی مخلوق کو عدل و انصاف دیا، خامیاں دور کر کے خوبیوں سے مالا مال کر دیا اور شر کے مقابلے میں خیر و بھلائی کو عام کر دیا۔[1]

یہ اس معاشرے کے خدّ وخال ہیں جس میں عربوں نے نشوونما پائی۔ یہ اس وقت افضل ترین معاشرہ تھا۔ اس معاشرے کے لیے رسول اللہ ﷺ کا انتخاب کیا گیا اور آپ کے لیے اس عربی معاشرے کا انتخاب ہوا۔ فارسیوں، رومیوں، ہندوؤں اور یونانیوں کے مقابلے میں یہ ایک نادر معاشرہ اور اعلیٰ مرکز تھا۔ فارسیوں کے علوم وفنون کی وسعت اور ہندوؤں کے فلسفے کی گہرائی کے باوجود رسول کا انتخاب ان میں سے نہیں کیا گیا، نہ رومیوں کے فنون لطیفہ کے باوصف نظر انتخاب ان پر پڑی اور نہ یونانیوں کی شاہکار شاعری اور اعلیٰ تصورات کے ہوتے ہوئے ان میں سے انتخاب کیا گیا۔ عرب کے اس اچھوتے معاشرے کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ عربوں میں فطرت سلیمہ، آزادی ضمیر اور روحانی بلندی جیسے اعلیٰ اوصاف موجود تھے اور دیگر اقوام ان اوصاف سے بے بہرہ تھیں۔[2]

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 1/97. [2] نظرات في السيرة لحسن البنا، ص: 14.

حصہ 2

ولادت باسعادت تا بعثت نبوی

باب : 1 قبل از ولادت رونما ہونے والے واقعات اور ان کی حکمتیں

باب : 2 ولادت باسعادت سے حلف الفضول تک کا سفر

باب : 3 تجارتی سفر، نکاح اور بعثت سے قبل اہم واقعات

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ﷺ

”کیا اس نے آپ کو یتیم پا کر جگہ نہیں دی؟“

(الضحیٰ 6:93)

باب 1

قبل از ولادت رونما ہونے والے واقعات اور ان کی حکمتیں

ذلت میں گھری انسانیت پر رحم فرماتے ہوئے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اسے پستی سے نکال کر عزت وشرف کے مقام پر فائز کرنا چاہا تو اپنے حبیب ﷺ کی بعثت کے ساتھ ان باسعادت لمحات کا آغاز فرمایا جن میں عالمِ بشریت کو ظلم و جہالت کی تاریکیوں سے نجات حاصل ہوئی۔

اس سے پہلے کہ ہم نبی ﷺ کی ولادتِ باسعادت کا تذکرہ کریں یا آپ کے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے واقعات بیان کریں یا یہ واضح کریں کہ نزولِ وحی سے قبل اللہ تعالیٰ نے کس قدر آپ کی خصوصی نگہداشت فرمائی یا یہ بتائیں کہ بعثت سے قبل آپ کتنی شفاف اور پاکیزہ سیرت کے مالک تھے، ہم زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ ان بڑی بڑی نشانیوں کو واضح کریں اور ان اہم واقعات کا تذکرہ کریں جو آپ کی ولادتِ باسعادت سے قبل رونما ہوئے، اس لیے کہ آپ ﷺ کی پیدائش سے قبل ان واقعات کا پیش آنا اس بات کا پیغام تھا کہ صبحِ روشن قریب آچکی ہے۔

اس کائنات میں دستورِ الٰہی بھی یہی ہے کہ سختی کے بعد آسانی پیدا ہوتی ہے، تاریکی کے بعد روشنی پھیلتی ہے اور بدحالی کے بعد خوشحالی میسر آتی ہے۔ ①

ولادت سے قبل چند اہم واقعات درج ذیل ہیں:

---

① هذا الحبيب محمد ﷺ يا محب للجزائري، ص: 51.

چاہ زمزم کی کھدائی

شیخ ابراہیم العلی رحمہ اللہ نے نبی کریم ﷺ کے جد محترم عبدالمطلب کے چاہ زمزم کھودنے کا واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ایک صحیح روایت میں بیان کیا ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''عبدالمطلب نے بیان کیا کہ میں حطیم میں سو رہا تھا (حطیم بیت اللہ کا وہ حصہ ہے جسے سرمائے میں کمی کی وجہ سے قریش مکہ نے بغیر تعمیر کے چھوڑ دیا تھا) کہ (خواب میں) میرے پاس ایک شخص آیا۔ اس نے مجھ سے کہا: ''طیبہ کو کھودیے!'' میں نے پوچھا کہ طیبہ کیا چیز ہے؟ مگر وہ شخص جواب دیے بغیر چلا گیا۔ (طیبہ کے معنی ہیں پاکیزہ ہونا، عمدہ ہونا، خوشبودار ہونا) اگلے روز میں پھر اس جگہ سویا تو وہی شخص پھر میرے پاس آیا اور کہنے لگا: ''بَرّہ کو کھودیے!'' (بَرّہ کے معنی ہیں بھلی، پاکیزہ) میں نے پوچھا: ''بَرّہ کیا چیز ہے؟'' مگر وہ بغیر جواب دیے چلا گیا۔ اگلے دن میں پھر اسی مقام پر سویا تو وہی شخص پھر میرے پاس آیا اور کہنے لگا: ''مضنونہ کو کھودیے!'' (مضنونہ کے معنی ہیں بیش قیمت اور عمدہ چیز جسے انسان سنبھال کر رکھتا ہے اور کسی دوسرے کو دینا پسند نہیں کرتا)۔ میں نے پوچھا: ''مضنونہ کیا چیز ہے؟'' تب وہ کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ اگلے روز میں پھر اسی جگہ آکر سویا تو وہ پھر میرے پاس آکر کہنے لگا: ''زمزم کھودیے!'' میں نے پوچھا: ''زمزم کیا چیز ہے؟ اس نے جواب دیا: ''(زمزم وہ کنواں ہے) جس کا پانی کبھی ختم ہوگا نہ کم، وہ حجاج کرام کو سیراب کرے گا وہ گوبر اور خون کے درمیان ہوگا، (یعنی خوراک میں دودھ کا کام دے گا) سفید ٹانگوں والے کوے کے چونچ مارنے اور چیونٹیوں کی بستی کے قریب ہوگا (شاید یہ اشارہ تھا کہ کنویں کی تلاش کے لیے زمین کھودنی پڑے گی مگر زیادہ نہیں صرف چیونٹیوں کے بل کے برابر۔)''[1]

---

[1] صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي:1/35,34.

مشہور سیرت نگار ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ جب چاہ زم زم کی خوبیاں واضح ہوگئیں اور اس کی جگہ معلوم ہوگئی اور عبدالمطلب نے جان لیا کہ یہ خواب سچا ہے تو انھوں نے کدال پکڑی اور اپنے بیٹے حارث کی معیت میں اس جگہ کی کھدائی شروع کردی۔ اس روز حارث کے سوا ان کے ساتھ کوئی اور بیٹا موجود نہیں تھا۔ جب کھدائی کے دوران میں عبدالمطلب کو کنویں کی منڈیر نظر آئی تو انھوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ قریش سمجھ گئے کہ عبدالمطلب نے اپنا مقصد حاصل کرلیا ہے۔ وہ اس کے پاس آئے اور کہنے لگے: ”اے عبدالمطلب! یہ ہمارے جدامجد اسماعیل علیہ السلام کا کنواں ہے اور اس میں ہمارا بھی حق ہے، ہمیں بھی اس میں شریک کرو۔“ عبدالمطلب نے کہا: ”میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا کیونکہ ہر کام تمھیں چھوڑ کر میرے ذمے لگایا گیا ہے اور یہ کنواں تمھیں نہیں مجھے عطا کیا گیا ہے۔“ قریش نے کہا: ”(اے عبدالمطلب!) انصاف سے کام لو، ہم اسے تنہا تمھاری ملکیت میں نہیں رہنے دیں گے بلکہ تمھارا مقابلہ کریں گے۔“ عبدالمطلب نے کہا: ”(اگر یہ بات ہے) تو پھر جسے تم پسند کرتے ہو، میرے اور اپنے درمیان منصف تسلیم کرلو، میں اس سے تمھارا فیصلہ کروا لیتا ہوں۔“ انھوں نے بنوسعد بن ہُذیم کی ایک کاہنہ کا نام پیش کیا جو شام کے علاقے میں رہائش پذیر تھی۔ عبدالمطلب نے اسے تسلیم کرلیا۔

چنانچہ عبدالمطلب نے اپنے خاندان بنوعبدمناف کے چند افراد کے ساتھ رخت سفر باندھا۔ قریش کے ہر قبیلے کا ایک ایک فرد اس کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس زمانے میں یہ سارا راستہ صحرائی تھا۔ وہ سب چل پڑے تو راستے میں عبدالمطلب اور اس کے ساتھیوں کا پانی ختم ہوگیا۔ پیاس کی وجہ سے بے حال ہوگئے حتی کہ انھیں اپنی موت نظر آنے لگی۔ اگر کسی کے پاس کچھ پانی تھا بھی تو وہ کسی دوسرے کو دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ ہر ایک یہی جواب دیتا کہ صحرائی علاقہ ہے، اگر ہمارے پاس بھی پانی ختم ہوگیا تو پھر ہمارا وہی حال ہوگا جو تمھارا ہورہا ہے۔ یہ صورتِ حال دیکھتے ہوئے عبدالمطلب نے اپنی رائے کا اظہار کیا کہ

شدتِ پیاس سے ہم سب موت کا شکار ہو جائیں گے، جبکہ ابھی ہم میں کچھ توانائی موجود ہے، اس لیے ہر شخص اپنے لیے ایک ایک قبر کھودے تاکہ جو مرتا جائے اس کے ساتھی اسے اس کی قبر میں دفن کرتے جائیں حتی کہ آخر میں صرف ایک ہی آدمی باقی رہ جائے (جسے دفن کرنے والا کوئی نہ ہو) ایک آدمی کی لاش کا ضائع ہو جانا پورے قافلے کی لاشوں کے ضائع ہونے سے بہتر ہے۔ سب نے اس رائے کو پسند کیا۔

ہر شخص نے اپنے لیے ایک ایک گڑھا کھودا اور شدتِ پیاس سے موت کا انتظار کرنے بیٹھ گئے۔ عبدالمطلب نے پھر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ تو حماقت ہوگی اگر ہم نے اسی طرح اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا اور اپنی جان بچانے کے لیے (پانی کی تلاش میں) سفر نہ کیا۔ ہمت کرو اور سفر جاری رکھو۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ کسی جگہ ہمیں پانی مہیا فرمادے، چنانچہ وہ سفر کے لیے تیار ہوگئے۔ جب عبدالمطلب نے اپنی سواری کو اٹھایا تو اس کے پاؤں کے نیچے سے شیریں پانی کا چشمہ پُھوٹ پڑا۔ یہ دیکھ کر عبدالمطلب اور اس کے ساتھیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ سب کے سب جو روانگی کے لیے پابہ رکاب تھے، سواریوں سے اترے۔ انھوں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا، اپنے مشکیزے بھی پانی سے بھر لیے۔ اب عبدالمطلب نے قریشی قبائل کو، جو تمام صورتِ حال کو بنظر غائر دیکھ رہے تھے، آواز دی کہ آؤ پانی لے لو اور دیکھو اللہ تعالیٰ نے ہمیں سیراب کر دیا ہے۔

وہ لوگ آئے، سب نے پانی پیا، اپنے اپنے مشکیزے بھرے اور بیک زبان کہا: ”اے عبدالمطلب! بخدا! اللہ نے ہمارے مقابلے میں آپ کے حق میں فیصلہ کر دیا ہے، اللہ کی قسم! اب ہم کبھی آپ سے زم زم کے بارے میں جھگڑا نہیں کریں گے۔ جس اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس بے آب و گیاہ جنگل میں سیراب کیا ہے، یقیناً اسی نے آپ کو زم زم کا کنواں عطا فرمایا ہے۔ خیر و برکت کے ساتھ اپنے زم زم کی طرف واپس چلیں، یہ آپ ہی کا حق ہے۔“ چنانچہ وہ سب کاہنہ عورت کے پاس جانے کے بجائے واپس ہوئے اور قریش زم زم سے دستبردار ہو گئے۔

سیرت نگار ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ زم زم کے بارے میں یہ روایت ہے جو حضرت علی ؓ سے مجھ تک پہنچی۔[1]

آبِ زم زم کے فضائل: آبِ زم زم کے فضائل میں بے شمار احادیث موجود ہیں۔ ان میں سے ایک روایت وہ ہے جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابوذر ؓ کے قبولِ اسلام کے واقعے میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّهَا مُبَارَكَةٌ إِنَّهَا طَعَامُ طُعْمٍ»

''یہ (آبِ زم زم) بہت بابرکت ہے اور خوراک کا کام بھی دیتا ہے۔''[2]

سنن دارقطنی اور مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کی روایت ہے جسے امام حاکم نے صحیح کہا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهُ، إِنْ شَرِبْتَهُ تَسْتَشْفِي بِهِ، شَفَاكَ اللّٰهُ! وَ إِنْ شَرِبْتَهُ لِشِبَعِكَ، أَشْبَعَكَ اللّٰهُ! وَ إِنْ شَرِبْتَهُ لِيَقْطَعَ ظَمَئَكَ، قَطَعَهُ اللّٰهُ! وَ هِيَ هَزْمَةُ جِبْرِيلَ، وَ سُقْيَا اللّٰهِ إِسْمَاعِيلَ»

''آبِ زم زم جس مقصد کے لیے پیا جائے وہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر تم حصولِ شفا کے لیے پیو گے تو اللہ تعالیٰ شفا عطا فرمائے گا۔ اگر بھوک مٹانے کے لیے پیو گے تو اللہ تعالیٰ تمھاری بھوک مٹا دے گا۔ اگر پیاس بجھانے کے لیے پیو گے تو اللہ تعالیٰ پیاس ختم کر دے گا۔ یہ حضرت جبریل ؑ کی ایڑی[3] کی ضرب کے ساتھ نمودار ہوا

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 1/151-153، والسير والمغازي لابن إسحاق: 25,24، تحقيق سهيل زكار، و دلائل النبوة للبيهقي: 1/94,93. (ابن اسحاق نے سماع کی صراحت کی ہے، اس لیے اس کی سند صحیح ہے۔ امام زہری کی ایک مرسل روایت اس کی شاہد ہے، لہٰذا بیہقی اور ابن ہشام کے طریق سے یہ روایت صحیح ہے۔ [2] صحيح مسلم، حديث: 2473. [3] صحیح البخاری میں راوی نے شک کے ساتھ بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ نے جبریل ؑ کی ایڑی یا پر کی ضرب کا تذکرہ کیا ہے، دیکھیے: صحيح البخاري، حديث: 3364.

اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سیرابی کا سامان تھا۔“ [1]

شیخ محمد ابوشہبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہر صورت حافظ دمیاطی نے «مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهُ» کو صحیح کہا ہے اور وہ متاخرین حفاظ حدیث میں سے ایک قابل اعتماد شخصیت ہیں۔ [2] اور حافظ عراقی نے بھی اس کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ [3]

اصحابِ فیل کا واقعہ

یہ واقعہ قرآن کریم اور سنت نبویہ سے ثابت ہے۔ اس کی تفصیل، سیرت اور تاریخ کی کتب میں موجود ہے اور مفسرین نے بھی اپنی تفاسیر میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں فرمایا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝﴾

”(اے نبی!) کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اس نے ان کی چال کو بیکار نہیں کر دیا؟ اور اس نے ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے، جو ان پر کھنگر کی کنکریاں پھینک رہے تھے، پھر اللہ نے انھیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا۔“ [4]

واقعۂ فیل کی جانب نبوی اشارے: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ والے سفر میں مکہ کی جانب جا رہے تھے۔ جب اس گھاٹی پر پہنچے جہاں سے مکہ کو راستہ اترتا تھا تو آپ کی سواری بیٹھ گئی۔ صحابہ کرام نے ”حَلْ حَلْ“ کی آواز لگا کر اسے اٹھانا چاہا مگر وہ (اونٹنی) بضد رہی اور

---

[1] المستدرك للحاكم: 473/1، و سنن الدارقطني: 288/2. اس سند کے ایک راوی محمد بن حبیب جارودی کے بارے میں امام حاکم رحمہ اللہ نے فرمایا: ”اس سند میں اگر محمد بن حبیب جارودی نہ ہو تو یہ سند صحیح ہے۔“ دارقطنی کے محقق مجدی بن منصور بن سید الشوری نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 158/1. [3] مقدمة ابن الصلاح وشرحها للحافظ العراقي، ص: 13. [4] الفيل 105:1-5.

نہ اُٹھی۔ تب لوگوں نے کہا: ’’قصواء (اونٹنی کا نام) اَڑ گئی ہے۔‘‘ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«مَا خَلَأَتِ الْقَصْوَاءُ وَمَا ذَاكَ لَهَا بِخُلُقٍ وَّلٰكِنْ حَبَسَهَا حَابِسُ الْفِيلِ»

’’قصواء اڑی نہیں ہے اور نہ یہ اس کی عادت ہے بلکہ اسے اس ذات نے روکا ہے جس نے (مکہ مکرمہ سے) ہاتھی (والوں کو) روکا تھا۔‘‘ [1]

امام ابو حاتم کی کتاب «السيرة النبوية» میں یہ واقعہ یوں مروی ہے کہ ایک بادشاہ جسے ابرہہ کہا جاتا تھا اور اس کا تعلق حبشہ سے تھا، اس نے یمن پر تسلط حاصل کیا۔ [2] اور صنعاء شہر میں ایک گرجا تعمیر کیا جس کا نام القُلَّیس رکھا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ عربوں کے حج کا رخ اس کی طرف پھیر دے، چنانچہ اس نے پختہ ارادہ کرلیا کہ وہ مکہ جا کر کعبہ کو منہدم کرے گا۔ حمیر کا ایک بادشاہ جس کا نام ذونفر تھا، اپنی وفادار قوم کو لے کر ابرہہ کے مقابلے کے لیے نکلا مگر اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جب اسے گرفتار کرکے ابرہہ کے سامنے پیش کیا گیا تو ذونفر نے اس سے درخواست کی: عالی جاہ! مجھے قتل نہ کریں۔ مجھے زندہ رکھنا آپ کے لیے میرے قتل سے بہتر ہوگا، چنانچہ ابرہہ نے اسے قتل کرنے کے بجائے اپنی قید میں رکھ لیا۔

پھر ابرہہ کعبے کی جانب روانہ ہوا۔ جب خُثعم قبائل کے قریب پہنچا تو نُفَیل بن حبیب خثعمی نے کچھ یمنی قبائل اپنے ساتھ ملا کر اس سے جنگ کی لیکن ابرہہ نے انھیں ہزیمت سے دوچار کیا اور نُفَیل بن حبیب کو گرفتار کرلیا۔ نفیل نے بھی ابرہہ سے درخواست کی کہ مجھے قتل نہ کرنا، میں عرب کی سرزمین سے خوب واقف ہوں (تمھارے کام آؤں گا) اور

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 2731.

[2] ابرہہ الاشرم: حبشہ کے گورنر ارياط نے یمن پر 525ء تا 543ء حکومت کی، پھر حبشی فوج نے بغاوت کی جس کا سربراہ ابرہہ تھا۔ ارياط اس فتنے میں مارا گیا اور ابرہہ تنہا یمن کا بادشاہ بن بیٹھا۔ لفظ ’’ابرہہ‘‘ لفظ ’’ابراہیم‘‘ کا حبشی تلفظ ہے۔ وہ نکٹا تھا، لہٰذا اشرم کہلاتا تھا۔ (ماخوذ از تاریخ ارض القرآن کامل از سید سلیمان ندوی، ص:244)

میری قوم بھی میری فرمانبردار ہے۔ میرا ان پر مکمل کنٹرول ہے۔ (اگر تو نے مجھے قتل نہ کیا تو میں انھیں تیرے ساتھ جنگ کرنے سے باز رکھوں گا)۔ اس پر ابرہہ نے اسے بھی زندہ چھوڑ دیا۔ اس طرح نُفَیل اس کی رہنمائی کے لیے اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

جب ابرہہ طائف پہنچا تو مسعود بن مُعَتّب بنوثقیف کے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر اس سے ملا اور کہا کہ اے بادشاہ! ہم تیرے غلام ہیں اور ہماری تجھ سے کوئی مخالفت نہیں۔ ہم تو ''لات'' کو پوجنے والے ہیں جس سے تجھے کوئی غرض نہیں۔ تیری غرض تو مکہ سے ہے۔ ہم تیرے ساتھ ایک شخص کو بھیج دیتے ہیں جو تجھے مکہ تک پہنچائے گا، چنانچہ انھوں نے ''ابورِغال'' نامی اپنا ایک غلام اس کے ساتھ کر دیا۔ وہ انھیں لے کر چلا۔ جب (مکہ کے قریب) مُغَمَّس نامی مقام پر پہنچا تو وہاں ابورِغال فوت ہو گیا۔ یہ وہی ابو رِغال ہے جس کی قبر کے پاس سے گزرتے ہوئے لوگ اس کی قبر پر پتھر مارتے تھے۔[1]

ابرہہ نے مُغَمَّس سے اسود بن مقصود کو اپنے ہراول دستے کا کمانڈر بنا کر مکہ بھیجا۔ اہل حرم اس کے پاس جمع ہو گئے۔ اس نے ''اَرَک'' نامی جگہ سے عبدالمطلب کے دو سو اونٹ اپنے قبضے میں لے لیے، پھر ابرہہ نے حُناطہ حمیری کو اہل مکہ کے پاس بھیجا اور کہا کہ شریف مکہ سے مل کر اسے میرا پیغام پہنچا دو کہ میں جنگ کے لیے نہیں آیا۔ میں صرف اس گھر

---

[1] یہ وہی ابو رغال ہے جس کی قبر کا حوالہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی دیا تھا۔ مسند احمد میں ہے کہ جب غیلان بن سلمہ ثقفی رضی اللہ عنہ مسلمان ہوا تو اس کی دس بیویاں تھیں۔ آپ ﷺ نے اسے حکم دیا کہ اپنی دس بیویوں میں سے چار کا انتخاب کر کے باقیوں کو طلاق دے دو۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں اس نے اپنی بقایا بیویوں کو طلاق دے دی اور مال اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ آپ کو معلوم ہوا تو اس سے فرمایا: ''مجھے لگتا ہے شیطان نے تیری موت کی خبر آسمان سے سن لی ہے اور یہ بات اس نے تیرے دل میں بھی ڈال دی ہے۔ اب شاید تو تھوڑا عرصہ ہی زندہ رہے گا۔ اللہ کی قسم! تجھے اپنی بیویوں سے رجوع کرنا ہو گا اور اپنا مال بھی بیٹوں سے واپس لینا ہو گا ورنہ میں تیری بیویوں کو وارث بناؤں گا اور لوگوں کو حکم دوں گا وہ تیری قبر پر پتھر برسائیں گے جیسا کہ ابورغال کی قبر پر برسائے گئے تھے۔'' (مسند أحمد: 14/2)

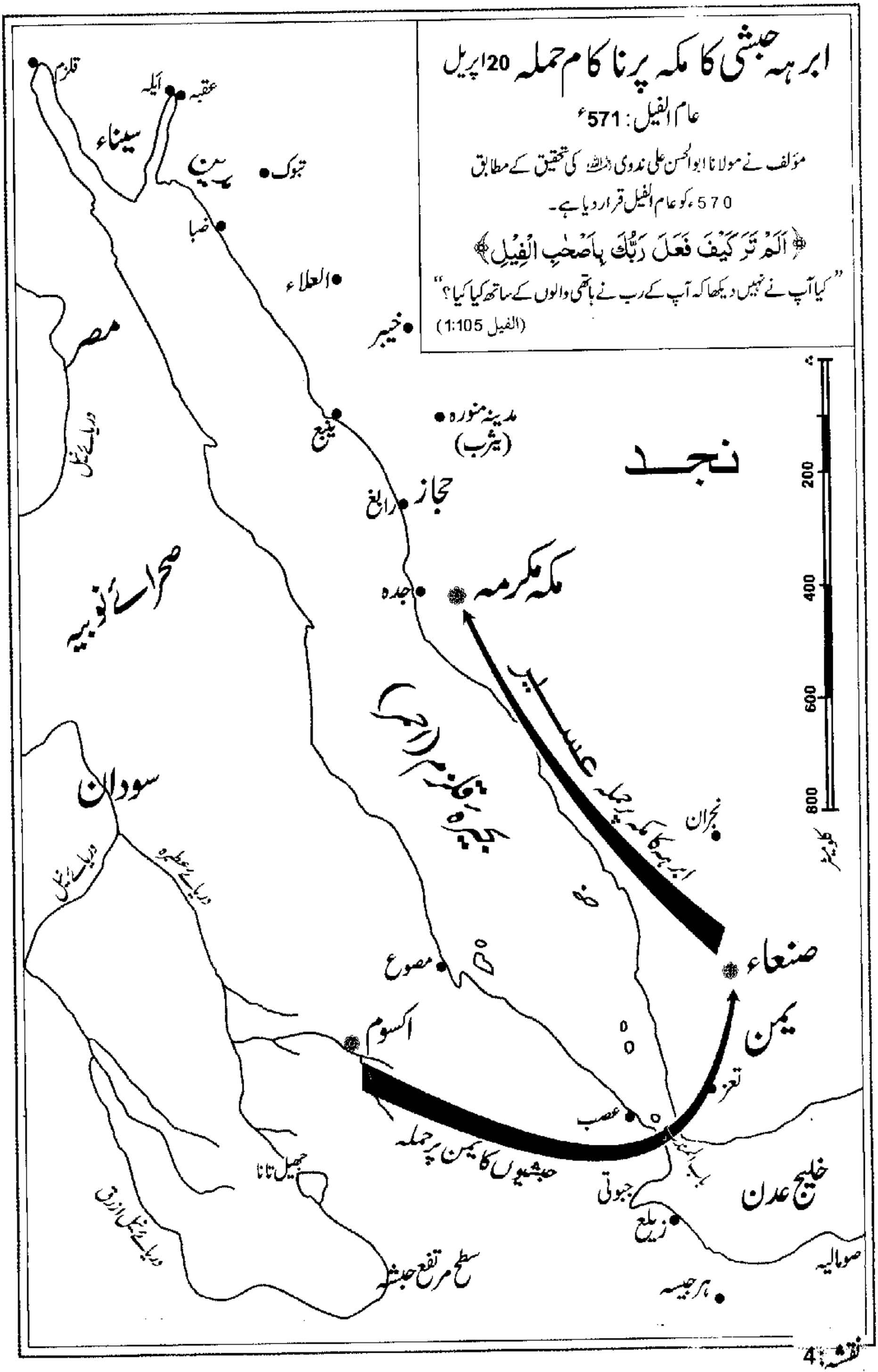

ابرہہ حبشی کا مکہ پر ناکام حملہ 20 اپریل

عام الفیل : 571ء

مؤلف نے مولانا ابوالحسن علی ندوی ؒ کی تحقیق کے مطابق
570ء کو عام الفیل قرار دیا ہے۔

﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ﴾

”کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟“

(الفیل 1:105)

قلزم
ایلہ
عقبہ
سیناء
مدین
تبوک
ضبا
العلاء
مصر
خیبر
دریائے نیل
ینبع
مدینہ منورہ
(یثرب)
نجد
حجاز
رابغ
صحرائے نوبیہ
مکہ مکرمہ
جدہ
عسیر
بحیرۂ قلزم (احمر)
ابرہہ کا مکہ پر حملہ
نجران
سودان
دریائے نیل
دریائے عطبرہ
صنعاء
مصوع
یمن
اسوم
تعز
عصب
حبشیوں کا یمن پر حملہ
جھیل تانا
باب المندب
جبوتی
خلیج عدن
زیلع
دریائے نیل ازرق
صومالیہ
سطح مرتفع حبشہ
ہرجیسہ
200
400
600
800
کلومیٹر

نقشہ: 4

(بیت اللہ) کو گرانے آیا ہوں، چنانچہ حناطہ مکہ پہنچ کر عبدالمطلب بن ہاشم سے ملا اور کہا کہ مجھے بادشاہ نے آپ کی جانب بھیجا ہے کہ میں آپ پر واضح کر دوں کہ بادشاہ آپ سے جنگ کرنے کے لیے نہیں آیا، صرف اس گھر (بیت اللہ) کو گرا کر واپس چلا جائے گا لیکن اگر تم نے لڑائی کی تو پھر وہ بھی تم سے لڑے گا۔

عبدالمطلب نے جواب دیا کہ ہم بھی اس سے جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے، اس لیے ہم اس کے اور بیت اللہ کے درمیان حائل نہیں ہوں گے۔ اگر اللہ نے اس کی رسی دراز کر دی ہے تو ہم اس سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ حُناطہ نے عبدالمطلب سے کہا، پھر میرے ساتھ بادشاہ کے پاس چلو، چنانچہ عبد المطلب اس کے ساتھ فوجی کیمپ میں چلے گئے۔ ذونفر عبدالمطلب کا دوست تھا، وہ اس کے پاس گئے اور کہا: ''اے ذونفر! جس مصیبت میں ہم مبتلا ہوئے ہیں، کیا تم اس سے نجات کے لیے ہماری مدد کر سکتے ہو؟'' اس نے جواب دیا: ''وہ شخص جو خود قیدی ہو اور صبح و شام اسے موت کا دھڑکا لگا رہتا ہو وہ کسی کی کیا مدد کر سکتا ہے؟ البتہ میں ہاتھیوں کے منتظم انیس کی جانب پیغام بھیجتا ہوں اور اس سے کہتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو، وہ بادشاہ سے تمھارے لیے مفاد حاصل کرے اور تمھارے مقام و مرتبہ کو اس کے سامنے بڑھا چڑھا کر بیان کرے۔'' چنانچہ ذونفر نے انیس کو بلوایا اور اس سے کہا کہ یہ عبدالمطلب قریش کے سردار ہیں۔ مکہ کی تجارت ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بڑے مہمان نواز ہیں۔ پہاڑوں میں رہنے والے جنگلی جانور بھی ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ تمھارے بادشاہ نے ان کے دو سو اونٹ چھین لیے ہیں، یہ میرا دوست ہے۔ اگر تم انھیں کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہو تو ضرور پہنچاؤ۔

انیس فوراً ابرہہ کے پاس گیا اور اس سے کہا: ''اے بادشاہ سلامت! یہ (عبدالمطلب) قریش کا سردار ہے اور مکہ کا بہت بڑا تاجر ہے، اس قدر مہمان نواز ہے کہ جہاں عام لوگ اس سے مستفید ہوتے ہیں وہاں پہاڑوں میں رہنے والے جانور بھی اس سے فیض یاب

ہوتے ہیں۔ وہ شرفِ باریابی کا طالب ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے اجازت مرحمت فرمادیں، وہ خود چل کر آپ کے پاس آیا ہے۔ آپ کا مخالف ہے نہ اس نے آپ کو کوئی نقصان پہنچایا ہے۔'' ابرہہ نے انھیں باریابی کی اجازت دے دی۔

عبدالمطلب بڑے قدآور، بارعب اور خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ جب ابرہہ نے انھیں دیکھا تو وہ ان کی پُر وقار شخصیت سے بڑا متاثر ہوا۔ ان کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ جہاں اس نے نامناسب سمجھا کہ ان کو اپنے ساتھ تختِ شاہی پر بٹھائے، وہاں اس بات کو بھی مناسب خیال نہ کیا کہ وہ زمین پر بیٹھیں، لہٰذا وہ خود ہی تخت شاہی سے اتر کر قالین پر آبیٹھا اور عبدالمطلب کو اپنے ساتھ بٹھالیا۔

عبدالمطلب نے گفتگو کا آغاز کیا کہ اے بادشاہ سلامت! آپ نے میرے اموال کے ایک حصے پر قبضہ کرلیا ہے۔ میرا مال مجھے واپس لوٹا دیں۔ ابرہہ نے جوابًا کہا کہ میں تمھیں دیکھ کر بڑا متاثر ہوا تھا لیکن تمھارا مطالبہ سُن کر میرے دل میں تمھاری کوئی قدر و منزلت نہیں رہی۔ عبدالمطلب نے پوچھا: ''وہ کیوں۔'' ابرہہ نے جواب دیا کہ میں اس گھر کو منہدم کرنے آیا ہوں جو تمھارے اور تمھارے آباء و اجداد کے دین کی بنیاد ہے اور تمھارے دفاع اور قوت کا مرکز ہے۔ مگر تم نے اس کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی، صرف اپنے دو سو اونٹوں کو مذاکرات کا موضوع بنایا ہے۔ عبدالمطلب نے کہا کہ ان اونٹوں کا مالک میں ہوں، (اس لیے میں نے ان کی بات کی ہے)۔ اس گھر کا بھی ایک مالک ہے، وہ خود ہی اس کی حفاظت فرمالے گا۔ ابرہہ نے (بڑی رعونت سے) کہا: ''وہ بھی اسے مجھ سے نہ بچاسکے گا۔ تجھے جو کرنا ہے کرلے، اُسے جو کرنا ہوگا کرلے گا۔''

ابرہہ نے حکم دیا تو عبدالمطلب کے اونٹ انھیں واپس کر دیے گئے، چنانچہ عبدالمطلب نے واپس آکر قریش کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ گھاٹیوں میں بکھر جائیں۔

ابرہہ نے، جو کہ مُغَمَّس میں تھا، مکہ میں داخل ہونے کا عزم کرتے ہوئے لشکر کو تیار کیا اور اپنے ہاتھی پر ضروری سامان رکھوادیا۔ لیکن ہاتھی کو جب حرکت دے کر چلانے لگے تو اس نے چلنے سے انکار کر دیا اور زمین پر بیٹھ جانا چاہا۔ لشکریوں نے اس کے سر پر ہتھوڑے مارے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کو چلانے کے لیے ہر حربہ آزمایا گیا مگر اس نے قدم تک نہ اٹھایا۔ جب انھوں نے اس کا رخ یمن کی طرف کیا تو وہ تیز دوڑنے لگا۔ لیکن حرم کی طرف موڑنے پر وہ دوبارہ رک گیا اور ایک پہاڑ کے ساتھ جا لگا۔ اتنے میں اللہ نے سمندر کی طرف سے چڑیوں جیسے پرندوں کے جھنڈ بھیج دیے۔ ہر پرندے کے پاس تین تین کنکریاں تھیں۔ دو دو ان کے پنجوں میں اور ایک ایک چونچ میں۔ کنکریوں کی جسامت چنے اور مسور کے دانوں کے برابر تھی۔ پرندے ان کے اوپر سے گزرتے اور کنکریاں گراتے چلے گئے۔ جس کو بھی وہ کنکری لگتی، ہلاک ہوجاتا۔ اس طرح فوج کے خاصے سپاہی مارے گئے۔ جو بچ گئے انھوں نے واپس بھاگنا شروع کر دیا۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کا ذکر سورۂ فیل میں کیا گیا ہے۔

ابرہہ کے لشکریوں نے تیزی سے واپس بھاگنا شروع کر دیا۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی مرکر جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے جسم میں ایک بیماری پیدا کردی جس سے اس کا پور پور گرنے لگا۔ جب بھی کوئی پور گرتا تو وہاں سے خون اور پیپ رسنا شروع ہوجاتا۔ جب وہ اپنے بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ یمن پہنچا تو چوزے کی طرح ہو چکا تھا، پھر اسی حالت میں مر گیا۔[1]

ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں بیان کیا ہے کہ عبدالمطلب نے بہت سے قریشی لوگوں کی معیت میں بیت اللہ کے دروازے کا کنڈا پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے ابرہہ اور اس کے لشکر کے مقابلے میں مدد طلب کی۔ عبدالمطلب نے باب کعبہ کا کنڈا پکڑ کر یہ اشعار پڑھے:

---

[1] السيرة النبوية لأبي حاتم البستي، ص:34-39، و السيرة النبوية لابن كثير:1/30-37.

لَاهُمَّ إِنَّ الْعَبْدَ يَمْ نَعُ رَحْلَهُ فَامْنَعْ حَلَالَكْ
لَا يَغْلِبَنَّ صَلِيبُهُمْ وَ مِحَالُهُمْ غَدْوًا مِّحَالَكْ
إِنْ كُنْتَ تَارِكَهُمْ وَ قِبْلَتَنَا فَأَمْرٌ مَّا بَدَا لَكْ

”اے اللہ! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔ کل ان کی صلیب اور تدبیر تیری تدبیر پر غالب نہ آجائے، اگر تو انھیں اور ہمارے قبلے کو اپنے حال پہ چھوڑنا چاہتا ہے تو تیری مرضی۔ تو جو چاہے کر۔“

دعا کے بعد عبدالمطلب نے باب کعبہ کا کنڈا چھوڑ دیا اور قریش کے لوگوں کو ساتھ لے کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر پناہ گزیں ہوگئے اور اس انتظار میں رہے کہ ابرہہ مکہ میں داخل ہوکر کیا کرتا ہے۔ اس کے بعد ابن اسحاق نے ابرہہ اور اس کے لشکر کی ہلاکت کا واقعہ بیان کیا ہے۔[1]

اصحاب الفیل کے واقعے سے حاصل ہونے والے اسباق، عبرتیں اور نتائج

کعبۃ اللہ کا شرف و فضل: اس واقعے سے بیت اللہ کی فضیلت و عظمت واضح ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے تعمیر ہونے والا یہ پہلا گھر ہے۔ مشرکین عرب اس گھر کی بہت تعظیم کرتے تھے، اسے نہایت مقدس سمجھتے تھے اور کسی بھی چیز کو اس پر فوقیت نہیں دیتے تھے۔ یہ مقام و مرتبہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے دین کی باقیات کا ایک حصہ تھا جو عربوں میں چلا آرہا تھا۔

مکہ اور اہل عرب سے عیسائیوں کا حسد: بیت اللہ کی تعظیم کرنے والے عربوں اور سرزمینِ مکہ کے بارے میں عیسائیوں کے دلوں میں حسد اور بغض کے جو جذبات پنہاں تھے، کھل کر سامنے آگئے۔ اسی وجہ سے ابرہہ نے قُلَّیس نامی گرجا تعمیر کرکے عربوں کو بیت اللہ

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام بشرح الخشني، ص: 84-91.

کی تعظیم سے ہٹانا چاہا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ترغیب و ترہیب کے حربے بھی استعمال کیے مگر عرب اپنے موقف پہ ڈٹے رہے۔ یہ کشمکش اس حد تک پہنچ گئی کہ ایک اعرابی نے اظہارِ نفرت کے لیے قُلَّیس گرجا کو گندگی سے آلودہ کر دیا۔

امام رازی رحمہ اللہ اس آیت: ﴿ أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ۝ ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ کید کے معنی ہوتے ہیں: ”خفیہ طریقے سے دوسرے کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کرنا۔ اگر کوئی سوال کرے کہ ابرہہ کے اس معاملے کو ”کید“ کا نام کیوں دیا گیا، حالانکہ اس کا معاملہ واضح تھا، اس نے بیت اللہ کو منہدم کرنے کا اعلان کیا تھا، تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ابرہہ کے دل میں جو عزائم تھے وہ اس اعلان سے بھی زیادہ بدترین تھے۔ اس کے دل میں عربوں کے لیے بہت حسد تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کعبے کی وجہ سے جو شرف انھیں حاصل ہوا ہے، ان سے چھین کر اپنی ذات اور اپنے علاقے کے لیے خاص کر دے۔[1]

مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے جذبۂ قربانی: بیت اللہ کی حفاظت کے لیے شاہانِ حمیر میں سے ایک بادشاہ ابرہہ اور اس کے لشکر سے ٹکرا جاتا ہے اور شکست کی صورت میں اس کا قیدی بن جاتا ہے۔ اسی طرح نفیل بن حبیب خثعمی نے یمنی قبائل کو اپنے ساتھ ملا کر ابرہہ سے جنگ کی مگر لشکر جرار کا مقابلہ نہ کر سکے لیکن اپنے مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے جانوں کے نذرانے ضرور پیش کیے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مقدس اشیاء کی حفاظت اور اس کی خاطر قربانی کا جذبہ ایک ایسی چیز ہے جو انسانی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔

قومی غداروں کی رسوائی: دشمن کے مفاد کے لیے کام کرنے والے جن لوگوں نے ابرہہ کے ساتھ تعاون کیا، اس کے جاسوسوں کا کردار ادا کیا اور بیت اللہ کی جانب اس کی رہبری کی تاکہ وہ بیت اللہ کو گرانے کا عزم پورا کر سکے، وہ دنیا و آخرت میں ملعون قرار پائے۔

---

[1] تفسير الرازي: 32/94.

لوگوں نے ان کے لیے لعنت کی اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انھیں اپنی رحمت سے دور کر کے ملعون بنا دیا۔ ابورغال کی قبر بددیانتی اور غداری کی علامت بن گئی۔ یہ لوگوں کے دلوں میں مبغوض و ناپسندیدہ ٹھہرا اور اس کی قبر کے قریب سے گزرنے والا ہر شخص اسے پتھر مارتا۔

اللہ تعالیٰ کے خلاف معرکہ آرائی کی حقیقت: سردار مکہ عبدالمطلب کے اس قول کہ ”ہم اس (ابرہہ) کے اور بیت اللہ کے درمیان حائل نہیں ہوں گے۔ اگر اللہ نے اس کی رسی دراز کردی ہے (اور اسے اس کے ارادے سے نہیں روکتا) تو ہم تو اس سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے“ اس میں ایک باریک نکتہ ہے جو اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے دشمنوں کے درمیان معرکہ آرائی میں ناکامی و ذلت دشمن ہی کا مقدر ہے۔ دشمن کی قوت اور طاقت خواہ کتنی ہی ہو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت، پکڑ اور سزا کے سامنے لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ وہی زندگی عطا کرنے والا ہے اور جب چاہے اسے واپس لے سکتا ہے۔[1]

علامہ جمال الدین قاسمی رحمہ اللہ نے امام قاشانی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے: ”اصحاب الفیل کا واقعہ مشہور ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے متصل ظہور پذیر ہوا۔ یہ قدرت الٰہی کی نشانیوں میں سے ایک عظیم نشانی ہے اور ان لوگوں کے لیے اس کی ناراضی کا ایک مظہر ہے جو اس کے حرم کی بے حرمتی کی جسارت کریں۔“[2]

بیت اللہ اور اس کے متولیوں کی تعظیم: عربوں کے دلوں میں بیت اللہ کی عظمت اور زیادہ بڑھ گئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت فرمائی۔ دشمنوں کی سازشوں اور مفسدین کی شرارتوں سے اسے بچایا۔ عربوں کے دلوں میں قریش کی عظمت بھی دو چند ہوگئی۔ وہ کہنے لگے کہ یہ تو اللہ والے ہیں، اللہ نے ان کی لڑائی خود لڑی اور خود ہی ان کے دشمنوں کو تباہ کردیا۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نشانی تھی اور مکہ سے ایک ایسے نبی

---

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 112. [2] محاسن التفسير للقاسمي: 262/17.

کی بعثت کا پیش خیمہ تھا جو کعبہ کو بتوں سے پاک کرے گا، اس کی شان بلند کرے گا اور اس کی عظمتِ رفتہ بحال کرے گا۔[1]

واقعۂ فیل نبوت کی دلیل: بعض علماء نے کہا ہے کہ واقعۂ فیل نبوت کے شواہد اور دلائل میں سے ہے۔ امام ماوردی رحمہ اللہ اسی سلسلے میں فرماتے ہیں: حاکم ہونے کی نشانیاں نمایاں اور نبوت کے شواہد واضح ہیں۔ ان کا آغاز انجام کی خبر دے رہا ہے۔ ان میں جھوٹ اور سچ کی آمیزش نہیں۔ حق ممتاز ہوتا ہے، ان شواہد کی قوت اور انتشار کے مطابق یہ نبوت کی بشارتیں اور انذارات ہوتی ہیں۔

جب ولادت رسول اللہ ﷺ کا زمانہ قریب آیا تو علاماتِ نبوت کی عطر بیزیاں اور برکات کا ظہور شروع ہوگیا۔ ان میں سے بڑا اور سب سے زیادہ شہرت پانے والا واقعۂ فیل ہے۔ اس واقعے میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی علامت اس طرح ہے کہ آپ اس زمانے میں سرزمین مکہ کے اندر بطنِ مادر میں تھے کیونکہ اس واقعے کے پچاس دن بعد 12 ربیع الاول بروز سوموار آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔[2] جبکہ آپ کے والد گرامی اس سے پہلے وفات پا گئے تھے۔ یہ واقعہ دو اعتبار سے بڑی نشانی ہے:

① اگر وہ (اصحاب الفیل) غالب آجاتے تو اہل مکہ کو غلام اور قیدی بنا لیتے مگر اللہ تعالیٰ نے انھیں ہلاک کردیا تاکہ اس کے رسول ﷺ پر دونوں حالتوں، بطن مادر اور بچپن میں قید اور غلامی کے لمحات نہ آئیں۔

② قریش کا اپنے معبود حقیقی سے کوئی ایسا تعلق نہ تھا جس کی وجہ سے انھیں اس بات کا مستحق سمجھا جاتا کہ انھیں اصحاب الفیل سے بچایا جائے اور نہ ہی وہ اہل کتاب تھے بلکہ ان میں کچھ بتوں کے پجاری، کچھ مورتیوں کے معتقد، کچھ زندیق اور کچھ آخرت کے منکر تھے۔

---

[1] السیرة النبویة للندوي، ص: 92.

[2] قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری رحمہ اللہ نے تقویمی تحقیق کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ آپ ﷺ کی ولادت باسعادت 9 ربیع الاول کو ہوئی۔ دیکھیے: رحمة للعالمین: 70,69/1.

جب اللہ تعالیٰ نے نبوت کی تاسیس اور کعبہ کی تعظیم کے لیے غلبۂ اسلام کا ارادہ فرمایا اور عرب میں یہ خبر پھیل گئی کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ہاتھیوں والے لشکر کو تباہ و برباد کیا تو لوگوں پر حرم کی ہیبت چھا گئی اور وہ قریش کے پہلے سے بھی زیادہ مطیع و فرمانبردار بن گئے اور کہنے لگے کہ یہ تو بڑے اللہ والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی لڑائی خود لڑی اور خود ہی ان کے دشمنوں کی چالوں کو ناکام بنا دیا۔ یوں قریش ان کے نزدیک اور زیادہ قابل تعظیم ہو گئے۔ رفادہ،[1] سِقایہ[2] اور سدانہ[3] کا سارا انتظام قریش کے ہاتھ میں آ گیا۔

اس طرح قریش مذہبی پیشوا اور محبوب قائد بن گئے اور اصحاب الفیل زمانۂ ماضی کی ایک ضرب المثل بن کر رہ گئے۔[4]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”واقعہ اصحاب الفیل نبی کریم ﷺ کی پیدائش کے سال ہوا۔ بیت اللہ کے قرب وجوار میں رہنے والے لوگ مشرک تھے جو بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ ان مشرکین کی نسبت عیسائیوں (بیت اللہ پر حملہ کرنے والے اصحاب الفیل) کا مذہب بہتر تھا۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب الفیل کی تباہی بیت اللہ کے آس پاس آباد لوگوں کی وجہ سے نہ ہوئی تھی بلکہ بیت اللہ کی وجہ سے ہوئی تھی یا نبی کریم ﷺ کی وجہ سے کیونکہ آپ ﷺ کی ولادت مبارکہ اسی سال بیت اللہ کے پاس ہوئی۔ ممکن ہے دونوں وجوہات ہوں۔ الغرض وجہ جو بھی ہو یہ واقعہ آپ ﷺ کی نبوت کے دلائل میں سے ایک دلیل تھی۔“[5]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں واقعہ اصحاب الفیل کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے لیے تمہید اور پیش خیمہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس

---

[1] رفادہ: ایک مخصوص رقم ہوتی تھی جو قریش ہر سال آپس میں جمع کرتے، پھر ایام منیٰ میں حجاج کرام کی ضیافت کرتے تھے۔ [2] سقایہ: زمانۂ جاہلیت میں حجاج کے کھانے پینے اور ان کی میزبانی کا انتظام سقایہ کہلاتا تھا۔ [3] سدانہ: خانہ کعبہ کی خدمت اور کلید برداری کو سدانہ کہا جاتا تھا اور کعبے کے خادم کو سادن کہتے تھے۔ [4] أعلام النبوة للماوردي: 185-189. [5] الجواب الصحيح لابن تيمية: 4/122.

لیے کہ مشہور ترین قول کے مطابق اسی سال آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ گویا قدرت زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ اے قریش کی جماعت! اللہ تعالیٰ نے اہل حبشہ کے خلاف تمھاری مدد اس لیے نہیں کی کہ تم ان سے بہتر ہو۔ یہ تو اس مقدس گھر کی حفاظت کے لیے کی تھی جسے ہم اپنے آخری نبی اُمّی محمد ﷺ کی بعثت کے ساتھ مزید شرف و منزلت عطا کرنا چاہتے تھے۔[1]

بیت اللہ اور حفاظت الٰہی: اللہ تعالیٰ نے خود اس گھر کی حفاظت فرمائی۔ اہل کتاب (ابرہہ اور اس کے لشکر) کو یہ طاقت نہ دی کہ بیت اللہ کو تباہ کریں یا اس مقدس سرزمین پر غالب آئیں، حالانکہ شرک اپنی نجاست سے اسے آلودہ کررہا تھا اور مشرکین اس کے پاسبان بنے بیٹھے تھے۔ یہ حکمتِ الٰہی تھی کہ بیت اللہ غاصبوں کے تسلط سے آزاد اور دسیسہ کاروں کے مکر سے محفوظ رہے اور اس سرزمین کی آزادی بھی برقرار رہے تاکہ یہاں جدید نظریات و افکار (اسلامی عقائد) آزاد فضا میں پروان چڑھ سکیں۔ کوئی غاصب اس پر غلبہ پاسکے نہ کوئی سرکش اس پر اثر انداز ہوسکے اور اسلام جو تمام ادیان اور تمام انسانوں پر غالب ہونے کے لیے آیا ہے، جو کسی کی پیروی و اطاعت کے لیے نہیں بلکہ عالمِ انسانیت کی قیادت کے لیے آیا ہے، اس پر کوئی غالب نہ آسکے۔ یہ اس گھر اور اس دین کی حفاظت کے لیے ایک تدبیر الٰہی تھی جو اس وقت بروئے کار لائی گئی جب کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس دین کے پیغمبر کی ولادت باسعادت اسی سال ہوگی۔[2]

آج جب عالمی صلیبی اور صہیونی طاقتیں ان مقدس مقامات کے بارے میں غلط اور بُرے عزائم رکھتی ہیں اور ان کی خفیہ اور مکروہ سازشیں ان عزائم کو پورا کرنے کے لیے بتدریج آگے بڑھ رہی ہیں تو اصحاب الفیل کے واقعے میں تدبیر الٰہی سے ہمیں حوصلہ اور اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہود و نصاریٰ کے مقابلے میں بیت اللہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر: 4/549,548. [2] السیرۃ النبویۃ لأبي فارس، ص: 113.

کی حفاظت فرمائی جب اس کے نگران مشرک تھے تو اب بھی وہ یقیناً مکہ مکرمہ اور اپنے نبی کے شہر مدینہ منورہ کو بدخواہوں کے عزائم اور سازشیوں کے مکر وفریب سے محفوظ رکھے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔[1]

واقعۂ فیل سے عربوں کی نئی تاریخ کا آغاز: اصحاب الفیل کے ساتھ جو کچھ ہوا، عربوں نے اس کو بڑی اہمیت دی اور اس واقعے سے ایک نئی تاریخ شروع کی، چنانچہ ان کی تحریر وگفتگو میں یہ نمونے ملتے ہیں کہ فلاں واقعہ عام الفیل میں پیش آیا، یا فلاں شخص عام الفیل میں پیدا ہوا، یا یہ واقعہ عام الفیل کے اتنے سال بعد پیش آیا۔

عام الفیل (اصحاب الفیل کی تباہی کا سال) 570 عیسوی کے مطابق ہے۔[2]

---

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 3980/6. [2] السیرۃ النبویۃ للندوي: 93.

باب 2

ولادت باسعادت سے حلف الفضول تک کا سفر

نبی کریم ﷺ کا نسب

نبی کریم ﷺ اخلاق وکردار اور فطرت ومزاج کے لحاظ سے اکمل ترین انسان اور نسب کے لحاظ سے اعلیٰ واشرف نسب کے حامل تھے۔ آپ کے نسب کی فضیلت میں بہت سی صحیح احادیث موجود ہیں۔ صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اصْطَفٰی كِنَانَةَ مِنْ وَّلَدِ إِسْمَاعِيلَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ، وَاصْطَفٰی قُرَيْشًا مِّنْ كِنَانَةَ، وَ اصْطَفٰی مِنْ قُرَيْشٍ بَنِي هَاشِمٍ وَّاصْطَفَانِي مِنْ بَنِي هَاشِمٍ»

”اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کا انتخاب فرمایا اور کنانہ سے قریش کو چنا، قریش سے بنی ہاشم کو منتخب کیا اور بنی ہاشم سے میرا انتخاب فرمایا۔“ [1]

امام بخاری نے نبی کریم ﷺ کا نسب اس طرح بیان کیا ہے: ابو القاسم محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قُصَی بن کلاب بن مُرّۃ بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مُدرِکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معدّ بن عدنان۔ [2]

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2276. [2] صحیح البخاري، قبل الحدیث: 3851.

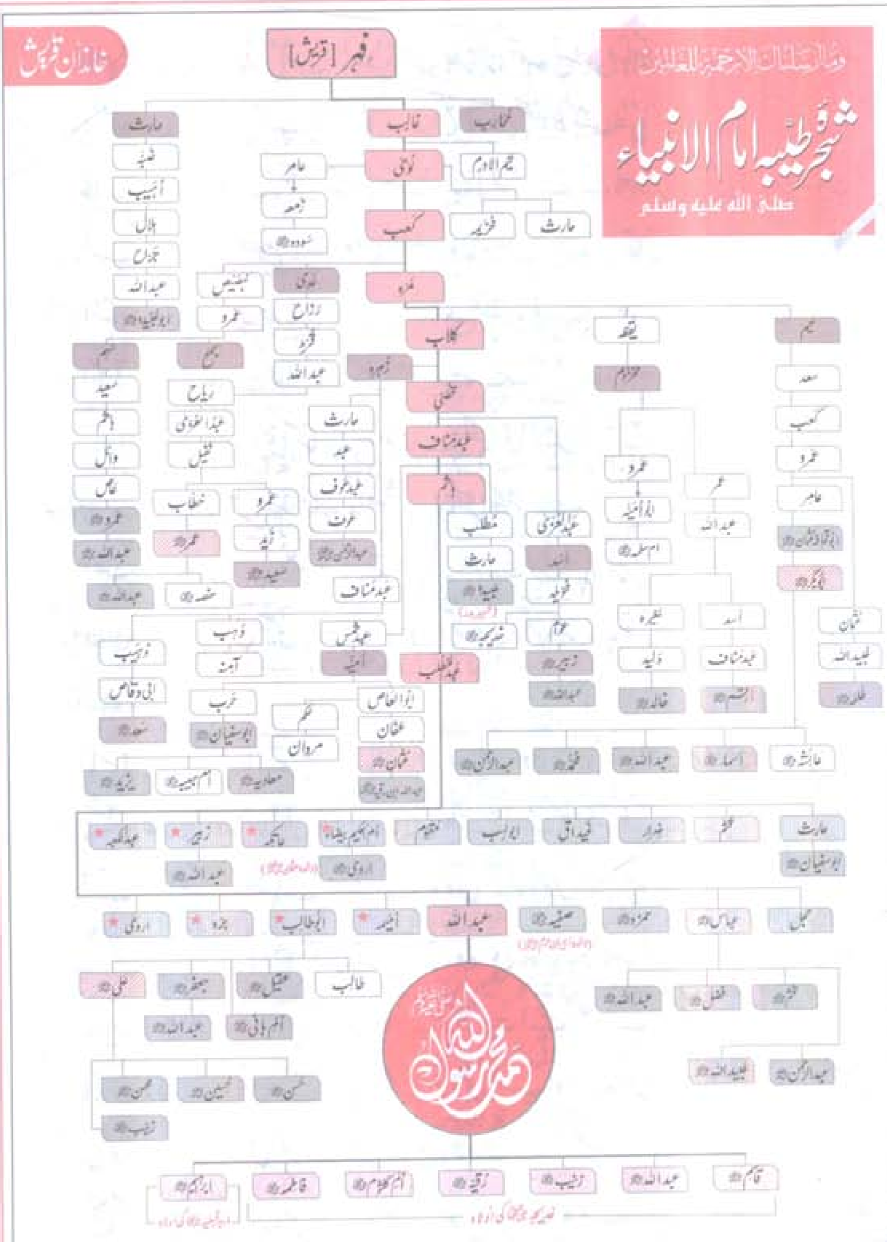
خاندان قریش
وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین
شجرۂ طیبہ امام الانبیاء
صلی اللہ علیہ وسلم
فہر [قریش]
غالب
محارب
حارث
لؤی
تیم الادرم
عامر
کعب
خزیمہ
حارث
مرہ
عدی
ہصیص
کلاب
یقظہ
تیم
زہرہ
قصی
مخزوم
عبد مناف
ہاشم
عبدالعزیٰ
مطلب
عبدالمطلب
عبد شمس
امیہ
عبداللہ
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ابو طالب
عباس
حمزہ
صفیہ
ابو لہب
علی
جعفر
عقیل
طالب
ام ہانی
حسن
حسین
محسن
زینب
قاسم
عبداللہ
زینب
رقیہ
ام کلثوم
فاطمہ
ابراہیم
خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اولاد
ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی اولاد
عثمان
ابو بکر
عمر
عائشہ
اسماء
عبداللہ
محمد
عبدالرحمٰن
ابو سفیان
معاویہ
ام حبیبہ
یزید
ابو العاص
عفان
مروان
حکم
سعد
ابی وقاص
زہرہ
وہب
آمنہ
حرب
خطاب
زید
سعید
عبدالرحمٰن
عوف
عبد عوف
خالد
ولید
مغیرہ
ام سلمہ
ابو امیہ
ارقم
زبیر
اسد
خویلد
عوام
خدیجہ
طلحہ
عبیداللہ
عبیدہ
حارث
ابو عبیدہ

▨ فہر قریش سے محمد ﷺ تک شجرۂ نسب
▨ قبائل کے بانی افراد
▨ عبدالمطلب کی اولاد
▨ صحابہ وصحابیات رضی اللہ عنہم
▨ نبی کریم ﷺ کی اولاد
□ نبی کریم ﷺ کی قرشی ازواج
▨ جنت کی بشارت پانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم
▨ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم
★ [illegible]

ماخذ: الأطلس التاریخي لسیرة الرسول ★ معجم قبائل العرب ★ أسد الغابة ★ [illegible] ★ الشجرة الزکیة

امام بغوی رحمہ اللہ نے ''شرح السنۃ'' میں عدنان تک نسب مبارک ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ''عدنان سے اوپر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب صحیح طور پر محفوظ نہیں۔'' [1]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی عدنان تک نسب ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ''یہاں (عدنان) تک نسب صحیح طور پر معلوم ہے۔ اس پر علماء و ماہرینِ نسب کا اتفاق ہے اور کسی بات میں بھی اختلاف نہیں، جبکہ عدنان سے اوپر معاملہ مختلف فیہ ہے۔ علمائے نسب کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ عدنان اولاد اسماعیل میں سے ہے۔'' [2]

امام ابن سعد رحمہ اللہ اپنی کتاب ''الطبقات الکبریٰ'' میں فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک عدنان سے اوپر اسماعیل علیہ السلام تک خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ [3]

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم نے کوئی ایسا ماہرِ نسب نہیں دیکھا جو عدنان اور قحطان سے اوپر کوئی یقینی بات جانتا ہو۔ اگر کوئی کچھ کہتا ہے تو محض اندازے کے ساتھ کہتا ہے۔ [4]

امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''بالاتفاق عدنان اولادِ اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام میں سے ہیں۔ لیکن عدنان اور اسماعیل علیہ السلام کے مابین علمائے نسب کا اختلاف ہے۔'' [5]

نسب کی اہمیت و فضیلت ہمیشہ سے لوگوں کے دلوں میں موجود رہی ہے کیونکہ عالی نسب شخص کی قیادت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، وہ نبی ہو یا بادشاہ۔ اس کے مقابلے میں حقیر نسب والے کی قیادت تسلیم نہیں کی جاتی۔ اکثریت ایسے شخص کے جھنڈے تلے جمع ہونے کو ناپسند کرتی ہے، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ نسب اور خاندان ملا تاکہ یہ شرف و فضل لوگوں کو آپ کے گرد جمع کرنے میں معاون ثابت ہو۔ [6]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل مبارک بہت پاکیزہ اور نہایت عمدہ ہے۔ آپ اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام

---

[1] شرح السنة للبغوي: 193/13. [2] زاد المعاد: 71/1. [3] الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 58/1.
[4] الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 58/1. [5] السيرة النبوية للذهبي، ص: 1. [6] دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص: 96.

اور ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی نسل میں سے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی قبولیت کا مظہر اور اپنے بھائی عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے دی گئی بشارت ہیں، جیسا کہ خود آپ ﷺ نے اپنے بارے میں فرمایا: «أَنَا دَعْوَةُ أَبِي إِبْرَاهِيمَ وَ بِشَارَةُ أَخِي عِيسٰى» ”میں اپنے باپ (جدامجد) ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور اپنے بھائی عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔“[1]

نسل کی پاکیزگی اور نسب کی بلندی انسان کو گھٹیا امور سے بچاتی ہے اور فضائل و محاسن حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ انبیاء و رسل اور داعیانِ حق اس بات کے بہت زیادہ خواہش مند ہوتے ہیں کہ ان کے نسب پاکیزہ اور ان کی نسل عمدہ ہو۔ اس وصف کے ساتھ وہ لوگوں میں متعارف ہوں تاکہ لوگ انھیں اچھا سمجھ کر ان کی بات پر اعتماد کریں۔[2]

نبی کریم ﷺ کا جو اعلیٰ و افضل نسب بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں کو دیگر لوگوں پر فوقیت عطا کی ہے اور قریش کو دیگر قبائل پر فضیلت سے نوازا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے محبت کا تقاضا ہے کہ اس قوم سے محبت کی جائے جس قوم سے آپ کا تعلق ہے اور اس قبیلے سے بھی جس میں آپ ﷺ کی ولادت ہوئی۔ اس کا مقصود یہ نہیں کہ قوم یا قبیلے کے ہر فرد یا شخصیت سے محبت کی جائے بلکہ یہ محبت خالصتاً ان افراد و شخصیات کے مجموعے، یعنی قوم یا قبیلے سے ہوگی، مثلاً عربوں کے قریشی قبیلے کے اس شرف و فضیلت کو تسلیم کرنا ہوگا جو انھیں محض رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نسبت سے حاصل ہوا ہے۔ اگر کوئی عربی یا قریشی اللہ کے دین سے انحراف کرتے ہوئے خود کو اس مقامِ فضیلت سے گرا بیٹھے جو اللہ نے اپنی بندگی کرنے والوں کو عطا کیا ہے تو دین سے یہ انحراف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس کی نسبت کو ختم کر دے گا، پھر اس نسبت کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ وہ اپنے انجامِ بد کو پہنچے گا۔[3]

---

[1] المستدرك للحاكم: 600/2، و مسند أحمد: 127/4، و مجمع الزوائد: 222/8. [2] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 102. [3] فقه السيرة للبوطي: 45.

جناب عبد اللہ بن عبد المطلب کا نکاح اور آمنہ کا خواب

نبی کریم ﷺ کے والد گرامی عبد اللہ بن عبد المطلب نسبتاً اپنے بھائیوں کے اپنے والد عبد المطلب کو بہت زیادہ محبوب تھے۔ جب عبد اللہ بن عبد المطلب نذر کی وجہ سے ذبح ہونے سے بچ گئے۔[1] اور ان کی جگہ عبد المطلب نے سو اونٹ بطور فدیہ دے دیے تو ان کی شادی حضرت آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب سے کردی جو کہ مکہ کی عورتوں میں سب سے زیادہ عالی نسب خاتون تھیں۔[2] شکمِ مادر میں استقرارِ رحم کے کچھ ہی عرصے کے بعد آپ ﷺ کے والد گرامی کا انتقال ہوگیا۔ وہ ایک تجارتی قافلے کے ساتھ شام سے واپس آرہے تھے۔ جب مدینہ پہنچے تو داعی اجل کا پیغام آپہنچا، چنانچہ انھیں اپنے ننھیال بنو عدی بن نجار کے ہاں مدینہ میں دفن کر دیا گیا۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی

---

[1] اس نذر کی تفصیل کچھ اس طرح ہے: جب سردار عبدالمطلب چاہ زم زم کی تلاش میں زمین کھود رہے تھے اس وقت ان کا صرف ایک ہی بیٹا حارث تھا۔ قریش نے ان کا مذاق اڑایا تو انھوں نے نذر مانی کہ اللہ تعالیٰ نے اگر انھیں دس بیٹے عطا کیے اور وہ ان کے لیے قوت کا ذریعہ بنے تو وہ ایک بیٹا کعبہ کے پاس ذبح کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دس بیٹے عطا کر دیے اور وہ جب ان کے قوت کا ذریعہ بنے تو انھوں نے اپنے بیٹوں کو اپنی نذر سے آگاہ کیا اور نذر پوری کرنے کی ترغیب بھی دی۔ چنانچہ جب قرعہ اندازی کی گئی تو عبداللہ کا نام نکلا جو عبدالمطلب کو سب سے پیارا تھا۔ عبدالمطلب نے چھری سنبھالی اور انھیں لے کر ذبح کرنے کے لیے اساف اور نائلہ کی طرف چل پڑے۔ لیکن عبداللہ کے ماموں زاد مغیرہ مخزومی کہنے لگے: اللہ کی قسم! ہمیں اس کی جان بچانے کے لیے سارا مال بھی قربان کرنا پڑا تو ہم دریغ نہیں کریں گے۔ پھر وہ ایک کاہنہ کے پاس گئے تو اس نے کہا: ایک آدمی کے قتل کے عوض تم کیا دیت دیتے ہو؟ کہا گیا کہ دس اونٹ دیتے ہیں۔ اس نے کہا دس اونٹوں اور عبداللہ کے درمیان اس وقت تک قرعہ اندازی کرتے رہو جب تک اونٹوں کا قرعہ نہ نکلے۔ وہ قرعہ اندازی کرتے رہے جب سو اونٹ ہوئے تب اونٹوں کا قرعہ نکلا۔ چنانچہ سو اونٹ ذبح کر دیے گئے اور اس طرح عبداللہ کی جان بچ گئی۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 1/151-155، والطبقات لابن سعد: 1/89,88)

[2] وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 46.

سوائے اس مبارک وجود کے جو ابھی ماں کے پیٹ میں تھا، گویا تقدیر زبانِ حال سے عبداللہ بن عبدالمطلب سے کہہ رہی تھی: ”تیری زندگی کا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ تیری پیدا ہونے والی اولاد کی تربیت و پرورش خود ذاتِ الٰہی اپنی حکمت و رحمت کے ساتھ فرمائے گی تاکہ عالمِ بشریت کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی جانب لایا جاسکے۔“

جناب عبداللہ بن عبدالمطلب کی حضرت آمنہ کے ساتھ شادی ہی آپ ﷺ کی نبوت کے امور کا نقطۂ آغاز نہ تھا (بلکہ بہت سے دیگر امور بھی تھے) جیسا کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا: ”آپ کی نبوت کا نقطۂ آغاز کیا تھا؟“[1] آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَنَا دَعْوَةُ أَبِي إِبْرَاهِيمَ وَ بُشْرٰی عِيسٰی وَ رَأَتْ أُمِّي أَنَّهُ خَرَجَ مِنْهَا نُورٌ أَضَاءَتْ مِنْهُ قُصُورُ الشَّامِ»

”میں اپنے باپ (جد امجد) ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔ میری والدہ نے دیکھا کہ ان سے ایک نور نکلا جس سے شام کے محلات روشن ہوگئے۔“[2]

مولانا الطاف حسین حالی نے اس حدیث کے مفہوم کو یوں منظوم کیا ہے ؎

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل و نویدِ مسیحا

دعائے ابراہیم علیہ السلام

رسول اللہ ﷺ کا دعائے ابراہیم ہونا اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○﴾

---

[1] وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 46. [2] مسند أحمد: 262/5، والمستدرك للحاكم: 600/2، و مجمع الزوائد: 221/8.

> ”اے ہمارے رب! اور ان لوگوں کے لیے انھی میں سے ایک رسول بھیج، وہ ان کے سامنے تیری آیتیں تلاوت کرے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور انھیں پاک کرے، بے شک تو ہی غالب، خوب حکمت والا ہے۔“ [1]

بشارتِ عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ ﷺ کی آمد کی بشارت دی تھی، جیسا کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ط ﴾

> ”اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! بے شک میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس (کتاب) تورات کی جو مجھ سے پہلے ہے اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں، وہ میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا۔“ [2]

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان: ”میری والدہ نے دیکھا کہ ان سے ایک نور نکلا جس سے شام کے محلات روشن ہوگئے۔“ کے بارے میں امام ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وضع حمل کے وقت اس نور کا نکلنا اُس نور کی جانب اشارہ تھا جو آپ ﷺ لے کر آئے اور جس سے روئے زمین کے لوگوں نے ہدایت حاصل کی اور اس خطۂ ارضی سے شرک کی تاریکیاں ختم ہوگئیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ○ ﴾ ”یقیناً تمھارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور واضح کرنے والی کتاب آ گئی ہے۔“ [3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”آپ ﷺ کے نور کے ظہور کو ملک شام کے ساتھ

---

[1] البقرۃ 129:2۔ [2] الصف 6:61۔ [3] المآئدۃ 15:5۔

خاص کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کا دین بلاد شام میں خوب مضبوط ہوگا۔ صحیح احادیث کے مطابق آخری زمانے میں شام کا علاقہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک مضبوط قلعہ ہوگا۔ اور یہیں دمشق کی مشرقی جانب سفید مینار پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا (آسمان سے) نزول ہوگا۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ، لَا يَضُرُّهُمْ مَّنْ خَذَلَهُمْ، وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ كَذٰلِكَ»

''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔ انھیں بے یارومددگار چھوڑنے والے نقصان پہنچا سکیں گے نہ ان کی مخالفت کرنے والے، یہاں تک کہ اللہ کا حکم (قیامت) آجائے۔''[1]

صحیح بخاری ہی میں سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: «وَ هُمْ بِالشَّامِ» ''اور وہ شام کے علاقے میں ہوں گے۔''[2]

ولادت مصطفیٰ ﷺ

رسول اکرم ﷺ کی ولادت بالاتفاق سوموار کو ہوئی۔ اکثر کا خیال ہے کہ یہ 12 ربیع الاول کی تاریخ تھی۔[3] اور اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ آپ اسی سال پیدا ہوئے جس سال اصحاب الفیل کا واقعہ پیش آیا اور شعب بنی ہاشم میں واقع ابو طالب کے گھر میں آپ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔[4]

لیبیا کے ایک شاعر و ادیب استاذ محمد بشیر المغیربی نے مخصوص انداز میں ولادت

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1920. [2] صحیح البخاري، حدیث: 3641و7311. [3] السیرة النبویة لابن کثیر: 203/1. قاضی سلیمان سلمان منصور پوری رحمہ اللہ نے تقویمی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت باسعادت 9 ربیع الاول کو ہوئی، دیکھیے: (رحمة للعالمین ﷺ: 70,69/1) [4] وقفات تربویة مع السیرة النبویة لأحمد فرید، ص: 47.

رسول ﷺ کا تذکرہ کیا ہے جو بن غازی سے شائع ہونے والے اخبار ’’الوطن‘‘ میں 1947ء میں شائع ہوا:

’’زمانہ زندگی کی انتہائی کمزور حالت کو پہنچ گیا ہے لیکن (ولادت رسول ﷺ کا) دن ہمیشہ جوان رہے گا۔

وہ صدیوں کے جھرمٹ میں ایک فاتح کی شان سے چل رہا ہے اور برسوں کو سواری بنا کر اس پر سوار ہے۔

زمانے نے اپنے ایام میں اس (یوم ولادت رسول ﷺ) کے لیے ایک تخت شاہی بنایا۔ اس طرح یہ دن زمانے کا دائمی تاج بن گیا۔

اس کی وجہ سے اقوام کے قدم اس طرح اٹھنے لگے جیسے بلوغت کی عمر کو پہنچنے والے بچے کے قدم (مضبوط اور درست) ہوتے ہیں۔

وہ کتنا عظیم دن ہے جو اس وجود مسعود کو لے کر آیا جو تمام جہانوں کے لیے مجسمۂ رحمت ہے، ان کی عزت کا سامان اور ترقی کا ضامن ہے۔

اور آپ ﷺ کی وجہ سے اس کائنات کو وہ حقیقت ملی جس نے زندگی کے راز کو آشکار کر دیا۔ اور آپ ﷺ نے دنیا میں لوگوں کے لیے راستہ روشن کر دیا تاکہ لوگ متقی بن کر آخرت کو جائیں۔

آپ ﷺ کی (ضیاء پاشیوں کی) وجہ سے شاید یہ دنیا سورج سے کہہ دیتی کہ مجھے اب تیری ضرورت نہیں کیونکہ مجھے میری روشنی مل چکی ہے۔‘‘

اسی شاعر نے قاہرہ میں منعقدہ کانفرنس بعنوان ’’طرابلس الغرب الثقافی‘‘ میں 1949 میں یہ اشعار کہے:[1]

’’اگر چہ میں مدحِ رسول کا حق ادا نہیں کر سکتا، پھر بھی میں دشمنوں کو ذلیل کرنے

---

[1] مؤلف کہتے ہیں کہ میں نے یہ اشعار خود شاعر کی زبانی سنے تھے۔

کے لیے مدحِ رسول میں نغمہ سرائی کروں گا۔

میں آسمان کو یوں دیکھ رہا ہوں جیسے وہ ایک بہت بڑی کتاب ہو۔ اور ستارے فرشتوں کے روپ میں مجھے دکھائی دے رہے ہیں۔

چودھویں کے چاند کی شعائیں یوں معلوم ہوتی ہیں گویا پیغامِ رسالت کا نزول ہو رہا ہو۔

تب مجھے اس کائنات کی خوشی سے لبریز سرگوشی سنائی دیتی ہے۔ جو کہہ رہی ہے: کہ ایسی ہی ایک روشن اور حسین رات میں رسول کریم ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔

اور محمد ﷺ کے نور نے پہاڑوں اور ہموار زمین کو روشن کر دیا۔

سارا زمانہ اس نور سے فیض یاب ہوا، جبکہ اس سے قبل وہ ایک طویل رات میں حیران و سرگرداں تھا۔‘‘

نبی کریم ﷺ کو دودھ پلانے اور پرورش کرنے والی خواتین

ثویبہ: رسول اللہ ﷺ کی حقیقی والدہ حضرت آمنہ کے بعد سب سے پہلے جس عورت نے آپ کو دودھ پلایا وہ آپ ﷺ کے چچا ابولہب کی لونڈی ثُوَیبہ تھی۔ حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے انھیں بتایا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: ’’اے اللہ کے رسول! آپ میری بہن سے شادی کر لیجیے۔‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَوَتُحِبِّينَ ذٰلِكِ» ’’کیا تم یہ پسند کرتی ہو؟‘‘ میں نے کہا: ’’جی ہاں، پہلے بھی صرف میں ہی تو آپ کی بیوی نہیں ہوں، اس لیے میں اس بات کو پسند کرتی ہوں کہ اس خیر میں کسی اور کے بجائے میری بہن میرے ساتھ شریک ہو۔‘‘ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ ذٰلِكِ لَا يَحِلُّ لِي» ’’میرے لیے یہ جائز نہیں۔‘‘

(بیک وقت دو بہنیں ایک مرد کے نکاح میں نہیں آسکتیں) تب میں نے کہا: ”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ ابوسلمہ کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: «بِنْتَ أُمِّ سَلَمَةَ؟» ”ام سلمہ کی بیٹی سے؟“ میں نے کہا: ”جی ہاں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا:

> «لَوْ أَنَّهَا لَمْ تَكُنْ رَبِيبَتِي فِي حَجْرِي مَا حَلَّتْ لِي، إِنَّهَا لَابْنَةُ أَخِي مِنَ الرَّضَاعَةِ، أَرْضَعَتْنِي وَ أَبَاسَلَمَةَ ثُوَيْبَةُ، فَلَا تَعْرِضْنَ عَلَيَّ بَنَاتِكُنَّ وَلَا أَخَوَاتِكُنَّ»
>
> ”وہ تو میری ربیبہ (پچھ لگ) ہے (میری بیوی ام سلمہ کی اس کے پہلے خاوند ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے بیٹی ہے)۔ اگر وہ میری ربیبہ نہ بھی ہوتی تب بھی وہ میرے نکاح میں نہیں آسکتی تھی۔ کیونکہ وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے۔ مجھے اور ابوسلمہ ہم دونوں کو ثُوَیبہ نے دودھ پلایا ہے، تم مجھے اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے نکاح کی پیشکش نہ کیا کرو۔“[1]

حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا: حضرت ام ایمن نے آپ ﷺ کی پرورش کی۔ آپ ﷺ کو ان کا دودھ پلانا ثابت نہیں ہے۔ آپ نبی کریم ﷺ کے والد گرامی عبداللہ بن عبدالمطلب کی خادمہ تھیں۔ آپ کا نام ام ایمن برکت اور آپ کا تعلق حبشہ سے تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ بڑے ہوئے تو آپ نے ام ایمن رضی اللہ عنہا کو آزاد کردیا، پھر ان کا نکاح حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کرا دیا، (اللہ تعالیٰ نے انھیں اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما جیسا فرزند بھی عطا کیا)۔ ام ایمن رضی اللہ عنہا کا انتقال نبی کریم ﷺ کی وفات کے پانچ ماہ بعد ہوا۔[2]

حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا: ان کا تعلق قبیلہ بنو سعد سے تھا۔ انھوں نے بھی نبی ﷺ کو دودھ پلایا تھا۔ حلیمہ سعدیہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی ان برکات کے متعلق ہم سے ایک منفرد واقعہ

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 5101، و صحیح مسلم، حدیث: 1449. [2] صحیح مسلم، حدیث: 1771.

بیان کرتی ہیں جو برکات انھوں نے اپنی ذات، اولاد، بکریوں اور اپنے گھر میں محسوس کیں۔

حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تو بنو سعد بن بکر کی کچھ عورتیں، جن میں حلیمہ بنت حارث بھی تھیں، مکہ مکرمہ آئیں تاکہ عرب کے رواج کے مطابق شیر خوار بچوں کو رضاعت کے لیے حاصل کریں۔ حلیمہ سعدیہ بیان کرتی ہیں کہ میں سب سے پہلے روانہ ہونے والی عورتوں کے ساتھ اپنی سفید گدھی پر سوار ہو کر چلی۔ میرے ساتھ میرے شوہر حارث بن عبدالعزیٰ بھی تھے۔ طویل سفر کی وجہ سے ہماری گدھی کی ٹانگوں پر رسنے والے زخم بن گئے تھے۔ میرے ساتھ ایک عمر رسیدہ اونٹنی بھی تھی جو دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں دیتی تھی۔ زمانہ بھی قحط سالی کا تھا۔ بھوک کی وجہ سے لوگ بہت مشکل میں تھے۔ میرے ساتھ میرا بیٹا بھی تھا جو (بھوک کی وجہ سے) ساری رات نہیں سوتا تھا۔ اسے بہلانے کے لیے بھی میرے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ ہماری کچھ بکریاں تھیں اور ہم امید لگائے بیٹھے تھے کہ بارش ہوگی تو ہمیں خوشحالی نصیب ہوگی۔

جب ہم مکہ پہنچے تو ہمارے قافلے کی ہر عورت نے رسول اللہ ﷺ کو لینا چاہا مگر پھر اس لیے نہ لیا کہ وہ یتیم تھے، ان کا باپ زندہ ہوتا تو دودھ پلانے والی کی عزت افزائی کرتا اور اسے انعام و اکرام سے نوازتا۔ بچے کی ماں، چچا اور دادا سے ایسی امیدیں وابستہ نہیں کی جاتی تھیں۔ میرے سوا میرے قافلے کی ہر عورت کو کوئی نہ کوئی بچہ رضاعت کے لیے مل گیا۔ مجھے کوئی بچہ نہ ملا تو میں رسول اللہ ﷺ کے گھر کی طرف واپس آئی اور آپ کو لے لیا۔ اللہ کی قسم! میں نے صرف اس وجہ سے آپ کو لیا کہ مجھے کوئی اور بچہ نہیں ملا۔ میں نے اپنے خاوند سے کہا کہ میں بنو عبد المطلب کے اسی یتیم بچے کو لے لیتی ہوں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ہمارے لیے نفع مند بنا دے گا۔ اس طرح میں اپنی ہم سفر عورتوں کے ساتھ خالی ہاتھ بھی واپس نہ ہوں گی۔

حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میرے خاوند نے کہا کہ ٹھیک ہے، چنانچہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے لیا اور اس سفر میں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے میں انھیں لے کر وہاں آ گئی۔ اللہ کی قسم! میں جونہی وہاں پہنچی میری چھاتی دودھ سے لبریز ہو گئی۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا اور آپ کے رضاعی بھائی (اپنے بیٹے) کو بھی۔ دونوں خوب سیر ہو گئے۔ میرے خاوند اونٹنی کی جانب گئے تو دیکھا اس کے تھن بھی دودھ سے بھرے ہوئے ہیں، انھوں نے اس کا دودھ دوہا، مجھے پلایا اور خود بھی پیا۔ ہم دونوں خوب سیر ہوئے۔ میرے خاوند نے کہا: ''حلیمہ! تو نے کچھ محسوس کیا ہے؟ اللہ کی قسم! ہمیں تو بہت ہی بابرکت ہستی مل گئی ہے۔ اللہ نے ہمیں وہ کچھ دے دیا ہے جس کی ہم نے تمنا بھی نہیں کی تھی۔'' حلیمہ فرماتی ہیں کہ ہم نے شکم سیری کی حالت میں بڑی پرسکون رات گزاری۔ اس سے قبل ہم اپنے بھوک سے بلبلاتے بچے کی وجہ سے سو بھی نہیں سکتے تھے۔

صبح ہم اپنی ہم سفر عورتوں کے ساتھ مکہ مکرمہ سے اپنے علاقے کی جانب روانہ ہوئے۔ میں اپنی سفید گدھی پر سوار ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی گود میں لے لیا۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں حلیمہ کی جان ہے! وہ گدھی اس قدر تیز رفتاری سے چلی کہ اس نے سارے قافلے کو پیچھے چھوڑ دیا حتی کہ سب عورتیں کہنے لگیں: ''حلیمہ! اسے روکو، کیا یہ وہی گدھی ہے جس پر تو ہمارے ساتھ آئی تھی؟'' میں نے کہا: ''ہاں، وہی ہے۔'' انھوں نے حیرت سے کہا کہ وہ تو آتے ہوئے خاصی زخمی ہو گئی تھی اب اسے کیا ہوا ہے؟ میں نے جواب دیا: ''میں جس بچے کو لے کر اس پر سوار ہوئی ہوں، وہ بچہ بڑا بابرکت ہے۔''

حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہمارا سفر جاری رہا، اللہ تعالیٰ ہمیں مزید بھلائیاں عطا کرتا رہا۔ بالآخر ہم اپنے علاقے میں پہنچ گئے۔ یہاں اُسی طرح قحط سالی تھی۔ چرواہے صبح جاتے اور شام کو واپس آتے۔ ہمارے قبیلے بنو سعد کی بکریاں بھی بھوکی پیاسی واپس آتیں مگر میری بکریاں جب واپس آتیں تو ان کے پیٹ بھرے ہوتے۔ اور تھن دودھ سے لبریز

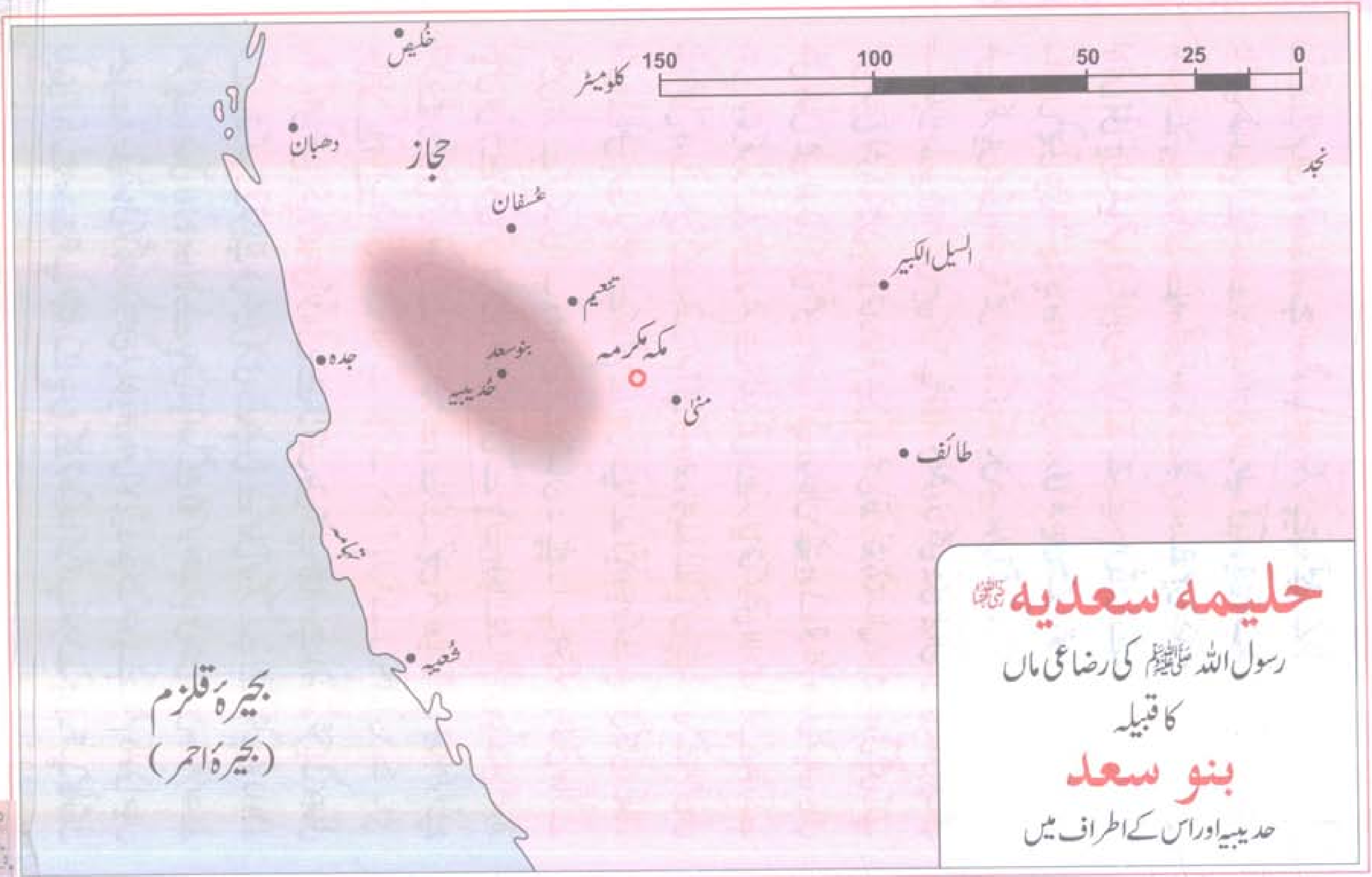

حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی ماں

کا قبیلہ

بنو سعد

حدیبیہ اور اس کے اطراف میں

150
100
50
25
0
کلومیٹر
خلیص
وھبان
حجاز
عسفان
نجد
السیل الکبیر
تنعیم
مکہ مکرمہ
بنو سعد
حُدیبیہ
جدہ
منیٰ
طائف
تہامہ
شُعیبہ
بحیرۂ قلزم
(بحیرۂ احمر)

ہوتے۔ ہم ان کا دودھ دوہتے اور خوب سیر ہوکر پیتے۔ قبیلے کے لوگ تعجب سے کہتے: ''بھئی معاملہ کیا ہے؟ حارث بن عبد العزیٰ اور حلیمہ کی بکریاں جب شام کو واپس آتی ہیں تو ان کے پیٹ خوراک سے اور تھن دودھ سے لبریز ہوتے ہیں، جبکہ تمھاری بکریاں بھوکی واپس آتی ہیں۔ کیا تم اپنی بکریوں کو چرانے کے لیے وہاں نہیں لے جاسکتے جہاں ان کی بکریاں چرتی ہیں؟'' چنانچہ وہ اپنی بکریاں ہماری بکریوں کے ساتھ لے جاتے، پھر بھی ان کی بکریاں بھوکی واپس آتیں اور ہماری بکریاں سیر ہوکر آتیں۔

حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ کی نشوونما بھی بڑی حیران کن تھی۔ کوئی بچہ بھی اس طرح نشوونما نہیں پا رہا تھا۔ عام بچوں کی جس قدر نشوونما سال بھر میں ہوتی تھی آپ کی دنوں میں ہو جایا کرتی تھی۔ جب آپ دو سال کے ہوئے تو ہم دونوں میاں بیوی آپ کو مکہ مکرمہ لے آئے۔ ہم نے آپس میں طے کر لیا تھا کہ حتی الامکان آپ کو خود سے جدا نہیں ہونے دیں گے۔ جب ہم آپ کی والدہ ماجدہ کے پاس پہنچے تو ان سے عرض کی کہ اللہ اس بات پر شاہد ہے کہ ہم نے اس بچے سے زیادہ بابرکت بچہ کبھی نہیں دیکھا۔ ہمیں ڈر ہے کہ مکہ کی آب و ہوا سے اسے نقصان نہ پہنچے۔ آپ اس کو فی الحال ہمارے پاس ہی رہنے دیں حتی کہ مکہ کی فضا بیماریوں سے پاک ہوجائے۔ ہم اس بات پر اصرار کرتے رہے حتی کہ انھوں نے ہمیں اجازت دے دی۔ یوں ہم دوبارہ آپ ﷺ کو اپنے ساتھ لے آئے۔

ابھی تین یا چار ماہ ہی گزرے تھے کہ ایک دن آپ ﷺ اپنے (دودھ شریک) بھائی کے ساتھ گھر کے قریب ہی بھیڑ بکری کے بچوں سے کھیل کود کر رہے تھے کہ آپ کا (دودھ شریک) بھائی دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا کہ سفید لباس میں ملبوس دو افراد نے میرے قریشی بھائی کو پکڑ کر زمین پر لٹایا اور اس کا پیٹ چاک کر دیا ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی دوڑتے ہوئے آپ ﷺ کے پاس گئے تو دیکھا کہ آپ کھڑے ہیں۔ آپ کا رنگ

فق ہے۔ آپ ہمیں دیکھ کر سسکیاں بھر کر رونے لگے۔ ہم نے لپٹ کر انھیں اپنی آغوش میں لیا اور کہا کہ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، کیا بات ہے؟ آپ نے بتایا کہ میرے پاس دو آدمی آئے، انھوں نے مجھے لٹا کر میرا پیٹ چاک کیا اور پیٹ میں کچھ رکھ کر دوبارہ اسے پہلے کی طرح کر دیا۔ یہ سُن کر اس کے رضاعی باپ نے کہا: ''اللہ کی قسم! مجھے لگتا ہے کہ میرا بیٹا کسی مصیبت کا شکار ہو گیا ہے۔ اسے جلدی سے اس کے گھر والوں تک پہنچا دو۔'' اس سے قبل کہ ہمارے خدشات حقیقت بن کر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیں، اسے اس کے گھر والوں کے سپرد کر دو۔ چنانچہ ہم آپ کو لے کر آپ کی والدہ کے پاس چلے آئے۔ انھوں نے ہمیں دیکھ کر بڑے تعجب کا اظہار کیا اور پوچھا: ''کیا بات ہے؟ ہمارے کہنے کے بغیر ہی اس بچے کو واپس لے آئے ہو، حالانکہ تم انھیں اپنے پاس رکھنے کے شدید خواہش مند تھے۔'' ہم نے کہا: ''کوئی بات نہیں، اللہ کی توفیق سے مدت رضاعت مکمل ہو گئی ہے۔ ہمیں اپنی چاہت کے مطابق مسرتیں اور خوشیاں بھی حاصل ہو گئی ہیں، چنانچہ ہم نے اس بات کو ترجیح دی کہ آپ کی خواہش کے مطابق اس بچے کو آپ کی آغوش میں دے دیں۔''

اس پر آپ ﷺ کی والدہ نے کہا: ''معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے ساتھ کوئی خاص سانحہ رونما ہوا ہے۔ بتاؤ کیا بات ہے؟'' انھوں نے بہت اصرار کیا تو ہمیں تمام واقعہ بیان کرنا پڑا۔ جسے سن کر انھوں نے فرمایا: ''جو تم نے سمجھا ہے ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اللہ کی قسم! اللہ اسے کبھی ضائع نہیں ہونے دے گا۔ میرے اس بیٹے کی تو بہت بلند شان ہوگی۔'' پھر انھوں نے کہا: ''کیا میں تمھیں اس کے بارے میں اہم بات نہ بتاؤں؟ اس بچے کا حمل بہت خفیف اور نہایت آسان تھا۔ حالتِ حمل میں مَیں نے خواب دیکھا کہ میرے اندر سے ایک نور نکلا جس سے بصریٰ (شام) کے اونٹوں کی گردنیں روشن ہو گئیں۔ یا یہ بات فرمائی کہ بصریٰ کے محلات روشن ہو گئے، پھر جب اس بچے کی ولادت ہوئی تو اس کی

ولادت عام بچوں جیسی نہ تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ زمین پر رکھ کر اپنا سر آسمان کی جانب اٹھا لیا تھا۔ بہر حال اب تم اسے لے آئے ہو تو اسے چھوڑ جاؤ۔'' یہ کہہ کر انھوں نے اس بچے کو ہم سے لے لیا اور ہم واپس چلے آئے۔[1]

حکمتیں اور فوائد

حضرت حلیمہ سعدیہ کے لیے نبی کریم ﷺ کی برکات: یہ برکات حلیمہ سعدیہ کی ہر چیز میں ظاہر ہوئیں۔ ان کی چھاتی کا دودھ سے بھر جانا اور دودھ کا زیادہ ہو جانا آپ ﷺ کی برکت کا ایک مظہر تھا۔ یہ دودھ تو حلیمہ سعدیہ کے اپنے بیٹے کے لیے کافی نہیں تھا مگر اب دونوں بچوں کے لیے وافر مقدار میں تھا۔ یہ بھی آپ ﷺ کی برکت تھی کہ حلیمہ سعدیہ کے بیٹے کو اطمینان و سکون حاصل ہوا۔ وہ قبل ازیں روتا رہتا تھا۔ اپنی ماں کی بے چینی کا سبب بنتا تھا۔ انھیں بے آرام کرتا تھا، سونے نہیں دیتا تھا۔ اب اسے شکم سیر ہو کر سکون ملا تو اس کی ماں کو راحت و سکون والی نیند نصیب ہوئی۔ آپ ﷺ کی برکت ان کی کمزور و لاغر بکریوں میں بھی ظاہر ہوئی جو پہلے دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں دیتی تھیں اب اتنا دودھ دے رہی ہیں جتنا کبھی دیکھا تھا نہ سنا تھا۔

یہ برکات اس بات کا ثبوت ہیں کہ حلیمہ سعدیہ کے خاندان کو یہ شرف حاصل ہوا کہ انھوں نے آپ کو دودھ پلایا اور اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں عزت عطا فرمائی۔[2] اس میں حکمت یہ تھی کہ حلیمہ سعدیہ کے خاندان کے دل میں اس بچے کی محبت پیدا ہو، وہ آپ

---

[1] مسند أبي يعلى، حديث: 7163، و صحيح ابن حبان، حديث: 6335، و المعجم الكبير للطبراني: 24/212-215، ومجمع الزوائد للهيثمي: 8/220,221، ودلائل النبوة للبيهقي: 1/133-136. والسيرة النبوية لابن هشام بشرح الخشني: 1/214. ابن اسحاق نے اس روایت میں سماع کی صراحت کی ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث جید الاسناد ہے۔ اس کے شواہد بھی موجود ہیں جو اسے تقویت پہنچاتے ہیں، لہٰذا یہ حدیث شواہد کی وجہ سے حسن درجے کی ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية للذهبي، ص: 8)

[2] فقه السيرة للبوطي، ص: 44.

کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں، آپ کے معاملے میں اپنی ذمہ داری عمدگی سے ادا کریں اور اچھے انداز سے آپ کی دیکھ بھال اور پرورش کریں اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ان لوگوں نے اپنی اولاد سے بڑھ کر آپ کو چاہا اور آپ کے ساتھ شفقت بھرا سلوک کیا۔[1]

اللہ کا فیصلہ بابرکت اور افضل ہوتا ہے: بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہی بہتر اور زیادہ باعث برکت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تھا کہ یہ یتیم بچہ حلیمہ سعدیہ کو ملے، جبکہ حلیمہ سعدیہ نے کوئی اور بچہ نہ ملنے پر بحالتِ مجبوری آپ ﷺ کو لیا۔ ہر قسم کی خیر اور بھلائی اللہ کے فیصلے میں تھی، چنانچہ آپ ﷺ کو لیتے ہی اس کے نتائج ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ اس میں ہر مسلمان کے لیے درس ہے کہ اللہ کی تقدیر اور اس کے فیصلے پر اس کا دل مطمئن اور راضی رہنا چاہیے۔ اللہ نے جو اس کے مقدر میں نہیں کیا اور جو اس کو نہیں ملا اس پر پشیمان نہیں ہونا چاہیے۔

دیہی ماحول کے اثرات: دیہی ماحول کے جسمانی صحت، طہارتِ قلب اور عقل و ذہانت پر اثر انداز ہونے کے بارے میں الشیخ محمد الغزالی فرماتے ہیں کہ بچوں کی نشوونما کے لیے دیہاتی ماحول میں بے شمار فوائد ہوتے ہیں، مثلاً: وہ فطرت کی آغوش میں پروان چڑھیں اور وہاں کی کھلی آب وہوا اور آزاد اور وسیع فضا سے مستفید ہوں۔ اس سے بچوں کی فطری صلاحیتیں بڑھتی ہیں، اعضاء مضبوط ہوتے ہیں، احساسات جنم لیتے ہیں اور افکار ونظریات میں حریت پیدا ہوتی ہے۔

یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہمارے بچے کئی کئی منزلہ عمارتوں اور تنگ فلیٹوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے کسی ڈربے میں بند کر کے انھیں تازہ ہوا میں سانس لینے کے حق سے محروم کر دیا گیا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید سہولتوں سے آراستہ شہری زندگی میں اعصابی تناؤ جیسی بیماریوں کا اصل سبب فطرت سے دوری اور خلافِ فطرت تصنع اور

---

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 105.

بناوٹ کی طرف حد سے زیادہ میلان ہے۔

اہل مکہ کی یہ خواہش قابل قدر تھی کہ ان کے بچے دیہی ماحول میں پرورش پائیں اور وہاں کی آزاد فضا میں ان کی تربیت کے مراحل طے ہوں۔ اکثر ماہرینِ علم التعلیم اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ فطرت ہی بچے کی پہلی درس گاہ ہونی چاہیے تاکہ اس کے عقل و شعور اور اس کائنات کی حقیقتوں میں یکسانیت پیدا ہو لیکن لگتا ہے کہ اس خواب کی تعبیر بہت مشکل ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے بنو سعد کے ماحول میں رہ کر فصیح عربی زبان سیکھی، پھر سب سے بڑھ کر فصیح اللسان بن گئے۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کہا کہ میں نے آپ سے زیادہ کسی کو فصیح اللسان نہیں پایا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«وَمَا يَمْنَعُنِي وَ أَنَا مِنْ قُرَيْشٍ، وَّ أُرْضِعْتُ فِي بَنِي سَعْدٍ»

''یہ کون سی ایسی بات ہے میرا تعلق قریش سے ہے اور میری رضاعت بنو سعد میں ہوئی ہے۔''[2]

شق صدر

بنو سعد کے علاقے میں شقِ صدر کا جو واقعہ پیش آیا وہ علامات نبوت میں سے ایک علامت اور بار نبوت کے لیے آپ کے انتخاب کی ایک روشن دلیل تھا۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام آپ کے پاس آئے۔ آپ کو پکڑ کر زمین پر لٹا دیا، پھر آپ کا سینہ مبارک چاک کرتے ہوئے دل باہر نکالا اور اس میں سے خون کا ایک لوتھڑا نکال کر فرمایا: ''تیرے جسم کا یہ حصہ شیطان کا تھا۔'' پھر سونے کے طشت

---

[1] فقه السيرة للغزالي، ص:60، 61. [2] الرّوض الأنف للسهيلي: 1/188.

میں زمزم کے پانی کے ساتھ دل کو صاف کیا اور دوبارہ سینے میں رکھ کر اسے سی دیا۔ بچے دوڑتے ہوئے آپ ﷺ کی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہ کے پاس گئے اور کہا کہ محمد ﷺ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ وہ سب آپ کے پاس آئے اور دیکھا کہ آپ کا رنگ بدلا ہوا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود آپ ﷺ کے سینہ مبارک پر سلائی کے نشانات دیکھے ہیں۔[1]

دروس و حکمتیں: نبی ﷺ کے جسم مبارک سے شیطانی لوتھڑے کو الگ کر دینا یقیناً آپ کی نبوت کے ابتدائی دلائل میں سے ایک دلیل اور آپ کو ہر قسم کے شر اور غیر اللہ کی بندگی سے محفوظ رکھنے کی تیاری تھی تاکہ آپ ﷺ کے دل میں توحید خالص کے سوا کوئی اور چیز سرایت نہ کر سکے۔ آپ ﷺ کا بچپن اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ آپ کبھی گناہ کے قریب بھی نہیں گئے اور نہ کسی بت کو کبھی سجدہ کیا، حالانکہ شرک قریش میں بکثرت موجود تھا۔[2]

مُستشرق نِکلسن واقعہ شقِ صدر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ ایک کہانی ہے جو اس قرآنی آیت ﴿ أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴾ کی تفسیر میں وضع کی گئی ہے اور اگر یہ واقعہ درست بھی ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ (معاذ اللّٰہ) آپ کو مرگی جیسا کوئی مرض لاحق تھا۔ اس مستشرق نے یہ کوئی نئی بات نہیں کی۔ اس سے قبل مشرکین مکہ نے بھی (معاذ اللّٰہ) آپ ﷺ پر جنون یا پاگل پن کا الزام لگایا تھا، جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے بارے میں ایسے تمام الزامات کی قرآن مجید میں یوں نفی کر دی:

﴿ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ ۝ ﴾

”اور (اے اہل مکہ!) تمھارا ساتھی (محمد) دیوانہ نہیں۔“[3]

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 162، و مسند أحمد: 149/3، ودلائل النبوة للبیهقي: 5/2. [2] السیرة النبویة الصحیحة للدکتور العمري: 104/1. [3] التکویر 81: 22.

دکتور رمضان بوطی واقعۂ شق صدر کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”معلوم ہوتا ہے کہ حکمت الٰہی یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا معاملہ واضح کر دیا جائے اور جسمانی طور پر بھی بچپن ہی سے آپ کو وحی کے لیے تیار کیا جائے اور ہر قسم کے شر سے محفوظ رہنے کا سامان کر دیا جائے تا کہ یہ چیز لوگوں کو آپ پر ایمان لانے اور آپ کی رسالت کی تصدیق پر آمادہ کر سکے۔ گویا یہ آپ ﷺ کی روحانی پاکیزگی کا آپریشن تھا مگر اسے مادی اور جسمانی شکل دے دی گئی تا کہ لوگ اس آسمانی اعلان کو سن لیں اور اس کا مشاہدہ بھی کر لیں۔“[1]

نبی ﷺ کے جسم مبارک سے اس لوتھڑے کو اس لیے نکالا گیا تا کہ بچپن کی لاابالی، غفلت اور بے فائدہ امور کی جانب میلانات سے آپ کو پاک کر دیا جائے اور اس کی جگہ آپ کو سنجیدگی، دور اندیشی اور توازن پسندی جیسے اوصاف حمیدہ سے متصف کر دیا جائے۔ اس سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت اور حفاظت حاصل تھی اور شیطان کے بس میں نہ تھا کہ آپ پر کسی بھی طرح اثر انداز ہو سکے۔[2]

والدہ محترمہ کا انتقال

نبی ﷺ کی والدہ محترمہ آپ کو آپ کے ننھیال سے ملوانے کے لیے، جن کا تعلق قبیلۂ بنو نجار سے تھا، مدینہ لے گئی تھیں۔ واپسی پر راستے میں ابواء کے مقام پر آپ ﷺ کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور انھیں وہیں دفن کر دیا گیا۔[3] اس وقت آپ ﷺ کی عمر چھ سال تھی۔

---

[1] فقه السيرة للبوطي، ص: 47. [2] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 107,106. صحیح مسلم میں اس کی وضاحت یوں ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک جن (شیطان) مقرر کیا ہے۔“ صحابہ کرام نے کہا: ”کیا آپ کے ساتھ بھی شیطان ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جی ہاں، میرے ساتھ بھی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف میری مدد فرمائی ہے اور وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ اب وہ مجھے صرف نیکی ہی کا کہتا ہے۔“ (صحیح مسلم، حدیث: 2814) [3] السيرة النبوية لابن هشام: 168/1.

دادا جان کی آغوش محبت میں

والدہ محترمہ کے انتقال کے بعد آپ کے دادا جناب عبدالمطلب نے آپ کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ وہ اپنے بیٹوں، یعنی نبی ﷺ کے چچاؤں سے بڑھ کر آپ سے پیار کرتے تھے۔ چونکہ وہ بارعب شخصیت کے مالک تھے، اس لیے ان کا کوئی بیٹا اُن کے بستر پر بیٹھنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ لیکن آپ ﷺ اپنے دادا جان کے بستر پر بیٹھ جاتے، آپ کے چچا آپ کو اپنے والد کے بستر سے دور رکھنے کی کوشش کرتے، جبکہ دادا آپ کو منع نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے بستر پر بیٹھا دیکھ کر خوش ہوتے تھے کیونکہ انھوں نے آپ کے رخ انور میں یہ بات محسوس کرلی تھی کہ یہ بچہ بڑی خوبیوں کا مالک ہوگا اور اس کی شان بہت بلند ہوگی۔ [1]

رسول اللہ ﷺ کے دادا جان کو آپ سے شدید محبت تھی۔ وہ آپ کو جس کام کے لیے بھی بھیجتے، آپ اسے پورا کر دیتے۔ ایک دن عبدالمطلب نے آپ ﷺ کو اونٹوں کے پیچھے بھیجا۔ واپس آتے ہوئے آپ کو کچھ تاخیر ہوگئی تو عبدالمطلب بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے شعر کی شکل میں اللہ سے دعا کرنے لگے:

رَبِّ رُدَّ رَاكِبِي مُحَمَّدًا رُدَّهُ لِي وَاصْنَعْ عِنْدِي يَدًا

”اے میرے پروردگار! میرے سوار محمد (ﷺ) کو لوٹا دے، اسے واپس کرکے مجھ پر احسان فرما۔“

جب نبی کریم ﷺ اونٹ لے کر واپس آئے تو عبدالمطلب ان سے کہنے لگے: ”اے بیٹے! میں تو ایک ماں کی طرح پریشان ہوگیا تھا۔ مجھے ہمیشہ تیرا خدشہ لاحق رہتا ہے۔“ [2]

نبی کریم ﷺ ابھی اپنی عمر کے آٹھویں سال میں تھے کہ آپ کے دادا عبدالمطلب اللہ

---

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 101. [2] المعجم الكبير للطبراني: 314/5، حديث: 391، والمستدرك للحاكم: 604,603/2، محقق سیرت نگار ابراہیم العلی نے اس واقعہ کو صحیح کہا ہے، دیکھیے: (صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 56)

کو پیارے ہو گئے۔ [1]

چچا جان کی کفالت میں

آپ ﷺ کے دادا جان وصیت کرتے ہوئے آپ ﷺ کو آپ کے چچا ابو طالب کے سپرد کر گئے۔ چچا نے کمال مہربانی سے آپ کی حفاظت کرتے ہوئے کفالت کی۔ [2]

حکمت الٰہی کا تقاضا تھا کہ رسول اللہ ﷺ یتیمی کی حالت میں پرورش پائیں، صرف اللہ کی حفاظت آپ کے شاملِ حال رہے، آپ لاڈ پیار اور دولت سے دور رہیں تاکہ آپ نازو نعمت کے عادی نہ ہو جائیں، آپ کے دل میں مال و منصب کی محبت جگہ پکڑے نہ آپ سرداری اور چودھراہٹ والے ماحول سے متاثر ہوں، وگرنہ لوگوں کے لیے نبوت کے تقدس اور دنیاوی جاہ و جلال میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا اور انھیں یہ کہنے کا موقع ملتا کہ آپ نے مستقبل میں نبوت کا دعویٰ کرنے کے لیے ہی یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ [3]

نبی کریم ﷺ کو بچپن ہی سے صدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ باپ کی شفقت سے محروم تو تھے ہی، ماں کی آغوشِ محبت بھی چھن گئی، پھر دادا کی شفقت سے بھی محروم ہونا پڑا۔ یکے بعد دیگرے غم کے جام نوش کرنے پڑے جس کے نتیجے میں آپ نہایت حساس اور نرم دل ہو گئے۔ غم اشخاص کو سنگدلی، تکبر اور غرور سے پاک کرتے ہوئے کندن بنا دیتا ہے اور ان میں رحم دلی اور تواضع پیدا کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے والدین کی عالمِ جوانی میں وفات شاید اس حکمت کی حامل ہو کہ آپ ﷺ ان لوگوں کے لیے نمونہ بن جائیں جن کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک بچپن ہی میں انھیں داغ مفارقت دے گیا ہو۔

اور یہ بھی منشائے الٰہی تھا کہ والدین کی محبت و شفقت اور تعلیم و تربیت سے محرومی کے

---

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 101. [2] مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيٰى اليحيٰى، ص: 119.

[3] فقه السيرة للبوطي، ص: 46.

باوجود آپ کا اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کا مالک ہونا اس بات کا ثبوت بن جائے کہ آپ کی تعلیم وتربیت کا کام خود رب العالمین نے کیا ہے۔

والدین سے دور کرنے میں یہ بھی مشیت الٰہی تھی کہ نبی ﷺ مضبوط ارادے کے مالک اور اولوالعزم بن جائیں، اپنے معاملات میں کسی کے محتاج نہ بنیں، یہاں تک کہ آپ کی دعوت میں بھی والدین کا کوئی اثر نظر نہ آئے۔[1] اور آپ کی تعلیم وتربیت میں کسی انسانی ہاتھ کا دخل نہ ہو بلکہ خالصتاً یہ تربیت رب ذوالجلال کی جانب سے ہو۔ جاہلی نظریات اور رسوم ورواج کا آپ کی شخصیت پر کوئی اثر نہ ہو، آپ کی ہر سوچ اور فکر اس ذات کی عطا کردہ ہو جو حکیم وخبیر ہے۔ اسی نے آپ کے تمام ظاہری سہارے چھین کر خود آپ کو سہارا دیا۔ آپ کی مادی ضروریات کے لیے اسی نے دادا اور چچا کے دل میں آپ کی محبت پیدا کی، جبکہ آپ کی ذہنی، فکری اور اخلاقی تربیت مکمل طور پر ربانی تربیت تھی۔[2]

گلہ بانی

ابو طالب مالی طور پر اتنے خوشحال نہ تھے، اس لیے ان کے ساتھ تعاون کے طور پر نبی ﷺ کو بکریاں چرانے کا کام کرنا پڑا۔ آپ نے خود اپنے اور پہلے گزرے ہوئے انبیاء کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان سب نے بکریاں چرانے کا کام کیا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے لڑکپن میں معاوضے پر اہل مکہ کی بکریاں چرائیں۔ ایک صحیح حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: «مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا رَعَى الْغَنَمَ»

’’اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی انبیاء مبعوث فرمائے سب نے بکریاں چرائی ہیں۔‘‘

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا: ’’کیا آپ نے بھی؟‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا:

«نَعَمْ، كُنْتُ أَرْعَاهَا عَلٰى قَرَارِيطَ لِأَهْلِ مَكَّةَ»

---

[1] رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 20/3. [2] فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 85,84.

"ہاں، میں قراریط (رائج الوقت سکوں) کے عوض اہل مکہ کی بکریاں چراتا تھا۔"[1]

گلہ بانی کی وجہ سے آپ کو درج ذیل فوائد حاصل ہوئے:

آپ ﷺ کو جس متانت اور سنجیدگی کی ضرورت تھی، اسے سیکھنے کا موقع میسر ہوا۔

صحرائی حسن و جمال سے بہرہ ور ہونے کے مواقع حاصل ہوئے۔ تخلیق کائنات میں خالق کی شان وشوکت کے مظاہر پر غور کرنے کے لمحات حاصل ہوئے۔ رات کی خاموشی، چاند کی روشنی اور بادنسیم کے جھونکوں میں اپنے محبوب پروردگار سے سرگوشیوں کے لیے قیمتی ساعات میسر آئیں۔ اپنا تزکیہ کرتے ہوئے صبر، بردباری، تحمل، متانت اور شفقت و رحمت جیسے اوصاف حمیدہ اختیار کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔[2]

آپ ﷺ کے بکریاں چرانے کے اس عمل میں مسلمانوں کے لیے درس ہے کہ وہ حیوانات کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ آپ ﷺ کا گلہ بانی کرنا دراصل ایک مشق تھی کہ مستقبل میں آپ نے اقوام کی دیکھ بھال اور ان کے سیاسی امور کو کیسے انجام دینا ہے۔

گلہ بانی کے تربیتی اثرات

① صبر: بکریاں چرانے والے چرواہے کے لیے ضروری ہے کہ وہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک صبر و تحمل کا مظاہرہ کرے تاکہ بکریاں اپنا پیٹ بھر سکیں کیونکہ ان کی یہ عادت ہے کہ وہ آہستہ آہستہ گھاس پھوس چرتی ہیں۔ اگر چرواہا صبر و تحمل کا مظاہرہ نہیں کرے گا تو بکریاں بھوکی رہیں گی۔ اسی طرح انسانیت کی تربیت کرنے والے مربی حضرات کے لیے ضروری ہے کہ ان میں بھی صبر و تحمل کے اوصاف موجود ہوں۔[3]

ایک چرواہا بلند و بالا محلات میں نہیں رہتا اور نہ ہی اس کی زندگی ناز ونعم میں گزرتی ہے بلکہ وہ تو گرم آب وہوا میں زندگی بسر کرتا ہے، بالخصوص جزیرہ نمائے عرب کے صحرا

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 2262.

[2] محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 1/177.

[3] مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص: 124.

میں تو انتہائی شدت کی گرمی پڑتی ہے۔ اسے اپنی پیاس بجھانے کے لیے وافر پانی کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ اسے خشک روٹی اور تنگی و سختی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اس طرح وہ اپنے نفس کو ایسی مشکلات برداشت کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور اسی روکھی سوکھی زندگی پر صابر و قانع ہو جاتا ہے۔[1]

② **تواضع:** تواضع چرواہے کی فطرت بن جاتی ہے کہ وہ بکریوں کی خدمت کرے، نسل بڑھانے کا اہتمام کرے، ان کی حفاظت کا بندوبست کرے۔ اگر سونا ہو تو ان کے قریب سوئے۔ اگر ان کے بول و براز سے کوئی چیز اس کے جسم پر لگ جائے تو بھی تنگدل نہیں ہوتا۔ زندگی کے یہ رنگ ڈھنگ اس کے نفس کو غرور و تکبر سے پاک کر دیتے ہیں اور اس میں تواضع اور انکساری پیدا کرتے ہیں۔[2]

صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ»

”جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔“

ایک صحابی نے عرض کیا: ”ہر شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا لباس خوبصورت ہو، اس کے جوتے اچھے ہوں۔ (کیا یہ بھی تکبر ہے؟)“ آپ نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ جَمِيلٌ يُّحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبْرُ: بَطَرُ الْحَقِّ وَ غَمْطُ النَّاسِ»

”بے شک اللہ تعالیٰ صاحب جمال ہے اور خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے۔ تکبر تو یہ ہے کہ حق بات قبول نہ کی جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے۔“[3]

③ **بہادری و شجاعت:** گلہ بانی کے دوران ایسے لمحات بھی آتے ہیں کہ چرواہے کو جنگلی درندوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس میں شجاعت و بہادری بدرجۂ اتم

---

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 115,114. [2] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 114. [3] صحيح مسلم، حديث: 91.

موجود ہوتا کہ وقت آنے پر وہ جنگلی جانوروں کا مقابلہ کرکے اپنی بکریوں کی حفاظت کرسکے۔[1]

④ **رحمت وشفقت:** اگر بکری بیمار ہو جائے، اسے چوٹ لگ جائے یا اس کی ہڈی وغیرہ ٹوٹ جائے تو اس کی یہ کیفیت اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ اس کا علاج کیا جائے اور اس کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کیا جائے۔ ایک چرواہا ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ اس طرح اس کے دل میں رحمت وشفقت خوب پروان چڑھتی ہے۔ جو شخص حیوانات کے ساتھ مہربان ہو وہ انسانوں کے لیے تو بہت زیادہ مہربان ہوگا، خاص طور پر وہ ہستی جسے اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہو کہ وہ لوگوں کی تعلیم کا اہتمام کرے، ان کی رہنمائی فرمائے اور انھیں جہنم سے بچا کر دنیا اور آخرت میں سرخرو کرنے کے لیے کوشاں ہو جائے۔[2]

⑤ **محنت سے روزی کمانے کا جذبہ:** اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو حضرت محمد ﷺ کو بکریاں چرانے کی ضرورت پیش نہ آتی لیکن یہ آپ ﷺ کی تربیت کا ایک مرحلہ تھا اور آپ کی امت کے لیے درس تھا کہ اپنی روزی محنت کے ساتھ اور اپنے ہاتھوں سے کما کر حاصل کرو۔ بکریاں چرانا بھی ہاتھ کی کمائی کی ایک قسم ہے۔

ایک داعی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نظریں دوسروں کے اموال پر نہ ہوں اور نہ اس کی معاش کا انحصار غیروں پر ہو۔ وہ مالی طور پر ہر شخص سے مستغنی ہو۔ اسی صورت میں اس کی قدر و قیمت میں اضافہ اور اس کا مقام و مرتبہ بلند ہوگا، شکوک وشبہات سے محفوظ رہے گا اور اس کی جدوجہد میں اخلاص پیدا ہوگا۔ اس طرح ان دشمنان اسلام کے پیدا کردہ شبہات بھی باطل قرار پائیں گے جو لوگوں کو یہ تصور دیتے ہیں کہ (نعوذ باللّٰہ)

---

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 115,114. [2] مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص: 127.

انبیائے کرام علیہم السلام نے اپنی دعوت کے ذریعے دنیاوی دولت و اقتدار حاصل کرنا چاہا۔ [1] اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾

”انھوں نے کہا: کیا تو ہمارے پاس آیا ہے کہ ہمیں اس (طریقے) سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا اورتم دونوں کے لیے زمین میں اقتدار ہو؟ جبکہ ہم تم دونوں پر ایمان لانے والے نہیں۔“ [2]

یہ بات فرعون نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے کہی تھی۔ ایسے لوگوں کی عقل پر دنیا کی محبت اس قدر غالب آچکی ہوتی ہے کہ کسی بھی نظریے اورتحریک کو دیکھ کر یہ لوگ فوراً الزام لگادیتے ہیں کہ اس کا مقصد دنیا کا حصول ہے، اسی لیے انبیاء علیہم السلام نے واضح طور پراپنی امتوں سے کسی دنیاوی اجر سے بے نیاز ہونے کا اعلان فرمایا:

﴿ وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ﴾

”اور اے میری قوم! میں تم سے اس پر کوئی مال نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو اللہ ہی پر ہے۔“ [3]

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت مِقدام رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِّنْ أَنْ يَّأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ، وَ إِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ»

”انسان کی بہترین خوراک وہ ہے جو اس نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے حاصل کی

---

[1] مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص: 137. [2] يونس 78:10. [3] هود 29:11.

ہو۔ اللہ کے نبی حضرت داود علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا کرتے تھے۔‘‘ [1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اگر صرف حلال روزی پر اکتفا کرے تو اس کے اندر ایسی جرأت اور بہادری پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کلمۂ حق دوٹوک الفاظ میں کہہ سکتا ہے۔ [2] کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو اپنی آمدن اور نوکریاں بچانے کے لیے ظالموں کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں، ان کی غلط باتوں پر خاموشی اختیار کرتے ہیں اور ان کی خواہش پرستی کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ [3]

اگر کوئی داعی اپنی دعوت کے ذریعے سے دولت اور روزی کمانا چاہتا ہو یا اس کی دعوت کی بنیاد لوگوں کے صدقات اور چندے ہوں تو اس کی دعوت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، لوگوں میں کوئی پذیرائی حاصل نہیں کر سکتی، اس لیے ایک مسلمان داعی کو سب سے بڑھ کر اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ اس کی معاش کا انحصار ذاتی محنت اور عمدہ تجارت پر ہو۔ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے تاکہ دنیاوی لحاظ سے وہ کسی کا احسان مند نہ ہو، وگرنہ اپنے محسن کے سامنے وہ آزادی کے ساتھ حق بات کا اظہار نہیں کر سکے گا، اس کا فضل و احسان ضرور اسے مرعوب کرے گا۔

اس مقصد کے لیے نبی ﷺ کو اس تربیتی مرحلے سے گزرنا پڑا۔ اگرچہ یہ بات آپ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی اور نہ آپ جانتے تھے کہ مستقبل میں اللہ تعالیٰ کی رسالت اور اس کے دین کی دعوت کی ذمہ داریاں آپ کے سپرد کی جا رہی ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تربیت کے لیے جو انداز اختیار کیا اس میں یہی حکمت پنہاں ہے۔ تربیت کا یہ انداز بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہی مشیت تھی کہ بعثت سے قبل آپ ﷺ کی حیات مبارکہ میں کوئی ایسی چیز پیش نہ آئے جو بعثت کے بعد آپ کی دعوت میں کسی قسم کی پیچیدگی یا

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 2072. [2] مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيى اليحيى، ص: 128.

[3] فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 93.

رکاوٹ پیدا کرے یا اس پر منفی اثرات مرتب کرے۔[1]

حصولِ رزق کے لیے نبی کریم ﷺ کا گلہ بانی کی طرف متوجہ ہونا آپ کے اعلیٰ اوصاف کے مالک ہونے کی نشاندہی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلند ذوق اور نازک احساسات سے آراستہ فرمایا تھا۔ آپ کے چچا ابو طالب آپ ﷺ کے حقوق اور ضروریات کی مکمل نگہداشت کرتے تھے اور ایک مشفق باپ کی طرح آپ کے ساتھ محبت و شفقت کا مظاہرہ کرتے تھے لیکن جب نبی ﷺ نے محسوس کیا کہ میں محنت و مشقت کر سکتا ہوں تو گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنے چچا کا معاون بن کر خود کو کام کاج میں لگا دیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ فطری خود داری اور حسن معاملت سے بہرہ ور اور حتی المقدور اپنا بوجھ خود اٹھانے والے تھے۔[2]

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے لیے اس دنیا میں کس طرح کی زندگی پسند کرتا ہے۔ اس کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ اپنے نبی ﷺ کو ابتدائی زندگی میں دنیا کی سہولتیں اور آسائشیں عطا کر دیتا تاکہ حصول رزق کے لیے آپ کو محنت و مشقت اور گلہ بانی نہ کرنا پڑتی۔ لیکن حکمت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ ہم یہ بات جان لیں کہ انسان کا بہترین مال وہ ہوتا ہے جو وہ اپنے معاشرے اور بنی نوع انسان کی خدمت کرتے ہوئے اپنی جدوجہد سے حاصل کرتا ہے اور اس کا بدترین مال وہ ہے جو وہ بغیر کسی محنت و مشقت کے، راحتِ نفس و جان سے حاصل کرتا ہے اور اپنے معاشرے کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔[3]

بعثت سے قبل نبی ﷺ کی شرک وغیرہ سے حفاظت کا اہتمام

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو زمانۂ جاہلیت کے شرک اور بت پرستی سے محفوظ رکھا۔ امام احمد رحمہ اللہ مسند احمد میں روایت بیان کرتے ہیں کہ ہشام بن عروہ کو ان کے والد نے

---

[1] فقه السيرة للبوطي، ص: 50.
[2] فقه السيرة للبوطي، ص: 50.
[3] فقه السيرة للبوطي، ص: 50.

بتایا کہ مجھ سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ایک پڑوسی نے بیان کیا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

«أَيْ خَدِيجَةُ! وَاللّٰهِ لَا أَعْبُدُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى»

''اے خدیجہ! اللہ کی قسم! میں نے کبھی لات و عزیٰ کی عبادت نہیں کی۔''[1]

لات و عُزیٰ مشرکین کے بتوں کے نام ہیں جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اور ان کے سامنے جھکتے تھے۔ اسی طرح عہد جاہلیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس جانور کا گوشت نہیں کھاتے تھے جو کسی بت خانہ میں ذبح کیا گیا ہو۔ زید بن عمرو بن نُفیل کا بھی یہی طرز عمل تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عنفوان شباب میں عام نوجوانوں جیسے میلانات و جذبات اور خواہشوں سے بھی محفوظ رکھا، جو اگرچہ جوانی کا تقاضا ہوتی ہیں لیکن قائدین اور رہنماؤں کے مرتبہ و مقام کے شایانِ شان نہیں ہوتیں۔[3]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''اہل جاہلیت جن غیر پسندیدہ کاموں کا شوق رکھتے تھے میں نے ساری زندگی صرف دو مرتبہ ان کا ارادہ کیا اور ہر بار اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ رکھا۔ مکہ کے بالائی حصے میں ایک قریشی نوجوان میرے ساتھ اپنی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ ایک رات میں نے اس سے کہا کہ میری بکریوں کا بھی خیال رکھنا۔ میں آج مکہ میں قصہ گوئی کی محفل میں شریک ہونا چاہتا ہوں جیسا کہ دیگر نوجوان کرتے ہیں۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، چنانچہ میں چل پڑا۔ مکہ کی آبادی میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک گھر سے موسیقی، گانوں اور باجوں کی آواز آئی۔ میں نے پوچھا: ''کیا معاملہ ہے؟'' مجھے بتایا گیا کہ فلاں قریشی عورت کی فلاں

---

[1] مسند أحمد: 4/222 و 5/362. [2] وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 51.

[3] محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 1/51.

قریشی مرد سے شادی ہوئی ہے۔ میں بھی اس ساز و آواز کی طرف متوجہ ہوا لیکن مجھے نیند نے آلیا، پھر صبح دھوپ کی گرمی سے میں بیدار ہوا اور واپس چلا آیا۔ اس نوجوان نے پوچھا کہ سناؤ، کیسا رہا؟ میں نے اسے ساری بات بتا دی۔

پھر ایک دوسری رات میں نے اس نوجوان سے وہی درخواست کی (کہ میری بکریوں کا خیال رکھنا)، اس نے آمادگی ظاہر کی تو میں چل پڑا۔ میں نے اسی طرح (موسیقی و گانے) کی آوازیں سنیں اور مجھے وہی بات (کہ فلاں مرد کی فلاں عورت سے شادی ہوئی ہے) بتائی گئی۔ میں پھر ان آوازوں کی جانب متوجہ ہوا تو مجھ پر نیند غالب آ گئی۔ اگلی صبح سورج کی شعائیں پڑنے پر ہی میں بیدار ہوا، چنانچہ میں واپس اپنے ساتھی کے پاس آ گیا۔ اس نے پھر پوچھا کہ سناؤ، کیا کر کے آئے ہو؟ میں نے کہا: ''کچھ بھی نہیں۔''
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! اس کے بعد میں نے کبھی ایسے جاہلانہ عمل کا ارادہ نہیں کیا حتی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نبوت سے سرفراز فرما دیا۔''[1]

اس حدیث سے دو اہم حقیقتیں آشکار ہوتی ہیں:

① نبی کریم ﷺ کی ذات مبارکہ میں تمام بشری اوصاف موجود تھے۔ ہر نوجوان کی طرح آپ بھی اپنے دل میں مختلف طبعی میلانات پاتے تھے جیسا کہ حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ انسان کی فطرت میں یہ میلانات و جذبات ودیعت کیے جائیں، چنانچہ آپ ﷺ قصہ گوئی اور لہو و لعب کا مفہوم سمجھتے تھے۔ ان میں کیا لذت ہوتی ہے اس کا بھی آپ کو شعور تھا۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح آپ کے دل میں بھی ان کا شوق کروٹ لیتا تھا۔

② اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے بگاڑ کی ہر صورت سے آپ کی حفاظت فرمائی اور ہر اس چیز سے آپ کو دُور رکھا جو اس دعوت کے تقاضوں کے منافی تھی جس کے لیے آپ کو تیار کیا جا رہا تھا۔[2]

---

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي:2/34,33، ومجمع الزوائد:8/226. [2] فقه السيرة للبوطي، ص:51,50.

بَحیرا راہب سے ملاقات

ابو طالب نبی کریم ﷺ اور بعض قریشی بزرگوں کی معیت میں تجارت کے سلسلے میں شام کی طرف سفر کے لیے روانہ ہوئے۔ جب بحیرا راہب (ایک عیسائی عالم و زاہد) کے پاس سے گزرے تو وہاں کچھ دیر قیام کیا۔[1] اپنی سواریوں سے سامان اتار کر نیچے رکھ رہے تھے کہ بحیرا راہب ان کے پاس آیا، حالانکہ اس سے قبل کسی بھی سفر میں وہ کبھی ان کے پاس آیا تھا نہ کبھی ان سے کوئی بات کی تھی۔

ابھی یہ اپنی سواریوں سے سامان اتار رہے تھے کہ راہب نے آ کر ہر ایک کو غور سے دیکھنا شروع کیا، پھر رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: ”یہ تمام جہانوں کا سردار ہے، رب العالمین کا رسول ہے۔ وہ اسے تمام جہانوں کے لیے مجسمۂ رحمت بنا کر مبعوث فرمائے گا۔“ قریشی بزرگ اس سے پوچھنے لگے کہ تجھے کیسے معلوم ہوا؟ اس نے بتایا: ”جب تم گھاٹی سے نیچے اتر رہے تھے تو تمام درختوں اور پتھروں نے اسے سجدہ کیا اور شجر و حجر نبی ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ میں ان کی ایک اور علامت بھی جانتا ہوں۔ ان کے کندھے کی ہڈی کے نیچے سیب کے برابر مہر نبوت بھی ہے۔“

راہب نے واپس جا کر ان کے لیے کھانا تیار کیا، پھر وہ کھانا لے کر ان کے پاس آیا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ اُونٹوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ انھیں بلاؤ۔ آپ ﷺ تشریف لائے تو ایک بادل آپ پر سایہ فگن تھا۔ سب لوگ ایک درخت کے سائے میں بیٹھے تھے۔ جب آپ آئے تو درخت کے سائے میں کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ آپ

---

[1] 582ء میں جب آپ ﷺ کی عمر بارہ سال ہوئی تو آپ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ شام کے تجارتی سفر پر گئے۔ قافلہ بُصریٰ شہر میں ٹھہرا جہاں بحیرا راہب کا عبادت خانہ تھا۔ بُصریٰ جنوبی شام میں اُردن کی سرحد سے 19 میل شمال کی جانب ہے۔ اسے بُصری الشام بھی کہتے ہیں۔ (اٹلس سیرت نبوی، ص 94,93، دارالسلام)

ایک جگہ بیٹھ گئے تو درخت کا سایہ آپ کی جانب جھک گیا۔ اس پر راہب نے سب کو متوجہ کیا کہ دیکھو، درخت کا سایہ اس کی جانب ہو گیا ہے۔

ابھی وہ راہب ان کے پاس کھڑا ہو کر انھیں اللہ کا واسطہ دے کر کہہ رہا تھا کہ اسے لے کر رومیوں کے پاس نہ جاؤ۔ رومی ان کے اوصاف سے انھیں پہچان کر قتل کر ڈالیں گے۔ دریں اثنا اچانک وہاں سات رومی اشخاص آموجود ہوئے۔ راہب ان کے پاس گیا اور پوچھا: ”کیسے آئے ہو؟“ انھوں نے کہا: ”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس وقت کا نبی اس ماہ ایک سفر پر نکلنے والا ہے، اس لیے تمام راستوں پر لوگ بھیج دیے گئے ہیں۔ ہمیں اس کے متعلق خبر ملی ہے، اس لیے ہمیں اس کی تلاش کے لیے تمھاری خانقاہ کی طرف بھیجا گیا ہے۔“ راہب نے ان سے پوچھا: ”کیا تمھارے پیچھے کوئی تم سے بہتر بھی ہے؟“ انھوں نے جواب دیا: ”ہمارے آقا نے تمھاری خانقاہ کی طرف بھیجنے کے لیے ہمارا ہی انتخاب کیا ہے اور ہم ہی سب سے بہتر ہیں۔“ راہب نے انھیں سمجھایا: ”دیکھو! اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کام کا ارادہ کر لیا ہے تو کیا کوئی شخص اس میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے؟“ رومیوں نے جواب دیا: ”نہیں۔“ اس پر راہب نے کہا: پھر اس (ہونے والے نبی) کے ہاتھ پر بیعت کر لو اور اس کا ساتھ دو۔

پھر راہب نے (قریشی تاجروں سے) کہا: ”میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! بتاؤ اس کا سرپرست کون ہے؟“ انھوں نے کہا: ”ابو طالب۔“ تب راہب ابو طالب کو اللہ کے واسطے دینے لگا کہ آپ ﷺ کو واپس بھیج دو۔ بالآخر ابو طالب نے آپ ﷺ کو واپس مکہ بھیج دیا۔[1]

بَحیرا راہب کے واقعے سے ماخوذ اہم نکات: ① اہل کتاب کے حق پرست راہب یہ

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 3620، و دلائل النبوة للبيهقي: 25,24/2، و المستدرك للحاكم: 615/2، و دلائل النبوة لأبي نعيم، ص: 109.

بات جانتے تھے کہ محمد ﷺ ہی تمام انسانیت کے لیے رسول ہیں۔ یہ بات انھیں اس لیے معلوم ہوئی کہ ان کی کتابوں میں نبی ﷺ کے اوصاف اور نشانیاں موجود تھیں۔

② شجر و حجر نے آپ ﷺ کو سجدہ کیا، بادل آپ پر سایہ فگن ہوا اور درخت کا سایہ آپ کی جانب جھک گیا۔

③ نبی کریم ﷺ نے اپنے سفر اور اپنے چچا کی معیت میں اس سیاحت سے بہت کچھ سیکھا۔ خاص طور پر قریش کے بزرگوں سے بہت فائدہ اٹھایا جو صاحبِ تجربہ اور نہایت دانشور تھے، جبکہ آپ ﷺ کی زندگی میں ایسے تجربات نہیں آئے تھے۔

④ بَحیرا راہب نے ابو طالب کو عیسائیوں کے شر سے متنبہ کیا اور واضح طور پر بتا دیا کہ اگر ان رومیوں کو اس نبی کا علم ہو گیا تو وہ انھیں زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ اس نے آپ ﷺ کے چچا اور مکہ کے بزرگوں کو مجبور کیا کہ وہ آپ ﷺ کو لے کر رومیوں کے پاس نہ جائیں کیونکہ اگر انھوں نے آپ کو آپ کے اوصاف کی وجہ سے پہچان لیا تو وہ ضرور آپ کو قتل کر دیں گے۔ رومیوں کو یہ معلوم تھا کہ اس نبی کی آمد سے اس علاقے پر ان کا غاصبانہ قبضہ ختم ہو جائے گا اور تمام اشیاء اصل حقداروں کے پاس واپس چلی جائیں گی۔ ایسا کرنا رومی سلطنت کے مفادات کے خلاف ہے، اس لیے جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوگا وہ رومیوں کا دشمن ہے۔ یہ وہ بات تھی جس سے رومی خوف زدہ تھے۔

جنگِ فجار

یہ جنگ بنو کنانہ اور بنو ہوازن کے درمیان ہوئی۔ قریش نے بنو کنانہ کا ساتھ دیا۔ اس جنگ کا سبب یہ بنا کہ نعمان بن منذر کا ایک تجارتی قافلہ عکاظ کی منڈی کی طرف جا رہا تھا۔ بنو ہوازن کے سردار عروۃ الرَّحّال بن عتبہ نے اس قافلے کو بہ حفاظت عکاظ کی منڈی تک پہنچانے کے لیے پناہ دی۔ (بنو کنانہ اس قافلے کو لوٹنا چاہتے تھے) بنو کنانہ کے ایک سردار برّاض بن قیس بن کنانہ نے عروہ سے کہا: ”کیا تم بنو کنانہ کے مقابلے میں اس

قافلے کو پناہ دو گے؟'' اس نے کہا: ''ہاں، بنو کنانہ کیا ساری مخلوق کے خلاف بھی میں اس قافلے کو پناہ دوں گا۔ عروہ باہر نکلا تو برّاض نے موقع پا کر اسے قتل کر دیا۔ بنو کنانہ کو قتل کی خبر ملی (کہ ہمارے ایک سردار نے بنو ہوازن کے ایک سردار کو قتل کر دیا ہے) تو وہ فوراً حرمِ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے (تاکہ حرم میں پناہ لے سکیں)۔ کچھ دیر بعد بنو ہوازن کو بھی خبر پہنچ گئی۔ انھوں نے بنو کنانہ کا تعاقب شروع کر دیا اور ان کے حرم پہنچنے سے پہلے ہی انھیں آلیا۔ رات گئے تک ان دونوں کے مابین لڑائی ہوتی رہی، پھر وہ (بنو کنانہ) حرم کی سرزمین میں داخل ہو گئے تو بنو ہوازن نے جنگ سے ہاتھ روک لیا، بعد میں بھی انھوں نے کئی جنگیں لڑیں۔ اس جنگ میں قریش نے بنو کنانہ کا ساتھ دیا۔ (کیونکہ قریش بنو کنانہ ہی کا ایک حصہ تھے۔) نبی کریم ﷺ بھی کچھ روز اس جنگ میں شریک رہے کیونکہ آپ کے چچاؤں نے آپ کو ساتھ چلنے کا حکم دیا تھا۔ اس جنگ میں چونکہ مکہ کے تقدس کو تار تار کیا گیا تھا، اس لیے اس جنگ کا نام حرب فجار پڑ گیا۔[1]

خود رسول اللہ ﷺ اس جنگ کے بارے میں فرماتے ہیں: «كُنْتُ أُنَبِّلُ عَلَى أَعْمَامِي» ''میں اپنے چچاؤں کو تیر پکڑاتا تھا۔'' یعنی میں دشمن کے پھینکے ہوئے تیر اٹھا اٹھا کر اپنے چچاؤں کو دیتا تھا۔[2]

اس وقت نبی ﷺ کی عمر مبارک چودہ یا پندرہ سال تھی۔ ایک قول بیس سال کا بھی ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ آپ ﷺ کا دشمن کے پھینکے ہوئے تیروں کو جمع کر کے اپنے چچاؤں کو پکڑانا آپ کی نوعمری پر دلالت کرتا ہے۔

ان چیزوں سے رسول اللہ ﷺ میں جرأت اور شجاعت پیدا ہوئی اور آپ نے نوجوانی ہی میں جنگ کی عملی تربیت حاصل کر لی۔

عربوں کی دیگر لڑائیوں کی طرح بالآخر یہ جنگ بھی ختم ہو گئی، پھر اللہ تعالیٰ نے ان میں

---

[1] وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 53. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 198/1، والسيرة الحلبية: 1/127-129.

اپنے دین اسلام کا نور بھیج کر ان گمراہیوں کا خاتمہ کردیا اور ان کے دلوں میں محبت و الفت پیدا کی۔ [1]

حِلف الفُضُول

جنگ فجار سے قریش کی واپسی کے (تقریباً چار ماہ) بعد حلف الفضول [2] کا معاہدہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ (یمن کے ایک علاقہ) زَبید سے ایک آدمی کچھ سامانِ تجارت لے کر مکہ آیا۔ عاص بن وائل نے اس سے سامان خریدا مگر قیمت ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ زَبیدی نے قریش کے معززین سے اس معاملے میں مدد چاہی لیکن انھوں نے عاص کے مقام ومرتبہ کی وجہ سے اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ زَبیدی نے کعبہ کے پاس کھڑے ہو کر بنوآل فہر اور مکہ کے باکردار لوگوں سے مدد کی درخواست کی اور بآواز بلند یہ اشعار پڑھے ؎

يَا آلَ فِهْرٍ لِمَظْلُومٍ بِضَاعَتَهٗ   بِبَطْنِ مَكَّةَ نَائِي الدَّارِ وَالنَّفَرِ
وَمُحْرِمٍ أَشْعَثَ لَمْ يَقْضِ عُمْرَتَهٗ   يَا لَلرِّجَالِ وَبَيْنَ الْحِجْرِ وَالْحَجَرِ
إِنَّ الْحَرَامَ لِمَنْ تَمَّتْ كَرَامَتُهٗ   وَلَا حَرَامَ لِثَوْبِ الْفَاجِرِ الْغُدَرِ

”اے آل فہر! (قریشیو!) اس مظلوم کی مدد کرو جس کا تجارتی مال وادی مکہ میں

---

[1] وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 53. [2] وجہ تسمیہ: قریش سے پہلے بنو جرہم نے مظلوموں کی حمایت کے لیے ایک انجمن بنائی تھی۔ اس کام میں تین افراد پیش پیش تھے: فضل بن وداعہ، فضل بن فضالہ اور فضل بن حارث۔ ان سب کے نام میں ”فضل“ کا مادہ مشترک تھا۔ اسی اشتراک کی وجہ سے اس معاہدے کو حلف الفضول کا نام دیا گیا تھا۔ قریش نے جب اسی سے ملتا جلتا معاہدہ کیا تو اس کا نام بھی حلف الفضول رکھ دیا۔ اس کی یہ توجیہ بھی بیان کی گئی ہے کہ قریش نے اس معاہدے کا نام حلف الفضول اس لیے رکھا کہ وہ ایک فضیلت والے کام میں شامل ہوئے تھے۔ (البداية والنهاية: 271/2)

> چھین لیا گیا۔ وہ یہاں اپنے گھر بار، خاندان اور انصار و مددگار سے بہت دور ہے، آؤ اور اس کی مدد کرو۔ وہ (مظلوم) نہایت پراگندہ حالت میں ہے، احرام کی حالت میں ہے، ابھی اس نے عمرہ بھی ادا نہیں کیا۔ اے لوگو! حجر اسود اور حطیم کے مابین بیت اللہ کے پاسبانو! اس مظلوم کی مدد کرو۔ عزت و حرمت اس شخص کی ہے جس کے کام اچھے ہیں۔ غدار اور بدکار (عاص بن وائل) کی چادر کی کوئی عزت و حرمت نہیں۔" [1]

یہ اشعار سن کر زبیر بن عبدالمطلب اٹھے اور کہا کہ اب اس معاملے کو یونہی نہیں چھوڑا جا سکتا، چنانچہ عبداللہ بن جدعان نے کھانے کا اہتمام کیا اور اس کے گھر میں بنو ہاشم، بنو زہرہ، بنو امیہ اور بنو مخزوم کے سرکردہ لوگ جمع ہوئے اور انھوں نے حرمت والے مہینے ذوالقعدہ میں حلف اٹھایا اور پختہ معاہدہ کیا کہ واللہ! ہم ظالم کے خلاف اور مظلوم کے ساتھ ایک ہاتھ کی طرح متحد ہوں گے یہاں تک کہ وہ مظلوم کا حق اسے لوٹا دے۔ جب تک سمندر میں ایک بھی قطرہ پانی ہے اور ثبیر و حراء پہاڑ اپنی جگہ قائم ہیں، یہ معاہدہ بھی برقرار رہے گا۔ [2]

پھر وہ سب عاص بن وائل کے پاس گئے اور اس سے زبیدی کا سامان چھین کر زبیدی کے حوالے کیا۔

قریش نے اس معاہدے کا نام حلف الفضول رکھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ان لوگوں نے نہایت افضل کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

زبیر بن عبدالمطلب نے اسی معاہدے کے بارے میں یہ اشعار کہے:

> "معاہدہ حلف الفضول کرنے والوں نے یہ حلف اٹھایا ہے کہ سرزمین مکہ میں کوئی ظالم نہیں ٹھہر سکے گا۔ سب نے اس بات پر پختہ عہد و پیمان کیا ہے، لہٰذا مکہ میں رہنے والے اور باہر سے آنے والے سب محفوظ ہیں۔"

---

[1] الروض الأنف للسهيلي:156,155/1. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة:213/1.

اس معاہدے میں نبی ﷺ بھی شریک ہوئے۔ اس معاہدے نے ظلم کے محلات منہدم کر دیے اور حق کے مینار کو بلند کیا۔ یہ معاہدہ عربوں کے قابل فخر کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ عرب انسانی حقوق سے آشنا تھے۔[1]

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«شَهِدْتُّ حِلْفَ الْمُطَيِّبِينَ مَعَ عُمُومَتِي وَ أَنَا غُلَامٌ، فَمَا أُحِبُّ أَنَّ لِي حُمْرَ النَّعَمِ وَ أَنِّي أَنْكُثُهُ»

”میں اپنے چچاؤں کے ساتھ مُطَیِّبین (بنو ہاشم، بنو امیہ، بنو زہرہ اور بنو مخزوم) کے معاہدے میں موجود تھا اور میں ابھی لڑکا تھا۔ اگر مجھے اس کے عوض سرخ اونٹ بھی ملیں تو میں اسے توڑنا پسند نہیں کروں گا۔“[2]

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

«لَقَدْ شَهِدتُّ فِي دَارِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ جُدْعَانَ حِلْفًا مَّا أُحِبُّ أَنَّ لِي بِهٖ حُمْرَ النَّعَمِ وَلَوْ أُدْعٰى بِهٖ فِي الْإِسْلَامِ لَأَجَبْتُ»

”میں عبداللہ بن جدعان کے گھر پر اس معاہدے میں شریک تھا۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اس معاہدے کو چھوڑ کر اس کی جگہ سرخ اونٹ لے لوں۔ اگر اب بھی دورِ اسلام میں اس عہد و پیمان کے لیے مجھے بلایا جائے تو میں لبیک کہوں گا۔“[3]

درس و عبرت اور فوائد: ① عدل و انصاف کا حصول ہر ایک کا حق ہے۔ اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنی بعثت سے قبل، عدل و انصاف کے اصولوں کی سربلندی کے لیے اور ایسے معاہدوں میں شرکت اپنے لیے باعث اعزاز سمجھتے تھے۔ مثبت اقدار کو تقویت

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 214/1. [2] مسند أحمد: 190/1، والأدب المفرد للبخاري، حديث: 567، و مسند أبي يعلٰى، حديث: 844-846. [3] السنن الكبرٰى للبيهقي: 367/3، والسيرة النبوية لابن هشام: 142,141/1.

دینی چاہیے، خواہ وہ دین سے بے بہرہ لوگوں کی طرف ہی سے پیش کی گئی ہوں۔ [1]

② حلف الفضول جاہلیت کے اندھیروں میں روشنی کی ایک کرن تھی۔ اس میں اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ کسی معاشرے یا نظام میں فساد جس قدر بھی پھیل جائے اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ معاشرہ یا نظام ہر قسم کی خوبی سے کورا ہے۔ مکہ مکرمہ کے جاہلی معاشرے پر بت پرستی اور ظلم و استبداد کی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ہر طرف زیادتی، زنا اور سودخوری جیسے برے اخلاق کا دَور دَورہ تھا۔ اس کے باوجود وہاں ایسے دلیر اور جری لوگ موجود تھے جو نہ صرف ظلم کو ناپسند کرتے تھے بلکہ ظلم ان کے لیے ناقابل برداشت بھی تھا۔ اس میں ان داعیوں کے لیے بہت بڑا درس ہے جو ایسے معاشروں میں کام کر رہے ہیں جہاں اسلام بالادست نہیں یا وہاں اسلام کی مخالفت میں تشدد کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ [2]

اسلام ظلم کا قلع قمع کرتا ہے اور مظلوم کی حمایت کرتا ہے، قطع نظر اس سے کہ مظلوم کا تعلق کس قوم، نسل، مذہب اور وطن سے ہے۔ [3]

④ اچھے کاموں کے لیے معاہدہ کرنا اور حلف اٹھانا مستحب ہے۔ یہی وہ باہمی تعاون ہے جس کا قرآن حکیم میں حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾

”نیکی اور تقویٰ کے امور میں ایک دوسرے سے تعاون کیا کرو۔“ [4]

مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ ایسی صورتوں میں باہمی معاہدے کریں کیونکہ یہ معاہدے اس چیز کی تاکید کے لیے ہوتے ہیں جو شریعت میں مطلوب ہے۔ لیکن یہ شرط ہے کہ معاہدے مسجد ضرار جیسے نہ ہوں کہ ان معاہدوں کی صورت میں مسلمانوں کے اندر گروہ بندی پیدا ہو اور وہ ظلم و تشدد کو ہوا دیں۔

ظلم روکنے کے لیے یا ظالم کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمان غیر مسلم اقوام کے ساتھ

---

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 112/1. [2] فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 110. [3] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 121. [4] المآئدة 2:5.

بھی معاہدہ کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ یہ معاہدے موجودہ حالات میں بھی اور مستقبل میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے لیے فائدہ مند ہوں۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا: «مَا أُحِبُّ أَنَّ لِي بِهِ حُمْرَ النَّعَمِ» ”مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اس معاہدے کو چھوڑ کر اس کی جگہ سرخ اونٹ لے لوں۔“[1] کیونکہ ایسے معاہدوں سے عدل و انصاف حاصل ہوتا ہے اور ظلم رکتا ہے۔ اور آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی اس بات کی دلیل ہے: «لَوْ دُعِيتُ بِهِ فِي الْإِسْلَامِ لَأَجَبْتُ» ”اگر اسلام میں بھی مجھے اس معاہدے کی طرف بلایا جائے تو میں ضرور لبیک کہوں گا۔“[2]

کیونکہ یہ معاہدہ ظالم کو ظلم سے روکتا ہے اس لیے آپ ﷺ نے واشگاف الفاظ میں فرما دیا کہ اسلام کے بعد بھی اگر کوئی مجھے اس معاہدے کی رُو سے آواز دے گا تو میں اس کی دادرسی کے لیے تیار رہوں گا۔[3]

⑤ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں اس کا ایک مثبت کردار ہو۔ اپنے ماحول اور معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات میں اس کی حیثیت ایک تماشائی کی نہ ہو۔ نبی کریم ﷺ اپنے (غیر مسلم) معاشرے میں لوگوں کی نگاہوں کا مرکز تھے اور آپ کا کردار مثالی تھا۔ سب آپ کو امین کے نام سے پکارتے تھے۔ آپ ﷺ یکساں طور پر مرد و زن کے دلوں کی دھڑکن تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عمدہ اخلاق سے آراستہ کیا تھا۔ آپ اعلیٰ اخلاق و کردار کا مسلسل مظاہرہ کرتے رہے یہاں تک کہ آپ نے اپنی قوم کے دل جیت لیے۔ یہ اس بات کی زندہ تصویر ہے کہ معاشرے میں اخلاق کی قدر و قیمت کس قدر زیادہ ہوتی ہے اور عمدہ اخلاق و کردار کی مالک شخصیت کا کس قدر احترام ہوتا ہے کہ ایک بگڑا ہوا معاشرہ بھی اس کی عزت و توقیر پر مجبور ہو جاتا ہے۔[4]

---

[1] مسند أحمد: 190/1، والأدب المفرد للبخاري، حديث: 567، و مسند أبي يعلى، حديث: 844-846، والسيرة النبوية لابن هشام: 142,141/1. [2] السنن الكبرى للبيهقي: 367/3، والسيرة النبوية لابن هشام: 142,141/1. [3] الأساس في السنة لسعيد حوّى: 172/4. [4] فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 111,110.

باب 3

تجارتی سفر، نکاح اور بعثت سے قبل اہم واقعات

سفرِ تجارت اور خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایک اعلیٰ خاندان کی مالدار بیوہ خاتون تھیں۔[1] وہ معاوضے پر لوگوں کو تجارت کے لیے اپنا مال دیا کرتی تھیں۔ جب انھیں محمد کریم ﷺ کی صداقت و امانت اور اعلیٰ اخلاق کی خبر ہوئی تو انھوں نے آپ ﷺ کو پیش کش کی کہ میرا مال تجارت کے لیے شام لے جائیں، میں دیگر تاجروں کی نسبت آپ کو زیادہ معاوضہ دوں گی۔ آپ ﷺ نے یہ پیش کش قبول کر لی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا غلام میسرہ بھی آپ کا شریک سفر بن گیا۔ شام پہنچ کر آپ ﷺ نے اپنے ساتھ لایا ہوا سامانِ تجارت فروخت کیا اور وہاں سے سامان خریدا۔ مکہ واپس آنے پر آپ کا لایا ہوا سامان جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فروخت کیا تو ان کے مال میں کئی گنا اضافہ ہوا۔

اس سفر میں رسول کریم ﷺ کو مالی فوائد کے ساتھ ساتھ اور بہت سے تجربات اور فائدے حاصل ہوئے۔ آپ کا مدینہ منورہ سے گزر ہوا جسے مستقبل میں آپ کی جائے ہجرت بننا تھا اور جسے آپ علیہ السلام نے اپنی دعوت کا مرکز بنانا تھا۔ آپ ان علاقوں سے بھی گزرے جو (بعثت اور ہجرت کے بعد) آپ کے ہاتھوں فتح ہوئے اور وہاں آپ کے

---

[1] خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پہلے خاوند کا نام عتیق بن عائذ تھا۔ ان کے انتقال کے بعد خدیجہ رضی اللہ عنہا ابو ہالہ کے نکاح میں آئیں، پھر ابو ہالہ کا بھی انتقال ہوگیا۔

دین کی نشر و اشاعت ہوئی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کا سبب بھی یہی سفر بنا۔ ایک تو میسرہ نے ان سے آپ ﷺ کی فیاضی، صداقت اور کریمانہ اخلاق کا تذکرہ کیا،[1] دوسرا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے خود دیکھا کہ ان کے مال میں اتنی برکت ہوئی جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی اور لوگوں کی زبانی بھی انھیں آپ ﷺ کی عادات عالیہ کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تو گویا اپنی گمشدہ منزل مل گئی۔ انھوں نے اپنے دل کی بات اپنی سہیلی نفیسہ بنت مُنَبِّہ کو بتا دی۔ نفیسہ خود نبی کریم ﷺ کے پاس گئیں اور انھیں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کرنے کا مشورہ دیا۔[2] آپ ﷺ نے اپنی رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے یہ پیشکش اپنے چچاؤں کے سامنے رکھی تو سب نے موافقت کی۔ آپ کے چچا حمزہ بن عبدالمطلب نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے منگنی کی بات چیت کی۔ آخر کار حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی زوجیت میں آگئیں۔ آپ ﷺ نے اس موقع پر بیس اونٹنیاں بطور حق مہر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو دیں۔ یہ پہلی خاتون تھیں جن سے رسول اللہ ﷺ کا نکاح ہوا اور ان کی زندگی میں آپ ﷺ نے کسی اور عورت سے شادی نہیں کی۔[3]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے رسول اللہ ﷺ کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ایک بیٹے کا نام قاسم تھا، انھی کے نام پر آپ کی کنیت ابو القاسم تھی۔ دوسرے بیٹے کا نام عبداللہ تھا جنھیں طاہر اور طیب کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ قاسم جب شہسواری کی عمر کو پہنچے تو اللہ کو پیارے ہو گئے، جبکہ عبداللہ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ انھیں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس بلا لیا۔ دونوں بیٹے بعثت سے قبل ہی فوت ہو گئے۔

بیٹیوں کے نام زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ رضی اللہ عنہن ہیں۔ ان سب نے اسلام قبول

---

[1] رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 27/3. [2] وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 56. [3] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 122.

کیا، مدینہ کی ہجرت کا بھی انھیں شرف حاصل ہوا اور رسول اللہ ﷺ نے ان سب کی شادیاں بھی کیں۔[1]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کے وقت آپ ﷺ کی عمر پچیس سال تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس سال تھی۔[2]

درس و عبرتیں اور فوائد: ① ایک کامیاب تاجر کے اوصاف میں سے اہم ترین وصف صداقت و امانت ہے۔ تجارت میں نبی کریم ﷺ کی شخصیت کے یہی دو اوصاف تھے جنھوں نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو آمادہ کیا کہ وہ اپنا تجارتی سامان دے کر آپ ﷺ کو شام بھیجیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت میں برکت فرمائی اور ہر قسم کی خیر اور بھلائی کے دروازے کھول دیے۔

② ذرائع آمدنی کا ایک بہترین ذریعہ تجارت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے لیے بعثت سے قبل اسے نہایت آسان بنا دیا تھا۔ آپ ﷺ نے تجارت کے فنون میں مہارت حاصل کی اور تاجروں کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا: «اَلتَّاجِرُ الصَّدُوقُ الْأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ» ”امانت دار اور سچ بولنے والا تاجر قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کی معیت میں اُٹھایا جائے گا۔“[3] روزی کے حصول کے لیے باوقار پیشے اختیار کرنا مسلمانوں کے فرائض میں سے ہے۔ ایسا شخص دوسرے کے احکامات کا پابند نہیں ہوتا، نہ کسی کا ماتحت ہوتا ہے نہ غلام اور نہ دوسروں کا محتاج ہوتا ہے بلکہ دوسرے لوگ اس کے محتاج ہوتے ہیں جو اس کے تجربات اور اس کی امانت و عفت سے مستفید ہوتے ہیں۔

③ آپ ﷺ کی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق تھی۔ اللہ تعالیٰ

---

[1] رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 28/3. [2] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 122. [3] السلسلة الصحيحة: 1336/7، حديث: 3453، البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

نے آپ ﷺ کے لیے ایسی شریک حیات کا انتخاب کیا جو ہر لحاظ سے آپ کے لیے مناسب ہو۔ آپ ﷺ کا ہر بوجھ اٹھائے، آپ کے غموں کو ہلکا کرے۔ نبوت کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں آپ کی معاون ہو اور پریشانی کے عالم میں پیار اور محبت کے ساتھ زندگی بسر کرے۔[1]

شیخ محمد الغزالی ؒ فرماتے ہیں کہ وہ عورتیں جو عظیم لوگوں کی زندگیوں کو کامیاب بنانے والی ہوتی ہیں، ان کے لیے حضرت خدیجہ ؓ کی زندگی ایک مثالی زندگی ہے۔ انبیاء اور رسولوں کے دل بڑے حساس ہوتے ہیں اور وہ جس قوم کی تقدیر بدلنے کے لیے جستجو کرتے ہیں اس قوم کی طرف سے انھیں بڑی زیادتیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے انھیں بھلائی کے راستے میں بڑی جدوجہد کرنا پڑتی ہے، اس لیے انھیں دوسروں کی نسبت ایسی شریکِ حیات کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے جو ان کی نجی زندگی کو محبت والفت اور اتفاق و یگانگت سے معمور کر دے۔ حضرت خدیجہ ؓ میں یہ اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے، اس لیے انھوں نے نبی کریم ﷺ کی زندگی پر نہایت عمدہ اور گہرے اثرات چھوڑے۔[2]

④ بچپن میں نبی کریم ﷺ کو اپنے والدین سے جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا اور جوانی میں اپنے بیٹوں کی جدائی کا دُکھ سہنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلے بڑے حکیمانہ ہوتے ہیں۔ اس کی یہ مشیت تھی کہ آپ ﷺ کا کوئی بیٹا بقید حیات نہ رہے تاکہ مستقبل میں کوئی نبوت کا دعویدار بن کر اپنے آپ کو اور دوسروں کو آزمائش میں مبتلا نہ کر دے۔ ایک انسانی خواہش اور فطری تقاضوں کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیٹے عطا بھی کیے۔ اس میں یہ حکمت تھی کہ نبی ﷺ کی کمال مردانگی پر کسی کو عیب لگانے اور زبان درازی کی جرأت نہ ہو، پھر کم عمری ہی میں انھیں واپس لے لیا تاکہ آپ ﷺ کی ذات ان لوگوں

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 123,122/1۔ [2] فقه السيرة للغزالي، ص: 75۔

کے لیے اطمینان قلب اور حصول صبر کا وسیلہ بن جائے جنھیں اللہ نے بیٹے عطا نہیں کیے یا عطا کر کے واپس لے لیے، نیز یہ ایک طرح کی آزمائش بھی تھی اور انبیاء ہی شدید ترین آزمائشوں میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔[1]

یہ بھی حکمت الٰہی تھی کہ نرم دلی اور رحمدلی کو آپ ﷺ کی شخصیت کا ایک حصہ بنا دیا جائے۔ کیونکہ قوموں کے رہنما سخت مزاج اور تشدد پسند نہیں ہوتے۔ سخت مزاج اور تشدد پسند لوگ وہی ہوتے ہیں جن کی فطرت میں خود غرضی اور سنگدلی کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہو۔ ان کی ساری زندگی آسائشوں اور خوشحالیوں سے بھری ہو، انھوں نے کبھی کوئی دکھ اور تکلیف نہ دیکھی ہو۔ لیکن وہ شخص جسے مصائب و تکالیف نے کندن بنا دیا ہو وہ مصیبت زدہ لوگوں کا سب سے زیادہ غمخوار ہوگا اور سب سے بڑھ کر ضرورت مندوں کے کام آئے گا۔[2]

⑤ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ ﷺ کی شادی سے یہ بات ایک مسلمان پر عیاں ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ کو جسمانی لذتوں کی کوئی فکر نہ تھی۔ اگر آپ دیگر نوجوانوں کی طرح صرف تسکینِ جسم و جاں کے رسیا ہوتے تو پھر کسی کم عمر عورت کی خواہش کرتے اور بڑی عمر کی عورت سے کبھی شادی نہ کرتے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے شادی کا پیغام اس لیے قبول کیا کیونکہ وہ اپنے خاندان میں عزت و شرافت اور اعلیٰ مرتبے کی حامل تھیں اور زمانۂ جاہلیت میں انھیں عفیفہ و طاہرہ (پاکدامن و پاکباز) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

⑥ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم ﷺ کی شادی نے مستشرقین اور سیکولر قسم کے اسلام دشمنوں کی زبانیں بند کر دی ہیں اور ان کے قلموں کو لگام دی ہے جنھوں نے یہ سمجھا تھا کہ ہم آپ ﷺ کی زیادہ شادیوں کو موضوع بنا کر پیغمبر ﷺ پر ایک کاری وار کر سکتے ہیں۔

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 2398، وسنن ابن ماجه، حديث: 4023. [2] فقه السيرة للغزالي، ص: 78.

انھوں نے (نعوذ باللہ) نبی کریم ﷺ کو ایک شہوت پرست شخص کے روپ میں پیش کیا جو اپنی ذات اور خواہشات میں ڈوبا ہوا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جاہلی معاشرے میں بھی اپنی زندگی کے شب و روز نہایت پاکباز شخصیت کے طور پر گزارے۔ آپ ﷺ کے گردونواح میں ہر قسم کی برائی کے محرکات موجود تھے مگر آپ نے ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور پھر ایک ایسی عورت سے شادی کی جو عمر میں آپ سے 15 سال بڑی تھیں اور ان کی رفاقت میں زندگی بسر کرتے رہے۔ ان کے سوا کسی اور کو آنکھوں میں نہ بسایا، حالانکہ مواقع بھی موجود تھے اور ان کا حصول بھی نہایت آسان تھا۔ جوانی کی عمر گزر گئی۔ عمر کا درمیانی حصہ گزار کر بڑھاپے میں داخل ہو گئے لیکن یہ شادی برقرار رہی حتی کہ حضرت خدیجہ ؓ پینسٹھ سال کی عمر میں اپنے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ خود نبی کریم ﷺ اپنی عمر کے پچاسویں سال میں داخل ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں آپ نے کبھی کسی دوسری عورت کے ساتھ شادی کا سوچا بھی نہیں، جبکہ 20 سے 50 سال کے دورانیے میں کوئی مرد ایک سے زائد شادیوں کی تمنا کرتا ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے اس عمر میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ حضرت خدیجہ ؓ کی موجودگی میں کسی اور عورت سے شادی کریں یا لونڈی ہی خرید لیں۔ اگر آپ کی ایسی خواہش ہوتی تو ایک اشارے پر سینکڑوں عورتیں آپ کی زوجیت میں آنے کے لیے تیار تھیں۔

حضرت خدیجہ ؓ کے انتقال کے بعد نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ ؓ اور دیگر امہات المومنین سے نکاح کیا۔ ہر نکاح کی ایسی حکمت اور وجہ تھی کہ ایک مسلمان جب ان پر غور کرتا ہے تو اس کے دل میں نبی کریم ﷺ کی عظمت و رفعت بڑھ جاتی ہے اور آپ کے خلق عظیم کا اعتراف مزید پختہ ہو جاتا ہے۔[1]

---

[1] فقه السيرة للبوطي، ص:54,53.

بیت اللہ کی تعمیر میں رسول اللہ ﷺ کی شرکت

جب محمد رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک پینتیس سال ہوئی تو قریش نے بیت اللہ کی ازسرنو تعمیر کا منصوبہ بنایا کیونکہ اس کا کچھ حصہ جل گیا تھا اور سیلاب کے تسلسل نے بھی اس کی دیواروں کو کمزور کر دیا تھا۔ یہ ابھی تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر پر قائم تھا۔ پتھروں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اس کی اونچائی انسانی قدو قامت سے کچھ اُونچی تھی۔ قریش اسے گرا کر مزید اونچا کرنا چاہتے تھے (چونکہ اس سے قبل بیت اللہ کی چھت نہیں تھی، اس لیے وہ) اس پر چھت ڈالنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن اسے منہدم کرنے سے گھبراتے اور خوف کھاتے تھے۔ اس پر ولید بن مغیرہ نے کہا کہ میں اسے گرانے کی ابتدا کرتا ہوں۔ اس نے کدال پکڑی اور یہ کہہ کر حجر اسود اور رکن یمانی کا درمیانی حصہ مسمار کر دیا کہ اے اللہ، ہم تجھ سے منحرف نہیں ہوئے، صرف خیر و بھلائی کے ارادے سے یہ کام کر رہے ہیں۔

لوگ رات بھر منتظر رہے کہ اگر ولید بن مغیرہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو گیا تو ہم بیت اللہ کا کوئی بھی حصہ نہیں گرائیں گے بلکہ شکستہ دیوار مرمت کر دیں گے۔ اور اگر اسے کچھ نہ ہوا تو یہ اس بات کی دلیل ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے کام پر راضی ہے، چنانچہ صبح سویرے ولید بن مغیرہ نے پھر سے بیت اللہ کی دیواروں کو گرانا شروع کر دیا۔ لوگ بھی اس کے ساتھ شریک ہو گئے اور دیواریں گراتے گراتے سبز رنگ کے پتھروں تک پہنچ گئے جو اُونٹوں کے کوہانوں کے مانند تھے اور ایک دوسرے میں پیوست تھے (بعض مؤرخین نے ان پتھروں کو اساس ابراہیم قرار دیا ہے۔)

قریش نے کام آپس میں تقسیم کر لیے تھے۔ ہر قبیلے کے لیے تعمیر کا ایک حصہ متعین کر دیا گیا تھا۔ قریش کے سردار اور بزرگ پتھر لانے اور لگانے میں شریک رہے۔ نبی کریم ﷺ

نے اور آپ کے چچا عباس بن عبدالمطلب نے بھی تعمیر کعبہ میں شرکت کی۔ آپ دونوں پتھر لاتے تھے۔ حضرت عباس نے آپ ﷺ سے کہا کہ اپنا تہبند اتار کر اپنی گردن پر رکھ لو، تمھاری گردن پتھروں کی وجہ سے زخمی ہونے سے محفوظ رہے گی۔ (آپ نے چچا کی بات مان لی) تو غش کھا کر زمین پر گر گئے۔ آپ کی آنکھیں آسمان کی طرف گڑ گئیں، پھر کچھ دیر بعد افاقہ ہوا تو فرمایا: «إِزَارِي، إِزَارِي» ”مجھے میری چادر دو۔“ پھر آپ ﷺ نے مضبوطی سے اپنی چادر باندھ لی۔[1]

جب حجر اسود کے نصب کا وقت آیا تو قبائل میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ اس پتھر کے نصب کرنے کا اعزاز صرف اسے حاصل ہو۔ ممکن تھا کہ اسی وجہ سے ان کے درمیان خونریزی شروع ہو جاتی، ابو امیہ ولید بن مغیرہ نے کہا: ”اے قریش کے لوگو! اپنے اختلاف کو دور کرنے کے لیے اس شخص کو منصف تسلیم کر لو جو اب سب سے پہلے مسجد کے دروازے سے اندر داخل ہو۔ سب اس پر متفق ہو گئے، پھر محمد رسول اللہ ﷺ (مسجد کے دروازے سے اندر) داخل ہوئے، سب نے انھیں دیکھ کر کہا کہ ہم اس امین پر راضی ہیں۔ جب قریش نے آپ کو ساری بات بتائی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «هَلُمُّوا ثَوْبًا» ”ایک کپڑا لاؤ۔“ جب کپڑا لایا گیا تو آپ نے اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو اس پر رکھ کر فرمایا: «لِتَأْخُذْ كُلُّ قَبِيلَةٍ بِنَاحِيَةٍ مِّنَ الثَّوْبِ، ثُمَّ ارْفَعُوا جَمِيعًا» ”اب ہر قبیلہ اس کپڑے کو ایک جانب سے پکڑ کر اوپر اٹھائے۔“ سب اسے اوپر اٹھا کر اس مقام پر لے آئے جہاں اسے نصب کیا جانا تھا تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے اسے وہاں نصب فرما دیا، پھر اس پر بقیہ تعمیر کی گئی۔[2]

کعبۃ اللہ کی دیواروں کی بلندی 18 ہاتھ تک کر دی گئی اور اس کا دروازہ زمین سے اس

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 1582، صحيح مسلم، حديث: 340. [2] المستدرك للحاكم: 459,458/1، والمصنف لعبدالرزاق: 101,100/5، ودلائل النبوة للبيهقي: 57,56/2.

قدر بلند کر دیا گیا کہ بغیر سیڑھی کے اس میں داخلہ ممکن نہ تھا۔ ایک مقصد تو یہ تھا کہ ہر کوئی بیت اللہ میں داخل نہ ہو، قریش جسے چاہیں داخل ہونے کی اجازت دیں۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ سیلاب کا پانی بیت اللہ میں داخل نہ ہو۔ اس کی چھت لکڑی کے چھ ستونوں پر بنائی گئی۔

قریش نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ بیت اللہ کی تعمیر میں صرف حلال کمائی استعمال کریں گے۔ بدکاری، سود خوری اور ظلم سے حاصل کردہ مال اس میں خرچ نہیں کریں گے۔ اس مقصد کے لیے جمع شدہ حلال مال اتنا وافر نہ تھا کہ بیت اللہ کی تعمیر اصل بنیاد پر مکمل ہو سکے، لہٰذا انھوں نے کچھ حصہ تعمیر کے بغیر چھوڑ دیا جسے حِجر (حطیم) کہا جاتا ہے اور چھوٹی سی دیوار بنا دی تاکہ اسے بیت اللہ کا حصہ سمجھا جائے۔ (اور طواف کے وقت اس حصے کو بھی شاملِ طواف سمجھا جائے۔)[1]

درس و عبرت اور فوائد: ① بیت اللہ کی اہمیت اور قریش کے ہاں اس کے تقدّس کو جاننے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کی تعمیر و تاسیس خود حضرت ابراہیم اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کی۔ اس طرح یہ ایک اللہ کی عبادت اور توحید کا پہلا مرکز بنا۔

② تاریخی لحاظ سے بیت اللہ کی تعمیر چار مرتبہ ہوئی۔

پہلی مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے تعمیر کیا اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ان کی معاونت فرمائی۔

دوسری مرتبہ قریش نے بعثت نبوی سے قبل اس کی تعمیر کی اور اس تعمیر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شرکت فرمائی۔

تیسری تعمیر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کی۔ یزید بن معاویہ کے عہد حکومت میں

---

[1] وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 57، و رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 30,29/3.

جب حصین بن نمیر السکونی نے مدعی خلافت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا محاصرہ کیا تھا تو اس دوران بیت اللہ کا کچھ حصہ جل گیا، پھر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اس کی تعمیر فرمائی۔

چوتھی تعمیر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت کے بعد عبدالملک بن مروان کے دورِ حکومت میں ہوئی۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی تعمیر ختم کر کے کعبے کو دوبارہ اسی بنیاد پر تعمیر کیا گیا جو عہد نبوی میں تھی۔[1]

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی تعمیر میں بیت اللہ کا وہ حصہ (حطیم) بھی شامل کر لیا تھا جسے قریش نے تعمیر کے بغیر چھوڑ دیا تھا۔ انھوں نے بیت اللہ کی اونچائی دس ہاتھ بڑھا دی تھی اور اس کے دو دروازے بنا دیے تھے، ایک داخل ہونے کے لیے اور دوسرا باہر نکلنے کے لیے۔ انھوں نے یہ سب کچھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی اس فرمان نبوی کی روشنی میں کیا تھا:

«يَا عَائِشَةُ! لَوْلَا أَنَّ قَوْمَكِ حَدِيثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ، لَأَمَرْتُ بِالْبَيْتِ فَهُدِمَ، فَأَدْخَلْتُ فِيهِ مَا أُخْرِجَ مِنْهُ، وَ أَلْزَقْتُهُ بِالْأَرْضِ، وَ جَعَلْتُ لَهُ بَابَيْنِ، بَابًا شَرْقِيًّا وَّبَابًا غَرْبِيًّا، فَبَلَغْتُ بِهِ أَسَاسَ إِبْرَاهِيمَ»

”اے عائشہ! تیری قوم جاہلیت کو چھوڑ کر تازہ تازہ مسلمان ہوئی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں حکم جاری کرتا کہ بیت اللہ کو گرا کر اس میں وہ حصہ داخل کر دیا جائے جو بغیر تعمیر کے چھوڑ دیا گیا ہے اور میں اس کا دروازہ بلند کرنے کے بجائے زمین کے ساتھ برابر کر دیتا اور میں اس کے دو دروازے بناتا ایک مشرق کی جانب اور ایک مغرب کی جانب اور میں اسے ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر استوار کرتا۔“[2]

③ حجر اسود کا جھگڑا ختم کرنے کا انداز نہایت عادلانہ و منصفانہ تھا جسے سب نے پسند کیا اور

---

[1] السيرة النبوية للبوطي، ص:58,57. [2] صحيح البخاري، حديث: 1586، و صحيح مسلم، حديث:(401)-1333.

اس کی وجہ سے خونریزی اور مہلک جنگ کے خطرات ٹل گئے۔ آپ ﷺ کے فیصلے کے عادلانہ ہونے کی یہ دلیل ہے کہ سب قبائل نے اسے پسند کیا اور ہر قبیلے کو حجر اسود اس کے مقام پر رکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ ﷺ کو یہ توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی تھی جس نے بعثت سے قبل آپ ﷺ کی صحیح رہنمائی فرمائی۔ باب صفا سے آپ ﷺ کا داخل ہونا بھی تقدیر الٰہی کے مطابق تھا تاکہ آپ ﷺ اس مشکل ترین بحران کو حل کریں جو قلوب و اذہان کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ سب نے آپ ﷺ کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ آپ ایسے امانت دار تھے کہ نہ کسی پر ظلم کرتے اور نہ بدسلوکی کرتے بلکہ آپ گھروں کے رکھوالے، جانوں کے محافظ اور خون کو تحفظ دینے والے تھے۔[1]

④ بیت اللہ کی تعمیرِ نو کے واقعے نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ قریشی حلقے میں نبی کریم ﷺ کو کس قدر ادب و احترام حاصل تھا۔[2]

آپ ﷺ کو ایک اعزاز تو یہ حاصل ہوا کہ آپ نے ان کے جھگڑے کو ختم کیا اور قریشی قبائل کے درمیان شروع ہونے والی جنگ کو روک دیا۔ دوسرا اعزاز حجر اسود کو اس کے مقام پر رکھنا تھا جس کے لیے سارے قبائل ایک دوسرے پر بازی لے جانا چاہتے تھے، وہ اعزاز اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا۔[3]

⑤ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو بھر پور صلاحیت سے نوازا تھا کہ آپ مشکلات کا آسان حل تلاش کر لیتے تھے۔ یہ چیز آپ ﷺ کی پوری حیات طیبہ میں نظر آتی ہے اور یہ آپ کی رسالت و نبوت کی ایک اہم دلیل ہے۔[4]

⑥ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو عالم شباب میں جاہلیت کی تمام غلاظتوں اور عیوب سے محفوظ رکھا۔ تعمیر کعبہ کے دوران میں پتھر اٹھاتے وقت جب آپ نے (اپنے چچا کے کہنے

---

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 125. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 116/1.

[3] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 125. [4] الأساس في السنة لسعيد حوّى: 145/1.

پر) اپنی چادر اپنی گردن پر رکھ لی تو غش کھا کر زمین پر گر گئے۔ اس کے بعد کبھی آپ ﷺ بے لباس نہیں ہوئے۔[1]

نبوت محمدیہ کے استقبال کی تیاری

حکمت الٰہی کا تقاضا تھا کہ لوگوں کو آپ ﷺ کی نبوت کے استقبال کے لیے تیار کیا جائے، چنانچہ درج ذیل طریقوں سے لوگوں کو تیار کیا گیا:

حضرت محمد ﷺ کے متعلق انبیاء علیہم السلام کی بشارتیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ عربوں میں انھی میں سے ایک رسول مبعوث فرما تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کرتے ہوئے حضرت محمد کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا یوں تذکرہ فرمایا:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ؕ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝﴾

”اے ہمارے رب! اور ان لوگوں کے لیے انھی میں سے ایک رسول بھیج، وہ ان کے سامنے تیری آیتیں تلاوت کرے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور انھیں پاک کرے، بے شک تو ہی غالب، خوب حکمت والا ہے۔“[2]

قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ پہلے انبیاء پر نازل کردہ آسمانی کتابوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بارے میں بشارتیں نازل فرمائیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ز﴾

”(یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جس کا

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 1582. [2] البقرة 2:129.

ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔“ [1]

عیسیٰ علیہ السلام نے بھی آپ ﷺ کی بشارت دی جس کا قرآن حکیم نے یوں تذکرہ کیا ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝﴾

”اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! بے شک میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس (کتاب) تورات کی جو مجھ سے پہلے ہے اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں، وہ میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا، پھر جب وہ (رسول) ان کے پاس کھلی نشانیوں کے ساتھ آیا تو وہ بولے: یہ تو کھلا جادو ہے۔“ [2]

اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو نبی ﷺ کی بعثت کے بارے میں بتا دیا تھا اور انھیں حکم دیا تھا کہ اپنی امتوں کو بھی یہ بات بتا دیں کہ اگر وہ (آخری نبی) ان کی زندگی میں مبعوث ہو جائے تو اس پر ایمان لانا اور اس کے نقش قدم پر چلنا ان کے لیے ضروری ہے۔ [3] اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ۝﴾

”اور (یاد کرو) جب اللہ نے تمام نبیوں سے عہد لیا تھا کہ جب میں تمھیں کتاب اور حکمت عطا کروں، پھر تمھارے پاس کوئی رسول آئے جو اس (کتاب) کی

---

[1] الأعراف 157:7. [2] الصف 6:61. [3] دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص:102,101.

تصدیق کرتا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تمھیں اس پر ایمان لانا ہو گا اور اس کی مدد کرنی ہو گی۔ اللہ نے فرمایا: کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہم نے اقرار کیا۔ اللہ نے فرمایا: تو تم گواہ رہنا اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔'' [1]

تورات اور انجیل کے نسخوں میں تحریف ہو چکی ہے اور ان سے اسم محمد ﷺ کی صراحت حذف کر دی گئی ہے، البتہ تورات سَامِرَہ اور انجیل برناباس جو عہد نبوی سے قبل موجود تھیں اور پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں ارباب کلیسا نے انھیں ممنوع قرار دے دیا تھا، ان میں یہ صراحت موجود تھی۔ اس کی تائید ان مخطوطوں سے بھی ہوتی ہے جو اب بحیرۂ مردار کے علاقے سے ملے ہیں۔ انجیل برناباس میں ایسی عبارات موجود ہیں جن میں اسم محمد ﷺ کی صراحت ہے، مثلاً: باب: 41 میں یہ عبارت موجود ہے:

29۔ اللہ تعالیٰ حجاب میں ہو گیا اور فرشتے میخائیل نے ان دونوں (آدم و حوا) کو جنت سے نکال دیا۔

30۔ جب آدم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دروازے پر لکھا ہوا تھا: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ [2]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ متواتر روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب حضرت محمد ﷺ کو ان صفات کی وجہ سے پہچانتے تھے جو پہلی کتابوں میں مذکور تھیں، پھر وہ فرماتے ہیں کہ یہ بات بھی کئی واسطوں سے معلوم ہوئی ہے کہ آپ ﷺ سے پہلے انبیاء نے آپ کے بارے میں بشارت دی تھی، مثلاً: وہ کتب جو آج اہل کتاب کے پاس موجود ہیں ان میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اور جن لوگوں نے اُن (قدیم) کتب کو دیکھا، پھر وہ مسلمان ہوئے یا نہ ہوئے، انھوں نے بھی بتایا کہ ان کتب میں آپ ﷺ

---

[1] آل عمرٰن 3:81۔ [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 118/1.

کا تذکرہ موجود تھا۔ اور انصار سے یہ بات تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ اہل کتاب (یہودی) جو ان کے ہمسائے تھے انھیں بتایا کرتے تھے کہ وہ (نبی) مبعوث ہونے والا ہے، وہ اللہ کا رسول ہوگا اور اس کا ذکر ان کی کتب میں موجود ہے۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ ہم اس رسول کا انتظار کر رہے ہیں اور یہی بات انصار کے قبول اسلام کا اہم سبب بنی جب انھیں نبی کریم ﷺ نے اسلام کی دعوت دی تو وہ فوراً ایمان لے آئے اور آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔[1]

بدری صحابی سیدنا سلمہ بن سلامہ بن وقش رضی اللہ عنہ[2] بیان کرتے ہیں کہ بنو عبدالاشہل کے علاقے میں ہمارا ایک یہودی پڑوسی تھا۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ وہ اپنے گھر سے نکل کر بنو عبدالاشہل کی مجلس میں آبیٹھا۔ سلمہ بن سلامہ کہتے ہیں کہ میں اس مجلس کے تمام افراد سے کم عمر تھا اور میں ایک چادر اوڑھے صحن میں لیٹا ہوا تھا کہ اس یہودی نے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے، قیامت کے آنے، اعمال کا حساب ہونے، نیز میزان اور جنت وجہنم کا تذکرہ کیا۔ اس کے مخاطب سب کے سب مشرک اور بت پرست تھے۔ ان کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر سے زندگی ہوگی۔ تب انھوں نے اس یہودی سے کہا کہ اے فلاں تیرا ستیاناس ہو! کیا تو سمجھتا ہے کہ مرنے کے بعد پھر سے لوگوں کو ایک ایسے جہان میں دوبارہ زندہ کیا جائے گا جہاں جنت بھی ہوگی اور جہنم بھی، وہاں لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا وسزا دی جائے گی؟ یہودی نے کہا: ”ہاں، اس ذات کی قسم جس ذات کے نام پر حلف اٹھایا جاتا ہے! میں تو یہ چاہتا ہوں کہ کل قیامت کے دن مجھے اس جہنم سے نجات مل جائے اور اس کے بدلے میں بے شک مجھے اس دنیا میں ایک بہت بڑا تنور تیار کر کے اس میں آگ دہکا کر مجھے اس میں ڈال کر بند کر دیا جائے۔“

---

[1] الجواب الصحيح لابن تيمية: 340/1. [2] سلمہ بن سلامہ اشہلی رضی اللہ عنہ بیعت عقبہ اولیٰ وثانیہ میں شریک رہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں یمامہ کا حاکم مقرر کیا۔ انھوں نے 34ھ میں 70 سال کی عمر میں وفات پائی۔ (أسد الغابة: 523/2)

سب نے تعجب سے پوچھا: ''تم نے جو باتیں بتائی ہیں ان کی کیا نشانی ہے؟'' اس نے مکہ اور یمن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس علاقے سے ایک نبی مبعوث ہوگا۔ سب نے پوچھا: ''ہم کب اسے دیکھیں گے؟'' یہودی نے میری جانب دیکھا، میں ان سب سے کم عمر تھا اور کہا کہ اگر اس بچے نے اپنی پوری عمر پائی تو ضرور اسے پائے گا۔ سلمہ بن سلامہ کہتے ہیں کہ شب و روز گزرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول ﷺ بھیج دیا۔ آپ اس وقت ہم میں موجود ہیں۔ ہم آپ علیہ السلام پر ایمان لا چکے ہیں مگر اس یہودی نے ظلم و حسد کا راستہ اختیار کرتے ہوئے نبی ﷺ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ ہم نے اس سے پوچھا: ''اے فلاں! تو برباد ہو۔ کیا تو نے ہم سے اس نبی کے بارے میں یہ یہ باتیں نہیں کہی تھیں؟'' اس نے کہا: ''ہاں، کہی تھیں لیکن ہم اس نبی پر ایمان نہیں لا سکتے۔''[1]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے زبور کے بعض نسخے دیکھے جن میں حضرت محمد ﷺ کا نام لے کر ان کی صراحت کی گئی تھی، پھر میں نے زبور کا ایک اور نسخہ دیکھا تو اس میں یہ صراحت نہ تھی۔ اس وجہ سے یہ بات کوئی بعید نہیں کہ بعض نسخوں میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف موجود ہوں اور بعض میں نہ ہوں۔[2]

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما تورات میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم! تورات میں آپ ﷺ کے وہی اوصاف بیان کیے گئے ہیں جو قرآن حکیم میں مذکور ہیں (تورات میں ہے) کہ اے نبی! ہم نے آپ کو شاہد، مبشر، نذیر اور ناخواندہ لوگوں کا محافظ بنا کر بھیجا ہے۔ تو میرا بندہ اور رسول ہے۔ میں نے تیرا نام متوکل رکھا ہے۔ نہ تو بد زبان ہے نہ تندخُو، نہ بازاروں میں چلّانے والا اور نہ برائی کا بدلہ برائی کے ساتھ دینے والا بلکہ معاف اور درگزر کرنے والا ہے۔ جب تک وہ

---

[1] مسند أحمد: 467/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 79,78/2، والسيرة النبوية لابن هشام: 226,225/1. [2] الجواب الصحيح لابن تيمية: 340/1.

نبی راہِ حق سے بھٹکی ہوئی ملتِ (ابراہیم) کو راہِ راست پر نہیں لے آتا اور وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار نہیں کر لیتے اور وہ نبی جب تک بصیرت سے محروم آنکھوں، سماعت سے عاری کانوں اور غور و فکر سے بے بہرہ دلوں کو کھول نہیں دیتا، اللہ تعالیٰ اسے اپنے پاس واپس نہیں بلائے گا۔[1]

حضرت کعب احبار ؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خود تورات میں یہ لکھا ہوا دیکھا ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ جو نہ بدزبان ہیں اور نہ تُند خو، نہ بازاروں میں چِلّانے والے اور نہ برائی کا بدلہ برائی سے دینے والے بلکہ وہ معاف اور درگزر کرنے والے ہیں۔ اس کی امت خوگرِ حمد ہوگی۔ وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کریں گے، ہر بلند جگہ پر اللہ اکبر کہیں گے۔ نصف پنڈلی تک اپنی چادریں رکھیں گے۔ اپنے اعضاء کو پاک و صاف رکھیں گے۔ نماز اور جہاد میں ان کی صف بندی یکساں ہوگی۔ آسمان کی فضاؤں میں ان کی اذان گونجے گی۔ آدھی رات کے وقت (وہ ذکرِ الٰہی کریں گے اور) ان کے منہ سے نکلنے والی آواز شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح ہوگی۔ مکہ اس نبی کی جائے ولادت ہے۔ طابہ (مدینہ طیبہ) کی طرف وہ ہجرت کرے گا اور شام کے علاقے میں اس کی حکمرانی ہوگی۔[2]

بعثت نبوی کے متعلق علمائے اہل کتاب کی بشارتیں

حضرت سلمان فارسی ؓ اپنے اسلام لانے کے مشہور واقعے میں بیان کرتے ہیں کہ

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 2125و 4838، و مسند أحمد: 174/2، و دلائل النبوة للبيهقي: 375,374/1.

[2] صحيح السيرة النبوية لشيخ إبراهيم العلي، ص: 30، و دلائل النبوة للبيهقي: 377,376/1، کعب بن ماتع حمیری یمانی معروف بہ کعب الاحبار ؒ یہودی تھے۔ نبی ﷺ کی وفات کے بعد اسلام لائے۔ عہد عمر ؓ میں مدینہ آئے، پھر شام چلے گئے، صحابہ کے ساتھ جہاد کیا اور عہدِ عثمان ؓ میں حمص میں فوت ہوئے۔ (سِير أعلام النبلاء: 489/3) کعب احبار 34 ھ میں 104 سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ (تهذيب التهذيب: 393/8)

جب عَمُّورِیہ[1] کے راہب کی وفات کا وقت قریب آیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ اس نبی کے ظہور کا وقت قریب آ گیا ہے جو دین ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مبعوث کیا جائے گا۔ وہ سرزمین عرب میں پیدا ہو گا اور ایسی زمین کی طرف ہجرت کرے گا جو دو حرّوں (سیاہ نوک دار پتھریلے علاقوں) کے درمیان واقع ہے۔ ان دونوں حرّوں کے درمیان کھجوروں کے باغات ہوں گے۔ (یہ مدینہ منورہ کے اوصاف ہیں) اس نبی کی واضح علامتیں یہ ہیں: وہ ہدیہ تو کھائے گا مگر صدقہ نہیں کھائے گا۔ اس کے کندھوں کے درمیان مہر نبوت ہے۔ (اے سلمان!) اگر تم اس علاقے میں جا سکتے ہو تو ضرور جاؤ۔

اس کے بعد حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ کس طرح مدینہ پہنچے اور کیسے انھیں غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا، پھر ہجرت کے بعد کس طرح نبی کریم ﷺ سے ان کی ملاقات ہوئی اور انھوں نے کچھ کھانا بطور صدقہ آپ کو پیش کیا مگر آپ نے قبول نہ کیا، پھر کچھ کھانا بطور ہدیہ دیا تو آپ نے تناول فرما لیا، پھر سلمان رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے کندھوں کے درمیان مہر نبوت دیکھنے کا تذکرہ کرتے ہیں اور آخر میں ان تمام شہادتوں کو دیکھ لینے کے بعد اسلام قبول کرنے کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔[2]

یہودی علماء اور عوام بھی آپ ﷺ کی بعثت سے کچھ عرصہ قبل اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ابو تَیِّہان (جو یہود کا بہت بڑا عالم، زاہد اور مستجاب الدعوات تھا) شام سے (یثرب) آیا اور بنوقریظہ کے محلے میں آ کر ٹھہرا اور آپ ﷺ کی بعثت سے دو سال قبل

---

[1] عموریہ: اس تاریخی شہر کے کھنڈر انقرہ (ترکی) کے جنوب میں ''اسرقلعہ'' کے نام سے ملتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید نے 666ء میں عموریہ کو اطاعت پر مجبور کیا مگر پھر عیسائیوں نے یہ شہر چھین لیا۔ دوسری بار 838ء میں معتصم باللہ کے سپہ سالار اَفشین نے اسے فتح کیا۔ 931ء میں امیر طَرسُوس ثُمل نے عموریہ کو نذر آتش کر دیا۔ (اٹلس سیرت نبوی، دارالسلام، ص: 180)

[2] مسند أحمد:5/441-444، والمستدرك للحاكم:3/599-602، و دلائل النبوة للبيهقي:2/83-97، ودلائل النبوة لأبي نعيم، ص: 199، والسيرة النبوية لابن هشام:1/228-234، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:1/122.

فوت ہو گیا۔ جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا تو اس نے بنو قریظہ سے کہا: ”اے یہودیوں کی جماعت! تم جانتے ہو کہ شراب و کباب اور عیش و عشرت کی سرزمین شام کو چھوڑ کر میں بھوک و افلاس اور فقر و فاقہ کی سرزمین، یعنی حجاز میں کیوں چلا آیا؟“ سب نے کہا کہ تم ہی بہتر جانتے ہو۔ ابو تیِّہان نے کہا: ”میں اس علاقے میں اس لیے آیا تھا تاکہ اس نبی کا انتظار کروں جس کی بعثت کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔ میں اس کی بعثت کا امیدوار تھا تاکہ میں اس کی اتباع کر سکوں۔“

یہ بات یہودیوں اور دوسرے لوگوں میں عام ہو گئی اور علم یقین کے درجے تک پہنچ گئی۔ اس بنیاد پر یہودی اہل مدینہ سے کہا کرتے تھے کہ ایک نبی کی بعثت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ ہم اس نبی کی معیت میں تمھیں قوم عاد اور قومِ اِرَم کی طرح قتل کریں گے۔[1]

یہی بات انصار کے قبول اسلام کا سبب بنی۔ انصار کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ہدایت کے ساتھ ساتھ جس چیز نے ہمیں اسلام کی طرف راغب کیا وہ یہودیوں کی باتیں تھیں۔ ہم تو مشرک اور بت پرست تھے۔ ہمارے پاس وہ علم نہ تھا جو اہل کتاب کے پاس تھا۔ ہمارے اور ان کے درمیان ہمیشہ سے لڑائیاں رہیں۔ جب ہم انھیں کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ ہم سے کہتے تھے کہ ایک نبی کی بعثت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ ہم اس نبی کی معیت میں تمھیں قومِ عاد اور قومِ اِرَم کی طرح قتل کریں گے۔[2]

روم کے بادشاہ ہرقل کو جب نبی کریم ﷺ کا خط ملا تو اس نے بھی کہا تھا کہ مجھے علم تھا کہ اس نبی کا ظہور ہونے والا ہے لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ نبی تم (قریش) میں سے ہو گا۔[3]

---

[1] دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص: 107. [2] السيرة النبوية لا بن هشام: 231/1. [3] صحيح البخاري، حديث: 7، و صحيح مسلم، حديث: 1773.

لوگوں کی عمومی صورت حال

اس دور کے عربوں کے احوال کی عکاسی کرتے ہوئے مشہور سکالر علامہ ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں حالات اس قدر بگڑ چکے تھے اور انسانیت اس مقام تک پہنچ چکی تھی کہ ان کی اصلاح عام قسم کے مصلحین اور معلمین کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ معاملہ نہ تو کسی ایک عقیدے کی اصلاح کا تھا نہ کسی عبادت کی ترغیب کا تھا، نہ ان کی کوئی بری عادت چھڑوانے کا تھا اور نہ کسی ایک معاشرے کی اصلاح کا تھا، ایسے کاموں کی تکمیل کے لیے تو ہر جگہ اور ہر زمانے میں مصلحین اور معلمین موجود رہتے ہیں اور یہ کام تسلسل سے ہوتا رہتا ہے۔

اصل مسئلہ اس جاہلیت اور تباہ کن بت پرستی کے خاتمے کا تھا جو نسل در نسل بڑھتی ہوئی ایک طویل عرصے کے بعد اس قدر مضبوط اور عام ہو چکی تھی کہ انبیاء اور رسولوں کی تعلیمات دب کر رہ گئی تھیں اور مصلحین و معلمین کی جدوجہد بے اثر بن چکی تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک ایسی مضبوط، عالی شان، وسیع و عریض عمارت قائم کی جائے جس میں تمام اقوامِ عالم پناہ لے سکیں اور وہ ساری دنیا کو اپنی وسعتوں میں سمیٹ لے۔ اس دور کا اہم قضیہ یہ تھا کہ ایک نئے انسان کو وجود میں لایا جائے جو ہر لحاظ سے قدیم انسان سے مختلف ہو، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَٰهُ وَجَعَلْنَا لَهُۥ نُورًا يَمْشِى بِهِۦ فِى ٱلنَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُۥ فِى ٱلظُّلُمَٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَٰفِرِينَ مَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ۝﴾

”کیا ایک ایسا شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس کے لیے نور بنا دیا، وہ اس کی روشنی میں لوگوں میں چلتا ہے، (کیا) وہ اس شخص جیسا (ہو سکتا)

ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں پڑا ہے، ان سے نکلنے والا نہیں؟ اسی طرح کافروں کے لیے ان کاموں میں کشش رکھی گئی ہے جو وہ کرتے ہیں۔''[1]

اس دور میں کرنے کا کام یہ تھا کہ فساد پیدا کرنے والے جراثیم کا قلع قمع کر دیا جائے۔ بت پرستی کو اس طرح جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے کہ اس کے اثرات بھی باقی نہ رہیں اور انسانی دلوں میں عقیدۂ توحید کو گہرائی اور مضبوطی کے ساتھ اس قدر پختہ کر دیا جائے کہ اس سے زیادہ پختگی کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا ہو۔ ان میں رضائے الٰہی کے حصول کا شوق، عبادت الٰہی کی لگن، خدمت انسانی کا جذبہ اور نصرتِ دین کی تڑپ اس قدر پیدا کر دی جائے جو ہر چاہت اور خواہش پہ غالب آجائے اور ہر مزاحمت کو دور کر دے۔

گویا ضرورت اس امر کی تھی کہ انسانیت جو خودکشی پر تیار تھی اور دنیا و آخرت کی بربادی کی اتھاہ گہرائیوں میں چھلانگ لگانے کے لیے پَر تول چکی تھی، اسے اس ہلاکت سے بچا کر ایسے راستے پر چلا دیا جائے جس کا آغاز ایسی سعادت ہے جو صرف حقیقی معرفت اور ایمان رکھنے والوں کو نصیب ہوتی ہے اور اس راستے کا اختتام دائمی جنت پر ہوتا ہے جس کے انعام کا وعدہ خوف الٰہی رکھنے والوں سے کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی عکاسی اور منظر کشی کس قدر عمدہ اور بلیغ انداز میں فرمائی جب قرآن حکیم میں نبی کریم ﷺ کی بعثت کا احسانِ عظیم کی صورت میں تذکرہ فرمایا:

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ﴾

''اور تم اپنے آپ پر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کے احسان سے بھائی (بھائی) بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، پھر اس نے تمھیں

---

[1] الأنعام 122:6.

اس میں گرنے سے بچا لیا۔“[1]

بعثت سے قبل علامات واشارات نبوت

نبی ﷺ کی نبوت کے بے شمار شواہد ہیں، مثلاً:

(i) **بعثت سے قبل پتھر کا آپ علیہ السلام کو سلام کہنا:** حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي لَأَعْرِفُ حَجَرًا بِمَكَّةَ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ أُبْعَثَ، إِنِّي لَأَعْرِفُهُ الْآنَ»

”مکہ مکرمہ میں ایک پتھر کو میں جانتا ہوں جو میری بعثت سے قبل مجھے سلام کہا کرتا تھا۔ میں اسے اب بھی پہچانتا ہوں۔“[2]

(ii) **سچے خواب دیکھنا:** باقاعدہ نزول وحی کے آغاز پر آپ کو سچے خواب دکھائے گئے۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے روزِ روشن کی طرح وہ حقیقت کا روپ دھار لیتا۔[3]

(iii) **گوشہ نشینی اور خلوت:** گوشہ نشینی اور عبادت کے لیے خلوت آپ کا محبوب عمل بنا دیا گیا۔ آپ غار حرا میں گوشہ نشیں ہو جاتے، جو مکہ کے شمال مغرب کی جانب واقع ہے اور کئی کئی راتوں تک عبادت میں مشغول رہتے۔ کبھی دس راتیں کبھی اس سے زیادہ اور کبھی ایک ماہ تک وہاں رہتے،[4] پھر اپنے گھر واپس پلٹ آتے۔ گھر میں بہت کم عرصہ گزارنے کے بعد گوشہ نشینی کے لیے ضروری سامان لیتے اور دوبارہ غار حرا میں تشریف لے جاتے۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا حتی کہ اسی ایک گوشہ نشینی کے دوران آپ پر پہلی باقاعدہ وحی نازل ہوئی۔[5]

---

[1] آل عمرٰن 103:3. [2] صحيح مسلم، حديث: 2277، و مسند أحمد: 89/5، وجامع الترمذي، حديث: 3624. [3] صحيح البخاري، حديث: 3، وصحيح مسلم، حديث: 160. [4] السيرة الحلبية: 12/2. [5] فقه السيرة للبوطي، ص: 60.

حصہ 3

وحی کا نزول اور خفیہ دعوت کا آغاز

باب: 1 رسول اللہ ﷺ پر وحی کا نزول

باب: 2 خفیہ دعوتی سرگرمیاں

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ
رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ

”درحقیقت اللہ نے ایمان والوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے کہ
اس نے ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسول بھیجا ہے۔“

(آلِ عمرٰن 164:3)

باب 1

رسول اللہ ﷺ پر وحی کا نزول

نبی کریم ﷺ کی عمر کے چالیس سال بیت چکے تھے اور آپ غارِ حرا میں گوشہ نشین ہو کر اس کائنات اور اس کے خالق کی معرفت حاصل کرنے کے لیے غور وفکر کیا کرتے تھے۔ غارِ حرا میں آپ کی گوشہ نشینی کئی کئی راتوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ جب سامانِ ضرورت ختم ہو جاتا تو اپنے گھر واپس آ کر مزید راتوں کے لیے ضروری سامان لے جاتے تھے۔①

ماہ رمضان کے ایک سوموار کو دن کے وقت حضرت جبریل علیہ السلام پہلی مرتبہ غارِ حرا میں داخل ہوئے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث نقل کی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ پر نزولِ وحی کے سلسلے کا آغاز حالتِ نیند میں اچھے اچھے خوابوں سے ہوا۔ آپ جو بھی خواب دیکھتے، وہ روزِ روشن کی طرح حقیقت بن جاتا، پھر خلوت وتنہائی کا شوق آپ کے دل میں پیدا کر دیا گیا، چنانچہ آپ غارِ حرا میں خلوت نشین ہو جاتے اور کئی کئی راتیں گھر تشریف لائے بغیر مصروف عبادت رہتے۔ ان راتوں کے لیے آپ ضروری سامان ساتھ لے جاتے تھے۔ سامان ختم ہونے پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس واپس آتے اور اتنے ہی عرصے کے لیے سامانِ ضرورت دوبارہ لے جاتے یہاں تک کہ آپ کے پاس حق آیا۔ آپ اس وقت غارِ حرا میں تھے، یعنی آپ کے پاس فرشتہ آیا اور اس نے کہا:

---

① صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 67.

«اِقْرَأْ، قَالَ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ، قَالَ: فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ، ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ: اِقْرَأْ، قُلْتُ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ، فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ، ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ: اِقْرَأْ، فَقُلْتُ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ، فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّالِثَةَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي، فَقَالَ: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ○ خَلَقَ الْاِنْسٰنَ مِنْ عَلَقٍ○ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ○ عَلَّمَ الْاِنْسٰنَ مَا لَمْ یَعْلَمْ○﴾

’’پڑھیے! آپ ﷺ نے فرمایا: میں پڑھ نہیں سکتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر اس نے مجھے پکڑ کر اس زور سے دبایا کہ میری ہمت جواب دے گئی، پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھیے! میں نے کہا: میں پڑھ نہیں سکتا، اس نے مجھے دوسری بار زور سے پکڑ کر دبوچا کہ میری ہمت جواب دے گئی، پھر چھوڑ کر کہا: پڑھیے! میں نے کہا: میں پڑھ نہیں سکتا۔ پھر اس نے مجھے تیسری بار پکڑ کر دبوچا، پھر چھوڑ کر کہا: ’’اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے پیدا کیا، اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے، وہ ذات جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، اس نے انسان کو وہ علم سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔‘‘[1]

رسول اللہ ﷺ ان آیات کو سن کر واپس گھر آئے۔ آپ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ آپ حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے اور فرمایا: «زَمِّلُونِي، زَمِّلُونِي» ’’مجھے چادر اوڑھا دو، مجھے چادر اوڑھا دو۔‘‘ انھوں نے آپ کو چادر اوڑھا دی یہاں تک کہ آپ کا خوف جاتا رہا، پھر آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تمام واقعہ بتاتے ہوئے فرمایا: «لَقَدْ خَشِيتُ عَلٰى نَفْسِي» ’’مجھے تو اپنی جان کا خطرہ محسوس ہوا تھا۔‘‘ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: «كَلَّا أَبْشِرْ! فَوَاللّٰهِ لَا يُخْزِيكَ اللّٰهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ

---

[1] العلق 96:1-5.

وَتَصْدُقُ الْحَدِيثَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِينُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ» ”قطعاً نہیں۔ اللہ کی قسم! اللہ کبھی آپ کو رسوا نہیں کرے گا۔ آپ تو صلہ رحمی کرنے والے ہیں، دوسروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، تہی دست لوگوں کی ضرورت پوری کرتے ہیں، مہمان کی عزت افزائی کرتے ہیں اور حق کے راستے میں پیش آنے والی تکالیف پر لوگوں کی مدد فرماتے ہیں۔“

پھر حضرت خدیجہ ؓ آپ ﷺ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعُزّٰی کے پاس لے گئیں۔ ورقہ زمانہ جاہلیت میں عیسائیت اختیار کر چکے تھے۔ وہ عبرانی زبان لکھنا جانتے تھے، اس لیے حسب توفیق انجیل عبرانی زبان میں لکھا کرتے تھے۔ اس وقت وہ بہت بوڑھے تھے اور نابینا ہو چکے تھے۔ ان سے حضرت خدیجہ ؓ نے کہا: ”بھائی جان! ذرا اپنے بھتیجے کی بات تو سنیں۔“ ورقہ نے پوچھا: ”بھتیجے تجھے کیا نظر آیا ہے؟“ رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا بیان فرما دیا۔ اس پر ورقہ نے آپ سے کہا: ”یہ تو وہی ناموس (فرشتہ جبریل) ہے جسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ ؑ پر نازل فرمایا تھا۔ کاش! میں اس وقت جوان اور طاقتور ہوتا، کاش! میں اس وقت زندہ ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو دیس نکالا دے گی۔“ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: «أَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ» ”کیا یہ لوگ مجھے (یہاں سے) نکال دیں گے؟“ ورقہ نے کہا: ”ہاں، جب بھی کوئی شخص اس طرح کا پیغام (رسالت) لایا جیسا تم لائے ہو تو اس سے ضرور دشمنی کی گئی۔ اگر مجھے تیرا زمانہ حاصل ہوا تو میں تیری زبردست مدد کروں گا۔“ پھر ورقہ جلد ہی فوت ہو گئے اور وحی (کچھ عرصے کے لیے) رک گئی۔[1]

جب ہم حضرت عائشہ ؓ کی اس حدیث کو بنظر غائر دیکھتے ہیں تو اس سے بہت سے ایسے امور مستنبط ہوتے ہیں جن کا نبی ﷺ کی سیرت کے ساتھ گہرا تعلق ہے، مثلاً:

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3 و4953.

اچھے خواب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ حضرت محمد ﷺ پر نزول وحی کے سلسلے کا آغاز اچھے خوابوں سے ہوا جنھیں سچے خواب بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس سے مراد عمدہ قسم کے مناظر ہیں جنھیں دیکھنے سے انشراح صدر ہو (سینہ قبولِ حق کے لیے کشادہ ہو جائے) اور روحانی تزکیہ حاصل ہو۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر وحی کا آغاز حالتِ نیند میں خوابوں کے ساتھ کیا۔ اس میں یہ حکمت بھی ہو سکتی ہے کہ اگر خوابوں کے ساتھ آغاز نہ کیا جاتا بلکہ فرشتہ اچانک آپ کے پاس آتا جبکہ اس سے پہلے آپ نے کسی فرشتے کو نہ دیکھا تھا تو آپ کو ایسی گھبراہٹ ہوتی کہ فرشتے سے وحی وغیرہ اخذ نہ کر سکتے، اس لیے حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ وحی کی ابتدا نیند کی حالت میں خوابوں کے ساتھ ہوتا کہ وحی اخذ کرنے کی آپ کو مشق ہو جائے اور آپ اس سے مانوس ہو جائیں۔[2]

اچھے اور سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہوتے ہیں جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے:

«اَلرُّؤيَا الْحَسَنَةُ مِنَ الرَّجُلِ الصَّالِحِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَّأَرْبَعِينَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ»

”نیک آدمی کو آنے والا اچھا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔“[3]

اہل علم کا قول ہے کہ نبی ﷺ کو اچھے خوابوں کی رؤیت کا سلسلہ چھ ماہ تک جاری رہا۔ امام بیہقی نے بھی یہ بات بیان کی ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ نیند کی حالت میں قرآن نازل نہیں ہوا بلکہ سارے کا سارا قرآن حالت بیداری میں نازل ہوا۔

اچھے خواب اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس دنیاوی زندگی میں بشارت کا ذریعہ ہیں۔

---

[1] طریق النبوة والرسالة لحسين مؤنس، ص:21. [2] منامات الرسول لعبد القادر الشيخ إبراهيم، ص: 57. [3] صحيح البخاري، حديث: 6983، و سنن ابن ماجه، حديث: 3893، و مسند أحمد: 126/3.

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّهُ لَمْ يَبْقَ مِنْ مُبَشِّرَاتِ النُّبُوَّةِ إِلَّا الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ، يَرَاهَا الْمُسْلِمُ أَوْ تُرٰى لَهُ»

''اے لوگو! نبوت کی خوشخبریوں میں سے صرف اچھا خواب ہی باقی رہ گیا ہے جسے مسلمان دیکھ لیتا ہے یا (کسی کے لیے) اسے دکھا دیا جاتا ہے۔''[1]

نزول وحی سے پہلے، نبی کریم ﷺ غار حرا میں بڑے خوبصورت خواب دیکھتے تھے۔ جب بیدار ہوتے تو انشراح صدر (قبول حق کے لیے سینہ کی کشادگی) جیسی دولت سے مالا مال ہوتے اور زندگی کے حسن و جمال سے بہرہ ور ہونے کے لیے آپ کا نفس تیار ہوتا۔[2]

آغاز وحی کے بارے میں مروی تمام روایات اس بات پر متفق ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر نزول وحی کے سلسلے کا آغاز اچھے خوابوں سے ہوا جو آپ نیند کی حالت میں دیکھتے مگر بیدار ہونے پر وہ حقیقت بن کر سامنے آجاتے۔ اس میں ذرہ بھر تغیر و تبدل نہ ہوتا۔ کوئی بات نہ بھولتی گویا وہ آپ کے دل و دماغ پر نقش ہو جاتی تھی۔

حضرت عائشہ ؓ جن کا شمار فصحائے عرب میں ہوتا ہے، انھوں نے نبی کریم ﷺ کے خوابوں کی صداقت اور ان کے حقیقت بن جانے کی تشبیہ اس انداز میں بیان کی ہے کہ عرب دنیا اپنی فصاحت کی معراج پر پہنچ جانے کے باوجود اس سے بلیغ تشبیہ پیش نہیں کر سکتی۔ عائشہ ؓ نے اس طرح تشبیہ دی کہ جب صبح کی روشنی پھیلتی ہے تو ہر قسم کی تاریکی دم توڑ دیتی ہے اور ہر چیز کی حقیقت واشگاف ہو جاتی ہے، اسی طرح جب آپ ﷺ نیند سے بیدار ہوتے تو آپ کا دیکھا ہوا خواب روز روشن کی طرح ایک حقیقت بن کر سامنے آجاتا۔[3]

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 479، و سنن أبي داود، حدیث: 876، و سنن ابن ماجه، حدیث: 3899، وسنن النسائي، حدیث: 1046، ومسند أحمد: 219/1. [2] طریق النبوة والرسالة لحسین مؤنس، ص: 22. [3] محمد رسول اللّٰه ﷺ لصادق عرجون: 254/1.

غار حرا میں گوشہ نشینی

نبوت سے کچھ عرصہ قبل نبی کریم ﷺ کے دل میں خلوت اور گوشہ نشینی کا شوق پیدا کر دیا گیا تا کہ آپ ﷺ کا دل، دماغ اور روح نبوت کی اس عظیم ذمہ داری کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے جو عنقریب آپ کے سپرد کی جانے والی تھی۔ آپ ﷺ نے گوشہ نشینی کے لیے غار حرا کا انتخاب کیا تا کہ زندگی کی مشغولیات ترک کر کے اور مخلوق سے الگ رہ کر اپنی فکری قوتوں، روحانی جذبات، دلی احساسات اور عقل و شعور کو یکجا کر سکیں اور کائنات کے بے مثال خالق و موجد سے مناجات کے لمحات میسر آ سکیں۔[1]

غار حرا جہاں حبیب کبریا ﷺ بار بار تشریف لے جاتے تھے وہ ایک ایسی جگہ تھی جو غور و خوض کے لیے نہایت مناسب تھی۔ غار میں کھڑے ہوں تو حدِّ نگاہ تک پہاڑ ہی پہاڑ نظر آتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عظمتِ الٰہی کے سامنے جھکے ہوئے اور سجدہ ریز ہیں یا پھر صاف و شفاف آسمان نظر آتا ہے۔ ایک تیز نگاہ رکھنے والا شخص غار حرا میں کھڑے ہو کر مکہ کا نظارہ بھی کر سکتا ہے۔[2]

نبی کریم ﷺ کے دل میں گوشہ نشینی کا شوق پیدا ہونا، ایک مخصوص قسم کی تیاری کا انداز تھا تا کہ آپ کا دل بشری اور مادی آلودگیوں سے پاک ہو کیونکہ آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ رب ذوالجلال کی خاص تربیت اور رہنمائی میں گزر رہا تھا۔ نبوت سے قبل آپ کی عبادت کا اسلوب یہ تھا کہ آسمانوں کی عظیم، زبردست اور بے مثال بادشاہت پر غور و فکر کرتے اور کائنات کی ایسی نشانیوں پر تدبر فرماتے جو اس بات کی دلیل تھیں کہ ان کا خالق بے نظیر کاریگری کا مالک ہے، اس کی قوت و قدرت بھی عظیم ہے اور تدبیر و تنظیم بھی نہایت مضبوط ہے اور وہ نہایت خوش اسلوبی سے اپنے امور کو انجام دینے والا ہے۔[3]

---

[1] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون:1/254. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة:1/256. [3] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون:1/469.

یہی وجہ ہے کہ بعض وعظ و ارشاد والے لوگ خلوت اختیار کرتے ہیں جس میں وہ ذکرِ الٰہی اور عبادت کا خاص اہتمام کرتے ہیں تا کہ ان کا دل منور ہو، دل کی ساری تاریکیاں ختم ہو جائیں اور وہ غفلت و شہوت اور بے راہ روی سے پاک ہو جائیں۔

نبی کریم ﷺ کی سنت ہے کہ وہ ماہ رمضان میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔[1] ہر مسلمان کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ خواہ وہ حکمران ہو یا سیاستدان، عالم ہو یا تاجر تا کہ وہ ان آلودگیوں سے پاک و صاف ہو جائے جو دل و دماغ میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمیں اپنے حالات و واقعات کو کتاب و سنت کی روشنی میں درست کرنا چاہیے اور اس سے قبل کہ ہمارا محاسبہ ہو ہمیں خود اپنا محاسبہ کر لینا چاہیے۔

دعوتی امور کے دانشوروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کچھ وقت نکال کر سوچ بچار کریں کہ دعوتی کام کی کیا صورتِ حال ہے، کہاں کام میں تیزی ہے اور کہاں کمزوری؟ پھر ان عوامل کا جائزہ لینا چاہیے جو دعوتی امور میں خلل کا باعث بنتے ہیں۔

معاشرتی حالات سے بھی واقفیت حاصل کرنی چاہیے کہ معاشرے میں کیا خرابیاں ہیں اور کون سی خوبیاں ہیں؟ مخصوص حالات میں گوشہ نشینی اختیار کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں، خاص طور پر ان حالات میں جب بگاڑ عام ہو جائے، دنیا ہی کو ہر جگہ ترجیح دی جانے لگے اور نفس پرستی لوگوں کا نصب العین بن جائے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ گوشہ نشینی میں اچھے پہلو ملحوظ رکھے جائیں اور منفی پہلوؤں سے کنارہ کشی اختیار کی جائے اور پھر وہی اسلوب اختیار کیا جائے جو حق ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس بیان: ''آپ ﷺ کئی راتوں تک گوشہ نشینی اختیار کرتے تھے۔'' کی تشریح میں علامہ شیخ محمد عبداللہ دراز فرماتے ہیں کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ راتیں نہ تو بہت تھوڑی ہوتی تھیں اور نہ بہت زیادہ۔ اور میانہ روی کا یہ انداز جو

---

[1] الأساس في السنة لسعيد حوّى: 1/195.

آپ نے بعثت سے قبل اختیار کیا تھا بعثت کے بعد بھی ہمیشہ سے ملت اسلامیہ کا شعار اور سیرت نبویہ کا نشان رہا ہے۔ [1]

غار حرا میں حق کی آمد

غار حرا میں آپ ﷺ کے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور کہا کہ پڑھیے! تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں پڑھ نہیں سکتا۔'' آپ فرماتے ہیں کہ جبریل نے مجھے تین بار معانقہ کرتے ہوئے دبوچا، پھر قرآن کی سب سے پہلی نازل ہونے والی آیات کی تلاوت فرمائی۔

قرآن کریم کی سب سے پہلی نازل ہونے والی بابرکت آیات کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی پیدائش کا آغاز خون کے ایک لوتھڑے سے ہوتا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی کرم نوازی ہے کہ اس نے انسان کو وہ علم عطا کیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ اسے علم کی وجہ سے شرف و کرامت عطا کی اور اسی بنیاد پر حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر امتیاز حاصل ہوا۔ علم بسا اوقات اذہان میں ہوتا ہے، کبھی گفتگو میں اور کبھی ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریروں میں ہوتا ہے۔ [2]

انھی آیات کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا آغاز ہوا۔ یہ نہایت عظیم واقعہ تھا۔ سید قطب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''یہ ایک بہت عظیم واقعہ تھا، اتنا عظیم کہ جس کی کوئی حد نہ ہو۔ ہم اس کی عظمت بیان کرنے کی جس قدر بھی کوشش کریں اس کا احاطہ نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے بے شمار پہلو تو ایسے ہیں جو ہمارے تصور سے بھی بالا ہیں۔ یقیناً یہ واقعہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے بھی عظیم ہے اور اپنی ہدایت و رہنمائی کے لحاظ سے بھی اور اس لحاظ سے بھی بہت عظیم ہے کہ انسانی زندگی پر اس کے بے شمار اثرات مرتب ہوئے۔ وہ لمحہ جس میں یہ واقعہ رونما ہوا، بلا مبالغہ اس زمین کی طویل ترین تاریخ کا عظیم ترین لمحہ تھا۔ اس عظیم لمحے میں رونما ہونے والے واقعے کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ذات جس کے جاہ و جلال کی کسی کو تاب نہیں، جس کی عظمت مخلوق کے عقل و شعور سے بہت بالا

---

[1] المختار من كنوز السنة لمحمد عبدالله دراز، ص: 19. [2] تفسير ابن كثير: 528/4.

ہے، جو ایسی ہیبت کا مالک ہے کہ کوئی اس کے سامنے دم نہیں مار سکتا جو اس قدر زبردست ہے کہ اس کے سامنے کسی کی کوئی مجال نہیں، جو اتنا بڑا ہے کہ اس کے سامنے ہر چیز ہیچ ہے، جو تمام خزانوں اور بادشاہتوں کا حقیقی مالک ہے، اس نے انسان نامی مخلوق کو اپنی مہربانیوں میں لینا چاہا۔ وہ انسان جو کائنات کے اس گوشۂ زمین میں چھپا ہوا تھا، اللہ نے اسے عزت عطا کی اور ان میں سے ایک فرد (آخری نبی ﷺ) کا انتخاب کیا تاکہ وہ نورِ الٰہی کا مرکز، اس کی حکمتوں کا خزینہ اور اس کے کلام کے لیے جائے نزول بن جائے اور اس کے ذریعے سے ان انعامات کی تکمیل کرے جو وہ اپنی اس مخلوق کو عطا فرمانا چاہتا ہے۔''[1]

پہلی وحی نے قلم کی شان اور اہمیت کو بلند کیا اور واضح کیا کہ اقوام و ملل کی تعمیر میں علم کا بہت بڑا کردار ہے اور یہ حقیقت بھی واشگاف کر دی کہ انسان کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت علم و معرفت ہے۔ اس عظیم واقعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں علم کا کیا مقام و مرتبہ ہے۔ نبوت ملنے پر سب سے پہلا کلمہ جو رسول اللہ ﷺ تک پہنچا، وہ پڑھنے کا حکم تھا۔ اسلام نے ہمیشہ علم کی ترغیب اور اس کے حاصل کرنے کا حکم دیا۔ اہل علم کا مقام بلند کیا اور انھیں دوسروں پر فوقیت عطا کی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ﴾

''تم میں سے جو ایمان لائے ہیں اور جنھیں علم دیا گیا ہے، اللہ ان کے درجات بلند کرتا ہے۔''[2]

اور اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝﴾

---

[1] تفسير في ظلال القرآن لسيدقطب: 3936/6. [2] المجادلة 11:58.

''کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے، برابر ہو سکتے ہیں؟ بس عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔''[1]

فائدہ مند علم وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ اسی نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ جب سے انسانیت نے حصول علم کا یہ راستہ ترک کر دیا اور اس کا علم منہج الٰہی کی حدود و قیود سے آزاد ہو گیا، تب سے اس کا علم انسانیت کی تباہی و بربادی کا سبب بن گیا۔[2]

وحی کی کیفیت اور نزول وحی کی شدت

پہلی وحی کے موقع پر جبریل علیہ السلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار دبوچا یہاں تک کہ آپ نے اس سے مشقت و تکان محسوس کی۔ اس کے بعد بھی آپ نزول وحی کی وجہ سے شدت، تکان اور تکلیف برداشت کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ○ ﴾

''یقیناً ہم جلد آپ پر ایک بھاری بات ڈالیں گے۔''[3]

یقیناً ایسا کرنے میں بہت عظیم حکمتیں ہیں، مثلاً: اس دین کی اہمیت و عظمت کو اور اس کے حصول کے لیے جو خصوصی اہتمام کیا گیا اسے واضح کرنا مقصود تھا اور امت کو یہ بتانا بھی تھا کہ جس دین کی نعمتوں سے وہ بہرہ ور ہو رہی ہے، وہ بڑی محنت و مشقت کے بعد حاصل ہوا ہے۔[4]

فطری قوانین اور طریقوں سے ہٹ کر وحی کا نزول ایک معجزہ ہے جس کے ذریعے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلامِ الٰہی، یعنی قرآن مجید کو جبریل امین علیہ السلام کی وساطت سے حاصل کیا۔ وحی کا قلبی غور و فکر یا داخلی احساسات سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی

---

[1] الزمر 9:39. [2] الوحي و تبليغ الرسالة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص: 34. [3] المزمل 5:73.

[4] الوحي و تبليغ الرسالة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص: 31,30.

سے ایک الگ چیز تھی جو آپ کو عطا کی گئی۔ آپ ﷺ کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ وحی کو محفوظ کریں اور اسے امت تک پہنچائیں۔ وحی کی تفسیر و تشریح نبی کریم ﷺ کے اپنے اسلوب کے ساتھ ہوتی رہی جیسا کہ آپ ﷺ کی احادیث و اقوال سے ظاہر ہوتا ہے۔[1]

وحی وہ بنیاد ہے جس پر دین کے تمام حقائق، مثلاً: عقائد، شرعی احکام، اخلاق وغیرہ کا انحصار ہے۔ اسی وجہ سے مستشرقین اور ان کے پیشرو ملحدین وحی کی حقیقت پر تنقید کرتے اور اس کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے وحی کی اس حقیقت میں تاویل و تحریف کرنے کی کوشش کی جو ہمیں صحیح احادیث سے معلوم ہوئی اور جسے ثقہ محدثین نے بیان کیا۔ کسی نے کہا کہ محمد ﷺ نے اسلام کے نظریات اور قرآن حکیم کو بَحیرا راہب سے سیکھا۔ کسی نے کہا کہ آپ (معاذ اللّٰہ) اعصابی مریض (جلد غصہ میں آنے والے) تھے یا آپ کو مرگی کا مرض تھا، جبکہ حقائق یہ بتاتے ہیں کہ محمد ﷺ غار حرا میں تھے۔ اچانک جبریل علیہ السلام آپ کے سامنے آئے۔ آپ نے انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جبریل علیہ السلام آپ سے کہہ رہے تھے کہ پڑھیے۔[2]

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وحی کا تعلق نبی ﷺ کے ذاتی خیالات و تصورات اور دلی احساسات و وساوس سے نہیں تھا بلکہ یہ آپ ﷺ کی ذات گرامی سے ایک الگ چیز تھی جو آپ کے سامنے پیش کی گئی اور آپ نے اسے قبول کیا۔ اس کا تعلق آپ کے دلی اور اندرونی احساسات کے ساتھ نہیں تھا۔

جبریل امین کا آپ ﷺ کو تین بار دبوچنا اور پھر چھوڑ دینا اور ہر بار کہنا کہ پڑھیے، اس حقیقت کو واشگاف کرتا ہے کہ وحی ایک خارجی چیز تھی جو آپ کو عطا کی گئی اور یہ اس باطل نظریے کا ردّ کرتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک وہم تھا، اندرونی وسوسے تھے اور اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

---

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 129/1. [2] فقه السيرة للبوطي، ص: 64.

نبی کریم ﷺ نے جب جبریل علیہ السلام کو دیکھا اور وحی سنی تو آپ پر خوف اور ہیبت طاری ہوگئی تھی اور کانپتے دل کے ساتھ آپ جلدی جلدی گھر واپس آئے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ اس رسالت کا کوئی شوق نہیں رکھتے تھے جس کی تبلیغ کی ذمہ داری آپ کے کندھوں پر رکھی جانے والی تھی۔[1]

اسی مفہوم کی تائید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ط﴾

"آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ لیکن ہم نے اسے نور بنا دیا، ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں راہ دکھاتے ہیں۔"[2]

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ط قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ج اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ج اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝﴾

"اور جب ان پر ہماری واضح آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ لوگ، جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں: تو اس کے سوا کوئی (دوسرا) قرآن لے آ، یا اسے (کچھ) بدل دے۔ کہہ دیجیے: مجھے اختیار نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، بے شک اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے (سخت) دن کے عذاب سے ڈر لگتا ہے۔"[3]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی صحیح حدیث کے سامنے وحی کو مشکوک قرار دینے والوں کی آراء کی

---

[1] فقه السيرة للبوطي، ص: 64. [2] الشورىٰ 52:42. [3] يونس 15:10.

کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے بعد مسلسل وحی نازل ہوتی رہی اور ایسے دلائل سامنے آتے رہے جنھوں نے وحی کی حقیقت کو واضح کر دیا اور ان لوگوں کے اقوال کو باطل قرار دیا جو وحی کی حقیقت کو مشکوک بنانا چاہتے تھے۔ دکتور بوطی نے ان دلائل کا اس طرح تذکرہ کیا ہے:

① نبی کریم ﷺ نزول قرآن کے فوراً بعد اسے تحریر کرنے کا حکم فرماتے تھے، جبکہ حدیث کے لیے صرف صحابۂ کرام کے حافظے میں محفوظ رہنے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ یہ اس لیے نہیں کہ حدیث محض آپ ﷺ کا کلام ہے اور اس کا نبوت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس لیے کہ قرآن حکیم کے الفاظ اور حروف حضرت جبریل علیہ السلام کی وساطت سے آپ تک پہنچائے گئے تھے، جبکہ حدیث کا مفہوم اگرچہ منجانب اللہ ہوتا تھا لیکن اس کے الفاظ اور ترتیب نبی کریم ﷺ کی تھی، اس لیے آپ ﷺ مکمل احتیاط برتتے تھے کہ اللہ کا کلام جو حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے آپ تک پہنچا، وہ آپ ﷺ کے اپنے کلام کے ساتھ ملنے نہ پائے۔

② بعض اوقات آپ ﷺ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کیا جاتا تھا لیکن آپ فوراً جواب نہیں دیتے تھے بلکہ کئی کئی دن گزر جاتے۔ جب اس کے بارے میں قرآن کی کوئی آیت نازل ہوتی، پھر آپ اس کا جواب دیتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ ﷺ کسی معاملے میں کوئی طرزِ عمل اختیار فرماتے مگر قرآنی آیات کے نزول کے بعد آپ کو اپنا طرز عمل تبدیل کرنا پڑتا۔ اور بعض اوقات ان آیات میں تنبیہ کا پہلو بھی موجود ہوتا تھا۔

③ رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی انسان کے سامنے زانوئے تلمُّذ تہ نہیں کیے تھے اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی انسان محض مکاشفے ہی سے تاریخی حقائق معلوم کر سکے، مثلاً: حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نومولود کو دریا کے حوالے کرنا اور فرعون کے واقعات کا بیان کرنا۔ یہ سب اس بات کے دلائل ہیں کہ آپ نے یہ کسی سے پوچھ کر یا سُن کر بیان نہیں کیے بلکہ ایسا صرف وحی کے ساتھ ہی ممکن تھا۔ رب ذوالجلال فرماتے ہیں:

﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝﴾

"اور آپ اس (قرآن) سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے اسے لکھتے تھے، (اگر ایسا ہوتا) تب تو باطل پرست یقیناً شک کر سکتے تھے۔"[1]

④ نبی کریم ﷺ کا اپنی قوم کے ساتھ چالیس سال تک راست گوئی سے کام لینا اور "صادق" کے طور پر قوم میں معروف ہونا اس بات کا متقاضی تھا کہ آپ اپنی ذات کے بارے میں بھی سچائی اور راست گوئی سے کام لیتے اور وحی کے متعلق آپ کو کسی قسم کا کوئی شک نہ تھا، نہ فکری طور پر اور نہ بصری طور پر۔ اگر پہلی وحی کے نزول کے بعد آپ کو اس بارے میں کوئی تردّد تھا بھی تو اس آیت نے اسے ختم کر دیا:

﴿فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝﴾

"پھر اگر آپ (اس کتاب کے متعلق) شک میں ہوں جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھیے جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں، یقیناً آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے حق آ گیا ہے، لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔"[2]

اور یہ مروی ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «لَا أَشُكُّ وَ لَا أَسْأَلُ» "نہ تو میں شک کرتا ہوں اور نہ میں (کسی سے کچھ) پوچھوں گا۔"[3]

---

[1] العنكبوت 48:29. [2] يونس 94:10. [3] المصنف لعبد الرزاق: 126,125/6، حديث: 10211، والدرالمنثور للسيوطي: 389/4. یہ حضرت قتادہ کی مرسل روایت ہے۔ صاحب کتاب نے زیر نظر آیت کے مرجوح معنی مراد لیے ہیں۔ جمہور مفسرین نے اس آیت کے یہ معنی لیے ہیں کہ یہ خطاب نبی کریم ﷺ کے واسطے سے عام انسانوں سے ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کو تو وحی کے متعلق کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ (مترجم)

وحی کی اقسام

علماء نے وحی کی درج ذیل اقسام بیان کی ہیں:

① سچے خواب: اسی سے سلسلۂ وحی کا آغاز ہوا۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ روشن صبح کی طرح حقیقت کا روپ دھار لیتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «رُؤْيَا الْأَنْبِيَاءِ وَحْيٌ» ”انبیاء کے خواب وحی ہوتے ہیں۔“ [1]

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول یوں نقل فرمایا: ﴿يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ﴾ ”اے میرے پیارے بیٹے! بے شک میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے یقیناً ذبح کر رہا ہوں۔“ [2]

② الہام: الہام کے معنی یہ ہیں کہ فرشتہ اپنا آپ دکھائے بغیر نبی کے دل میں کوئی بات ڈال دے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”بے شک روح القدس، یعنی جبریل علیہ السلام نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ کسی نفس کو اس وقت تک موت نہیں آئے گی جب تک وہ اپنا رزق مکمل طور پر حاصل نہیں کر لیتا اور اپنی زندگی پوری نہیں کر لیتا، اس لیے اللہ سے ڈرتے رہو اور حصولِ رزق کے لیے عمدہ (جائز) طریقہ اختیار کرو۔“ [3]

③ صدائے جَرَس کی طرح وحی کا نزول: جس طرح گھنٹی کی آواز زور دار ہوتی ہے اسی صورت میں وحی کی آواز بھی نہایت زور دار ہوتی تھی۔ یہ وحی کی سب سے سخت صورت تھی جیسا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ آپ پر وحی کیسے نازل ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَحْيَانًا يَأْتِينِي مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَ هُوَ أَشَدُّهُ عَلَيَّ، فَيُفْصَمُ عَنِّي وَ قَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَ أَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا

---

[1] المستدرك للحاكم: 432/2.
[2] الصّٰفّٰت 102:37.
[3] شرح السنة للبغوي: 304/13، والتمهيد لابن عبد البر: 284/1.

فَيُكَلِّمُنِي، فَأَعِي مَا يَقُولُ»

’’کبھی کبھی گھنٹی کی آواز کی طرح ہوتی ہے اور یہ میرے لیے شدید ترین صورت ہوتی ہے۔ نزول وحی کی یہ کیفیت جب ختم ہوتی ہے تو وحی مجھے یاد ہو چکی ہوتی ہے اور کبھی فرشتہ انسانی شکل میں میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے گفتگو کرتا ہے، پھر جو کچھ وہ کہتا ہے میں یاد کر لیتا ہوں۔‘‘[1]

④ **اللہ تعالیٰ کا براہِ راست نبی ﷺ کو وحی کرنا:** جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے براہِ راست کلام کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ اعزاز نصّ قرآن سے ثابت ہے، اسی طرح ہمارے نبی ﷺ کے لیے اس اعزاز کا ثبوت حدیث معراج میں موجود ہے۔[2]

⑤ **فرشتے کا اپنی اصلی شکل میں آکر وحی کرنا:** کبھی نبی ﷺ فرشتے کو اس کی پیدائشی شکل میں دیکھتے تھے اور اسی حالت میں وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق آپ کی جانب وحی کرتا تھا۔

⑥ **فرشتے کا انسانی صورت میں آنا:** کبھی فرشتہ انسانی شکل اختیار کر کے نبی کریم ﷺ سے مخاطب ہوتا۔ وہ جو کچھ آپ سے کہتا، آپ اسے یاد کر لیتے تھے۔ اس صورت میں کبھی کبھی صحابۂ کرام بھی فرشتے کو (انسانی شکل میں) دیکھ لیتے تھے۔[3]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے وحی کے مذکورہ بالا مراتب بیان کیے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ پر وحی کا نزول انسانی زندگی کے نئے دور کا آغاز تھا۔ اس سے قبل یہ سلسلہ منقطع ہو چکا تھا اور انسانیت گمراہی کے تاریک پردوں میں گم گشتہ پھر رہی تھی۔ رسول اللہ ﷺ پر وحی کا نزول ایک سخت مرحلہ ہوتا تھا جیسا کہ حدیث مبارکہ سے واضح ہے،

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 2، وصحیح مسلم: 87-2333. [2] الرؤیٰ والأحلام لأسامة عبدالقادر، ص: 108. [3] زاد المعاد: 34,33/1.

حالانکہ آپ سب لوگوں سے زیادہ بہادر اور مضبوط دل کے مالک تھے۔ 23 سالہ عہد نبوت کے کئی واقعات اس بات کے شاہد ہیں۔ دراصل نزول وحی کی شدت اس وجہ سے تھی کہ معاملہ کسی انسان کا دوسرے انسان سے ہم کلام ہونے کا نہ تھا بلکہ فرشتوں کی ایک عظیم ہستی جو حاملِ کلام الٰہی تھی، اس کے ایک ایسے اعلیٰ و اشرف انسان سے ہم کلام ہونے کا معاملہ تھا جو اللہ تعالیٰ کا منتخب کردہ تھا۔ رحمٰن کے کلام کو رحمٰن کے بندوں تک پہنچانے کا معاملہ تھا۔

اس بہت بڑی ذمہ داری کی ہیبت کا اندازہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے کیا جاسکتا ہے جو پہلی وحی کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: «لَقَدْ خَشِيتُ عَلٰى نَفْسِي» ”مجھے تو اپنی جان خطرے میں محسوس ہوئی۔“ اور اسی حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول سے بھی حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پہلی وحی کے بعد واپس آئے تو خوف سے آپ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے اور فرمایا: «زَمِّلُونِي، زَمِّلُونِي» ”مجھے چادر اوڑھا دو۔ مجھے چادر اوڑھا دو۔“ انھوں نے آپ کو چادر اوڑھا دی یہاں تک کہ آپ کا خوف جاتا رہا۔

نزول وحی کی شدت کو اور زیادہ واضح کر دینے والی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہے جسے امام بخاری اور امام مسلم نے بیان کیا ہے کہ میں نے شدید سردی میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی تھی۔ جب سلسلہ نزول وحی ختم ہوا تو آپ ﷺ کی پیشانی پسینے سے شرابور تھی۔[1]

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی نزول وحی کی شدت کو واضح کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آپ تکلیف محسوس کرتے اور آپ کا رنگ متغیر ہو جاتا۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 2، و صحيح مسلم، حديث:(80)-2333. [2] صحيح مسلم، حديث:2334، و مسند أحمد:317/5.

میدانِ دعوت میں نیک بیوی کا کردار

غارِ حرا میں پہلی وحی کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ سخت گھبراہٹ اور خوف کی حالت میں گھر پہنچے تو حضرت خدیجہ ؓ نے آپ کی ساری بات سن کر کسی گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا بلکہ بڑے اطمینان اور سکون سے جائزہ لیا اور سارا واقعہ سن کر فوراً ورقہ بن نوفل کے پاس تشریف لے گئیں اور سارا معاملہ ان کے گوش گزار کیا۔[1]

وحی کی خبر سننے کے بعد حضرت خدیجہ ؓ نے جو موقف اختیار کیا، یہ ان کی وسعتِ فہم اور دور اندیشی کی دلیل تھا۔ انھوں نے فوراً وحی کی خبر اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں موازنہ کیا اور اس حقیقت کو پالیا کہ جو شخص فطری طور پر اخلاق عالیہ کا مالک ہو، اللہ تعالیٰ اسے کبھی رسوا نہیں کرتا۔

انھوں نے آپ ﷺ کا یہ وصف بیان کیا کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ رشتے داروں کے ساتھ کسی انسان کا میل جول اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ وہ شخص ذاتی طور پر اس خوبی کا مالک ہے کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرتا اور ان پر اپنا مال بھی خرچ کرتا ہے۔

کسی بھی انسان کے اخلاق معلوم کرنے کے لیے سب سے پہلا آئینہ اس کے اقرباء ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے رشتے داروں کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے اُنھیں متحد و متفق رکھنے اور ان کا دل جیتنے میں کامیاب ہو جائے تو ایسا شخص یقیناً دوسرے لوگوں کے دل جیتنے میں بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔[2]

ام المومنین سیدہ خدیجہ ؓ نے ایمان لانے میں سبقت حاصل کی۔ انھوں نے وہ قانون قدرت جان لیا تھا جو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے معاملے میں اختیار کرتا ہے اور ان کا

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 61/1. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 64/1.

یقین مزید پختہ ہو گیا تھا کہ محمد ﷺ کے پاس اخلاق عالیہ اور عادات جمیلہ کا جو ذخیرہ ہے ایسا ذخیرہ اس کائنات میں کسی بھی انسان کے پاس نہیں ہے۔ ان کے دل نے یہ بات بھی جان لی تھی کہ آپ ﷺ پر رب ذوالجلال کی خاص نظرِ کرم اور مہربانیاں ہیں اور انھوں نے خود اس بات کا مشاہدہ بھی کیا کہ بہت سے ایسے مقامات پر آپ ﷺ پر عنایات ربانیہ کی بارش ہوتی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے ایسے اعلیٰ کردار کی بدولت آپ ﷺ کی عزت وشرف میں اضافہ کیا۔ ایسے اعلیٰ کردار کو مقام نبوت و رسالت کہا جا سکتا ہے نہ معجزہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ خرق عادت امور کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف وہ انسانی فضائل اور خوبیاں تھیں جو عظیم کارہائے نمایاں انجام دینے والی خاص شخصیات میں ہوتی ہیں۔[1]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اس بات کا یقین تھا کہ ان کے سرتاج نبی ﷺ میں ایسی باکمال فطری خوبیاں، پائیدار اخلاق و محاسن، عمدہ اور پسندیدہ طرزِ عمل، اعلیٰ و بالا کردار اور کامل ترین انسانی شرافت موجود ہے۔ یہ تمام محاسن کسی بھی کامیابی کے ضامن اور فتح و کامرانی کو یقینی بنانے کا ذریعہ ہوتے ہیں، اسی لیے انھوں نے اپنے مختصر مگر گہرائی کے حامل کلمات کے ساتھ کمالِ محمدی کو ثابت کیا ہے۔[2] حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کی اعلیٰ صفات سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا میں ہرگز رسوا نہیں کرے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی پیدائش مکارم اخلاق پر فرمائی تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جامع کمالات میں سے چند کی مثال بھی بیان کی۔

اس کائنات کے معاشرتی قوانین میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندے کو اخلاق کریمانہ عطا کیے ہوں اور پھر اسے زندگی میں رسوا بھی کیا ہو۔ جبکہ محمد ﷺ مکارمِ اخلاق کی بلندیوں تک پہنچے ہوئے تھے۔ کسی کے لیے اس سے آگے بڑھنا تو بہت دور کی بات ہے اس کے برابر پہنچنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔[3]

---

[1] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون:1/307. [2] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 1/308,307. [3] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون:1/232.

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کی نبوت کے لیے صرف آپ کے اخلاقِ عالیہ سے دلیل نہیں لی بلکہ اس وقت کے ایک بہت بڑے عالم اور اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس تشریف لے گئیں، جو کہ نبی آخر الزمان کی آمد کے منتظر تھے کیونکہ انھوں نے اہل کتاب کے علماء سے یہ بات معلوم کی تھی کہ اس نبی کی آمد اور بعثت کا وقت قریب آچکا ہے۔ ورقہ کی گفتگو نے نبی کریم ﷺ پر بڑا خوشگوار اثر چھوڑا، آپ کو حوصلہ ملا اور دل کو تقویت حاصل ہوئی۔ ورقہ نے آپ ﷺ کو بتلایا کہ جو فرشتہ غار حرا میں آپ سے ہم کلام ہوا ہے، یہ وہی فرشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے تمام انبیاء علیہم السلام کے درمیان پیغام رساں رہا ہے اور بہت سے رازوں کا مالک ہے۔ ورقہ کے مندرجہ ذیل اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کا منتظر تھا ؎

لَجَجْتُ وَ كُنْتُ فِي الذِّكْرٰی لَجُوجًا   لِهَمٍّ طَالَمَا بَعَثَ النَّشِيجَا
وَوَصْفٍ مِّنْ خَدِيجَةَ بَعْدَ وَصْفٍ   فَقَدْ طَالَ انْتِظَارِي يَا خَدِيجَا
بِبَطْنِ الْمَكَّتَيْنِ عَلٰی رَجَائِي   حَدِيثَكِ أَنْ أَرٰی مِنْهُ خُرُوجَا
بِمَا خَبَّرْتِنَا مِنْ قَوْلِ قَسٍّ   مِّنَ الرُّهْبَانِ أَكْرَهُ أَنْ يَّعُوجَا
بِأَنَّ مُحَمَّدًا سَيَسُودُ فِينَا   وَ يَخْصِمُ مَنْ يَّكُونُ لَهُ حَجِيجَا

”ایک دیرینہ فکر جو میرے دل کو بھی رلاتا تھا میں اکثر اسی کے بارے میں سوچ و بچار میں رہتا تھا۔ اور علمائے اہل کتاب نے آنے والے پیغمبر کے جو اوصاف بیان کیے تھے ان کے بعد خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جو صفات بیان کیں تو میں انھیں میں مگن ہو گیا۔ اے خدیجہ! میرا انتظار تو طویل ہوتا جا رہا ہے۔ تیری گفتگو سے مجھے امید بندھی ہے کہ میں سرزمین مکہ میں اس نبی کا ظہور دیکھ سکوں گا۔ اہل کتاب کے علماء اور راہبوں کی پیش گوئی کے مطابق تو نے مجھے جو خبر دی ہے میں نہیں چاہتا کہ یہ

غلط ثابت ہو۔ (وہ خبر یہ ہے) کہ محمد ﷺ عنقریب ہمارے سردار ہوں گے اور اپنے مخالفین پر غالب آئیں گے۔‘‘ [1]

ورقہ بن نوفل نے نبی کریم ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی تھی اور نبی کریم ﷺ نے ان کے جنتی ہونے کی شہادت دی تھی۔

امام حاکم نے حضرت عائشہ ؓ سے روایت بیان کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «لَا تَسُبُّوا وَرَقَةَ فَإِنِّي رَأَيْتُ لَهُ جَنَّةً أَوْ جَنَّتَيْنِ» ’’ورقہ کو بُرا بھلا نہ کہو۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس کے لیے ایک یا دو باغ ہیں۔‘‘ [2]

حضرت عائشہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ حضرت خدیجہ ؓ نے رسول اللہ ﷺ سے ورقہ کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «قَدْ رَأَيْتُهُ فَرَأَيْتُ عَلَيْهِ ثِيَابًا بِيضًا، فَأَحْسِبُهُ لَوْ كَانَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ لَمْ يَكُنْ عَلَيْهِ ثِيَابٌ بِيضٌ» ’’میں نے اسے سفید لباس پہنے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر وہ اہل جہنم سے ہوتا تو اس پر سفید لباس نہ ہوتا۔‘‘ [3]

امام ہیثمی کہتے ہیں کہ امام ابویعلی نے اپنی مسند میں حضرت جابر بن عبداللہ ؓ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ورقہ بن نوفل کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: «أَبْصَرْتُهُ فِي بُطْنَانِ الْجَنَّةِ وَ عَلَيْهِ السُّنْدُسُ» ’’میں نے اسے جنت کے ایک بہترین درجے میں دیکھا ہے اور اس کا لباس ریشمی تھا۔‘‘ [4]

حضرت خدیجہ ؓ کو اپنی قوم میں ایک اہم معاشرتی مقام حاصل تھا اور فطرتاً انھیں رحم دلی، بردباری، حکمت و دانائی اور معاملہ فہمی جیسے عمدہ اوصاف و دیعت فرمائے گئے

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 194/1. [2] المستدرك للحاكم: 609/2، ومسند البزار، حديث: 2751,2750، ومجمع الزوائد: 416/9، علامہ البانی ؒ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، دیکھیے: (السلسلة الصحيحة: 761/1) [3] مسند أحمد: 65/6، اس کی سند ضعیف ہے۔ [4] مجمع الزوائد: 416/9، و مسند أبي يعلٰى، حديث: 2047، علامہ البانی ؒ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے، دیکھیے: (صحيح السيرة النبوية: 94/1)

تھے، اس وجہ سے انھوں نے نبی کریم ﷺ کی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو ایک مثالی بیوی عنایت فرمائی کیونکہ وہ تمام کائنات کے لیے اور خاص طور پر دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کے لیے ایک بہترین نمونہ ہیں۔ ام المومنین کے اس اہم کردار کی روشنی میں اللہ تعالیٰ نے حاملین دعوتِ اسلامی کی رہنمائی فرمائی ہے کہ انھیں بھی اس میدان میں رسول اللہ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے تاکہ انھیں وہ اعلیٰ مقاصد حاصل ہوں جن کے لیے وہ جدوجہد کر رہے ہیں۔[1]

دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کی بیویوں کے لیے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایک بہترین مثال اور اعلیٰ نمونہ ہیں۔ دعوتِ دین کا کام کرنے والا جہاں اپنے پاس ایک پیغام رکھتا ہے وہاں وہ صاحب درد بھی ہوتا ہے۔ اسے امت کے ضائع ہونے کا درد ہوتا ہے۔ وہ اس کے بگاڑ پر متفکر ہوتا ہے۔ اپنی قوم کی شان وشوکت بڑھانے کے لیے فکر مند ہوتا ہے۔ دنیا کے اطراف واکناف میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم وستم، ان کی بھوک و افلاس اور ان کے خلاف ہونے والی سازشوں پر وہ بے چین ہوتا ہے۔ دعوت دین کا کام کرنے والوں کی مشکلات، تکالیف اور آزمائشوں پر وہ مضطرب ہوتا ہے اور جس پیغام کا وہ حامل ہوتا ہے اسے دوسروں تک پہنچانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ یہ ذمہ داری ایک طویل وقت کا تقاضا کرتی ہے جس کے لیے اسے اپنی نیند، آرام بلکہ اپنے اہل وعیال کے لیے مخصوص وقت بھی قربان کرنا پڑتا ہے۔ یہ فریضہ وقت، مال بلکہ دنیا کی ہر چیز کی قربانی مانگتا ہے۔ اگرچہ اس کی بیوی میں، اخلاق وتقویٰ، حسن و جمال اور حسب ونسب جیسی خوبیاں موجود ہوں لیکن دعوت دین کا فریضہ اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ بیوی دعوت کی ضرورت و اہمیت سے واقف ہو اور اسے ان باتوں کا مکمل طور پر احساس ہو کہ اس کے خاوند کی کیا حیثیت و مقام ہے، اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں اور اس کی کون سی مشکلات ہیں، پھر اسے

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 69/1.

اپنے خاوند کے پہلو بہ پہلو ایک مددگار کی حیثیت سے اس کے کام کو آسان بنانا چاہیے نہ کہ اس کے راستے کا کانٹا یا رکاوٹ بنے۔[1]

دعوتِ دین کی کامیابی میں نیک عورت کا بہت نمایاں کردار ہوتا ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پہلی وحی کے نزول کے موقع پر نبی کریم ﷺ کو حوصلہ دیا اور آپ کی ڈھارس بندھائی۔ اس طرح انھوں نے دعوت کے میدان میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ بلاشبہ ایک نیک بیوی اپنے خاوند کی کامیاب زندگی کے لیے ایک اہم رول ادا کرتی ہے اور ان معاملات میں اس کا کردار مزید اہم ہو جاتا ہے جن کا تعلق براہ راست لوگوں سے ہو۔ دعوت الی اللہ کی ذمہ داری ادا کرنے والے کو باصلاحیت نیک بیوی مل جائے تو یہ اس کی کامیابی کا ایک اہم سبب شمار ہوگا۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا: «اَلدُّنْیَا مَتَاعٌ، وَّخَیْرُ مَتَاعِ الدُّنْیَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ»

”دنیا ساز و سامان کا نام ہے اور نیک بیوی اس دنیا کا بہترین سامان ہے۔“[3]

نبی کریم ﷺ کی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ وفا شعاری

رسول اللہ ﷺ اپنے اہل خانہ کے ساتھ حسن سلوک اور وفا شعاری میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ان کی زندگی میں اور زندگی کے بعد بھی انتہائی درجے کی وفا شعاری کا مظاہرہ کیا۔ آپ ﷺ نے انھیں ان کی زندگی ہی میں جنت کی بشارت دے دی تھی اور انھیں اللہ تعالیٰ اور جبریل علیہ السلام کی جانب سے سلام بھی پہنچایا تھا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور

---

[1] وقفات تربوية من السيرة النبوية لعبد الحميد البلالي، ص: 40. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 68/1. [3] صحيح مسلم، حديث: 1469، و سنن ابن ماجه، حديث: 1855، ومسند أحمد: 168/2، و السنن الكبرى للنسائي: 272/3، حديث: 5325.

کہنے لگے: ”اے اللہ کے رسول! ابھی آپ کے پاس حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایک برتن میں سالن، کھانا یا مشروب لے کر آ رہی ہیں۔ جب وہ آپ کے پاس آئیں تو انھیں ان کے رب کی طرف سے اور میری طرف سے سلام کہیے اور جنت میں ایک ایسے گھر کی بشارت دیجیے جو ایک خول دار موتی (یا سونے) کا بنا ہوا ہے۔ اس میں شور ہوگا نہ کوئی تکلیف۔“ [1]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد ان کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی وفا شعاری کا تذکرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان الفاظ سے کرتی ہیں کہ میں نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سوا نبی ﷺ کی ازواج میں سے کسی پر رشک نہیں کیا، حالانکہ میں نے انھیں نہیں دیکھا۔ لیکن نبی کریم ﷺ کثرت سے ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اگر کبھی بکری ذبح کرتے تو اس کا گوشت تقسیم کر کے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں کے ہاں بھیجا کرتے تھے، کبھی میں آپ سے کہتی: ”لگتا ہے دنیا میں خدیجہ کے سوا کوئی عورت نہیں تھی۔“ اس پر آپ فرماتے: «إِنَّهَا كَانَتْ وَ كَانَتْ، وَ كَانَ لِي مِنْهَا وَلَدٌ» ”وہ واقعی ایسی ہی تھی۔ میری اولاد بھی تو اسی سے ہوئی ہے۔“ [2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بہن ہالہ بنت خویلد نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آنے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا اجازت طلب کرنے کا انداز یاد آ گیا۔ آپ بڑے خوش ہوئے اور فرمایا: «اَللّٰهُمَّ هَالَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ» ”یا اللہ! یہ ہالہ بنت خویلد ہے۔“

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:) مجھے بڑا رشک آیا۔ میں نے کہا: ”آپ قریش کی ایک بوڑھی عورت کو یاد کر رہے ہیں، وہ (دانت نہ ہونے کی وجہ سے) سُرخ مسوڑھوں والی جو عرصہ ہوا فوت ہو چکی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے بہتر بیوی عطا کی ہے۔“ [3]

نبی کریم ﷺ نے اس عورت کی بڑی عزت افزائی کی جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں ان

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3820، و صحيح مسلم، حديث: 2432. [2] صحيح البخاري، حديث: 3818، وصحيح مسلم، حديث: 2435. [3] صحيح البخاري، حديث: 3821، وصحيح مسلم، حديث: 2437.

کے پاس آیا کرتی تھی اور آپ نے یہ بات واضح کی کہ عہد رفتہ کی پاسداری ایمان کا جزو ہے۔[1]

رسولوں کی تکذیب کا سلسلہ

جب ورقہ بن نوفل نے کہا: ”کاش! میں اس وقت جوان اور طاقتور ہوتا۔ کاش! میں اس وقت زندہ ہوتا جب آپ ﷺ کی قوم آپ کو دیس نکالا دے گی۔“ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: «أَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ» ”کیا یہ لوگ مجھے (یہاں سے) نکال دیں گے؟“ ورقہ نے کہا: ”ہاں جب بھی کوئی اس طرح کا پیغام (رسالت) لایا جیسا آپ لائے ہیں تو اس سے ضرور دشمنی کی گئی۔ اگر زمانہ (نبوت) مجھے ملا تو میں آپ کی پرزور تائید کروں گا۔“[2]

اس حدیث نے اس طرز عمل کی وضاحت کر دی جو پہلی امتیں ہر اس نبی کے ساتھ اختیار کرتی رہیں جس نے بھی انھیں اللہ کی طرف بلایا اور ان کا یہ طرز عمل انبیاء کی تکذیب اور انھیں وطن سے نکال دینا تھا۔ اللہ تعالیٰ قوم لوط کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝﴾

”پھر اس کی قوم کا اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ انھوں نے کہا: آل لوط کو اپنی بستی سے نکال دو کیونکہ یہ لوگ تو بڑے پاک صاف بنتے ہیں۔“[3]

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 71/1، اس قصے کی وضاحت کچھ یوں ہے: حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں: ایک دفعہ ایک عمر رسیدہ خاتون نبی ﷺ کے پاس آئیں۔ اس وقت نبی ﷺ میرے پاس تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے ان کا نام پوچھا تو انھوں نے اپنا نام جثامہ مزنیہ بتایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں تیرا نام حسانہ مزنیہ ہے۔ سناؤ! تمھارا کیا حال ہے؟ اب تم لوگ کیسے ہو؟ ہمارے بعد آپ لوگوں کے حالات کیسے رہے؟“ انھوں نے کہا: ”میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! ہمارے حالات بہت اچھے ہیں۔“ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ جب وہ عورت چلی گئی تو میں نے آپ ﷺ سے عرض کی: ”آپ اس خاتون کو بڑی اہمیت دے رہے تھے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّهَا كَانَتْ تَأْتِينَا زَمَنَ خَدِيجَةَ، وَإِنَّ حُسْنَ الْعَهْدِ مِنَ الْإِيمَانِ» ”یہ خدیجہ کے زمانے میں ہمارے پاس آیا کرتی تھی۔ اور گزرے ہوئے زمانے کو اچھے انداز میں نبھانا ایمان کا حصہ ہے۔“ (السلسلة الصحيحة: 424/1)

[2] صحيح البخاري، حديث: 3، وصحيح مسلم، حديث: 160.

[3] النمل 56:27.

قوم شعیب نے بھی اسی طرح کہا:

﴿قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا﴾

”اس کی قوم میں سے جو سردار تکبر کرتے تھے، انھوں نے کہا: اے شعیب! ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے ضرور نکال دیں گے یا تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ گے۔“ [1]

وحی کی بندش

قدیم اور جدید علمائے سیرت نے وحی کی بندش کا تذکرہ کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وحی کی بندش سے مراد کچھ عرصے کے لیے وحی کا رُک جانا ہے اور اس کی حکمت یہ تھی کہ نبی کریم ﷺ پر جو خوف طاری ہو گیا تھا، دور ہو جائے اور دوبارہ وحی کی آمد کا انتظار رہے۔ [2]

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بندش وحی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: «بَيْنَ أَنَا أَمْشِي إِذْ سَمِعْتُ صَوْتاً مِّنَ السَّمَاءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِي فَإِذَا الْمَلَكُ الَّذِي جَاءَنِي بِحِرَاءٍ جَالِسٌ عَلَى كُرْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ فَرُعِبْتُ مِنْهُ فَرَجَعْتُ فَقُلْتُ: زَمِّلُونِي، زَمِّلُونِي فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: ﴿يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝﴾ فَحَمِيَ الْوَحْيُ وَتَوَاتَرَ» ”ایک دن میں جا رہا تھا تو میں نے آسمان سے ایک آواز سنی۔ میں نے نظر اٹھائی تو وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا، زمین و آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں اس (منظر) سے ڈر گیا۔ گھر واپس آیا تو میں نے کہا: ”مجھے کمبل اوڑھا دو۔ مجھے کمبل اوڑھا دو“، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ

---

[1] الأعراف 88:7. [2] فتح الباري:36/1.

آیات نازل فرمائیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝﴾

”اے لحاف میں لپٹنے والے! اٹھیے اور ڈرایئے اور اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے اور اپنے کپڑے پاک رکھیے اور ناپاکی چھوڑ دیجیے۔“ [1]

اس کے بعد وحی کی آمد تیز ہوگئی اور مسلسل آنے لگی۔“ [2]

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”رہی یہ بات کہ وحی کتنے دنوں تک بند رہی تو اس سلسلے میں ابن سعد نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بندش چند دنوں کے لیے تھی اور سارے پہلوؤں پر نظر ڈالنے کے بعد یہی بات راجح بلکہ یقینی معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ وحی کی بندش تین سال یا ڈھائی سال تک رہی تو یہ قطعاً صحیح نہیں، البتہ یہاں دلائل پر بحث کی گنجائش نہیں۔ وحی کی بندش کے عرصے میں رسول اللہ ﷺ حزین وغمگین رہے اور آپ پر حیرت واستعجاب طاری رہا۔“ [3]

امام بخاری رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ (وحی کی بندش کی وجہ سے) رسول اللہ ﷺ اس قدر غمگین ہوئے کہ کئی بار بلند وبالا پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ گئے تاکہ وہاں سے چھلانگ لگا دیں۔ لیکن جب کسی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے کہ وہاں سے چھلانگ لگائیں تو جبریل علیہ السلام نمودار ہوتے اور فرماتے: ”اے محمد (ﷺ)! آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔“ اس طرح آپ ﷺ کا اضطراب تھم جاتا اور دل پُرسکون ہو جاتا، پھر آپ واپس آجاتے، پھر جب آپ پر وحی کی بندش کا عرصہ طویل ہوگیا تو آپ پھر ایسا کرنے (پہاڑ کی چوٹی سے چھلانگ لگانے) کے لیے نکلتے لیکن جب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے تو جبریل علیہ السلام نمودار ہوکر پھر وہی بات دہراتے (کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں)۔ [4]

---

[1] المدثر 74:1-5. [2] صحيح البخاري، حديث:4. [3] الرحيق المختوم، ص:79,80. [4] صحيح البخاري، حديث:6982، وصحيح ابن حبان، حديث:33، ودلائل النبوة للبيهقي:2/138.

باب 2

خفیہ دعوتی سرگرمیاں

پیغامِ الٰہی کی تبلیغ کے لیے حکمِ ربانی

پہلی وحی کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ آپ رحیم و کریم رب کی طرف سے منصبِ نبوت پر فائز ہو چکے ہیں۔

پھر جبریل علیہ السلام دوسری مرتبہ آپ کے پاس تشریف لائے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی یہ وحی پہنچائی:

﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝﴾

”اے لحاف میں لپٹنے والے! اٹھیے اور ڈرائیے اور اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے اور اپنے کپڑے پاک رکھیے اور ناپاکی چھوڑ دیجیے۔“ ①

ان آیات کا تسلسل رسول اللہ ﷺ کے لیے اس بات کا پیغام تھا کہ آرام و سکون کی نیند کا دور ختم ہو چکا۔ اب مستقبل میں آپ کو ایک نہایت عظیم الشان کام پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ اس کام کی ذمہ داریوں کا تقاضا یہ ہے کہ آپ نیند کو چھوڑ کر کمر بستہ ہو جایئے، معصیت کے خاتمے کے لیے ہر طریقہ آزمایئے تاکہ کسی کا عذر باقی نہ رہے۔ پیغامِ رسالت لوگوں تک پہنچایئے۔ وحی کے ساتھ تعلق مضبوط بنایئے اور اس راستے میں آنے

---

① المدثر 74:1-4.

والی ہر تکلیف پر دل کو مضبوط رکھے۔ اس طریقے سے رسالت کا حق ادا ہوگا اور دعوت بھی مضبوط ہوگی۔[1]

دعوت دین اور اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کا سب سے پہلا حکم ان آیات میں دیا گیا ہے۔ ان آیات میں ایسے امور کی طرف رہبری کی گئی ہے جنھیں دعوت محمدی اور اسلامی تعلیمات کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے۔ اسلام کی بنیاد انھی امور پر ہے اور وہ امور یہ ہیں: توحید، قیامت پر ایمان، تزکیہ نفوس، امتِ مسلمہ کو ہر قسم کے شر سے بچانا اور ان کے مفادات کا تحفظ کرنا۔

ان آیات کا مقصد رسول اللہ ﷺ کی عزیمت میں شدّت اور تیزی پیدا کرنا تھا تاکہ آپ اپنے رب کی رسالت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے پوری طرح مستعد ہو جائیں اور کسی مزاحمت، رکاوٹ اور مشکل کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دعوت الی اللہ کی احسن طریقے سے تکمیل کر سکیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝﴾ کہہ کر بڑے پیارے انداز میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مخاطب فرمایا۔ اس میں اس امر کا اظہار بھی تھا کہ اب نیند اور آرام کی پروا نہ کرتے ہوئے عزم صمیم کر لیجیے، پھر ساتھ ہی ﴿قُمْ﴾ کہہ کر حکم دے دیا کہ اب تبلیغ دین کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے ایسی عزیمت کے ساتھ جو کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لائے اور ایسی قوت کے ساتھ جس میں دور اندیشی بھی ہو، سرگرم عمل ہو جائیے۔[2]

وحی کی بندش کے بعد آپ ﷺ سے جو سب سے پہلا خطاب کیا گیا۔ اس میں صرف ڈرانے کا حکم ہے، خوشخبری دینے کا نہیں۔ اس میں یہ لطیف اشارہ موجود ہے کہ آپ کو فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے لیے انتھک محنت اور تلخ ترین مرحلوں سے گزرتے ہوئے زبردست جدوجہد کرنی ہوگی۔ ان آیات سے رسول اللہ ﷺ کی عزیمت محکم ہوگئی، آپ کا

---

[1] فقه السيرة للغزالي، ص: 90. [2] دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 181.

حوصلہ مضبوط ہو گیا اور آپ ﷺ آمادہ ہو گئے کہ اپنے نصب العین کے حصول کے لیے سب کچھ کر گزریں اور اس راستے میں آنے والی کسی مشکل اور رکاوٹ کو خاطر میں نہ لائیں۔

آپ ﷺ سے کہا گیا: ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ ”اور صرف اپنے رب ہی کی بڑائی بیان کریں۔“ یعنی خالق کے سوا کسی مخلوق کو بڑا نہ سمجھیں۔ مخلوق میں سے کسی کی عظمت آپ کے دل میں جاگزیں نہ ہو۔ نہ ان میں سے کسی کے کام کی ہیبت آپ پر طاری ہو اور نہ کسی کا خوف مسلّط ہو۔ صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے۔ اسی نے آپ کی حفاظت کی تھی جب آپ دنیا میں نہیں آئے تھے بلکہ اپنے ماں باپ کے بدن میں تھے۔ اس نے آپ کو اپنے فضل سے پروان چڑھایا اور اپنی جود وسخا کے ذریعے آپ کی سرپرستی فرمائی۔ آپ کو بہترین صورت اور سیرت کے ساتھ تیار کیا، پھر اپنا رسول بنا کر آپ کو رسالت کی عظیم ذمہ داریاں سونپیں۔ ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ تمام عظمتیں، بڑائیاں اور جاہ و جلال صرف ایک اللہ کے لیے ہے۔ ان میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔ ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ کہہ کر گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے یہ فرمایا ہے کہ فطری پاکیزگی اور طہارت میں آپ انسانیت کی معراج پر پہنچے ہوئے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تخلیق نہایت بلند اور عمدہ ترین اخلاق پر فرمائی اور آپ کو نبوت عطا کر کے اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے تیار فرمایا، لہٰذا اب اس امر کی زیادہ ضرورت ہے کہ آپ اپنے نفس کی طہارت میں اضافہ کریں۔ اس طرح آپ کے پاکیزہ معاشرتی میل جول سے آپ کی عزت و توقیر بڑھے گی۔ اس وقت آپ جہانوں کے لیے اللہ کے رسول ہیں۔ رسالت کا کمال اس وقت حاصل ہوگا جب آپ صبر، حلم، عفو و درگزر اور احسان جیسے معاشرتی اخلاق میں کمال حاصل کریں گے۔

دعوت الی اللہ کے نصب العین پر قائم رہیے۔ لوگوں کی ایذا رسانی اور طعن و تشنیع آپ کا رخ تبدیل کر سکے نہ مصائب کے ریلے آپ کو اپنے نصب العین کے حصول سے دور کر سکیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا: ﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۝﴾ ''اور پلیدی سے دور رہیے'' گویا یہ کہہ کر آپ ﷺ کی رہنمائی فرمائی گئی کہ آپ اپنی فطرت اور مزاج کے باعث جن (ناپسندیدہ) چیزوں سے اجتناب برت رہے ہیں اس میں آپ کی نیت یہ ہونی چاہیے کہ میں یہ سب کچھ اپنے اللہ کے حکم کی تعمیل میں، اس کی بندگی اختیار کر کے کر رہا ہوں تاکہ آپ کا یہ عمل آپ کی امت کے لیے پیروی کا ایک نمونہ بنے اور آپ کی رسالت کے ذریعے سے ان کی تطہیر ہو جائے۔[1]

سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد آپ نے چپکے چپکے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اسلامی تعلیمات کی دعوت کا آغاز فرمایا۔ فطری بات تھی کہ آپ اس کا آغاز اپنے اہل خانہ، دوست احباب اور اپنے قریبی لوگوں سے کرتے، چنانچہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔ اس کے نتائج کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا قبول اسلام

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو منفرد اعزاز حاصل ہے کہ وہ نہ صرف خواتین میں بلکہ مطلق طور پر سب لوگوں سے پہلے جناب رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں۔ رسول کریم ﷺ کی زبان مبارک سے سب سے پہلے آپ ہی نے وحیِ الٰہی سماعت فرمائی اور آپ ﷺ ہی سے سن کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے سب سے پہلے قرآن کی تلاوت کا شرف حاصل کیا۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ سے نماز کی تعلیم سب سے پہلے آپ ہی نے حاصل کی۔ اور آپ ہی کے مکان کو یہ شرف حاصل ہوا کہ سب سے پہلی وحی جو جبریل علیہ السلام نے محمد مصطفیٰ ﷺ تک پہنچائی، اس کی تلاوت غارِ حراء کے بعد آپ ہی کے گھر میں کی گئی۔[2]

عقیدۂ توحید کے اقرار کے بعد شریعت اسلامیہ میں سب سے پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے

---

[1] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون:1/589-593. [2] المرأة في العهد النبوي للدکتورة عصمة الدین، ص: 36.

فرض کی وہ اقامت صلاۃ ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ نماز کی فرضیت کے بعد نبی کریم ﷺ نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو وضو اور نماز کی تعلیم دی۔

نماز کی فرضیت کے بعد جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تشریف لائے۔ اس وقت آپ ﷺ مکہ مکرمہ کی بالائی جانب تھے۔ جبریل علیہ السلام نے وادی کی ایک جانب اپنی ایڑی ماری تو وہاں سے ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ نماز کے لیے وضو کرنے کا طریقہ سکھانے کے لیے جبریل علیہ السلام نے وضو کیا۔ نبی کریم ﷺ انھیں دیکھتے رہے، پھر آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کے وضو کی طرح وضو کیا۔ اس کے بعد جبریل علیہ السلام نے آپ کو نماز پڑھائی اور آپ ﷺ نے ان کی امامت میں نماز ادا کی، پھر جبریل علیہ السلام واپس چلے گئے اور رسول اللہ ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے۔ آپ نے جبریل علیہ السلام کی طرح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو وضو کر کے دکھایا اور بتایا کہ نماز کے لیے اس طرح وضو کیا جاتا ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کو دیکھ کر ان کے وضو کی طرح وضو کیا، پھر نبی کریم ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام کی طرح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو نماز پڑھائی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کی امامت میں نماز ادا کی۔[1]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد بچوں میں سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا۔ اس وقت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی عمر راجح قول کے مطابق دس سال تھی۔ امام طبری اور ابن اسحاق نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر یہ خصوصی انعام فرمایا کہ انھیں نبی کریم ﷺ کے سایہ عاطفت میں تربیت حاصل کرنے کا موقع مرحمت فرمایا۔ نبی کریم ﷺ نے انھیں اپنے چچا

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 261,260/1، ومعين السيرة لصالح الشامي، ص: 41. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 284/1.

ابو طالب سے لے کر اپنے گھر کا ایک فرد بنا لیا تھا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ تیسرے فرد ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد نماز ادا کی۔[2]

بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ نماز ادا کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ مکہ کی وادیوں میں چلے جاتے تھے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی اپنے والد، چچا صاحبان اور اپنی ساری قوم سے چھپ کر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلے جاتے تھے۔ دونوں وہاں نمازیں ادا کرتے اور شام کو واپس آ جاتے تھے، پھر وہ پاکیزہ گھر انھیں اپنی آغوش میں لے لیتا تھا جو دولت ایمان کی وجہ سے ہر قسم کی آلودگی سے پاک، صدق و وفا سے لبریز اور عزت و شرافت کا منبع تھا۔[3]

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کا قبول اسلام

غلامی کی زندگی سے نجات پانے والوں میں سب سے پہلے ایمان لانے کا شرف حضرت زید بن حارثہ الکلبی رضی اللہ عنہما کو حاصل ہوا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے اور آپ ﷺ کو بہت محبوب بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں اپنا بیٹا (متبنٰی) بنایا ہوا تھا۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے والد گرامی اور دیگر گھر والوں کو اپنے بیٹے کی غلامی کا علم ہوا تو وہ انھیں واپس لینے اور خرید نے کے لیے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ ﷺ نے حضرت زید کو مکمل اختیار دے دیا کہ واپس جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔ زید رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے والد اور اہل خانہ پر ترجیح دی اور کہا کہ میں آپ ﷺ کو چھوڑ کر کہیں جانا پسند نہیں کروں گا۔ آپ ﷺ میرے لیے والد اور چچا کے درجے میں ہیں۔ یہ

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام:246/1. [2] عيون الأثر لابن سيد الناس:115/1. [3] المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص:42.

سن کر ان کے والد اور چچا نے کہا: ”تجھ پر افسوس ہے تو آزادی کے بجائے غلامی کو پسند کر رہا ہے؟ اور اپنے باپ، چچا اور گھر والوں کو چھوڑ رہا ہے۔“ یہ سن کر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”جی ہاں! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں ایسی خوبیاں دیکھی ہیں کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کسی اور کا انتخاب نہیں کر سکتا۔“ [1]

دختران نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قبول اسلام

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام صاحبزادیوں سیدہ زینب، ام کلثوم، رقیہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہن نے بھی فوراً اسلام قبول کر لیا۔ کیونکہ وہ اپنے والد کی بعثت سے قبل ہی ان کی استقامت اور حسنِ کردار کی وجہ سے بہت متاثر تھیں۔ اس زمانے کے لوگ بت پرستی اور طرح طرح کے گناہوں میں گھرے ہوئے تھے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان آلودگیوں سے یکسر پاک تھے۔ ان سب اوصاف سے متاثر ہو کر آپ کی صاحبزادیاں فوراً ایمان لے آئیں۔ [2]

اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور شریعت اسلامیہ کی پیروی کرنے والا پہلا گھرانہ بنا۔ تلاوتِ قرآن اور اقامتِ صلاۃ کے لحاظ سے بھی اس گھرانے کو فوقیت حاصل ہوئی اور اللہ نے انھیں خوبیوں سے نوازا۔ انھی خصوصیات اور امتیازات کی وجہ سے اسلامی دعوت کی تاریخ میں اس پہلے کاشانۂ نبوت کو عظمت حاصل ہوئی اور اس خانوادے نے اسلام کی نشر واشاعت میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

اس مقدس کاشانے کی خصوصیات وامتیازات درج ذیل ہیں:

① غار حرا کے بعد آسمانی وحی کی پہلی تلاوت اس گھر میں ہوئی۔

② قبول اسلام میں سب مردوں اور عورتوں پر سبقت لے جانے والی شخصیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص: 191. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 1/284.

کی محبوب بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اسی گھر کی مکین تھیں۔

③ اقامت صلاۃ سب سے پہلے اسی گھر میں ہوئی۔

④ سب سے پہلے ایمان لانے والے تین افراد حضرت خدیجہ، حضرت علی اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم اسی گھر میں اقامت گزیں تھے۔

⑤ نصرت دین کی ذمہ داری سب سے پہلے اس گھرانے نے قبول کی۔ گھر کا کوئی فرد، وہ چھوٹا تھا یا بڑا، دعوتِ دین کی حمایت سے پیچھے نہیں رہا۔[1]

قیادت کا حق صرف اسی گھر کو حاصل تھا۔ اسی گھر کی مالکہ کا یہ استحقاق تھا کہ وہ رہتی دنیا تک کے مسلمان گھرانوں اور ان کی عورتوں اور مردوں کے لیے ایک تابندہ مثال اور آئیڈیل بنے۔ اس گھر کے مکینوں میں ایک پاکباز، مجسمۂ ایمان واخلاق اور پیکر صدق و صفا بیوی تھی۔ ایک فرماں بردار، دست وبازو بننے والے دوست اور ساتھی کی صورت میں ایک چچا زاد نوجوان جسے سربراہ خاندان نے اپنی کفالت میں لے رکھا تھا۔ ایک سچا مومن، معاون اور مددگار منہ بولا بیٹا تھا۔ اور فرماں بردار واطاعت گزار، ایماندار اور حق کی تصدیق کرنے والی بیٹیاں تھیں۔[2]

اس خانوادے نے ایمان کا خوبصورت جامہ زیب تن کر لیا تھا اور تصدیق رسالت کے نور نے اس گھرانے کے تمام افراد کے کردار کو منور کر دیا تھا۔ شوہر نامدار اور زوجہ محترمہ میں کامل ہم آہنگی تھی اور ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا بھرپور احترام موجود تھا۔ اس جلیل القدر گھرانے کی فضا میں یہ ارشاد ربانی عملاً جلوہ گر نظر آ رہا تھا:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ﴾

’’وہ (اللہ) وہی تو ہے جس نے تمھیں ایک جان (آدم) سے پیدا کیا اور اس سے

---

[1] المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص:43. [2] المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص:45.

اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس سے سکون حاصل کرے۔"[1]

اس طرح اس گھر میں نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کی عملی شکل موجود تھی جو آپ نے تربیت کے سلسلے میں فرمایا تھا:

«مَا مِنْ مَّوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ»

"ہر بچہ فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش کے بعد اس کے والدین اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا ڈالتے ہیں۔"[2]

صحیح تربیت ہی کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی بیٹیاں ایمان لانے اور تصدیق کرنے میں سبقت لے گئیں۔ اس طرح کاشانۂ نبوی کو سب پر فوقیت حاصل ہوگئی۔

ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مانتا ہے اور محمد ﷺ کو اس کا نبی اور رسول تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنی معاشرتی زندگی میں اعلیٰ قدریں اختیار کرنے، شرعی احکام کی بجا آوری اور دینی فرائض پر عمل کے لیے اس مثالی گھرانے کو اپنا آئیڈیل بنائے۔[3]

سنت الٰہیہ سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ قوم کی اصلاح اور تعمیر و ترقی کے لیے، ایک اچھے انسان، اچھے خاندان اور پھر ایک اچھے معاشرے کی تشکیل بنیادی عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسلام نے ایک مسلمان فرد کی تربیت کا خاص اہتمام کیا ہے اور ہر عمل سے پہلے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا ضروری قرار دیا ہے۔ ایک مسلمان فرد کسی بھی معاشرتی تعمیر کے زاویوں کو درست رکھنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اسی طرح ایک خاندان بھی زبردست اہمیت کا حامل ہوتا ہے جس میں افراد تیار کیے جاتے ہیں۔ پیدائش سے موت تک ساری زندگی ایک شخص خاندان کی حفاظت و نگرانی میں رہتا

---

[1] الأعراف 189:7. [2] صحيح البخاري، حديث: 1358، وصحيح مسلم، حديث: 2658.

[3] المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص:46.

ہے اور یہ پہلی تربیت گاہ ہے جہاں کردار سازی ہوتی ہے، جہاں فرد کو اخلاق کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے اور جہاں اس کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ اس طرح خاندان فرد اور معاشرے کے درمیان ایک پُل اور واسطے کا کام دیتا ہے۔ اگر واسطہ درست اور مضبوط ہوگا تو اس کی دونوں اطراف، یعنی فرد اور معاشرہ بھی درست اور مضبوط ہوں گے۔[1]

دعوت اسلامیہ کی تحریک کے آغاز ہی سے خاندان کی اصلاح کا اہتمام نمایاں تھا۔ تقدیر الٰہی کا فیصلہ بھی تھا کہ قبول اسلام میں ایک خاتون (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا) سب سے سبقت لے جائے۔ اس طرح اسلام میں عورت کا درجہ بلند ہو اور اسلام کی مضبوط بنیاد بھی خاندان پر رکھی جائے۔

ایک بچے (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کے قبول اسلام میں سبقت لے جانے میں اس جانب اشارہ تھا کہ قوم کے نونہالوں کے لیے جو کلیاں ہوتے ہیں، دعوت دین کی ضرورت ہے۔ اور نئی نسل کی تربیت کا خاص اہتمام کرنا چاہیے تاکہ وہ صحیح مراحل سے گزر کر اسلامی معاشرہ، اسلامی حکومت اور اسلامی ثقافت کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کر سکے۔[2]

اسلامی دعوت کے نقطۂ آغاز پر ایک خاتون سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا، ایک آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما، ایک بچے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور خاندان نبوت کے بقیہ افراد کے سامنے دعوت پیش کرنا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ یہ دعوت سب کے لیے ہے۔ چاہے کوئی چھوٹا ہو یا بڑا، مرد ہو یا عورت، آقا ہو یا غلام، یہ سب معاشرے کا حصہ ہیں اور اپنے وقت پر ان سب کو معاشرے کی تعمیر، حکومت کے قیام اور ثقافتِ اسلامیہ کی ترویج کے لیے اپنا کردار ادا کرنا ہے۔[3]

---

[1] دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 208. [2] الأخوات المسلمات وبناء الأسرة القرآنية لمحمود جوهري، ص: 7. [3] دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 208.

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

شرفاء اور معزز مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے۔ بعثت سے قبل بھی وہ آپ ﷺ کے نہایت قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ انھی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں نے جسے بھی اسلام کی دعوت دی، اس نے تردد کا اظہار یا توقف کیا یا اسے سمجھنے میں ٹھوکر کھائی، سوائے ابوبکر کے۔ میں نے جونہی انھیں دعوت دی، انھوں نے بلا تأمل قبول کر لیا۔[1]

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھی بھی ہیں اور آپ ﷺ کے حسنات میں ایک بہترین عطیہ بھی ہیں۔ آپ کا قبول اسلام کسی ایک فرد کا اسلام لانا نہ تھا بلکہ قوم کا اسلام قبول کرنا تھا، جیسا کہ ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے۔

- ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ قریش میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔
- آپ بڑے نرم مزاج اور اپنی قوم میں نہایت ہر دل عزیز اور محبوب شخصیت کے مالک تھے۔
- آپ پوری قوم قریش میں لوگوں کا حسب نسب سب سے بہتر جانتے تھے اور قریش کے نسب کی خوبیوں اور خامیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔
- آپ اعلیٰ اخلاق کے مالک اور سخاوت کرنے والے تاجر تھے۔
- آپ کی قوم کے لوگ آپ کے علم و نظر، تجارت اور حسن کردار کی وجہ سے آپ سے محبت کرتے تھے اور کثرت سے آپ کے پاس آیا کرتے تھے۔[2]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک بہت بڑی متاع تھے جو اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو مرحمت فرمائی۔ فیاضی اور دریا دلی ایک ایسا وصف ہے جو لوگوں کی محبت حاصل کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ وصف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بڑی فیاضی سے عطا کیا تھا، اس لیے

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 164/2. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 371/1.

ابوبکر ؓ قریش کی ایک محبوب شخصیت تھے۔ ابوبکر ؓ لوگوں سے اور لوگ ابوبکر ؓ سے محبت کرتے تھے۔ ابوبکر ؓ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ”میری امت کے لیے میری امت کی سب سے زیادہ مشفق و مہربان شخصیت ابوبکر ؓ ہیں۔“ [1]

عربوں کے ہاں علم انساب اور علم تاریخ بہت اہم علوم مانے جاتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ ان دونوں علوم کے جید عالم تھے۔ قریش بھی اس بات کے معترف تھے کہ ابوبکر صدیق ؓ قریش کے نسب اور ان کی تاریخ کو اس کے روشن دور اور تاریک ابواب سمیت سب سے بہتر جانتے ہیں۔ علم و ثقافت کے رسیا حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے پاس بیٹھنے کے لیے کوشاں رہتے تھے تاکہ ان سے وہ علم حاصل کریں جو اس قدر فراوانی، گہرائی اور وسعت کے ساتھ کسی اور جگہ نہیں مل سکتا، اس لیے دانش مند اور بیدار مغز نوجوان ہمیشہ آپ کی مجالس کی جستجو میں رہتے تھے۔ یہ فکری اور علمی لحاظ سے ممتاز لوگ تھے جو جناب ابوبکر صدیق ؓ سے ان علوم کے طلب گار رہتے تھے۔ یہ علمی وجاہت اور مقبولیت بھی جناب ابوبکر صدیق ؓ کی عظمت کو اجاگر کرتی ہے۔

مکہ میں محنت مزدوری کرنے والا طبقہ بھی موجود تھا اور مالدار طبقہ بھی۔ یہ سبھی حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی مجلس میں شرکت کے خواہش مند رہتے تھے۔ آپ مکہ کے بڑے تاجر تو نہ تھے لیکن مشہور تاجروں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔

ضرورت مند لوگ بھی آپ کے پاس کثرت سے آتے تھے۔ آپ اپنے گھر آنے والوں کا نہایت خوش دلی سے پُر تپاک استقبال کرتے تھے۔ آپ بڑے مہمان نواز اور نرم طبیعت کے مالک تھے۔ مہمانوں کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے اور ان سے محبت بھرا سلوک کرتے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے ہاں مکی معاشرے کے ہر طبقے کی دلچسپی کا سامان موجود تھا۔ [2]

---

[1] جامع الترمذي، حديث:3791,3790، وسنن ابن ماجه، حديث: 154، ومسند أحمد: 184/3 و 281. علامہ البانی ؒ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، دیکھیے: (السلسلة الصحيحة: 298/3، وصحيح سنن الترمذي، حديث: 3790)

[2] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 115/1.

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی دعوت: مکی معاشرے میں آپ کے پاس بڑا وسیع اور متنوع سماجی، علمی اور ادبی سرمایہ تھا، اس لیے جب آپ اسلام کی دعوت کے لیے متحرک ہوئے تو اچھے اور ممتاز لوگوں کی ایک جماعت نے آپ کی دعوت فوراً قبول کر لی۔ ان لوگوں کے نام درج ذیل ہیں:

① حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، قبول اسلام کے وقت عمر 34 سال۔

② حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، قبول اسلام کے وقت عمر 30 سال۔

③ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، قبول اسلام کے وقت عمر 17 سال۔

④ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ، قبول اسلام کے وقت عمر 12 سال۔

⑤ حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ، قبول اسلام کے وقت عمر 13 سال۔[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی محنت کا سب سے پہلا ثمر یہی پانچ جوان تھے۔ آپ نے انھیں اسلام کی دعوت دی جو انھوں نے فوراً قبول کر لی۔ وہ ایک ایک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے سامنے یہ لوگ ایمان لائے۔

یہ وہ ابتدائی ستون تھے جن پر دعوت دین کی عمارت استوار ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کو مضبوط بنانے والا یہ پہلا سامان رسد تھا۔ انھی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت فرمائی اور انھیں طاقت بہم پہنچائی، پھر کیا مرد اور کیا عورتیں، سب کے سب فوج در فوج اللہ کا دین قبول کرنے لگے۔ اس ہراول دستے کا ہر فرد اسلام کا داعی تھا۔ کم تعداد میں ہونے کے باوجود انھوں نے رسالت کی حفاظت کی اور ایک عظیم لشکر کی طرح دعوت کا کام کیا۔ اس میدان میں کوئی ان سے آگے نہ بڑھ سکا نہ ان جیسا کردار ادا کر سکا۔ تاریخ اسلام میں ان جیسی کوئی نظیر نہیں ملتی۔[2]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت الی اللہ میں سرگرمی اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہے

---

[1] التربیة القیادیة للدکتور الغضبان: 116/1. [2] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 533/1.

کہ دین حق پر ایمان کیسے لایا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی بجا آوری کیسے کی جاتی ہے اور ایک مومن کا طرزِ عمل کیسا ہوتا ہے۔ اسے ایک لمحہ کے لیے بھی چین اور سکون نہیں ملتا۔ جس سچائی پر وہ ایمان لایا ہے جب تک وہ اس کی حقانیت کو دنیا کے روبرو ثابت نہیں کر دیتا، آرام سے نہیں بیٹھتا، اس کی یہ تگ و دو کوئی جذباتی نہیں ہوتی نہ یہ عارضی اور جلد ختم ہونے والی ہوتی ہے کہ جھاگ کی طرح بیٹھ جائے یا کوئلے کی طرح راکھ ہو جائے۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا دینی جذبہ اور سرگرمی و مستعدی ان کے آخری سانس تک باقی رہی۔ اس میں کوئی کمی، کمزوری یا اکتاہٹ پیدا نہیں ہوئی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دعوت کا حامی بنانے کے لیے صاحب حیثیت لوگوں کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی نشر و اشاعت میں دوسروں کی نسبت حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے اثرات زیادہ وسیع اور دور رس تھے۔[1]

قبولِ اسلام سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو تعلق تھا، وہ ذاتی اور طبعی میلان کی وجہ سے تھا۔ یہ لگاؤ نئے سرے سے ایک اللہ پر ایمان اور مصائب میں ایک دوسرے کے دست و بازو بننے کی بنیاد پر استوار ہوا۔ رسول اللہ ﷺ تمام اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ ﷺ کا درجہ بہت بلند تھا اور عوام الناس میں بھی آپ ایک خاص مرتبے کے حامل تھے، تاہم آپ ﷺ کی دعوتی جدوجہد کو حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے ایمان لانے سے بڑی تقویت حاصل ہوئی کیونکہ وہ عوام الناس میں خاصے مقبول تھے اور سبھی انھیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔[2]

اہل ایمان کی ایک ایسی جماعت تیار کرنے کے لیے جو مملکت اسلامیہ کے قیام کے لیے جدوجہد کر سکے، لوگوں کو اپنے معبود حقیقی کے دین کی دعوت دے سکے اور ایک بے مثال

---

[1] الوحي وتبليغ الرسالة للدكتور يحيىٰ اليحيٰ، ص: 62. [2] خاتم النبيين لأبي زهرة، ص: 298.

اسلامی معاشرہ وجود میں لا سکے، اس مقصد کے لیے قابل ترین شخصیات کا انتخاب کر کے انھیں انفرادی طور پر راز داری کے ساتھ دعوت دینے کا کام جاری رہا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا دوسرا گروہ

پہلے گروہ کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد صحابۂ کرام کا جو دوسرا گروہ تیار ہوا، اس میں اسلام قبول کرنے والی شخصیات کے نام یہ ہیں:

① ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ۔

② ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسد بن مخزوم بن مُرّہ رضی اللہ عنہ۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی ہیں اور آپ کی پھوپھی (برۃ بنت عبدالمطلب) کے صاحبزادے ہیں۔

③ ارقم بن ابی الارقم مخزومی رضی اللہ عنہ۔

④ عثمان بن مظعون اَلْجُمَحِی رضی اللہ عنہ۔

⑤ عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ۔

⑥ سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ۔

⑦ قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ۔

⑧ عبداللہ بن مظعون رضی اللہ عنہ۔

⑨ فاطمہ بنت خطاب بن نفیل رضی اللہ عنہا۔ یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بہن اور سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ ہیں۔

⑩ اسماء بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما۔

⑪ خباب بن اَرت رضی اللہ عنہ، یہ بنوزہرہ کے حلیف تھے۔

⑫ عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما۔[1]

---

[1] دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 212.

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا تیسرا گروہ

تیسرے گروہ میں مشرف بہ اسلام ہونے والی پاکیزہ ہستیوں کے نام یہ ہیں:

① عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔ یہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں۔

② عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

③ مسعود بن القاری رضی اللہ عنہ۔ انھیں مسعود بن ربیعہ بن عمرو بھی کہا جاتا ہے۔

④ سلیط بن عمرو رضی اللہ عنہ۔

⑤ حاطب بن عمرو رضی اللہ عنہ۔ یہ سلیط کے بھائی ہیں۔

⑥ عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ۔

⑦ اسماء بنت سلامہ رضی اللہ عنہا۔ یہ عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ ہیں۔

⑧ خنیس بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ۔

⑨ عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ۔ یہ آل خطاب کے حلیف تھے۔

⑩ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ۔

⑪ ابواحمد بن جحش رضی اللہ عنہ۔

⑫ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

⑬ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا۔ یہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ ہیں۔

⑭ حاطب بن حارث رضی اللہ عنہ۔

⑮ فاطمہ بنت مجلّل رضی اللہ عنہا۔ یہ حاطب بن حارث رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ ہیں۔

⑯ حطاب بن حارث رضی اللہ عنہ۔ یہ حاطب بن حارث رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں۔

⑰ فکیہہ بنت یسار رضی اللہ عنہا۔ یہ حطاب بن حارث رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ہیں۔

⑱ معمر بن حارث رضی اللہ عنہ۔ یہ حاطب اور حطاب رضی اللہ عنہما کے بھائی ہیں۔

⑲ سائب بن عثمان بن مَظْعُون رضی اللہ عنہ۔

⑳ مُطَّلب بن ازہر رضی اللہ عنہ۔

㉑ رَمْلَہ بنت ابی عوف رضی اللہ عنہا۔ یہ مطلب بن ازہر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ہیں۔

㉒ نَحّام بن عبداللہ بن اُسید رضی اللہ عنہ۔

㉓ عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ۔ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔

㉔ فہیرہ رضی اللہ عنہ۔ یہ عامر رضی اللہ عنہ کے والد ہیں۔ یہ طُفیل بن حارث کے غلام تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انھیں خرید کر آزاد کر دیا۔

㉕ خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ۔

㉖ اُمَینہ بنت خلف رضی اللہ عنہا جو خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ ہیں۔

㉗ ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس رضی اللہ عنہ۔

㉘ واقد بن عبداللہ بن عبد مناف رضی اللہ عنہ۔

㉙ خالد بن بُکیر بن عبد یالیل رضی اللہ عنہ۔

㉚ عامر بن بکیر بن عبد یالیل رضی اللہ عنہ۔

㉛ عاقل بن بکیر بن عبد یالیل رضی اللہ عنہ۔

㉜ ایاس بن بکیر بن عبد یالیل رضی اللہ عنہ۔

㉝ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ۔ یہ بنو مخزوم بن یقظہ کے حلیف تھے۔ ابن ہشام نے ان کی نسبت عنسی اور ان کا تعلق مذحج سے بیان کیا ہے۔

㉞ صُہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ۔

㉟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ۔

(36) حضرت انیس غفاری رضی اللہ عنہ۔

(37) اُم ابوذر و انیس غفاری رضی اللہ عنہم۔

㊳ حضرت بلال بن رباح حبشی رضی اللہ عنہ۔[1]

اسلام کے اس ہراول دستے کا تعلق قریش کے تمام قبائل سے ہے۔ ابن ہشام نے ان کی تعداد چالیس سے زیادہ بیان کی ہے۔[2]

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اس کے بعد لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے ان میں مرد و زن سبھی شامل تھے اور مکہ میں اسلام کا تذکرہ زبان زد عام ہوگیا۔[3]

مذکورہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام کا یہ ہراول دستہ جسے سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا یہ اپنی قوم کے بہترین لوگ تھے۔ یہ گھٹیا اور ادنیٰ درجے کے افراد نہ تھے جیسا کہ بعض دشمنان اسلام نے انھیں کمتر لوگوں کی صورت میں پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کی اکثریت غلاموں کی تھی جنھوں نے آزادی کے حصول کے لیے اسلام کا لبادہ پہن لیا تھا۔

بعض سیرت نگاروں نے بھی اسلام کے اس ہراول دستے (سابقین اسلام) کے بارے میں بحث کرتے ہوئے اس حقیقت سے پہلو تہی کی ہے۔ ایک سیرت نگار رقمطراز ہیں کہ سیرت ہمیں بتاتی ہے کہ اس مرحلے میں جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے ان کی اکثریت تنگ دست، کمزور اور غلاموں پر مشتمل تھی۔ اس میں کیا حکمت تھی؟[4]

بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ آغاز اسلام سے تین سال تک دعوت کے نتیجے میں چالیس خواتین و حضرات مسلمان ہوئے جن میں اکثر کمزور، پسے ہوئے، تنگ دست، غلام یا آزاد کردہ غلام تھے اور اس ہراول دستے میں مختلف عجمی لوگ شامل تھے، جیسے صہیب رومی اور بلال حبشی رضی اللہ عنہما وغیرہ۔[5]

بعض نے لکھا ہے کہ نبی ﷺ پر کمزور قسم کے مرد، عورتیں اور آزاد کردہ لوگ ایمان لائے۔[6]

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 287/1.

[2] السيرة النبوية لابن هشام: 245/1-262.

[3] السيرة النبوية لابن هشام: 262/1.

[4] فقه السيرة للبوطي، ص: 77.

[5] فقه السيرة للبوطي، ص: 79.

[6] حدائق الأنوار ومطالع الأسرار لابن الديبع الشيباني: 301/1.

اگر بنظرِ عمیق دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ فقراء، کمزور، آزاد کردہ غلام یا عجمی کہہ کر جن لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ صرف تیرہ افراد ہیں۔ اور اس زمانے میں اسلام قبول کرنے والے گروہ میں اس تعداد کو اکثریت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ حقیقت میں اس تعداد کا پانچواں حصہ ہے۔[1]

اس وقت جو لوگ مسلمان ہوئے تھے ان کے قبول اسلام کا سبب کوئی دنیاوی غرض نہیں تھی بلکہ وہ انشراح صدر کے ساتھ حق کو پہچان کر اس پر ایمان لائے تھے اور پیغمبر حق کے دست و بازو بنے تھے اور اس جذبۂ حق پرستی میں وہ سب لوگ یکساں تھے چاہے امیر ہوں یا غریب، آزاد ہوں یا غلام۔ حضرت ابوبکر صدیق، بلال، عثمان، صہیب رومی رضی اللہ عنہم، سب اس معاملے میں برابر تھے۔[2]

فضیلۃ الاستاذ صالح شامی فرماتے ہیں: ”ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم اولین اسلام لانے والے کمزور قسم کے لوگوں اور غلاموں کا انکار کریں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ اور یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس قسم کے لوگوں کی اکثریت تھی تو پھر اسلام کی دعوت ایک طبقاتی جنگ کا منظر پیش کرے گی جس میں عام تحریکوں کی طرح کمزور اور پسے ہوئے لوگوں کے دلوں میں طاقتور طبقے کے خلاف نفرت پیدا کر کے انھیں ان کے مدمقابل کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ یہ چیز تو کسی مسلمان کے تصور میں بھی نہیں تھی۔ جتنے لوگ بھی اسلام میں داخل ہوئے ان سب نے ایک اللہ کی بندگی اختیار کرتے ہوئے ایک دوسرے کو بھائی بھائی سمجھا۔

یہ تو اس دعوت کے حق ہونے کی بڑی مستند دلیل ہے کہ آغاز ہی میں ان لوگوں کی اکثریت نے اسے قبول کیا جو اپنی قوم کے بہترین افراد تھے اور انھوں نے اس عقیدے کی خاطر طرح طرح کی شدید تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کیں اور ایسا اہانت آمیز سلوک

---

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص:39,38. [2] من معين السيرة لصالح الشامي، ص:40.

برداشت کیا جو کبھی ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آیا تھا۔‘‘ [1]

اسلام کی نسبت تو ایسی پاکیزہ ہستیوں، روشن عقلوں اور شفاف دلوں کی جانب ہے، جنھیں اللہ رب العزت نے اسی مقصد کے لیے وجود بخشا تھا۔ ان جلیل القدر ہستیوں کے نام یہ ہیں: حضرت خدیجہ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمٰن، حضرت طلحہ، حضرت ابوعبیدہ، حضرت ابوسلمہ، حضرت ارقم، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت سعید بن زید، حضرت عبداللہ بن جحش، حضرت جعفر طیار، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت فاطمہ بنت خطاب، حضرت خالد بن سعید، حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہم اور ان جیسی دوسری کئی شخصیات ہیں جنھیں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے اور مسلمانوں کا ہراول دستہ بننے کا اعزاز حاصل ہوا اور یہ سب کے سب اپنی اپنی قوم کے معزز اور باوقار افراد تھے۔ [2]

---

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 40. [2] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 40،

ملحوظہ: شروع شروع میں کس قسم کے لوگ ایمان لائے تھے۔ اس ضمن میں مؤلف نے ایک اہم دلیل کا ذکر نہیں کیا۔ وہ یہ ہے کہ شاہ روم ہرقل نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ، جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، سے ایک یہ سوال بھی کیا تھا: «فَأَشْرَافُ النَّاسِ يَتَّبِعُونَهُ أَمْ ضُعَفَائُهُمْ؟» ’’امیر کبیر اور وڈیرے لوگ ان کی اتباع کرتے ہیں یا غریب مسکین؟‘‘ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کمزور لوگ۔ ہرقل اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہنے لگا: ’’انبیائے کرام علیہم السلام کے پیروکار ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔‘‘ (صحيح البخاري، حديث: 7) ایک روایت میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے جواب کی وضاحت خود ہرقل کی زبانی اس طرح منقول ہے: «فَزَعَمْتَ أَنَّهُمُ الْأَحْدَاثُ وَالْمَسَاكِينُ وَالضُّعَفَاءُ وَكَذٰلِكَ أَتْبَاعُ الْأَنْبِيَاءِ فِي كُلِّ زَمَانٍ» ’’تمھارا خیال ہے کہ آپ کی اتباع کرنے والے نوعمر، مسکین، غریب اور ناتواں قسم کے لوگ ہیں۔ اور انبیائے کرام کے پیروکار ہر زمانے میں ایسے ہی ہوتے ہیں۔‘‘ (دلائل النبوة للبيهقي: 383/4) ایک اور روایت میں ہرقل کا سوال اس طرح بھی منقول ہے: «أَضُعَفَائُهُمْ أَمْ أَشِدَّائُهُمْ؟» ’’ان میں سے کمزور لوگ آپ کی اتباع کرتے ہیں یا سرکردہ اور طاقت ور لوگ؟‘‘ (المصنف لعبدالرزاق: 345/5 و 9724) دراصل ہرقل کا یہ تبصرہ قرآن مجید کی حسب ذیل آیات کی عکاسی کرتا ہے: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ ﴾ ’’اور ہم نے کسی بھی بستی میں کوئی متنبہ کرنے والا بھیجا تو وہاں کے خوشحال متکبر لوگوں نے یہی کہا کہ تم جو دے کر بھیجے گئے ہو ہم اسے نہیں مانتے۔‘‘ (سبا 34:34) اور نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کے سرداروں نے کہا: ◂◂

یہی مسلمانوں کا وہ ہراول دستہ ہے جو نبی کریم ﷺ کی دعوت پر سب سے پہلے ایمان لایا اور ان کی تصدیق کی۔

دعوت وتبلیغ کا تسلسل

نبی کریم ﷺ نے نہایت خفیہ انداز میں دعوت وتبلیغ کی مہم جاری رکھی اور اپنے خاندان اور حلقۂ احباب میں سے ایسے افراد کو جمع کرتے رہے جو آپ کے فرماں بردار بھی ہوں اور مددگار بھی، نیز ان کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد دعوت وتبلیغ کی راز داری بھی برقرار رہے۔ بعد میں یہی لوگ رسول اکرم ﷺ کے قابل اعتماد معاون بنے اور انھوں نے چپکے چپکے دعوت کا حلقہ وسیع کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوتی زندگی میں یہ ایک مشکل ترین مرحلہ تھا۔ آپ ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والوں کو اس مرحلے میں دعوتی سرگرمیوں کے سلسلے میں شدید تکالیف اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ دعوت صرف انھی لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی تھی جو قابل اعتماد ہوں اور ان سے کسی ضرر یا خرابی کا اندیشہ نہ ہو۔ اس وجہ سے دعوتی عمل کی رفتار دھیمی اور محتاط رہی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دعوت کے تقاضوں کی معرفت کا حصول اور ان کی انجام دہی ایک دشوار گزار عمل تھا۔ اس دعوت کو قبول کرنے والے سے پہلا تقاضا ادائیگی نماز اور حسب

» ﴿ وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا ﴾ ''اور ہم تجھے نہیں دیکھتے کہ ان لوگوں کے سوا کسی نے تیری پیروی کی ہو جو ہم میں سے گھٹیا ہیں۔'' (ھود 27:11) ان سب دلائل کو سامنے رکھیں تو یہی بات سمجھ آتی ہے کہ جن سیرت نگاروں نے شروع شروع میں اسلام لانے والی اکثریت کے کمزور اور ناتواں ہونے کا بتایا ہے وہ اس حساب سے ہے کہ وہ مالدار اور سردار قسم کے لوگ نہیں تھے اور واقعتاً ایسا ہی تھا۔ سردار قسم کے لوگ تو بدر میں جہنم واصل ہوئے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بسا اوقات غریب لوگ بھی خاندانی عزت، وقار اور شرف میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ مؤلف نے جن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا ہے ان کی اکثریت اسی نوعیت کی تھی۔ لہٰذا اس صورت میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ اور اگر مؤلف کے نتیجے کو تسلیم کر لیں کہ کمزور فقراء اور آزاد کردہ غلام کل تعداد کا پانچواں حصہ تھے تو اس صورت میں مذکورہ دلائل سے تضاد لازم آتا ہے۔ واللہ أعلم (ن۔ف)

استطاعت فہم قرآن کا ہوتا تھا۔ لیکن وہ علانیہ نماز ادا کرسکتا تھا نہ تلاوت قرآن، اس لیے مسلمان وادیوں اور گھاٹیوں میں چھپ کر نماز ادا کرتے تھے۔ [1]

سلامتی کی تدابیر

دعوت دین کے اس مرحلے کا امتیازی نشان اخفا اور راز داری تھا۔ اپنے قریبی عزیزوں سے بھی یہ کام مخفی رکھا جاتا تھا۔ راز داری برقرار رکھنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ہدایات بہت واضح اور قطعی تھیں۔ آپ ﷺ نے اسلام قبول کرنے والوں کے متعدد حلقے بنا دیے تھے۔ یہ حلقے مخفی طور پر اپنی تیاری اور تربیت کے مراحل طے کررہے تھے۔ ان حلقوں کا خود کو مخفی رکھنا کسی بزدلی یا گریز کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس لائحہ عمل ہی کا ایک حصہ تھا جو رب العزت نے ودیعت فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے صحابۂ کرام کو چھوٹے چھوٹے حلقوں کی صورت میں منظّم فرمایا۔ نئے مسلمان ہونے والے ایک دو افراد کو ایک ایسے شخص کی کفالت میں دے دیا جاتا جو طاقتور بھی ہوتا تھا اور صاحب استطاعت بھی۔ وہ اسی کے پاس رہتے اور وہی ان کے کھانے پینے کی ضروریات کا اہتمام کرتا تھا۔ جس نے قرآن حکیم کا نازل شدہ حصہ یاد کیا ہوتا، وہ دوسروں کو یاد کرا دیتا تھا۔ اس طرح یہ علمی حلقے تشکیل پاتے جو علمی حلقے ہونے کے ساتھ ساتھ اخوت ومحبت کے گہوارے بھی تھے۔

قرآن حکیم ہی رسول اللہ ﷺ کا وہ منہج تھا جس کی اساس پر آپ نے صحابۂ کرام کی تربیت فرمائی۔ آپ کی تربیت نہایت جامع اور ہمہ جہت تھی۔ آپ ﷺ نے ان کے عقائد درست کیے، عبادات کا طریقہ بتایا۔ اخلاق حسنہ کا سلیقہ سکھایا اور انھیں سلامتی کا راستہ اختیار کرنے کی ترغیب دی، اس لیے کہ قومی ترقی کے اہم عوامل میں سے یہ بھی ہے کہ قوم کے ہر فرد میں اپنی حفاظت اور سلامتی کا احساس بیدار ہو، خاص طور پر اس ہراول دستے کے افراد میں جو اسلام کا پاسبان بھی ہو اور انسانی دنیا میں اس دین قیم کے غلبے کے

---

[1] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة.

لیے جدو جہد بھی کر رہا ہو، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مکی دور میں تربیت اسی اساس پر ہوئی۔ جوں جوں دعوت وتبلیغ کا عمل وسیع ہوتا گیا اپنے تحفظ وسلامتی کا احساس بھی بڑھتا گیا۔ اسی راہ عمل میں دعوت کی کامیابی کے ساتھ اسلامی حکومت وجود میں آگئی۔

مکی دور میں نازل ہونے والی آیات بھی اس حقیقت کی طرف رہنمائی فرماتی ہیں:

﴿ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾

"اے میرے بیٹو! تم جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کو ڈھونڈو اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، بے شک اللہ کی رحمت سے تو کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔"[1]

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی کی تلاش کے سلسلے میں معلومات اکٹھی کریں اور انھیں تلاش کریں۔ اللہ کا ایک نبی دوسروں سے اطلاعات حاصل کرنے کی اہمیت واضح کر رہا ہے۔ معلومات حاصل کرنا فن سراغ رسانی کے بنیادی امور میں سے ہے۔ اور فرمان الٰہی: ﴿ وَلَا تَايْـَٔسُوْا ﴾ "اور مایوس نہ ہونا" حصول معلومات کی اہمیت کو اجاگر کر رہا ہے۔[2]

اسی لیے صحابۂ کرام سب سے پہلے اس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے جسے دین کی دعوت دینا مقصود ہوتا تھا اور اعلیٰ قیادت ان امور کی نگرانی کرتی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے اس مقصد کے لیے امن وسلامتی کا ایک اعلیٰ نظام ترتیب دیا تھا جس سے قیادت اور دعوتی مراکز کے باہمی تعلق کی نگرانی ہوتی تھی تاکہ راز داری برقرار رہے۔

قرآن حکیم کی مکی آیات میں یہ ارشاد ربانی بھی موجود ہے:

﴿ وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۡ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓي اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ۝﴾

---

[1] يوسف 87:12. [2] الاستخبارات العسكرية في الإسلام لعبدالله علي السلامة، ص: 105.

''اور موسیٰ کی ماں نے اس (موسیٰ) کی بہن سے کہا: تو اس کے پیچھے پیچھے جا، پھر وہ (گئی تو) اسے دور سے دیکھتی رہی، جبکہ وہ (فرعونی) بے خبر تھے۔ اور ہم نے موسیٰ پر دائیوں (کے دودھ) کو پہلے ہی سے حرام کر دیا تھا، پھر موسیٰ کی بہن نے کہا: کیا میں تمھیں ایک گھر والے کا بتاؤں جو تمھارے لیے اس کی پرورش کریں اور وہ اس کے خیر خواہ بھی ہوں؟''[1]

مذکورہ دونوں آیات سے ہمیں درج ذیل امور کی رہنمائی ملتی ہے:

① حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ اپنے بیٹے کی حفاظت کے لیے اس کے بارے میں حصول معلومات کے ذرائع بروئے کار لاتی رہیں۔ ﴿وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ﴾ میں ''قصّ'' کے معنی ہوتے ہیں نشانات وعلامات کا پیچھا کرتے ہوئے معلومات جمع کرنا۔

② حصول معلومات کے لیے اس شخصیت کا انتخاب کیا گیا جو قابل اعتماد بھی تھی اور خود بھی حصول معلومات میں دلچسپی رکھتی تھی تاکہ حاصل ہونے والی معلومات صحیح اور قابل اعتماد ہوں۔ اور یہ سارا کام دلچسپی اور شوق کے ساتھ کیا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے حضرت موسیٰ کی بہن کے سوا کسی اور شخصیت کا انتخاب نہیں کیا کیونکہ بہن اس مقصد کے لیے دلچسپی بھی رکھتی ہے اور قابل اعتماد بھی ہوتی ہے۔ اور اپنی ذات سے بالاتر ہو کر ہر قسم کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے، لہٰذا یہ نہایت اہم بات ہے کہ حصول معلومات کے لیے جس شخصیت کو بھیجا جائے وہ اپنی ذات کی فکر کیے بغیر دلچسپی اور شوق و ولولے کے ساتھ اپنا مقصد حاصل کرے۔

③ اپنے ہدف کا پیچھا اس انداز میں کیا جائے کہ نہ کسی کی نظروں میں آیا جائے اور نہ کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جس پر دیکھنے والوں کو شک گزرے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اپنی بیٹی سے یہی کہا تھا کہ وہ خبردار رہے اور کسی کی نگاہ میں نہ آئے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ دور

---

[1] القصص 28:11،12.

ہی دور سے اپنے بھائی کو دیکھتی رہی اور کسی دیکھنے والے کو گمان تک نہ گزرا کہ یہ لڑکی کسی خاص مقصد سے آ رہی ہے۔

④ حصول معلومات کے لیے انتہائی گہری نگاہ، بہت ہوشیاری اور دانائی سے کام لینا چاہیے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کیا۔

⑤ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے سراغ رسانی کا جدید طریقہ اختیار کیا۔ یہ طریق کار اپنے موقف کے مطابق ذہن سازی کرنے یا رائے عامہ ہموار کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے جب دیکھا کہ دودھ پلانے والی عورتیں اس بچے (موسیٰ علیہ السلام) کو دودھ پلانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں تو ان سے (ہمدردی کے انداز میں) کہا:

﴿هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰٓ أَهْلِ بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُۥ لَكُمْ وَهُمْ لَهُۥ نَٰصِحُونَ ۝﴾

> ”کیا میں تمھیں ایک گھر والے بتاؤں جو تمھارے لیے اس کی پرورش کریں اور وہ اس کے خیر خواہ بھی ہوں؟“ [1]

⑥ حصول معلومات کے ساتھ ساتھ اپنا مقصد حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے ان کا ٹھکانا معلوم کر کے اپنی ماں تک صرف اس کی اطلاع نہیں پہنچائی بلکہ اس نے تمام معلومات اکٹھی کیں، موسیٰ علیہ السلام تک رسائی حاصل کی اور انھیں اپنی ماں کی گود تک واپس لانے کی بھرپور کوشش کی جس میں وہ کامیاب بھی رہی۔ [2]

ان آیات سے صحابۂ کرام میں تحفظ و سلامتی کا جذبہ بیدار ہو گیا اور انھوں نے اپنے دعوتی کام میں احتیاط کا پہلو ہر آن ملحوظ خاطر رکھا۔ افراد کی تربیت کا زمانہ ہو یا قیامِ حکومت کے بعد کا دور، سیرت نبوی میں ایسی تدابیر بکثرت موجود ہیں جو اپنی حفاظت اور سلامتی کے لیے ضروری ہیں۔ اس لیے عہد حاضر میں اسلامی تحریکوں اور مسلمان حکومتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ امن و سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے تمام جدید وسائل بروئے کار لائیں

---

[1] القصص 12:28. [2] الاستخبارات العسكرية في الإسلام لعبد الله علي السلامة، ص: 111-113.

بلکہ اس مقصد کے لیے مطلوب آلات تیار کریں تاکہ یہود ونصاریٰ اور بے دین لوگوں کے مذموم ارادوں سے اسلام اور مسلمانوں کو محفوظ رکھا جا سکے۔ امت میں انتشار پیدا کرنے والی اسلام دشمن سازشوں کا مقابلہ کرکے وحدت اُمّت کو مضبوط کیا جا سکے اور اسلام دشمن طاقتوں کی معاندانہ کارروائیوں کی نگرانی کی جا سکے۔ امن وسلامتی کے ضامن ان آلات سے جو معلومات حاصل ہوں گی وہ اسلامی قیادت کے لیے نہایت مفید ہوں گی۔ لیکن ضروری ہے کہ پوری دنیا پر نگاہ رکھنے اور معلومات حاصل کرنے کے لیے جو ادارے قائم کیے جائیں اور جو آلات تیار کیے جائیں وہ قرآن وسنت کی ہدایات کے مطابق ہوں۔ ان اداروں میں کام کرنے والے لوگ اعلیٰ اخلاق واوصاف کے مالک ہوں۔ اور ان میں امن پسند مسلمانوں کی صفات نمایاں ہوں۔

اگر مسلمان اس بات کا اہتمام کرلیں تو دشمنوں کی بہت سی غیر متوقع کارروائیوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے کیونکہ اگر آپ دشمن کے داخلی حالات سے آگاہ ہوں اور آپ کو اپنی صلاحیتوں کا بھی ادراک ہو تو پھر چاہے سینکڑوں معرکے ہو جائیں آپ کو کوئی خوف دامن گیر نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس اگر آپ اپنی صلاحیتوں اور طاقت کا ادراک رکھتے ہوں مگر دشمن کی قوت اور اس کے داخلی حالات سے بے خبر ہوں تو پھر ہر معرکے میں شکست آپ کا مقدر بن سکتی ہے۔[1]

ایسے ادارے قائم کرنا اور وہ آلات تیار کرنا جو قیادت کو معلومات پر مبنی رپورٹیں مہیا کریں اور جن کی روشنی میں قیادت مستقبل کی منصوبہ بندی کر سکے، کوئی انوکھی بات نہیں بلکہ یہ تاریخ انسانیت کا ایک اہم باب ہے جو عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے زمانے سے اب تک مسلمانوں کی تاریخ کا بھی حصہ رہا ہے۔

استحکام سلطنت کے اہم اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ مذکورہ انٹیلی جینس

---

[1] الاستخبارات العسكرية في الإسلام لعبد الله علي السلامة، ص: 113.

نظام پر توجہ دی جائے اور موجودہ حالات کے تقاضوں کے مطابق اسے تمام ارتقائی مراحل سے گزار کر نئے اور بہترین اسلوب پر استوار کیا جائے۔[1]

نبی کریم ﷺ صحابۂ کرام کی ہمہ جہت تربیت کی بنفس نفیس نگرانی فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے صحابۂ کرام کے کئی گروپ تشکیل دیے تھے۔ مثلاً حضرت فاطمہ بنت خطاب (جو حضرت عمر ؓ کی بہن تھیں) اور ان کے سرتاج حضرت سعید بن زید جو حضرت عمر کے چچازاد بھائی ہیں[2] انھیں حضرت نعیم بن عبداللہ النّحام کے ساتھ ملا کر حضرت خباب بن ارت ؓ کا شاگرد بنا دیا گیا تھا۔ قرآن حکیم سے ان کا تعلق محض یہ نہ تھا کہ قواعدِ تجوید کے ساتھ اس کی تلاوت کریں یا حروف کو ان کے صحیح مخارج سے ادا کریں یا اس کی بکثرت تلاوت کریں بلکہ ان کا اہم ترین مقصد قرآن کی تعلیم کا صحیح فہم حاصل کرنا تھا تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور عائد کردہ پابندیاں جان کر ان کے مطابق عمل کریں۔[3]

نبی کریم ﷺ ہمیشہ بڑی محکم اور منظّم منصوبہ بندی کرتے اور ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاتے تھے۔ آپ کو کامل یقین تھا کہ ایک دن آپ کو علانیہ دعوت کا حکم ملنے والا ہے۔ دعوت کا یہ مرحلہ نہایت شدید اور صبر آزما ہوگا۔ اور اس مقصد کے لیے ایک منظّم اور قابل اعتماد جماعت کی موجودگی نہایت ضروری ہے۔ ایسی جماعت کی تیاری کے لیے ایک مرکز بھی ناگزیر تھا جہاں تربیت دینے والے پیغمبر ﷺ بنفس نفیس اپنے ساتھیوں سے براہ راست ملاقات کرتے۔ اسلام قبول کرنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے حضرت خدیجہ ؓ کا گھر تنگ پڑ گیا تو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کی نظرِ انتخاب دارِ ارقم بن ابی ارقم پر پڑی۔ رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا مکمل احساس و ادراک تھا کہ معاملات کی راز داری کے لیے

---

[1] فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي، ص:311.

[2] درحقیقت سعید بن زید ؓ حضرت عمر بن خطاب ؓ کے بھتیجے لگتے تھے۔ ان کے والد زید بن عمرو، عمر فاروق ؓ کے چچا زاد بھائی تھے اور ان دونوں کے دادا نفیل تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ عربی محاورے میں چچا کے پوتے کو بھی ابن عم ہی کہتے ہیں۔ (أسد الغابة: 476/2)

[3] الدعوة الإسلامية لعبد الغفار عزيز، ص: 96.

انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے، اس کے ساتھ ساتھ تربیت دینے والے قائد کا اپنے ساتھیوں سے مسلسل رابطہ رکھنا اور ملتے رہنا بھی بے حد ضروری ہے۔ یہ میل ملاقات لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل بھی رہنی چاہیے تھی تاکہ دعوتی اور قائدانہ صلاحیتیں رکھنے والے افراد کی تیاری اور ان کی عملی وفکری رہنمائی کے لیے قائدِ تحریک اور اس کے پیروکاروں کے مابین وقفے وقفے سے ملاقاتوں کا منظّم سلسلہ جاری رہے۔

نبی کریم ﷺ کی طرف سے خفیہ اور مستحکم تنظیم سازی کا اس قدر اہتمام اس کی واضح دلیل ہے کہ آپ ﷺ کا مقصد صرف داعی تیار کرنا نہیں تھا کیونکہ اس کام کے لیے اس قدر اہتمام کی ضرورت نہ تھی۔ آپ ﷺ کا مقصد تو یہ تھا کہ ایسے افراد تیار کیے جائیں جو اسلامی حکومت کے نہ صرف ماہر معمار ثابت ہوں بلکہ دعوت دین کے ابلاغ کی ذمہ داریاں نبھانے اور اقوام عالم کی قیادت کا حق بھی ادا کرسکیں۔

اگر رسالت کا مقصد لوگوں تک محض دعوت پہنچانا ہی ہوتا تو اس کے لیے بہترین جگہ بیت اللہ تھی جہاں سبھی قریش جمع ہوتے اور محفلیں جماتے تھے۔ لیکن مقصد کچھ اور تھا، اسی لیے تنظیم سازی میں مکمل راز داری شرطِ لازم تھی تاکہ وہ جگہ کسی کی نظر میں نہ آئے جہاں نبی ﷺ اپنے ساتھیوں سے ملاقات کرتے ہیں، نہ اس جگہ پہنچنے کا کسی کو علم ہوسکے۔[1]

دارِ اَرقم ایک مرکز قیادت

کتب سیرت میں یہ تذکرہ موجود ہے کہ فریقین (مسلمانوں اور مشرکین مکہ) کے درمیان سب سے پہلے ٹکراؤ، جس میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک مشرک کو زخمی کردیا تھا، کے بعد دار ارقم کو اعلیٰ قیادت کا مرکز بنا لیا گیا تھا۔ ممتاز مؤرخ ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنی قوم کے افراد سے چھپ کر گھاٹیوں میں جا کر نماز ادا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ مکہ کی

---

[1] دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 218.

ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ کچھ مشرکین نے انھیں نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ ان کے مابین تکرار ہوگئی اور نوبت برا بھلا کہنے اور لڑائی جھگڑے تک پہنچی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر ایک مشرک کو اونٹ کی ران کی ہڈی دے ماری جس سے اس کا سر پھٹ گیا۔ یہ پہلا خون تھا جو حق و باطل کی کشمکش میں بہایا گیا۔[1]

دار ارقم دعوت دین کا ایک نیا مرکز بن گیا جس میں مسلمانوں کے اجتماعات ہوتے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہر نئی وحی رسول اللہ ﷺ سے براہ راست سیکھتے تھے۔ آپ ﷺ اللہ کی یاد دلاتے اور تلاوتِ قرآن سے ان کے قلوب و اذہان منور کرتے۔ مسلمان نہایت توجہ سے آپ کے فرمودات سنتے اور اپنے دل کی ہر بات اور درپیش اندیشے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔ یوں نبی ﷺ اپنی نگرانی میں ان کی تربیت فرماتے جیسا کہ اللہ عزوجل کی براہ راست نگرانی میں آپ ﷺ نے تربیت حاصل کی تھی۔ ان اجتماعات سے رسول اللہ ﷺ کو دلی سکون واطمینان حاصل ہوتا تھا۔[2]

رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ ہراول دستے کی اہم خصوصیات

رسول اللہ ﷺ سے براہ راست تربیت پانے والے اس ہراول دستے میں بہت سی اہم خوبیاں نمایاں تھیں۔ ان کی بدولت وہ ایسے مسلمان افراد کی تیاری کا کام نہایت ثابت قدمی سے انجام دیتے چلے گئے جو دولت ایمان سے سرشار حکومت قائم کرنے اور ایک شاندار تہذیب وجود میں لانے کی صلاحیت سے مالا مال ہوں۔ ان اہم خصوصیات میں سے چند ایک یہ تھیں:

وحی الٰہی کے سامنے سرتسلیم خم کر دینا اور سرمو انحراف نہ کرنا: عقائد ونظریات، احکام و مسائل اور اخلاق وآداب وغیرہ کا مکمل علم اور ذات باری تعالیٰ کا صحیح شعور وحی الٰہی اور قرآن وسنت ہی سے ممکن ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ذات باری تعالیٰ، اس کے

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام:282,281/1. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان:198/1.

اسماء وصفات اور اس کے افعال کی معرفت حاصل ہو۔ اس امر کا بخوبی علم ہو کہ اللہ تعالیٰ کو کن صفات سے متصف اور کن عیوب سے پاک جاننا چاہیے۔ فرشتوں، آسمانی کتابوں اور انبیاء کے بارے میں مکمل معرفت حاصل ہونی چاہیے۔ یوم حساب اور جنت وجہنم کے متعلق کامل شعور کے ساتھ ساتھ شریعت کے بارے میں مجمل ومفصل علم ہونا چاہیے۔ اور ان تمام شرعی احکام سے واقفیت ہونی چاہیے جن کا تعلق ہر بالغ و عاقل انسان سے ہوتا ہے۔ اس بات کی معرفت بھی رکھنی چاہیے کہ کس حالت میں کیا اسلوب اختیار کرنا چاہیے، غصے اور پیار کی حالت میں کیا انداز اپنانا چاہیے، امیری اور غریبی میں کونسا طریقہ اختیار کرنا بہتر ہے، حالت امن وجنگ میں کیا رویہ اختیار کیا جائے، خیر وشر میں کون سا راستہ اپنانا ضروری ہے اور فتنوں سے کیسے محفوظ رہا جائے اور فتنوں والے زمانے میں کیا کردار ادا کیا جائے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ صحیح ایمان کی نعمت سے نوازتے ہیں ان کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ ہر موقع پر شرعی دلیل کی پابندی کرتے ہیں۔[1] فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ أُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝ ﴾

”اور جنھیں ہم نے پیدا کیا ان میں سے ایک گروہ (ان لوگوں کا) ہے جو حق کا راستہ بتاتے ہیں اور اسی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔“[2]

صحابۂ کرام نے دوسروں کی نسبت وحی اور دلائل سے زیادہ استفادہ کیا اور سب سے بڑھ کر احکام ربانی کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ اس کے کچھ اسباب تھے، مثلاً:

① ان کے دل ہر قسم کی آلودگی اور غیر شرعی میلانات ورجحانات سے بالکل پاک تھے اور وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ملنے والی ہدایات وتعلیمات کو قبول کرنے اور بلا تامل ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

② انھیں شرعی قانون سازی اور وحی الٰہی کے نزول کا زمانہ میسر آیا اور اس کے ساتھ ساتھ

---

[1] صفة الغرباء للدكتور سلمان العودة، ص: 83. [2] الأعراف 181:7.

انھیں جناب رسول اللہ ﷺ کی رفاقت ومصاحبت کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ شرعی نصوص کے اسبابِ نزول اور احوال دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ بہتر جانتے تھے۔ یہ حقیقت محتاج وضاحت نہیں کہ شرعی نصوص کے صحیح فہم اور ان کی حقیقت اور فقاہت جاننے میں ان سے متعلقہ امور اور اسباب کی معرفت بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔

③ قرآن وسنت کی نصوص عام طور پر انھی واقعات وحالات کے بارے میں ہوتی تھیں جن کا تعلق صحابۂ کرام کی انفرادی یا اجتماعی زندگی سے ہوتا تھا، اس لیے ان نصوص کا روئے سخن براہِ راست ان کی طرف تھا۔ اسی وجہ سے وہ ان پر زیادہ اثر انداز ہوتی تھیں چونکہ یہ نصوص ظہور میں آنے والے نت نئے واقعات کا حل پیش کرتی تھیں اور وقوعے کے ساتھ ہی نازل ہوجاتی تھیں، اس لیے ایسے لمحات میں قلوب واذہان فوری اثر قبول کرتے تھے اور حکم کی عاجلانہ تعمیل کے لیے معاً مستعد رہتے تھے۔

④ عہد نبوی میں ہونے کی وجہ سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو نصوص (احادیث) کی صحت اور ضعف جانچنے کے لیے کسی مشقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور نہ بعد میں آنے والے لوگوں کی طرح انھیں سلسلہ اسناد کی ضرورت محسوس ہوئی، نہ اسماء الرجال اور فن عِلَل کی معرفت حاصل کرنا پڑی اور نہ غیر صحیح (ضعیف یا موضوع) روایات سے سابقہ پڑا، اس لیے کسی بھی حدیث کی قبولیت میں انھیں کبھی کوئی تردد نہیں ہوا جیسا کہ بعد میں آنے والے، خصوصاً وہ لوگ جن کے دلوں میں نفاق تھا یا جنھوں نے روایتِ سنت اور درایتِ سنت کی تعلیم پائی نہ اس میں تفقُّہ حاصل کیا، بیشتر احادیث قبول کرنے میں متردد ہوئے۔[1]

جبکہ صحابۂ کرام کا طرزِ عمل یہ تھا کہ بقول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، وہ جونہی کسی شخص کی زبان سے یہ کلمہ سنتے کہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" تو ہر طرف سے نظر پھیر کر اسی کی طرف متوجہ ہوجاتے۔[2]

---

[1] صفة الغرباء للدكتور سلمان العودة، ص: 93,92. [2] صفة الغرباء للدكتور سلمان العودة، ص: 94.

ایمان اور وحی کا دلوں میں اُتر جانا: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا وحی کے ذریعے حاصل ہونے والے علم کے ساتھ وہ معاملہ اور برتاؤ نہ تھا جو عام علمی حقائق کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ عقل تو ان کا ساتھ دیتی ہے مگر دل اور بقیہ اعضاء کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ذات باری تعالیٰ، اس کے اسماء وصفات اور اس کے کارخانہ قدرت کی معرفت نے ان کے دلوں میں اس کی بے کراں محبت اور عبادت کے جذبات پیدا کر دیے تھے۔ اس سے ملاقات اور جنت میں اس کے جمال بے مثال کی دید کا شوق بڑھا دیا تھا۔ اس کی عظمت اور اس کے مؤاخذے، سزا، پکڑ اور عذاب کا خوف دلوں میں بٹھا دیا تھا۔ اس کی بے مثل نعمتوں کے حصول کا جذبہ بیدار کر دیا تھا۔ اور اس کی ذات پر حسنِ اعتماد، اس کی خوشنودی اور جنت کے حصول کی زبردست تڑپ پیدا کر دی تھی۔

یوں معرفت الٰہی اور ایمان باللہ کے تمام اثرات ان میں جمع ہو گئے تھے، یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت تمام محبتوں پر غالب آچکی تھی، ہر چیز کا خوف اس کے خوف تلے دب گیا تھا اور اسی کی ذات عالی ان کی تمام امیدوں کا مرکز بن گئی تھی۔ جنت اور جہنم کی معرفت نے ان کے دلوں میں دائمی اور لازوال نعمتوں کے حصول کی لگن اور خوفناک عذاب سے بچنے کا ڈر پیدا کر دیا تھا۔ کبھی ان کے دلوں پر جنت کی ان نعمتوں کا تصور چھا جاتا تھا جن کے حصول کے لیے وہ بے قرار تھے اور ان کی محرومی سے خوف کھاتے تھے۔ اور کبھی اس عذاب کا خیال آجاتا جس کے خوف سے وہ لرزتے رہتے تھے۔ ان کے دل صرف عالم آخرت ہی میں اٹک گئے تھے۔ انھیں اسی کی فکر تھی، اسی کا خوف تھا اور اسی سے ان کی ساری تمنائیں اور آرزوئیں وابستہ تھیں۔ گویا وہ قبروں سے جی اٹھنے، روز قیامت، میزان، پُل صراط، جنت اور جہنم کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

تقدیر کی معرفت نے انھیں تمام اسباب سے بے نیاز اور ایک اللہ پر کامل یقین واعتماد عطا کر دیا تھا۔ کسی چیز کے نہ ملنے پر انھیں کوئی غم نہ ہوتا اور مل جانے پر وہ اتراتے نہیں

تھے۔ ہر چیز کے حصول کے لیے وہ خوبصورت اسلوب اختیار کرتے تھے کیونکہ جو انسان کے مقدر میں ہے وہ اسے ضرور ملے گا اور جو اس کے مقدر میں نہیں ہے، وہ ہرگز ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس حقیقت کے ادراک نے ان کے دلوں میں ایسی دلیری پیدا کر دی کہ وہ اپنے مقاصد جلیلہ کے لیے آگے بڑھنا تو جانتے تھے مگر پیچھے ہٹنے کے تصور سے یکسر ناآشنا تھے۔ موت کی حقیقت جان کر اور اس پر ایمان لا کر وہ دنیا سے کنارہ کش ہوگئے اور تمام توجہ آخرت کی جانب مبذول کر لی۔ نیک اعمال پر ہمیشگی اختیار کی کیونکہ موت انسان کے بہت قریب ہے اور وہ نہیں جانتا کہ موت کب اسے اپنے شکنجے میں کس لے۔

حصول علم کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ وہ دل کی گہرائی تک اتر جائے اور باطن میں ایک انقلاب برپا کر دے۔ اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو تو ایسا علم بےکار اور لاحاصل ہے بلکہ دنیا و آخرت میں نقصان پہنچانے والا ہے۔[1]

قلبی طور پر اثر قبول کرنے کا وصف دوسروں کی نسبت صحابۂ کرام میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ کیونکہ دوسروں کی نسبت ان کا ایمان زیادہ مستحکم اور اکمل تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ انھوں نے ایمان براہ راست رسول اللہ ﷺ سے اس حالت میں حاصل کیا تھا کہ یہ نہایت شگفتہ، شاداب اور تر و تازہ تھا۔ اس میں کسی نفسی آلائش، خواہش پرستی اور غفلت کا شائبہ تک نہ تھا۔[2]

صحابۂ کرام دن کو شہسوار بن کر جہاد کرتے تھے اور رات کو دنیا سے لاتعلق ہو کر اپنے رب کی رضا کے لیے اس کے حضور قیام کرتے تھے۔ ان کا علم، ایمان اور خشیت الٰہی دنیاوی امور کی ادائیگی میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے۔ وہ خرید و فروخت بھی کرتے تھے، کھیتی باڑی کی مشقت بھی اٹھاتے تھے، شادی بیاہ کے معاملات طے کرتے تھے۔ اپنے اہل و عیال اور دیگر انسانوں کی ضروریات کا خیال رکھتے اور انھیں بخوبی پورا کرتے تھے۔ وہ خود پسندی سے

---

[1] صفة الغرباء للدكتور سلمان العودة، ص: 97. [2] صفة الغرباء للدكتور سلمان العودة، ص: 102.

بہت دور تھے، اہم کارنامے اور عظیم الشان نیک اعمال کر کے بھی انھیں معمولی سمجھتے تھے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہراول دستے کے اوصاف

دعوت دین کا پہلا مرحلہ راز داری کے ساتھ انفرادی دعوت پر مشتمل تھا۔ نبی کریم ﷺ کی منصوبہ بندی نہایت منظّم اور احتیاط پر مبنی تھی۔ آپ ﷺ نے تمام سیاسی مصلحتیں ملحوظ رکھ کر بہت ٹھوس منصوبہ بندی کی تھی۔ آپ ﷺ نے دار ارقم کا انتخاب محض مسلمانوں کے اجتماعات منعقد کرنے کے لیے نہیں کیا تھا کہ جہاں وہ محض وعظ ونصیحت کی باتیں سن سکیں بلکہ وہ قیادت کا مرکز اور تعلیم وتربیت کی عظیم درس گاہ کی حیثیت رکھتا تھا جہاں دعوت اور قیادت کے لیے افراد تیار کیے جاتے تھے۔ ایک ایک فرد کی ہر لحاظ سے مکمل اور شایانِ شان تربیت کی جاتی تھی اور بعض افراد کی خصوصی تربیت کا اہتمام کیا جاتا تھا تاکہ وہ دعوت دین اور اقوام عالم کی قیادت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے اہل ہو جائیں۔

رسول اللہ ﷺ نے نہایت احتیاط اور حکیمانہ نظم ونسق کے ساتھ ہر شخص کی ذمہ داری متعین فرما دی تھی اور ہر فرد اپنے سپرد کی گئی ذمہ داری سے بخوبی واقف تھا۔ سب کو اس امر کا احساس تھا کہ دعوت دین کس مرحلے سے گزر رہی ہے اور اس کے لیے کون سا طریق کار اور کیسا اسلوب ہوگا۔ یوں تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم احتیاط، راز داری، حفاظتی تدابیر اور نظم وضبط کی پوری پابندی کرتے تھے۔[1]

مکی زندگی میں اہل ایمان کی جماعت تیار کرنے کا کام آہستہ آہستہ، بتدریج اور راز داری کے ساتھ مکمل ہوا۔ اس مرحلے میں اللہ تعالیٰ کے اس حکم میں مضمر رہنمائی کو شعار بنایا گیا:

﴿ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ﴾

”اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روک رکھیں جو صبح و شام اپنے رب کو

---

[1] دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 237.

پکارتے ہیں، وہ اس کا چہرہ چاہتے ہیں۔"[1]

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے نبی کریم ﷺ کی رہنمائی فرمائی ہے کہ جو لوگ آپ کی دعوت قبول کر رہے ہیں ان کی کوتاہیوں اور لغزشوں پر صبر کیجیے۔ اگر وہ بار بار سوال کریں تو چاہے ان کے سوالات غلط ہی ہوں ان کا بُرا نہ مانیے۔ اگر وہ کبھی آپ کی رہنمائی قبول کرنے میں تردد کا اظہار کریں تب بھی انھیں اپنے آپ سے دور نہ رکھیے اور دعوت دین کے سلسلے میں پیش آنے والی تکالیف پر صبر و ہمت سے کام لینے کی ترغیب دینے اور ان کا حوصلہ بڑھانے کی بھرپور کوشش کیجیے اور دعوت دین کے راستے کی نزاکتیں ان پر واضح کر دیجیے۔ انھیں خبردار کر دیجیے کہ یہ کوئی آسان راستہ نہیں تاکہ وہ کسی کے فریب میں آ کر غریب مسلمانوں کو اپنے سے دور نہ کر دیں۔[2]

سورۂ کہف کی مذکورہ آیت میں امت مسلمہ کے ہراول دستے کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے چند اہم ترین صفات درج ذیل ہیں:

صبر: قرآن حکیم اور احادیث نبویہ میں لفظ صبر کا ذکر متعدد بار ہوا ہے اور لوگوں کو اس امر کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے باہمی معاملات میں صبر سے کام لیں۔ صبر کی اہمیت اس بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ خسارے سے محفوظ رہنے والی جماعت کی چار صفات ہیں جو کہ سورۂ عصر میں بیان کی گئی ہیں۔

اس میں رب ذوالجلال نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ سبھی انسان خسارہ اٹھانے والے ہیں اور ان میں سے صرف ان لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جو درج ذیل چار امور انجام دیں:

① اللہ پر ایمان لائیں۔

② نیک عمل کریں۔

③ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کریں۔

---

[1] الکہف 28:18. [2] الطريق إلى جماعة المسلمين لحسين بن محسن، ص: 170.

④ ایک دوسرے کو صبر و تحمل کی تلقین کریں۔

انسان کی نجات صرف اس وقت ممکن ہے جب وہ ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ خود کو ایک اچھا انسان بنالے اور دوسروں کی خیر خواہی کے جذبے سے ان کی درست رہنمائی کرکے انھیں اچھا انسان بنانے کی کوشش کرے۔ گویا اس طرح وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو ادا کرنے کا اہتمام کرے گا اور صبر و تحمل کی نصیحت کرنا بھی انتہائی ضروری ہے کیونکہ کسی فرد یا جماعت کے لیے سب سے مشکل کام ایمان اور عمل صالح پر استقامت اور حق وعدل کی پاسداری ہے۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے اپنے نفس سے جہاد کرنا پڑتا ہے۔ اپنے نفس پر قابو پانے کے بعد دوسروں کو ایمان اور اعمال صالحہ کی زندگی پر لانے کی جدوجہد کا مرحلہ آتا ہے اور اس مرحلے میں پیش آنے والی تکالیف ومصائب پر صبر کا دامن نہایت مضبوطی سے تھامنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ باطل کی بدتمیزیوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ طویل سفر اور کٹھن مراحل کی صعوبتیں سہنی پڑتی ہیں اور کبھی انجانے راستوں اور منزل کی دوری سے پیدا ہونے والی مایوسیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔[1]

دعاؤں کا بکثرت اہتمام: یہ وصف اس فرمان الٰہی سے واضح ہوتا ہے: ﴿ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ ﴾ ”وہ صبح وشام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔“[2]

دعا کامیابیوں کا بہت بڑا دروازہ ہے۔ جب کسی انسان کو دعا کا سلیقہ اور اس کی توفیق حاصل ہوجائے تو اس پر خیر وبرکت کا مسلسل نزول ہونے لگتا ہے، اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ جن افراد کو دعوت دین کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے تیار کیا جارہا ہو انھیں اس بات کا عادی بنانا چاہیے کہ وہ تعلق باللہ کو نہایت مضبوط اور مستحسن بنائیں۔ کثرت سے دعائیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور التجائیں کیا کریں۔ کیونکہ یہ کامیابی اور غیبی نصرت کا نہایت محکم اور یقینی ذریعہ ہے۔[3]

---

[1] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 3968/6. [2] الكهف 28:18. [3] فقه التمكين في القرآن الكريم للدكتور الصلابي، ص:221.

اخلاص: یہ وصف فرمان الٰہی کے اس جز سے واضح ہوتا ہے:

﴿ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ﴾ ”وہ اس کا چہرہ چاہتے ہیں۔[1]

دعوت دین کا کام کرنے کے لیے جن افراد کو تیار کیا جاتا ہے ضروری ہے کہ انھیں اس بات کی تربیت دی جائے کہ ان کے خطبات و دروس، ان کی ساری محنت ومشقت اور تمام جدوجہد صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر ہو۔ صرف اسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی تمنا ہو اور اسی سے حسن انعام کی امید ہو۔

دنیاوی مال وجاہ اور بڑے بڑے توصیفی القاب کا حصول اس کا مطمح نظر نہ ہو۔ اُسے چھوٹے یا بڑے کسی منصب کی طلب نہ ہو۔ اسے جہاں بھی کھڑا کردیا جائے وہ فوج کے ایک سپاہی کی طرح اللہ کے دین اور صحیح عقیدے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دے اور زبان حال سے یہی صدا بلند ہو رہی ہو:

﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ۙ لَا شَرِيْكَ
لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ ﴾

”کہہ دیجیے: بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت، (سب کچھ) اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی (بات یعنی توحید) کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔“[2]

قبولیت اعمال کے لیے اخلاص ایک رکن لازم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف وہی عمل شرف قبولیت پاتا ہے جس میں اِخلاص ہو، نیت درست ہو اور وہ قرآن وسنت کے مطابق ہو۔

عزم واستقلال: یہ وصف فرمان الٰہی کے اس حصے سے عیاں ہے:

﴿ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾

---

[1] الکہف 18:28۔ [2] الأنعام 6:162,163۔

”اور آپ کی آنکھیں ان سے تجاوز نہ کریں کہ آپ دنیاوی زندگی کی زینت چاہنے لگیں۔“ [1]

یہ عزم واستقلال جو اس آیت میں مذکور ہے یہ اُس ثابت قدمی کا ایک جز ہے جس سے ہر داعی کو متصف ہونا چاہیے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ○﴾

”مومنوں میں سے کچھ وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا وہ سچ کر دکھایا، چنانچہ ان میں سے بعض نے اپنا عہد پورا کیا (شہادت پا گئے) اور ان میں سے بعض منتظر ہیں اور انھوں نے (عہد میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔“ [2]

اس آیت کریمہ میں تین صفات کا تذکرہ ہے:

① ایمان ② جوانمردی ③ سچائی۔

یہ تینوں صفات دین حق پر ثابت قدمی کے اہم اسباب ہیں۔

ایمان اعلیٰ اقدار اختیار کرنے اور ان سے وابستہ رہنے کی ترغیب دیتا ہے بلکہ بلند مقصد کے لیے جان کی قربانی کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔

جوانمردی اپنے اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے جوش پیدا کرتی ہے، پھر انسان کو کسی ذلت وحقارت کی پروا نہیں ہوتی۔ وہ اپنے بلند مقصد اور اعلیٰ نظریے کی جانب مسلسل رواں دواں رہتا ہے۔

سچائی ہر تغیر وتبدل اور واپسی کا راستہ بند کر دیتی ہے۔ اس طرح یہ سب خصوصیات مل کر انسان میں ثابت قدمی پیدا کرتی ہیں، پھر وہ اپنی گردن پر چمکتی ہوئی تلوار دیکھ کر بھی راستہ نہیں بدلتا۔ پھانسی کا پھندا دیکھ کر بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی۔ دولت کی چمک اور کسی حسینہ کا حسن وجمال بھی اسے لبھا نہیں سکتا۔ وہ اپنی جگہ محکم اور ثابت قدم رہتا ہے۔

---

[1] الكهف 28:18. [2] الأحزاب 23:33.

جن کندھوں پر دعوت دین، قیام حکومت اور تہذیب وتمدن کی تعمیر جیسی اہم ذمہ داریاں ڈالنی مقصود ہوں، ضروری ہے کہ ان میں وہ پختگی اور عزیمت پیدا کر دی جائے جو بلند اقدار اور اعلیٰ مقاصد کے حصول میں مددگار ثابت ہو۔[1]

یہ وہ چند اہم اور نمایاں اوصاف ہیں جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اس ہراول دستے میں نمایاں تھے۔

بعد میں آنے والے کچھ عبادت گزار لوگوں کو مرض خود پسندی لاحق ہوا جس کی وجہ سے وہ دوسروں کے اعمال کو حقارت سے دیکھنے لگے، ان کی دینی خدمات کو معمولی سمجھنے اور ان کی منزلت شناسی سے محروم رہ کر جرم ناقدری کے مرتکب ہوئے۔ ان کی ہر نیکی اور عبادت اپنی ذات کے گرد گھومتی ہے۔ ایسے لوگ خود کو عظیم انسان تصور کرتے ہیں، حالانکہ یہی چیز بداخلاقی کا پیش خیمہ اور نیک اعمال کے اکارت ہونے کا سبب ہے۔ جو لوگ اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ صرف ہم ہی دین کے ٹھیکے دار ہیں۔ وہ عقل و شعور کے دریچوں اور آنکھوں کو بند کر لیتے ہیں۔ انھیں دوسروں کی خوبیاں نہیں، صرف خامیاں نظر آتی ہیں بلکہ دوسروں کی خوبیاں بھی ان کے نزدیک خامیاں بن جاتی ہیں۔[2]

نبی کریم ﷺ کی شخصیت اور اثر انگیز قیادت

تاریخ انسانیت میں دارارقم کو تعلیم وتربیت کی عظیم ترین درس گاہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ اس درس گاہ کے عظیم معلم خود جناب رسول اللہ ﷺ تھے جو ساری انسانیت کے معلم ہیں اور آپ ﷺ کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ کرنے والی ہستیاں وہ تھیں جنھیں مستقبل میں دعوت الی اللہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا تھا اور اقوام عالم کی رہنمائی کرنی تھی۔ وہ ایسے راہنما بنے جنھوں نے انسانیت کو انسانوں کی

---

[1] دعوة الله بين التكوين والتمكين للدكتور علي جريشة، ص:92,91۔ [2] صفة الغرباء للدكتور سلمان العودة، ص:104,103۔

غلامی سے نجات دلائی اور انھیں تاریکی سے نکال کر روشنی میں لا کھڑا کیا۔ رب ذوالجلال نے بھی اپنی نگرانی میں ان کی ایسی تربیت فرمائی جس کی کوئی مثال اس سے پہلے ملتی ہے نہ قیامت تک مل سکے گی۔[1]

اللہ تعالیٰ نے دار ارقم میں رسول اللہ ﷺ کو اپنے صحابہ کا ایک ایسا ہراول دستہ بنانے کی توفیق مرحمت فرمائی جو جہالت کی گھٹاؤں میں گھرے ہوئے تھے مگر جناب رسول اللہ ﷺ کی محنت شاقہ سے انھیں ایمان کا نور حاصل ہوا، پھر وہ دنیا کے مایہ ناز شہرت یافتہ انسان بن گئے۔ انھوں نے عالم بشریت کی عظیم ترین دعوت کا حق ادا کرکے انسانی تاریخ سازی کا اہم کردار ادا کیا۔

دارارقم کی درس گاہ سے فیض یافتہ ارباب علم و دانش عظیم ترین شخصیات قرار پائے۔ ان کے بعد جتنا بھی دعوت و جہاد کا کام ہوا، جتنی اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں اور جو تہذیب و تمدن وجود میں آیا، اس کی اساس یہی مبارک ہستیاں تھیں۔ زمانے اور زندگی کی کروٹیں آج تک ابوبکر صدیق، عمر بن خطاب، عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم جیسی ہستیوں کی ایک بھی مثال پیش نہیں کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے مربی اعظم ﷺ کو یہ توفیق عنایت فرمائی کہ انھوں نے دعوت کے خفیہ مرحلے میں دار ارقم جیسی درس گاہ میں ایسی نادر اور بے مثال شخصیتوں کی تربیت فرمائی جنھوں نے توحید اور دعوت و جہاد کا پرچم ہر جگہ لہرا دیا حتیٰ کہ جزیرہ نمائے عرب ان کے سامنے سرنگوں ہو گیا اور نصف صدی میں انھوں نے عظیم فتوحات حاصل کیں۔

نبی کریم ﷺ کو خداداد اعلیٰ صلاحیتیں حاصل تھیں، ان کی بدولت آپ ﷺ نے دعوت و تبلیغ کے ابتدائی تین برسوں میں بہترین انسانی جواہر کا انتخاب کیا اور پھر خاص اسلوب میں ان کی تربیت فرما کر اس قابل بنایا کہ اقوام عالم کی قیادت اور انسانوں کی رہنمائی کا

---

[1] دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 219.

اہم ترین فریضہ انھیں سونپا جا سکے۔ کیونکہ عظیم مقاصد اور انسانی بھلائی کے اہم ترین اہداف انھی لوگوں کے سپرد کیے جا سکتے ہیں جو نابغۂ روزگار، اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں کے مالک اور غیر معمولی لیاقت وصلاحیت کے حامل ہوں۔

دنیا کی تمام یونیورسٹیوں اور درس گاہوں میں دار ارقم کو نہایت عظیم الشان مقام ومرتبہ حاصل ہے جہاں رسول اللہ ﷺ ایک مُربّی کی حیثیت سے ہراول دستے کے منتخب وممتاز افراد سے ملاقات فرماتے تھے اور یہ مسلسل ملاقاتیں اس درس گاہ کے شرکاء کی عملی تربیت کا باعث تھیں۔ وہ شرکاء جن میں فوج کے ایسے سپاہیوں کا سا ولولہ کار فرما ہوتا تھا جن کی رگ رگ میں سمع وطاعت، حکم کی تعمیل، بڑوں کا ادب واحترام اور اصول پسندی سمائی ہو، ایسی تربیت جس میں سپہ سالار اپنے سپاہیوں کے دلوں میں اللہ رب العزت پر اعتماد، عزیمت، پختگی اور ثابت قدمی کوٹ کوٹ کر بھر دیتا، ان کے اخلاق وکردار کی خوب دیکھ بھال اور کانٹ چھانٹ کرتا اور انھیں تعلیم وتربیت کے تمام مراحل طے کراتا تھا۔ یہ منظم ومرتب ملاقاتیں عزائم کو پختہ کرتیں، ہمتوں کو تقویت پہنچاتیں اور جذبۂ ایثار وقربانی کو بیدار کرتی تھیں۔[1]

ان تربیتی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز یہ ہوتا تھا کہ جسے دین کی دعوت دی جاتی اس کی ملاقات براہ راست رسول اللہ ﷺ سے کرا دی جاتی تھی۔ اس ملاقات سے اس انسان میں ایک عجیب انقلاب برپا ہو جاتا اور اس کے لیے غیر متوقع طور پر ہدایت کے راستے کھل جاتے۔ وہ جہالت کی ظلمتوں سے نکل کر اسلام کی روشنی سے منور ہو جاتا اور کفر چھوڑ کر ایمان کی دولت سمیٹ لیتا تھا۔ یوں اس خالص عقیدے اور نئے دین کی وجہ سے آنے والی آزمائشیں، مصیبتیں اور تکالیف برداشت کرنا اس کے لیے آسان ہو جاتا تھا۔

جناب رسول اللہ ﷺ وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے تحریک اسلامی میں حرکت پیدا کی۔ آپ ﷺ انتہائی پرکشش اور اثر انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی

---

[1] دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 220.

نگرانی میں تیار فرمایا تھا اور آپ ﷺ کو انسانی تاریخ کی کامل ترین شخصیت عطا کی تھی۔

عظمت ہمیشہ سے محبوب خلائق رہی ہے۔ لوگ اسے نگاہ اشتیاق سے دیکھتے ہیں۔ ہر عظیم شخصیت کے گرد چاہنے والے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ محبت اور پسندیدگی کی وجہ سے اس سے کبھی الگ نہیں ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو اس عظمت کے ساتھ ساتھ یہ عالی رتبہ بھی حاصل تھا کہ آپ اللہ کے آخری پیغمبر تھے، آپ پر وحی الٰہی نازل ہوتی تھی اور آپ ﷺ اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچاتے تھے۔ یہ ایک دوسرا پہلو تھا جو رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ایک مومن کے جذبات واحساسات کو ایک نرالی کیفیت عطا کرتا تھا۔ ایک مومن آپ ﷺ کی ذات والا صفات ہی کی وجہ سے محبت نہیں کرتا تھا جیسا کہ عموماً عظیم شخصیتوں سے ان کی ذات کی بنا پر محبت ہوتی ہے بلکہ ایک مومن کی آپ ﷺ سے بے پایاں محبت اس عطیۂ خداوندی کے باعث بھی تھی جو اللہ تعالیٰ نے یگانہ شخصیت کی صورت میں آپ کو عطا کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ آپ ﷺ کی معیت میں وحی الٰہی کی نورانیت بھی حاصل کرتا تھا۔ اس طرح آپ ﷺ کی ذات والا صفات میں ایک عظیم انسانی ہستی کا وجود اور ایک عظیم رسول کا وجود یکجا ہو کر جگمگاتا تھا۔ ان دونوں وجودوں کی یکجائی سے ایک ایسا حسین اِمتزاج ظہور میں آتا تھا کہ ایک وجود کو دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہو جاتا تھا اور ان دونوں وجودوں سے محبت بھی یکجائی اختیار کر کے اپنی انتہا کو پہنچ جاتی تھی، یہاں تک کہ مومن کے دل میں حُب رسول ﷺ کے ساتھ حُب الٰہی بھی جاگزیں ہو جاتی، پھر ان دونوں محبتوں کے دھارے سے مومن کے جذبات واحساسات جنم لیتے تھے۔ یہی محبت اس کے افکار اور کردار کا محور بن جاتی تھی۔ اسی محبت نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہراول دستے میں جوش وجذبہ پیدا کیا۔ یہی محبت اسلامی تربیت کا نقطۂ آغاز، اساس اور سرچشمہ بن گئی۔[1]

---

[1] منهج التربية الإسلامية لمحمد قطب، ص:35,34.

دارارقم کے تدریسی مضامین

رسول اللہ ﷺ نے دار ارقم میں جس مضمون کی تعلیم دی وہ صرف قرآن حکیم تھا۔ آپ ﷺ قرآن حکیم کی آیات کی توضیح فرماتے۔ روح القدس جبرائیل علیہ السلام نو بہ نو آیات لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تشریف لاتے، صحابۂ کرام براہ راست زبان رسالت سے وہ آیات اور ان کی تفسیر سنتے تو وہ ان کے دلوں کو سیراب کرتی ہوئی ان کی روحوں میں اتر جاتیں اور خون کی طرح ان کے رگ و ریشے میں سرایت کر جاتیں۔ یوں ان کے قلوب و ارواح قرآن حکیم سے لگاّ کھا کر اس کی تاثیر سے مستفید ہوتے رہے۔ اس طرح ایک شخص اپنی اقدار، جذبات واحساسات، اغراض ومقاصد، طرز عمل اور امنگوں کے لحاظ سے ایک نیا انسان بن جاتا تھا۔ نبی کریم ﷺ کی پوری کوشش تھی کہ اس درس گاہ میں صرف قرآن حکیم ہی تدریسی مضمون ہو، اس منہج پر صحابۂ کرام کی تربیت ہو اور قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز ان کی تعلیم کا جز نہ بنے۔[1]

دار ارقم میں صحابۂ کرام نے اس حقیقت کا سراغ پالیا کہ دعوت وارشاد کا میدان ہو یا انسانی زندگی کے معاملات ہوں، امور سلطنت ہوں یا تہذیب وتمدن کی تعمیر ہو، ان سب کے لیے دستور اعلیٰ کی حیثیت صرف قرآن حکیم اور فرامین محمد مصطفیٰ ﷺ ہی کو حاصل ہے۔

قرآن حکیم ہی وہ واحد نصابی کتاب تھی جو دارارقم کے طالبان علم نے مربی اعظم رسول اللہ ﷺ کی تفسیر اور فرمودات کی روشنی میں پڑھی۔ حصول علم کا تنہا یہی منبع تھا، اسی کے مطابق امت مسلمہ کی اس بے مثال جماعت نے تربیت حاصل کی۔

قرآن حکیم اس امت کے لیے ایک زندہ وتابندہ کتاب ہے۔ اس میں امت کے لیے نہایت مخلصانہ خیر خواہی اور رہنمائی موجود ہے اور امت مسلمہ اپنی بقا اور زندہ قوم بننے کے لیے اس کتاب لاجواب سے سبق حاصل کر سکتی ہے۔

---

[1] دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص:225.

صحابۂ کرام کے اس ہراول دستے نے بڑی محنت اور جستجو سے قرآن حکیم کی تعلیم حاصل کی، اسے اپنے دل ودماغ میں محفوظ رکھا اور انتہائی ذوق وشوق سے اس کی تعلیمات و ہدایات کا فہم حاصل کیا اور پھر مکمل طور پر خود کو اسی سانچے میں ڈھالا۔ وہ اپنے حال اور مستقبل کے لیے قرآن حکیم ہی کی آیات سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

صحابۂ کرام کے اس ہراول دستے کی پوری نشو ونما تعلیمات قرآنیہ ہی کی روشنی میں ہوئی اور وہ تعلیمات الٰہیہ ہی کا ایک عملی نمونہ بن کر لوگوں کے سامنے آئے۔ قرآن حکیم کو درس گاہ ربانی کی حیثیت حاصل تھی۔ اس مدرسے نے معرفت الٰہی سے سرشار ایسے قائد تیار کیے کہ تاریخ انسانیت آج تک ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے اور تا قیامت عاجز وقاصر رہے گی۔

نبی کریم ﷺ پر نزول قرآن کا مقصد یہی تھا کہ آپ ﷺ اس کے مطابق ایک امت (جماعت) تیار کریں، حکومت اسلامیہ کا قیام وجود میں لائیں، ایک بے مثال انسانی معاشرہ تشکیل دیں، قرآن کے ذریعے لوگوں کے قلوب واذہان، اخلاق وکردار اور افکار ونظریات کو جلا بخشیں اور اس کے مطابق ان کے اعتقادات، اخلاق اور جذبات واحساسات سنواریں، پھر آپ ﷺ نے امت مسلمہ کے اس ہراول دستے کو اس طرح تیار کیا کہ وہ نظریاتی، جذباتی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور عسکری طور پر ہر لحاظ سے تمام انسانی معاشروں پر سبقت لے گیا اور اسے ساری دنیا پر ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوگئی۔[1]

دار ارقم کو مرکز قرار دینے کی وجوہات

دار ارقم کو کئی اسباب وعوامل کی بنا پر مرکز بنایا گیا، مثلاً:

① حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے کا علم دشمنان اسلام کو نہیں ہو سکا تھا، اس لیے ان کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ رسول اللہ ﷺ دار ارقم میں صحابۂ کرام

---

[1] دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 335.

سے ملاقاتیں کرتے ہوں گے۔

② حضرت ارقم بن ابی ارقم رضی اللہ عنہ کا تعلق بنومخزوم سے تھا۔ بنومخزوم کا قبیلہ اور بنو ہاشم (جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ تھا) دونوں ہمیشہ آپس میں برسر پیکار رہے تھے، لہٰذا کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ ارقم کا گھر مرکز اسلام بن سکتا ہے۔ یہ تو دشمن کے دل میں اپنا قلعہ بنانے والی بات تھی (کہ بنو ہاشم اپنے مخالفین بنومخزوم کے کسی گھر کو اپنا مرکز بنالیں)۔

③ حضرت ارقم رضی اللہ عنہ نے جب اسلام قبول کیا تو ان کی عمر اس وقت تقریباً سولہ (16) سال تھی۔ اور قریش کا ذہن اس جانب گیا ہی نہیں کہ ایک نوعمر کا گھر بھی اسلامی مرکز بن سکتا ہے۔ ان کا ظن غالب یہی تھا کہ یہ لوگ بنو ہاشم کے کسی گھر کو اپنا مرکز بنائیں گے یا پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یا ان جیسے کسی اور مسلمان کا گھر مرکز اجتماعات قرار پائے گا۔

یہاں پہنچ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حفاظتی تدابیر کے لحاظ سے دار ارقم کو مرکز بنانا حکمت عملی کے اعتبار سے نہایت حکیمانہ فیصلہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قریش نے کبھی اس مرکز پر دھاوا بولا نہ انھیں مسلمانوں کے اس مرکز کا علم ہوسکا۔[1]

قبائلِ قریش میں دعوت دین کا فروغ اور اس کی عالمگیریت

پس پردہ دعوت کے مرحلے میں اسلام قریش کے تمام قبائل میں یکساں پھیلا۔ کسی بھی قبیلے کا اس جانب جھکاؤ دوسروں کی نسبت زیادہ نہیں تھا اور یہ چیز اس وقت کی قبائلی زندگی کے مزاج کے خلاف تھی۔ اسلام نے اپنی دعوت کی اشاعت کے لیے قبائلی نظام اور قبائلی تعصب سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ اسی وجہ سے اس دعوتی مرحلے میں اسے دیگر قبائل کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ اس دعوت نے کسی قبیلے کی بالادستی روا نہیں رکھی بلکہ سب کو یکساں مقام دیا۔ اسی لیے یہ دعوت قریش کے متعدد قبائل میں عصبی تحفظات سے بالاتر رہ کر یکساں طور پر پھیلتی چلی گئی۔

---

[1] المنهج الحركي للدكتور الغضبان:49/1.

اس دور میں اسلام قبول کرنے والی ہستیوں کے ناموں پر ایک نگاہ ڈالیے:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو تیم سے تھا۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بنو امیہ سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کا قبیلہ بنو اسد تھا۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بنو عبد الدار سے تھے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بنو ہاشم کے چشم و چراغ تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو زہرہ سے تھا۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی نسبت بنو عدی سے تھی۔

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کا قبیلہ بنو جمح تھا۔

گویا اس مرحلے میں اسلام قبول کرنے والی اکثریت کا تعلق قریش سے نہیں تھا۔

اب کچھ اور نو مسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام ملاحظہ کیجیے:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو ہذیل سے تھا۔

حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو مازن سے تھا۔

حضرت عبداللہ بن قیس رضی اللہ عنہ بنو اشعر کے فرزند تھے۔

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما بنو مذحج کی شاخ عنس سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کا قبیلہ بنو کلب تھا۔

حضرت طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ قبیلہ دوس کے سردار تھے۔

حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کا تعلق قبیلہ بنو سلیم سے تھا۔

حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ بنو نمر بن قاسط سے تعلق رکھتے تھے۔

اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس مرحلے میں اسلام صرف مکہ مکرمہ تک محدود نہیں رہا تھا۔[1]

---

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 133/1.

نبی کریم ﷺ نے ٹھوس منصوبہ بندی کے ساتھ اپنا دعوتی اسلوب وضع کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ پر توکل کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے ہر قسم کے اسباب و وسائل سے بھی کام لیا۔

رسول اللہ ﷺ نے پختہ تربیت، مضبوط تنظیم سازی، وسیع تعلیم اور حفاظتی تدابیر کا مکمل اہتمام کیا۔ اپنے سماجی تعلقات میں کوئی فرق نہیں آنے دیا اور پس پردہ دعوت کے پہلے مرحلے کے بعد اگلے مرحلے کے لیے بھرپور تیاری کی کیونکہ رسالت مآب ﷺ یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ دعوت الی اللہ صرف رازداری کے مرحلے تک محدود نہیں رہے گی کہ لوگوں کو بس فرداً فرداً دعوت دی جائے بلکہ یہ دعوت تو ساری کائنات پر حجت قائم کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے تاکہ مشیت الٰہی سے انسانوں کو انسانوں کی غلامی اور ظلم و ستم سے نجات دلائی جائے اور انھیں شرک و جہالت کے اندھیروں سے نکال کر توحید و اسلام کی روشنی سے منور کیا جائے، اس لیے ابتدا ہی میں رب ذوالجلال نے دعوت کی حقیقت اور اس کا میدان عمل واضح کر دیا تھا۔ مکی آیات سے صاف ظاہر ہے کہ یہ دعوت علاقائی نہیں بلکہ عالمگیر ہے۔

فرمان الٰہی ہے: ﴿ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِينَ ۝ ﴾

”یہ تو تمام جہانوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔“[1]

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِينَ ۝ ﴾

”اور وہ تمام جہانوں کے لیے نصیحت ہی تو ہے۔“[2]

اس دعوت کے مخاطب تمام بنی نوع انسان ہیں۔ یہ دعوت دراصل ان لوگوں کے لیے نجات دہندہ بن کر آئی ہے جو اللہ کے فضل و احسان کے مستحق ٹھہر چکے ہیں۔ اس سے یہ بات

---

[1] ص 87:38۔ [2] القلم 52:68۔

واضح ہو جاتی ہے کہ اس دعوت کا اعلان سرعام کھلم کھلا ہو گا اور اس کا پیغام ہر فرد تک پہنچایا جائے گا۔ خیر و شر کو واضح کیا جائے گا۔ غلط راستے پر چلنے والوں کو بُرے انجام سے ڈرایا جائے گا، پھر اس دعوت عام کے نتیجے میں پیش آنے والی مخالفتوں، اذیّتوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنا ہو گا۔

نبی کریم ﷺ نے اپنی دعوت کے آغاز میں رازداری کا جو اسلوب اختیار کیا تھا وہ مخصوص حالات کے پیش نظر محض ایک استثنائی صورت تھی کیونکہ ابتدا میں یہ دعوت نامانوس تھی اور نہایت نازک احوال میں دی جا رہی تھی، اس لیے یہ پہلو نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔

جنگ اور امن کی حالت میں اسلام کے بہت سے امور سیاسی مصلحت کے باعث پوشیدہ رکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح دعوت کے معاملے میں بھی بعض اوقات رازداری کا اہتمام ضروری ہو جاتا ہے۔ تاہم اصل بات یہی ہے کہ اللہ کا دین چھپایا نہ جائے اور اس کی شریعت اور احکام کو سب لوگوں پر اچھی طرح واضح کر دیا جائے۔ لیکن بسا اوقات ایسے حالات پیش آ جاتے ہیں کہ اسے صیغۂ راز میں رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ دینی امور کے علاوہ دیگر معاملات جیسے کسی مہم کی منصوبہ بندی یا اس کی تفصیلات صیغۂ راز میں رکھی جاتی ہیں۔ درحقیقت یہ ایک مصلحت ہے جس کا تعلق انسانی فکر و اجتہاد سے ہے۔ اس قسم کی حکمت عملی کو نہ کتمان دین کا نام دیا جا سکتا ہے نہ اسے اظہار حق سے گریز کہا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر کسی مصلحت کی وجہ سے اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد پوشیدہ رکھی جائے تو اس طرح دعوت دین اور تبلیغ و ارشاد میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا، نہ وہ مقصد فوت ہوتا ہے جس کے لیے کتابیں نازل کی گئیں اور رسول بھیجے گئے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے کھلم کھلا دعوت اور اعلان نبوت کے بعد بھی بہت سی باتیں ظاہر نہیں فرمائیں، مثلاً: اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟ ان کے اجتماعات کہاں ہوتے ہیں؟ اور مخالفین

کے حربے ناکام اور ان کی سازشیں ناکارہ کرنے کے لیے کیا منصوبہ بندی کی گئی ہے؟ آپ ﷺ نے یہ ساری باتیں صیغۂ راز میں رکھیں اور اس سے دین کی تبلیغ و اشاعت کے کام پر کوئی ناگوار اثر نہیں پڑا۔[1]

---

[1] الغرباء الأوّلون للدكتور الغضبان، ص: 124-126.

حصہ 4

مکی دور اور تعلیم و تربیت کا اہتمام

باب : 1 مکی دور میں عقائد و نظریات کی تعمیر و اصلاح

باب : 2 مکی دور میں عبادات اور اخلاق عالیہ کی تعلیم و تربیت

يتلوا عليهم ءايته ويزكيهم
ويعلمهم الكتب والحكمة

''وہ انہیں اس کی آیتیں سناتا ہے اور ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے
اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔''

(آل عمران 3: 164)

باب 1

مکی دور میں عقائد ونظریات کی تعمیر واصلاح

قوانین قدرت کے ساتھ طرزِ عمل میں دانشمندانہ اسلوب نبوی

قیام حکومت اور اقوام کی تعمیر وترقی ان اصول وقواعد اور قوانین کو تسلیم کیے بغیر ممکن نہیں ہے جو انفرادی واجتماعی اور قومی وملکی کارکردگی میں کارفرما ہوتے ہیں۔ جب ہم سیرتِ حبیب ﷺ کا بنظر غائر مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لاکر قوانین قدرت کے ساتھ نہایت حکیمانہ طرزِ عمل اختیار کیا۔

قوانین قدرت دراصل اللہ تعالیٰ کے وہ احکام ہیں جو اس کائنات میں ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہیں اور انھیں تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ یہ قوانین قدرت بے شمار ہیں۔ لیکن اس کتاب میں ہمارے پیش نظر وہ قوانین قدرت ہیں جن کا تعمیر وترقی کی جدوجہد سے بڑا گہرا تعلق ہے۔

رب العالمین کی مشیت یہ تھی کہ دین اسلام بلکہ اس کائنات کے تمام معاملات قوانین فطرت کے مطابق طے پائیں اور کسی معاملے کا ظہور ونفوذ کرامتوں اور معجزوں سے وابستہ نہ رہے تاکہ بعد میں آنے والے مسلمان یہ کہہ کر دین کے راستے پر چلنے سے گریزاں نہ رہیں اور انبیاء وسلف صالحین کے منہج سے پیچھے نہ ہٹ جائیں کہ پہلے لوگوں کو خرق عادت معجزے عطا کیے گئے تھے، اسی لیے دین کے راستے پر چلنا ان کے لیے ممکن تھا لیکن اب سلسلۂ نبوت ختم ہونے اور رسولوں کی بعثت موقوف ہو جانے کی وجہ سے معجزات کا دروازہ

بند ہو چکا ہے، اس لیے اب ہم دین پر نہیں چل سکتے۔[1]

قرآن حکیم کی آیات پر غور وفکر کرنے والا واضح طور پر محسوس کرتا ہے کہ یہ آیات ان قوانین قدرت سے لبریز ہیں جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ ان قوانین کو کھول کھول کر بیان کرکے ان کی طرف توجہ مبذول کرانے کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے اور ان سے عبرت حاصل کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے کی تلقین کی گئی ہے تاکہ مسلم معاشرہ احکام الٰہیہ کے مطابق صحیح خطوط پر استوار ہو۔

قرآن حکیم جب اس سرزمین پر جاری وساری قوانین فطرت کے مطالعے کی طرف مسلمانوں کو دعوت نظارہ دیتا ہے تو انھیں وہ اصول بھی سمجھا دیتا ہے جن کے مطابق یہ قوانین کام کرتے ہیں۔ مسلمان کوئی انوکھی مخلوق نہیں ہیں کہ وہ ان قوانین فطرت سے مستثنیٰ ہوں بلکہ یہ قوانین تو ساری کائنات، سبھی اقوام وملل اور افراد وحکومت پر لاگو اور کارفرما ہیں۔ اس زمین پر زندگی بے مقصد نہیں۔ نہ امورِ زندگی بے ترتیب رکھے گئے ہیں بلکہ سب کے سب قوانین فطرت کے پابند ہیں۔

جب مسلمان ان قوانین فطرت پر غور کرتے ہیں اور ان کی حقیقت دریافت کر لیتے ہیں تو ان پر واضح ہو جاتا ہے کہ ان واقعات وحوادث میں کیا حکمتیں اور مقاصد پوشیدہ ہیں، پھر اس نظام قدرت پر ان کا یقین پختہ ہو جاتا ہے جس کے تحت یہ حوادث رونما ہوتے ہیں اور وہ جان جاتے ہیں کہ اس نظام میں بے شمار حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ اس ادراکِ حقیقت سے انھیں اپنی منزل کی طرف تیز رفتاری سے سفر کرنے کے لیے صحیح منصوبہ بندی میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اور وہ محض اپنے مسلمان ہونے ہی پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ کامیابی اور حصول مقصد کے لیے مناسب اسباب و وسائل بھی بروئے کار لاتے ہیں۔[2]

حیاتِ کائنات کے لیے جو قوانین فطرت جاری وساری ہیں وہ تبدیل نہیں ہوتے۔ یہ

---

[1] واقعنا المعاصر لمحمد قطب، ص: 414. [2] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 478/1.

قوانین جس طرح ماضی میں کارفرما تھے اسی طرح مستقبل میں بھی برسرِکار رہیں گے۔[1]

یہی وہ قوانین قدرت ہیں جن کے مطابق اللہ تعالیٰ اس جہان زندگی کو چلا رہا ہے اور اسی کے منشا کے مطابق یہ رواں دواں ہے۔ انسانی زندگی میں کوئی بھی چیز بلا وجہ نہیں ہوتی بلکہ سب کچھ انھی قوانین الٰہیہ کے مطابق ہوتا ہے جن میں نہ کوئی تغیر و تبدّل ہوتا ہے، نہ کسی پر کوئی زیادتی کی جاتی ہے اور نہ کسی کی خواہش ملحوظ رکھی جاتی ہے۔[2]

مسلمانوں کو دوسری قوموں سے بڑھ کر ان سنن الٰہیہ کا ادراک ہونا چاہیے جو کتاب اللہ اور سیرتِ رسول ﷺ میں واضح طور پر موجود ہیں تاکہ یہ دین کو غالب کرنے کا مقصود حاصل کرسکیں۔ دین کا غلبہ بغیر جدوجہد کے خود بخود نہیں ہوسکتا اور نہ ظلم وزیادتی سے دین غالب آسکتا ہے۔ اس کے لیے تو نور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کچھ اصول وضوابط متعین فرمائے ہیں تاکہ اس کے مومن بندے ان کی معرفت حاصل کرکے ان پر بصیرت کے ساتھ عمل پیرا ہوں۔[3]

اقوام وملل اور افراد کے بارے میں جو قوانین فطرت اور سنن الٰہیہ ہیں، لازم ہے کہ ہم ان کا بغور مطالعہ کریں اور سنن الٰہیہ کے سمجھنے کے بعد ان کے مطابق اپنے لیے ایک متوازن نظام تمدن اور معاشرتی قوانین وضع کریں۔[4]

سنن الٰہیہ کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرنے کے سلسلے میں استاذ البنا رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قوانین قدرت سے ٹکراؤ کا راستہ اختیار نہ کرو کیونکہ وہ یقیناً تم پر غلبہ حاصل کرلیں گے۔ ان پر دسترس حاصل کرنے اور انھیں اپنے مفاد میں استعمال کرنے کی کوشش کرو۔ ان کی لہروں اور بہاؤ کو روکنے کے بجائے ان کا رخ اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کردو۔ فطرت کے بعض قوانین کی زد سے بچنے کے لیے دیگر قوانین فطرت کا سہارا لو، پھر اپنی

---

[1] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 478/1. [2] التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 227. [3] جيل النصر المنشود للقرضاوي، ص: 15. [4] المشروع الإسلامي لنهضة الأمة قراءة في فكر حسن البناء، ص: 58.

کامیابی کا انتظار کرو، اس طرح کامیابی یقیناً تمھارے قدم چومے گی۔[1]

استاذ البنا کی گفتگو سے ان اہم امور کی نشاندہی ہوتی ہے:

① قوانین فطرت سے عدم ٹکراؤ۔

② ان پر دسترس حاصل کرنا۔

③ انھیں اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا۔

④ ان کا رخ تبدیل کر دینا۔

⑤ ایک قانون کی زد سے بچاؤ کے لیے دوسرا قانون بروئے کار لانا۔

⑥ پُر امید ہو کر کامیابی کا انتظار کرنا۔[2]

استاذ البنا نے جو نتائج اخذ کیے ہیں اس بات کی دلیل ہیں کہ انھوں نے سیرتِ نبوی اور تاریخ اسلام کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اقوام وملل کے امور کا خوب تجربہ رکھتے ہیں۔ اپنے معاشرے اور اس کے گردونواح پر ان کی گہری نگاہ ہے اور وہ مرض کی صحیح تشخیص اور علاج پر قادر ہیں۔

دعوت دین کی جدوجہد کو منظّم کرنے، اسلامی حکومت قائم کرنے اور ایک متمدن اور اپنے خالق کا فرمانبردار مثالی انسان بنانے کے لیے سب سے پہلی اسلامی تحریک بھی، جس کی قیادت خود نبی کریم ﷺ نے فرمائی، سُنن الٰہیہ اور قوانین فطرت کے تابع تھی جن میں سے بعض کا تذکرہ بالاختصار ہو چکا ہے، مثلاً:

تہذیب وتمدن کی تعمیر وتشکیل کے لیے قیادت کی اہمیت۔

باطل کے مقابلے کے لیے ایک قابل اعتماد اور منظّم جماعت کی اہمیت۔

اس منہج کی اہمیت جس سے عقائد، اخلاق، عبادات، اقدار اور نظریات اخذ کیے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ایک نہایت واضح سنت ''سنتِ تدریج'' یعنی کسی کام کو درجہ بدرجہ کرنا ہے۔

---

[1] رسالة المؤتمر الخامس، ص: 127. [2] المشروع الإسلامي في فكر حسن البنّاء، ص: 58.

یہ سنت اس کی تمام مخلوق اور کائنات میں کارفرما ہے اور یہ اس جماعت کے لیے بھی بے حد ضروری ہے جو ترقی کے راستے پر گامزن ہے اور غلبۂ دین کے لیے کام کر رہی ہے۔

اس سنت کو اختیار کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ (منزل مقصود تک پہنچنے کا) راستہ طویل ہوگا۔ خصوصاً موجودہ حالات میں جبکہ ہر چیز پر جاہلیت مسلط ہو چکی ہے اور اپنے ساز و سامان سمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ شر اور فساد لوگوں کے دلوں میں سرایت کر چکا ہے، اب اس کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے بتدریج کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اسلام کی پہلی دعوت کا آغاز بھی بتدریج ہوا تھا۔ جو آہستہ آہستہ مگر مستحکم انداز میں چلتی رہی۔ پہلے مرحلے میں باصلاحیت افراد کا انتخاب ہوا۔ ان کی تربیت کر کے ایک جماعت کی بنیاد رکھی گئی، پھر باطل قوتوں سے مقابلہ ہوا جس کے نتیجے میں کامیابی اور غلبہ حاصل ہوا۔ یہ سب مرحلے بیک وقت شروع نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اگر یہ بیک وقت شروع کر دیے جاتے تو مشکلات اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن تھا کہ بعد والے مرحلے کو پہلے مرحلے پر مقدم کر دیا جاتا۔ اس طرح بڑا خلل اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی اور کام آگے بڑھنے سے رک جاتا۔[1]

اسلوب تدریج اختیار کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ دعوت دین کا کام کرنے والے بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ غلبۂ اسلام کی منزل رات بھر میں حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ وہ پلک جھپکنے میں امت مسلمہ کی موجودہ صورت حال تبدیل کر دیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ انھیں مطلوبہ نتائج حاصل بھی ہوں گے یا نہیں؟ وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ موجودہ صورت حال کیونکر پیدا ہوئی؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟ نہ وہ کوئی ایسی حکمت عملی وضع کرتے ہیں کہ کن وسائل کو بروئے کار لایا جائے، کون کون سے اسالیب اختیار کیے جائیں اور کام کا آغاز کس طرح کیا جائے؟[2]

---

[1] التمکين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 227. [2] آفات على الطريق لمحمد سيد نوح: 57/1.

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی مقامات پر ہماری توجہ تدریجی طریق کار کی طرف مبذول کرائی ہے، مثلاً: اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ ایام میں پیدا فرمایا ہے، حالانکہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ پلک جھپکنے سے بھی کم وقت میں انھیں پیدا فرما دے۔ ہر چیز اس کے احاطۂ علم میں ہے۔ نباتات، حیوانات اور انسان کی تخلیق کے بھی ادوار ہیں۔ حکیمانہ سنت الٰہی کے مطابق سب چیزیں درجہ بدرجہ ارتقائی مراحل سے گزر کر نشوونما پاتی ہیں۔ آہستہ آہستہ مکمل ہوتی ہیں اور اپنے عروج بام تک پہنچتی ہیں۔[1]

اسی طرح شریعت اسلامیہ میں بھی اسلوب تدریج واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے، اسلام لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرتا ہے، اسی لیے اسلام نے لوگوں پر جو چیزیں واجب یا حرام کی ہیں ان میں تدریجی مرحلے ملحوظ خاطر رکھے گئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نماز، روزہ اور زکاۃ کی فرضیت کئی مراحل سے گزر کر اپنی موجودہ شکل تک پہنچی۔

اسلام کے ابتدائی زمانے میں انسانوں کی خرید و فروخت، یعنی غلامی کا نظام ساری دنیا میں رائج تھا۔ اگر اسے فوراً ختم کرنے کی کوشش کی جاتی تو اس وقت کی معاشی اور معاشرتی زندگی میں ایک طوفان برپا ہو جاتا، اس لیے اسلام نے اس مقصد کے لیے اسلوب تدرُّج اختیار کیا۔ اور اس نظام کو ختم کرنے کے لیے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی۔ علاوہ ازیں مختلف قسم کے کفارے کے لیے غلاموں کی آزادی کا دائرہ وسیع کیا تاکہ اس طرح آہستہ آہستہ غلامی ختم ہو جائے۔[2]

جب ہم قرآن کریم اور سنتِ مطہرہ کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ رسالت مآب ﷺ کے ذریعے عالمِ عرب اور پھر ساری دنیا میں کس قدر منظّم طریقے سے آہستہ آہستہ اسلامی انقلاب برپا ہوا، تمام معاملات اپنی طبعی رفتار سے رواں دواں رہے اور بالآخر مشیت الٰہی کے مطابق اپنی منزل سے ہمکنار ہوئے۔[3]

---

[1] التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 227. [2] الخصائص العامة للإسلام للقرضاوي، ص: 166. [3] التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 229.

اسلوب تدرُّج اپنانا قانون ربانی ہے۔ اسے میدان سیاست میں بھی بروئے کار لانا چاہیے۔ اگر اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور اس کی عملی تنفیذ کے لیے یہ اسلوب اختیار کیا جائے تو یقیناً غلبۂ اسلام کی منزل حاصل ہوگی۔ اگر ہم حقیقی اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ کسی صدارتی آرڈیننس، شاہی فرمان یا کسی پارلیمنٹ کی قرار داد سے اس خواب کی تعبیر حاصل ہوجائے گی۔ اس کے لیے اسلوب تدرُّج اختیار کرنا ہوگا، یعنی اس کے لیے ہر قسم کی تیاری کرنا ہوگی۔ فکر اور سوچ پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی۔ افراد کی تربیت کے لیے ایک جماعت کو تیار کرنا ہوگا۔ نبی کریم ﷺ نے جاہلانہ طرز زندگی کو اسلامی طرز حیات میں تبدیل کرنے کے لیے یہی منہج اختیار کیا۔ آپ ﷺ بعثت کے بعد تیرہ سال مکہ مکرمہ میں رہے، اس عرصے میں آپ کا بنیادی مقصد یہی رہا کہ اہل ایمان کی ایک ایسی تربیت یافتہ جماعت تیار ہوجائے جو دعوت کی ذمہ داری اٹھانے کی صلاحیت رکھتی ہو اور دین کی حفاظت اور پوری دنیا میں اس کی نشر و اشاعت کے لیے جدوجہد کرنے کی اہل ہو، اسی لیے مکی دور میں اتنے شریعت کے قوانین نازل نہیں ہوئے جتنا کہ تعلیم و تربیت اور رجال کار کی تیاری کا کام ہوا۔[1]

تبدیلی کا اسلوب اور اس کا عقائد سے تعلق

ترقی کے راستے پر گامزن ہونے کے لیے ایک اہم ترین طریقہ وہ ہے جس کی نشاندہی اس فرمان الٰہی سے ہوتی ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ۗ﴾

”بے شک اللہ نہیں بدلتا جو کسی قوم میں ہے، حتی کہ وہ اسے بدل لیں جو ان کے نفسوں میں ہے۔“[2]

---

[1] الخصائص العامة للإسلام للقرضاوي، ص: 168. [2] الرعد 11:13.

یہ بات نہایت واضح ہے کہ امت مسلمہ کو غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے اندر تبدیلی نہیں لے آتی۔ لیکن اس وقت امت مسلمہ کی جو صورت حال ہے اس میں کسی قسم کے غلبے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقصد کے لیے امت کا اپنے آپ کو بدلنا نہایت ضروری ہے۔ وہ قوم جو ذلت آمیز زندگی پر راضی ہو جائے، اس میں آگے بڑھنے کا جذبہ مفقود ہو جائے، اپنی تکلیف دہ صورت حال کو بدلنے اور اس کی بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش نہ کرے، ایسی قوم کو کبھی غلبہ واقتدار حاصل نہیں ہوتا۔[1]

اسلام کو روز اول ہی سے شدید قسم کی صورت حال پیش آئی۔ صرف جزیرہ نمائے عرب نہیں بلکہ پورے کرۂ ارض کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک طرف عقائد وتصورات سے ٹکراؤ تھا تو دوسری طرف کئی قسم کے اقدار اور معیار سے جنگ تھی۔ اگر ایک طرف مختلف نظاموں اور تہذیبوں کا مقابلہ کرنا پڑا تو دوسری جانب کئی قسم کی مصلحتوں اور تعصّبات سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

پہلے دن ہی سے اسلام اور جزیرہ نمائے عرب بلکہ پوری دنیا کے انسانوں کی صورت حال میں بہت زیادہ بُعد تھا۔ اسلام ان لوگوں میں جو تبدیلی لانا چاہتا تھا اس کا دور دور تک تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نوع انسانی کی اس صورت حال کو ایک طویل تاریخ بنیاد فراہم کر رہی تھی، بہت سی مصلحتیں اسے تقویت پہنچا رہی تھیں اور بہت سی طاقتیں اسے مضبوط کر رہی تھیں۔ یہ سب اس نئے دین اسلام کے راستے میں ایک مضبوط بند کی شکل اختیار کر گئیں کیونکہ یہ دین جو صرف عقائد ونظریات، اقدار ومعیار، رسوم ورواج اور کردار وجذبات کی تبدیلی کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ وہ تمام ظالمانہ نظام ہائے زندگی اور تہذیبوں کو بدلنا چاہتا ہے اور جابرانہ دساتیر وقوانین کا خاتمہ اس کا مقصود ہے۔ وہ انسانی قیادت کو ظلم وجبر اور جہالت کے ہاتھوں سے چھین کر ایک اللہ اور اس کے دین اسلام کے حوالے کرنے کا خواہاں ہے۔[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو چیز ایک مرتبہ وقوع پذیر ہو جائے وہ دوسری مرتبہ بھی رونما

---

[1] التمکین للأمة الإسلامیة لمحمد السید، ص: 210. [2] هذا الدین لسید قطب، ص: 52,51.

ہوسکتی ہے۔ اسلام کو جو عروج حاصل ہوا تھا وہ ان قوانین فطرت کے ساتھ ہی حاصل ہوا تھا نہ کہ مافوق الفطرت معجزات کے ساتھ۔ یہ عروج اور کامیابی ہر اس شخص کو آج بھی حاصل ہوسکتی ہے جو قوانین فطرت کے اس سرمائے کو حاصل کرنے کے بعد اس کا صحیح استعمال کرے اور اس کے مطابق اپنی پوری قوت اور صلاحیتیں صرف کرے۔[1]

نبی کریم ﷺ نے منہج ربانی کے مطابق جس انقلاب کی قیادت فرمائی اس کا آغاز نفس انسانی سے کیا۔ آپ نے عظیم انسان تیار کیے، پھر ان کے ذریعے انسانی معاشرے میں ایک عظیم انقلاب پیدا کیا جس نے انسانیت کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی جانب، جہالت سے نکال کر علم کی جانب اور پسماندگی سے نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کیا اور پھر ان کی بدولت ایک بہترین اور شاندار تہذیب کو متعارف کروایا۔[2]

نبی کریم ﷺ نے قرآنی منہج کے مطابق عقائد، افکار، نظریات، اخلاق اور احساسات کی اصلاح فرما کر اپنے صحابہ کے دلوں میں ایک انقلاب پیدا کردیا جس کی بدولت آپ ﷺ کے گردونواح کی انسانی دنیا ہی تبدیل ہوگئی۔ مدینہ منورہ کی حالت بدل گئی، پھر مکہ مکرمہ میں تبدیلی آئی۔ اس کے بعد جزیرہ نمائے عرب اور روم و فارس کی سلطنتیں اس انقلاب کی وجہ سے بدلتی چلی گئیں۔ یہ ایک ایسی بین الاقوامی تحریک تھی جس میں صبح وشام خالق کائنات کا ذکر ہوتا تھا اور اس کی تسبیح بیان کی جاتی تھی۔ مکی دور میں قرآنِ حکیم کے ذریعے عقائد کی اصلاح کا بہت زیادہ اہتمام کیا گیا۔ مختلف اسالیب کے ساتھ عقائد سمجھائے گئے جس کی بدولت ان کے دل ایمان سے لبریز ہوگئے اور ان میں بہت بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم اور درجہ بدرجہ حاصل ہونے والی ترقی کی وضاحت اس طرح بیان فرمائی ہے:

---

[1] هذا الدين لسيد قطب، ص: 65. [2] نفوس و دروس في إطار التصوير القرآني لتوفيق محمد سبع، ص: 367.

﴿أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾

”کیا ایک ایسا شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس کے لیے نور بنا دیا، وہ اس کی روشنی میں لوگوں میں چلتا ہے، (کیا) وہ اس شخص جیسا (ہوسکتا) ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں پڑا ہے، ان سے نکلنے والا نہیں؟ اسی طرح کافروں کے لیے ان کاموں میں کشش رکھی گئی ہے جو وہ کرتے ہیں۔“[1]

درحقیقت یہ ایک بہترین اور حیران کن منظر نامہ ہے جسے بیان کرنے میں قلم بھی چکرا کر رک جاتے ہیں۔ اور قرآن کا اسلوب تو ہر آن ایسا ہے جس سے عقلیں سیراب ہوں اور مختلف اسلوبِ بیاں جنم لیں، پھر بھی تعبیر کا حق ادا نہ کرسکیں۔ موت سے زندگی کی جانب سفر، اندھیروں سے اجالوں کی طرف سفر، کیا یہ دونوں مردہ اور زندہ، اندھیرا اور اجالا یکساں ہوسکتے ہیں؟ نہیں ان کے درمیان تو ایک طویل مسافت ہے، ایک واضح تضاد ہے جسے وہی شخص محسوس کرسکتا ہے جو حیرت انگیز قرآنی بیانات کی روشنی میں اہل عرب کی حالت پر گہری نگاہ رکھتا ہو۔[2]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عقائد کی اصلاح

بعثتِ نبوی سے قبل لوگوں کو صحیح معنوں میں معرفتِ الٰہی حاصل نہ تھی، اس وجہ سے وہ اسماء وصفات باری تعالیٰ کے سلسلے میں درست منہج سے ہٹے ہوئے تھے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۠ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَاۗىِٕهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾

---

[1] الأنعام122:6۔ [2] الانحرافات العقدية والعلمية لعلي بن تجيب الزهراني:1/25,26.

''اور اللہ ہی کے لیے اچھے اچھے نام ہیں، لہٰذا تم اسے ان (ناموں) سے پکارو اور چھوڑ دو ان لوگوں کو جو اس کے ناموں میں کج روی اختیار کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، جلد اس کی سزا پائیں گے۔''[1]

وہ لوگ بعض صفات الٰہیہ کا انکار کر دیتے تھے اور اللہ تعالیٰ کو ایسے ناموں سے موسوم کرتے تھے جو اس کے شایانِ شان نہ ہوتے یا ان میں غلط معنی پوشیدہ ہوتا۔ اسی طرح بسا اوقات وہ کچھ خامیوں اور عیوب کی نسبت بھی اس کی طرف کر دیتے، مثلاً: وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور جنات کو اس کا شریک بنا بیٹھے تھے۔

فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ﴾

''اور (اس پر بھی) لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا۔''[2]

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ﴾

''اور وہ اللہ کی بیٹیاں ٹھہراتے ہیں، وہ (اولاد سے) پاک ہے۔''[3]

قرآن حکیم نے صحیح عقائد کو مضبوط کیا اور اہل ایمان کے دلوں میں انھیں پختہ کیا، پھر تمام لوگوں کے لیے وضاحت سے بیان کر دیا کہ سب کا پروردگار ایک ہے، اس کے سوا کوئی پروردگار نہیں۔ معبود بھی ایک ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اس کے اسماء وصفات اسی کے ساتھ خاص ہیں، کوئی اور ان اسماء وصفات کا مالک نہیں۔ اور قرآن نے ہمیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی خبر دی ہے ان پر ایمان لانا ضروری ہے، مثلاً: فرشتوں، آسمانی کتابوں، انبیائے کرام علیہم السلام، اچھی اور بری تقدیر اور آخرت کے دن پر ایمان۔ قرآن نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ تمام رسولوں پر ایمان اور ان کی بتائی ہوئی تعلیمات کو ماننا بھی نہایت ضروری ہے۔[4]

---

[1] الأعراف 180:7. [2] الأنعام 100:6. [3] النحل 57:16. [4] أهمية الجهاد في نشر الدعوة لعلي العلياني، ص: 47.

قرآن حکیم کی مکی آیات نے لوگوں میں معرفت الٰہی پیدا کی اور انھیں بتایا کہ انھیں کس معبود کی عبادت کرنی چاہیے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی انھی آیات کو بنیاد بنا کر صحابۂ کرام کی تربیت کی۔ پہلے دن ہی سے آپ ﷺ کی یہ تمنا رہی کہ لوگوں کو اپنے رب کے بارے میں صحیح تصور دیں اور انھیں بتائیں کہ ان کے رب کے ان پر حقوق ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کو اس بات کا احساس تھا کہ یہ تصور ہی ان پاکباز نفوس اور فطرت سلیمہ کے حاملین کو ایمان و یقین کی دولت دے سکتا ہے۔ قرآن کریم سے ماخوذ اس تصور کو عام کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ نے اپنی تمام تر توجہ ان پہلوؤں پر مرکوز رکھی:

① اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے۔ ہر قسم کے کمالات سے متصف ہے جن کا شمار ممکن نہیں۔ وہ ایک ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ نہ اس کی کوئی بیوی ہے اور نہ اولاد۔

② اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق و مالک اور تمام معاملات کنٹرول کرنے والا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ قف یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾

”بے شک تمھارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر مستوی ہوگیا۔ وہ دن کو رات سے اس طرح ڈھانپتا ہے کہ وہ (رات) جلدی سے اس (دن) کو آلیتی ہے اور اس نے سورج، چاند اور تارے اس طرح پیدا کیے کہ وہ سب اس (اللہ) کے حکم کے پابند کردیے گئے ہیں۔ آگاہ رہو! پیدا کرنا اور حکم صادر کرنا اسی کے لیے روا ہے، اللہ رب العالمین بہت بابرکت ہے۔“[1]

---

[1] الأعراف 54:7.

③ اس کائنات میں ہمیں چھوٹی بڑی یا ظاہر و مخفی جو بھی نعمت حاصل ہوتی ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ○﴾

”اور تمھارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ تو اللہ ہی کی طرف سے ہے، پھر جب تمھیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسی سے تم آہ و فغان کرتے ہو۔“ [1]

④ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علم میں ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اس سے مخفی نہیں۔ انسان جو کچھ چھپاتا یا ظاہر کرتا ہے سب اس کے علم میں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ط يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَىْءٍ عِلْمًا ○﴾

”اللہ وہ ذات ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمینیں بھی ان (آسمانوں) کی مثل، ان کے درمیان اس کا حکم نازل ہوتا ہے تاکہ تم جان لو کہ بلاشبہ اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے اور بلاشبہ اللہ نے (اپنے) علم سے ہر شے کا احاطہ کر رکھا ہے۔“ [2]

⑤ اور اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے ذریعے سے ہر انسان کے تمام اعمال کا ریکارڈ (نامۂ اعمال) تیار کرواتا ہے۔ اس میں معمولی سے معمولی چیز اور بڑی سے بڑی چیز بھی موجود ہوتی ہے۔ اس نامۂ اعمال کو ایک مناسب وقت پر انسان کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ○﴾

”(انسان) جو بات بھی (منہ سے) نکالتا ہے (اسے لکھنے کو) اس کے پاس ایک نگران (فرشتہ) تیار ہوتا ہے۔“ [3]

---

[1] النحل 53:16۔ [2] الطلاق 12:65۔ [3] قٓ 18:50۔

⑥ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کی پسند اور چاہت کے مطابق مختلف معاملات میں مبتلا کر کے ان کا امتحان لیتا ہے تاکہ لوگوں کو ان کی حقیقت معلوم ہو جائے کہ کون اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر پر راضی رہتا ہے اور ہر حال میں اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ یقیناً ایسے لوگ ہی خلافت و امانت اور سرداری کے اہل ہوتے ہیں۔ اور کون ہے جو اس کی قضاء و قدر پر راضی نہیں ہوتا بلکہ غصے کا اظہار کرتا ہے، ایسے لوگ غضب الٰہی کا شکار ہوتے ہیں اور کوئی ذمہ داری ان کے سپرد نہیں کی جاتی۔

⑦ اور اللہ تعالیٰ ایسے انسان کی نصرت و تائید فرماتے ہیں اور اسے مکمل توفیق عنایت کرتے ہیں جو سب کو چھوڑ کر اس کی پناہ، حفاظت اور امان میں آنا چاہے اور کسی کام کے کرنے یا چھوڑنے میں اسی کے حکم کی تعمیل کرے۔

⑧ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر یہ حق ہے کہ صرف اس کی عبادت کریں، اس کی توحید کو تسلیم کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔

﴿بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝﴾

"بلکہ آپ اللہ ہی کی عبادت کریں اور شکر گزاروں میں سے ہو جائیں۔"[1]

⑨ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں توحید اور بندگی کے تقاضے بیان فرما دیے ہیں۔[2]

امت مسلمہ کے ہراول دستے نے اس تربیت کے دوران میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور اسمائے حُسنیٰ کا فہم حاصل کیا اور ان کے تقاضوں کے مطابق اس کی بندگی اختیار کی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی عظمت ان کے دلوں میں پختہ ہو گئی اور اس کی خوشنودی کا حصول ان کا نصب العین اور زندگی کا مقصد بن گیا۔ انھوں نے اس احساس کو ہمیشہ بیدار رکھا کہ وہ ہر لمحے اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہیں اور وہ انھیں دیکھ رہا ہے۔ اس طرح انھوں نے اپنی خواہشات نفس پر کنٹرول کیا اور بے قابو نہیں ہونے دیا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے آپ

---

[1] الزمر 66:39. [2] منهج الرسول في غرس الروح الجهادية للسيد محمد نوح، ص: 10-16.

کو ہر قسم کے شرک سے پاک رکھا۔ نہ شرک فی التصرف کے قریب گئے نہ شرک فی الاسماء والصفات کو قریب آنے دیا۔ ہمیشہ یہی عقیدہ رکھا کہ امور کائنات کے چلانے میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں ہے، نہ کسی کو وجود بخشنے میں، نہ عدم کی طرف لے جانے میں، نہ زندگی عطا کرنے میں، نہ زندگی ختم کرنے میں۔ اور اس کے اذن کے بغیر نہ کوئی خیر حاصل کر سکتا ہے نہ شر دور کر سکتا ہے۔ اور اس بات کا عقیدہ رکھا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتے، مثلاً: علم غیب اللہ کے سوا کسی اور ذات کو حاصل نہیں۔ عظمت و کبریائی صرف اسی کے لیے ہے، حاکمیت مطلقہ اور اطاعت مطلقہ صرف اس کی ہے کسی اور کو یہ وصف حاصل نہیں ہو سکتا۔[1]

نبی کریم ﷺ نے توحید کی بنیاد پر افراد کی تربیت فرمائی۔ اسی تربیت پر اسلام کی عمارت قائم ہوئی اور یہی وہ صحیح منہج ہے جسے پہلے انبیاء اور رسولوں نے اختیار کیا۔ ہر رسول نے اپنی قوم کو سب سے پہلے صرف ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ز اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ط ﴾

’’اور البتہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس نے کہا:) بے شک میں تمھیں صاف صاف ڈرانے والا ہوں، یہ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔‘‘[2]

حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ط قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط ﴾

’’اور (ہم نے) عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو (بھیجا)، اس نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، تمھارے لیے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔‘‘[3]

---

[1] أهمّية الجهاد في نشر الدعوة لعلي العلياني، ص: 53. [2] هود 11:25,26. [3] هود 11:50.

اور حضرت صالح علیہ السلام کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا م قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ط ﴾

”اور (ہم نے) ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو (بھیجا)۔ اس نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔“ [1]

اور حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ ﴾

”اور (ہم نے) مدین (والوں) کی طرف ان کے بھائی شعیب کو (بھیجا)، اس نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔“ [2]

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ط هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ○ ﴾

”بے شک اللہ میرا اور تمھارا رب ہے، چنانچہ اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔“ [3]

الغرض تمام رسولوں نے توحید الوہیت کی دعوت دی۔ توحید الوہیت کا مفہوم یہ ہے کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کے سوا ہر باطل معبود سے دور رہا جائے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ج ﴾

”اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔“ [4]

---

[1] ھود 61:11. [2] ھود 84:11. [3] آل عمرٰن 51:3. [4] النحل 36:16.

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کے دلوں میں خالص اور مکمل توحید پختہ کی اور اس کے مطابق ان کی تربیت فرمائی۔ آپ ﷺ بذات خود انتہائی درجے کے موحد مومن کی زندہ مثال تھے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ○ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ؕ﴾

”(اے نبی!) کہہ دیجیے: بے شک مجھے میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی ہے صحیح اعلیٰ اقدار کے حامل دین کی، ایک رب کے پرستار ابراہیم کے طریقے کی اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا، کہہ دیجیے: بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت، (سب کچھ) اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی (بات، یعنی توحید) کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں، کہہ دیجیے: کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں؟ جبکہ وہی ہر چیز کا رب ہے۔“[1]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کی جو تربیت فرمائی اس سے بڑے ہی مبارک ثمرات حاصل ہوئے۔ صحابۂ کرام میں کوئی ایسی بات نہ رہی جو توحید الوہیت یا توحید ربوبیت یا توحید اسماء و صفات کے منافی ہو۔ انھوں نے ایک اللہ کے سوا کسی کی حاکمیت تسلیم نہ کی، اس کے سوا کسی کو مطاع نہ جانا۔ اسے ناراض کر کے کسی دوسرے کی اتباع نہ کی اور کسی دوسرے کی محبت کو اللہ کی محبت پر غالب نہ آنے دیا۔

اللہ کے سوا کسی اور کا خوف ان کے دلوں پر غالب نہ آسکا۔ انھوں نے صرف اسی پر

---

[1] الأنعام 6:161-164.

مکمل اعتماد کیا، اس کے سوا کسی کو جائے پناہ نہ سمجھا۔ صرف اسی سے مانگا، اسی سے مغفرت طلب کی، اسی کے نام پر جانور ذبح کیے، اسی کے لیے نذریں دیں، اس کے سوا کسی کو مدد کے لیے نہیں پکارا اور وہ امور جو صرف اسی کی قدرت وطاقت میں ہیں، ایسے امور میں صرف اسی سے استعانت چاہی۔ صرف اسی کے سامنے سر جھکایا، اسی کو سجدہ کیا۔ اس کے لیے حج کیا، اسی کے گھر کا طواف کیا اور ہر قسم کی عبادت خاص اسی کے لیے کی۔ نہ اسے مخلوق سے تشبیہ دی نہ معدوم سے بلکہ اس سے ہر قسم کے عیب اور نقص کی نفی کی۔ انھوں نے اس کی ایسی تمام صفات کو تسلیم کیا جو اس نے خود بیان کیں یا اس کے رسول ﷺ نے بیان کیں۔ کسی بھی صفت میں نہ تحریف کی نہ تاویل اور نہ تعطیل سے کام لیا۔ صرف اسی کا خوف دل میں بسایا۔ مطلق اطاعت کا حق اس کے سوا کسی کو نہ دیا۔ اس کے اوصاف ربوبیت میں کسی کو شریک نہ کیا، مثلاً: زندگی عطا کرنا، موت سے ہمکنار کرنا، رزق دینا، اس علم کا مالک ہونا جو ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے، قدرت کاملہ کا مالک ہونا، قائم بالذات ہونا، مطلق بقاء کا مالک ہونا، تحلیل وتحریم کا فیصلہ کرنا اور اس جیسی صفات میں وہ کسی دوسرے کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی توفیق عنایت فرمائے کہ ہم قولاً، فعلاً اور اعتقاداً توحید کے تقاضے پورے کریں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے اور وہی ایسا کرسکتا ہے۔[1]

قرآن حکیم کی مکی آیات نے عقیدۂ توحید کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ بتایا کہ محمد ﷺ کی رسالت تمام انسانوں اور جنوں کے لیے ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○﴾

”اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہی بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“[2]

---

[1] أهمية الجهاد في نشر الدعوة لعلي العلياني، ص:55,54.

[2] سبا28:34.

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾

”کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، جس کے پاس آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔“[1]

فرمان الٰہی ہے:

﴿وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ○﴾

”اور (یاد کیجیے) جب ہم نے جنوں کی ایک جماعت کو آپ کی طرف متوجہ کیا، جبکہ وہ قرآن سنتے تھے، پھر جب وہ اس (کی تلاوت سننے) کو حاضر ہوئے تو (ایک دوسرے سے) کہا: خاموش رہو، چنانچہ جب (تلاوت) ختم ہوگئی تو وہ اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر پھرے۔“[2]

اور اس سے ملتی جلتی دیگر آیات میں بھی یہی بات موجود ہے۔[3]

قرآن حکیم کی مکی آیات نے جس طرح توحید باری تعالیٰ اور رسالت کے بارے میں صحابۂ کرام کے دلوں میں صحیح اور شفاف عقیدہ پختہ کیا، اسی طرح فرشتوں کے متعلق ان کے عقیدے کی اصلاح کی اور انھیں بتایا کہ فرشتے بھی اللہ کی مخلوق ہیں، اللہ کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں، اس کی بندگی بجالاتے ہیں اور خود کو اس کی بندگی سے بالا نہیں سمجھتے۔ زمین و آسمان میں کہیں بھی ان کی شراکت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر یہ کسی کو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ فرمان الٰہی ہے:

---

[1] الأعراف 158:7. [2] الأحقاف 29:46. [3] أهميّة الجهاد في نشر الدعوة لعلي العلياني، ص: 56.

﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○﴾

''اور آسمانوں اور زمین کے تمام جاندار اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اور تمام فرشتے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔''[1]

اور اسی طرح دیگر آیات میں بھی یہی چیز موجود ہے۔

قرآن حکیم کی مکی آیات نے اپنے بے مثال اور اثر انگیز اسلوب سے ایمان کے جملہ ارکان اہل ایمان کے دلوں میں پختہ کیے اور سب لوگوں کے لیے واضح بھی کر دیے۔

آپ ﷺ پر نزول قرآن اور آپ سے قبل تورات اور انجیل کے نزول کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ○﴾

''اسی نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور اسی نے تورات اور انجیل کو نازل کیا۔''②

اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی واضح فرما دی کہ اس نے بہت سے انبیاء کو لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا:

﴿وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ○﴾

''اور ہم نے پہلے لوگوں میں کتنے ہی نبی بھیجے۔''[2]

قرآن کریم میں جنت کا بیان اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر اس کے اثرات

قرآن کریم کی مکی آیات میں یوم آخرت کے ذکر کو خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ شاذ ونادر ہی کوئی مکی سورت ہوگی جس میں قیامت کے دن کے احوال مذکور نہ ہوں، انعام پانے

---

[1] النحل 49:16. [2] آل عمرٰن 3:3. [3] الزخرف 6:43.

والوں کا اور عذاب میں مبتلا ہونے والوں کا ذکر نہ ہو اور لوگوں کو میدان محشر میں جمع کرنے اور ان کے محاسبے کی کیفیت بیان نہ کی گئی ہو۔ ان آیات کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسان اپنی آنکھوں سے قیامت کو دیکھ رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۚ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۖ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ○ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ○ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ۖ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ○ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۖ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ○ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ○﴾

’’اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے اور قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان بھی اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے ہوں گے، وہ پاک ہے اور اس شرک سے بالاتر ہے جو وہ کرتے ہیں۔ اور صور میں پھونکا جائے گا تو جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے بے ہوش ہوجائے گا سوائے اس کے جسے اللہ چاہے، پھر اس میں دوسری بار پھونکا جائے گا تو وہ یکا یک کھڑے (ہوکر) دیکھنے لگیں گے اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی اور (عملوں کی) کتاب رکھی جائے گی اور انبیاء اور گواہ لائے جائیں گے

اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اور ہر شخص نے جو عمل کیا ہوگا اسے اس کا پورا پورا اجر دیا جائے گا اور جو کچھ وہ کررہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے، حتی کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے دربان ان سے کہیں گے: کیا تمھارے پاس تمھی میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تم پر تمھارے رب کی آیتیں پڑھتے تھے اور تمھیں تمھاری اس دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے؟ وہ کہیں گے: کیوں نہیں! لیکن کافروں پر عذاب کا فیصلہ ثابت ہو چکا۔ (انھیں) کہا جائے گا: تم جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اس میں تم ہمیشہ رہو گے، چنانچہ تکبر کرنے والوں کا (یہ) ٹھکانا بہت برا ہے۔ اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے ہوں گے، وہ جنت کی طرف گروہ در گروہ لے جائے جائیں گے، حتی کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے دربان ان سے کہیں گے: تم پر سلام ہو، تم پاکیزہ رہے، اب تم اس میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔"[1]

قرآن حکیم نے جنت کے اوصاف نہایت واضح انداز میں بیان کیے ہیں جس کا صحابۂ کرام کے دلوں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ قرآن حکیم نے جنت کے متعلق یہ بیان کیا کہ وہ بے مثال ہے، اس کے کئی دروازے ہیں، اس میں بہت سے درجات ہیں۔ اس میں بہتی ہوئی نہریں ہیں، جاری چشمے ہیں، محلات اور خیمے ہیں۔ طرح طرح کے درخت ہیں جیسے سدرۃ المنتہٰی اور طوبیٰ۔ قرآن حکیم نے اہل جنت کو ملنے والی نعمتوں ملبوسات، زیورات، بستروں، قالینوں، خدام، بیویوں اور آپس کی گفتگو کی کچھ کچھ تفصیلات بیان کی ہیں اور اہل جنت کو

---

[1] الزمر 39:67-73.

ملنے والی سب سے اعلیٰ نعمت اور ان کے اظہار تشکر کی وضاحت کی ہے۔ قرآن حکیم کی اس توضیح نے صحابۂ کرام کے قلوب و اذہان اور ان کے جذبات و احساسات پر مکمل غلبہ پالیا (حتیٰ کہ خالقِ جنت کی اطاعت کرکے ان نعمتوں کا حصول ان کا مطمح نظر بن گیا۔) قرآن حکیم کی روشنی میں جنت کے بعض اوصاف درج ذیل ہیں:

جنت کا بے مثال ہونا: جنت کی نعمتیں خالصتاً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے جود وکرم اور فضل و احسان کا مظہر ہیں جو اس نے اپنے صاحبِ تقوی بندوں کے لیے تیار کر رکھی ہیں جن میں سے چند ایک نعمتوں کا ذکر فرما دیا (تاکہ ان کے حصول کے لیے تڑپ پیدا ہو) اور بہت سی نعمتوں کو پردۂ غیب میں رہنے دیا۔ ہمیں رب ذوالجلال نے صرف اتنا بتایا کہ وہ نعمتیں ایسی ہیں جو فی الحال تمھاری عقل سے بالا ہیں، تمھاری سوچ اور فکر بھی اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّآ أُخۡفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعۡيُنٍ جَزَآءَۢ بِمَا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ ○﴾

”کوئی شخص نہیں جانتا کہ (ان کے اعمال کے بدلے میں) ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک کی کون کون سی چیزیں پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔“[1]

اللہ تعالیٰ نے اس اجرعظیم کا سبب بھی بیان فرمایا کہ قیام اللیل اور انفاق فی سبیل اللہ جیسے عظیم اعمال کے صلے میں انھیں یہ انعامات حاصل ہوں گے۔

جنت کے درجات: سب اہل جنت کے اعمال یکساں نہیں ہوں گے۔ بعض کی نیکیاں دوسروں کی نسبت زیادہ ہوں گی اور اس وجہ سے انھیں دوسروں پر فضیلت حاصل ہوگی۔ آخرت میں بھی ان کے درجات ان کی نیکیوں کی نسبت بلند ہوں گے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَمَن يَأۡتِهِۦ مُؤۡمِنٗا قَدۡ عَمِلَ ٱلصَّٰلِحَٰتِ فَأُوْلَٰٓئِكَ لَهُمُ ٱلدَّرَجَٰتُ ٱلۡعُلَىٰ ○﴾

”اور جو اس کے حضور مومن (بن کر) حاضر ہوگا، جبکہ اس نے نیک عمل کیے ہوں

---

[1] السجدة 17:32.

تو انھی (لوگوں) کے درجے بلند ہیں۔''[1]

ایمان لانے والے اولیاء اللہ اپنے اپنے ایمان اور تقوے کے لحاظ سے ان درجات کو حاصل کریں گے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ○﴾

''دیکھیے! کس طرح ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی؟ اور یقیناً آخرت درجوں میں بڑھ کر ہے اور فضیلت دینے میں (بھی) بڑھ کر ہے۔''[2]

اور فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍؕ كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ○﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی تو ہم ان کی اولاد کو (جنت میں) ان سے ملا دیں گے اور ہم ان کے عمل میں سے کچھ بھی کم نہیں کریں گے۔ ہر شخص اس کے عوض جو اس نے کمایا گروی ہے۔''[3]

جنت کی نہریں: قرآن کریم کی متعدد آیات میں جنت کی نہروں کا تذکرہ ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَؕ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ۬ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّىؕ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْؕ﴾

''اس جنت کی صفت جس کا متقین سے وعدہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ اس میں (ایسے) پانی کی نہریں ہیں جو بدلنے والا نہیں اور ایسے دودھ کی نہریں ہیں جس کا

---

[1] طٰه 75:20. [2] بني إسرآئيل 21:17. [3] الطور 21:52.

ذائقہ (کبھی) تبدیل نہ ہوا ہوگا اور ایسی شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہے اور صاف شفاف شہد کی نہریں ہیں، اور وہاں ان (متقین) کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہوگی۔'' [1]

جنت کے چشمے: جنت میں ایسے بے شمار چشمے ہیں جن کے مشروبات اور ذائقے مختلف ہیں، فرمان الٰہی ہے: ﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ○﴾

''بے شک متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔'' [2]

فرمان الٰہی ہے: ﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ ظِلٰلٍ وَّ عُیُوْنٍ ○﴾

''بے شک متقی لوگ چھاؤں میں اور بہتے چشموں میں ہوں گے۔'' [3]

خشیت الٰہی رکھنے والوں کے لیے جو دو دو باغات تیار کیے گئے ہیں، انھیں اس طرح بیان فرمایا:

﴿فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ○﴾

''ان دونوں (باغوں) میں دو چشمے جاری ہوں گے۔'' [4]

پھر اگلی آیات میں اس بات کو اس انداز میں بیان فرمایا:

﴿فِیْهِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ○﴾

''ان میں جوش مارتے دو چشمے ہیں۔'' [5]

جنت میں دو چشمے ایسے ہیں جن کا خالص پانی بغیر کسی آمیزش کے مقرب لوگ نوش فرمائیں گے۔ نیک لوگوں کے لیے اس پانی میں مزید ذائقوں کی آمیزش بھی کی جائے گی۔ ایک چشمہ کافور ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۚ○ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا ○﴾

---

[1] محمد 15:47۔ [2] الحجر 45:15۔ [3] المرسلٰت 41:77۔ [4] الرحمٰن 50:55۔ [5] الرحمٰن 66:55۔

”بے شک نیک لوگ ایسے جام سے پئیں گے جس میں کافور کی ملاوٹ ہوگی، (وہ) ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے بندے پئیں گے اور (جدھر چاہیں گے) اس کی شاخیں نکال لے جائیں گے۔“ [1]

دوسرا چشمہ تسنیم ہے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۙ○ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ ۙ○ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ۚ○ يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ۙ○ خِتَامُهُ مِسْكٌ ۚ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ۭ○ وَمِزَاجُهُ مِن تَسْنِيمٍ ۙ○ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ○﴾

”بے شک نیک لوگ ضرور نعمتوں میں ہوں گے، مسہریوں پر (بیٹھے) دیکھ رہے ہوں گے، ان کے چہروں پر آپ نعمتوں کی تازگی محسوس کریں گے، انھیں مہر لگی خالص شراب پلائی جائے گی، اس پر کستوری کی مہر لگی ہوگی، لہٰذا شائقین کو اسی کا شوق کرنا چاہیے، اس میں تسنیم کی آمیزش ہوگی، (وہ) ایک چشمہ ہے جس سے (اللہ کے) مقرب بندے پئیں گے۔“ [2]

جنت کے چشموں میں سے ایک کا نام سلسبیل ہے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا ۚ○ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا ○﴾

”اور وہاں انھیں ایسے جام پلائے جائیں گے جن میں سونٹھ کی ملاوٹ ہوگی، (یہ) جنت میں ایک چشمہ ہے جسے سلسبیل کا نام دیا گیا ہے۔“ [3]

جنت کے درخت: جنت کے بعض درختوں کے اوصاف قرآنی آیات کی روشنی میں درج ذیل ہیں:

---

[1] الدھر 76:5,6۔ [2] المطففین 83:22-28۔ [3] الدھر 76:17,18۔

سدرۃ المنتہیٰ: اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اس درخت کا ذکر فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ اس درخت کے قریب ہی نبی کریم ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا ہے اور اسی درخت کے قریب ہی جنت الماویٰ ہے۔ اس درخت پر ایسی خوبصورتی طاری تھی کہ اس کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ۙ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی ○ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی ۗ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰی ۙ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ○﴾

”اور البتہ تحقیق اس (رسول) نے اس (جبریل) کو ایک بار اور بھی اترتے دیکھا، سدرۃ المنتہیٰ (آخری حد کی بیری) کے قریب، اس کے نزدیک ہی جنت الماویٰ ہے، اس وقت بیری پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا، نگاہ نہ تو بہکی اور نہ حد سے بڑھی۔“ [1]

شجر طوبیٰ: یہ ایک بہت بڑا درخت ہے جس سے اہل جنت کا لباس تیار ہوتا ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«طُوبٰی شَجَرَةٌ فِي الْجَنَّةِ مَسِيرَةُ مِائَةِ عَامٍ، ثِيَابُ أَهْلِ الْجَنَّةِ تَخْرُجُ مِنْ أَكْمَامِهَا»

”طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے جس کا سایہ ایک سو سال کی مسافت کے برابر ہے اہل جنت کا لباس اس کے شگوفوں سے تیار ہوگا۔“ [2]

اتنا بڑا درخت کہ ایک سوار اس کے سایے میں ایک سو سال تک چلتا رہے اس کی مقدار کا اندازہ اس کے خالق کے سوا اور کون کرسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس درخت کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ اتنا بڑا ہوگا کہ اگر کوئی تیز رفتار شہسوار اس درخت کے سایے کو عبور کرنا چاہے تو اسے ایک سو سال درکار ہوں گے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

---

[1] النجم 53:13-17۔ [2] سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني: 4/639، حديث: 1985.

«إِنَّ فِي الْجَنَّةِ لَشَجَرَةً يَّسِيرُ الرَّاكِبُ فِي ظِلِّهَا مِائَةَ سَنَةٍ، وَاقْرَؤُوا إِنْ شِئْتُمْ: ﴿وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۝﴾

’’جنت میں اس قسم کا درخت ہے کہ اس کے سایے میں ایک سوار سو سال تک چلتا رہے گا۔‘‘ اگر تم چاہتے ہو تو یہ آیت پڑھو: ’’اور لمبے سایوں میں۔‘‘[1]

اور یہ سب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کی حسن تخلیق کے دلائل ہیں۔

اہل جنت کی خوراک اور مشروبات: اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ جنت میں اہل جنت جس قسم کی خوراک اور مشروبات کی تمنا کریں گے وہ انھیں پیش کیے جائیں گے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۝﴾

’’اور (ان کے سامنے پیش کیے جائیں گے) ایسے پھل جن کا وہ انتخاب کریں گے۔‘‘[2]

ایک اور مقام پر یوں فرمایا:

﴿يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾

’’ان پر سونے کی رکابیوں اور ساغروں کے دور چل رہے ہوں گے، اور اس (جنت) میں جس شے کو ان کے دل چاہیں گے اور (ان کی) آنکھیں متلذذ ہوں گی (وہ موجود ہوگی) اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔‘‘[3]

اور اللہ تعالیٰ نے انھیں اجازت دے دی ہے کہ وہ جنت کی جس نعمت کو پسند کریں اور جس قسم کا کھانا اور مشروب انھیں پسند ہو وہ حاصل کرلیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝﴾

’’(کہا جائے گا:) مزے سے کھاؤ اور پیو ان (اعمال) کے بدلے جو تم نے

---

[1] صحيح البخاري، حديث:3252. [2] الواقعة56:20. [3] الزخرف43:71.

گزرے دنوں میں آگے بھیجے۔‘‘ [1]

اہل جنت کی شراب: اللہ تعالیٰ اہل جنت کو جن مشروبات سے نوازیں گے ان میں سے ایک شراب ہے۔ دنیا کی شراب اپنے اندر بے شمار خامیاں اور آفات لیے ہوتی ہے۔ اس سے عقل زائل ہو جاتی ہے، سر چکراتا ہے، پیٹ خراب ہو جاتا ہے، بدن بیماریوں کا مجموعہ بن جاتا ہے، کمزوریاں لاحق ہو جاتی ہیں، ذائقہ کڑوا ہوتا ہے، رنگ اور مہک ناپسندیدہ ہوتی ہے مگر جنت کی شراب ان تمام خامیوں سے پاک ہوگی۔ صاف وشفاف، مہکتی ہوئی اور دل نشین ہوگی۔ [2] فرمان الٰہی ہے:

﴿يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ۝ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشَّٰرِبِينَ ۝ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنزَفُونَ ۝﴾

’’ان کے لیے جاری چشمے سے شراب (طہور) کا بھرا جام پھرایا جائے گا، سفید رنگ (بالکل صاف شفاف) پینے والوں کے لیے لذت (والی ہوگی)، نہ اس سے سر چکرائے گا اور نہ وہ اس سے مدہوش ہوں گے۔‘‘ [3]

اللہ تعالیٰ نے اس کی رنگت کی خوبصورتی بیان فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ یہ پینے میں لذیذ ہوگی۔ اس کے پینے سے اکتاہٹ نہیں ہوگی۔

اس شراب کی دو خوبیاں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سیل بند ہوگی اور دوسری یہ کہ پینے کے بعد انھیں کستوری کی خوشبو محسوس ہوگی۔ [4]

اہل جنت کا کھانا پینا کسی غلاظت کا سبب نہیں بنے گا: جنت ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہوگی اور اہل جنت اس میل کچیل سے پاک ہوں گے جس سے اہل دنیا بچ نہیں سکتے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

---

[1] الحآقّة 24:69. [2] اليوم الآخر في الجنة والنار لعمر الأشقر، ص: 23. [3] الصّٰفّٰت 37:45-47.

[4] تفسير ابن كثير: 514/6.

«إِنَّ أَوَّلَ زُمْرَةٍ يَّدْخُلُونَ الْجَنَّةَ عَلٰى صُورَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ عَلٰى أَشَدِّ كَوْكَبٍ دُرِّيٍّ فِي السَّمَاءِ إِضَاءَةً، لَا يَبُولُونَ وَلَا يَتَغَوَّطُونَ، وَلَا يَتْفِلُونَ وَلَا يَمْتَخِطُونَ»

"میری امت میں سے سب سے پہلی جماعت جو جنت میں داخل ہوگی ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتے ہوں گے۔ ان کے بعد وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے جو آسمان کے سب سے زیادہ چمکدار ستارے کے مانند ہوں گے۔ نہ انھیں بول و براز کی حاجت ہوگی نہ بلغم اور تھوک آئے گا۔"[1]

جنت میں درجات کا فرق نور کی کمی اور زیادتی سے ہوگا جیسا کہ اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن آلودگی اور غلاظت سے پاک ہونے میں سب یکساں ہوں گے نہ انھیں بول و براز کی حاجت ہوگی نہ ان کے جسم سے بو آئے گی، نہ وہ تھوکیں گے اور نہ انھیں ناک صاف کرنی پڑے گی۔ کھانے پینے کا کچھ فضلہ خوشبو دار پسینے میں تبدیل ہو کر بہہ جائے گا اور کچھ ڈکار سے خارج ہو جائے گا لیکن اس ڈکار سے بڑی عمدہ خوشبو مہکے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ أَهْلَ الْجَنَّةِ يَأْكُلُونَ فِيهَا وَيَشْرَبُونَ، وَلَا يَتْفِلُونَ وَلَا يَبُولُونَ، وَلَا يَتَغَوَّطُونَ وَلَا يَمْتَخِطُونَ، قَالُوا: فَمَا بَالُ الطَّعَامِ، قَالَ: جُشَاءٌ وَّرَشْحٌ كَرَشْحِ الْمِسْكِ»

"اہل جنت کھائیں گے، پئیں گے مگر تھوکیں گے نہیں، نہ پیشاب کریں گے نہ پاخانہ، نہ ناک صاف کرنے کی ضرورت ہوگی۔" صحابہ نے پوچھا: "وہ کھانا کہاں جائے گا؟" تو آپ ﷺ نے فرمایا: "ڈکار اور پسینہ بن جائے گا جن سے کستوری

---

[1] صحيح البخاري، حديث:3327، و صحيح مسلم، حديث:2834.

کی خوشبو مہکے گی۔“ [1]

اہل جنت کے ملبوسات، زیورات اور عود دان: اہل جنت اعلیٰ قسم کے لباس زیب تن کریں گے اور سونے، چاندی، ہیرے جواہرات کے خوبصورت زیورات سے آراستہ ہوں گے۔ ان کے ملبوسات ریشمی ہوں گے۔ کنگن سونے، چاندی اور جواہرات سے مرصع ہوں گے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۝﴾

”ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے، وہاں انھیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور وہاں ان کا لباس ریشمی ہوگا۔“ [2]

مزید فرمایا:

﴿عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۫ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝﴾

”ان (کے تن) پر باریک، سبز اور دبیز ریشم کے کپڑے (لباس) ہوں گے اور انھیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب انھیں شراب طہور پلائے گا۔“ [3]

ان کے لباس مختلف رنگوں کے ہوں گے، ان میں سے ایک رنگ سبز بھی ہوگا۔ وہ سبز رنگ کے باریک اور موٹے ریشم کے لباس پہنیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی بتایا ہے کہ اہل جنت کی کنگھیاں سونے اور چاندی کی ہوں گی اور وہ عود دان میں خوشبودار عود جلا کر اپنے کمروں کو معطر کر رہے ہوں گے اور ان کے پاکیزہ جسموں سے کستوری کی خوشبو مہک رہی ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«آنِيَتُهُمُ الذَّهَبُ وَالْفِضَّةُ، وَأَمْشَاطُهُمُ الذَّهَبُ، وَوَقُودُ مَجَامِرِهِمِ

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2835. [2] فاطر 33:35. [3] الدھر 21:76.

الْأَلُوَّةُ، يَعْنِي الْعُودَ، وَرَشْحُهُمُ الْمِسْكُ»

’’ان (اہل جنت) کے برتن سونے اور چاندی کے ہوں گے۔ ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی۔ ان کے عود دان میں خوشبو دار لکڑی جل رہی ہوگی اور ان کا پسینہ کستوری کی طرح مہک رہا ہوگا۔‘‘ [1]

اہل جنت کے لباس اور زیورات نہ بوسیدہ ہوں گے اور نہ ختم۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ يَّدْخُلِ الْجَنَّةَ يَنْعَمُ لَا يَبْأَسُ، لَا تَبْلٰى ثِيَابُهٗ وَلَا يَفْنٰى شَبَابُهٗ»

’’جنت میں جانے والے ہمیشہ تر و تازہ رہیں گے کبھی بدحال نہیں ہوں گے، نہ ان کے لباس بوسیدہ ہوں گے اور نہ ان کی جوانی ختم ہوگی۔‘‘ [2]

اہل جنت کی گفتگو اور محفلیں: اہل جنت ایک دوسرے سے ملاقاتیں کریں گے، پاکیزہ محفلوں میں اکٹھے ہوں گے، دنیا میں اپنے احوال یاد کر کے اللہ تعالیٰ کے انعامات اور جنت ملنے کا تذکرہ کریں گے۔ اہل جنت کی مجالس کے بارے میں فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ○ ﴾

’’اور ان کے سینوں میں جو کینہ حسد ہوگا ہم نکال دیں گے، (وہ) تختوں پر آمنے سامنے (بیٹھے) بھائی بھائی ہوں گے۔‘‘ [3]

قرآن حکیم نے ہمیں بتایا کہ وہ اپنی محفلوں میں کس قسم کی گفتگو کریں گے:

﴿ وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ○ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ○ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ○ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ○ ﴾

’’اور وہ (اہل جنت) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر باہم (حال) پوچھیں گے،

---

[1] صحیح البخاري، حدیث:3246، و صحیح مسلم، حدیث:2834(17). [2] صحیح مسلم، حدیث:2836. [3] الحجر 47:15.

وہ کہیں گے: بلاشبہ ہم (اس سے) پہلے اپنے اہل و عیال میں (اللہ سے) ڈرا کرتے تھے، پھر اللہ نے ہم پر احسان کیا اور اس نے ہمیں (جھلسا دینے والی) لو کے عذاب سے بچا لیا، بلاشبہ ہم پہلے ہی اس (اللہ) کو پکارا کرتے تھے، بے شک وہی خوب احسان کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔"[1]

اہل جنت ان شرپسندوں کا تذکرہ بھی کریں گے جو دنیا میں اہل ایمان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرتے تھے اور انھیں کفر کی طرف بلاتے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ○ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّىْ كَانَ لِىْ قَرِيْنٌ ○ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ○ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ○ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ○ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِىْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ○ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ○ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّىْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ○ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ○ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ○ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ○﴾

"وہ (جنتی) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر باہم پوچھیں گے، ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا: بے شک میں (دنیا میں) میرا ایک ہم نشین تھا، جو کہتا تھا: کیا بھلا تو بھی (قیامت کی) تصدیق کرنے والوں میں سے ہے؟ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم (اٹھا کر) بدلہ دیے جائیں گے؟ وہ (جنتی ساتھیوں سے) کہے گا: کیا تم (جہنم میں) جھانک کر دیکھو گے؟ پھر وہ جھانکے گا تو اسے جہنم کے درمیان میں دیکھے گا۔ وہ (اس سے) کہے گا: اللہ کی قسم! یقیناً قریب تھا کہ تو مجھے ہلاک کر ڈالتا۔ اور اگر میرے رب کا فضل نہ ہوتا تو میں ضرور حاضر کیے ہوؤں (مجرموں) میں سے ہوتا۔ (جنتی ساتھیوں سے کہے گا:) تو کیا پس (اب) ہم مرنے والے نہیں۔ اپنے پہلی بار مرنے کے سوا اور نہ ہمیں عذاب

---

[1] الطور 52:25-28.

ہی ہوگا۔ بلاشبہ یہ تو بہت بڑی کامیابی ہے۔ عمل کرنے والوں کو تو ایسی ہی (کامیابی) کے لیے عمل کرنے چاہئیں۔“ [1]

اہل جنت کی بیویاں: دنیا میں مومن کی مومن بیوی آخرت میں بھی اس کی بیوی ہوگی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَہَا وَمَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِہِمۡ وَاَزۡوَاجِہِمۡ وَذُرِّیّٰتِہِمۡ وَالۡمَلٰٓئِکَۃُ یَدۡخُلُوۡنَ عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ کُلِّ بَابٍ ۝﴾

”جو کہ ہمیشہ کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بھی جو ان کے باپ دادا اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے صالح ہوئے۔ اور فرشتے (جنت کے) ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے۔“ [2]

اہل جنت سایے میں تکیے لگا کر بیٹھے ہوں گے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ہُمۡ وَاَزۡوَاجُہُمۡ فِیۡ ظِلٰلٍ عَلَی الۡاَرَآئِکِ مُتَّکِـُٔوۡنَ ۝﴾

”وہ اور ان کی بیویاں سایوں میں تختوں پر ٹیک لگائے ہوں گے۔“ [3]

فرمان ربانی ہے: ﴿اُدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ اَنۡتُمۡ وَاَزۡوَاجُکُمۡ تُحۡبَرُوۡنَ ۝﴾

”تم جنت میں داخل ہو جاؤ، تم اور تمھاری بیویاں خوش حال ہو گے۔“ [4]

حیران کن حد تک حسین و جمیل عورتیں: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿کَذٰلِکَ ۟ وَزَوَّجۡنٰہُمۡ بِحُوۡرٍ عِیۡنٍ ۝﴾

”اسی طرح ہوگا۔ اور ہم غزال چشم (بڑی بڑی آنکھوں والی) حوروں کو ان کی بیویاں بنا دیں گے۔“ [5]

حور، حوراء کی جمع ہے۔ (اردو میں ”حور“ بطور واحد مستعمل ہے) حوراء اس عورت کو کہتے ہیں جس کی آنکھوں کا سفید حصہ انتہائی سفید ہو اور سیاہ حصہ انتہائی سیاہ ہو۔ اور عین

---

[1] الصّٰفّٰت 37:50-61. [2] الرعد 13:23. [3] یٰسٓ 36:56. [4] الزخرف 43:70. [5] الدخان 44:54.

عَیناء کی جمع ہے جبکہ عیناء موٹی آنکھوں والی عورت کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حورعین کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ نوجوان اور ہم عمر ہوں گی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ۝ حَدَآئِقَ وَأَعْنَٰبًا ۝ وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ۝﴾

”بے شک متقی لوگوں کے لیے کامیابی ہے، باغات اور انگور ہیں اور نوجوان ہم عمر عورتیں (ہیں)۔“ [1]

فرمان ربانی ہے:

﴿فَجَعَلْنَٰهُنَّ أَبْكَارًا ۝ عُرُبًا أَتْرَابًا ۝﴾

”پس ہم انھیں کنواریاں بنائیں گے، من موہنی، ہم عمر۔“ [2]

ان کے کنوارا پن سے مراد یہ ہے کہ قبل ازیں کسی کی زوجیت میں نہیں گئی ہوں گی جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿فِيهِنَّ قَٰصِرَٰتُ ٱلطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۝﴾

”ان میں جھکی نظروں والی (شرمیلی اور باحیا حوریں) ہوں گی، ان سے پہلے انھیں کسی انسان اور کسی جن نے ہاتھ نہیں لگایا ہوگا۔“ [3]

قرآن کریم نے جنت کی عورتوں کا حسن و جمال اس طرح بیان کیا ہے:

﴿وَحُورٌ عِينٌ ۝ كَأَمْثَٰلِ ٱللُّؤْلُؤِ ٱلْمَكْنُونِ ۝﴾

”اور (ان کے لیے) غزال چشم حوریں (ہوں گی)، جیسے غلاف میں لپٹے ہوئے موتی۔“ [4]

مکنون سے مراد محفوظ اور چھپا ہوا موتی ہے کہ سورج کی شعاعوں سے اس کا رنگ خراب نہ ہوا ہو اور نہ ہاتھوں کے لمس سے اس پر کوئی نشان پڑے ہوں۔ قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر انھیں ہیرے اور جواہرات سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

---

[1] النّبأ 78:31-33. [2] الواقعة 56:36,37. [3] الرحمٰن 55:56. [4] الواقعة 56:22,23.

﴿كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ ۝﴾

’’گویا وہ ہیرے اور موتی (مونگے) ہیں۔‘‘ [1]

جنت کی عورتیں دنیا کی عورتوں جیسی نہیں ہوں گی، انھیں حیض، نفاس، بول و براز اور تھوک و بلغم نہیں آئے گا۔ [2]

نبی کریم ﷺ نے جنت کے مردوں اور عورتوں کے حسن و جمال کے بارے میں فرمایا ہے:

«أَوَّلُ زُمْرَةٍ تَلِجُ الْجَنَّةَ، صُورَتُهُمْ عَلٰى صُورَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، لَا يَبْصُقُونَ فِيهَا وَلَا يَمْتَخِطُونَ وَلَا يَتَغَوَّطُونَ فِيهَا، آنِيَتُهُمْ وَأَمْشَاطُهُمْ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، وَمَجَامِرُهُمْ مِّنَ الْأَلُوَّةِ وَرَشْحُهُمُ الْمِسْكُ، وَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ زَوْجَتَانِ، يُرٰى مُخُّ سُوقِهِمَا مِنْ وَّرَاءِ اللَّحْمِ مِنَ الْحُسْنِ»

’’سب سے پہلی جماعت جو جنت میں داخل ہوگی وہ چودھویں رات کے چاند کی طرح (حسین و جمیل) ہوں گے۔ نہ وہ تھوکیں گے نہ انھیں بلغم آئے گا اور نہ بول و براز کی حاجت ہوگی۔ جنت میں ان کے برتن اور کنگھیاں سونے چاندی کے ہوں گے۔ ان کے عود دان میں خوشبودار لکڑی جل رہی ہوگی۔ ان کا پسینہ کستوری کی طرح مہک رہا ہوگا۔ ان میں سے ہر ایک کی دو دو بیویاں ہوں گی۔ وہ اتنی حسین ہوں گی کہ ان کی پنڈلی کا گودا حسن کی وجہ سے گوشت کے باہر سے نظر آئے گا۔‘‘ [3]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابۂ کرام کو اہل جنت کے حسن و جمال کی جو جھلک دکھائی ہے، ذرا غور کریں کہ کہیں آپ کو اس کی مثال مل سکتی ہے۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

«وَلَوْ أَنَّ امْرَأَةً مِّنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ اطَّلَعَتْ إِلٰى أَهْلِ الْأَرْضِ لَأَضَاءَتْ مَا

---

[1] الرحمٰن 55:58. [2] الوسطية في القرآن الكريم للصلابي، ص:433. [3] صحيح البخاري، حديث:3245، وصحيح مسلم، حديث:2834(17).

بَيْنَهُمَا وَلَمَلأَتْهُ رِيحاً، وَلَنَصِيفُهَا عَلٰى رَأْسِهَا خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا»

''اگر اہل جنت کی کوئی ایک عورت زمین والوں پر ایک نگاہ ڈال دے تو زمین و آسمان کا درمیانی حصہ چمک اٹھے اور خوشبو سے معطر ہو جائے اور اس کے سر کا دوپٹہ دنیا وما فیہا سے بہتر ہے۔''[1]

اہل جنت کے لیے دیدار الٰہی کا عظیم انعام: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب جنتی لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائیں گے: «تُرِيدُونَ شَيْئًا أَزِيدُكُمْ» ''تم مزید کسی چیز کی خواہش رکھتے ہو؟'' اہل جنت کہیں گے: (اے اللہ!) تو نے ہمارے چہروں کو منور فرما دیا ہے، ہمیں جنت میں داخل فرما دیا ہے اور جہنم سے ہمیں بچا لیا ہے (ہمیں اور کیا چاہیے؟) تب اللہ تعالیٰ اپنے حجاب کو ہٹائیں گے۔ اس طرح اہل جنت کو اپنے رب کے دیدار سے بہتر کوئی عطیہ زیادہ محبوب نہ ہوگا۔''[2]

ایک اور روایت میں ہے کہ اسے بیان کرنے کے بعد آپ ﷺ نے حسب ذیل آیت تلاوت فرمائی:

﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

''جن لوگوں نے نیک کام کیے ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید (دیدارِ الٰہی) ہے اور ان کے چہروں کو سیاہی اور ذلت نہیں ڈھانپے گی، یہی لوگ جنتی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''[3]

اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا مندی بھی حاصل ہوگی۔ حضرت ابوسعید

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 2796. [2] صحيح مسلم، حديث: 181، و جامع الترمذي، حديث: 2555، وسنن ابن ماجه، حديث: 187، و مسند أحمد: 333,332/4. [3] يونس 26:10.

خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’بے شک اللہ تعالیٰ اہل جنت سے مخاطب ہو کر فرمائے گا: «يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ!» ’’اے اہل جنت!‘‘ وہ جواب دیں گے: ’’اے ہمارے پروردگار! ہم حاضر ہیں۔ بھلائی صرف تیرے پاس ہے۔‘‘ اللہ پوچھے گا: «هَلْ رَضِيتُمْ؟» ’’کیا تم خوش ہو؟‘‘ وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! ہم کیسے خوش نہ ہوں تو نے تو ہمیں اتنا کچھ عطا کر دیا ہے، جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو عطا نہیں کیا۔ تب اللہ تعالیٰ فرمائے گا: «أَنَا أُعْطِيكُمْ أَفْضَلَ مِنْ ذٰلِكَ؟» ’’کیا میں تمھیں اس سے بھی اچھی چیز دوں؟‘‘ اہل جنت کہیں گے کہ اے پروردگار! اس سے عمدہ چیز کیا ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: «أُحِلُّ عَلَيْكُمْ رِضْوَانِي فَلَا أَسْخَطُ عَلَيْكُمْ بَعْدَهُ أَبَدًا» ’’میں تم سے راضی ہو گیا ہوں۔ آج کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔‘‘[1]

اہل جنت کی دعاؤں کے اختتامی کلمات: اہل ایمان کو قیامت کے دن بڑی بڑی ہولناکیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پل صراط پر سے گزرتے وقت وہ بڑا خوف اور رعب محسوس کریں گے، پھر اللہ تعالیٰ ان کے سب غم دور کر کے انھیں نعمتوں والے باغات میں داخل فرمائے گا۔ وہاں وہ اللہ تعالیٰ کی تیار کردہ بڑی بڑی نعمتوں کا مشاہدہ کریں گے تو بے ساختہ ان کی زبانوں سے اپنے رب کی تحمید و تقدیس کے کلمات جاری ہو جائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سب غم دور کر دیے ہوں گے اور اپنے تمام وعدوں کو پورا کرتے ہوئے انھیں جنت کا وارث بنا دیا ہو گا۔ فرمان ربانی ہے:

﴿دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○﴾

’’اس (جنت) میں ان کی پکار ہو گی: اے اللہ! تو پاک ہے۔ اور اس میں ان کی

---

[1] صحيح البخاري، حديث:6549، و صحيح مسلم، حديث:2829.

دعا ہوگی: سلام۔ اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ تمام تعریفیں اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہیں۔ ”[1]

نبی کریم ﷺ اپنے صحابۂ کرام کی اسی بات پر تربیت فرماتے رہے کہ ان کی جدو جہد کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کو خوش کرنا ہے تاکہ وہ راضی ہوکر انھیں اعلیٰ ترین باغات میں داخل فرمائے۔ آپ ﷺ قرآنی اسلوب میں اپنے صحابہ کو جنت کے اوصاف بتایا کرتے تھے اور صحابۂ کرام اس وقت یوں محسوس کرتے گویا جنت ان کے سامنے ہے، وہ فوراً اس سے متاثر ہوتے گویا کہ وہ جنت کو حقیقتاً اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ قرآنی اسلوب کا اعجاز ہے کہ وہ آخرت جو ابھی آئی نہیں، کے حالات کو یوں بیان کرتا ہے کہ انسان خود کو عالم آخرت میں تصور کرتا ہے اور اس عالم دنیا کو جس میں عملاً زندگی گزار رہا ہے یوں سمجھتا ہے گویا وہ اسے چھوڑ چکا ہے اور اس سے جدا ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں۔[2]

جنت کا اچھوتا تصور اور اس پر یقین کامل امت مسلمہ کی ترقی اور پیش قدمی کے لیے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ جب امت کے افراد کے دلوں میں جنت کے باغات کا تصور بیدار ہوجائے تو وہ (جنت کے مالک) اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے زیادہ جوش کے ساتھ عمل کریں گے اور اس کے حضور بہترین اور نفیس ترین اعمال پیش کریں گے۔ ان کے دلوں سے کمزوری اور موت سے کراہت ختم ہوجائے گی۔ ان کے دلوں میں ایسا جوش و جذبہ اور ولولہ پیدا ہوگا کہ وہ اللہ کے دین کے غلبے کے لیے صبر و استقامت اور عزیمت کے ساتھ اپنی تمام توانائیاں استعمال کریں گے۔

امت مسلمہ کی تاریخ کے سنہری اوراق میں جو فیصلہ کن معرکے اور عظیم فتوحات رقم ہیں وہ اس بات پر شاہد ہیں کہ ان عظیم کامیابیوں کے نمایاں اسباب یہ تھے کہ سپہ سالاروں اور مجاہدین کی انتہائی چاہت تھی کہ انھیں اللہ کی راہ میں شہادت کا اعزاز حاصل ہو جائے۔ وہ

---

[1] یونس 10:10. [2] دراسات قرآنیة لمحمد قطب، ص:81.

فریضۂ جہاد کی صورت میں عبادت میں مصروف رہتے اور اللہ تعالیٰ کی جنتوں کو حاصل کرنے کا ان کا شوق جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔

تاریخ اسلام میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں، مثلاً: اندلس میں عیسائیوں کے خلاف معرکۂ زلاقہ میں یوسف بن تاشفین کی قیادت میں کامیابی حاصل ہوئی، نیز معرکہ حطین میں صلاح الدین ایوبی کی فتح، عین جالوت میں تاتاریوں کے مقابلے میں سیف الدین قطز اور رکن الدین بیبرس کی کامیابی اور محمد الفاتح کی قیادت میں قسطنطنیہ کی فتح اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

قرآن کریم میں جہنم کا بیان اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر اس کے اثرات

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف جاگزیں تھا۔ وہ اس کے مواخذے سے ڈرتے تھے مگر اس کی رحمت کی امید بھی رکھتے تھے۔ نبی کریم ﷺ کی تربیت کا پورا اثر ان کے دلوں میں موجود تھا۔ آپ ﷺ نے قرآنی اسلوب ہی اختیار فرمایا تھا اور یہ اسلوب صحابۂ کرام کے دلوں پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوا۔

قرآن کریم نے قیامت کے دن کی ہولناکیوں اور اس کے اثرات کو بیان کیا ہے کہ کس طرح زمین اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی مٹھی میں ہوگی اور اسے ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا اور کس طرح آسمان کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور پہاڑوں کو روئی کی طرح اڑا دیا جائے گا اور کس طرح سمندروں کو پھاڑ دیا جائے گا اور ان میں آگ بھڑکا دی جائے گی۔ آسمان تھرتھرا کر پھٹ جائے گا۔ سورج کو لپیٹ دیا جائے گا۔ چاند بے نور ہو جائے گا اور ستارے ٹوٹ جائیں گے۔

قرآن کریم نے قیامت کے دن کفار کی بھی منظر کشی کی ہے کہ وہ کس طرح ذلیل و رسوا اور حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے ہوں گے، ان کے اچھے اعمال کسی کام نہ آئیں گے۔

جھوٹے معبود اور ان کے پجاری آپس میں لڑیں گے۔ گمراہی پھیلانے والے اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے آپس میں جھگڑا کریں گے۔ دنیا میں سرداروں نے جن لوگوں کو زبردستی اپنا ماتحت بنا رکھا تھا وہ ایک دوسرے سے جھگڑیں گے۔ کافر اپنے ساتھی شیطان سے الجھ رہا ہوگا، پھر اپنے جسم کے اعضاء کو موردِ الزام ٹھہرائے گا، روح اور جسم کا آپس میں جھگڑا ہوگا۔

قرآن کریم نے شفاعت کا تذکرہ بھی کیا ہے، اس کی شروط بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ کونسی شفاعت قبول ہوگی اور کون سی ردّ کردی جائے گی۔ حساب اور جزا و سزا کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ حساب کس طرح ہوگا، کافروں سے جواب دہی ہوگی اور کیوں ہوگی؟

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ تمام مخلوقات سے ظلم کا قصاص لیا جائے گا اور اس بات کا تفصیلاً ذکر کیا ہے کہ اس دن کس طرح قصاص لیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انسانی خون کی عظمت بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ قیامت کے دن میزان (ترازو) نصب کیے جائیں گے جن کے ذریعے اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ نبی کریم ﷺ نے حوض کے بارے میں خبر دی ہے اور بتایا ہے کہ کون کون سے لوگ اس حوض سے سیراب ہوں گے اور کن کن لوگوں کو اس حوض پر آنے سے روک دیا جائے گا۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ کس طرح کافروں کو گھسیٹ کر جہنم میں گرایا جائے گا اور کس طرح مومن اور منافق پل صراط پر سے گزریں گے اور وہاں سے صرف مومنین ہی نجات پاسکیں گے۔[1]

قیامت کے بارے میں اس گفتگو کا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں پر بڑا گہرا اثر تھا۔ قرآن کریم نے جہنم میں طرح طرح کے عذابوں کی تصویر کشی کی ہے۔ مسلمانوں کے اس ہراول دستے کی کیفیت یوں ہوگئی تھی گویا کہ وہ جہنم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

قرآن حکیم میں جہنم کے متعلق ان امور کی وضاحت موجود ہے:

---

[1] الوسطية في القرآن الكريم للصلابي، ص:402.

اہل جہنم کا کھانا پینا: قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اہل جہنم کا کھانا ضَرِیع (کانٹے دار خشک جھاڑیاں) اور زَقُّوم (کڑوا، زہریلا تھوہر کا درخت) ہوگا اور ان کا مشروب حَمِیم (گرم کھولتا ہوا پانی)، غِسلین (زخموں کی پیپ) اور غسّاق (پیپ وغیرہ) ہوگا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝﴾

"ان کا طعام صرف خار دار جھاڑیاں ہوگا، جو نہ موٹا کرے گا نہ بھوک مٹائے گا۔"[1]

اس قسم کا کھانا بھی ایک طرح کا عذاب ہے۔ نہ تو اس کے کھانے سے انھیں لذت حاصل ہوگی اور نہ ان کے جسموں کو کوئی فائدہ ہوگا۔

زَقُّوم (تھوہر) کے بارے میں فرمان ربانی ہے:

﴿اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۝ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ۝﴾

"بے شک تھوہر کا درخت، گناہ گار کا کھانا ہے، پگھلے تانبے (یا تلچھٹ) کے مانند، وہ پیٹوں میں تیز گرم پانی کے کھولنے کی طرح کھولے گا۔"[2]

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے زَقُّوم (تھوہر) کے متعلق فرمایا ہے:

﴿اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ۝ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ۝ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ۝﴾

"کیا یہ مہمانی بہتر ہے یا (دوزخ میں) تھوہر کا درخت؟ بلاشبہ ہم نے اسے ظالموں کے لیے آزمائش بنایا ہے، بے شک وہ ایک درخت ہے جو دوزخ کی تہ میں اگتا ہے، اس کا پھل گویا کہ وہ شیطانوں کے سر ہیں۔"[3]

اور یہ بھی فرمایا:

﴿وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ﴾

---

[1] الغاشیة 88:6,7. [2] الدخان 44:43-46. [3] الصّٰفّٰت 37:62-65.

’’اور اس درخت (زقوم) کو بھی جس پر قرآن میں لعنت کی گئی۔‘‘ [1]

ان آیات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تھوہر (زقوم) انتہائی بدترین درخت ہے جس کا بیج جہنم کی گہرائی میں لگایا گیا ہے اور اس کی شاخیں جہنم میں ہر جانب پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کا پھل انتہائی ناپسندیدہ ہے۔ اسے شیطان کے سر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اگرچہ لوگوں نے شیاطین کو دیکھا نہیں لیکن ان کی ڈراؤنی شکل کا تصور دلوں میں موجود ہے۔ اہل جہنم کی بھوک اس قدر بھڑکا دی جائے گی کہ وہ اس درخت اور اس کے پھل کی خباثت کے باوجود اسے کھانے پر مجبور ہو جائیں گے اور خوب پیٹ بھر کر کھائیں گے۔ جب ان کا پیٹ بھر جائے گا تو یہ ان کے پیٹ میں جوش مارنا شروع کر دے گا جیسا کہ تیل کی تلچھٹ میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ جس سے انتہائی تکلیف اور درد محسوس کریں گے۔ جب ان کی یہ کیفیت ہو جائے گی تو ان کو شدّت سے کھولتے پانی کے پاس لایا جائے گا تو وہ اس اونٹ کی طرح پانی پئیں گے جو پانی پیتا جاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا، پھر یہ گرم پانی ان کی انتڑیوں کو ریزہ ریزہ کر دے گا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَ سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ۝﴾

’’(کیا یہ لوگ) ان لوگوں کے مانند ہو سکتے ہیں جو آگ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور انھیں گرم کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا تو وہ ان کی آنتیں ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا؟‘‘ [2]

یہ قیامت والے دن جہنمیوں کی ضیافت ہوگی۔ [3]

﴿فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۝ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝ لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخٰطِئُوْنَ ۝﴾

’’لہٰذا آج یہاں کوئی اس کا غم خوار دوست نہیں اور زخموں کے دھوون کے سوا کوئی

---

[1] بنيّ إسرآء يل 60:17. [2] محمد 15:47. [3] اليوم الآخر في الجنة والنار لعمر الأشقر، ص: 88.

کھانا نہیں۔ خطا کاروں کے سوا اسے کوئی نہیں کھائے گا۔“[1]

اسی طرح ”غساق“ کا یوں تذکرہ کیا گیا ہے:

﴿هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ۙ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوَاجٌ ۝﴾

”یہ ہے کھولتا ہوا پانی اور پیپ، اب وہ اس کو چکھیں، اور اس کے مانند کئی قسم کے دوسرے (عذاب) ہوں گے۔“[2]

غِسلین اور غسّاق ایک ہی چیز ہے، یعنی وہ پیپ اور غلاظت جو اہل جہنم کے جسموں اور زخموں سے بہے گی۔ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ غلاظت ہے جو زانیہ عورتوں کی شرم گاہوں سے بہے گی اور کافروں کے گوشت اور کھالوں سے نکلے گی۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ غلاظت ہے جو اہل جہنم کے جسموں سے خارج ہوگی۔[3]

قرآن پاک میں اہل جہنم کے چار قسم کے مشروبات کا تذکرہ ہے:

① حَمِیم: انتہائی درجہ حرارت پر ابلتا ہوا پانی۔

② غَسَّاق: زخموں سے رستی ہوئی پیپ۔ اس کا ذکر خوراک اور مشروب دونوں میں کیا گیا ہے۔

③ صَدِید: کافروں کے گوشت اور کھالوں سے رستا ہوا آمیزہ۔

④ مُہْل: تلچھٹ۔ (تیل کی میل جو نیچے بیٹھ جائے)۔

جب یہ مشروبات جہنمی کے چہرے کے قریب آئیں گے تو چہرے کی کھال پگھل کر ان میں جا گرے گی۔[4]

اہل جہنم کے لباس: اہل جہنم کے لباس کے بارے میں فرمان ربانی ہے:

﴿سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ۝﴾

---

[1] الحاقة 69:35-37. [2] ص 38:57,58. [3] يقظة أولي الاعتبار مما ورد في ذكر الجنة والنار لصديق حسن، ص: 86. [4] اليوم الآخر في الجنة والنار لعمر الأشقر، ص: 90.

’’ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے اور آگ ان کے چہروں کو ڈھانپتی ہو گی۔‘‘ [1]

’’قَطِرَ ان‘‘ کے معنی پگھلا ہوا تانبا بھی کیے گئے ہیں۔

اہل جہنم کو دیے جانے والے عذاب کی اقسام: فرمان الٰہی ہے:

﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا﴾

’’(وہ دوزخ کی) آگ ہے جس پر انھیں صبح و شام پیش کیا جاتا ہے۔‘‘ [2]

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ○﴾

’’جنھوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکا، ہم انھیں عذاب پر عذاب زیادہ دیں گے، اس لیے کہ وہ فساد کرتے تھے۔‘‘ [3]

نبی کریم ﷺ نے اس شخص کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا جسے جہنم میں سب سے ہلکا عذاب دیا جائے گا:

«إِنَّ أَهْوَنَ أَهْلِ النَّارِ عَذَابًا يَّوْمَ الْقِيَامَةِ لَرَجُلٌ تُوضَعُ فِي أَخْمَصِ قَدَمَيْهِ جَمْرَةٌ يَّغْلِي مِنْهَا دِمَاغُهُ»

’’قیامت کے دن اہل جہنم میں سے اس شخص کا عذاب سب سے ہلکا ہوگا جس کے دونوں قدموں کے نیچے آگ کا انگارا رکھا جائے گا جس کی وجہ سے اس کا دماغ کھول رہا ہوگا۔‘‘ [4]

(اس سے معلوم ہوا کہ اہل جہنم کا عذاب یکساں نہ ہوگا، بعض کو سخت ترین عذاب ہوگا اور بعض کو اس سے کم ہوگا۔)

---

[1] إبرٰهيم 50:14. [2] المؤمن 46:40. [3] النحل 88:16. [4] صحيح البخاري، حديث: 6562,6561، وصحيح مسلم، حديث: 213.

اہل جہنم کا چہروں کے بل اٹھایا جانا اور آگ کا چہروں کو جھلسانا: اللہ تعالیٰ اہل جہنم کو اس انداز میں بھی ذلیل ورسوا کرے گا کہ انھیں اندھا، بہرا اور گونگا بنا کر چہرے کے بل چلائے گا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ۝﴾

”اور جسے اللہ ہدایت دے تو وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کرے تو آپ ان کے لیے اس (اللہ) کے سوا کوئی دوست ہرگز نہ پائیں گے اور ہم انھیں روزِ قیامت چہرے کے بل، اندھے، گونگے اور بہرے اٹھائیں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ جب بھی وہ بجھنے لگے گی تو ہم ان کے لیے اور بھڑکا دیں گے۔“ [1]

پھر ان کو چہروں کے بل گھسیٹ کر جہنم میں گرایا جائے گا۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ۭ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

”اور جو شخص برائی لائے گا تو ان کے منہ آگ میں اوندھے کر دیے جائیں گے (اور کہا جائے گا:) تم بس اسی کا بدلہ پاؤ گے جو تم عمل کرتے تھے۔“ [2]

پھر آگ ان کے چہروں کو جھلسائے گی اور ہمیشہ انھیں اپنی لپیٹ میں لیے رکھے گی۔ انھیں کوئی ایسی چیز حاصل نہیں ہوگی جسے وہ اپنے اور آگ کے درمیان لا کر اس سے اپنا بچاؤ کر سکیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ۝﴾

”آگ ان کے چہرے جھلسا دے گی اور وہ اس میں بدشکل ہوں گے۔“ [3]

---

[1] بنيِ إسرآء يل 97:17. [2] النّمل 90:27. [3] المؤمنون 104:23.

(جھلسنے کی وجہ سے نچلے ہونٹ نیچے کی جانب اور اوپر والے ہونٹ اوپر کی جانب کھینچ دیے جائیں گے۔)

اہل جہنم کا گھسیٹا جانا: دردناک عذاب کی ایک صورت یہ بھی ہوگی کہ کافروں کو جہنم میں چہروں کے بل گھسیٹا جائے گا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ○﴾

”جس دن وہ آگ میں اپنے چہروں کے بل گھسیٹے جائیں گے (کہا جائے گا:) تم جہنم (کے عذاب) کا چھونا چکھو۔“[1]

جہنم میں گھسٹتے وقت یہ چیز ان کی تکلیف میں مزید اضافے کا سبب بنے گی کہ ان کی گردنوں میں طوق اور پاؤں میں زنجیریں ہوں گی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ ○ۙ فِي الْحَمِيْمِ ڏ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ○﴾

”جب ان (جھٹلانے والوں) کی گردنوں میں طوق اور بیڑیاں ہوں گی (جن میں جکڑ کر) وہ گھسیٹے جائیں گے، کھولتے ہوئے پانی میں، پھر وہ آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔“[2]

اہل جہنم کے چہروں کا سیاہ ہونا: اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں اہل جہنم کے چہروں کو انتہائی سیاہ کردیں گے جیسے رات کی تاریکی نے ان کے چہروں پر بسیرا کیا ہوا ہو۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَاۗءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○﴾

---

[1] القمر 48:54. [2] المؤمن 40:71، 72.

''اور جن لوگوں نے برے کام کیے تو برائی کا بدلہ اس (برائی) کے برابر ہی ہے اور انھیں ذلت ڈھانپ لے گی۔ کوئی انھیں اللہ (کے عذاب) سے بچانے والا نہیں ہوگا، یوں لگے گا کہ ان کے چہروں پر تاریک رات کے ٹکڑے اوڑھا دیے گئے ہیں، یہی (لوگ) دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''[1]

آگ کا کافروں کو ہر جانب سے گھیر لینا: جب کافروں کی یہ صورت حال ہو کہ گناہوں اور معصیتوں نے ان کا یوں احاطہ کرلیا ہو جیسے کنگن کلائی کا احاطہ کرلیتا ہے تو انھیں بدلہ بھی پھر اسی طرح ملنا چاہیے، اس لیے جہنم کی آگ ان کو ہر جانب سے گھیر لے گی۔

فرمان الٰہی ہے:

﴿لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ○﴾

''ان کے لیے جہنم ہی کا بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر (اسی کا) اوڑھنا ہوگا اور ہم ظالموں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔''[2]

''مِہَادٌ'' ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو نیچے ہو اور غواش، غَاشِیَۃٌ کی جمع ہے۔ غَاشِیَہ وہ چیز ہے جو اوپر سے ڈھانپ لے۔ گویا آگ اہل جہنم کو اوپر نیچے ہر جانب سے گھیرے ہوئے ہوگی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○﴾

''اس دن، ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے، عذاب انھیں ڈھانپ لے گا اور اللہ فرمائے گا: جو کچھ تم کرتے تھے اس کا مزہ چکھو۔''[3]

ایک اور مقام پر فرمایا:

---

[1] یونس 27:10. [2] الأعراف 41:7. [3] العنکبوت 55:29.

﴿لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۭ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ۭ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ○﴾

”ان کے لیے ان کے اوپر آگ کے سائبان ہوں گے اور ان کے نیچے (بھی آگ کے) سائبان ہوں گے، یہی وہ (عذاب) ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، لہٰذا اے میرے بندو! تم مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔“ [1]

ایک اور مقام پر صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ آگ ان کو ہر طرف سے گھیرے گی۔ آگ کی دیواریں ہوں گی جو ہر طرف سے کافروں کا احاطہ کرلیں گی اور وہ ہزار کوشش کے باوجود اس سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔

﴿اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا﴾

”بلاشبہ ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتوں نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے۔“ [2]

”سُرَادِق“ سے مراد آگ کی فصیل اور دیواریں ہیں جو ہر طرف سے جہنم کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ [3]

جہنم کی آگ کا دلوں تک پہنچ جانا: دنیا کی آگ میں اگر کوئی ذی روح جل جائے تو اس کے دل تک آگ پہنچنے سے پہلے ہی وہ موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے مگر جہنم کی آگ اتنی شدید ہوگی کہ جسم میں سرایت کرتے ہی فوراً دل تک پہنچ جائے گی۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ۡۖ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ۭ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ۙ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝﴾

”ہرگز نہیں! اسے ضرور حُطَمہ میں پھینکا جائے گا اور آپ کو کیا معلوم کہ حُطَمہ کیا ہے؟ وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے، جو دلوں تک پہنچے گی۔“ [4]

---

[1] الزمر 16:39. [2] الكهف 29:18. [3] اليوم الآخر في الجنة والنار لعمر الأشقر، ص: 102.

[4] الهمزة 104:4-7.

اہل جہنم کو جکڑنے والی زنجیریں اور طوق: اللہ تعالیٰ نے اہل جہنم کے لیے زنجیریں، طوق اور ہتھوڑے تیار کر رکھے ہیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۟ وَأَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ۝﴾

”بلاشبہ ہم نے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔“ [1]

مزید فرمایا:

﴿إِنَّ لَدَيْنَآ أَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۝ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا أَلِيْمًا ۝﴾

”بے شک ہمارے پاس بیڑیاں اور بھڑکتی ہوئی آگ ہے اور گلے میں اٹکنے والا طعام اور دردناک عذاب ہے۔“ [2]

ان کی گردنوں میں طوق ڈالے جائیں گے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَجَعَلْنَا الْأَغْلٰلَ فِيْٓ أَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾

”اور ہم ان لوگوں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے جنھوں نے کفر کیا، انھیں صرف اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ عمل کرتے تھے۔“ [3]

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿إِذِ الْأَغْلٰلُ فِيْٓ أَعْنٰقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ ۝﴾

”جب ان کی گردنوں میں طوق اور بیڑیاں ہوں گی (جن میں جکڑ کر) وہ گھسیٹے جائیں گے۔“ [4]

فرمان الٰہی ہے:

﴿إِنَّ لَدَيْنَآ أَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۝﴾

---

[1] الدھر 4:76. [2] المزمّل 13,12:73. [3] سبا 33:34. [4] المؤمن 71:40.

”بے شک ہمارے پاس بیڑیاں اور بھڑکتی آگ ہے۔“ [1]

”اَنکال“ سے مراد زنجیریں ہیں۔ انھیں ”انکال“ کا نام اس لیے دیا گیا کیونکہ یہ عذاب کا سبب بنتی ہیں اور ان کے ذریعے گناہگاروں کو نشانِ عبرت بنایا جاتا ہے۔

قرآن حکیم کے بیان کردہ منظر پر ذرا غور کیجیے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۝﴾

”(حکم ہوگا:) اسے پکڑو، پھر طوق ڈال دو، پھر اسے جہنم (کی آگ) میں جھونک دو، پھر ایک زنجیر میں، جس کی پیمائش ستر گز ہے، اسے جکڑ (یا پرو) دو۔“ [2]

اہل جہنم کی چیخ و پکار اور اظہارِ ندامت: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝﴾

”اور اگر بلاشبہ ہر ظالم شخص کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے تو وہ اسے (عذاب سے بچنے کے لیے) ضرور فدیہ دے دے گا اور مجرم جب عذاب دیکھیں گے تو ندامت کو چھپائیں گے اور ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے۔“ [3]

جب کافر اپنے نامۂ اعمال کو کفر و شرک سے بھرا دیکھے گا اور اسے یقین ہو جائے گا کہ اب ان اعمال کی وجہ سے اسے ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا پڑے گا تو وہ اپنے آپ کے لیے بددعائیں کرے گا کہ کاش! مجھے موت آجائے، میں ہلاک ہو جاؤں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝﴾

---

[1] المزمل 12:73. [2] الحآقّة 69:30-32. [3] یونس 10:54.

''اور جس شخص کو اس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ پیچھے دیا گیا تو وہ عنقریب تباہی کو دعوت دے گا اور وہ بھڑکتی آگ میں جا پڑے گا۔''[1]

جب انھیں جہنم میں گرایا جائے گا اور وہ اس کی تپش سے جلنے لگیں گے تو اپنی ہلاکت و بربادی کا واویلا کریں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ۝﴾

''جب وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے اس (جہنم) کی کسی تنگ جگہ میں جھونکے جائیں گے تو وہ وہاں ہلاکت کو پکاریں گے۔''[2]

اور اس وقت مجرم اپنے کفر، گمراہی اور کم عقلی کا اعتراف کریں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝﴾

''اور وہ کہیں گے: کاش! ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو ہم دوزخ والوں میں نہ ہوتے۔''[3]

مجرم جہنم میں چیخ و پکار کریں گے اور شدت سے گریہ و زاری کریں گے اور اپنے رب کو اسی امید سے پکاریں گے کہ وہ انھیں دوزخ سے نکال دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صٰلِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ﴾

''اور وہ اس (جہنم) میں چلائیں گے (اور کہیں گے:) اے ہمارے رب! تو ہمیں (اس سے) نکال، (اب) ہم نیک عمل کریں گے نہ کہ وہ جو (پہلے) کرتے تھے۔''[4]

لیکن ان کی درخواست سختی سے ردّ کر دی جائے گی اور انھیں اس انداز میں دھتکار دیا جائے گا جیسے حیوانوں کو دھتکارا جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ۝ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ۝ قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ۝﴾

''وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہماری بدبختی ہم پر غالب آگئی اور (واقعی) ہم

---

[1] الانشقاق 84:10-12. [2] الفرقان 25:13. [3] الملك 67:10. [4] فاطر 35:37.

لوگ گمراہ تھے، اے ہمارے رب! ہمیں یہاں سے نکال، پھر اگر ہم لوٹیں (دوبارہ وہی کریں) تو بلاشبہ ہم ظالم ہوں گے، اللہ فرمائے گا: اسی (جہنم) میں ذلیل وخوار (پڑے رہو) اور مجھ سے کلام نہ کرو۔"[1]

جہنمیوں کے بارے میں جو فیصلہ ہو چکا وہ پورا ہو کر رہے گا۔ وہ اپنے اس انجام سے دوچار ہوں گے جس میں کوئی چیخ وپکار فائدہ نہیں دیتی اور نہ کوئی درخواست منظور ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے درخواست اور آہ و زاری کے بعد دوزخی لوگ دوزخ کے داروغے کی طرف رخ کریں گے اور اس سے درخواست کریں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے عذاب میں کمی کی سفارش کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ○﴾

"اور وہ (سب) لوگ، جو آگ میں ہوں گے، جہنم کے دربانوں سے کہیں گے: تم اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ایک دن تو ہم سے کچھ عذاب ہلکا کر دے۔"[2]

اس موقع پر وہ جہنم کے داروغہ "مالک" کو بھی آواز دیں گے اور اس سے بھی درخواست کریں گے کہ وہ ان کی روح نکال کر انھیں عذاب سے نجات دلائے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ○﴾

"اور وہ (داروغۂ جہنم کو) پکاریں گے: اے مالک! تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کردے، وہ کہے گا: بے شک تم تو ہمیشہ (اسی عذاب میں) رہو گے۔"[3]

ان ظالموں نے ایمان کو چھوڑ کر کفر کا راستہ اختیار کر کے اپنے آپ کو بھی نقصان پہنچایا اور اپنے اہل وعیال کو بھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] المؤمنون23:106-108. [2] المؤمن40:49. [3] الزُّخرف43:77.

﴿قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِیْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ۝﴾

”کہہ دیجیے: بلاشبہ خسارہ اٹھانے والے تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے روز قیامت اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو خسارے میں ڈالا، خبردار! یہی کھلا خسارہ ہے۔“[1]

قرآن حکیم کی مکی آیات نے مسلمانوں کی اس طرح تربیت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی سزا کا ڈر اور مؤاخذے کا خوف ان کے دلوں میں پختہ کر دیا۔ ان آیات نے یہ بات واضح کی کہ آخرت کا عذاب حسی اور معنوی دونوں اقسام کا ہوگا۔ قرآن حکیم کی تشریح کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کے سامنے اس انداز میں جہنم کی حقیقت پیش کی کہ ہر صحابی اوامر کو بجالاتا اور نواہی سے اجتناب کرتا۔ اس کے دل و دماغ میں ہر وقت جنت اور جہنم کا تصور بیدار رہتا اور وہ ہر لمحہ موت کے استقبال کے لیے تیار رہتا۔ اسے یقین کامل رہتا کہ موت آ کر رہے گی اور اسے اپنے تمام اعمال کا حساب دینا ہے اور قبر جنت کا باغیچہ ہوگی یا آگ کا گڑھا۔ جب کوئی صحابی ان سب باتوں کو ذہن نشین کر لیتا تھا تو اس کا دل خوف الٰہی سے لبریز ہو جاتا اور وہ ہر جگہ اور ہر وقت اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں محسوس کرتا اور نیک اعمال کے لیے ایک نئے جوش اور جذبے کے ساتھ سرگرم عمل ہو جاتا، خواہ وہ کام دعوتِ دین کا ہو، جہاد فی سبیل اللہ کا ہو، حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا ہو، یا نسل انسانی کو بگاڑ سے بچانے کے لیے اسلامی تہذیب و تمدن کے استوار کرنے کا ہو۔ اور وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا گو رہتا کہ وہ اسے انبیاء، صدّیقین، شہداء اور اپنے نیک بندوں کی رفاقت عطا کر کے اس کی عزت افزائی کرے کیونکہ ان لوگوں سے اچھی رفاقت کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔

جنت، جہنم اور آخرت کی حقیقت کا تصور اور اس کا صحیح فہم ان لوگوں کے دلوں پر نہایت گہرے اثرات ڈالتا ہے جو امت مسلمہ کے روشن مستقبل کے لیے کام کر رہے ہوں یا ان کی عزت و عظمتِ رفتہ کے حصول کی جدوجہد کر رہے ہوں اور یہ چیز افراد امت کے اعتقادی

---

[1] الزُّمر 15:39.

نظریات کے لیے بھی بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ نبی کریم ﷺ نے یہی اسلوب اختیار کیا اور ہمارے لیے بھی ضروری ہے کہ ہم بھی یہی اسلوب اختیار کریں۔

قضاء و قدر کا صحیح مفہوم اور صحابۂ کرام پر اس کے اثرات

قرآن حکیم نے مکی دور میں مسئلہ قضاء و قدر کو بھی کافی اہمیت دی ہے۔ فرمان ربانی ہے: ﴿اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ○﴾

”بلاشبہ ہم نے ہر چیز ایک مقرر اندازے کے مطابق پیدا کی ہے۔“ [1]

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا ○﴾

”وہی ذات جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اس نے اپنے لیے کوئی اولاد نہیں بنائی اور نہ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کیا۔“ [2]

مراتب قضاء و قدر: نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کے دلوں میں قضاء و قدر کا مفہوم پختہ کیا اور قرآن حکیم کی روشنی میں اس کے مراتب واضح کیے۔ وہ مراتب درج ذیل ہیں:

پہلا مرتبہ: اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو شامل ہے۔ کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا تَكُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَیْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ ۚ وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ○﴾

---

[1] القمر 49:54. [2] الفرقان 2:25.

''اور (اے نبی!) آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اور اللہ کی طرف سے (نازل شدہ) قرآن میں سے جو کچھ بھی پڑھتے ہیں اور تم لوگ جو بھی عمل کرتے ہو، اس وقت ہم تمھیں دیکھ رہے ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔ اور آپ کے رب سے ذرہ بھر کوئی چیز بھی چھپی نہیں ہوتی، زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی اس سے چھوٹی (چیز) اور نہ بڑی، مگر (وہ) واضح کتاب میں (درج) ہے۔''[1]

دوسرا مرتبہ: ظہور پذیر ہونے والی ہر چیز لکھی جا چکی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۣ وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْٓ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ ○﴾

''بلاشبہ ہم ہی مردوں کو زندہ کریں گے اور جو (اعمال) وہ آگے بھیج چکے انھیں ہم لکھ رہے ہیں اور ان کے آثار (نشاناتِ قدم) کو بھی اور ہم نے ہر شے کو واضح کتاب میں محفوظ کر رکھا ہے۔''[2]

تیسرا مرتبہ: اللہ تعالیٰ کی مشیت غالب ہوتی ہے اور اسے قدرت کاملہ حاصل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعْجِزَهٗ مِنْ شَیْءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَلِیْمًا قَدِیْرًا ○﴾

''کیا وہ زمین میں چلتے پھرتے نہیں کہ وہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے جبکہ وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے اور اللہ (ایسا) نہیں کہ اسے کوئی چیز آسمانوں میں اور زمین میں عاجز کر دے، بلاشبہ وہ خوب جاننے والا، بڑی قدرت والا ہے۔''[3]

---

[1] یونس 61:10۔ [2] یٰسٓ 12:36۔ [3] فاطر 35:44۔

چوتھا مرتبہ: ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝﴾

”یہ ہے اللہ، تمھارا رب، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے، چنانچہ تم اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز پر نگران ہے۔“ [1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں قضاء و قدر کی حقیقت کا صحیح فہم اور اس کا پختہ عقیدہ بہت سے مفید ثمرات پیدا کرنے کا سبب بنا اور انھیں دنیا و آخرت کی بے شمار بھلائیاں حاصل ہوئیں، مثلاً:

① اللہ کی بندگی اختیار کرنا۔ تقدیر ان امور میں سے ہے جن پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے امت کو ایمان لانے کی طرف دعوت دی ہے۔

② تقدیر پر ایمان شرک سے نجات کا ذریعہ ہے کیونکہ مومن کا یہ عقیدہ ہے کہ نفع ونقصان پہنچانے، عزت و ذلت دینے اور عروج و زوال سے ہمکنار کرنے والی ذات صرف ایک اللہ کی ہے۔

③ قضاء وقدر پر ایمان دلوں میں یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ہر ذی روح کی موت کا وقت متعین ہے، اس لیے مومن دشمن کے مقابلے میں بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرتا اور بہادری سے پیش قدمی کرتا ہے۔

④ مومن تکالیف و مصائب پر صبر کرتا اور اس پر اللہ تعالیٰ سے اجر کی امید رکھتا ہے۔

⑤ سکونِ دل، اطمینانِ قلب اور فکر و غم سے نجات قضاء و قدر پر ایمان رکھنے کے ثمرات ہیں۔ یہ متاع گم گشتہ ہے، روئے زمین پر رہنے والا ہر فرد ان کا طلب گار اور متلاشی ہے جبکہ صحابۂ کرام کو اس قدر وافر سکون و اطمینانِ قلب حاصل تھا جو آج ہمارے وہم و

---

[1] الأنعام 102:6.

گمان اور تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔

⑥ قناعت، عزت نفس اور غیروں کی غلامی سے نجات بھی عقیدۂ تقدیر کے ثمرات میں سے ہیں۔ تقدیر پر ایمان رکھنے والا شخص یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ اس کی روزی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اسے یقینِ کامل ہوتا ہے کہ اللہ اس کا رازق ہے، کسی بھی معاملے میں اسے کسی اور کی ضرورت نہیں اور وہ سب امور میں اس کے لیے کافی ہے۔ اسے یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ اپنی روزی پوری کیے بغیر وہ اس دنیا سے نہیں جائے گا اور اگر سب لوگ مل کر اسے کوئی چیز دینا چاہیں یا اس سے چھیننا چاہیں تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی تقدیر میں لکھ دیا ہے۔

اس طرح مومن میں قناعت پیدا ہوگی۔ وہ کوئی ایسا عمل نہیں کرے گا جس سے اس کی عزت نفس مجروح ہو۔ وہ ہر چیز کے حصول کے لیے خوبصورت انداز اختیار کرے گا۔ دنیا کی حرص کو خیر باد کہہ دے گا، دوسروں کی غلامی برداشت نہیں کرے گا اور کسی مخلوق کے مال کو للچائی نگاہ سے نہیں دیکھے گا بلکہ اپنی خواہشوں اور چاہتوں کا مرکز رب العالمین کو بنائے گا۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کی تربیت کو محض ایمان کے مذکورہ چھ ارکان کی تعلیم تک محدود نہیں رکھا بلکہ انسان، کائنات اور زندگی اور ان کے باہمی ربط کے متعلق ان کے عقائد، نظریات اور تصورات کی درستگی بھی کی تاکہ ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے مطابق زندگی گزار سکے اور اپنے مقصد حیات کا ادراک کرتے ہوئے ان ذمہ داریوں کو بطریقِ احسن ادا کر سکے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کی ہیں اور بے بنیاد باتوں اور خرافات سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔[1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا انسان کی حقیقت کو جان لینا

قرآن کریم نے انسان کو اپنے رب اور قیامت کے دن کی معرفت دینے کے بعد اسے

---

[1] أهمية الجهاد في نشر الدعوة الإسلامية لعلي العلياني، ص: 59.

اپنے آپ کی معرفت عطا کی، نیز فطری طور پر پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات دیے کہ انسان کیسے وجود میں آیا اور اس کا انجام کیا ہوگا؟ ہر انسان کے دل میں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں اور وہ ان سوالات کے جوابات کے لیے بڑا بے چین بھی ہوتا ہے۔[1]

قرآن حکیم نے صحابۂ کرام کے لیے یہ واضح کیا کہ نسلِ انسانی کی نشو ونما کیسے ہوتی ہے، اس کی حقیقت کیا ہے، اس کے اصل عناصر کیا ہیں، انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے اور مرنے کے بعد ان کا انجام کیا ہوگا؟

صحابۂ کرام نے نبی کریم ﷺ کی وساطت اور قرآنی اسلوب سے انسان کی حقیقت معلوم کی کہ سب سے پہلے انسان کی تخلیق پانی اور مٹی کے مجموعے سے ہوئی اور پھر اس کی اولاد اور نسل ایک حقیر سے پانی کے ساتھ وجود میں آ رہی ہے۔ انسان کو اپنے رب کے ہاں کیا شرف و منزلت حاصل ہے، اس نے کس طرح انسان کو مسجود ملائک بنایا، اسے بے شمار مخلوقات پر فضیلت اور برتری عطا کی، یہ سب کچھ واضح کیا تا کہ انسان خود کو دو متضاد انتہاؤں اعلیٰ اور ادنیٰ کے درمیان محسوس کرے اور خالق کے ہاں اپنے شرف و منزلت کی وجہ سے خود کو باوقار سمجھے۔ اپنی تخلیق کے اسلوب کو سامنے رکھ کر تواضُع اختیار کرے۔ اپنے اس خالق کی عظمت کا اعتراف کرے جس نے اسے اس کے اصل سے پیدا فرما کر حسین و جمیل شکل وصورت عطا کی اور اسے ایک بلند مقام پر فائز کیا تا کہ اس میں فخر اور غرور و تکبر پیدا نہ ہو اور اپنی عزت و کرامت کو ملحوظ رکھ کر وہ اپنے خالق کے سوا کسی اور کی غلامی اور بندگی اختیار نہ کرے۔[2]

اگر اللہ تعالیٰ انسان کو اس رہنمائی کے بغیر چھوڑ دیتا تو بہت سے لوگ اپنی حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر مشکلات کا شکار ہو جاتے بلکہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اب بھی مشکلات میں گھری ہوئی ہے کیونکہ انھوں نے اپنے مخصوص نظریات کی وجہ سے اپنے آپ پر زیادہ

---

[1] منهج التربية الإسلامية لمحمد قطب:54/2. [2] أساليب التشريق في القرآن للدكتور الحسين جلو، ص: 134.

انحصار کیا جس کے نتیجے میں ان میں غرور و تکبر پیدا ہوا یا پھر وہ قَعرِ مذلت میں گر گئے (کہ خود کو خالق کے سوا غیروں کے قدموں میں ڈال دیا۔)

انسان کا اپنے آپ پر غور و فکر اس کی تربیت کے موثر ترین ذرائع میں سے ہے۔ جب سے انسان اس دنیا میں آیا ہے اپنے بارے میں غلط فہمیوں کا شکار ہے۔ کبھی حدِّ اعتدال سے اتنا بڑھ جاتا ہے کہ خود کو اس کائنات کی سب سے اعلیٰ اور عظیم ترین ہستی سمجھنے لگتا ہے اور فخر اور غرور و تکبر سے بھرے ہوئے بلند بانگ دعوے کرنے لگتا ہے جیسا کہ قوم عاد کے متعلق کہا گیا:

﴿فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝﴾

"پھر جو عاد تھے تو انھوں نے زمین میں ناحق تکبر کیا اور بولے: قوت میں ہم سے زیادہ سخت کون ہے؟ کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک اللہ جس نے انھیں پیدا کیا وہ قوت میں ان سے زیادہ سخت ہے۔ اور وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔"[1]

فرعون نے بھی یہ دعویٰ کیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝﴾

"تو کہا: میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں۔"[2]

کبھی تو انسان خود کو اتنی بلندی پر لے جاتا ہے کہ خود کو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتا بلکہ خود معبود بن بیٹھتا ہے۔

اور کبھی انسان اس کے برعکس خود کو انتہائی ذلت اور پستی میں گرا دیتا ہے۔ خود کو اس کائنات کا حقیر ترین ذرہ سمجھتا ہے۔ کبھی شجر و حجر کے سامنے سر جھکاتا ہے، کبھی نہروں اور

---

[1] حٰمٓ السجدۃ 15:41. [2] النّٰزعٰت 24:79.

پہاڑوں کے سامنے ماتھا ٹیکتا ہے، کبھی حیوانات کے سامنے سربسجود ہو جاتا ہے اور کبھی خیال کرتا ہے کہ سورج اور چاند کو سجدہ کیے بغیر وہ زندہ وسلامت نہیں رہ سکتا۔[1]

قرآن حکیم نے بڑے واضح انداز میں اس حقیقت کو آشکارا کیا ہے کہ انسان کی پیدائش دو طرح سے ہوئی۔ سب سے پہلے انسان کو مٹی کے گارے سے بنا کر اس میں روح ڈالی گئی۔ اس کے بعد اس کی نسل کی پیدائش حقیر پانی کی ایک بوند سے ہوئی اور اب تک یہی طریقہ تسلسل سے جاری ہے۔[2] انسان کی تخلیق کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسٰنِ مِنۡ طِیۡنٍ ○ ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَهٗ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِیۡنٍ ○ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصٰرَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ ○﴾

”جس نے ہر چیز کو اچھے طریقے سے پیدا کیا اور اس نے تخلیقِ انسان کی ابتدا مٹی سے کی، پھر اس کی نسل ایک حقیر پانی کے جوہر (نطفے) سے چلائی، پھر اس (کے اعضا) کو درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے تمھارے کان، آنکھیں اور دل بنائے، تم کم ہی شکر کرتے ہو۔“[3]

قرآن حکیم میں اس مفہوم کو واضح کرنے والی بے شمار آیات ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت زیادہ قدر و منزلت اور شرف عطا فرمایا ہے۔ اُمّت مسلمہ کے اس ہراول دستے صحابۂ کرام کے قلوب و اذہان پر اس گفتگو کے بہت زیادہ اثرات تھے۔ قرآن حکیم نے انسان کی عزت وشرف کو کئی لحاظ سے بیان کیا ہے، مثلاً:

اللہ تعالیٰ کا انسان کو اپنے ہاتھوں سے تخلیق فرمانا: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] أصول التربية للنحلاوي، ص: 31. [2] أساليب التشويق في القرآن للدكتور الحسين جلو، ص: 134. [3] السجدة 32: 7-9.

﴿إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ۝ فَإِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُوْنَ ۝ إِلَّآ إِبْلِيْسَ اسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ قَالَ يٰٓإِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۖ أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ۝﴾

’’(یاد کیجیے) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا: بے شک میں مٹی سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں، چنانچہ جب میں اسے ٹھیک ٹھیک بنادوں اوراس میں اپنی روح پھونک دوں، تو تم اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑنا، تب تمام فرشتوں نے (بیک وقت) اکٹھے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے، اس نے تکبر کیا اوروہ کافروں میں سے ہوگیا، اللہ نے فرمایا: اے ابلیس! تجھے کس چیز نے اس (آدم) کو سجدہ کرنے سے منع کیا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا؟ کیا تو نے تکبر کیا یا تو اونچے درجے والوں میں سے ہے؟‘‘ [1]

وہ روح جو انسان میں داخل ہوئی، قرآن حکیم کی ان آیات نے واضح کیا ہے کہ وہ نہایت عالی مرتبت اور عالیشان ہے۔ اور پھر اس پہلے انسان کا ایسا والہانہ استقبال کیا گیا کہ فرشتے اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور باری تعالیٰ انسان کی عظمتِ شان کا اعلان فرشتوں کو سجدہ کرانے کی صورت میں فرما رہے ہیں۔

متوازن جسم اور حسین صورت: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَإِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝﴾

’’اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور تمھیں صورت دی تو تمھاری صورتیں بہت اچھی بنائیں اوراسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔‘‘ [2]

---

[1] صٓ 38:71-75. [2] التغابن 64:3.

ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ○﴾

”ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا ہے۔“ [1]

انسان کے متوازن جسم کی تخلیق کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ○ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ○﴾

”جس نے تجھے پیدا کیا پھر تجھے درست کیا اور تجھے معتدل بنایا، اس نے جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔“ [2]

انسان کے لیے قوت گویائی اور عقل و دانش کا عطیہ: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○﴾

”(اللہ) رحمٰن نے قرآن سکھایا، اسی نے انسان کو پیدا کیا، اسے بولنا سکھایا۔“ [3]

(دیگر مخلوقات کی نسبت انسان کو خالق نے یہ شرف عطا کیا کہ وہ دل کے جذبات کا احسن انداز میں اظہار کرسکتا ہے، پھر علم و دانش کی بدولت بے شمار گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے ترقی کے زینے طے کرتا چلا جارہا ہے۔)

زمین و آسمان کی اشیاء کا انسان کے لیے مُسَخّر ہونا: اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اسے بے حد و حساب اور بڑی بڑی نعمتیں عطا کیں۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۚ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۗ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ○﴾

”اور اس نے تمھیں ہر وہ چیز دی جو تم نے اس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گنو تو انھیں شمار نہ کرسکو گے۔ بے شک انسان بڑا ظالم، نہایت ناشکرا ہے۔“ [4]

اللہ تعالیٰ نے انسان کی عزت افزائی کے لیے آسمانی بادشاہت کو اس کے لیے مُسَخّر کر دیا جس میں بے شمار ستارے، سورج اور چاند ہیں اور ان سب کو ایک ایسے منفرد نظام میں

---

[1] التين 95:4. [2] الانفطار 82:7. [3] الرحمٰن 55:1-4. [4] إبراهيم 14:34.

سمو دیا جس سے دن رات اور مختلف موسم وجود میں آتے ہیں اور انسان ان سب سے مستفید ہوتا ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝﴾

”اور اس نے تمھارے لیے مسخر کیے رات اور دن اور سورج اور چاند اور تمام تارے بھی اسی کے حکم کے پابند ہیں۔ بے شک اس میں عقل مند لوگوں کے لیے البتہ کئی نشانیاں ہیں۔“[1]

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾

”اور اس نے اپنی طرف سے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، سب تمھارے تابع کر دیا۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔“[2]

انسان کی دیگر مخلوقات پر فضیلت: فرمان الٰہی ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝﴾

”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بنی آدم کو عزت دی ہے اور انھیں بر و بحر میں سواریاں دیں اور انھیں پاکیزہ چیزوں میں سے رزق دیا اور انھیں اپنی کثیر مخلوقات پر جنھیں ہم نے پیدا کیا، فضیلت دی۔“[3]

انبیاء اور رسولوں کی بعثت کے ساتھ انسان کی عزت افزائی: اللہ تعالیٰ کی طرف سے

---

[1] النحل 12:16۔ [2] الجاثية 13:45۔ [3] بني إسرآءيل 70:17۔

انسان کی عزت افزائی کے بڑے بڑے مظاہر میں سے ایک مظہر انبیاء اور رسل کو انسانوں کی رشد و ہدایت کے لیے مبعوث فرمانا ہے جنھوں نے نوع انسانی کو حیات افزا تعلیمات سے بہرہ ور کیا اور ان تعلیمات پر عمل کرنے کی صورت میں دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضمانت دے دی۔ تکریمِ انسان کے طور پر اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمتیں اسلام، ایمان اور احسان کی نعمتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کی توفیق عطا فرمائے! آمین۔ فرمان ربانی ہے:

﴿قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝﴾

”اس (اللہ) نے فرمایا: تم دونوں یہاں سے اکٹھے اتر جاؤ، تمھارے بعض، بعض کے دشمن ہیں، پھر جب تمھارے پاس میری ہدایت پہنچے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ مشقت میں پڑے گا۔“[1]

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝﴾

”کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، جس کے پاس آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے، لہٰذا تم اللہ پر اور اس کے رسول اُمی نبی پر ایمان لاؤ، جو (خود بھی) اللہ اور اس کے (تمام) کلمات پر ایمان لاتا ہے اور تم اس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔“[2]

---

[1] طٰهٰ 123:20. [2] الأعراف 158:7.

انسان کی عزت وتکریم کا ایک مظہر جس کا صحابۂ کرام کو بھی بڑی شدت سے احساس تھا، وہ یہ ہے کہ انسان کو انسانوں کی اور معبودانِ باطلہ کی غلامی سے نجات دلا کر صرف ایک معبود حقیقی کی بندگی کا شرف بخشا گیا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطّٰغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عٰقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ۝﴾

”اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو، پھر ان میں سے بعض کو اللہ نے ہدایت دی اور ان میں سے بعض پر ضلالت ثابت ہوگئی، لہٰذا تم زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو (رسولوں کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیسا (عبرتناک) ہوا؟“ [1]

اللہ تعالیٰ کی انسان سے محبت اور ملاء اعلیٰ میں اس کا تذکرہ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی عزت وتکریم کے اعلیٰ ترین مظاہر میں سے ایک مظہر یہ ہے کہ اس نے انسان کو اپنی محبت و چاہت اور پسندیدگی کا اہل بنایا اور قرآن حکیم میں اسے وہ تمام طریقے بتا دیے جنھیں اختیار کر کے وہ حُبِ الٰہی کا حقدار بن سکتا ہے۔ اور اس کا سب سے پہلا طریقہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرنے اور آخرت میں جنت حاصل کرنے کے لیے جو تعلیمات و ہدایات دی ہیں ان کی مکمل اتباع کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے اتباعِ رسول کے لذیذ ترین ثمرات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوةً طَیِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِیَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝﴾

”جس نے نیک عمل کیے، مرد ہو یا عورت، جبکہ وہ مومن ہو تو ہم ضرور اسے پاکیزہ

---

[1] النحل 36:16.

زندگی بسر کرائیں گے اور ہم انھیں ضرور ان کا اجر و ثواب ان بہترین اعمال کے بدلے میں دیں گے جو وہ کرتے تھے۔''[1]

انسان کی حفاظت اور نگرانی: انسان کی عزت و تکریم کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اسے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص تائید، سرپرستی اور حفاظت کا اہتمام ہوتا ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ۝﴾

''حالانکہ تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں۔''[2]

اور انسان کی حفاظت کے لیے فرشتوں کو متعین کیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ۝﴾

''کوئی جان ایسی نہیں جس پر کوئی نگہبان نہ ہو۔''[3]

اس طرح قرآن حکیم میں انسان کی عزت و تکریم کی بے شمار صورتوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔[4]

آدم علیہ السلام اور شیطان کی کشمکش کا صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاں تصور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآنی اسلوب کے ساتھ اپنے صحابہ کو بتایا کرتے تھے کہ شیطان کا آدم علیہ السلام کے ساتھ کیا طرز عمل تھا اور یہ کہ شیطان ہی انسان کا شدید ترین ازلی دشمن ہے جس نے ان کے باپ آدم علیہ السلام کو راہِ راست سے ہٹانے کی کوشش کی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝﴾

---

[1] النحل 97:16. [2] الانفطار 10:82. [3] الطارق 4:86. [4] موسوعة نضرة النعيم في مكارم أخلاق الرسول الكريم: 4/1136-1142.

”اے بنی آدم! کہیں شیطان تمھیں فتنے میں نہ ڈال دے جس طرح اس نے تمھارے ماں باپ کو جنت سے نکلوایا تھا جب اس نے ان دونوں کا لباس اتروایا تھا تاکہ ان کو ان کی شرم گاہیں دکھا دے۔ بے شک وہ اور اس کا قبیلہ تمھیں دیکھتا ہے جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔ بے شک ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کے دوست بنا دیا جو ایمان نہیں لاتے۔“ [1]

ایک اور مقام پر یوں فرمایا:

﴿قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝﴾

”وہ بولا: پس اس وجہ سے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا تو میں ان (لوگوں کو گمراہ کرنے) کے لیے تیرے سیدھے راستے پر ضرور بیٹھوں گا، پھر میں ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے ان کے پاس ضرور آؤں گا اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے بھی اور تو ان کی اکثریت کو شکر گزار نہیں پائے گا۔“ [2]

شیطان کے متعلق یہ گفتگو سُن کر، اس کے غیر مرئی ہونے کے باوجود، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یہ محسوس کرنے لگے کہ شیطان ان کے تعاقب میں ہے۔ ان کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں سے انھیں اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا ہے، انھیں معصیت پہ ابھارنا چاہتا ہے اور ان کی خوابیدہ خواہشات کو بیدار کرنا چاہتا ہے، اس لیے وہ ہمیشہ کوشش کرتے تھے کہ اپنے دشمن شیطان کے حملوں سے آگاہ رہیں۔ وہ نیک اعمال میں مُسابقت اختیار کر کے شیطان کی چالوں کو ناکام بنا دیتے تھے۔ اس طرح انھیں بہکانے کے لیے شیطان کو کوئی راستہ نہ ملتا۔[3]

حضرت آدم علیہ السلام کا شیطان کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ قرآن حکیم میں کئی ایک

---

[1] الأعراف 27:7. [2] الأعراف 17،16:7. [3] واقعنا المعاصر لمحمد قطب، ص: 46.

مقامات پر مذکور ہے۔ بعض مقامات پر تفصیل سے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے جیسا کہ سورۂ اعراف (7:11-25) میں ہے۔ کہیں اس واقعے کی کچھ تفصیلات بیان کی گئی ہیں جیسا کہ سورۂ حجر (15:26-42)، سورۂ بنی اسرائیل (17:61-65)، سورۂ طٰہٰ (20:116-123) اور سورۂ ص (38:71-85) میں ہے۔ اور کئی مقامات پر اس کی جانب محض اشارہ کیا گیا ہے اور یہ اسلوب قرآن حکیم میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔

سورۂ ابراہیم میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن شیطان کا ان لوگوں کے بارے میں کیا موقف ہو گا جنھوں نے دنیا میں اس کی روش کو اپنایا اور کس طرح وہ ان سے بالکل لاتعلق ہو جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾

”اور جب (جنت یا جہنم کے) معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے گا تو شیطان کہے گا: بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا، اور میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس کی میں نے خلاف ورزی کی اور میرا تم پر کوئی زور نہ تھا مگر یہ کہ میں نے تمھیں دعوت دی تو تم نے میری بات مان لی، چنانچہ تم مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو۔ میں تمھارا فریاد رس نہیں اور نہ تم میرے فریاد رس ہو۔ بلاشبہ میں تو اس کا انکار کرتا ہوں جو تم اس سے پہلے مجھے (اللہ کا) شریک ٹھہراتے تھے۔ بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔“[1]

سورۂ اعراف میں آدم علیہ السلام اور شیطان کا واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے:

---

[1] ابراھیم 14:22.

> ''اور اے آدم! تو اور تیری بیوی جنت میں رہو اور تم دونوں جہاں سے چاہو کھاؤ اور تم دونوں اس درخت کے قریب مت جانا ورنہ تم دونوں ظالموں میں سے ہو جاؤ گے، پھر شیطان نے ان دونوں کو بہکانے کے لیے (ان کے دل میں) وسوسہ ڈالا تا کہ ان کے لیے ان کی شرم گاہیں ظاہر کر دے جو ان سے چھپائی گئی تھیں۔ اور شیطان نے کہا: تمھارے رب نے تمھیں صرف اس لیے روکا ہے کہ (کہیں) تم دونوں فرشتے نہ بن جاؤ، یا (کہیں) تم دونوں ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ اور اس نے ان دونوں کے سامنے قسم کھائی کہ بے شک میں تم دونوں کے خیر خواہوں میں سے ہوں، چنانچہ شیطان نے ان دونوں کو دھوکا دے کر پھسلا دیا، پھر جب ان دونوں نے اس درخت کا پھل چکھا تو ان دونوں کی شرم گاہیں ان پر ظاہر ہو گئیں اور وہ دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے چپکانے لگے (تاکہ ستر ڈھانک سکیں) اور ان کے رب نے ان کو آواز دی: کیا میں نے تمھیں اس درخت سے روکا نہیں تھا؟ اور میں نے تمھیں یہ (نہیں) کہا تھا کہ شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے؟ انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور تو نے ہم پر رحم نہ فرمایا تو یقیناً ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔''[1]

انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تاریخ کی معرفت حاصل کرے۔ غم غلط کرنے کے لیے نہیں بلکہ حصولِ عبرت کے لیے۔ دیگر قرآنی واقعات کی طرح حضرت آدم علیہ السلام کے شیطان کے ساتھ پیش آنے والے واقعے میں بے شمار اسباق ہیں۔ یہ نوع انسانی کو بتاتا ہے کہ ان کی ابتدا کیا تھی اور انتہا کیا ہو گی، اس زمین میں ان کا کردار کیا ہو گا اور اس کردار کو ادا کرنے کے لیے کن اسالیب کو اختیار کرنا ہو گا۔ اس سفر میں کیا کیا رُکاوٹیں

---

[1] الأعراف 7:19-23.

ہوں گی اور ان رُکاوٹوں سے کیسے بچنا ہو گا اور کس طرح انھیں عبور کیا جا سکے گا۔[1]

قرآن حکیم کی جن آیات میں آدم علیہ السلام اور شیطان کی کشمکش کا ذکر ہے ان آیات نے صحابۂ کرام کے لیے عقائد، نظریات اور اخلاق کے میدان میں بہت سے اہم امور کی نشاندہی کی تھی، مثلاً:

نسل انسانی کی ابتدا آدم علیہ السلام سے ہوئی: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مکمل انسانی شکل و صورت میں پیدا فرمایا اور اس سے نسلِ انسانی وجود میں آئی۔ آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ مٹی سے بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس میں روح پھونکی۔ اس طرح وہ گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان بن گیا۔ وہ ابتدا ہی سے مکمل انسانی شکل وصورت کا مالک تھا، کسی اور مخلوق سے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا انسانی شکل میں نہیں آیا۔

صرف اللہ کی غیر مشروط اطاعت، اسلام کا بنیادی اصول: اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، چنانچہ وہ بغیر کسی تردد اور ہچکچاہٹ کے ربِ ذوالجلال کا حکم بجا لاتے ہوئے اور آدم علیہ السلام کی عظمت وفضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے حضور سجدۂ تکریم کی صورت میں جھک گئے، حالانکہ فرشتوں کا تعلق اللہ تعالیٰ کی نہایت مقرب جماعت سے ہے۔ وہ ہر وقت رب العالمین کے حضور تسبیح و تقدیس اور عبادت میں مشغول رہتے ہیں، پھر بھی وہ فوراً آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے، جبکہ آدم علیہ السلام سے اس وقت کوئی ایسی عبادت بھی ظاہر نہ ہوئی تھی جو فرشتوں کی عبادت سے افضل ہوتی۔ دراصل سجدہ کرنے کا حکم رب العالمین کی طرف سے صادر ہوا تھا لہٰذا کسی تردد وتوقف، نکتہ چینی اور حکمت جانے بغیر اس کی تعمیل انتہائی ضروری تھی۔

یہی اسلام کا اصول اور مسلمان کی شان ہے کہ وہ فوراً اپنے رب کی اطاعت کرتا ہے اور بغیر کسی تردّد کے اس کا حکم بجا لاتا ہے۔ اس کی یہ اطاعت غیر مشروط ہوتی ہے۔ حکم اس

---

[1] دراسات قرآنیة لمحمد قطب، ص: 114.

کی عقل اور چاہت کے مطابق ہو یا مخالف، وہ اس کا سبب یا حکمت جانے بغیر فوراً سرِتسلیم خم کر دیتا ہے۔

انسان خطا کا پتلا ہے: آدم علیہ السلام سے غلطی سرزد ہوئی، جس سے صحابۂ کرام نے یہ بات جان لی کہ انسان سے غلطی کا ارتکاب ہونا کوئی بعید نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق ایسے مزاج اور فطرت پر کی ہے کہ اس سے غلطی کا سرزد ہو جانا ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں ایسے میلانات، رجحانات اور خواہشات رکھ دی ہیں جو اس کی کمزوریاں ہیں۔ ان کی وجہ سے شیطان نہایت آسانی سے انسان کو اپنے وسوسوں کا شکار بنا لیتا ہے اور اس کے لیے گناہ کا راستہ بہت خوشنما بنا دیتا ہے۔

انسان کی فطری اور پوشیدہ خواہشات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ موت کو پسند نہیں کرتا اور لازوال زندگی کا خواہش مند ہوتا ہے یا کم از کم طویل ترین عمر پانے کی تمنا رکھتا ہے۔ اس کی یہ چاہت بھی ہوتی ہے کہ وہ اس مختصر زندگی میں لامحدود بادشاہت کا مالک بھی ہو۔[1]

ابلیس نے آدم علیہ السلام کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں اور ان کی زوجۂ محترمہ کو بہکایا اور انھیں ہمیشہ زندہ رہنے کا لالچ دیا۔

انسان کی فطرت میں ان چیزوں کے ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ خود کو اپنی خواہشات، میلانات اور رجحانات کے حوالے کر دے بلکہ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان پر کنٹرول حاصل کرے، انھیں لگام دے کر رکھے اور انھیں شرعی احکام کا پابند بنائے۔

یہ میلانات و رجحانات حقیقت میں دل کی خواہشات ہوتی ہیں جو اکثر بے لگام ہو جاتی ہیں اور حد سے تجاوز کر جاتی ہیں۔ انھیں صرف شرعی احکام کی پابندی ہی سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم نے مکروہ دلی خواہشات کی مذمت کی ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

---

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 1269/3.

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝﴾

''لیکن جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اپنے نفس کو خواہش سے روکا تو بے شک جنت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔''[1]

بے لگام خواہشات قابل مذمت ہوتی ہیں، اس لیے وہ انسان قابلِ تعریف ٹھہرا جس نے اپنے نفس کو بے لگام خواہشات سے بچائے رکھا۔[2]

آدم علیہ السلام کا نِسیان توکل علی اللہ کی تعلیم ہے: آدم علیہ السلام سے غلطی کا صدور اس بات کو واضح کرتا ہے کہ انسان خطا کا پتلا ہے اور یہ بہت جلد خطا کا مرتکب بن جاتا ہے اور یہ دیکھ کر دل خوف اور گھبراہٹ سے لبریز ہو جاتے ہیں مگر اس سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ مسلمان کا اپنے رب پر اعتماد اور توکل مزید بڑھ جاتا ہے۔ وہ شیطان مردود کے شر سے بچنے کے لیے اسے ہی اپنا ملجاً و ماویٰ سمجھتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کے اظہار کے لیے کہ آدم علیہ السلام کا ان کے رب کے ہاں کتنا اعلیٰ مقام اور کس قدر فضیلت ہے، فرشتوں سے انھیں سجدہ کروایا اور انھیں سجدہ نہ کرنے پر ابلیس کو جنت سے نکال باہر کیا، پھر آدم علیہ السلام اور ان کی زوجۂ محترمہ کو جنت میں ٹھہرایا اور انھیں واضح طور پر حکم دیا کہ اس مخصوص درخت کے قریب نہ جانا۔ اس درخت کے سوا جنت کی تمام نعمتیں اور تمام قسم کے پھل استعمال کرنے کی اجازت دی۔

اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو شیطان اور اس کے مکر و فریب سے متنبہ فرمایا اور بتایا کہ وہ تم دونوں کو جنت سے نکلوانے کی کوشش کرے گا، لہٰذا اس کی چال میں نہ آنا۔ اس کے باوجود شیطان انھیں فریب دینے اور بہکانے میں کامیاب ہو گیا۔ ان دونوں نے اس درخت کا پھل کھا لیا اور معصیت کے مرتکب ٹھہرے۔ اس طرح شیطان انھیں جنت سے نکلوانے میں کامیاب ہو گیا۔

---

[1] النّٰزعٰت 79:40،41۔ [2] المستفاد من قصص القرآن لعبد الکریم زیدان: 28/1۔

آدم علیہ السلام کی اس غلطی کی وجہ سے صحابۂ کرام کے دلوں میں اس ناپاک دشمن ابلیس کا خوف پیدا ہو گیا اور اس خوف سے کہ کہیں یہ انھیں راہ راست سے بھٹکا نہ دے، ان کے دلوں میں یہ دائمی جذبہ پیدا ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر بھروسا کریں۔ اس مردود شیطان کے شر سے بچنے کے لیے اللہ ہی کی مدد چاہیں اور اسی کی پناہ میں آ جائیں کیونکہ اس شیطان کا ایک ہی مقصد ہے کہ وہ انسان کو گمراہ کرے اور اسے معصیت کی دلدل میں گرا دے۔

صحابۂ کرام نے یہ حقیقت ان آیات کریمہ سے اخذ کی:

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنٌ ۚ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا ۝﴾

''بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں اور آپ کا رب کارساز کافی ہے۔''[1]

دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّهُۥ لَيْسَ لَهُۥ سُلْطَٰنٌ عَلَى ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝﴾

''بے شک ان لوگوں پر اس کا کوئی زور نہیں (چلتا) جو ایمان لائے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔''[2]

شیطان ان لوگوں کو گمراہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور نہ ان پر اثر انداز ہو سکتا ہے جن کے دل اللہ پر ایمان سے لبریز ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا ہے اور ان کے اعضاء کو اپنی اطاعت میں مشغول کر لیا ہے۔ اب ان کا تمام تر اعتماد اور انحصار ذات باری تعالیٰ پر ہے۔ ان پر شیطان کا زور نہیں چل سکتا کیونکہ وہ ہر وقت شیطانی خواہشات سے نبرد آزما رہتے ہیں اور اس کی تمام چالوں اور تدبیروں کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ اللہ پر ایمان لانے سے انھیں ایسا نور حاصل ہوتا ہے جو ہر پریشانی کا ازالہ کرتا ہے۔ توکل علی اللہ سے انھیں قوت الٰہی حاصل ہو جاتی ہے جس کا شیطان مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس طرح ایمان باللہ اور توکل علی اللہ کی طاقت کے سامنے شیطان بے بس اور

---

[1] بني إسراء يل 65:17. [2] النحل 99:16.

ناکام ہو جاتا ہے۔[1]

توبہ و استغفار کی ضرورت و اہمیت: آدم علیہ السلام کے واقعے سے صحابۂ کرام نے یہ بات سیکھی کہ گناہ اور معصیت کے سرزد ہو جانے پر فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی چاہیے اور گناہوں کے راستے سے پلٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

آدم علیہ السلام اور ان کی زوجۂ محترمہ سے جب معصیت سرزد ہوئی تو انھوں نے فوراً ہی اپنے مہربان پروردگار سے مغفرت اور رحمت طلب کی۔ فرمان ربانی ہے:

﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○﴾

> ”انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور تو نے ہم پر رحم نہ فرمایا تو یقیناً ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔“[2]

آدم و حوا نے ﴿ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا﴾ کہہ کر فوراً ہی اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور ساتھ ہی شدید قسم کی ندامت کا اظہار بھی کر دیا۔ سچے دل سے توبہ کرتے ہوئے اللہ کی رحمت کے امیدوار بن کر انھیں یہ خوف لاحق تھا کہ اگر اس کی رحمت و مغفرت حاصل نہ ہوئی تو ہم خائب و خاسر ہو جائیں گے۔

جب حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی زوجۂ محترمہ اپنے عالی مرتبت ہونے کے باوجود توبہ و استغفار سے مستغنی نہیں ہو سکے تو باقی اولادِ آدم کیونکر اس سے مستغنی ہو سکتی ہے! ان کو تو اس کی زیادہ ضرورت ہو گی۔[3]

حسد اور تکبر سے اجتناب: ابلیس نے آدم علیہ السلام کے معاملے میں جو کچھ بھی کیا اس کی بنیادی وجہ حسد اور تکبر تھا۔ گناہ کا آغاز تکبر سے ہوتا ہے۔ ابلیس نے بھی خود کو آدم علیہ السلام سے

---

[1] المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 71/1. [2] الأعراف 23:7. [3] المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 30/1.

بڑا اور افضل سمجھتے ہوئے اپنے رب کے اس حکم کو ٹھکرا دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کرے۔

چونکہ تکبر معصیت کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے، اس لیے اسلام نے اس سے بچنے اور دور رہنے کا حکم دیا ہے اور تکبر کرنے والوں کے لیے سخت وعید بتائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ»

”وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ بھر بھی تکبر ہوگا۔“ [1]

قرآن حکیم میں بھی بے شمار آیات ہیں جو تکبر اور تکبر کرنے والوں کی مذمت کرتی ہیں اور قیامت کے دن ان کے برے انجام سے خبردار کرتی ہیں۔

تکبر کی حقیقت: تکبر کا اطلاق دو چیزوں پر ہو سکتا ہے:

(i) حق کو ٹھکرا دینا، اسے حقیر سمجھتے ہوئے یا خود کو اس سے بالا خیال کرتے ہوئے یا اس سے دشمنی رکھتے ہوئے اسے تسلیم نہ کرنا اور اس کی اطاعت کرنے کے بجائے مخالفت کرنا۔

(ii) لوگوں کو حقیر جاننا۔ انھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھنا۔[2]

حق کو ٹھکرانے کا سب سے خطرناک پہلو احکامِ الٰہی کو رد کر دینا ہے کیونکہ احکامِ الٰہی یقیناً حق ہیں۔ اس حق کو ٹھکرا دینا اور قبول نہ کرنا یقیناً تکبر ہے۔

صحابۂ کرام میں تو حسد اور تکبر کے جراثیم بھی نہ تھے، وہ سب لوگوں سے بڑھ کر ان خامیوں سے مُنَزَّہ تھے۔ خود پسندی اور خود ستائی ان میں نام کو نہ تھی۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ نہایت خطرناک چیزیں ہیں۔ شیطان نے بھی یہی کہا تھا کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ صحابۂ کرام نے یہ حقیقت جان لی تھی کہ ابلیس نے اپنی اصل پر فخر کرتے ہوئے کہا تھا:

﴿خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝﴾

”مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔“ [3]

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 91. [2] صحيح مسلم، حديث: 91، والمستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 33/1. [3] الأعراف 12:7.

لہٰذا وہ اپنی اصل کے لحاظ سے حقیر ہے اور میں اپنی اصل کے لحاظ سے اعلیٰ ہوں۔ یہی تکبر اس کی گمراہی کا سبب بنا، اس لیے اصل اور نسب پر فخر نہیں کرنا چاہیے۔

ابلیس بنی آدم کا پہلا دشمن ہے: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مکی آیات سے یہ بات معلوم کر لی تھی کہ شیطان ہی ان کا سب سے پہلا دشمن ہے کیونکہ ان کے جد امجد آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کے باعث اسے بارگاہ الٰہی سے دھتکار دیا گیا اور اللہ کی رحمتوں سے محروم اور اس کی لعنتوں کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ یوں وہ آدم علیہ السلام، ان کی زوجۂ محترمہ اور ان کی اولاد کا پہلا اور ازلی دشمن بن گیا۔

اللہ تعالیٰ نے شیطان اور اس کے متبعین کے متعلق فیصلہ فرما دیا:

﴿وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝﴾

''اور یقیناً ان سب کے وعدے کی جگہ جہنم ہے۔''[1]

شیطان نے اولاد آدم سے اپنی دشمنی کا اعلان کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا تذکرہ یوں فرمایا ہے:

﴿قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾

''کہنے لگا: بھلا دیکھ تو اسے جسے تو نے مجھ پر عزت دی ہے، اگر تو مجھے یوم قیامت تک ڈھیل دے تو تھوڑے لوگوں کے سوا میں اس کی تمام نسل کی جڑ کاٹ دوں گا۔''[2]

شیطان نے اولاد آدم کو بہکانے اور گمراہ کرنے کے لیے اپنے عزمِ صمیم کا اظہار کر دیا تھا اور اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگی تھی کہ اسے قیامت تک زندہ رکھے تاکہ وہ اپنے عزم کی تکمیل کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ابلیس آدم اور اولاد آدم کا شدید ترین دشمن ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

---

[1] الحجر 43:15. [2] بني إسرآء يل 62:17.

﴿قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ○﴾

”اس نے کہا: میرے رب! مجھ کو تیرے گمراہ کرنے کے سبب یقیناً میں ان (لوگوں) کے لیے زمین میں (گناہ) خوش نما بنادوں گا اور ان سب کو گمراہ کروں گا، تیرے ان بندوں کے سوا جو ان میں سے چنے ہوئے ہیں۔“[1]

قرآنی آیات کے اسلوب سے صحابۂ کرام کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ شیطان کا انسان کے ساتھ رشتہ صرف دشمنی کا ہے۔ نہ اس رشتے کو تبدیل کیا جا سکتا ہے اور نہ ان میں دشمنی ختم کر کے مصالحت کروائی جا سکتی ہے کیونکہ شیطان کا ایک ہی مقصد، ایک ہی کام اور ایک ہی نصب العین ہے کہ انسان کو راہِ راست سے بھٹکا دے اور گناہوں کو خوشنما بنا کر اسے اللہ کی معصیت پر مجبور کر دے۔

اس لیے صحابۂ کرام نے اس فرمان الٰہی پر عمل کرتے ہوئے شیطان کو اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دیا تھا:

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ○﴾

”بے شک شیطان تمھارا دشمن ہے، لٰہذا تم اسے دشمن ہی جانو، بس وہ تو اپنے گروہ کو اس لیے بلاتا ہے کہ وہ جہنم والوں میں سے ہو جائیں۔“[2]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے شیطان کی کوئی بات نہیں مانی، اس سے عداوت اختیار کی اور خود بھی اس سے بچ کر رہے اور لوگوں کو بھی اس سے بچاتے رہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا آپس میں گفتگو کا انداز

شیطان کے شر سے بچنے اور اس کے مکر و فریب کو ناکام بنانے کے لیے صحابۂ کرام نے

---

[1] الحجر 15:39، 40. [2] فاطر 35:6.

جو ذرائع اختیار کیے ان میں سے ایک ذریعہ اس فرمان ربانی پر عمل پیرا ہونا تھا:

﴿وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝﴾

''اور میرے بندوں سے کہہ دیجیے کہ وہ بات کہیں جو احسن ہو، بے شک شیطان ان کے درمیان فساد ڈالتا ہے، بلاشبہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول ﷺ سے فرمایا کہ وہ اہل ایمان کو یہ حکم دیں کہ وہ اپنی گفتگو میں عمدہ کلام اور پاکیزہ کلمات استعمال کریں۔ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو پھر شیطان ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور بغض پیدا کر دے گا جس سے وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔ شیطان تو انسان کا کھلا اور بدترین دشمن ہے۔ اس کا تو نصب العین یہی ہے کہ انسان ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں اور ان میں شر عام ہو جائے۔

صحابۂ کرام نے ہمیشہ باہمی معاملات میں اعلیٰ اخلاق اختیار کیا۔ ان کے سامنے ہمیشہ یہ فرمان الٰہی موجود رہا:

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۝ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۝﴾

''برائی کو اس طریقے سے دور کیجیے جو احسن ہو، ہم اسے خوب جانتے ہیں جو وہ بیان کرتے ہیں اور آپ کہیں: اے میرے رب! میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اے میرے رب! میں (اس سے بھی) تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس حاضر ہوں۔''[2]

دوسرے کی بدسلوکی اور بداخلاقی کے جواب میں درگزر سے کام لیتے ہوئے عمدہ

---

[1] بنيٓ إسرآء يل 53:17. [2] المؤمنون23:96-98.

اخلاق اور اچھے برتاؤ کا مظاہرہ کیجیے۔ اس طرح اس کی دشمنی دوستی میں اور اس کی نفرت محبت میں بدل جائے گی۔[1]

﴿وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ○﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ اے میرے پروردگار! میں شیطانوں کے ان وسوسوں کے شر سے بچنے کے لیے تیری پناہ میں آتا ہوں جو کہ شر و فساد اور باطل کی ترغیب دیتے ہیں اور راہِ حق سے دور کرتے ہیں کیونکہ شیاطین نہ خود کوئی اچھا کام کرتے ہیں نہ ان کی موجودگی میں کوئی نفع حاصل کیا جا سکتا ہے۔[2] اس لیے اے پروردگار! مجھے ان کے شر سے بچا کر اپنی پناہ میں لے لے۔ شیاطین میرے کسی بھی معاملے میں مداخلت نہ کریں، اس لیے ہر کام شروع کرتے وقت اللہ کی پناہ میں آنا مشروع ہے تاکہ شیطان کو دور کیا جا سکے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِيْمٌ ○ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ○ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○﴾

”اور نیکی اور برائی برابر نہیں ہو سکتیں، آپ (برائی کو) ایسی بات سے ٹالیے جو احسن ہو تو (آپ دیکھیں گے) یکا یک وہ شخص کہ آپ کے اور اس کے درمیان دشمنی ہے، (ایسا ہو جائے گا) جیسے گرم جوش جگری دوست ہو اور یہ (خصلت) انھی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے نصیب والا ہو، اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ ابھارے تو اللہ کی پناہ مانگیے، یقیناً وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔“[3]

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص آپ کے ساتھ برا سلوک کرے، آپ اس پر احسان

---

[1] تفسیر القاسمي: 100/12. [2] المستفاد من قصص القرآن الكريم لعبد الكريم زيدان: 85/1.

[3] حٰمٓ السجدة 41:34-36.

کریں۔ آپ کا یہ احسان اسے آپ کے ساتھ محبت کرنے پر مجبور کر دے گا۔ وہ اپنی دشمنی ترک کر کے آپ کا انتہائی عقیدت مند اور پیارا دوست بن جائے گا۔ لیکن ان اوصاف کو پانے کے لیے انتہائی صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ دوسرے کی بدسلوکی فراموش کر کے اس پر احسان کرنے کے لیے اپنے نفس پر بھاری پتھر رکھنا ہوگا اور جو لوگ ایسا کر لیں وہ یقیناً دنیا و آخرت میں انتہائی خوش نصیب اور سعادت مند ہوں گے۔[1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ رہنمائی بھی فرمائی ہے کہ اگر شیطان تمھارے دل میں یہ خیال ڈالے کہ دوسرے کی بد اخلاقی کا جواب بد اخلاقی سے دینا چاہیے اور اس کی بدسلوکی پر اس سے بدلہ لینا چاہیے تو آپ شیطان کے ان وسوسوں سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کریں۔ وہ آپ کی دلی کیفیت کو جانتا ہے اور آپ کی وہ دعائیں بھی سنتا ہے جس سے آپ اس کی پناہ کے طلبگار ہیں۔

شیطان کے ساتھ نرمی برتنے کا کوئی فائدہ نہیں، اس لیے اس کی برائی کا جواب احسان مندی سے نہیں دینا چاہیے کیونکہ شیطان تو اسی بات پر خوش ہوگا کہ آپ اس کی روش پر چلتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کریں۔ اس کے سوا وہ آپ سے کچھ نہیں چاہے گا۔

لیکن انسانوں میں سے جو آپ کا دشمن ہے، اس کے ساتھ اگر آپ احسان کریں گے تو اس کا فائدہ ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ اس کی برائی کا جواب برائی سے نہ دیں، تب بھی یہ اسلوب فائدہ مند ہوگا، اسی لیے شریعت اسلامیہ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اگر کوئی انسان ہمارے ساتھ بُرا سلوک کرتا ہے تو ہم اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ لیکن اگر شیطان ہمارے ساتھ برائی کرتا ہے تو اس صورت میں صرف ایک ہی چیز مفید ثابت ہوسکتی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کریں تاکہ وہ ہمیں شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔[2]

قرآن حکیم نے بڑے واضح انداز میں بتا دیا ہے کہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر: 4/101,100. [2] المستفاد من قصص القرآن الکریم لعبد الکریم زیدان: 1/86.

انسان اور شیطان کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

شیطان کے شر سے محفوظ رہنے کے کیا ذرائع ہیں؟

شیطان کس طرح اولاد آدم کو بہکاتا ہے؟

قرآن حکیم نے یہ بھی بتا دیا کہ آخرت میں شیطان ان تمام لوگوں سے براءت کا اعلان کرے گا جن کو اس نے گمراہ کر کے راہِ حق سے دور کیا ہو گا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○﴾

”اور جب (جنت یا جہنم کے) معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے گا تو شیطان کہے گا: بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس کی میں نے خلاف ورزی کی اور میرا تم پر کوئی زور نہ تھا مگر یہ کہ میں نے تمھیں دعوت دی تو تم نے میری بات مان لی، چنانچہ تم مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو۔ میں تمھارا فریاد رس نہیں اور نہ تم میرے فریاد رس ہو۔ بلاشبہ میں تو اس کا انکار کرتا ہوں جو تم اس سے پہلے مجھے (اللہ کا) شریک ٹھہراتے تھے۔ بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔“[1]

یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے کہ ابلیس کی حقیقت کیا ہے اور اس ملعون دشمن کے بارے میں صحابۂ کرام کا کیا تصور تھا؟

کائنات کے متعلق صحابہ کا نظریہ

رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کو مسلسل قرآن حکیم کی تعلیم دیتے رہے اور قرآن حکیم کی

---

[1] إبراهيم 14:22.

آیات کی روشنی میں انھیں صحیح عقائد و نظریات سمجھاتے رہے۔ اس کائنات اور فانی و لازوال زندگی کے بارے میں درست نقطۂ نظر بتاتے رہے۔ آپ نے انھیں بتایا کہ اس کائنات کا آغاز کیسے ہوا اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ فرمان ربانی ہے:

﴿قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۚ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ○ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ۚ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَحِفْظًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ○﴾

’’آپ کہہ دیجیے: کیا تم واقعی اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا اور تم اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو؟ وہ تو جہانوں کا رب ہے۔ اور اس نے اس (زمین) میں اس کے اوپر مضبوط پہاڑ بنائے اور اس میں برکتیں رکھیں اور اس میں (رہنے والوں کے لیے) اس کی غذاؤں کا (ٹھیک) اندازہ کیا، محتاجوں کے لیے یکساں طور پر (یہ سارا کام) چار دنوں میں (مکمل ہوا)، پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ دھواں تھا، تب اللہ نے اس سے اور زمین سے کہا: تم دونوں خوشی یا ناخوشی سے آؤ تو ان دونوں نے کہا: ہم دونوں خوشی خوشی حاضر ہیں، پھر (اللہ نے) انھیں دو دنوں میں سات آسمان بنا دیا اور ہر آسمان میں اس کا کام الہام کر دیا اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں (ستاروں) سے زینت دی اور (اس کی خوب) حفاظت کی، یہ نہایت غالب، خوب جاننے والے کی تدبیر ہے۔‘‘[1]

ان آیات کریمہ نے اس کائنات کی تین حقیقتوں کی جانب اشارہ کیا ہے:

---

[1] حٰمٓ السجدة 41:9-12.

(i) آسمان تخلیق سے قبل محض ایک دھواں تھا۔ زمین کی تخلیق اور اس میں سامانِ خوراک مہیا کرنے کا کام چار دنوں میں ہوا۔

(ii) اس کائنات کا اصل مادہ (ابتدائی حالت میں) دھواں تھا۔

(iii) زمین و آسمان کی تخلیق کے تمام تر مراحل چھ ایام پر مشتمل ہیں۔[1]

قرآن حکیم نے ایک اہم حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ کائنات ستاروں، سیاروں اور کہکشاں کی شکل میں آنے سے قبل کس حالت میں تھی۔ انسان اپنے وسائل سے محض اندازے ہی قائم کر سکتا تھا اور اس حقیقت تک کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ۝﴾

”میں نے انھیں نہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں گواہ بنایا اور نہ خود ان کے پیدا کرنے میں اور میں گمراہ کرنے والوں کو بازو (مددگار) بنانے والا نہیں۔“[2]

قرآن حکیم نے اشارہ کیا ہے کہ کائنات کا مادہ ایک ہی ہے اور پھر نہایت وضاحت کے ساتھ اس کی حقیقتوں کو بیان کیا ہے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝﴾

”کیا کافروں نے نہیں دیکھا (غور کیا) کہ بے شک آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے ان دونوں کو الگ الگ کر دیا اور ہم نے پانی سے ہر زندہ شے بنائی، کیا پھر وہ ایمان نہیں لاتے؟“[3]

صحابۂ کرام نے سورۂ حم السجدہ کی آیات سے یہی مفہوم حاصل کیا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی تخلیق، اس میں سامانِ خوراک مہیا کرنے اور ان میں برکتیں رکھنے کا کام چار ایام

---

[1] مباحث في إعجاز القرآن لمصطفیٰ مسلم، ص: 177. [2] الكهف 51:18. [3] الأنبیآء 30:21.

میں کیا اور یہ سب کچھ آسمان کی تشکیل اور اسے سات آسمان بنانے سے قبل ہوا۔ صحابۂ کرام نے یہ حقیقت خالق ارض و سما کی وحی سے معلوم کی۔[1]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

> ”(اللہ تعالیٰ نے) زمین کو دو ایام میں تخلیق فرمایا، پھر اس نے آسمان بنایا، پھر اس نے آسمان کی طرف متوجہ ہو کر اسے مزید دو دنوں میں درست فرمایا، پھر اس نے زمین کو بچھایا۔ زمین کو بچھانے سے مراد یہ ہے کہ اس نے زمین سے پانی نکالا اور نباتات پیدا کیں اور مزید دو ایام میں پہاڑ، اونٹ، ٹیلے اور جو کچھ بھی ان دونوں (زمین و آسمان) کے درمیان ہے پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿دَحٰىهَا﴾ اور ﴿خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ﴾ کا یہی مفہوم ہے۔ زمین اور زمین میں جو کچھ ہے اسے چار دنوں میں بنایا گیا اور سارے آسمان دو ایام میں۔“[2]

قرآن کریم نے اپنی عظیم آیات میں صحابۂ کرام کے لیے یہ بات واضح کی کہ اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے آسمان بنائے، زمین میں بڑے بڑے پہاڑ رکھ دیے۔ قرآن حکیم نے سورج، چاند، ستاروں اور کائنات کے دیگر حقائق کے بارے میں گفتگو کی۔ پہاڑوں کے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ان کے فوائد بیان کیے۔ ان کی ضرب الامثال بیان کیں۔ ان پر غور و فکر کی دعوت دی اور یہ بھی بتایا کہ عنقریب اللہ تعالیٰ ان پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے گا۔ قرآن حکیم نے سمندری دنیا کو موضوع گفتگو بنایا۔ سمندر میں چلنے والی کشتیوں کا تذکرہ کیا۔ سمندروں سے حاصل ہونے والی دولت کا ذکر کیا۔ قرآن حکیم نے فضا میں پائی جانے والی اشیاء، مثلاً: کڑکتی ہوئی بجلیوں، بادلوں، بارشوں اور ہواؤں کا تذکرہ کیا۔ فرمان ربانی ہے:

---

[1] مباحث في إعجاز القرآن لمصطفىٰ مسلم، ص: 177-179. [2] صحيح البخاري، حديث: 4816 تعليقا.

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ کَیْفَ یَشَآءُ وَیَجْعَلُهٗ کِسَفًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ○﴾

”اللہ وہ ذات ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے، پھر وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر اللہ اسے آسمان میں جس طرح چاہتا ہے پھیلاتا ہے اور وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، پھر آپ بارش دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر سے نکلتی ہے، پھر جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے بارش برساتا ہے تو اس وقت وہ خوش ہو جاتے ہیں۔“ [1]

قرآن حکیم نے جہاں ہر پہلو سے اس کائنات اور زندگی کی حقیقتوں کو آشکارا کیا ہے، وہاں حیوانات کے حقائق سے بھی پردہ اُٹھایا ہے کیونکہ حیوانات کی دنیا بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے کچھ کم نہیں۔ قرآن حکیم ہماری نگاہوں کو ان فوائد کی جانب متوجہ کرتا ہے جو کہ انسان ان حیوانات سے حاصل کرتا ہے۔ کبھی انھیں اپنا تابع فرمان بنا کر ان سے سواری کا کام لیتا ہے تو کبھی بوجھ اٹھانے کا۔ کبھی ان کے دودھ اور گوشت سے خوراک حاصل کرتا ہے تو کبھی ان کی اون اور کھالوں سے زیب و زینت کا سامان اور لباس بناتا ہے۔ ان حیوانات کو انسان کا تابع، مطیع اور خادم بنا دیا گیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل انسان اس کائنات اور اس میں بسنے والی مخلوقات سورج، چاند اور ستاروں کو دیکھتا تو ضرور تھا لیکن ان کے بارے میں صحیح تصوّرات اور نظریات سے بے بہرہ تھا۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کائنات میں خالق نے کون کون سے نظام وضع کیے ہوئے ہیں اور کن حکمتوں اور مقاصد کے لیے اس نے انھیں پیدا فرمایا ہے۔ اسے یہ بھی احساس نہ تھا کہ ہر چیز کس طرح اپنے بنانے والے کے بے عیب ہونے اور اوصاف عالیہ کے مالک ہونے کی شہادت دے رہی ہے۔ قرآن حکیم نے کائنات اور تمام مخلوقات پر غور و فکر اور تدبر کرنے کی دعوت دی اور انھیں بتایا کہ ہر چیز اپنے خالق کی

---

[1] الرُّوم 48:30.

تسبیح و تقدیس بیان کرتی ہے مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں پاتے۔ فرمانِ ربانی ہے:

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا﴾

''ساتوں آسمان اور زمین اور جو (مخلوق) ان میں ہے اس (اللہ) کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، بے شک وہ نہایت حوصلے والا، بہت بخشنے والا ہے۔''[1]

قرآن حکیم نے انھیں بتایا کہ حیوانات میں یہ وصف ہے کہ وہ انسان کے فرماں بردار اور مطیع ہوتے ہیں۔ اگر ان کی فطرت میں یہ وصف نہ ہوتا تو انسان کبھی ان پر تسلط حاصل نہ کر سکتا، اس لیے اس مُنعم کا شکر ادا کرنا ضروری ہے جس نے ان حیوانات کی فطرت میں انسان کی فرماں برداری کا وصف پیدا فرمایا۔[2] ارشادِ ربانی ہے:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ○ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ○ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ○﴾

''کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے جو چیزیں بنائیں ان میں یقیناً ہم نے ان کے لیے چوپائے بھی پیدا کیے؟ پھر وہ ان کے مالک (بن گئے) ہیں۔ اور ہم نے انھیں ان کے تابع کر دیا، چنانچہ ان میں سے کچھ ان کی سواریاں ہیں، اور ان میں سے کچھ کو وہ کھاتے ہیں۔ اور ان کے لیے ان (چوپایوں) میں (اور بھی) فائدے اور پینے کی چیزیں ہیں، کیا پھر وہ شکر نہیں کرتے؟''[3]

قرآن حکیم نے حیوانات کی روزی کے معاملے میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے کہ انسان اپنی روزی اور معیشت کے لیے بڑی سوچ بچار اور منصوبہ بندی کرتا ہے، پھر اس

---

[1] بنيّ إسرآءيل 17:44. [2] مباحث في إعجاز القرآن لمصطفىٰ مسلم، ص: 214. [3] يٰسٓ 36:71-73.

کے حصول کے لیے بڑے پاپڑ بیلتا ہے، پھر جس طریقے سے بھی ہاتھ لگ جائے اسے مستقبل کے لیے ذخیرہ کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے جبکہ حیوانات کے پاس نہ سوچ بچار کی قوت ہے نہ منصوبہ بندی کی صلاحیت، اس لیے اس ذات نے جو دانا بھی ہے اور ہر چیز سے باخبر اور بااختیار بھی، اسی نے ان کی روزی کے انتظامات فرمائے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○﴾

”اور کتنے ہی (زمین پر) چلنے پھرنے والے ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ انھیں اور تمھیں بھی رزق دیتا ہے اور وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔“ [1]

پروردگار کا اپنی مخلوقات کے ساتھ یہی انداز ہونا چاہیے کہ وہ ہر بات سے باخبر ہو، ہر چیز اس کی دسترس میں ہو اور وہ ہر حال میں روزی کا ذمہ دار ہو۔

ہر ذی روح کو ہر جگہ روزی مل رہی ہے، خواہ وہ سمندروں کی گہرائی میں ہو، تپتے صحراؤں میں ہو، برف کے پہاڑوں (گلیشیرز) میں ہو، چٹانوں کی تہ میں ہو یا ہواؤں اور فضاؤں میں ہو۔ سب کا اندراج ایک رجسٹر میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی سے غافل نہیں۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۭ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○﴾

”اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمے ہے اور وہ جانتا ہے اس کی قرارگاہ اور اس کے دفن ہونے کی جگہ کو۔ ہر چیز واضح کتاب میں (تحریر) ہے۔“ [2]

جانور اور حشرات الارض جو شکل و صورت اور چال ڈھال میں ایک دوسرے سے مختلف

---

[1] العنکبوت 60:29. [2] ھود 6:11.

ہیں، قرآن حکیم نے ان کی جانب توجہ دلاتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ انسان کی طرح ان کے بھی گروہ اور کنبے ہیں۔[1] ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ۚ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝﴾

''اور زمین پر چلنے والا کوئی جانور اور اپنے دونوں پروں سے اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں جو تمھاری طرح (الگ) امت نہ ہو، ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جس کا ذکر نہ کیا ہو)، پھر وہ سب اپنے رب کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔''[2]

قرآن حکیم نے اس کائنات اور اس میں پائی جانے والی مخلوقات و عجائبات کے بارے میں صحابۂ کرام کے افکار و تصورات کو صحیح سمت عطا کی اور انھیں اس زوال پذیر زندگی کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ نبی کریم ﷺ ہمیشہ ان کے دلوں میں یہ حقیقت جاگزیں کرتے رہے کہ دنیا کی زندگی کا انجام کیا ہوگا اور اس میں کامیابی کا راستہ کون سا ہے۔ آپ ﷺ کو یقین تھا کہ جو شخص بھی اپنے انجام سے واقف ہو جائے اور اسے نجات اور کامیابی کا راستہ مل جائے وہ اپنی تمام قوتوں اور وسائل کے ساتھ اس راستے پر گامزن ہونے کی جستجو کرے گا تاکہ کل کامیابی و کامرانی اس کے قدم چومے۔ آپ نے اس سلسلے میں درج ذیل امور کو نہایت اہتمام کے ساتھ واضح کیا:

(i) دنیاوی زندگی جس قدر بھی طویل ہو جائے انجام کار اس نے ختم ہونا ہے۔ اور دنیا کا سامان جتنا بڑھ جائے حقیقت میں وہ قلیل اور حقیر ہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو یوں واضح فرمایا:

---

[1] مباحث في إعجاز القرآن لمصطفىٰ مسلم، ص: 216. [2] الأنعام6:38.

﴿إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعٰمُ حَتّٰٓى إِذَآ أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَآ أَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ أَتٰىهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾

”بے شک دنیاوی زندگی کی مثال تو اس پانی کی سی ہے جسے ہم نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کی نباتات مل جل گئیں جس میں سے انسان اور چوپائے کھاتے ہیں، حتی کہ جب زمین نے اپنی رونق پکڑی اور مزین ہوگئی اور زمین والوں نے سمجھا کہ بے شک وہ اس (فصل کاٹنے) پر قادر ہیں تو ہمارا حکم (عذاب) رات یا دن کو (اچانک) آگیا، چنانچہ ہم نے اسے کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کر دیا، گویا کل وہ تھی ہی نہیں، اسی طرح ہم (اپنی) آیتیں کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔“ [1]

اس آیت کریمہ میں دنیاوی زندگی کی مثال دس چیزوں کے مجموعے کے ساتھ تشبیہ کی صورت میں بیان کی گئی ہے، اگر ان میں سے ایک چیز بھی کم کر دی جائے تو تشبیہ مکمل نہیں ہوتی۔ دنیا کی زندگی، جو بہت جلد بیت جاتی ہے اور دنیا کی نعمتیں اور مال و دولت جو بہت جلد ختم ہو جاتا ہے، پھر بھی لوگ اس کے دھوکے میں آجاتے ہیں، اسے بارش کے پانی سے تشبیہ دی گئی جس سے طرح طرح کے پودے، پھل اور پھول پیدا ہوتے ہیں، لباس فاخرہ سے آراستہ دلہن کی طرح زمین بھی خوبصورت اور خوشنما بن جاتی ہے، پھر جب زمین والوں کی ساری اُمیدیں اس سے وابستہ ہو جاتی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اب فصل ہر قسم کی آفت سے محفوظ ہوگئی ہے تو اچانک اللہ کا عذاب آتا ہے اور سب کچھ تہس نہس ہو جاتا ہے جیسے اس سے قبل وہاں کوئی چیز تھی ہی نہیں۔ [2]

---

[1] یونس 24:10. [2] الإتقان للسيوطي:2/70.

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو یہ فرمانِ ربانی بھی سنایا:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝﴾

''اور ان کے لیے دنیاوی زندگی کی مثال بیان کیجیے: جیسے پانی (مینہ)، جسے ہم نے آسمان سے نازل کیا، پھر اس سے زمین کی نباتات خوب مل جل گئی، پھر وہ چورا چورا ہوگئی جسے ہوائیں اڑالے جاتی ہیں اور اللہ ہر شے پر بہت قدرت رکھنے والا ہے۔''[1]

زمین کی تمام پیداوار پھل، پھول، کلیاں اور ہر طرح کا سبزہ بالآخر خشک ہو کر ریزہ ریزہ بن جاتا ہے، ہوائیں جس طرح چاہیں اسے اڑائے پھرتی ہیں، کبھی دائیں طرف پھینکتی ہیں اور کبھی بائیں طرف، مگر لوگ بھول جاتے ہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جو چاہے پیدا کر سکتا ہے اور جب چاہے اسے فنا بھی کر سکتا ہے۔[2]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ؕ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝﴾

''تم جان لو کہ دنیاوی زندگی محض کھیل تماشا اور زینت ہے اور آپس میں فخر کرنا اور ایک دوسرے پر اموال و اولاد میں کثرت جتانا ہے۔ (اس کی مثال یوں ہے) جیسے بارش کہ اس سے (پیدا شدہ) نباتات کسانوں کو خوش کرتی ہیں، پھر وہ خشک ہوجاتی ہیں تو آپ اسے زرد شدہ دیکھتے ہیں، پھر وہ چورا چورا ہوجاتی ہیں۔ اور آخرت میں (کفار کے لیے) شدید عذاب ہے اور (مومنوں کے لیے) اللہ کی طرف

---

[1] الكهف 45:18. [2] تفسير القاسمي: 49/11.

سے مغفرت اور رضامندی ہے اور دنیاوی زندگی تو بس دھوکے کا سامان ہے۔‘‘ [1]

دنیاوی زندگی کی حقارت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دُنیا کی زندگی محض سامان تفریح ہے۔ دیکھنے میں بڑی خوشنما ہے مگر اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ مال و اولاد میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی جستجو اور حسب و نسب میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کا شوق ہے۔ جس طرح بارش برسنے کے بعد پیدا ہونے والی پیداوار کاشتکاروں کی خوشی کا باعث ہوتی ہے، اسی طرح دنیا کی زندگی کافروں کے لیے شادمانی کا سبب بنتی ہے۔ وہ دنیا کے بہت زیادہ حریص اور شوقین ہوتے ہیں مگر جس طرح زمین میں اُگی سرسبز و شاداب فصل خشک ہو کر زرد بن جاتی ہے اور چارے میں تبدیل ہو جاتی ہے، اسی طرح دنیا کا انجام بھی فنا اور زوال ہے۔ دنیا کے ختم ہونے پر آخرت کا آغاز ہوگا (اور آخرت کی زندگی اور نعمتیں بے مثال اور لازوال ہیں)، اس لیے رب ذوالجلال نے ہمیں دنیا کی محبت سے بچنے اور آخرت بہتر بنانے کی ترغیب دی ہے اور بتایا ہے کہ آخرت میں دو ہی چیزیں ہوں گی: عذابِ شدید یا رضوان و مغفرت۔ اور آخرت کے مقابلے میں دنیا کی ساری دولت بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ مگر دنیا کے طالب اور حریص اس کے فریب میں مبتلا ہیں اور آخرت کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ سب کچھ دنیا اور دنیا کی دولت ہی کو سمجھ رہے ہیں۔ [2]

ان آیات کریمہ نے دنیا کی حقیقت کو نہایت واضح کر دیا ہے کہ یہ دنیا اپنے تمام تر سامانِ زینت اور متاعِ زیست حتی کہ انسانی خواہشات کی مکمل تکمیل کے باوجود بھی آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں نہایت حقیر اور ادنیٰ ہے۔ صحابۂ کرام نے دنیا کی اس حقیقت کو جان لیا تھا اور رسول اللہ ﷺ بھی انھیں ہمیشہ یہ یاد دہانی کراتے اور سمجھاتے رہے کہ ان کا دنیا میں آنے کا مقصد اور ذمہ داری کیا ہے اور ان کا اللہ کے ہاں کیا مقام ہے یہاں

---

[1] الحدید 20:57. [2] تفسیر ابن کثیر: 4/313,312.

تک کہ یہ باتیں ان کے قلوب و اذہان میں پختہ ہوگئیں۔ انھوں نے اپنی ذمہ داری پہچان لی۔ آپ ﷺ کی اعلیٰ تربیت کی بدولت ہی صحابۂ کرام کے دلوں میں دلیری، بہادری اور عزیمت پیدا ہوئی۔ وہ دن رات اپنی تمام تر صلاحیتوں اور قوتوں کے ساتھ سرگرم عمل رہے۔ ان میں کوئی کمزوری اور لچک پیدا نہیں ہوئی۔ سستی اور کوتاہی ان کے قریب نہ پھٹکی۔ ایک اللہ کے سوا کسی کا خوف انھیں دامن گیر نہ ہوا۔ مال و دولت کا لالچ اور اقتدار کی کشش انھیں اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے غافل نہ کرسکی۔ وہ دنیا کی سعادت اور آخرت کی کامیابی و نجات کے حصول کی خاطر سرگرداں رہے۔[1]

دعوت کے میدان میں کام کرنے والوں کی اکثریت کے دل سے یہ حقیقت محو ہو چکی ہے۔ وہ اس دنیا کی زندگی اور اس کے ساز و سامان میں غرق ہو چکے ہیں۔ دنیا کی محبت ان کے دلوں میں غالب آچکی ہے، وہ للچائی نظروں کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ جب انھیں کوئی تھوڑی سی چیز مل جاتی ہے تو ان کی حرص و ہوس مزید بڑھ جاتی ہے۔ دنیا کے ساتھ چمٹے ہونے کی وجہ سے نہ وہ سیر ہوتے ہیں اور نہ ان کی خواہش کم ہوتی ہے۔ یہ چیز امت کی ترقی اور دعوتی امور کے لیے بہت بڑا المیہ ہے، جبکہ شریعت کی مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے دنیا سے فائدہ اٹھانا اور اسے آخرت سنوارنے کے لیے ذریعہ اور وسیلہ بنانا کوئی عیب نہیں بلکہ یہ ایک پسندیدہ عمل ہے۔

---

[1] منهج الرسول في غرس الروح الجهادية للسيد محمد نوح، ص: 19-34.

باب 2

مکی دور میں عبادات اور اخلاق عالیہ کی تعلیم و تربیت

اُمت کے ہراول دستے کا عبادات کے ذریعے تزکیۂ نفس

ارشاد ربانی ہے:

﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّى وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝﴾

’’اور وہ آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہیے: روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمھیں تو بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔‘‘ ①

ایک اور مقام پر یوں فرمایا:

﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُۥ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِى فَقَعُوا۟ لَهُۥ سَٰجِدِينَ ۝﴾

’’چنانچہ جب میں اسے ٹھیک بنادوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو تم اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑنا۔‘‘ ②

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کی تربیت کے سلسلے میں تزکیۂ روح کا خاص خیال رکھا ہے اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اس مقصد کے حصول کے تمام ذرائع ان کے لیے واضح کر دیے جن میں سے چند اہم درج ذیل ہیں:

کائنات پر غور و فکر: اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن حکیم) پر غور و فکر کے ساتھ ساتھ اس کی

---

① بنيٓ إسرآءيل 85:17. ② صٓ 72:38.

کائنات اور تمام مخلوقات پر بھی غور و فکر کیا جائے تاکہ خالق کائنات کی عظمتوں اور اس کی حکمتوں کا شعور حاصل ہو۔

فرمان ربانی ہے:

> ”بے شک تمھارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر مستوی ہوگیا۔ وہ دن کو رات سے اس طرح ڈھانپتا ہے کہ وہ (رات) جلدی سے اس (دن) کو آلیتی ہے اور اس نے سورج، چاند اور تارے اس طرح پیدا کیے کہ وہ سب اس (اللہ) کے حکم کے پابند کردیے گئے ہیں۔ آگاہ رہو! پیدا کرنا اور حکم صادر کرنا اسی کے لیے روا ہے، اللہ رب العالمین بہت بابرکت ہے۔“ [1]

علم الٰہی پر غور و فکر: علم الٰہی کے بارے میں سوچ بچار کرنا کہ اس کی ہر چیز اس کے دائرۂ علم میں ہے، اس کا علم کائنات کی ہر چیز پر محیط ہے، ہر چیز جو نگاہوں سے اوجھل ہے یا نگاہوں میں آنے والی ہے، اس کے دائرۂ علم سے باہر نہیں۔ جب انسان اس بات کو اپنے تصور میں لاتا ہے تو اس کے قلب و روح عظمت الٰہی سے لبریز ہو جاتے ہیں اور دل کے تمام شکوک و شبہات ختم ہو جاتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

> ﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○﴾

”اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتا ایسا نہیں گرتا جسے وہ جانتا نہ ہو اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ (ایسا) نہیں (چھوٹتا جسے وہ جانتا نہ ہو) اور

---

[1] الأعراف 54:7.

کوئی تر چیز اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب میں (لکھی ہوئی) نہ ہو اور وہی ہے (اللہ) جو رات کو تمھیں فوت کرتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم دن میں کرتے ہو، پھر (دوسرے) دن میں تمھیں اٹھاتا ہے تاکہ (زندگی کی) مقررہ مدت پوری کی جائے، پھر اسی کی طرف تمھاری واپسی ہے، پھر وہ تمھیں بتادے گا جو تم کرتے رہے ہو۔‘‘ [1]

اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے مقاصد: روحانی تربیت کا سب سے بڑا اور اہم ترین ذریعہ عبادت الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے آپ کو نہایت حقیر اور ذلیل ترین درجے تک لے جانا عبادت ہے اور ایسی عبادت ایک اللہ کے سوا کسی اور کے لیے جائز نہیں۔ اسی لیے رب ذوالجلال نے فرمایا:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ﴾

’’اور آپ کے رب نے فیصلہ کر دیا کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔‘‘ [2]

وہ عبادات جن سے روح نشو ونما پاتی ہے اور نفس آلودگیوں سے پاک ہو جاتا ہے، دو طرح کی ہیں:

پہلی قسم: فرض عبادت، مثلاً: طہارت (غسل، وضو)، نماز، روزہ، زکاۃ اور حج وغیرہ۔

دوسری قسم: وہ امور جو بندگی کے وسیع معنی میں داخل ہیں۔ انسان اپنے خالق و مالک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے اور اسے خوش کرنے کے لیے جو کام کرتا ہے یا کسی کام کو چھوڑ دیتا ہے، اسی طرح کوئی نظریہ یا تصور اپنے دل میں پیدا کرتا ہے یا دل سے نکال باہر کرتا ہے، یہ سب امور عبادت میں شامل ہیں جن پر انسان کو اجر وثواب بھی حاصل ہوگا اور اس کی بہترین روحانی تربیت بھی ہوگی۔ [3]

---

[1] الأنعام 6:59,60. [2] بنيٓ إسرآءيل 23:17. [3] فقه الدعوة إلى الله لعبد الحليم محمود: 1/471,472.

اسلام میں یہ بات نہایت ضروری ہے کہ نماز، تلاوت قرآن، ذکر الٰہی اور تسبیح و تحمید کے ساتھ روح کا تزکیہ کیا جائے، اس لیے کہ نفسِ انسانی جب تک اپنی آلودگیوں سے پاک نہیں ہو جاتا اور اس کا اپنے خالق کے ساتھ تعلق قائم نہیں ہو جاتا اس وقت تک وہ اپنی شرعی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کر سکتا۔ عبادت اور اس پر دوام کی وجہ سے روح بیدار رہتی ہے، اسے ہر قسم کی خوراک اور توانائی حاصل ہوتی ہے اور ایسی تحریک پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کے لیے احکام الٰہیہ کو بجا لانا آسان ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ترتیب نزولی کے لحاظ سے تیسری سورت میں رسول کریم ﷺ کو نماز، ذکر اور تلاوتِ قرآن کا حکم فرمایا ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ○ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ○ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ○ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ○ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ○ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا ○ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ○ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ○ ﴾

”اے چادر میں لپٹنے والے! رات میں قیام کیجیے مگر تھوڑا سا، (یعنی) رات کا نصف، یا اس سے تھوڑا سا کم کیجیے، یا اس پر (کچھ) زیادہ کیجیے اور قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے، یقیناً ہم جلد آپ پر ایک بھاری بات ڈالیں گے، بلاشبہ رات کا اٹھنا (نفس کے) کچلنے میں زیادہ سخت اور دعا و ذکر کے لیے مناسب تر ہے، یقیناً دن میں آپ کے لیے بہت مصروفیت ہے اور اپنے رب کا نام ذکر کیجیے اور سب سے کٹ کر اسی کی طرف متوجہ ہو جایئے۔“[1]

نہایت اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے اور مشکل مہم جوئی کی اہلیت حاصل کرنے کے لیے قیام اللیل، ذکر الٰہی اور تلاوتِ قرآن حکیم پر ہمیشگی بہت ضروری ہے، اس لیے

---

[1] المزمّل 73:1-8.

رسول اللہ ﷺ صحابہ کے اسلام قبول کرتے ہی ارشاد ربانی کی روشنی میں عبادات کے ذریعے ان کی روحانی پاکیزگی اور تزکیہ و تربیت کا کام شروع کر دیتے تھے۔[1]

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ نماز کی ادائیگی کے لیے پہاڑی گھاٹیوں کا رخ کرتے تھے اور (اسلام دشمنوں سے) اپنی نمازیں مخفی رکھتے تھے۔[2]

اسلام کے ابتدائی زمانے میں جب رسول اللہ ﷺ کو اپنے صحابہ کے بارے میں یہ خوف دامن گیر ہوا کہ کفار مکہ انھیں کھلے عام تلاوتِ قرآن اور نماز کی ادائیگی کی اجازت نہیں دیں گے (بلکہ ان پر تشدد کریں گے) تو آپ ﷺ ان کو دار ارقم (جیسی خفیہ پناہ گاہ میں) لے جاتے ہیں، وہاں انھیں نماز پڑھاتے ہیں اور قرآن حکیم کی تعلیم دیتے ہیں۔ اگر نماز، تلاوت قرآن اور عبادات کے ذریعے روحانی تزکیے کی اہمیت نہ ہوتی تو خوف کی وجہ سے آپ اپنے صحابہ کو یہ چیزیں چھوڑنے کی اجازت دے دیتے۔ لیکن اس کے باوجود کہ قریش کو اس جگہ کا علم ہو گیا تھا جہاں آپ اپنے صحابہ کو نماز پڑھاتے تھے، پھر بھی آپ نے نماز اور تلاوت قرآن کو ترک نہیں کیا۔[3]

مکی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اقامتِ صلاۃ کی بہت زیادہ ترغیب دی ہے اور ان لوگوں کی تعریف فرمائی ہے جو نمازوں میں خشیت اختیار کرتے ہیں، آرام دہ بستروں کو چھوڑ کر ساری ساری رات ذکر الٰہی میں گزارتے ہیں اور ان لوگوں کی بھی تعریف فرمائی جو اللہ کو پکارتے ہیں، اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور اسے ہر لحظہ یاد رکھتے ہیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ○﴾

''مومن یقیناً فلاح پا گئے، وہ جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔''[4]

ایک اور مقام پر یوں فرمایا:

---

[1] أهمية الجهاد في نشر الدعوة لعلي العلياني، ص: 69.
[2] سبل الهدیٰ والرشاد للصالحي: 404/2.
[3] أهمية الجهاد في نشر الدعوة لعلي العلياني، ص: 70.
[4] المؤمنون23:2،1.

﴿ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○﴾

’’ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں (اور) وہ اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور جو ہم نے انھیں رزق دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔‘‘ [1]

رسول اللہ ﷺ کو تاکید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۚ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ○﴾

’’اور آپ نماز قائم کریں دن کی دونوں طرفوں (صبح و شام) اور رات کی کچھ گھڑیوں میں، بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔ یہ (اللہ کا) ذکر کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے۔‘‘ [2]

اس کے علاوہ سورۂ بنی اسرائیل (79,78:17)، طٰہٰ (130:20 و 132) اور قٓ (40,39:50) میں بھی اس طرح کی آیات موجود ہیں۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب راہِ نجات نظروں سے اوجھل ہو اور انسان مشکلات میں گھرا ہوا ہو تو اس وقت بہترین ہتھیار یہ ہوتا ہے کہ انسان کثرت سے نماز پڑھے، اپنے رب کو یاد کرے، تلاوتِ قرآن کرے، صرف ایک اللہ کے سامنے گڑگڑائے اور زیادہ سے زیادہ دعا کرے۔ [3]

عبادات میں سب سے پہلا درجہ نماز کا ہے اور یہ ایک مسلمان کے روحانی تزکیہ میں بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ صحابۂ کرام کی جماعت کو نماز کی وجہ سے جو نمایاں ترین فوائد حاصل ہوئے، ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

احکامِ الٰہیہ کی فوری تعمیل اور اظہار بندگی: اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کی تعریف کی

---

[1] السجدة 16:32. [2] هود 114:11. [3] أهمية الجهاد في نشر الدعوة لعلي العلياني، ص: 72.

ہے جو اس کے احکامات کو قبول کرتے ہیں اور فوراً ان کی تعمیل کرتے ہیں۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○﴾

''اور وہ لوگ جنھوں نے اپنے رب (کے حکم) کو مانا اور نماز قائم کی اور ان کا (ہر) کام باہمی مشورے سے ہوتا ہے اور ہم نے انھیں جو کچھ دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''[1]

اس وقت تک بندگی کا صحیح حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک انسان ہر ایک سے کٹ کر صرف ایک اللہ کی طرف رجوع نہ کرے اور اس کا ہر عمل صرف اور صرف اللہ کے لیے نہ ہو۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ○﴾

''کہہ دیجیے: بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت، (سب کچھ) اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی (بات یعنی توحید) کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔''[2]

صحابۂ کرام جانتے تھے کہ نماز کے مراحل میں سے ہر مرحلہ نمازی کی ذات پر ایک خاص اثر ڈالتا ہے اور اس کا روحانی تزکیہ کرتا ہے، اگر نمازی غور و تدبّر کے ساتھ سورۂ فاتحہ پڑھے تو یہ اسے اللہ کی بندگی کا مکمل شعور عطا کرتی ہے۔ جب بندہ یہ آیت پڑھتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ تو یہ اس شعور کو پختہ کرتی ہے کہ ہر قسم کے کمالات و اوصاف صرف اللہ کے لیے ہیں۔ اس کے پاس جو بھی نعمتیں ہیں وہ اُسی اللہ کی عطا کردہ ہیں۔ اسے اگر نیک اعمال کی توفیق ملی ہے تو وہ بھی اسی کی عطا کردہ ہے۔ پھر اس احساس

---

[1] الشوریٰ 42:38۔ [2] الأنعام 6:162،163۔

کے ساتھ بندہ اس کے اسمائے حسنیٰ اور صفات عالیہ کے ساتھ حمد و ثنا بجا لاتا ہے۔[1]

پھر جب وہ یہ آیت پڑھتا ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ تو اس کے دل میں یہ عقیدہ پختہ ہو جاتا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سوا کوئی ذات عبادت کے لائق نہیں۔ اور اس کے سوا کوئی مددگار نہیں۔ اگر اس کے علاوہ کسی سے مدد طلب کی گئی تو ذلت و رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔

پھر بندہ جب اس آیت تک پہنچتا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○﴾ تو گویا وہ اس بات کا اقرار کر رہا ہوتا ہے کہ میں جادۂ حق پر چلنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کے لیے بھی تیرا محتاج ہوں اور مجھے اس بات کی ضرورت ہے کہ میری مزید رہنمائی کی جائے اور مجھے اس رہنمائی کے ثمرات بھی حاصل ہوں اور میں ان لوگوں کے طرز عمل سے دور رہوں جو راہِ حق سے بھٹکے ہوئے اور غضب الٰہی کا شکار ہیں۔[2]

پھر نمازی جب رکوع کے لیے جھکتا ہے تو اپنے رب کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ اکبر کہتا ہے کہ اللہ ہر چیز سے بڑا ہے، پھر اپنی زبان سے اس کی تسبیح بیان کرتا ہے کہ اس کے سوا ہر چیز میں عیب ہو سکتا ہے مگر اس کی ذات ہر عیب سے پاک ہے۔ رکوع میں انسان ہر لحاظ سے، جسمانی طور پر بھی اور قلبی طور پر بھی، اس کے سامنے جھک جاتا ہے، پھر جب سجدہ کرتا ہے تو اپنے جسم کا سب سے زیادہ افضل اور محترم حصہ اللہ کے سامنے عاجزی اور ذلت اختیار کرتے ہوئے اس کی بارگاہ میں رکھ دیتا ہے۔ جسم کے اس ظاہری انکسار کے ساتھ ساتھ دل بھی اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ دل اپنی ساری خواہشات اور چاہتوں کو ختم کر کے اس کے سامنے تواضع اختیار کرتا ہے۔[3]

سجدے کی اس حالت میں انسان اپنے رب کے بہت زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔

---

[1] منهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون: 221/1.

[2] الموازنة لابن القيم، ص:35-40.

[3] الموازنة لابن القيم ، ص:43-46، والخشوع في الصلاة لابن رجب، ص:20-22.

سجدے میں جس قدر خشیت الٰہی زیادہ ہوگی اتنا ہی بندہ اپنے رب کے زیادہ قریب ہوگا۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ﴿كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝﴾

”ہرگز نہیں! آپ اس (ابوجہل) کی بات نہ مانیں اور سجدہ کریں اور اللہ کا قرب حاصل کریں۔“ [1]

حدیث نبوی ہے:

«أَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ وَ هُوَ سَاجِدٌ، فَأَكْثِرُوا الدُّعَاءَ»

”بندہ سجدے کی حالت میں اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے، لہٰذا (سجدہ کی حالت میں) کثرت سے دعا کیا کرو۔“ [2]

سجدے کے بعد جب نمازی سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے تو گویا اپنے رب کے حضور دوزانو ہو کر اور اپنا آپ اس کے حوالے کرتے ہوئے اپنی زیادتیوں اور معصیتوں پر معذرت کرتا ہے۔ اور اس سے اس کی رحمت و مغفرت کی بھیک مانگتا ہے۔

نماز کے تمام افعال میں اللہ تعالیٰ کے لیے بندگی کا اظہار نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ اور یہ بات بخوبی نظر آتی ہے کہ بندہ اپنے رب کی جانب کس قدر متوجہ ہے اور اس کی وحدانیت کا اعتراف کرتے ہوئے کس طرح اپنے ایمان کو تقویت پہنچا رہا ہے۔ یہی تزکیۂ نفس کی بنیاد ہے۔

یہ نماز کے وہ عظیم ترین ثمرات ہیں جو ایک نمازی کے لیے زندگی کے تمام راستے روشن کر دیتے ہیں اور اس کے دل کو پاکیزگی اور اطمینان بخشتے ہیں۔ [3]

بندے کی اپنے رب سے مناجات: رسول اللہ ﷺ نے اس مناجات کی یوں منظر کشی کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] العلق 19:96. [2] صحيح مسلم، حديث: 482. [3] منهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون: 222/1.

> ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے نماز اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دی ہے۔ میرے بندے نے جو کچھ مانگا میں نے عطا کر دیا۔ جب بندہ کہتا ہے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔ اور جب وہ یہ کہتا ہے: ﴿ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری تعریف اور ثنا بیان کی ہے، پھر جب وہ یہ کہتا ہے: ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی ہے، پھر جب وہ یہ کہتا ہے: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ (نصف حصہ) میرے بندے کا ہے اس نے جو کچھ مانگا میں نے اسے عطا کر دیا۔“ [1]

صحابۂ کرام نے نبی کریم ﷺ کی تربیت سے یہ بات معلوم کر لی کہ یہ مناجات تزکیۂ نفس اور تقویتِ ایمان کا عظیم ترین ذریعہ ہے۔

جب بندہ اپنے آپ کو اس چیز کے لیے آمادہ کر لیتا ہے اور پورے اشتیاق کے ساتھ اپنے رب کے حضور کھڑا ہو کر اس سے لَو لگا لیتا ہے اور اس کے فضل و کرم اور اس کی رحمتوں کا امیدوار بن جاتا ہے تو پھر ہر کام اور ہر چیز میں اسے نصرت الٰہی حاصل ہوتی ہے۔

دلی اطمینان اور راحت و سکون: نماز کی وجہ سے انسان کی پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں اور اسے راحت و سرور حاصل ہوتا ہے۔ سنن ابوداود میں ایک حدیث ہے: «كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ صَلّٰى» ”رسول اللہ ﷺ کو جب بھی کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو آپ نماز پڑھتے۔“ [2]

اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 395، وسنن أبي داود، حديث: 821. [2] سنن أبي داود، حديث: 1319، و مسند أحمد: 388/5.

«قَدْ جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ»

”میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔“[1]

رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کو (فرائض کے علاوہ) سنن اور نوافل کی بھی تعلیم دی تاکہ رب کے ساتھ ان کا تعلق مضبوط ہو اور ان کے دلوں کو امن و راحت نصیب ہو، نیز ان کی پریشانیوں اور مشکلات کو حل کرنے کے لیے نماز بہترین ہتھیار کا کردار ادا کرے۔

نماز گناہوں سے بچاتی ہے: فرمان ربانی ہے:

﴿إِنَّ الصَّلَوٰةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنكَرِ﴾

”یقیناً نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔“[2]

نماز کی ادائیگی سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو دلی راحت وسکون حاصل ہوتا تھا۔ نماز ان میں ایسی قوت اور جذبہ پیدا کر دیتی تھی جس کی وجہ سے وہ اچھے کام بڑے شوق سے کرتے اور برے کاموں سے دور رہتے تھے۔ نماز ان کے دلوں میں اس عقیدے کو مزید پختہ کرتی کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہیں، اس لیے انھیں اس کی قائم کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ نماز ان میں ایسی ہمت پیدا کرتی کہ وہ اپنی شدید ترین خواہشات پر کنٹرول کر لیتے اور اپنے آپ کو مشکلات میں ڈالنے سے نہ گھبراتے۔

نماز ان کے لیے ایک مضبوط اور محفوظ قلعے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو گناہوں اور معصیتوں سے بچا لیتے تھے۔[3]

صحابۂ کرام کا یہ بھی یقین تھا کہ نماز گناہوں کی معافی اور درجات کی بلندی کا سبب بنتی ہے۔

اس کے علاوہ بھی نماز کے روحانی اور تربیتی فوائد ہیں جو ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے

---

[1] المستدرك للحاكم: 160/2، امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور بتایا ہے کہ یہ امام مسلم کی شروط کے مطابق ہے، نیز امام ذہبی نے اس کی توثیق کی ہے۔ [2] العنكبوت45:29. [3] منهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون:227/1.

ہیں اور ایک نمازی آدمی کو یہ تمام فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اس طرح نماز روحانی تزکیہ وطہارت کے لیے بہترین کردار ادا کرتی ہے اور رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آجاتا ہے: «اَلصَّلَاۃُ نُورٌ» ”نماز ایک نور ہے۔“[1]

نماز ایک ایسا نور ہے جو نمازی کے لیے ہدایت کے راستے کو روشن کر دیتا ہے، اسے معصیتوں سے بچاتا ہے اور نیک اعمال کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا نور ہے جو نمازی کے دل کو منور کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے اسے ایمان کی مٹھاس (حلاوت) محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنے رب سے مناجات کی لذت سے محظوظ ہوتا ہے۔ نماز ایک ایسا نور ہے جس کی وجہ سے نفس ہر قسم کی آلودگی اور غلاظت سے پاک ہو جاتا ہے، اسے اطمینان قلب اور دلی راحت حاصل ہوتی ہے۔ وہ ہر خوف سے بے پروا اور پرسکون ہو جاتا ہے۔ نماز ایک ایسا نور ہے جو دنیا میں بھی نمازی کے چہرے پر نظر آتا ہے، اس کے چہرے پر حسن و جمال، رونق اور وجاہت نمایاں ہوتی ہے، جبکہ بے نماز کا چہرہ ان سب خوبیوں سے خالی ہوتا ہے۔[2] یہ نور قیامت کے دن بھی نمازی کے چہرے کو منور کر دے گا۔[3]

فرمان ربانی ہے:

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمٰنِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝﴾

”اس دن آپ ایمان والوں اور ایمان والیوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں دوڑتا ہوگا۔ (کہا جائے گا:) آج تمھیں ایسے باغات کی بشارت ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی تو

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 223. [2] منهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون: 233/1. [3] شرح صحيح مسلم للنووي: 100/3، إشارتًا، وجامع العلوم والحكم لابن رجب، ص: 190.

بہت بڑی کامیابی ہے۔“[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کثرت سے دعائیں اور ذکر و اذکار کیا کرتے تھے۔ خود بھی تلاوتِ قرآن حکیم کرتے اور دوسروں سے بھی تلاوت سنا کرتے تھے اور اس مقصد کے لیے راتوں کی خلوت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے۔ حضورِ قلب، غور و تدبر اور خشیت الٰہی کے حصول کے لیے خوب مجاہدہ کرتے۔ یہ تمام قُربت الٰہی کے حصول کے عظیم ذرائع ہیں۔ تزکیہ نفس پر ان کے بہت گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور نفس اپنے کمال کی بلندیوں کی جانب محو پرواز ہوتا ہے، ان سے روحانی عظمت حاصل ہوتی ہے۔ صحابۂ کرام کو ان سب نیکیوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ انھوں نے بندگی کے ان اعلیٰ مراتب کو حاصل کر لیا جن کی وجہ سے وہ اپنے رب کے بہت زیادہ قریب ہو گئے اور انھیں اپنے رب سے مناجات کا شرف حاصل ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«يَقُولُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي، وَأَنَا مَعَهُ حِينَ يَذْكُرُنِي إِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي، وَإِنْ ذَكَرَنِي فِي مَلَإٍ، ذَكَرْتُهُ فِي مَلَإٍ هُمْ خَيْرٌ مِّنْهُمْ، وَإِنْ تَقَرَّبَ مِنِّي شِبْرًا تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعًا، وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ بَاعًا، وَّإِنْ أَتَانِي يَمْشِي، أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً»

”اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرا بندہ میرے بارے میں جو گمان کرتا ہے میں اس کے ساتھ ویسا ہی طرزِ عمل اختیار کرتا ہوں۔ جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میری معیت لیتا ہے۔ اگر وہ اپنے نفس میں مجھے یاد کرتا ہے تو میں بھی اپنے نفس میں اسے یاد رکھتا ہوں۔ اگر وہ میرا ذکر لوگوں کی کسی جماعت میں کرتا ہے تو میں اس کا تذکرہ

---

[1] الحدید 12:57.

اس سے بہتر جماعت میں کرتا ہوں۔ اگر وہ ایک بالشت میرے قریب آتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب آتا ہوں۔ اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب ہوتا ہے تو میں دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ کے برابر اس کے قریب آتا ہوں۔ اگر وہ میری جانب چل کر آتا ہے تو میں اس کی جانب دوڑ کر آتا ہوں۔'' [1]

تلاوتِ قرآن حکیم ذکر کی عظیم ترین اقسام میں سے ہے۔ صحابۂ کرام اس کا خاص اہتمام کیا کرتے تھے۔ اسی تلاوت نے ان کے دلوں میں حُبِ الٰہی اور خشیتِ الٰہی کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ ان کے دلوں کو امراضِ قلب سے پاک کر دیا۔ اس طرح وہ قرآن حکیم کی ان آیات کا مصداق بن گئے:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝﴾

''اور ہم قرآن میں سے جو نازل کرتے ہیں وہ مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور وہ ظالموں کو خسارے ہی میں زیادہ کرتا ہے۔'' [2]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ۭ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۝﴾

''کہہ دیجیے: وہ (قرآن مجید) ان کے لیے جو ایمان لائے، ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور وہ ان کے حق میں اندھا پن ہے، یہ لوگ (جو حق بات نہیں سنتے گویا) دور دراز جگہ سے پکارے جا رہے ہوں۔'' [3]

---

[1] صحيح البخاري، حديث:7405، وصحيح مسلم، حديث:2675. [2] بنيّ إسرآءيل 82:17.

[3] حٰمٓ السجدة 44:41.

دوسرے مقام پر فرمان الٰہی ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝﴾

”جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں، آگاہ رہو! اللہ کے ذکر ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔“[1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم دعا کے ساتھ نہایت گہرا شغف رکھتے تھے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بتا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے مناجات اور اس کی بندگی کا سب سے نمایاں مظہر دعا ہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«اَلدُّعَاءُ هِيَ الْعِبَادَةُ» ”دعا عبادت ہی ہے۔“[2]

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دعا کا حکم دیا ہے اور اس انسان کو ڈانٹ پلائی ہے جو دعا چھوڑ کر تکبر کا انداز اختیار کرتا ہے گویا اسے اپنے رب کی کوئی ضرورت ہی نہیں، وہ ہر لحاظ سے اس سے بے نیاز ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝﴾

”اور تمھارے رب نے کہا ہے: تم مجھے پکارو، میں تمھاری (دعائیں) قبول کروں گا، بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں، وہ عنقریب ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔“[3]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ﴾ میں عبادت سے مراد دعا اور توحید ہے[4] (یعنی وہ میری توحید اور دعا کے سلسلے میں تکبر کا انداز اختیار کرتے ہیں۔)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کے لیے یہ بات واضح فرما دی تھی کہ دل کو ایک دائمی غذا

---

[1] الرّعد 28:13. [2] سنن أبي داود، حديث: 1479. [3] المؤمن 60:40. [4] تفسير ابن كثير: 86/4.

کی ضرورت ہے اور یہ غذا ذکر الٰہی، دعا اور تلاوتِ قرآن حکیم ہے۔ یہ غذا دل کو ہر قسم کے اَمراض اور آفات سے محفوظ رکھتی ہے۔

آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ ایک مسلمان کے لیے صبح شام، گھر میں داخل ہوتے اور نکلتے وقت، بازار میں داخل ہوتے وقت، کھاتے پیتے اور لباس پہنتے وقت، اسی طرح دیگر روز مرہ کے اعمال کے وقت کی دعائیں پڑھنا مستحب ہے تاکہ وہ ہر بیماری سے محفوظ رہے۔ اگر اسے کوئی عارضی صدمہ، مثلاً: بے چینی، غمگینی اور عائلی پریشانی لاحق ہو بھی جائے تو یہ ذکر و اذکار اور دعائیں شفا بخش مرہم کا کام دیتی ہیں جن سے دل مطمئن ہوتے ہیں اور روح کو زندگی حاصل ہوتی ہے۔

ان مسنون ذکر و اذکار اور دعاؤں میں بے چینی اور تکلیف کے موقع کی ایک دعا جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو سکھائی ہے وہ یہ ہے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيمُ الْحَلِيمُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبُّ الْأَرْضِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ»

''اس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو بڑی عظمتوں اور حلم والا ہے۔ اس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو عرش عظیم کا رب ہے۔ اس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو آسمانوں کا رب ہے اور زمین کا رب ہے اور مکرم عرش کا رب ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو یہ بات سکھا دی تھی کہ مشکلات میں کس طرح اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر کے اس کی امان، پناہ، حفاظت اور سکینت حاصل کرنی ہے تاکہ انھیں کوئی گھبراہٹ اور بے چینی نہ ہو بلکہ انھیں یقین کامل ہو کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے، ان کا حامی و مددگار ہے، ان کے معاملات کو سنبھالنے والا اور ان کی تائید و نصرت کرنے والا ہے اور انھیں اس بات کا پختہ یقین ہو کہ مجبور و لاچار کی پکار کو سننے والا اکیلا

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 6346.

صرف وہی ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْأَرْضِ ۗ أَءِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ○﴾

”(کیا یہ بت بہتر ہیں) یا وہ (اللہ) جو مجبور و لاچار کی دعا قبول کرتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور وہ اس کی تکلیف دور کر دیتا ہے اور وہ تمھیں زمین میں جانشین بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) معبود ہے؟ تم کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو۔“ [1]

بے شک ذکر و اذکار، دعا، تلاوتِ قرآن، قیام اللیل اور ہر قسم کی نفلی عبادات کا تزکیۂ نفس اور روحانی معراج پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

اس موضوع پر ہم جس قدر لکھ لیں ناکافی ہے۔ یہ مذکورہ بالا بحث چشمے سے حاصل کردہ چند گھونٹ ہیں۔

عقلی تربیت

انسان روح، جسم اور عقل کا مجموعہ ہے۔ قرآن نے انسان کو اسی مجموعی حیثیت سے خطاب کیا ہے اور قرآنی تعلیمات ہی کی روشنی میں نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابۂ کرام کی ہر لحاظ سے تربیت فرمائی۔ آپ نے ہر صحابی کی تربیت کا اس طرح اہتمام کیا کہ اس کی نظر و فکر اور غور و خوض کی صلاحیتیں مزید اجاگر ہوں کیونکہ یہی چیز انھیں اس بات کا اہل بنا سکتی ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ اور قرآن حکیم کا مقصود بھی یہی ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اس جانب یوں ہماری رہنمائی فرمائی ہے:

﴿قُلِ انظُرُوا مَاذَا فِي السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَمَا تُغْنِي الْآيَٰتُ وَالنُّذُرُ عَن قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ ○﴾

”(اے نبی!) کہہ دیجیے: دیکھو (اور غور کرو) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور

---

[1] النمل 27:62.

نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں دیتے جو ایمان نہیں لاتے۔''[1]

سورۂ عنکبوت میں یوں فرمایا:

﴿قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○﴾

''کہہ دیجیے: تم زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو اس نے مخلوق پہلی بار کیسے پیدا کی، پھر اللہ ہی (اسے) دوسری بار پیدا کرے گا، بلاشبہ اللہ ہر شے پر خوب قادر ہے۔''[2]

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○﴾

''(یہ قرآن) ایک کتاب ہے، ہم نے اسے آپ کی طرف نازل کیا، بڑی برکت والی ہے تاکہ وہ اس کی آیتوں پر غور کریں اور عقل مند اس سے نصیحت حاصل کریں۔''[3]

سورۂ عبس میں اس طرح فرمایا:

﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ○ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَاۗءَ صَبًّا ○ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ○ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ○ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ○ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ○ وَّحَدَاۗىِٕقَ غُلْبًا ○ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ○ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ○﴾

''چنانچہ انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کی طرف دیکھے، بے شک ہم نے خوب مینہ برسایا، پھر ہم نے زمین کو اچھی طرح پھاڑا، پھر ہم نے اس میں سے اناج اگایا اور انگور اور سبزیاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغات اور میوے اور چارا، (جو) تمھارے اور تمھارے جانوروں کے لیے سامانِ زندگی (ہے)۔''[4]

عقل انسان کی اہم ترین قوتوں میں سے ایک قوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عقل کی وجہ ہی

---

[1] یونس 101:10. [2] العنکبوت 20:29. [3] صٓ 29:38. [4] عبس 24:80-32.

سے انسان کو مکلّف (ذمہ دار) بنایا ہے۔ جو انسان پاگل پن یا کسی اور وجہ سے عقل سے محروم ہو، شریعت کی نگاہ میں وہ غیر مکلّف ہے اس سے تمام ذمہ داریاں ساقط ہو جاتی ہیں۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝﴾

"اور جس بات کا آپ کو علم ہی نہیں اس کے پیچھے نہ لگیں، بے شک کان، آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک کی بابت سوال کیا جائے گا۔"[1]

عقل انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ عقل ہی کی بدولت وہ حصول علم کا اہل بنتا ہے اور پھر علم کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے، اس لیے قرآن حکیم نے عقلی تربیت کے لیے ایک اسلوب وضع کیا ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کی تربیت کے لیے اختیار کیا۔ اس اسلوب کے اہم ترین نکات درج ذیل ہیں:

① عقل کو ان اصول وضوابط سے دور رکھا جائے جن کی بنیاد محض ظن، اندازہ، گروہی تعصب یا رسم ورواج ہو۔ قرآن حکیم نے اس سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ۝﴾

"حالانکہ انھیں اس کا کوئی علم نہیں، وہ تو بس گمان کی پیروی کرتے ہیں اور بلاشبہ گمان حق کے مقابلے میں کچھ بھی فائدہ نہیں دیتا۔"[2]

② عقل کے لیے ضروری ہے کہ تحقیق اور غور وفکر کے ساتھ ساتھ احتیاط کا دامن تھامے رکھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝﴾

---

[1] بنيٓ إسرآءيل 36:17. [2] النجم 28:53.

”اے ایمان والو! اگر کوئی نافرمان تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو (تاکہ) تم کسی قوم کو نادانی سے تکلیف (نہ) پہنچاؤ کہ پھر تم اپنے کیے پر پچھتاتے پھرو۔“ [1]

③ قوانینِ قدرت پر غور و فکر اور تدبر کے لیے عقل کو استعمال کرنا چاہیے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ۝ ﴾

”اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو ان کے مابین ہے حق ہی کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ اور یقیناً قیامت آنے والی ہے تو (اے نبی!) آپ (کافروں سے) خوبصورت انداز سے درگزر کریں۔“ [2]

④ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے جو کام مشروع قرار دیے ہیں، مثلاً: عبادات، معاملات، اخلاق و آداب، حالت امن و جنگ اور سفر و حضر میں زندگی گزارنے کا اسلوب، ان سب چیزوں کی حکمتوں پر غور و تدبر کرنے کے لیے عقل کو استعمال کرنا چاہیے۔ اس سے عقل کو نشو و نما اور پختگی حاصل ہوتی ہے۔ ان چیزوں کی معرفت حاصل ہونے کے بعد پھر انسان ان سے راہِ فرار اختیار نہیں کرتا بلکہ وہ احسن انداز میں تعلیمات الٰہی کو اپنی زندگی پر نافذ کرتا ہے کیونکہ اسی سے اطمینان و سکون اور بشری سعادتیں حاصل ہوتی ہیں اور ان کے حصول کے لیے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ہمیں ضابطۂ حیات عطا فرمایا ہے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ۝ ﴾

”اور تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اس (حلال جانور) کا گوشت نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام پڑھا گیا ہو؟ حالانکہ اللہ نے ان (سب جانوروں) کے بارے میں تفصیل

---

[1] الحجرات 6:49. [2] الحجر 85:15.

سے بتا دیا ہے جو اس نے تم پر حرام کیے ہیں، مگر جسے تم کھانے پر مجبور ہو جاؤ (تو وہ بھی حلال ہیں) اور بے شک اکثر لوگ اپنی خواہشات سے، بغیر علم کے دوسروں کو بہکاتے ہیں۔ بے شک آپ کا رب حد سے گزرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔‘‘[1]

⑤ انسانی تاریخ پر غور کرنے کے لیے عقل کو استعمال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے کیا طرزِ عمل رہا ہے تاکہ انسان اپنے آباء و اجداد اور پیشرو لوگوں کے واقعات سے نصیحت و عبرت حاصل کرے اور اس بات پر غور و فکر کرے کہ اقوام و مِلل کے بارے میں سنت الٰہی کیا رہی ہے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۠ وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ○﴾

’’کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں جنھیں ہم نے زمین میں ایسی طاقت دی تھی جو تمھیں نہیں دی اور ہم نے ان پر موسلا دھار بارش نازل کی اور نہریں بنائیں جو ان کے نیچے بہتی تھیں، پھر ہم نے ان کے گناہوں کے باعث انھیں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد دوسری قومیں پیدا کیں۔‘‘[2]

یہی بات اللہ تعالیٰ نے سورۂ یونس اور سورۂ روم میں بھی بیان فرمائی ہے۔

ان آیات کریمہ نے صحابۂ کرام کو یہ بات سمجھائی کہ اپنی عقل کو اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے مطابق استعمال کریں، کہیں ان کی عقلیں اللہ کے بارے میں (غلط نظریات کی وجہ سے) گمراہ ہو کر بھول بھلیوں میں نہ پھنس جائیں، جس طرح بہت سے فلسفی بھٹک گئے تھے جنھوں نے عقل کو اس کے استحقاق سے بڑھ کر تقدس کا درجہ دے دیا تھا۔[3]

قرآن حکیم کی اس تربیت کے نتیجے میں بہت زیادہ عملی فوائد حاصل ہوئے۔

---

[1] الأنعام 119:6.
[2] الأنعام 6:6.
[3] فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي، ص: 354.

جسمانی تربیت

نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کی جسمانی تربیت کا بھی اہتمام فرمایا اور اس تربیت کے لیے اصول بھی قرآن حکیم سے اخذ کیے تاکہ جسم اپنی ان ذمہ داریوں کو ادا کر سکے جن کے لیے اس کی تخلیق کی گئی۔ نہ اس سلسلے میں اسراف اور بخل سے کام لیا جائے اور نہ جسم کی ایک توانائی کو دوسری توانائی پر فوقیت دی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اپنے بندوں کے لیے واضح رہنمائی کر دی ہے کہ ان کے لیے کون کون سی پاکیزہ چیزیں حلال ہیں اور کون کون سی غیر پاکیزہ چیزیں حرام ہیں۔ اور ان لوگوں کی مذمت کی جو اپنے لیے (حلال کردہ) پاکیزہ چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ؁﴾

”(اے نبی!) کہہ دیجیے: جو زینت اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں، وہ کس نے حرام کی ہیں؟ کہہ دیجیے: یہ (پاکیزہ چیزیں) دنیا کی زندگی میں ان لوگوں کے لیے بھی ہیں جو ایمان لائے، جبکہ قیامت کے دن یہ خالصۃً مومنوں ہی کے لیے ہوں گی، اسی طرح ہم آیات کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔“ [1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اپنی جسمانی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد ہی اس قابل ہوتا ہے کہ اپنی ان ذمہ داریوں کو ادا کر سکے جن کا اللہ تعالیٰ نے اسے مکلّف بنایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی بجا لائے اور زمین میں خلافت کے فرائض بھی ادا کرے،

---

[1] الأعراف 32:7.

اس زمین کو آباد کرے اور اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیکی اور تقوے میں ہر قسم کا تعاون کرے، اس لیے قرآن حکیم نے انسانی جسم کی ضروریات کے لیے درج ذیل قواعد و ضوابط وضع کیے ہیں:

① اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان کے ساتھ کھانے پینے کی ضروریات کے لیے ایک ضابطہ مقرر فرمایا:

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝﴾

”اے بنی آدم! تم ہر نماز کے وقت اپنی زینت اختیار کرو، اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو، بے شک وہ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“[1]

② لباس کی انسانی ضروریات کے لیے یہ ضابطہ متعین فرمایا کہ جسم کے وہ اعضاء جنھیں چھپانا ضروری ہے ان کے لیے مناسب لباس پہننا سب کے لیے ضروری ہے اور لباس ایسا ہو جو انسان کو سردی اور گرمی کے نقصانات سے محفوظ رکھے اور اس بات کو بھی مستحب قرار دیا کہ مسجد میں جاتے وقت ایسا لباس استعمال کیا جائے جو باعث زینت ہو۔

③ رہائش کی ضرورت کا ضابطہ اس فرمان میں بیان کیا گیا:

﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝﴾

”اور اللہ نے تمھارے لیے تمھارے گھر جائے سکونت بنائے اور تمھارے لیے چوپایوں کی کھالوں سے ایسے گھر (خیمے) بنائے جنھیں تم ہلکا سمجھتے ہو اپنے کوچ کے دن اور اپنے قیام کے دن اور ان (بھیڑوں) کی اون سے اور ان (اونٹوں) کی

---

[1] الأعراف 31:7.

پشم سے اور ان (بکریوں) کے بالوں سے (گھریلو) اثاثے اور ایک مدت تک برتنے کی چیزیں (بنائیں)۔''[1]

④ تعمیرِ خاندان اور شریک حیات کی ضرورت پوری کرنے کے لیے یہ ضابطہ متعین کیا کہ اس مقصد کے لیے تمھارے لیے نکاح کرنا جائز ہے بلکہ خاص حالات میں اسے ضروری بھی قرار دیا۔ زنا، خفیہ راہ و رسم اور ہم جنس پرستی کو حرام قرار دیا۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝﴾

''اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، سوائے اپنی بیویوں یا ان (کنیزوں) کے جن کے مالک ہوئے ان کے دائیں ہاتھ تو بلاشبہ (ان کی بابت) ان پر کوئی ملامت نہیں، پھر جو شخص ان کے علاوہ (رستہ) تلاش کرے تو ایسے لوگ ہی حد سے گزرنے والے ہیں۔''[2]

⑤ مال و جائیداد کی ملکیت کے لیے ضابطہ بنایا کہ شرعی اصولوں کے مطابق مال اپنی ملکیت میں رکھا جا سکتا ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝﴾

''اور اس (مال) میں سے خرچ کرو جس میں اس نے تمھیں جانشین بنایا ہے، پھر تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے خرچ کیا ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''[3]

⑥ اسلام نے سرداری اور حکمرانی کے لیے یہ ضابطہ بنایا کہ کسی پر ظلم و زیادتی کرنا اور سرکشی اختیار کرنا حرام ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾

---

[1] النحل 16:80. [2] المؤمنون 23:5-7. [3] الحدید 57:7.

''اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیات کو جھٹلائے؟ بے شک ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔''[1]

⑦ محنت، جدوجہد اور اس میں کامیابی حاصل کرنا انسانی ضرورت ہے۔ اس کے لیے یہ ضابطہ متعین فرمایا کہ صرف وہی کام کیے جائیں جو شریعت میں جائز ہیں اور کسی دوسرے شخص کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں اور تمام مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ اس دنیا میں وہ کام کریں جن سے ان کے دینی اور دعوتی امور آسان ہو جائیں اور وہ کام اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لیے ذخیرۂ آخرت بن جائیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

''انھوں نے (موسیٰ سے) کہا: ہمارے پاس تمھارے آنے سے پہلے بھی ہمیں تکلیفیں دی گئیں اور تمھارے آنے کے بعد بھی۔ موسیٰ نے کہا: امید ہے کہ تمھارا رب تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تمھیں زمین میں جانشین بنا دے گا، پھر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔''[2]

قرآن حکیم کی بہت سی آیات میں عمل کو ایمان سے مربوط کیا گیا ہے اور عمل کے لیے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ عمل نیک ہو۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۝﴾

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، یقیناً ہم اس کا اجر ضائع نہیں کرتے جس نے اچھا عمل کیا۔''[3]

اللہ تعالیٰ نے اعمال میں حُسن (اچھا انداز و اسلوب) اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

---

[1] الأنعام 21:6. [2] الأعراف 129:7. [3] الكهف 30:18.

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَآئِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝﴾

''بے شک اللہ عدل اور احسان اور قرابت داروں کو (امداد) دینے کا حکم دیتا ہے اور وہ بے حیائی، برے کام اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔''[1]

⑧ اللہ تعالیٰ نے ان باتوں سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے کہ انسان دوسروں کو دھتکار دے، فخر و تکبر کا انداز اپنائے یا اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں پر اترائے اور غرور میں مبتلا ہو۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۖ فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ۖ وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ ۝﴾

''اور ہم نے کتنی ہی بستیاں ہلاک کردیں جو گزران زندگی (اپنے سامان زیست) پر اتراتی تھیں، چنانچہ ان کے یہ گھر (اجڑے پڑے) ہیں، ان کے بعد بہت تھوڑے ہی آباد ہوئے اور ہم ہی (ان سب کے) وارث ہوئے۔''[2]

یہ وہ بعض بنیادی امور ہیں جن پر نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابۂ کرام کی جسمانی تربیت کی اور انھیں اس بات کا اہل بنایا کہ وہ زندگی کی مشکلات، دعوتِ دین کی صعوبتیں اور جہادی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاسکیں۔

یہ حقیقت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کی بڑے عمدہ انداز میں تربیت فرمائی۔ ان کا روحانی تزکیہ فرمایا (انھیں ہر قسم کی اخلاقی و روحانی آلودگیوں سے پاک کیا)، ان کی عقلوں کو جلا بخشی اور ان کی جسمانی صلاحیتوں کو مزید اجاگر کیا تاکہ خالق کی پسندیدہ اور متوازن شخصیات تیار ہوں۔ یوں آپ ﷺ نے ایک کامیاب تربیتی سلسلہ بروئے کار لاتے ہوئے اپنے تمام مقاصد و اہداف کو حاصل کرلیا۔

---

[1] النحل 16:90۔ [2] القصص 28:58۔

مکارم اور رذائل کے متعلق صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت

اعلیٰ اور عمدہ اخلاق بھی عقیدے کا ایک اہم جز ہے۔ صحیح عقیدے کی تکمیل عمدہ اخلاق کے بغیر ممکن نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مختلف اسالیب کے ساتھ اپنے صحابہ میں عمدہ اخلاق پیدا کیے۔ آپ ﷺ انھیں قرآن حکیم کی آیات سناتے۔ صحابہ سننے کے بعد ان پر غوروتدبر کرتے، پھر ان ارشادات وتعلیمات کے مطابق عمل کرتے۔

قرآن حکیم کی مکی آیات پر غوروفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کی ترغیبات سے بھری پڑی ہیں اور ان میں ایسی بے شمار ہدایات ہیں کہ اپنے اخلاق وکردار کو ان آلودگیوں سے پاک اور صاف رکھا جائے جو اللہ کے دین پر چلنے میں خلل ڈالتی ہیں۔

رسولِ ہدایت جو کائنات کے لیے کامل ترین اسوہ اور امت کے لیے مخلص مُربّی تھے، خود خُلق عظیم کے مالک تھے۔ ارشادِ ربانی ہے:

”اور یقیناً آپ خُلقِ عظیم پر (کاربند) ہیں۔“[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: «إِنَّ خُلُقَ نَبِيِّ اللّٰهِ ﷺ كَانَ الْقُرْآنَ»

”نبی ﷺ کے اخلاق عین قرآن (کے مطابق) تھے۔“[2]

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں ہمارے نبی ﷺ کے اخلاق عالیہ کو یکجا کر دیا۔

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝﴾

”آپ (ان سے) درگزر کیجیے اور نیک کام کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے کنارہ کیجیے۔“[3]

امام مجاہد اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ”لوگوں کے اخلاق وکردار کے مقابلے

---

[1] القلم 4:68. أهمية الجهاد في نشر الدعوة لعلي العلياني، ص: 65,64. [2] صحيح مسلم، حديث: 746. [3] الأعراف 199:7.

میں گھٹیا پن اختیار کرنے کے بجائے نرمی اور درگزر کا رویہ اختیار کریں، مثلاً: ان کا عذر قبول کر لیں، انھیں معاف کر دیں، انھیں سہولت دیں اور ان سے بحث میں نہ الجھیں اور ان کے پوشیدہ امور کا کھوج مت لگائیں۔''[1]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس فرمان الٰہی کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''اس سے مراد ہر اچھا کام ہے۔ اور سب سے اچھا کام توحید ہے۔ اس کے بعد بندگی کے حقوق اور بندوں کے حقوق ہیں۔''[2]

﴿وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝﴾ سے مراد یہ ہے کہ کوئی جاہل آپ کے ساتھ بداخلاقی سے پیش آئے تو آپ اس کے جواب میں ویسا ہی انداز اختیار نہ کریں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو مدنظر رکھیں:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝﴾

''اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی (وقار اور عاجزی) سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے بات کریں تو وہ کہتے ہیں: سلام ہے۔''[3]

صحیح بخاری میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق یوں بیان کیا گیا ہے: «كَانَ النَّبِيُّ ﷺ أَحْسَنَ النَّاسِ خُلُقًا» ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ اچھے اخلاق والے تھے۔''[4]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو حُسنِ اخلاق کی تربیت دیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر حسن اخلاق کی ترغیب دیتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا شَيْءٌ أَثْقَلَ فِي مِيزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ، فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَيُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِيءَ»

---

[1] تهذيب مدارج السالكين لابن القيم: 2/655. [2] تهذيب مدارج السالكين لابن القيم: 2/655.

[3] الفرقان 25:63. [4] صحيح البخاري، حديث: 6203.

”قیامت کے دن مومن کی ترازو میں حُسنِ اخلاق سے زیادہ وزنی چیز کوئی نہیں ہو گی اور اللہ تعالیٰ بد اخلاق اور بدزبان انسان کو انتہائی ناپسند کرتا ہے۔“[1]

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی چیز ہے جس کی وجہ سے لوگ کثرت کے ساتھ جنت میں جائیں گے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«تَقْوَى اللّٰهِ وَ حُسْنُ الْخُلُقِ» ”اللہ کا ڈر اور اخلاق حسنہ۔“

پھر آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی چیز ہے جس کی وجہ سے لوگ کثرت کے ساتھ جہنم میں جائیں گے تو آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلْفَمُ وَالْفَرْجُ»

”زبان اور شرمگاہ (کے غلط استعمال سے)۔“[2]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو بتایا کہ حسن اخلاق کا اجر و ثواب بہت زیادہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبِكُمْ مِّنِّي مَجْلِسًا يَّوْمَ الْقِيَامَةِ أَحَاسِنُكُمْ أَخْلَاقًا وَّإِنَّ مِنْ أَبْغَضِكُمْ إِلَيَّ وَأَبْعَدِكُمْ مِّنِّي مَجْلِسًا يَّوْمَ الْقِيَامَةِ الثَّرْثَارُونَ وَالْمُتَشَدِّقُونَ وَالْمُتَفَيْهِقُونَ»

”تم میں سے میرے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ اور قیامت کے دن سب سے زیادہ میرے قریب بیٹھنے والا شخص وہ ہے جو تم میں سے زیادہ عمدہ اخلاق والا ہے۔ اور تم میں میرے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور قیامت کے دن سب سے زیادہ مجھ سے دور رہنے والے اشخاص وہ ہوں گے جو بغیر کسی دینی فائدے کے بہت زیادہ باتیں کرتے ہوں گے یا اپنی فصاحت و بلاغت کے اظہار، اپنی عظمت اور بڑائی کا لوہا منوانے کے لیے یا خود کو دوسروں سے بالا ثابت کرنے کے لیے کلام (خطاب) کریں گے۔“ (نبی کریم ﷺ نے تین الفاظ ارشاد فرمائے

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 2002. [2] جامع الترمذي، حديث: 2004.

تھے: الثرثارون والمتشدقون والمتفیهقون تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! الثرثارون اور المتشدقون کا مفہوم تو ہم سمجھتے ہیں، المتفیهقون سے کون مراد ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''المتکبرون'' تکبر کرنے والے۔'' [1]

نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابۂ کرام کی اخلاقی تربیت کے لیے قرآنی اسلوب کو اختیار کیا۔ عبادات اور عقائد کے ساتھ بیک وقت اخلاقی تعلیمات بیان کی جاتی تھیں کیونکہ اخلاق اور عقیدے کا باہمی تعلق قرآن حکیم میں بہت واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے رسول ﷺ اور سب مسلمانوں کے لیے واضح کر دیا کہ ایمانی اخلاق کیا ہے جس سے ہر مومن کو آراستہ ہونا چاہیے اور جاہلی اخلاق کیا ہے جس سے ہر مومن کو دور رہنا چاہیے۔

یہ حقیقت ہے کہ جاہلی اخلاق سے متنفر کرنے اور ان سے الگ تھلگ کرنے کا کام ابتدا ہی سے شروع ہو گیا تھا، پھر اس کے ساتھ ساتھ ان کے باطل اعتقادی تصورات سے نفرت پیدا کی گئی اور یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔

حسن خلق دین میں کوئی الگ چیز نہیں ہے اور نہ ہی یہ انسانی طرز عمل کے کسی خاص دائرے میں محصور ہے بلکہ حسن خلق دین کے جواہرات میں سے ایک جوہر ہے اور یہ انسانی زندگی کے ہر گوشے کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور مسلمان کے ہر طرز عمل کا ایک واضح اخلاقی رنگ ڈھنگ ہے۔ اخلاق حسنہ دراصل صحیح ایمان اور عقائد کی عملی تعبیر ہے کیونکہ ایمان محض دل میں پوشیدہ احساسات و جذبات کا نام نہیں بلکہ طرزِ عمل سے اس کا اظہار بھی ضروری ہے۔ ہمیں یہ حق ہے کہ جب ہم ایمان و اعتقاد کے مطابق ظاہری طرز عمل نہ دیکھیں یا ایمان و اعتقاد کے منافی طرز عمل دیکھیں تو پوچھیں کہ اب ایمان کہاں ہے؟ اور اس ایمان کا کیا فائدہ جو طرز عمل کو تبدیل نہ کرے؟ [2]

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 2018، الفاظ کے معانی کے لیے دیکھیے: تهذيب مدارج السالكين لابن القيم: 657/2. [2] دراسات قرآنية لمحمد قطب، ص: 130.

اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم نے عقیدے کے ساتھ اخلاق کا بڑا مضبوط ربط قائم کیا ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ فرمان ربانی ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ○ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ○ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۙ○ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○﴾

''مومن یقیناً فلاح پا گئے، وہ جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں اور وہ جو لغو باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں اور وہ جو زکاۃ ادا کرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، سوائے اپنی بیویوں یا ان (کنیزوں) کے جن کے مالک ہوئے ان کے دائیں ہاتھ تو بلاشبہ (ان کی بابت) ان پر کوئی ملامت نہیں، پھر جو شخص ان کے علاوہ (رستہ) تلاش کرے تو ایسے لوگ ہی حد سے گزرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی حفاظت کرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں، یہی لوگ وارث ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''[1]

سورت کا آغاز اس بات سے ہوا کہ کامیابی یقیناً اہل ایمان کے لیے ہے، پھر ان اہل ایمان کے اوصاف بیان کیے جو ان کے اخلاقی پہلو کو واضح کرتے ہیں اور اس بات کی جانب واضح اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ عمدہ اخلاق ایک لحاظ سے ایمان کا ثمرہ ہیں اور یہ کہ ایمان وہ ظاہری طرزِ عمل ہے جو دل میں موجود عقیدے کی ترجمانی کر رہا ہے۔

اہل ایمان کی سب سے پہلی صفت یہ ہے کہ وہ اپنی نمازوں میں اظہار عجز و نیاز کرتے

---

[1] المؤمنون 23:1- 10.

ہیں۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے جس میں سعادت کے وہ لمحات ہوتے ہیں جن میں ایک مومن نہایت عاجز بندہ بن کر اپنے آقا و پروردگار کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوتا ہے۔ دل اس کی یاد سے لبریز ہوتا ہے اور روح اس کے وصال کی لذتیں حاصل کر رہی ہوتی ہے۔ ایک سچے مومن کے ایمان کا سب سے پہلا مظہر یہی ہوتا ہے کہ اس کی نماز میں ایسا خشوع و خضوع ہو جو اس کے تعلق باللہ کی صداقت واضح کر دے اور حالت نماز میں اس تعلق کو مزید پُر جوش بنا دے۔

پھر یہ سورت دوسرے پہلو سے اہل ایمان کے طرزِ عمل کا ایک وصف بیان کرتی ہے کہ وہ بے ہودہ باتوں سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ بے ہودگی تو کسی بھی سنجیدہ انسان سے سرزد نہیں ہو سکتی۔ صحیح ایمان انسان کو وہ متانت عطا کرتا ہے جو اس کے اندر ذمہ داریوں کا احساس اور سنجیدگی پیدا کرتی ہے۔ سنجیدگی اس بات کا نام نہیں کہ انسان ہر وقت تُرش رو بنا رہے، ہر وقت اس کے ماتھے اور چہرے پر شکنیں پڑی ہوں بلکہ جب انسان کو اس بات کا شعور حاصل ہو جائے کہ خالق کائنات نے کتنی بڑی امانت اس کے سپرد کی ہے تو وہ کسی قسم کی بے ہودگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

پھر اہل ایمان کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ ان کے دل ہر وقت اس احساس سے لبریز رہتے ہیں کہ ان کے اموال میں اللہ تعالیٰ کا بھی حق ہے جو زکاۃ کی صورت میں انھیں ادا کرنا ہے۔

اہل ایمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جنسی امور میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پابندی کریں اور اس کی متعین کردہ حدود سے تجاوز نہ کریں۔ اور ان کے لیے یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ وہ معاشرتی تعلقات میں بھی احکام الٰہی ملحوظ رکھیں، امانتوں کی حفاظت کریں اور عہد و پیان کی پاسداری کریں۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک اخلاق کا کیا مفہوم تھا۔ عمدہ اخلاق جس طرح صحیح عقیدے کا ایک فطری نتیجہ ہیں، اسی طرح درست عقیدے

سے عبادات میں خشیت الٰہی پیدا ہوتی ہے۔ صحابۂ کرام نے اسی طرح سے قرآنی تعلیمات اور فرامین نبویہ کی حکمتوں کو حاصل کیا۔

قرآن حکیم نے ان کے سامنے ایک مومن شخص کا تفصیلی نقشہ کھینچ کر رکھ دیا جس میں ان کی سب سے پہلی اور نمایاں علامت بندگی کو قرار دیا۔ صحابہ کرام نے بھی یہ بات جان لی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا سب سے پہلا وصف نماز میں خشوع وخضوع اور عجز وانکسار اور آخری وصف نماز کی حفاظت قرار دیا اور بتایا کہ وہ زکاۃ کی ادائیگی پر کاربند رہتے ہیں۔ زکاۃ ایک ایسی عبادت ہے جو اپنے اندر بے شمار اخلاقی فضیلتوں کو لیے ہوئے ہے۔

قرآن حکیم موقع ومحل اور ضروریات کے لحاظ سے کبھی اس کی عبادت کے پہلو کو نمایاں کرتا ہے اور کبھی اخلاقی پہلو کو۔ سورۂ ذاریات میں متقین کے اوصاف میں عبادت کے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ۝ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝﴾

”جو کچھ ان کا رب انھیں دے گا، وہ اسے لے رہے ہوں گے۔ بلاشبہ وہ اس سے پہلے نیکو کار تھے، وہ رات کو بہت ہی تھوڑا سوتے تھے اور وہ سحری کے وقت مغفرت مانگا کرتے تھے اور ان کے مالوں میں سوالی اور محروم (نہ مانگنے والے) شخص کا حق (حصہ) ہوتا تھا۔“[1]

سورۂ رعد میں باشعور لوگوں کے اوصاف میں اخلاقی پہلو کو اہمیت دی گئی:

﴿اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ....﴾

---

[1] الذّٰریٰت 51:16-19.

> ’’کیا پھر وہ شخص جو جانتا ہے کہ یقیناً جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے وہی حق ہے، وہ اس شخص کے مانند (ہو سکتا) ہے جو اندھا ہے؟ بس عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں، وہ جو اللہ کا عہد پورا کرتے ہیں اور پختہ وعدہ نہیں توڑتے اور جو جوڑتے ہیں وہ چیز جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا اور وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب سے گھبراتے ہیں اور جنھوں نے اپنے رب کے چہرے کی طلب کے لیے صبر کیا اور نماز قائم کی اور ہمارے دیے رزق میں سے پوشیدہ اور ظاہر طور پر خرچ کیا اور وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں، انھی لوگوں کے لیے آخرت کا گھر ہے۔‘‘ [1]

دانشور اور باشعور لوگوں کی مناسبت سے اس مقام پر زیادہ تر اخلاقی اوصاف کا تذکرہ کیا گیا ہے، مثلاً: وفاداری، صلہ رحمی، صبر اور مال خرچ کرنا۔ لیکن یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ یہ محض معاشرتی خوبیاں نہیں بلکہ یہ وہ اوصاف ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور اسی کی خوشنودی کے لیے اختیار کیے گئے ہیں۔ اس طرح ان امور میں عبادت اور تقویٰ دونوں خوبیاں موجود ہیں۔ ان میں وفاداری ہے تو اللہ کے ساتھ عہد و پیمان کی وجہ سے، وہ ان تعلقات کو قائم رکھتے ہیں جنھیں اللہ نے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے۔ وہ اپنے رب کے ڈر اور یوم حساب کو بُرے انجام کے خوف سے اچھے کام کرتے ہیں اور برے کاموں سے دور رہتے ہیں۔ ان کا صبر بھی صرف اپنے رب کی خوشنودی کے لیے ہوتا ہے۔ ان کے ہر قسم کے طرزِ عمل اور اخلاق و اوصاف سے مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور یوم آخرت کی جواب دہی کا احساس ہوتا ہے۔ [2]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت اسی نکتے پر کی گئی کہ عبادت بھی اخلاق کی ایک قسم ہے کیونکہ اللہ سے ایفائے عہد، اس کی نعمتوں کی شکرگزاری، ہر خوبی کا اعتراف اور معززین و

---

[1] الرعد 13:19-22. [2] العبادة في الإسلام للقرضاوي، ص: 123.

اکابر کی توقیر و تعظیم یہ سب عبادات ہیں اور یہی اخلاق حسنہ بھی ہیں۔ [1]

صحابۂ کرام اخلاق ربانی کے حامل تھے۔ ان اخلاق کو پیدا کرنے والی چیز ایمان باللہ تھی اور پروان چڑھانے والی چیز آخرت میں بخشش کی امید تھی اور ان سے مقصود محض اللہ کی رضا اور اس کے اجر و ثواب کا حصول تھا، اس لیے وہ گفتگو میں سچائی سے کام لیتے تھے، امانت میں خیانت نہیں کرتے تھے، عہد و پیمان کی پاسداری کرتے تھے، مصائب و تکالیف اور میدان جہاد میں صبر سے کام لیتے تھے، مظلوم کی مدد کرتے تھے، چھوٹوں پر رحم اور بڑوں کا احترام کرتے تھے اور اپنے ہر طرز عمل میں عمدہ اور بہترین اسلوب اختیار کرتے تھے۔ اور یہ سب کچھ صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے اور اس سے اجر و ثواب لینے کے لیے ہوتا تھا اور یہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔ فرمان ربانی ہے:

﴿فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۚ○ وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ○﴾

''پھر اللہ نے انھیں اس دن کے شر (عذاب) سے بچا لیا اور تازگی اور سرور سے نوازا۔ اور ان کے صبر کے عوض انھیں جنت اور ریشمی لباس کا بدلہ عطا فرمایا۔'' [2]

مومن کا اخلاق سراسر عبادت ہے کیونکہ مومن کا معیار خیر اور شر ہے (وہ اسی کے ذریعے ہر چیز کو پرکھتا ہے) اور انتخاب و اجتناب میں اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی ہیں۔ (خیر و شر کے پرکھنے کے لیے ضمیر کافی نہیں ہوتا) کیونکہ ضمیر معصوم عن الخطا نہیں ہے۔ بہت سے لوگ اپنے ضمیر کے فیصلے کے مطابق برائیوں اور آلودگیوں میں پھنسے ہوئے ہیں مگر اس پر خوش اور مطمئن ہیں۔ [3]

محض عقل کوئی معتمد علیہ چیز نہیں کیونکہ یہ ایک ماحول اور معاشرے تک محدود ہوتی ہے اور خواہشات اور اختلافات اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ علم

---

[1] الوسطية في القرآن الكريم للصلابي، ص: 591. [2] الدهر 11:76-12. [3] الإيمان والحياة للقرضاوي، ص: 256.

اخلاق کے فلسفی آج تک فلسفۂ اخلاق کے کسی ایک معیار پر متفق نہیں ہو سکے۔

رسم و رواج نہ تو دائمی ہوتے ہیں اور نہ سب کے لیے قابلِ قبول۔ نئی نسل پرانی نسل کے رسوم و رواج کو بدل دیتی ہے۔ بعض اوقات ایک ہی قوم کے ایک ہی علاقے کے رسوم و رواج مختلف ہوتے ہیں، اس لیے مومن کو ایک ایسے قابل اعتماد اور محفوظ مصدر و مرکز کی ضرورت تھی جس کے بھٹکنے اور بہکنے کا اندیشہ نہ ہو۔ جو نہ کسی سے متاثر ہو اور نہ کسی پر زیادتی کرے۔[1]

تربیت نبوی میں اخلاق ایک وسیع مفہوم کا حامل لفظ ہے جو انسان کے تمام اعمال و حرکات، جذبات و احساسات اور فکر و نظر کا احاطہ کرتا ہے۔ نماز کے اپنے اخلاق و آداب ہیں کہ حالتِ نماز میں نمازی پر خشیت طاری ہو۔ گفتگو کے اخلاق و آداب یہ ہیں کہ لغو اور بے ہودہ باتوں سے اجتناب کیا جائے۔ جنسی معاملات کے اخلاق و آداب یہ ہیں کہ اللہ کی حدود و قیود کی پاسداری کی جائے۔ باہمی معاملات کے اخلاق و آداب یہ ہیں کہ بخل اور فضول خرچی کا درمیانی راستہ اختیار کیا جائے، معاشرتی زندگی کے اخلاق و آداب یہ ہیں کہ باہمی مشاورت سے معاملات طے کیے جائیں۔ اگر دشمن زیادتی کرے تو اس کے لیے بھی اخلاق و آداب ہیں کہ اس سے بدلہ لیا جائے مگر اس کی طرف سے ہونے والی زیادتی سے بڑھ کر زیادتی نہ کی جائے۔ غرض مسلمان کی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جس میں اسلام اس کی اخلاقی رہنمائی نہ کرتا ہو۔ ہر چیز کے لیے اخلاقی رہنمائی موجود ہے جو ایک مسلمان کو بتاتی ہے کہ یہ کام کس طرح انجام دینا چاہیے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ قرآنی مفہوم میں تمام تر اخلاق خالصتاً ایک اللہ کے لیے ہوں۔ کسی انسان کی خوشنودی مقصود نہ ہو، صرف ایک اللہ کے حکم کی تعمیل اور اس کی رضا کا حصول مطلوب ہو۔ سچائی (لوگوں میں شہرت کے لیے نہیں) صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ عہد کی پاسداری

---

[1] الوسطية في القرآن الكريم للصلابي، ص:592.

(اپنی ساکھ قائم کرنے کے لیے نہیں) صرف ایک اللہ کی خوشنودی کے لیے ہو۔ جنسی تعلقات میں حرام امور سے اجتناب صرف اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل کے لیے ہو۔ دوسروں کی غلطیوں سے درگزر کرنا اور معاف کر دینا احسان جتلانے کے لیے نہ ہو بلکہ اللہ کی رضا مقصود ہو۔ ظالم سے ظلم کا بدلہ (جرأت و بہادری کے اظہار کے لیے نہیں) صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہو۔ اعمال کی اچھے انداز میں انجام دہی دنیوی مفادات کے لیے نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ یہ سب کچھ صرف ایک اللہ کی بندگی کے لیے ہو، اسی کے خوف اور ڈر کی بنیاد پر ہو اور صرف اس کی خوشنودی کے حصول کے لیے ہو۔ یہ کوئی انسانی سودے بازی نہیں جو نفع و نقصان کے لیے کی جاتی ہے بلکہ یہ ایک معاملہ ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی ہونا چاہیے۔[1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ ۖ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا ۖ وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۖ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۖ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۖ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۖ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۖ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○﴾

”کہہ دیجیے: آؤ میں پڑھ کر سناتا ہوں جو کچھ تمھارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور

---

[1] دراسات قرآنیة لمحمد قطب، ص: 139.

> اپنی اولاد کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں بھی اور انھیں بھی رزق دیتے ہیں اور بے حیائی کے کاموں کے قریب نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر ہوں یا چھپے ہوئے ہوں اور کسی ایسی جان کو قتل مت کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہو، سوائے اس کے جس کا قتل برحق ہو، ان ساری باتوں کی اللہ نے تمھیں تاکید کی ہے تاکہ تم عقل سے کام لو اور تم یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو، یہاں تک کہ وہ پختگی کی عمر کو پہنچ جائے اور تم ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا دو، ہم کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر مکلف نہیں ٹھہراتے۔ اور جب تم کوئی بات کہو تو انصاف سے کام لو، اگرچہ (معاملہ تمھارے) قریبی رشتے دار (کا) ہو اور تم اللہ کا عہد پورا کرو۔ ان ساری باتوں کی اللہ نے تمھیں تاکید کی ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو اور یقیناً یہ میرا راستہ سیدھا ہے، لہٰذا تم اسی کی پیروی کرو اور تم دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو، وہ تمھیں اللہ کے راستے سے الگ کر دیں گے۔ اللہ نے تمھیں اس کی تاکید کی ہے تاکہ تم پرہیزگاری اختیار کرو۔“[1]

یہ وہ عمومی میثاقِ اخلاق ہے جس کی پابندی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے لوگوں نے کی تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ سیدھی راہ پر گامزن رہیں۔ یوں اس میثاقِ اخلاق کا عقیدے کے ساتھ گہرا اور بنیادی تعلق ہے جو کسی بھی صورت میں اس سے جدا نہیں ہو سکتا۔

اخلاقی اعمال کا دائرہ نہایت وسیع ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ وحیِ الٰہی نے اسے نہایت اعلیٰ و ارفع مقام عطا کیا ہے کہ اسے دین اور عبادت قرار دیا اور بتایا کہ ان اخلاقی تعلیمات کو اختیار کرنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت زیادہ ثواب ہے اور ان تعلیمات کی مخالفت کی صورت میں المناک عذاب ہے۔[2]

---

[1] الأنعام 6:151-153. [2] الوسطية في القرآن الكريم للصلابي، ص: 594.

جب ہم سورۂ انعام کی مذکورہ آیات کو بنظر غائر دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ آیات پانچ ضروری اصولوں کو اہتمام کے ساتھ بیان کر رہی ہیں جن سے دین و دنیا کی مصلحتیں وابستہ ہیں۔ اگر ان اصولوں کو چھوڑ دیا جائے تو دنیا کے معاملات درست نہ رہیں بلکہ یہ فساد کی طرف بڑھ جائیں، خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو جائے، انسانی زندگی غیر محفوظ ہو جائے، نجات کے راستے مفقود ہو جائیں اور ہر جانب محض خسارہ اور تباہی نظر آئے۔[1]

نبی کریم ﷺ کی دعوت کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ لوگوں کو شریعت کی جانب واپس لایا جائے کیونکہ شریعت ان پانچ ضروری اصولوں کی پاسداری کرتی ہے۔ ان آیات کریمہ میں جو پانچ ضروری اصول بیان کیے گئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

حفاظت دین: یہ اصول اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے مستنبط ہے:

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ﴾

”اور یقیناً یہ میرا راستہ سیدھا ہے، لہٰذا تم اسی کی پیروی کرو اور تم دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو، وہ تمھیں اللہ کے راستے سے الگ کر دیں گے۔“[2]

اسی طرح ارشاد فرمایا: ﴿اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـــًٔا﴾ ”اور یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ۔“

چونکہ شرک کی موجودگی میں دین برقرار نہیں رہ سکتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت کریں اور اس کے بتائے ہوئے سیدھے راستے کی اتباع کریں۔ اس راستے پر چلنے کی صورت میں کسی باطل قوت کا کوئی خوف نہیں ہوگا، نہ سامنے کی جانب سے نہ عقب سے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو شیطان کے راستوں پر چلنے سے منع کیا ہے کیونکہ شیطانی راستے سراسر گمراہی اور سرکشی کے راستے ہیں۔

---

[1] الموافقات للشاطبي: 8/2. [2] الأنعام 6:153.

ان راستوں پر چلنے سے دین حق سے دوری پیدا ہوگی، نیز نفسانی خواہشات اور شیطانی وسوسوں کی اتباع جنم لے گی۔ [1]

نبی کریم ﷺ نے دین کی حفاظت کا اتنا اہتمام کیا کہ اسے عملی زندگی میں اختیار کیا، دین کی خاطر جہاد کیا، دین کی جانب سب لوگوں کو دعوت دی، دین کے مطابق تمام امور اور فیصلے انجام دیے اور ہر دین مخالف قوت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ [2]

حفاظت نفس: ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾

”اور تم اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے، سوائے حق کے۔“ [3]

اسلامی شریعت نے حفاظت نفس کے سلسلے میں ٹھوس اور تحفظ کے ضامن قوانین وضع کیے ہیں۔ [4] ان احکامات میں کسی پر ظلم و زیادتی کو روکنا اور ان ذرائع کا سدباب کرنا شامل ہیں جو کسی کو قتل کرنے پر اکساتے ہوں، مثلاً: قصاص، اسی طرح کسی جان کو قتل کرنے کے لیے کسی واضح ثبوت اور شرعی دلیل کا پایا جانا، جان کی ضمانت، قصاص پر عمل درآمد میں اس غرض سے تاخیر کرنا کہ ہوسکتا ہے ملزم قاتل نہ ہو اور اسے معاف کرنا پڑے اور بحالت مجبوری کسی حرام چیز کی اباحت بھی انھی احکامات کا حصہ ہیں۔ [5]

حفاظت نسل: ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾

”اور بے حیائی کے کاموں کے قریب نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر ہوں یا چھپے ہوئے ہوں۔“ [6]

اور سب سے بڑی بے حیائی زنا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان میں ”فاحشہ“ قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

[1] مقاصد الشريعة للدكتور محمد سعد اليوبي، ص: 188. [2] مقاصد الشريعة للدكتور محمد سعد اليوبي، ص: 194. [3] بني إسرآءيل 33:17. [4] الموافقات للشاطبي: 27/4. [5] مقاصد الشريعة للدكتور محمد سعد اليوبي، ص: 212. [6] الأنعام 151:6.

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝﴾

’’اور تم زنا کے قریب مت جاؤ، یقیناً وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔‘‘ [1]

حفاظت نسل کا قانون زندگی کا اساسی جوہر اور زمین کی آبادکاری کا سبب ہے۔ اسی میں امت اسلامیہ کی طاقت کا راز مضمر ہے اور یہ عزت اور مال کی حفاظت کی ضمانت بھی ہے۔ اس لیے شریعت اسلامیہ نے حفاظت نسل کا قانون لاگو کیا اور ہر اس قانون کی مخالفت کی جو اس کے راستے میں رکاوٹ ہو اور اس سلسلے میں اہم ترین اصول وضوابط مقرر کیے۔ [2]

حفاظت مال: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ص﴾

’’اور تم یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، سوائے اس کے جو احسن طریقہ ہو، حتی کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔‘‘ [3]

اس قانون کی پاسداری کے لیے کسی کا مال غصب یا ضائع کرنے سے شریعت نے منع کیا ہے۔ مدنی دور میں چوری، ڈاکہ زنی اور لوٹ مار پر حد مقرر کرنا، اِتلافِ مال کی ضمانت اور اپنے مال کے دفاع کو جائز ٹھہرانا، قرض کی توثیق اور اس پر گواہ مقرر کرنا اور کسی گری پڑی چیز اور اس سے متعلقہ قوانین بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ [4]

حفاظت عقل: عقل کی حفاظت بھی ضروریات خمسہ کا اہم جز ہے کیونکہ تمام دینی امور کا مکلّف وہی شخص قرار پائے گا جس کی عقل سلامت ہوگی اور فاسد عقل والا کسی ذمہ داری کا اہل نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾ ’’تاکہ تم متقی بن جاؤ۔‘‘ [5]

اس میں اسی جانب اشارہ ہے (کہ عقلمند شخص اپنے فائدے کے لیے اللہ سے ڈرتے

---

[1] بني إسرآء يل 32:17. [2] مقاصد الشريعة للدكتور محمد سعد اليوبي، ص: 257. [3] بني إسرآء يل 34:17. [4] مقاصد الشريعة للدكتور محمد سعد اليوبي، ص: 287. [5] البقرة 183:2.

ہوئے احکاماتِ الٰہی کے مطابق زندگی گزار کر رضائے الٰہی حاصل کرے) واللہ اُعلم۔[1]

بلاشبہ اسلام نے عقل کو خراب کرنے اور اس میں خلل ڈالنے والی ہر چیز کو اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔[2]

قرآن کریم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عقائد، عبادات اور اخلاقیات میں تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ مقاصد شریعت کی طرف بھی رہنمائی کر رہا تھا۔ قرآن میں مذکور اخلاقِ ربانی توحید اور صرف اللہ کی بندگی کا اثبات کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی قرآنی منہج کے اصول و حقائق پر بے حد زور دیا گیا ہے۔ جس سے دین کے بنیادی راستے کا سراغ ملتا ہے۔ مندرجہ بالا تحقیق سے ثابت ہوا:

① صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی تمام احکامات کے صادر ہونے کا مرکز ہے۔ وہ پختہ کار شارع ہے اور اسی نے اخلاقی معیارات و اقدار کو مشروع قرار دیا ہے جو فطرت کے عین مطابق اور عقل سلیم کے موافق ہیں۔

② بلاشبہ عمدہ اخلاق دین کا جزوِ لاینفک ہیں بلکہ ربانی منہج کی اصل ہیں۔ محض انفرادی فضائل، اجتماعی آداب یا شہری قوانین کا نام اخلاق نہیں ہے۔

③ حیات انسانی میں اخلاقیات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جس پر قائم و دائم رہ کر انسان کامیاب زندگی گزار سکتا ہے اور اخلاق ہی انسانی زندگی کو شیاطین کے حملوں سے محفوظ رکھتے اور ذاتی مصلحتوں اور خواہشات کے تابع ہونے سے بچاتے ہیں۔[3]

قرآن کریم بہت سے متنوع آداب کو بیان کرتا ہے جو فضائل کے حصول میں بہترین رہنما ہیں، چنانچہ کتاب الٰہی میں انفرادی اور اجتماعی آداب تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

قرآنِ کریم کی بہت سی جامع آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قابل تعریف اخلاق کو اپنانے اور قابل مذمت عادات سے دور رہنے کے لیے احکامات صادر فرمائے ہیں۔

---

[1] مقاصد الشريعة للدكتور محمد سعد اليوبي، ص: 189. [2] مقاصد الشريعة للدكتور محمد سعد اليوبي، ص: 236. [3] المنهاج القرآني في التشريع لعبد الستار سعيد، ص: 425-433.

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل (38-23:15) میں جو ضابطۂ اخلاق بیان کیا اس میں سب سے پہلے توحید، یعنی صرف اللہ کی عبادت کا تذکرہ فرمایا۔ بعدازاں اس ضابطۂ اخلاق کے تحت اچھے اور برے اخلاق بیان فرمائے کیونکہ صرف اللہ تعالیٰ کو عبادت کے لائق تصور کرنا بھی ایک بنیادی اخلاقی اصول ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار عدل و انصاف اور دلی سچائی سے عبارت ہے اور اس کی وحدانیت کا انکار درحقیقت بد اخلاقی کے گڑھے میں گرنا ہے۔ حق کو قبول کرنے سے انکار، رسولوں کی اتباع سے متکبرانہ پہلوتہی، کبر و غرور، باطل کی سربلندی اور غلبے کے لیے بحث و تکرار، گمراہ کن اور بے بنیاد رسم و رواج کی تقلید اور ان پر جمے رہنا سب ایسے برے اخلاق ہیں جو انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں اور اسے راہ حق سے روکتے ہیں، باوجود اس کے کہ حق واضح ہو چکا ہے۔ اس طرح وہ سعادت دارین سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کا یہ ایقان و ایمان بھی رخصت ہو جاتا ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا طریق ہی وہ راستہ ہے جو انسان کو دنیا و آخرت کی سعادت سے بہرہ ور کرتا ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان آیات میں خاندانی نظام کے مختلف اخلاقی پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ ان میں والدین سے نیک سلوک، ان کا احترام ملحوظ رکھنا اور ان سے احسان اور تاحیات اچھے طریقے سے پیش آنا اور عزیز و اقارب اور کمزور لوگوں سے حسنِ سلوک شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ان آیات میں مالی امور اور اخراجات میں فضول خرچی سے منع کیا گیا ہے، نیز بہت زیادہ بخیلی اور انتہائی فضول خرچی کے درمیان راہِ اعتدال کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فضول خرچی سے نفرت دلانے کے لیے فضول خرچی کرنے والوں کو مخلوق کے سب سے برے بندے شمار کیا ہے۔

﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ وَكَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝﴾

”بے شک فضول خرچ شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا سخت ناشکرا ہے۔“ [1]

---

[1] بنيَ إسرآء يل 27:17.

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حرص اور بخل سے نفرت دلانے کے لیے اس کی مثال بیان فرمائی ہے:

﴿وَلَا تَجۡعَلۡ يَدَكَ مَغۡلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ﴾

''اور اپنا ہاتھ اپنی گردن کے ساتھ بندھا نہ رکھ۔''[1]

ان آیات میں اعلیٰ درجے کے اخلاق حسنہ کا درس دیا گیا ہے کہ اگر انسان کسی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مال خرچ نہیں کرسکتا تو اسے کم از کم اچھی گفتگو تو ضرور کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَإِمَّا تُعۡرِضَنَّ عَنۡهُمُ ٱبۡتِغَآءَ رَحۡمَةٍ مِّن رَّبِّكَ تَرۡجُوهَا فَقُل لَّهُمۡ قَوۡلًا مَّيۡسُورًا ۝﴾

''اور اگر تو اپنے رب کی رحمت تلاش کرنے کے لیے، جس کی تو امید رکھتا ہے، ان (عزیز و اقارب) سے اعراض ہی کرے تو تُو ان سے ایسی بات کہہ جس میں آسانی ہو۔''[2]

یہ ایک ایسی وصیت ہے جس کا لوگوں کے احسان پر مبنی تعلقات میں گہرا اثر نظر آتا ہے اور بعض اوقات تو اس کا اثر ان مادی نوازشات سے بڑھا ہوا نظر آتا ہے جنھیں احسان جتلانے اور اذیت پہنچانے سے آلودہ کر دیا جائے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیات میں اطاعتِ الٰہی سے سرکشی، خود نمائی، قَساوتِ قلبی، سنگدلی اور بے رحمی جیسے برے اخلاق کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے جن کے نتیجے میں قتل جیسا قبیح جرم خاص طور پر چھوٹی بچیوں کا قتل سرزد ہوتا ہے۔ قتل اگرچہ عظیم جرم ہے مگر یہ قوانین قصاص کا حصہ ہے۔ ان آیات میں اس کا ذکر اخلاقی پہلو سے کیا گیا جس کا مقصد قتل جیسے مذموم فعل کے ارتکاب سے روکنا اور درست منہج کی طرف رہنمائی کرنا، خصوصاً بچیوں کو قتل کرنے کے

---

[1] بنيّ إسرآء يل 29:17. [2] بنيّ إسرآء يل 28:17.

نظریے کی اصلاح کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ﴾ ”ہم انھیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمھیں بھی۔“ [1]

ایسے مذموم کام سے روکنے کا مقصد معاشرے میں اس بے روک ٹوک پھیلنے والی برائی کا قلع قمع کرنا ہے جس کا وہ بلا سوچے سمجھے ارتکاب کرتے تھے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی ان آیات میں زنا سے بھی روکا گیا ہے۔ زنا فی نفسہ ایک خطرناک اخلاقی جرم ہے جس میں سرکشی اور عزت و حرمت کی پامالی پائی جاتی ہے، پاکدامنی اور شرف انسانی کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے اور اعلیٰ انسانی اقدار کی توہین کی جاتی ہے۔

علاوہ ازیں ان آیات میں ایسے امور کا حکم یا نہی ہے جن کی بنیاد امانت یا خیانت، جدوجہد یا لہو و لعب اور انتہائی عاجزی یا غرور و تکبر ہے۔ امانت کے سلسلے میں جوانی تک پہنچنے سے پہلے یتیم کے مال کی حفاظت، ایفائے عہد اور ناپ تول میں انصاف کا حکم دیا گیا ہے اور خیانت کے حوالے سے ان احکام کے اضداد، یعنی یتیم کا مال کھانے، عہد شکنی اور کم تولنے کی ممانعت ہے۔ جدوجہد اور محنت و کوشش کے سلسلے میں انسان کو نفع بخش امور میں مشغول رہنے کا درس دیا گیا ہے اور جس چیز کا علم نہ ہو اس سے کنارہ کش رہنے کی تلقین کی گئی ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝﴾

”اور جس بات کا آپ کو علم ہی نہیں اس کے پیچھے نہ لگیں، بے شک کان، آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک کی بابت سوال کیا جائے گا۔“ [2]

جہاں تک بے فائدہ امور کا تعلق ہے تو ہر اس کام سے منع کر دیا گیا جو بے فائدہ اور لاحاصل ہو۔ انتہا درجے کی عاجزی یہ ہے کہ انسان کو اپنی حدود و قیود کا شعور ہو اور اپنی قدر و عزت جاننے اور اسے درست جگہ استعمال کرنے کی بصیرت حاصل ہو۔ اس کے

---

[1] بني إسرآءيل 31:17. [2] بني إسرآءيل 36:17.

مقابلے میں خود نمائی اور غرور و تکبر کی بنیاد جہالت، کم عقلی اور حماقت پر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ۝﴾

”بلاشبہ تُو نہ تو کبھی زمین پھاڑ سکتا ہے اور نہ کبھی لمبائی میں پہاڑوں تک پہنچ سکتا ہے۔“ [1]

ان آیات میں مذکورہ احکامات انسانی زندگی کو سنوارنے والے ہیں۔ ان جامع و مانع احکام کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی وصیت ان الفاظ پر ختم فرمائی:

﴿ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۗ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتُلْقَىٰ فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا مَّدْحُورًا ۝﴾

”یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو آپ کے رب نے آپ کی طرف وحی کی ہیں۔ اور اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ ٹھہراؤ، ورنہ جہنم میں ملامت زدہ، دھتکارے ہوئے ڈالے جاؤ گے۔“ [2]

اللہ تعالیٰ نے ان احکامات کو حکمت قرار دیا اور آغازِ آیات کی طرح ان کا اختتام دعوتِ توحید پر اور شرک سے بچنے پر کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہر بھلائی کی چابی ہے اور ایمان ہر بھلائی کا محافظ ہے، جبکہ کفر ہر برائی کی جڑ اور اس کا سبب ہے۔ [3]

یہ ہے اہل ایمان کی ایک جماعت کی تربیت کرنے کا قرآنی انداز جو اچھے اخلاق اختیار کرنے اور برے اخلاق سے احتراز پر مبنی ہے۔

قرآنی قصص سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عمدہ اخلاقی تربیت

قرآنی قصص مَواعِظ حَسَنہ، حکمت و دانائی، عقائد، اخلاقی رہنمائی، تربیتی اسالیب اور سابقہ امتوں کے واقعات سے نصیحت حاصل کرنے سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ قصص صرف تاریخی واقعات نہیں جو صرف مورخین کو فائدہ دیتے ہیں بلکہ یہ ان سے کہیں اعلیٰ و اَرفع

---

[1] بنی إسرآءیل 37:17. [2] بنی إسرآءیل 39:17. [3] المنهاج القرآني في التشريع لعبد الستار سعيد، ص:433.

ہیں۔ قرآنی واقعات میں توحید، علم، عمدہ اخلاق، عقلی دلائل، بصیرت افروز حقائق، قابل عمل نصائح اور تعجب خیز مباحث پائے جاتے ہیں۔

بطور مثال ہم حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان کرتے ہیں جس میں ہم اس بصیرت افروز واقعے کے اخلاقی پہلوؤں اور اس کے عمدہ مناظر پر روشنی ڈالیں گے۔

علمائے اخلاق اور حکماء کا کہنا ہے کہ امت اسلامیہ کا معاملہ اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک اس امت میں اعلیٰ ترین اصلاح کرنے والے، دین پر قائم رہنے والے اور ایسے رہنما افراد جنم نہ لیں جن میں اچھے اوصاف اور عمدہ اخلاق پائے جائیں۔ اگر یہ ذمہ داری کسی نبی کے سپرد ہو تو اس کے لیے چالیس اوصاف کا تذکرہ ملتا ہے جو تمام تر ایسے آداب و فضائل ہیں جن کی مدد سے پیغمبر امت کی بھلائی کی تدابیر کرتا ہے۔ اور اگر یہ ذمہ داری نبی کے علاوہ کسی صاحب فضیلت سردار پر ہو تو اس کے لیے ان چالیس اوصاف سے کم پر اکتفا کیا جائے گا۔

حضرت یوسف علیہ السلام جو ایک کامل اور صاحب جمال نبی تھے۔ ان کی سیرت کا گہرائی سے مطالعہ کر کے قائدین اور رہنما اہم معاملات کی ذمہ داری موزوں شخصیات کے سپرد کر سکتے ہیں۔

ہم یوسف علیہ السلام کے اعلیٰ منصبِ حکومت کا ذکر کرتے ہوئے ایسے بارہ فضائل کا تذکرہ کریں گے جو ہر اعلیٰ منصب پر فائز شخصیت میں ہونے چاہئیں تاکہ وہ قرآن کا مطالعہ کرنے والے ہر شخص کے لیے نصیحت اور فضائل کے متلاشی کے لیے لمحۂ فکریہ ثابت ہوں۔[1]

حکمران کے اوصاف

شہوتِ نفسانی سے بچنا: حکمران نفسانی خواہشات سے بچے تاکہ وہ اپنے نفس پر قابو رکھ سکے اور اس کی روحانی طاقت میں اضافہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] تفسیر القاسمي: 310/9.

﴿كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ○﴾

''اسی طرح (ہوا) تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو پھیر دیں، بے شک وہ ہمارے خالص کیے ہوئے بندوں میں سے تھا۔''[1]

بردباری: غیظ وغضب کے وقت بردباری سے ضبط نفس پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ○﴾

''انھوں (برادرانِ یوسف) نے کہا: اگر اس نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اس کے ایک بھائی نے بھی چوری کی تھی، چنانچہ یوسف نے یہ (بات) اپنے دل میں چھپائی اور ان پر ظاہر نہ کی (اور دل میں) کہا: تم بدترین درجے پر ہو اور اللہ خوب جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو۔''[2]

نرمی اور سختی کا درست استعمال: نرمی اور سختی کو اپنے اپنے مقام پر استعمال کرنے کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا:

﴿وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ○﴾

''اور جب اس نے ان کا سامان تیار کروایا تو کہا: میرے پاس اپنا پدری بھائی (بنیامین) لانا، کیا تم دیکھتے نہیں کہ میں پورا ماپ (غلہ) دیتا ہوں اور میں بہترین مہمان نواز ہوں، پھر اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے تو تمھارے لیے میرے پاس کوئی ماپ (غلہ) نہیں اور نہ تم میرے قریب آنا۔''[3]

اپنے رب پر بھروسا کرتے ہوئے خود اعتمادی کا حصول: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1] یوسف 24:12۔ [2] یوسف 77:12۔ [3] یوسف 60,59:12۔

﴿قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ○﴾

”(یوسف علیہ السلام نے) کہا: مجھے زمین کے خزانوں (پیداوار) پر مقرر کر دیجیے، بے شک میں خوب نگہبانی کرنے والا خوب جاننے والا ہوں۔“ [1]

قوت حافظہ: مضبوط یادداشت اس لیے ضروری ہے کہ انسان ان باتوں کو یاد رکھ سکے جنھیں مدت گزر چکی ہو، نیز لوگوں کی سرگرمیوں کو جان سکے اور ان کے مقابلے میں درست تدبیر کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ○﴾

”اور یوسف (علیہ السلام) کے بھائی (غلہ لینے) آئے اور اس کے پاس پہنچے تو اس نے انھیں پہچان لیا اور وہ اسے نہیں پہچانتے تھے۔“ [2]

خیالات اور تصورات کی عمدگی: یہ اس لیے کہ تمام اشیاء کا تصور وضاحت سے ممکن ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ○﴾

”جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا: اے میرے ابا جان! بے شک میں نے (خواب میں) دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے، سورج اور چاند میں نے انھیں دیکھا کہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔“ [3]

استعداد، علم سے محبت اور اس میں پختگی: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۚ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ○﴾

---

[1] یوسف 55:12. [2] یوسف 58:12. [3] یوسف 4:12.

”اور میں نے اتباع کی ہے اپنے باپ دادا، ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کے دین کی۔ ہمارے لیے (جائز) نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں، یہ اللہ کا ہم پر اور (سب) لوگوں پر فضل ہے، لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔“ [1]

مزید ارشاد فرمایا:

﴿رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۫ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۝﴾

”اے میرے رب! تو نے مجھے کچھ حکومت دی ہے اور مجھے باتوں (خوابوں) کی تعبیر سکھائی ہے، اے آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے تو مجھے اسلام پر موت دے اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔“ [2]

شفقت، عجز اور انکسار: حضرت یوسف علیہ السلام نے دو قیدی نوجوانوں سے عاجزانہ گفتگو فرمائی اور کہا:

﴿یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝﴾

”میرے قید کے دو ساتھیو! بھلا کئی جدا جدا معبود بہتر ہیں یا ایک زبردست اللہ؟“ [3]

عفو و درگزر: ارشاد ہے:

﴿قَالَ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ ؕ یَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ۝﴾

”یوسف نے کہا: تم پر آج کوئی ملامت نہیں، اللہ تمھاری مغفرت کرے اور وہ ارحم الراحمین ہے۔“ [4]

اپنے قبیلے کا اکرام کرنا: ارشاد ربانی ہے:

﴿اِذْهَبُوْا بِقَمِیْصِیْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰی وَجْهِ اَبِیْ یَاْتِ بَصِیْرًا ۚ وَ اْتُوْنِیْ بِاَهْلِكُمْ

---

[1] یوسف 12:38. [2] یوسف 12:101. [3] یوسف 12:39. [4] یوسف 12:92.

﴿اَجْمَعِيْنَ ۝﴾

"تم میری یہ قمیص لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، وہ بینا ہو جائیں گے اور تم اپنے تمام اہل وعیال کو میرے پاس لے آؤ۔"[1]

قوت گویائی اور فصاحت: حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے خواب کی عمدگی سے تعبیر کی اور بادشاہ، رعایا اور عوام کے دلوں کو اپنی طرف مائل کیا اور یہ سب کچھ حکمت وعلم سے بھرپور پالیسی سے ممکن ہوا۔

﴿فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ۝﴾

"پھر جب اس نے یوسف سے گفتگو کی تو کہا: یقیناً آج تو ہمارے ہاں مرتبے والا، امین ہے۔"[2]

حسن تدبیر: ارشاد رب العالمین ہے:

﴿قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝﴾

"اس (یوسف علیہ السلام) نے کہا: تم سات سال لگاتار کاشت کرو گے، چنانچہ تم جو (فصل) کاٹو تو وہ اس کی بالیوں ہی میں رہنے دو، سوائے تھوڑی (مقدار) کے جو تم کھاؤ۔"[3]

اللہ کی قسم! قرآن کتنا خوبصورت اور یہ علم کتنا شاندار ہے۔ بلاشبہ قرآنی قصص اور اخلاق کے مابین گہرا تعلق پایا جاتا ہے کیونکہ قرآن میں قصے بیان کرنے کا مقصد ایسے عمدہ اخلاق کی دعوت دینا ہے جو فرد، معاشرہ، جماعت، مملکت، امت اور تہذیب وتمدن کے لیے یکساں مفید ہیں۔ قرآنی قصص جس طرح عمدہ اخلاق کی دعوت دیتے ہیں اسی طرح مذموم اخلاق سے بچنے کی ترغیب بھی دیتے ہیں جن کے باعث بہت سی امتیں اور قبائل تباہی کا شکار ہوئے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی علیہ السلام کی طرف سے کی جانے والی تربیت اور اس منہج سے بھرپور استفادہ کیا جس پر نبی علیہ السلام خود کاربند تھے۔

---

[1] یوسف 93:12۔ [2] یوسف 54:12۔ [3] یوسف 47:12۔

یہ قرآن سے ماخوذ نبوی اخلاق کی چند مثالیں ہیں جو موضوع کا مکمل احاطہ نہیں کرتیں۔ نبی ﷺ کی سیرت اور سنت میں اس کی مزید وضاحت اور تفصیل سامنے آتی ہے۔

اخلاقیات کے بارے میں ربانی منہج جسے ہم نبوی اور قرآنی منہج بھی کہتے ہیں، ایک ایسا عمدہ اور یکتا طریقہ ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی کیونکہ یہ تو خالص رب العالمین کی طرف سے ہے اور منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ جب یہ خصوصیات مذکورہ منہج پر ایک جگہ جمع ہو جائیں تو ان میں قوت و کمال کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان خصوصیات میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

① منہج ربانی کتاب و سنت کی شکل میں ایک قابل قدر اخلاقی مرجع ہے جس میں ہر قابل تعریف اور قابل مذمت چیز کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

② منہج ربانی سے انسانی سلوک کی راہ متعین ہوتی ہے اور یہ علم کے حصول کا سبب بنتا ہے۔ چنانچہ اس سے اللہ کے دیدار اور اخروی کامیابی کی امید بندھتی ہے۔

③ منہج ربانی عملی نمونہ اور اخلاقی تربیت کی بنیاد ہے۔ اور یہ عمدہ اخلاق تمام تر خوبیوں کے ساتھ اللہ کے رسول کی ذات میں نظر آتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝﴾

"اور یقیناً آپ خُلقِ عظیم پر (کاربند) ہیں۔"[1]

اعلیٰ ترین نبوی منہاج جو کتاب اللہ پر مبنی ہے، اس نے اخلاق کو بڑی اہمیت دی اور مختلف طریقوں سے اس کے تمام تر فضائل حاصل کرنے کی ترغیب دی اور برے اخلاق اپنانے سے روکا ہے۔

قرآن کریم کا اخلاقی پیکج کائنات، زندگی اور انسان کو سامنے رکھتے ہوئے ترتیب دیا گیا ہے۔ عقائد کو اسلامی محل کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اور شرعی احکامات کو اس محل کے کمروں، راہداریوں اور دروازوں کی حیثیت دی گئی ہے اور اخلاق کو اس کامل محل کی رونق،

---

[1] القلم68:4. الوسطية في القرآن الكريم للصلّابي، ص:603.

خوبصورتی اور تروتازگی کا درجہ حاصل ہے جو اسے ربانی رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ اسی طرح اسلامی عقائد ایک پھیلے ہوئے اسلامی درخت کی جڑوں اور تنے کی حیثیت رکھتے ہیں تو شرعی احکامات اس کی ٹہنیاں اور شاخیں ہیں اور عمدہ اخلاق اس درخت کے پکے ہوئے پھل، اس کے لمبے کشادہ سائے اور اس کے عمدہ اور تروتازہ منظر کی عکاسی کرتا ہے۔ [1]

نبوی منہاج میں اثر پذیری، قبولیت اور صحابہ کی تربیت میں پابندی اور ذمہ داری کے اسالیب اختیار کیے گئے تاکہ مخلوق کو نظریات کے دائرے سے نکال کر ٹھوس نافذ العمل شکل کی طرف لایا جائے اور وہ عملی زندگی میں انھیں بروئے کار لا سکیں، چاہے یہ نظریات اعتقادی ہوں جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات کی جستجو اور آخرت کی امید اور چاہے ان کا تعلق عبادت سے ہو، جیسے وہ شعائر جن کا دارومدار نفوس کی تربیت، ارادوں کی پختگی اور تزکیہ نفس پر ہو۔ اور جب اسلامی دعوت ترقی پذیر ہوئی اور ایک اسلامی ریاست معرض وجود میں آ گئی تو اہل ایمان پر چند خارجی ذمہ داریاں نافذ ہوتی چلی گئیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

قانون سازی: اس کا مقصد اخلاقی اقدار کی حفاظت کرنا تھا، چنانچہ حدود اور قصاص کا نظام پیش کیا گیا جو فرد اور معاشرے کو قتل اور چوری جیسے جرائم اور دوسروں کی عزتیں پامال کرنے والے زنا اور قذف جیسے گناہوں کے ارتکاب اور شراب اور دیگر منشیات استعمال کرنے سے روکتا ہے جو اس کی عقل کو سلب کر لیتی ہیں۔

معاشرتی استحکام: اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب کردہ امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور اہل ایمان کی باہمی خیر خواہی اور باہمی ذمہ داری پر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس ذمہ داری کو زکاۃ، نماز اور اللہ و رسول کی اطاعت کے ساتھ نہ صرف بیان فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس فریضے کو اس امت کا بنیادی ڈھانچا قرار دیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] المنهاج القرآني في التشريع لعبد الستار سعيد، ص:425.

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ط وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ط مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُونَ ○﴾

”تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہت بہتر ہوتا۔ ان میں بعض ایمان والے بھی ہیں مگر ان کے اکثر نافرمان ہیں۔“[1]

یہ معاشرتی استحکام اور اس کا اثر مدنی دور میں ظاہر ہوا۔

ریاستی اقدار: ریاست میں رہتے ہوئے اعلیٰ اقدار کا قیام واجب قرار پایا۔ اس کی بنیاد مضبوط اخلاقی اساس پر ہے اور ریاست پر لازم آتا ہے کہ ان اخلاقی اقدار کی حفاظت کرے، انھیں تمام افراد اور معاشرے پر لاگو کرے اور اسے اپنے وجود کی بقا کے لیے سب سے زیادہ اہمیت دے۔[2]

اس طرح اسلامی اخلاق میں تمام کمالات جمع ہو گئے اور ربانی منہج پر قائم رہنے کے باعث یہ با اخلاق معاشرہ ایک مثالی عملی نظام کی صورت اختیار کر گیا۔

یہ مکی دور میں پائے جانے والے نظریاتی، روحانی اور اخلاقی کردار کے چند خدوخال تھے۔ بلاشبہ یہ تربیت بہت ثمر آور ثابت ہوئی۔

قبول اسلام میں سبقت لے جانے والے پچاس صحابۂ کرام میں بیس سے زائد ایسے تھے جنھوں نے نبی ﷺ کی زندگی اور وفات کے بعد دعوت اسلامی کی توسیع اور اسے عام کرنے کے لیے اس کی قیادت فرمائی اور امت اسلامیہ کے رہنما کہلائے۔ علاوہ ازیں بیس دیگر افراد کی اکثریت نبی علیہ السلام کی حیات مبارکہ ہی میں رتبۂ شہادت سے سرفراز ہو گئی۔

---

[1] آل عمرٰن 3:110. [2] المنهاج القرآني في التشريع لعبد الستار سعيد، ص:433.

امت کے اس ابتدائی قافلے میں بڑی عظیم شخصیات تھیں اور انھی میں سے وہ صحابہ بھی تھے جو عشرہ مُبشرہ کہلائے۔ وہ نبی علیہ السلام کے بعد امت کے افضل ترین افراد تھے اور ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے بڑی بڑی قربانیاں دے کر عظیم الشان اسلامی تہذیب کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کیا۔ ان میں عمار بن یاسر، عبداللہ بن مسعود، ابوذر اور جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہم سرِفہرست ہیں۔

اس ہراول دستے میں بہت سی عورتیں بھی شامل تھیں۔ امت کی عورتوں میں عظیم ترین ہستی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور اسی طرح ام الفضل بنت الحارث ہیں۔ حضرت اسماء ذات النِّطاقَین اور اسماء بنت عُمَیس ان فضیلت والی عورتوں میں سرفہرست تھیں۔

امت اسلامیہ کے اس ہراول دستے کو نظریاتی، روحانی اور اخلاقی تربیت کے اعلیٰ مواقع میسر آئے اور یہ تربیت بلا واسطہ سید البشر مُربِّی اعظم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے ہوئی۔ یہ لوگ قافلے کے حُدی خواں اور امت کے رہنما قرار پائے۔[1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت وتزکیہ کے ساتھ ساتھ انھیں جاہلی گندے اخلاق سے بھی پاک فرماتے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر ایک نگاہ ڈال کر خوش بخت قرار پاتا ہے تو اس آدمی کی سعادت کا درجہ تو بہت بلند ہوگا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرو سفر کا ساتھی ہو، آپ سے احادیث مبارکہ سنتا ہو، آپ کے نور ہدایت سے منور ہوتا ہو، آپ کے کلام سے مستفید اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کے سامنے تربیت پاتا ہو۔[2]

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان:201/1. [2] التربية القيادية:203,202/1.

حصہ 5

علانیہ دعوت اور مشرکین کی چالیں

باب : 1 علانیہ دعوت

باب : 2 قانون ابتلا

باب : 3 اسلامی دعوت کے خلاف مشرکین کی محاذ آرائی

باب : 4 اقتصادی و معاشرتی بائیکاٹ (شعب ابی طالب)

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ
بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۖ
وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۚ
وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ

"اے رسول
پہنچا دیجیے جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے
اور اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو آپ نے حق پیغمبری ادا نہیں کیا
اور اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔"

(المائدۃ 67:5)

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ

باب 1

علانیہ دعوت

نبی ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت فرمائی اور عقائد، عبادات اور اعلیٰ اخلاق کی بنیاد پر اسلامی جماعت قائم کی۔ اس عظیم جماعت کی تیاری کے بعد علانیہ دعوت کا وقت قریب آن پہنچا تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

”اور آپ اپنے قریبی رشتے داروں کو ڈرائیں اور جو مومنوں میں سے آپ کی اتباع کریں، ان کے لیے اپنے (مشفقانہ) بازو جھکائے رکھیں، پھر اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں تو کہہ دیجیے: بلاشبہ تم جو کچھ کر رہے ہو، میں اس سے بری ہوں۔“ ①

ان آیات کے نزول کے بعد نبی ﷺ نے اپنے قبیلے اور قرابت داروں کو ایک جگہ جمع کیا اور انھیں ایک معبود پر ایمان لانے کی علانیہ دعوت دی اور نافرمانی کی صورت میں سخت عذاب سے ڈرایا، انھیں اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی تلقین کی اور ہر انسان کو اس کی ذمہ داری سے آگاہ کیا۔ ②

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، جب آیت: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ نازل ہوئی تو نبی ﷺ صفا پہاڑی پر تشریف لے گئے اور بلند آواز سے پکارنے لگے: «يَابَنِي فِهْرٍ! يَا بَنِي عَدِيٍّ!» ”اے بنی فہر! اے بنی عدی!“ اور قریش کے دیگر قبائل کا

---

① الشعرآء 26:214-216. ② رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 3/46.

نام لیا، یہاں تک کہ سب جمع ہو گئے۔ اگر کوئی آدمی مصروفیت کی بنا پر نہ پہنچ پایا تو اس نے اپنا سفیر بھیج دیا تاکہ حقیقت حال دریافت کر سکے۔ غرض قریش آ گئے۔ ابولہب بھی آ گیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: «أَرَأَيْتَكُمْ لَوْ أَخْبَرْتُكُمْ أَنَّ خَيْلًا بِالْوَادِي تُرِيدُ أَنْ تُغِيرَ عَلَيْكُمْ أَكُنْتُمْ مُّصَدِّقِيَّ؟» ”ذرا بتاؤ تو اگر میں تمھیں یہ خبر دوں کہ ادھر وادی میں شہسواروں کا ایک لشکر ہے جو تم پر دھاوا بولنا چاہتا ہے تو کیا تم مجھے سچا مانو گے؟“ لوگوں نے کہا: ”ہاں! ہم نے آپ میں سچ کے سوا کچھ نہیں پایا۔“ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«فَإِنِّي نَذِيرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ»

”اچھا تو میں تمھیں ایک سخت عذاب سے پہلے خبردار کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔“

اس پر ابولہب نے کہا: ”تجھ پر سارے دن تباہی نازل ہو، تو نے ہمیں اس لیے جمع کیا تھا۔“ (معاذ اللہ!) اللہ تعالیٰ نے سورۂ لہب نازل فرمائی:

﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝﴾.....

”ٹوٹ جائیں دونوں ہاتھ ابولہب کے اور وہ ہلاک ہو گیا، نہ اس کے مال نے اسے کوئی فائدہ دیا اور نہ اس کی کمائی نے......۔“[1]

ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے قریش کے ہر قبیلے کا نام لے کر آواز دی تھی اور ہر ایک سے فرمایا: «أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِّنَ النَّارِ» ”اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ“ پھر فرمایا: «يَا فَاطِمَةُ! أَنْقِذِي نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ فَإِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا، غَيْرَ أَنَّ لَكُمْ رَحِمًا سَأَبُلُّهَا بِبِلَالِهَا» ”اے فاطمہ! اپنے آپ کو جہنم سے بچا کیونکہ میں تم لوگوں کو اللہ کی گرفت سے بچانے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا، البتہ تم لوگوں سے نسب و قرابت کے تعلقات ہیں جنھیں میں باقی اور تازہ رکھنے کی کوشش کروں گا۔“[2]

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 4770، وصحیح مسلم، حدیث: 208. [2] صحیح مسلم، حدیث: 204.

تمام قریشی حقیقت پسند اور عملی تھے۔ جب انھوں نے نبی ﷺ کی شخصیت کی طرف دیکھا تو انھیں اس شخصیت کے روپ میں ایک سچا اور امانتدار انسان نظر آیا جو ان کے سامنے ایک پہاڑ پر کھڑا تھا اور نبی ﷺ اس وقت پہاڑ کے دونوں طرف دیکھ رہے تھے جبکہ قریش صرف اپنے سامنے دیکھ سکتے تھے۔ ان کی ذہانت اور انصاف نے یہی فیصلہ کیا کہ آپ کی بات کی تصدیق کی جائے۔ تب انھوں نے بیک آواز ہوکر ''ہاں'' کہا۔

اور جب یہ ابتدائی نفسیاتی مرحلہ مکمل ہوگیا اور تمام حاضرین کی شہادت مکمل ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«فَإِنِّي نَذِيرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ»

''میں تمھیں ایک سخت عذاب سے پہلے خبردار کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔''

یہی وہ الفاظ تھے جو مقام نبوت کے لائق تھے اور نبی ﷺ کے پاس جو غیبی امور اور وہبی حقائق کا علم تھا اس کے شایانِ شان اس وعظ میں دانائی و بلاغت کے ساتھ لوگوں کو جہنم کی آگ سے ڈرایا گیا تھا، یہ ایک ایسا انداز تھا جس کی سابقہ ادیان اور نبوتوں میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس سے زیادہ براہ راست اور اس سے زیادہ واضح اسلوب کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا، لہٰذا تمام حاضرین آپ ﷺ کی بات سن کر خاموش ہوگئے۔[1] صرف ابولہب نے جواباً سخت الفاظ کہے۔

نبی ﷺ نے امت کے لیے ذرائع ابلاغ (میڈیا) کے اصول مقرر فرما دیے۔ آپ ﷺ نے پہاڑ جیسے بلند مقام کو کھڑے ہونے کے لیے منتخب فرمایا اور تمام لوگوں کو آواز دی اور آپ کی آواز ہر خاص و عام تک پہنچی۔ آج کل پیغام رسانی کے جدید ادارے بھی اسی اسلوب پر عمل کرتے ہیں تاکہ خبر زیادہ دور تک پہنچائی جا سکے۔

پھر نبی ﷺ نے اپنی مضبوط دعوت کے لیے مضبوط اساس، یعنی سچائی کا انتخاب کیا تاکہ

---

[1] السيرة النبوية لأبي الحسن الندوي، ص: 138.

اس بنیاد پر اپنا مدعا پیش کر سکیں۔ اس طرز عمل سے دعوت و پیغام رسانی سے منسلک افراد کو جان لینا چاہیے کہ لوگوں تک اطلاعات اور دعوت پہنچانے کی بنیاد پیغام بھیجنے اور وصول کرنے والے یا پیغام نشر ہونے کی جگہ اور اسے قبول کرنے والے کے درمیان باہمی اعتماد پر ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ گفتگو سچی ہو اس میں کسی قسم کا جھوٹ شامل نہ ہو۔[1]

یہ فطری بات تھی کہ نبی ﷺ نے اپنی علانیہ دعوت کی ابتدا اپنے قرابت داروں سے کی کیونکہ مکہ کی سرزمین قبائلی فضا کی حامل تھی، لہٰذا نبی ﷺ نے پہلے اپنے قرابت داروں کو دعوت پیش کی جو آپ کی نصرت و تائید اور حمایت میں معاون ہو سکتے تھے۔

اسی طرح مکہ کی سرزمین سے دعوت کی ابتدا اپنے اندر خاص اثرات لیے ہوئے تھی کیونکہ زمانۂ قدیم ہی سے یہ شہر دینی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل تھا، لہٰذا اہل مکہ کا دائرۂ اسلام میں داخل ہونا دیگر قبائل پر گہرا اثر چھوڑ سکتا تھا۔

قرآن کریم کے سیاق سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے اپنی بلند پایہ دعوت کے سلسلے میں قریش سے آغاز کیا۔[2]

مکی دور میں نازل ہونے والی آیات دعوت اسلامی کے عالمگیر ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ○﴾

”وہ ذات بڑی ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان (قرآن) نازل کیا تاکہ وہ جہان والوں کے لیے ڈرانے والا بنے۔“[3]

اللہ تعالیٰ نے مزید ارشاد فرمایا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○﴾

---

[1] الحرب النفسية ضد الإسلام للدكتور عبد الوهاب كحيل، ص:121.

[2] دراسة في السيرة لعماد الدين خليل، ص:66.

[3] الفرقان 1:25.

”اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔“ [1]

خفیہ دعوت کے بعد تبلیغ رسالت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا جس میں نبی ﷺ ہر قبیلے اور ہر شہر کے سردار کو دعوت پیش کرتے اور لوگوں کی محافل، مجالس اور مجمعوں میں تشریف لے جاتے۔ خصوصی تہوار اور موسم حج میں لوگوں کے سامنے دعوت پیش کرتے اور ہر ملنے والے غلام، آزاد، کمزور، طاقتور اور امیر و غریب کو راہ حق دکھاتے۔ [2] اور یہ مرحلہ ان آیات کے نازل ہونے کے بعد شروع ہوا: ﴿فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ۝﴾

”چنانچہ آپ کو جو حکم دیا جاتا ہے کھول کر سنا دیں اور مشرکین سے بے رخی برتیں۔“ [3]

اس علانیہ تبلیغ ہی کا نتیجہ تھا کہ نبی ﷺ کو تبلیغ دین کی راہ میں رکاوٹوں، لوگوں کی بے رخی، ٹھٹھا، مذاق، ایذا رسانی، تکذیب اور سوچی سمجھی مخالفانہ سازشوں کا سامنا کرنا پڑا اور آہستہ آہستہ نبی ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور بت پرست سرداروں کے درمیان معرکہ آرائی کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا اور لوگ مکہ سے اس محاذ آرائی کی خبروں کو جگہ جگہ پہنچانے لگے۔ اگرچہ بظاہر یہ محاذ آرائی تبلیغ رسالت کے خلاف تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ دعوت اسلامی پھیلنے کا ذریعہ بھی بن گئی، چنانچہ دنیا کے طول و عرض میں اس دعوت کو پہنچانے میں اس کے دشمنوں نے بھی حصہ ڈالا کیونکہ جب مخالف قبائل میں اس دعوت کی شدید مخالفت اور مذمت کی جاتی تو لوگ کفر و شرک کے ان سرداروں کی بات کو تسلیم نہ کرتے اور دعوت دین کی طرف کھنچے چلے آتے۔

ان دنوں ابلاغ کا واحد ذریعہ براہ راست ایک دوسرے تک خبریں پہنچانا تھا تو اس طرح قریب اور دور رہنے والوں نے نبی ﷺ کی رسالت کی خبر سن لی۔ آپ ﷺ کے اعلانِ رسالت کا واقعہ اتنا زبان زد عام ہوا کہ یہ محافل و مجالس حتی کہ نجی گفتگو کا موضوع بنتا چلا گیا۔ [4]

---

[1] الأنبياء 107:21. [2] رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 49,48/3. [3] الحجر 94:15. [4] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 167.

مشرکین کے اہم اعتراضات

مشرک سرداروں کے اکثر اعتراضات اللہ کی وحدانیت، آخرت پر ایمان، نبی علیہ السلام کی رسالت اور قرآن کریم کے بارے میں تھے۔ مشرکین کے اعتراضات اور ان کا جواب درج ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک: کفار اس بات کے منکر نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اور ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَىِٕنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝﴾

”اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے۔ تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے! آپ کہہ دیجیے: سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے۔“[1]

درحقیقت وہ لوگ بتوں کے پجاری تھے اور ان کا گمان تھا کہ یہ بت انھیں اللہ کے قریب کرنے کا وسیلہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيۡنُ الۡخَالِصُ ؕ وَالَّذِيۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى﴾

”سنو! خالص اطاعت و بندگی اللہ ہی کے لیے ہے اور جن لوگوں نے اس کے سوا کارساز بنا رکھے ہیں، (وہ کہتے ہیں:) ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے زیادہ قریب کر دیں۔“[2]

بت پرستی ان کی طرف ان کی ہمسایہ اقوام کی طرف سے منتقل ہوئی تھی، اس لیے انھوں نے توحید کا شدت سے انکار کیا اور اسے انتہائی عجیب خیال کیا۔[3] اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] لقمٰن 25:31. [2] الزمر 3:39. [3] رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 52/3.

﴿وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۫ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ○ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ○ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ○ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ○﴾

”اور انھوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ ان کے پاس انھی میں سے ایک ڈرانے والا آ گیا اور کافروں نے کہا: یہ تو ایک جادوگر ہے بڑا جھوٹا، کیا اس نے سارے معبودوں کو ایک کر دیا؟ بے شک یہ تو یقیناً ایک بڑی عجیب وغریب چیز ہے اور ان کے سردار (آوازِ حق سن کر یہ کہتے ہوئے) چل دیے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو، بے شک یہ چیز ہے جو کسی غرض سے (کہی جا رہی) ہے، ہم نے یہ بات کسی اور دین میں نہیں سنی، یہ تو بس گھڑی ہوئی بات ہے۔“[1]

مشرکین کا اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی مخلوق سے تعلق کے بارے میں عقیدہ درست نہیں تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ نعوذ باللہ جنات میں سے اللہ تعالیٰ کی بیوی ہے اور اس سے فرشتے پیدا ہوئے ہیں، لہٰذا یہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اس سلسلے میں مسلسل آیات نازل ہوتی رہیں جس میں واضح کیا گیا کہ اللہ عزوجل نے جنوں اور فرشتوں کو پیدا فرمایا ہے جس طرح انسانوں کو پیدا فرمایا ہے، نہ کوئی اس کی اولاد ہے اور نہ ہی اس کی بیوی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○﴾

”اور لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا، حالانکہ اسی نے تو انھیں پیدا کیا ہے اور انھوں نے بغیر کسی علم کے اللہ کے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیں، وہ پاک ہے اور ان

---

[1] صٓ 38:4-7.

باتوں سے بلند ہے جو وہ بیان کرتے ہیں، وہی آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اس کی اولاد کیسے ہوسکتی ہے جبکہ اس کی کوئی بیوی نہیں؟ اور اسی نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہی ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔“ [1]

قرآنی آیات میں یہ بھی بیان کیا گیا کہ جنات تو اللہ تعالیٰ کی عبودیت کا اقرار کرنے والے ہیں اور وہ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ ان کے اور اللہ کے درمیان کوئی نسبی رشتہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ○﴾

”اور انھوں نے اس (اللہ) کے اور جنوں کے درمیان رشتہ ٹھہرایا، حالانکہ بلاشبہ خود جنّوں نے جان لیا کہ وہ (اللہ کے سامنے) ضرور حاضر کیے جائیں گے۔“ [2]

نیز آیات قرآنی میں مشرکین سے حق کی اتباع کا مطالبہ کیا گیا ہے اور انھیں ہر قسم کے وہم وگمان سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى○ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا○﴾

”بلاشبہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کے نام عورتوں کے سے رکھتے ہیں، حالانکہ انھیں اس کا کوئی علم نہیں، وہ تو بس گمان کی پیروی کرتے ہیں اور بلاشبہ گمان حق کے مقابلے میں کچھ بھی فائدہ نہیں دیتا۔“ [3]

قرآنی آیات میں یہ وضاحت بھی ہے کہ یہ کتنی غیر معقول بات ہے کہ اللہ اپنے لیے بیٹیاں پسند کرے اور انھیں بیٹے عطا فرمائے کیونکہ ان کی رائے کے مطابق بیٹیاں کم درجے کی حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

[1] الأنعام 6:100, 101. [2] الصّٰفّٰت 37:158. [3] النجم 53:27, 28.

﴿ أَفَأَصْفَٰكُمْ رَبُّكُم بِٱلْبَنِينَ وَٱتَّخَذَ مِنَ ٱلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنَٰثًا ۚ إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا عَظِيمًا ۝ ﴾

”کیا پھر تمھارے رب نے تمھیں بیٹوں کے لیے چن لیا اور (اپنے لیے) فرشتوں میں سے بیٹیاں بنالیں؟ بلاشبہ تم بہت بڑی (نازیبا اور خطرناک) بات کہتے ہو۔“ [1]

اور یہ آیات مشرکین کو ان کے قول بلا دلیل کا احساس دلاتی ہیں:

﴿ وَجَعَلُوا ٱلْمَلَٰٓئِكَةَ ٱلَّذِينَ هُمْ عِبَٰدُ ٱلرَّحْمَٰنِ إِنَٰثًا ۚ أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ ۚ سَتُكْتَبُ شَهَٰدَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُونَ ۝ ﴾

”اور انھوں نے فرشتوں کو، جو رحمٰن کے بندے ہیں، (رحمٰن کی) بیٹیاں ٹھہرایا ہے۔ کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے؟ ان کی شہادت ضرور لکھی جائے گی اور ان سے (اس چیز کی) پوچھ گچھ ہوگی۔“ [2]

مشرکین کا آخرت سے انکار: رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایمان بالآخرت کی دعوت کا مشرکین نے تمسخر اور تکذیب سے جواب دیا:

﴿ وَقَالَ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۝ أَفْتَرَىٰ عَلَى ٱللَّهِ كَذِبًا أَم بِهِۦ جِنَّةٌۢ ۗ بَلِ ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِٱلْءَاخِرَةِ فِي ٱلْعَذَابِ وَٱلضَّلَٰلِ ٱلْبَعِيدِ ۝ ﴾

”اور کافروں نے کہا: کیا ہم تمھیں ایک ایسا شخص بتائیں جو تمھیں یہ خبر دیتا ہے کہ جب تم بالکل ہی پارہ پارہ کر دیے جاؤ گے تو بے شک تم البتہ ازسرنو پیدا کیے جاؤ گے؟ کیا اس نے اللہ پر جھوٹ گھڑا ہے یا اسے جنون (لاحق) ہے؟ (قطعاً نہیں!) بلکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (وہ) عذاب اور دور کی گمراہی میں پڑے ہیں۔“ [3]

---

[1] بني إسرآءيل 17:40. [2] الزخرف 43:19. [3] سبا 34:7، 8.

مشرکین مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے منکر تھے:

﴿وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ○﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ زندگی تو بس ہماری دنیا ہی کی زندگی ہے اور ہمیں (دوبارہ) نہیں اٹھایا جائے گا۔''[1]

اور وہ اپنے اس نظریے پر مضبوط قسموں کا سہارا بھی لیتے تھے:

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ۭ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○﴾

''اور وہ اللہ کی پختہ قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ اسے دوبارہ نہیں اٹھائے گا۔ کیوں نہیں! (بلکہ وہ اٹھائے گا) یہ اس کے ذمے سچا وعدہ ہے اور لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔''[2]

مشرکین اس دنیا کی زندگی کے علاوہ کسی دوسری زندگی کے قائل نہ تھے اور آخرت پر ایمان لانے کے لیے اپنے آباء واجداد کو دوبارہ زندہ کرنے کی شرط رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ○ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○﴾

''اور انھوں نے کہا: بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، ہم مرتے اور زندہ ہوتے ہیں اور ہمیں بس زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے۔ اور انھیں اس کا کوئی علم نہیں، وہ تو بس گمان کرتے ہیں اور جب ان پر ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں جو واضح ہوتی ہیں تو ان کی دلیل بس یہی ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں: اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ

---

[1] الأنعام 29:6. [2] النحل 38:16.

دادوں کو لاؤ۔‘‘ [1]

ان مشرکین کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ جس نے انھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہ انھیں دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ امام مجاہد اور دیگر ائمۂ تفسیر سے منقول ہے کہ ابی بن خلف اپنے ہاتھ میں بوسیدہ ہڈی لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ وہ ہڈی کو ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں اڑا رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا: ’’اے محمد! (ﷺ) کیا تیرا گمان ہے کہ اللہ اس خاک سے دوبارہ انسان پیدا فرمائے گا؟‘‘ تو نبی ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ، يُمِيتُكَ اللّٰهُ تَعَالٰى، ثُمَّ يَبْعَثُكَ، ثُمَّ يَحْشُرُكَ إِلَى النَّارِ» ’’ہاں، اللہ تجھے مارے گا، پھر زندہ کرے گا اور پھر جہنم رسید کرے گا۔‘‘ اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿ اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ○ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ○ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ○ ﴾

’’کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا ہے؟ پھر یکایک وہ کھلا جھگڑالو ہو گیا اور اس نے ہمارے لیے ایک مثال بیان کی اور وہ اپنی پیدائش کو بھول گیا، اس نے کہا: ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جبکہ وہ گلی سڑی ہوں گی؟ آپ کہہ دیجیے: انھیں وہی (اللہ) زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار پیدا کیا اور وہ ہر طرح کے پیدا کرنے کو خوب جانتا ہے۔‘‘ [2]

لوگوں کو ایمان بالآخرت کا نظریہ سمجھانے کے لیے قرآن کریم میں عقلی اور فطرت سے میل کھانے والے اسالیب اختیار کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے کہا ہے کہ اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے کہ لوگوں کو جزا اور سزا کے لیے دوبارہ پیدا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق کو اپنی بندگی کے لیے پیدا فرمایا، رسول بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں تا کہ

---

[1] الجاثية 45:24,25۔ [2] یٰسٓ 36:77-79، تفسیر ابن کثیر: 3/581. ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں عاص بن وائل کا نام ہے۔

لوگوں کے لیے عبادت و اطاعت کا طریقہ واضح کرے۔ لوگ اللہ کے حکم کی پابندی کریں اور اس کے منع کردہ افعال سے رک جائیں۔ لیکن بعض لوگوں نے اللہ کی اطاعت پر استقامت کے بجائے سرکشی اور بغاوت کا راستہ اختیار کیا۔ کیا اب عدل و انصاف کا تقاضا نہیں کہ جب اچھا اور برا دونوں دنیا چھوڑ جائیں تو اللہ اچھے کو اس کی نیکی کی جزا اور برے کو اس کی برائی کی سزا دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ كَالۡمُجۡرِمِيۡنَ ؕ○ مَا لَكُمۡ ۟ كَيۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ ۚ○ اَمۡ لَكُمۡ كِتٰبٌ فِيۡهِ تَدۡرُسُوۡنَ ۙ○ اِنَّ لَكُمۡ فِيۡهِ لَمَا تَخَيَّرُوۡنَ ○﴾

’’کیا پھر ہم مسلمانوں کو مجرموں کے برابر ٹھہرائیں گے؟ تمھیں کیا ہوا، تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟ کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھ لیتے ہو؟ (کہ) یقیناً تمھارے لیے اس (کتاب) میں تمھاری من مانی باتیں ہوں؟‘‘ [1]

اپنی جانوں پر ظلم کرنے والوں کا یہ خیال ہے کہ یہ کائنات عبث اور بے فائدہ پیدا کی گئی ہے اور اس میں کوئی حکمت نہیں ہے، مومن و مصلح اور کافر و فسادی کا انجام مختلف نہیں اور نہ ہی متقی اور گنہگار کے انجام میں کوئی فرق ہے۔ [2]

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا بٰطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ۚ فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنَ النَّارِ ○ اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالۡمُفۡسِدِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِيۡنَ كَالۡفُجَّارِ ○﴾

’’اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، بے کار پیدا نہیں کیا، یہ ان لوگوں کا خیال ہے جنھوں نے کفر کیا تو جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کی ہلاکت ہے۔ کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل

---

[1] القلم 68:35-38. [2] تفسیر ابن کثیر: 124/2.

کیے، ان لوگوں کے مانند کردیں گے جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں؟ یا ہم متقین کو بدکاروں کے مانند کردیں گے؟'' [1]

قرآن کریم نے لوگوں کے سامنے زمین کو نباتات کے ذریعے زندہ کرنے کی مثالیں رکھیں اور یہ نتیجہ نکالا کہ جو ذات اس مردہ زمین کو زندہ کرنے پر قادر ہے وہ فوت شدگان کو زندہ کرنے اور بوسیدہ ہڈیوں میں دوبارہ جان ڈالنے پر کیونکر قادر نہیں ہوسکتی، چنانچہ فرمایا:

﴿فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○﴾

''چنانچہ آپ اللہ کی رحمت کے آثار کی طرف دیکھیں، وہ زمین کو اس کی موت (ویرانی) کے بعد کیسے زندہ (آباد) کرتا ہے، بے شک وہ ضرور مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔'' [2]

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں چند ایسے واقعات کا تذکرہ فرمایا ہے کہ اس نے لوگوں کو اس دنیا میں مرنے کے بعد یہیں دوبارہ زندہ کیا۔ اللہ نے اصحاب کہف کا تذکرہ فرمایا کہ انھیں تین سو نو سال تک سلائے رکھا، پھر وہ اس مدتِ مَدید کے بعد اپنی خواب گاہ سے دوبارہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

اصحاب کہف کے قصے کے علاوہ بھی بہت سے ایسے براہین و دلائل موجود ہیں جنھیں اللہ کے رسول نے کفر و شرک کے سرغنوں کے ساتھ ہونے والے اپنے مناظروں میں پیش کیا۔

مشرکین کا رسول اللہ ﷺ کے بشر ہونے پر اعتراض: مشرکین نے نبی ﷺ کی شخصیت پر بھی اعتراضات کیے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ رسول اُن جیسا بشر نہیں ہوسکتا۔ اسے یا تو بذاتِ خود فرشتہ یا ہر وقت فرشتوں کی معیت میں ہونا چاہیے:

﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ○﴾

---

[1] صٓ 38:27، 28۔ [2] الروم 30:50۔

”اور لوگوں کے پاس ہدایت آجانے کے بعد ان کو ایمان لانے سے صرف اس چیز نے روکا کہ انھوں نے کہا: کیا اللہ نے بشر رسول بھیجا ہے؟“[1]

سورۂ انعام میں ارشاد فرمایا:

﴿وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝﴾

”اور ان (کافر) لوگوں نے کہا کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو معاملے کا فیصلہ کر دیا جاتا، پھر ان کو ذرا مہلت نہ دی جاتی اور اگر ہم اس (نبی) کو فرشتہ بنا کر بھیجتے تو بھی ہم اسے انسان ہی کی شکل میں بھیجتے اور (تب بھی) ہم انھیں اسی شبہے میں ڈالتے جس میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں۔“[2]

یعنی اگر ہم انسانیت کی طرف کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے تو اسے بھی آدمی کی شکل میں بھیجتے تاکہ لوگوں سے گفتگو اور اس سے فائدہ حاصل کرنے میں آسانی ہو اور پھر بعینہ وہی اعتراض سامنے آتا جو اس وقت درپیش تھا کہ وہ بشر کی رسالت کس طرح قبول کر سکتے ہیں۔[3]

مشرکین تو ایسا رسول چاہتے تھے جو کھانا کھائے نہ بازاروں میں چلے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝﴾

”اور انھوں نے کہا: اس رسول کو کیا ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے؟ اس کی طرف فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا جو اس کے ہمراہ (لوگوں کو) ڈرانے والا ہوتا؟ یا اس کی طرف کوئی خزانہ ڈالا جاتا، یا اس کا کوئی باغ ہوتا جس میں سے وہ

---

[1] بنيّ إسرآءيل 94:17. [2] الأنعام 9,8:6. [3] الوسطية في القرآن الكريم للصلابي، ص:402.

(پھل) کھاتا اور ظالموں نے (مومنوں سے) کہا: تم تو بس ایک جادو مارے شخص ہی کی اتباع کرتے ہو۔"[1]

انھوں نے تو گویا یہ سنا ہی نہیں تھا کہ سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام بھی تو کھانا کھاتے، بازاروں میں چلتے اور ضروریات زندگی میں مشغول رہتے تھے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ۝﴾

"اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے، بلاشبہ وہ کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے تھے اور ہم نے تمھیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنایا، کیا تم صبر کرتے ہو؟ اور آپ کا رب (سب کچھ) خوب دیکھ رہا ہے۔"[2]

مشرکین کا یہ بھی خیال تھا کہ رسول کو ایک بڑا سروار اور مالدار ہونا چاہیے۔

﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰي رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝﴾

"اور انھوں نے کہا: یہ قرآن ان دونوں شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل کیوں نہیں کیا گیا؟"[3]

اور اس عظیم آدمی سے ولید بن مغیرہ، جو مکہ میں تھا یا عروہ بن مسعود ثقفی، جو طائف میں تھا، مراد لیتے تھے۔[4]

انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دیوانگی منسوب کی:

﴿وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝ۭ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰۗىِٕكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝﴾

"اور انھوں نے کہا: اے وہ شخص جس پر یہ ذکر (قرآن) نازل کیا گیا ہے! یقیناً تو

---

[1] الفرقان 25:7، 8۔ [2] الفرقان 25:20۔ [3] الزخرف 43:31۔ [4] تفسیر ابن کثیر: 4/126، 127۔

تو مجنون ہے تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے آتا اگر تو سچوں میں سے ہے؟“ [1]

اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے جواب میں ارشاد فرمایا:

﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝﴾

”(اے نبی!) آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں۔“ [2]

مشرکین نے نبی ﷺ سے کہانت (فال گوئی) اور شعر بھی منسوب کیے:

﴿فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝﴾

”تو (اے نبی!) آپ نصیحت کرتے رہیں کہ آپ اپنے رب کے فضل سے نہ تو کاہن ہیں اور نہ دیوانے، کیا وہ (کافر) کہتے ہیں: (یہ نبی) شاعر ہے اور ہم اس کے بارے میں حوادثِ زمانہ (موت) کا انتظار کر رہے ہیں؟“ [3]

مشرکین نبی ﷺ پر اس طرح الزامات لگاتے، حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ آپ ﷺ نے کبھی شعر نہیں کہے بلکہ آپ سلیم العقل تھے اور آپ جو کچھ فرماتے تھے وہ کاہنوں کی مسجع گفتگو اور جادوگری کے منتروں سے کوسوں دور تھا۔ [4]

مشرکین نے رسول اللہ ﷺ سے جادو اور جھوٹ بھی منسوب کیا:

﴿وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝﴾

”اور انھوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ ان کے پاس انھی میں سے ایک ڈرانے والا آ گیا اور کافروں نے کہا: یہ تو ایک جادوگر ہے بڑا جھوٹا۔“ [5]

نبی ﷺ پر آیات نازل ہوئیں جو ان کو مشرکین کے فرسودہ خیالات کا پتہ دیتیں اور بتاتیں کہ آپ سے قبل انبیاء کا بھی اسی طرح مذاق اڑایا گیا تھا اور ان مذاق اڑانے والوں کا انجام سخت عذاب ہے، ارشاد ربانی ہے:

---

[1] الحجر 7,6:14. [2] القلم 2:68. [3] الطور 30,29:52. [4] رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 57/3. [5] صٓ 4:38.

﴿ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ﴾

''اور (اے نبی!) یقیناً آپ سے پہلے رسولوں سے بھی مذاق کیا گیا تھا، پھر ان میں سے جن لوگوں نے مذاق کیا تھا، انھیں اس عذاب نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔''[1]

آیات ربانیہ نبی ﷺ کو بتاتی تھیں کہ یہ لوگ آپ کی شخصیت کو نہیں جھٹلاتے بلکہ وہ حق کے دشمن ہیں اور درحقیقت ایسی باتوں کے ساتھ آیات ربانی کو ٹھکراتے ہیں۔[2]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ ﴾

''(اے نبی!) تحقیق ہم جانتے ہیں کہ بے شک آپ کو وہ بات غمگین کرتی ہے جو وہ کہتے ہیں، پس بے شک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ دراصل یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔''[3]

مشرکین کا قرآن کریم کے بارے میں نظریہ: مشرکین نے قرآن کریم کے اللہ کی وحی ہونے کا انکار کیا اور اسے شعراء کی تخلیق شدہ اشعار کی ایک قسم خیال کیا، حالانکہ قرآن اور شعر کے مابین مماثلت ڈھونڈنے والے ہر شخص نے یہ جان لیا تھا کہ قرآن اور شعر دو مختلف چیزیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

''اور ہم نے اس (رسول) کو شعر کہنا نہیں سکھایا اور نہ (یہ) اس کے لائق ہی تھے،

---

[1] الأنعام 10:6. [2] رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 58/3. [3] الأنعام 33:6.

یہ (کلام الٰہی) تو سراسر نصیحت اور واضح قرآن ہے تاکہ وہ اسے ڈرائے جو زندہ ہے اور کافروں پر (اللہ کے عذاب کی) بات ثابت ہو جائے۔“ [1]

قرآن کریم شعر ہو بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ اس میں تو لوگوں کو گمراہ کرنے اور حقیقت کے خلاف بولنے والے شعراء کی مذمت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ؕ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۙ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝﴾

”اور شاعروں کی پیروی گمراہ (لوگ) ہی کرتے ہیں، کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ بلاشبہ وہ (خیال کی) ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور بلاشبہ وہ (ایسی باتیں) کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔“ [2]

قرآن کریم اللہ تعالی کی طرف سے پیغمبر ﷺ پر نازل شدہ کلام ہے اس میں شعراء یا کاہنوں کے کلام سے قطعاً کوئی مشابہت نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

”بلاشبہ یہ (قرآن) رسول کریم (جبریل) کا قول ہے اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں، تم کم ہی ایمان لاتے ہو اور نہ (یہ) کسی کاہن کا قول ہے، تم کم ہی نصیحت پکڑتے ہو، (یہ تو) رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے۔“ [3]

سب سے پہلے شعراء ہی نے یہ فیصلہ دے دیا تھا کہ یہ قرآن شعر نہیں ہے۔ [4]

مشرکین کی طرف سے تکذیب و عناد اس قدر بڑھ چکا تھا کہ انھوں نے یہ بھی الزام لگایا کہ محمد (ﷺ) یہ قرآن ایک عجمی آدمی سے سیکھتے ہیں۔ جو قبیلہ قریش کے ایک خاندان کا غلام تھا اور صفا پہاڑی کے قریب اپنا سامان بیچا کرتا تھا۔ نبی ﷺ کبھی کبھار اس کے پاس

---

[1] يٰسٓ 70,69:36. [2] الشعرآء 26:224-226. رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 59/3. [3] الحآقة 40:69-43. [4] رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 59/3.

بیٹھ جاتے اور کسی موضوع پر گفتگو بھی کرتے۔ یہ لڑکا عجمی زبان بولتا تھا اور اسے معمولی عربی زبان کے علاوہ کچھ علم نہ تھا۔ وہ عربی میں بس ضرورت کی حد تک جواب دے سکتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِیْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِيْنٌ ○﴾

”اور ہمیں بخوبی علم ہے کہ وہ کہتے ہیں: یقیناً اس (نبی) کو ایک آدمی سکھاتا ہے۔ اس شخص کی زبان عجمی ہے جس کی طرف یہ غلط نسبت کرتے ہیں، جبکہ یہ (قرآن تو) فصیح عربی زبان ہے۔“ [1]

یعنی یہ کس طرح ممکن ہے کہ نبی ﷺ ایک عجمی سے فصاحت و بلاغت اور جامع ترین معانی رکھنے والا قرآن سیکھتے ہوں؟ ایسی بات تو کوئی کم عقل انسان بھی نہیں کرسکتا۔ [2]

مشرکین نے قرآن کے طریقۂ نزول پر بھی اعتراض کیا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ اسے یکبارگی اترنا چاہیے تھا، حالانکہ قرآن کا مختلف ٹکڑوں میں اترنا اہل ایمان کے دلوں کو مضبوط کرنے اور اس کے فہم، حفظ اور عمل کرنے کے اعتبار سے زیادہ مفید تھا۔ ارشاد ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ○﴾

”اور کافروں نے کہا: اس پر یہ قرآن ایک ہی بار اکٹھا کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح (ہم نے نازل کیا) ہے تاکہ ہم اس سے آپ کا دل مضبوط کریں اور ہم نے اسے خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھ سنایا ہے۔“ [3]

جب مشرکین نے قرآن اور حامل قرآن پر اعتراضات کی بوچھاڑ کردی تو اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو اس جیسا قرآن لانے کا چیلنج کردیا اور اعلان کردیا کہ تمام جن و انس مل

---

[1] النحل 103:16. تهذيب سيرة ابن هشام لعبدالسلام هارون: 114/1. [2] تفسير ابن كثير: 586/2.

[3] الفرقان 32:25.

کر بھی ایسا قرآن نہیں لا سکتے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۝﴾

”کہہ دیجیے: البتہ اگر تمام انسان اور جن اس (بات) پر جمع ہو جائیں کہ اس قرآن کی مثل لائیں تو وہ اس کی مثل نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔“[1]

بلکہ تمام لوگ قرآن جیسی دس سورتیں بنانے سے بھی عاجز ہوں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝﴾

”کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے یہ (قرآن) خود گھڑ لیا ہے؟ کہہ دیجیے: پھر تم بھی اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں لے آؤ اور اللہ کے سوا جنھیں (مدد کے لیے) بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔“[2]

جب ایسا نہ ہو سکا تو اللہ تعالیٰ نے ایک سورت بنا لانے کا چیلنج بھی دیا کہ وہ یہ بھی بنا کر نہیں لا سکتے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝﴾

”کیا وہ (کافر) کہتے ہیں کہ اس (رسول) نے اسے گھڑ لیا ہے؟ (اے نبی!) کہہ دیجیے: تو تم اس جیسی ایک ہی سورت لے آؤ اور (مدد کے لیے) اللہ کے سوا جن کو بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔“[3]

اگرچہ فصاحت عربوں کی طبیعت میں رچی بسی تھی اور ان کے اشعار و قصائد زور بیان کی بلندیوں کو چھو رہے تھے، اس کے باوجود قرآن کی سی ایک سورت بنا لانے سے بھی ان

---

[1] بنيٓ إسرآءيل 88:17. [2] هود 13:11. [3] يونس 38:10.

کا عاجز آنا اس بات کی دلیل تھا کہ قرآن اس اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کی ذات و صفات اور افعال و اقوال میں کوئی ثانی نہیں اور اس کا کلام کسی طور بھی مخلوق کے کلام کے مشابہ نہیں ہوسکتا۔[1]

مکی دور میں اسلامی دعوت ٹھکرانے کے اسباب

سیرت نگاروں نے مکی دور میں کفار کی طرف سے اسلامی دعوت کے ٹھکرانے کے مختلف اسباب بیان کیے ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

جزیرہ نمائے عرب میں نبوت کی عدم پذیرائی: جزیرہ نمائے عرب کے وہ لوگ جن میں نبی ﷺ مبعوث ہوئے آسمانی ادیان سے دور تھے۔ وہ کسی خاص دین کے پیروکار تھے نہ یہود و نصاریٰ کی طرح کسی خاص آسمانی کتاب کو مانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو جزیرہ نمائے عرب میں مبعوث فرما کر ان پر اپنی حجت قائم کردی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ○ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۗ سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ○﴾

”اور یہ (قرآن) ایک عظیم کتاب ہے، ہم نے اسے نازل کیا ہے، (یہ) برکت والی ہے، پس تم اس کی پیروی کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ تاکہ تم یہ نہ کہو کہ صرف ہم سے پہلے دو گروہوں (یہود و نصاریٰ) پر کتاب نازل کی گئی تھی اور بے شک ہم تو ان کے پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے، یا تم (یہ نہ) کہو

---

[1] رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 66/3.

کہ اگر بے شک ہم پر کتاب نازل کی جاتی تو ہم ضرور ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے، چنانچہ یقیناً تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح کتاب اور ہدایت اور رحمت آگئی ہے، پھر اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے منہ موڑا؟ جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں انھیں جلد ہم سخت عذاب کی شکل میں سزا دیں گے، اس لیے کہ وہ حق سے منہ موڑتے ہیں۔''[1]

عقیدۂ بت پرستی کا اہل عرب کی زندگی اور دل و دماغ پر گہرا اثر تھا جس کی وجہ سے وہ حق کے مقابلے میں ڈٹ گئے اور انھوں نے اسلام کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ ان کا طبعی میلان کسی آسمانی مذہب کو قبول کرنے کا روادار نہ تھا، اس لیے وہ صحیح عقیدے اور خالص دین کے حامل نہ تھے۔ وہ تو صرف مادی اور محسوس کیے جانے والے معبودوں کی عبادت کے قائل تھے۔ وہ اپنے معبودوں سے اس قدر عقیدت رکھتے تھے کہ ان کی خاطر اپنی جان، مال اور بیٹوں تک کو نچھاور کر دیتے۔ اس سلسلے میں قوم کو پہنچنے والی تکالیف اور اموات کے باوجود وہ بتوں کی محبت و تعظیم میں آگے ہی بڑھتے چلے جاتے، ایک دوسرے کو اسی باطل عقیدے پر صبر کی تلقین کرتے اور اپنے بتوں کی نصرت و عبادت کے سلسلے میں ہر دکھ برداشت کرنے کا درس دیتے، حالانکہ وہ سابقہ امتوں کے قصے بھی سنتے رہتے تھے کہ کس طرح وہ بت پرستی میں گرفتار ہوئے اور اس کی پاداش میں ان پر دنیا ہی میں کون کون سے عذاب نازل ہوئے۔[2]

باپ دادا کی طرف سے حاصل ہونے والی عصبیت: انبیاء علیہم السلام کی دعوت سے ٹکرانے والی سب سے بڑی طاغوتی طاقت آباء و اجداد کی تقلید اور ان کے طے شدہ راستے کی اتباع تھی۔ اللہ کے دین کو قبول نہ کرنے میں اسی عصبیت کا سب سے بڑا دخل تھا جس کے

---

[1] الأنعام6:155-157. [2] إغاثة اللهفان لابن القيم:2/225.

پھیلائے ہوئے نظریات سے نکلنا انسان کے لیے انتہائی مشکل ہوتا ہے، یہاں تک کہ انسان اس خول سے باہر نکلتے نکلتے اپنی جان تک ہار بیٹھتا ہے الا یہ کہ اللہ کی طرف سے اس کے دل میں ایسی سوچ پیدا ہو جس کے نتیجے میں اسے بت پرستی سے نجات مل جائے۔ قرآن کریم نے سابقہ امتوں میں بت پرستی کے فروغ کا سبب اپنے بڑوں کی تقلید کو قرار دیا ہے۔[1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا:

﴿إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ○ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَٰكِفِينَ ○ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ○ أَوْ يَنفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ○ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ○﴾

”جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: تم کیا پوجتے ہو؟ وہ کہنے لگے: ہم بت پوجتے ہیں اور ہم (ہمیشہ) انھی کے مجاور رہیں گے، اس (ابراہیم) نے کہا: کیا وہ تمھیں سنتے ہیں جب تم انھیں پکارتے ہو؟ یا وہ تمھیں نفع دیتے ہیں یا ضرر پہنچاتے ہیں؟ انھوں نے کہا: (نہیں) بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، وہ اسی طرح کرتے تھے۔“[2]

یہی وہ طرز عمل تھا جو نسل در نسل مشرکین اور دینِ الٰہی کے دشمنوں نے اپنایا۔ جیسے ہی دعوت اسلام کے پیامبر نیک اور صالح لوگ انھیں نفسانی خواہشات اور فواحش میں منہمک رہنے سے روکتے اور اس پر کوئی سند طلب کرتے تو وہ جواب دیتے:

﴿وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○﴾

”اور جب وہ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم نے اپنے باپ دادا کو یہی کرتے پایا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ (اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: اللہ قطعاً بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کے ذمے ایسی باتیں لگاتے ہو

---

[1] الطريق إلى المدينة لمحمد العبدة، ص:43. [2] الشعرآء 26:70-74.

جو تم نہیں جانتے؟"[1]

وہ یہ سب کچھ دلیل نہ ہونے اور لاجواب ہو جانے کے وقت کہتے کیونکہ ان کے پاس نہ تو کوئی کتاب تھی جس سے وہ دلیل پکڑتے اور نہ وہ ایسی عقل و دانش کے مالک تھے کہ انھیں رہنمائی حاصل ہوتی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظٰهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۭ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ○ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ○﴾

"کیا تم نے دیکھا نہیں کہ بے شک اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، تمھارے مطیع و تابع فرمان کر دیا ہے اور اس نے تم پر اپنی ظاہری اور چھپی نعمتیں پوری کر دی ہیں اور بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر علم، بغیر ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے جھگڑا کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جائے کہ تم اس کی اتباع کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم تو اسی (طریقے) کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، کیا اگرچہ شیطان انھیں عذاب جہنم کی طرف بلاتا رہا ہو تب بھی؟"[2]

شیطان نے انسانی طبیعت کو مدنظر رکھتے ہوئے کفار کو اس گمراہ کن تقلید میں مبتلا کیا۔ شیطان لوگوں کو آباء و اجداد کے ساتھ وفاداری کا سبق دیتا ہے اور انھیں اپنی تاریخ اور تہذیبی ورثے سے وابستہ رہنے کا درس دیتا ہے۔ یہ شیطانی تدبیر کا سب سے بڑا حربہ ہے جو انسان کو اس کے فطری رجحان، یعنی وطن اور مال وغیرہ کی محبت کے ذریعے سے گمراہ کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «إِنَّ الشَّيْطَانَ قَعَدَ لِابْنِ آدَمَ بِأَطْرُقِهِ، فَقَعَدَ

---

[1] الأعراف 28:7. [2] لقمٰن 21,20:31.

لَهُ بِطَرِيقِ الْإِسْلَامِ فَقَالَ لَهُ: أَتُسْلِمُ وَتَذَرُ دِينَكَ وَدِينَ آبَائِكَ وَآبَاءِ أَبِيكَ؟ قَالَ: فَعَصَاهُ فَأَسْلَمَ، ثُمَّ قَعَدَ لَهُ بِطَرِيقِ الْهِجْرَةِ، فَقَالَ: أَتُهَاجِرُ وَتَذَرُ أَرْضَكَ وَسَمَاءَكَ؟ وَإِنَّمَا مَثَلُ الْمُهَاجِرِ كَمَثَلِ الْفَرَسِ فِي الطِّوَلِ! فَعَصَاهُ فَهَاجَرَ، ثُمَّ قَعَدَ لَهُ بِطَرِيقِ الْجِهَادِ، فَقَالَ: تُجَاهِدُ؟ فَهُوَ جَهْدُ النَّفْسِ وَالْمَالِ، فَتُقَاتِلُ فَتُقْتَلُ، فَتُنْكَحُ الْمَرْأَةُ وَيُقْسَمُ الْمَالُ فَعَصَاهُ فَجَاهَدَ» ”شیطان ابن آدم کے مختلف راستوں میں بیٹھتا ہے۔ وہ اس کے اسلام کے راستے میں بیٹھتا ہے اور کہتا ہے: ”کیا تو مسلمان ہو کر اپنے آباء و اجداد کا دین چھوڑنا چاہتا ہے؟“ ابن آدم اس کی بات نہیں مانتا اور مسلمان ہو جاتا ہے، پھر شیطان اس کے ہجرت کے راستے میں بیٹھتا ہے اور کہتا ہے: ”کیا تو ہجرت کرے گا اور اپنے زمین و آسمان کو چھوڑ دے گا؟ مہاجر کی مثال تو اس گھوڑے کی سی ہے جو اپنی رسی سے بندھا ہوا ہے (یعنی مہاجر بلاد غیر میں جا کر صرف اپنے گھر کے اندر بند ہو کر رہ جاتا ہے۔ صرف اپنے جاننے والوں ہی کے پاس جاتا آتا ہے)“ ابن آدم اس کی بات نہیں مانتا اور ہجرت کرتا ہے، پھر شیطان اس کے جہاد کے راستے میں بیٹھتا ہے اور کہتا ہے: ”کیا تو جہاد کرے گا اور اپنی جان اور مال قربان کرے گا؟ تو جہاد کرے گا اور مارا جائے گا؟ پھر تیری بیوی سے نکاح کیا جائے گا اور تیرا مال تقسیم کر دیا جائے گا۔“ ابن آدم اس کی یہ بات بھی نہیں مانتا اور جہاد کے لیے نکلتا ہے۔“

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: «فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ أَنْ يُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ، وَمَنْ قُتِلَ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ أَنْ يُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ، وَإِنْ غَرِقَ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ أَنْ يُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ أَوْ وَقَصَتْهُ دَابَّتُهُ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ أَنْ يُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ» ”جو بھی شخص اس طرح کرے

گا اللہ تعالیٰ اسے ضرور جنت میں داخل فرمائے گا۔ اور جو اللہ کے راستے میں شہید ہوگیا، اللہ پر واجب ہے کہ اسے جنت میں داخل کرے۔ اور اسی طرح اگر کوئی پانی میں ڈوب گیا یا سواری سے گر کر مر گیا تو بھی اللہ تعالیٰ اسے ضرور جنت میں داخل فرمائے گا۔"[1]

جب نبی ﷺ جزیرہ نمائے عرب میں مبعوث ہوئے تو آپ ﷺ پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ آپ ایسا دین لے کر آئے ہیں جس پر ان کے آباء و اجداد کار بند نہ تھے۔ مشرکین سرداروں نے عامۃ الناس اور زیرک لوگوں کو اس دین سے نفرت دلانے کی کوشش کی اور دعوتِ اسلام کے گرد ایک عارضی حصار قائم کر دیا۔[2]

بت پرستی کی تائید میں اہل کتاب کا کردار: اہل عرب کا بت پرست معاشرہ دعوتِ توحید سے نبرد آزما ہوا۔ انھوں نے اس دعوت کے منکر اہل کتاب کے کردار کو بطور مضبوط دلیل اختیار کیا۔ تورات و انجیل کے پیروکاروں نے، جو آسمانی کتب کے وارث خیال کیے جاتے تھے، نبی ﷺ کی پیش کردہ دعوت کا انکار کرتے ہوئے اسے رد کر دیا تھا اور جھٹلایا تھا۔ یہ لوگ چونکہ دین کو زیادہ سمجھنے والے خیال کیے جاتے تھے، اس لیے ان کی روش مشرکین کے موقف کے لیے مضبوط دلیل ٹھہری۔ ارشاد ہے:

﴿وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۝ۚۖ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚۖ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝﴾

"اور ان کے سردار (آوازِ حق سن کر یہ کہتے ہوئے) چل دیے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو، بے شک یہ چیز ہے جو کسی غرض سے (کہی جا رہی) ہے، ہم نے یہ بات کسی اور دین میں نہیں سنی، یہ تو بس گھڑی ہوئی بات ہے۔"[3]

گویا مشرکین کا اپنے جھوٹے معبودوں کی عبادت پر قائم رہنا اس وجہ سے تھا کہ انھوں

---

[1] سنن النسائي، حديث: 3136، و مسند أحمد: 483/3، و صحيح ابن حبان، حديث: 4593.

[2] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 83. [3] صٓ 38: 6، 7.

نے نبی ﷺ کی دعوتِ توحید جیسی دعوت اس سے پہلے کے دین میں ہرگز نہ سنی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، سدی، محمد بن کعب قرظی، قتادہ اور امام مجاہد کی تفسیر کے مطابق پہلے دین سے مراد نصرانیت ہے۔[1]

یوں نبی ﷺ کے خلاف اہل کتاب کی شہادت مشرکین کے لیے تقویت کا سبب بنی، وگرنہ عرب والے کسی آسمانی کتاب اور اس میں موجود حقائق اور معلومات سے قطعًا ناآشنا تھے۔[2]

قبائلی عادات و اطوار کا غلبہ: سرداری اور شرف و عزت کے حصول کے لیے قبائل کی باہمی رسہ کشی ان کے عادات و اطوار میں جڑیں پکڑ چکی تھی، اس لیے نبی ﷺ کے اپنے قبیلے والے آپ کے خلاف بطور حجت یہ دلیل پیش کرتے کہ آپ ان میں سرداری اور بلند مرتبے کے حامل نہیں اور دیگر قبائل قریش اپنے منصب اور سرداری کو بچانے کی غرض سے مخالفت پر تلے ہوئے تھے، جبکہ دیگر قبائلِ عرب اپنے اپنے قبیلے کی یکجہتی کا تحفظ کسی دوسرے قبیلے کے فرد کی اتباع سے گریز کرتے ہوئے اسلام سے انکار کی صورت میں کرتے تھے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”پہلا دن جب میں نے رسول اللہ ﷺ کو جانا، وہ تھا جب میں اور ابوجہل مکہ کی ایک گلی میں چلے آرہے تھے۔ اچانک ہماری ملاقات رسول اللہ ﷺ سے ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوجہل سے کہا: «يَا أَبَا الْحَكَمِ! هَلُمَّ إِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَ إِلٰى رَسُولِهِ، إِنِّي أَدْعُوكَ إِلَى اللّٰهِ» ”اے ابو الحکم! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف آؤ، میں تمھیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔“ ابوجہل نے کہا: ”اے محمد! کیا تو ہمارے معبودوں کو گالی دینے سے رک سکتا ہے؟ کیا تو صرف یہی چاہتا ہے نا کہ ہم گواہی دیں کہ تو نے اللہ کا دین پہنچا دیا؟ اللہ کی قسم! اگر مجھے یقین ہو جائے کہ تو سچا ہے تو بھی میں تیری اتباع نہیں کروں گا۔“ مغیرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ وہاں سے واپس آ گئے تو ابوجہل مجھ سے کہنے لگا: ”اللہ کی قسم! مجھے علم ہے کہ وہ حق بات کہتے ہیں

---

[1] تفسير الطبري: 126/23، والدر المنثور للسيوطي: 146/7. [2] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 86.

لیکن ذرا غور کرو، بنوقُصَی کہتے ہیں کہ ہم بیت اللہ کے دربان ہیں، ہم نے کہا: ٹھیک ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم مجلس مشاورت (ندوہ) کے نگران ہیں۔ ہم نے کہا: ہاں۔ انھوں نے کہا: ہمارے پاس پرچم (لواء) ہے۔ ہم نے کہا: ہم نے مان لیا۔ انھوں نے کہا: ہمارے پاس حاجیوں کو پانی پلانے کی ذمہ داری (سقایہ) ہے۔ ہم نے یہ بھی تسلیم کر لیا، پھر انھوں نے حج وعمرہ کے لیے آنے والے لوگوں کو کھانا کھلایا اور ہم نے بھی کھانا کھلایا یہاں تک کہ جب باہمی مقابلہ زوروں پر تھا تو انھوں نے دعویٰ کیا کہ ہم میں نبی ہے۔ نہیں، اللہ کی قسم! میں کبھی (ان کی برتری تسلیم) نہیں کروں گا۔"[1]

اہل مکہ کی عرب قبائل پر برتری: اہل مکہ ہر ممکن طور پر اپنے مقام و مرتبے اور شرف و برتری کو قائم رکھنا چاہتے تھے وہ دیگر تمام عرب قبائل پر اپنا مذہبی تقدّس برقرار رکھنے کے خواہاں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اسلام ان سے ان کا یہ امتیاز چھین لے گا، سارا عرب ان سے نبرد آزما ہو جائے گا اور ان کی منڈیوں میں اپنی پیداوار لانے سے رک جائے گا اور وہ یہ بھول گئے تھے کہ اللہ ہی امن اور رزق دینے والا ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقَالُوٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ۭ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾

"وہ (مشرکین مکہ) کہتے ہیں: اگر ہم نے تیرے ساتھ ہدایت کی پیروی کی تو ہمیں ہماری زمین سے اچک لیا جائے گا، کیا ہم نے انھیں پر امن حرم میں جگہ نہیں دی جس کی طرف ہر قسم کے پھل ہماری طرف سے بطور رزق کھینچ کر لائے جاتے ہیں؟ لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے۔"[3]

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 207/2، وصحيح السيرة النبوية للألباني: 162/1. [2] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 96-106. [3] القصص 28:57.

قریش کا یہ گمان تھا کہ اہل عرب جو بتوں کو مقدس جانتے ہیں، جب انھیں علم ہوگا کہ قریش نے ایک نیا دین اختیار کرلیا ہے اور اپنے آباء واجداد کے دین کو چھوڑ دیا ہے تو وہ ان کے خلاف کارروائی کریں گے اور اہل مکہ پر ٹوٹ پڑیں گے بلکہ اس ''جرم'' کی پاداش میں وہ موسم حج میں ان کی منڈیوں میں اپنی پیداوار بھی نہیں لائیں گے۔ لیکن افسوس کہ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اللہ اپنے فیصلے پر غالب آنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ ۝ ﴾

''کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک ہم نے حرم (مکہ) کو پرامن بنایا ہے، جبکہ لوگ اس کے اردگرد سے اچک لیے جاتے ہیں۔ کیا پھر وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔''[1]

---

[1] العنکبوت67:29.

باب 2

قانونِ ابتلا

اپنی مخلوق کی ابتلا و آزمائش اللہ تعالیٰ کا ایسا رائج قانون ہے جس کا تذکرہ قرآن کریم میں جگہ جگہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ڮ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

”اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر اونچے درجے عطا کیے تاکہ وہ تمھیں ان نعمتوں میں آزمائے جو اس نے تمھیں دیں۔ بے شک آپ کا رب جلد سزا دینے والا ہے۔ اور بے شک وہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔“ ①

اللہ تعالیٰ نے مزید ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝﴾

”بلاشبہ ہم نے جو کچھ روئے زمین پر ہے، اسے اس کی زینت بنایا ہے تاکہ ہم انھیں آزمائیں کہ ان میں عمل کے لحاظ سے کون زیادہ اچھا ہے۔“ ②

اس دنیا میں مراتب پانے کا ابتلا و آزمائش سے گہرا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ کسی امت کو اس وقت تک دنیا میں مقام و مرتبہ حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مختلف

---

① الأنعام 6:165. ② الكهف 18:7.

آزمائشی مراحل سے نہ گزر جائے اور اس کا جوہر حالات کی کٹھالی میں اچھی طرح پگھل کر کھوٹا اور کھرا الگ نہ ہو جائے۔

یہی قانون الٰہی امت اسلامیہ پر بھی نافذ العمل رہا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت رہی کہ اہل ایمان کو آزمائش اور ابتلا سے گزارا جائے تاکہ ان کا ایمان خالص ہو جائے اور وہ زمین میں غلبہ حاصل کرلیں اور عزت و شرف کے مراتب پالیں۔

یہ مفہوم امام شافعی رحمہ اللہ کے ان الفاظ میں بھی پایا جاتا ہے جو انھوں نے ایک سائل کو جواب دیتے ہوئے کہے تھے۔ سائل نے سوال کیا تھا کہ آزمائش میں گھرا انسان بہتر ہے یا صاحب مرتبہ؟ اس پر امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا تھا: ”انسان پہلے آزمایا جاتا ہے، پھر اسے مقام و مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد علیہم السلام جیسے جلیل القدر انبیاء کو آزمایا جب انھوں نے صبر کیا تو اللہ نے انھیں مقام و مرتبہ عطا فرمایا، اس لیے کوئی انسان یہ خیال نہ کرے کہ وہ اس دنیا میں ہر قسم کے رنج و غم سے مکمل محفوظ رہے گا۔“[1]

اہل ایمان کو مقام و مرتبہ عطا کرنے سے پہلے کھرے کھوٹے کی پہچان کے لیے آزمائش و ابتلا لازمی امر ہے تاکہ ان کے اقتدار کی عمارت مضبوطی اور پختگی سے قائم ہو سکے اور ابتلا مومنوں کے لیے باعث رحمت ہوتا ہے نہ کہ باعث زحمت اور اس میں اللہ کا غضب نہیں بلکہ اس کی پسندیدگی شامل ہوتی ہے۔[2]

اسی طرح دعوتی میدان اور جنت کے راستے میں اللہ کا یہی قانون نافذ العمل ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَ حُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ»

”جنت کا راستہ مشکلات اور جہنم کا خواہشات سے پُر کر دیا گیا ہے۔“[3]

---

[1] الفوائد لابن القيم، ص: 283. [2] التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 235. [3] صحيح البخاري، حديث: 6487، و صحيح مسلم، حديث: 2822.

ابتلا کی حکمت اور اس کے فوائد

ابتلا کی بہت سی حکمتیں اور فوائد ہیں جن میں سے اہم ترین مندرجہ ذیل ہیں:

اچھے برے کا امتیاز: اللہ تعالیٰ نے ابتلا و آزمائش کو لوگوں کے درمیان امتیاز کرنے اور سچے مومن کو منافق سے الگ کرنے کا ذریعہ بنایا ہے کیونکہ انسان کا کردار بسا اوقات اچھے حالات میں واضح نہیں ہوتا اور سخت حالات میں کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿ أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُّتْرَكُوْٓا أَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ ﴾

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ صرف یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انھیں آزمایا نہیں جائے گا۔''[1]

تربیت: امام سید قطب رحمہ اللہ اس سلسلے میں فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کا قانون ابتلا ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے دعوتِ اسلام کی حامل اور اس راستے کی تکالیف برداشت کرنے والی جماعت تیار کی جاسکتی ہے۔ اور قانونِ ابتلا اس جماعت کی تربیت کا مؤثر ترین ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی بھلائی، قوت اور برداشت جیسی خوبیوں کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اللہ کا قانونِ ابتلا تکالیف برداشت کرنے کی عملی تربیت اور انسان کی حقیقت اور زندگی کا مقصد جاننے کا مرکزی ذریعہ ہے تاکہ اس کے نتیجے میں دعوت اسلامی کے علمبردار اور مضبوط کردار کے افراد ثابت قدمی سے آگے بڑھ سکیں اور یہی لوگ اس بار کو اٹھانے کے قابل سمجھے جاتے ہیں اور ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔''[2]

دلوں کے راز آشکار ہونا: اس سلسلے میں سید قطب رحمہ اللہ رقم طراز ہیں: ''انسان کی آزمائش سے قبل اس کے دل کی کیفیت اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتی ہے لیکن ابتلا و آزمائش کے ذریعے اس کا ہر خفیہ راز عالم دنیا میں آشکار ہوجاتا ہے جو پہلے سے اللہ کے علم میں ہے مگر لوگ اسے نہیں جانتے ہوتے، پھر لوگوں کے ظاہری عمل پر ان کا محاسبہ کیا جاتا ہے

---

[1] العنکبوت 29:2. [2] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 180/2.

نہ کہ صرف اللہ کے علم کی بنا پر۔ یہ ایک طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل، دوسری طرح عدل اور تیسرے پہلو سے دیکھا جائے تو لوگوں کی تربیت کا ذریعہ ہے۔ لوگ آپس میں کسی کا محاسبہ اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک اس کا معاملہ واضح نہ ہو جائے اور اس کا جرم ثابت نہ ہو جائے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرح کسی کے دل کا راز نہیں جانتے۔“[1]

امانت کا بوجھ اٹھانے کی حقیقی تیاری: اس سلسلے میں سید صاحب فرماتے ہیں: ”اللہ تعالیٰ کا اہل ایمان کو تکلیف میں مبتلا کرنا محض آزمائش میں ڈالنے کے لیے نہیں بلکہ یہ عمل تو اللہ کی امانت کا بوجھ اٹھانے کی حقیقی تیاری ہے۔ اس کے لیے ایک خاص تیاری کی ضرورت ہوتی ہے جو عملی طور پر مشکلات سے گزرنے، خواہشات پر قابو پانے، مصائب پر صبر کرنے اور لمبے فتنے اور سخت ابتلا میں مبتلا ہونے کے باوجود اللہ سے مدد اور ثواب حاصل ہونے کے یقین کے ساتھ مکمل ہوتی ہے۔ انسان کو سختیاں پگھلا کر رکھ دیتی ہیں جس سے اس کے نفس کا میل کچیل اتر جاتا ہے۔ اس کی پوشیدہ ذخیرہ شدہ طاقت جوش مارتی ہوئی بیدار ہو کر یکجا ہو جاتی ہے اور جب اس میں سختی اور تندی پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا جوہر مضبوط، ٹھوس اور پالش ہو جاتا ہے۔

سختیاں اور آزمائش بڑی بڑی جماعتوں کو تیار کرتی ہیں اور ہر فرد کی بنیاد مضبوط، طبیعت قوی اور اللہ کے ساتھ تعلق پختہ ہو جاتا ہے اور وہ فتح یا شہادت کی خوبیوں سے بہرہ ور ہو جاتا ہے۔ اس آزمائش و تربیت کے بعد ایسے ہی افراد اسلامی دعوت کا علم اٹھاتے ہیں اور ان پر اعتبار و اعتماد کیا جاتا ہے۔“[2]

حقیقت نفس کی پہچان: اس بارے میں سید قطب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”ابتلا کا مرحلہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ داعی خود اپنی حقیقت سے آگاہ ہو سکیں کیونکہ انھیں زندگی اور جہاد سے عملی طور پر نبرد آزما ہونا ہوتا ہے اور اسی طرح وہ انسانی نفس کی حقیقت اور اس کے مخفی پہلوؤں سے

---

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 387/6. [2] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 389/6.

آگاہ ہوسکیں جن سے جماعتوں اور معاشروں کی حقیقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

اس حقیقت کو پالینے کے بعد داعی حضرات جان لیتے ہیں کہ خواہشات کے باوجود کس طرح دعوت اسلامی خود ان کے اور لوگوں کے دلوں میں سرایت کرتی ہے اور وہ یہ بھی جان لیتے ہیں کہ شیطان کن کن راستوں سے لوگوں کے دلوں میں داخل ہوتا ہے اور راہِ حق کے کٹھن مراحل اور گمراہی کے طور طریقے کون کون سے ہیں۔''[1]

دعوت کی قدر و اہمیت کا شعور: اس بارے میں سید قطب کا کہنا ہے: ''ابتلا کا مرحلہ اس لیے بھی آتا ہے کہ جس قدر دعوت دین کے سلسلے میں مشقت اور مصائب کا سامنا ہو اور انسان اپنی قیمتی اور عزیز چیز کی قربانی دے، اسی قدر اس دعوت کی قدر و قیمت اور اہمیت ان پر آشکار ہوتی ہے۔ بعد ازاں حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں، وہ قربانی دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔''[2]

قبول اسلام کا سبب بننا: اہل ایمان کا آزمائش پر صبر اختیار کرنا بذات خود اس دین کی ایک خاموش دعوت ہے جو لوگوں کو اللہ کے دین میں داخل کر دیتی ہے۔ اگر اہل ایمان کمزوری یا بے ثباتی کا مظاہرہ کریں تو لوگ اس دین میں داخل ہونے سے انکار کر دیں گے۔

نبی ﷺ کے پاس کوئی شخص آتا اور اسلام قبول کر لیتا، پھر نبی ﷺ کی طرف سے اسے حکم ملتا کہ وہ اپنی قوم کو تبلیغ کرے، ان کے حق کو جھٹلانے اور تکالیف پہنچانے پر صبر کرے اور مسلسل کوشش جاری رکھے اور بالآخر وہ اپنی قوم کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کے لیے آپ کے پاس لے آتا۔[3]

بعض بااثر افراد کا دعوت اسلامی کی طرف مائل ہونا: اہل اسلام کی پختگی اور قربانیوں کو دیکھ کر بڑی بڑی بااثر شخصیات اس دین کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوجاتی ہیں۔ اگر ایمانی استقامت کا مظاہرہ کیا جائے تو ایسی بااثر شخصیات کے سامنے دعوت اسلام اور

---

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 181/2. [2] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 180/7.

[3] فقه السیرة النبویة للدکتور الغضبان، ص: 193,192.

حاملین دعوت کی عظمت بڑھ جاتی ہے اور وہ بلا تردد اسلام کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں بہت سی عظیم شخصیات جن سے اسلام کو غلبہ ملا، اس راستے سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں۔[1]

اللہ تعالیٰ کے ہاں درجات کی بلندی اور گناہوں کا کفارہ: نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَا يُصِيبُ الْمُؤْمِنَ مِنْ شَوْكَةٍ فَمَا فَوْقَهَا، إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ بِهَا دَرَجَةً، أَوْحَطَّ عَنْهُ بِهَا خَطِيئَةً»

”کسی مومن کو کوئی بھی کانٹا چبھے یا اس سے بڑی تکلیف پہنچے تو اللہ تعالیٰ اس کا ایک درجہ بلند فرما دیتے ہیں یا اس کا ایک گناہ معاف کر دیتے ہیں۔“[2]

بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک درجہ ہوتا ہے جہاں پر وہ اپنے عمل کی وجہ سے نہیں پہنچ سکتا۔ تب اللہ تعالیٰ اسے آزماتا ہے اور اس آزمائش کی وجہ سے اسے بلند درجے تک پہنچا دیتا ہے، اسی طرح ابتلا و آزمائش کی وجہ سے مسلمان کے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں۔[3]

ابتلا کے دیگر فوائد: ان میں اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت اور صفت قہار کی معرفت، بندوں کا عجز و انکسار، اخلاص، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کی طرف متوجہ ہونا، دعا اور گریہ و زاری، مصیبت پہنچانے والے کو معاف کرنا، مصیبت پر صبر کرنا اور اجر کی امید رکھنا اور اس میں پوشیدہ فوائد کو سامنے رکھ کر اللہ کا شکر ادا کرنا، مصائب میں مبتلا افراد سے اچھا سلوک کرنا اور ان کی مدد کرنا، نعمتِ عافیت کی قدر دانی اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا اور اس ابتلا و آزمائش کا سب سے بڑا فائدہ وہ آخرت کا ثواب ہے جو اللہ تعالیٰ اس آزمائش کی وجہ سے انسان کو عطا کرتا ہے۔ اور اس ثواب کے مختلف مراتب ہیں، جو شخص جتنا زیادہ صبر اور شکر سے کام لیتا ہے، اس کا ثواب بھی اسی نسبت سے زیادہ ہوتا ہے۔[4]

---

[1] فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص:194,193. [2] صحيح مسلم، حديث:2572. [3] التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 224، و فقه الابتلاء لمحمد أبي صعيليك، ص: 8-11. [4] فقه الابتلاء لمحمد أبي صعيليك، ص: 15-28.

نبی ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے مختلف اقسام کی آزمائشوں کا سامنا کیا، مثلاً: ’’قریش کی طرف سے ابو طالب کو نبی ﷺ کی حمایت سے باز رکھنے کی کوشش، اسلامی دعوت کا مذاق اڑانا، نبی ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تکالیف دینا، دعوت ترک کرنے پر سودے بازی اور پیشکشیں، صفا پہاڑی کو سونے کی بنانے کا مطالبہ، نبی ﷺ کے خلاف یہودیوں سے مدد مانگنا، دعوت دین اور نبی ﷺ کی شخصیت کے خلاف اہم مواقع خصوصاً حج کے موقع پر پروپیگنڈہ، کفار مکہ کی طرف سے اقتصادی بائیکاٹ جس میں نبی ﷺ، بنو ہاشم اور بنو مطلب نے تکلیفیں اٹھائیں اور اس کے علاوہ جسمانی تکالیف وغیرہ شامل ہیں۔

آئندہ صفحات میں اسلام کے خلاف مشرکین کی حیلہ سازیوں کے تذکرے کے علاوہ یہ بتایا جائے گا کہ نبی ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے کس طرح کفار کی سازشوں کے مقابلے میں اپنا دفاع کیا، دنیاوی اسباب کے ساتھ اس دور ابتلا کا سامنا کیا اور دنیاوی اسباب کس حد تک اختیار فرمائے حتی کہ مدینہ میں ایک اسلامی ریاست قائم کرنے میں کامیابی ممکن ہوئی۔

باب 3

اسلامی دعوت کے خلاف مشرکین کی محاذ آرائی

مشرکین مکہ نے اسلامی دعوت کے خلاف محاذ آرائی کا متفقہ فیصلہ کرلیا تھا کیونکہ اس دعوت نے ان کے جاہلی عقیدے کی قلعی کھول دی تھی، ان کے معبودوں کو باطل ٹھہرایا تھا اور ان کی آراء و افکار اور اللہ تعالیٰ، زندگی، انسان اور کائنات کے بارے میں ان کے تصورات کو کم عقلی کا نتیجہ قرار دیا تھا، لہٰذا انھوں نے اس دعوت کو روکنے، حق کی آواز کو دبانے اور اسلام کے فروغ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لیے مختلف ذرائع اور طریقے استعمال کیے:

ابو طالب کو نبی ﷺ کی حمایت سے دور رکھنے کی کوشش

قریش کے سردار ابو طالب کے پاس آئے اور کہا: ”اے ابو طالب! تیرے بھتیجے نے ہماری مجالس اور ہماری عبادت گاہ (مسجد حرام) میں آکر ہمیں تکلیف پہنچائی ہے۔ آپ اسے اس عمل سے روکیے۔“ اس پر ابو طالب نے نبی ﷺ سے کہا: ”یہ تیرے چچا زاد بھائی میرے پاس آئے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ تو انھیں ان کی مجالس اور حرم کعبہ میں تکلیف پہنچاتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو تو اس سے باز آجا۔“ نبی ﷺ نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی اور ان سے فرمایا: «تَرَوْنَ هٰذِهِ الشَّمْسَ؟» ”کیا تم سب اس سورج کو دیکھتے ہو؟“ انھوں نے کہا: ”ہاں“ فرمایا: «فَمَا أَنَا بِأَقْدَرَ أَنْ أَدَعَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ عَلٰى أَنْ تَشْعَلُوا مِنْهَا بِشُعْلَةٍ» ”اگر تم اس سورج کا شعلہ لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دو تو بھی میں یہ دعوت

کبھی نہیں چھوڑوں گا۔‘‘

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ کی قسم! اگر کوئی اس سورج سے آگ کا شعلہ بھی لے آئے تو بھی میں اس دعوت کو نہیں چھوڑوں گا جسے پہنچانے کے لیے مجھے بھیجا گیا ہے۔‘‘

ابو طالب نے قریش سے کہا: ’’میرے بھتیجے نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ تم بھلائی چاہتے ہو تو واپس چلے جاؤ۔‘‘ [1]

قریش نے کئی بار نبی ﷺ کو ان کے خاندان کے ذریعے دبانے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوئے۔

ابو طالب کی طرف سے اپنے بھتیجے کی حمایت کی خبر پھیلتی جا رہی تھی اور ان کے نبی ﷺ کی نصرت وحمایت پر کمر بستہ ہونے اور انھیں تنہا نہ چھوڑنے کا معاملہ زبان زد خاص و عام تھا جس سے قریش میں غم، حسد اور مکر و فریب کی لہر دوڑ گئی۔ وہ عمارہ بن ولید بن مغیرہ کو لیے ابو طالب کے پاس آئے اور کہا: ’’اے ابو طالب! یہ عمارہ بن ولید قریش کا طاقتور اور خوبصورت ترین فرد ہے۔ اس کا نفع نقصان آپ سے متعلق رہے گا، اسے آپ اپنا بیٹا بنا لیجیے اور اس کے عوض اپنے اس بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دیجیے جس نے آپ کے اور آپ کے بڑوں کے دین کی مخالفت کی، آپ کی قوم کا شیرازہ بکھیر دیا اور ہماری عقلوں کو بیوقوفی پر محمول کیا۔ ہم اسے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اور آپ کو ایک شخص کے بدلے ایک شخص دیا جا رہا ہے۔‘‘ ابو طالب نے کہا: ’’اللہ کی قسم! تم مجھ سے کتنا برا سودا کر رہے ہو۔ کیا تم اپنا بیٹا میرے حوالے اس لیے کرو کہ میں اسے کھلاؤں اور میں اپنا بیٹا تمھارے حوالے اس لیے کر دوں کہ تم اسے قتل کر ڈالو۔ اللہ کی قسم! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔‘‘ [2]

---

[1] التاريخ الكبير للبخاري: 51/1/4، ودلائل النبوة للبيهقي: 187/2، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 78، وسلسلة الأحاديث الصحيحة: 194/1. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 285/1، و البداية والنهاية: 48/3.

ایک شخص جب ابو طالب کی طرف سے نبی ﷺ کی پشت پناہی کا یہ انداز دیکھتا ہے تو وہ حیرت زدہ اور ہکا بکا رہ جاتا ہے کہ ابو طالب نے اپنا راستہ اپنے بھتیجے کے راستے کے ساتھ ملا لیا تھا بلکہ بنو ہاشم کا کفیل ہونے کے ناتے بنو ہاشم اور بنو مطلب کو تادمِ آخر نبی ﷺ کی تائید میں ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ اس میں مسلم اور مشرک کا کوئی امتیاز نہ تھا۔[1]

ابو طالب نے اپنے بھتیجے محمد ﷺ کو کھلم کھلا پناہ دی جس میں کسی قسم کا تردد یا تامل شامل نہ تھا۔ ابو طالب کا یہ انداز جاہلی رسم ورواج اور عرب کی روایات کے عین مطابق تھا جس کی بنا پر نبی ﷺ کی حفاظت اور اسلام کی خدمت ممکن ہوئی۔

ابو طالب نے جب بنو ہاشم اور بنو مطلب کے بارے میں قریش کی کارستانیوں کو دیکھا تو انھیں نبی ﷺ کے دفاع کی دعوت دی، چنانچہ وہ سب ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو گئے اور اللہ کے دشمن ابولہب کے سوا سب نے ابو طالب کی دعوت پر لبیک کہا۔

جب ابو طالب نے اپنی قوم کی یہ حالت دیکھی جو ان کے لیے مسرت کا سبب تھی، یعنی یہ کہ وہ سب ان کی سعی میں شریک اور ان کے ہمدرد ہیں تو ان کی مدح وستائش کی اور انھیں پرانے واقعات یاد دلائے۔ رسول اللہ ﷺ کی فضیلت اور مرتبہ واضح کیا تاکہ ان لوگوں کی رائے پختہ ہو جائے اور وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا رویہ اختیار کریں، چنانچہ ابو طالب نے ایک قصیدہ کہا:

> ”جب کبھی قریش کسی قابل فخر کام کے لیے اکٹھے ہوتے تو ان میں بنی عبد مناف ان کی جان اور روح رواں رہے، پھر جب ان میں سے بنی عبد مناف کے شرفاء کا شمار کیا گیا تو ان میں سے بڑے مرتبے والے اور بنو ہاشم کے سرکردہ افراد بھی نکلے۔ اور جب کبھی بنو ہاشم نے فخر کیا تو ان میں سے محمد (ﷺ) ہی منتخب ہوئے جو اس قبیلے کی جان اور بڑے مرتبے والے نکلے۔ قریش کے اچھے اور برے تمام

---

[1] فقہ السیرۃ النبویۃ للدکتور الغضبان، ص: 183.

> لوگوں نے ایک دوسرے کو ہماری مخالفت پر ابھارا، تاہم انھیں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی بلکہ ان کی متانت اور عقلیں چلی گئیں۔ ہمیشہ سے ہماری حالت یہ رہی ہے کہ ہم کسی ظلم کو جاری نہیں رہنے دیتے۔ جب کبھی لوگوں نے تکبر سے اپنے گال ٹیڑھے کیے تو ہم انھیں سیدھا کرتے رہے۔“[1]

جب ابوجہل نے ابوطالب کی اس پناہ کو توڑنا چاہا تو حمزہ (رضی اللہ عنہ) نے کمان مار کر اس کا سر پھوڑ دیا اور کہا: ”تو محمد (ﷺ) کی شان میں نازیبا الفاظ کہتا ہے، حالانکہ میں اس کے دین پر ہوں۔ اگر تجھ میں ہمت ہے تو دوبارہ ایسی حرکت کر کے دکھا۔“

یہ عجیب واقعہ تھا کہ جاہلیت کے پرستار اس شخص کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے جو ان کے معبودوں کو برا کہتا، ان کے دین میں عیب نکالتا اور انھیں بیوقوف گردانتا تھا، جبکہ وہ اس جاہلی جذبے کی بنا پر اپنی جانیں قربان کرنے اور جنگی معرکوں اور لڑائیوں میں کودنے کو تیار ہو جاتے تھے اور محمد (ﷺ) کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی تھی۔

جب ابوطالب کو عرب کے عام لوگوں کا خوف ہوا کہ کہیں وہ آپ کے اور آپ کی قوم کے پیچھے نہ پڑ جائیں تو انھوں نے وہ قصیدہ کہا جس میں انھوں نے حرم مکہ، نیز اپنے اس رتبے کی پناہ لی جو انھیں وہاں کی سکونت کے سبب حاصل تھا اور اپنی قوم کے بلند مرتبہ لوگوں پر اپنی محبت جتائی اور اپنے اشعار میں یہ بھی بتایا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو دشمن کے حوالے کرنے والے یا آپ کو کسی بڑے لالچ کے عوض کبھی چھوڑنے والے نہیں حتی کہ وہ آپ ﷺ کی حفاظت میں خود بھی ہلاک ہو جائیں۔ ابوطالب نے کہا:

> ”جب میں نے قوم کو دیکھا کہ ان میں محبت نہیں رہی اور انھوں نے تمام تعلقات اور رشتوں کو توڑ دیا ہے۔ انھوں نے ہم سے کھلی دشمنی اور ایذا رسانی شروع کی اور ہم سے الگ ہو جانے والے دشمن کی بات مانی۔ انھوں نے ہمارے خلاف تہمت زدہ

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 269/1.

لوگوں سے معاہدے کیے جو ہماری پیٹھ پیچھے غصے سے انگلیاں چباتے ہیں۔ میں بذات خود ایک لچکیلے نیزے اور گزرے ہوئے سرداروں کی وراثت سے ملی ہوئی ایک چمکیلی تلوار لے کر ان کے مقابلے میں ڈٹ گیا۔ اور میں نے اپنی قوم اور اپنے بھائیوں کو بیت اللہ کے پاس بلوایا اور اس کی سرخ دھاریوں والی چادریں پکڑ لیں۔“[1]

ابو طالب نے بیت اللہ اور اس کی دیگر مقدس اشیاء کے ساتھ اللہ کی پناہ پکڑی اور اللہ کے نام کی قسم اٹھا کر کہا کہ وہ کبھی محمد (ﷺ) کا ساتھ نہیں چھوڑے گا اگرچہ خون کی ندیاں بہہ جائیں اور تمام قبائل قریش سے نبرد آزما ہونا پڑے۔

”بیت اللہ کی قسم! تم نے غلط خیال کیا کہ ہم محمد (ﷺ) کے متعلق مغلوب ہو جائیں گے، حالانکہ ابھی تک ہم نے ان کے بچاؤ کے لیے نہ نیزہ زنی کی ہے اور نہ تیراندازی، تم نے غلط خیال کیا کہ ہم انھیں تمھارے حوالے کر دیں گے، ہرگز نہیں، حتی کہ ہم ان کے اردگرد پچھاڑ دیے جائیں گے اور اپنے بیوی بچوں کو بھول جائیں گے۔ تمھارے مقابلے کے لیے ہتھیار بند لوگ ایسے اٹھیں گے جیسے پانی لے جانے والی اونٹنیاں آواز پیدا کرنے والی پکھالوں (بڑے مشکیزوں) کا بوجھ لیے اٹھتی ہیں۔“

ابو طالب نے اپنے اشعار میں بنو عبد مناف کے زعماء کو ان کے نام لے کر دھمکایا اور لعن طعن کی، چنانچہ انھوں نے عتبہ بن ربیعہ سے کہا:

”اے عتبہ! ہم سے ایسی دشمنی رکھنے والے کی بات پر توجہ نہ دے جو بہت حاسد، بہت جھوٹا، بغض رکھنے والا اور فسادی ہے۔“

ابو طالب نے ابو سفیان بن حرب کے بارے میں کہا:

”ابو سفیان میرے پاس سے منہ پھیر کر یوں گزر گیا جیسے وہ یمن کے بڑے بڑے رئیسوں میں سے کوئی رئیس ہو۔ وہ اونچے مقامات اور سرد پانی کی جگہوں کی طرف

---

[1] السیرة النبویة لابن هشام: 273/1.

بھاگ جاتا ہے اور دعویٰ یہ ہے کہ میں تم سے غافل نہیں۔“ [1]

اور بنونوفل کے سردار مطعم بن عدی سے کہا:

”اے مطعم! میں نے تجھے کبھی بے یارومددگار نہیں چھوڑا، نہ خطروں کے وقت اور نہ بڑے اہم معاملوں میں۔ اے مطعم! لوگوں نے تجھ سے سخت برتاؤ کیا لیکن میں جب تن دہی سے تیرا پیچھا کروں گا تو تو چھوٹ نہ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے بنوعبدشمس اور بنونوفل کو ایسی بُری سزا دے کہ اس کی تکلیف فوری پہنچے، آئندہ کے لیے نہ چھوڑی جائے۔“ [2]

نبی ﷺ نے اپنے چچا کو اپنے دفاع کے لیے اپنی طرف مائل کر کے ایک عظیم مدد حاصل کرلی جو عربوں کے قبائلی رسم و رواج کے مطابق تھی۔ آپ نے اپنے خاندان کی مکمل حمایت حاصل کرلی اور ہر قسم کی زیادتی سے محفوظ ہوگئے اور آپ ﷺ کو فکر و حرکت کی آزادی نصیب ہوئی۔

نبی ﷺ کے اس اقدام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جس معاشرے میں رہتے تھے وہاں کے عادات و اطوار سے خوب واقف تھے۔ آپ کے اس طریقے میں تمام داعیوں کے لیے سبق پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے معاشرے اور قبائل سے ربط ضبط اور اللہ کے دین کی خدمت کے لیے ان کے قوانین اور سماجی ضابطوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

دعوت اسلامی میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش اور نتائج

مکہ کے مشرک نبی ﷺ کی دعوت میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگے اور اس غرض سے انھوں نے ذرائع ابلاغ کی جنگ یا میڈیا وار کا آغاز کیا جس کا لیڈر ولید بن مغیرہ تھا۔ اس کے پاس قریش کے چند لوگ جمع ہوئے کیونکہ وہ ان سب میں سے عمر رسیدہ تھا۔ حج کا موسم قریب آچکا تھا، ولید نے ان سے کہا:

---

[1] فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 212. [2] فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 212.

’’اے گروہ قریش! حج کا موسم قریب آچکا ہے۔ عنقریب عرب کے مہمان تمھارے پاس آئیں گے۔ انھوں نے تمھارے اس ساتھی (محمد) کا حال سن رکھا ہے۔ پس تمھیں چاہیے کہ اس کے متعلق ایک متفقہ رائے قائم کرلو۔ ایسا نہ ہو کہ تم میں باہم اختلاف ہو اور تم ایک دوسرے کو جھٹلانے اور ایک دوسرے کی بات کا رد کرنے لگو۔‘‘

قریش: ’’اے ابوعبد شمس! تم ہی کچھ کہو اور ایسی رائے کا اظہار کرو کہ ہم سب وہی کہیں۔‘‘

ولید: ’’نہیں، تم کچھ کہو، میں سنتا ہوں۔‘‘

قریش: ’’ہم کہیں گے کہ وہ کاہن ہے۔‘‘

ولید: ’’نہیں، اللہ کی قسم! وہ کاہن نہیں، ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے۔ وہ کاہنوں کا گنگنانا یا ان کی قافیہ پیمائی نہیں۔‘‘

قریش: ’’پھر ہم اسے دیوانہ کہیں گے۔‘‘

ولید: ’’نہیں، وہ دیوانہ بھی نہیں۔ ہم نے جنون کو دیکھا ہے اور اسے جانتے ہیں۔ اس کی حالت محض گنگنانے کی نہیں ہے، نہ خلجان ہے اور نہ شیطانی وسوسہ ہے۔‘‘

قریش: ’’تب ہم اسے شاعر کہیں گے۔‘‘

ولید: ’’وہ شاعر بھی نہیں۔ ہم شعر کی تمام اقسام: رِجز، ہَزَج، قَرِیض، مَقْبُوض و مَبْسوط کو جانتے ہیں۔ وہ شعر بھی نہیں۔‘‘

قریش: ’’پھر جادوگر کہیں گے۔‘‘

ولید: ’’جادوگر بھی نہیں۔ ہم نے بڑے بڑے جادوگر اور ان کے جادو دیکھے ہیں۔ اس میں ان کا پھونکیں مارنا ہے نہ ان کا گرہیں دینا ہے۔‘‘

قریش: ’’اے ابوعبد شمس! پھر ہم کیا کہیں؟‘‘

ولید: ’’واللہ! اس کی بات میں ایک قسم کی شیرینی ہے۔ اس کی جڑیں بہت شاخوں والی ہیں اور زمین میں پیوست ہیں اور اس کی شاخیں پھلدار ہیں۔ تم اپنی ان تمام باتوں سے

جو کچھ کہو گے اس کا جھوٹا ہونا ظاہر ہو جائے گا۔ ہاں، زیادہ سے زیادہ تم یہی بات کہہ سکتے ہو کہ وہ ایسا جادوگر ہے جس کے ذریعے باپ، بیٹے، بھائی، میاں، بیوی، فرد اور خاندان کے درمیان جدائی پڑ جاتی ہے۔‘‘[1]

اللہ تعالیٰ نے ولید بن مغیرہ کے بارے میں یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ○ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ○ وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًا ○ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا ○ ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ ○ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا ○ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ○ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ○ فَقُتِلَ كَیْفَ قَدَّرَ ○ ثُمَّ قُتِلَ كَیْفَ قَدَّرَ ○ ثُمَّ نَظَرَ ○ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ○ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ○ فَقَالَ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ یُّؤْثَرُ ○ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ○ سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ ○﴾

’’مجھے اور اس کو (تنہا) چھوڑ دیجیے جسے میں نے اکیلا ہی پیدا کیا اور اسے مال وافر دیا اور حاضر باش بیٹے (دیے) اور اس کے لیے خوب فراخی کا سامان کیا، پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں (اسے) مزید دوں، ہرگز نہیں! بلاشبہ وہ ہماری آیات سے سخت عناد رکھتا ہے، میں اسے جلد مشکل چڑھائی چڑھاؤں گا، بے شک اس نے غور و فکر کیا اور اندازہ لگایا پس وہ مارا جائے! کیسا اندازہ لگایا؟ پھر وہ مارا جائے! کیسا اندازہ لگایا؟ پھر اس نے دیکھا، پھر تیوری چڑھائی اور منہ بسورا، پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا، پھر اس نے کہا: یہ (قرآن) تو صرف جادو ہے جو پہلے سے چلا آرہا ہے، یہ تو صرف ایک بشر کا قول ہے، میں جلد اسے سقر (جہنم) میں ڈالوں گا۔‘‘[2]

مذکورہ قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کے خلاف اعصابی جنگ بلا سوچے سمجھے نہ تھی بلکہ اس منصوبے کو قریشی سرداروں نے بڑی دقت اور پختگی سے تیار کیا تھا۔ اس میں ابلاغیات

---

[1] السیر والمغازي لابن إسحاق: 151,150، و تهذیب السیرة: 1/65,64، و دلائل النبوة للبیهقي: 2/200، و السیرة النبویة لابن هشام: 1/289,288. [2] المدّثر 74/11-26.

کے مسلمہ اصولوں کا لحاظ رکھا گیا تھا جن کی آج کل کے جدید دور میں بھی پاسداری کی جاتی ہے جیسا کہ مناسب وقت، چنانچہ مشرکین نے پروپیگنڈے کے لیے موسم حج میں لوگوں کے جمع ہونے کا وقت چنا۔ اسی طرح آپس میں مکمل اتفاق اور عدم اختلاف وغیرہ بھی اس مہم کا حصہ تھا اور یہ سب اس لیے کہ اس میڈیا وار میں حملہ منظّم ہو اور حُجّاج کے وفود پر اس کے مکمل اثرات مرتب ہوں اور مطلوبہ نتائج حاصل کیے جاسکیں۔ مناسب وقت کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایسی مناسب جگہ کا بھی انتخاب کیا جہاں تمام حجاج کے وفود پہنچتے ہوں۔

مذکورہ واقعے سے نبی ﷺ کی عظمت اور قرآن مجید کی اثر آفرینیوں کا پتہ بھی چلتا ہے۔ ولید بن مغیرہ قریش کا بڑا رہنما تھا مگر اکابر قریش کی متکبرانہ عادات کے باوجود وہ قرآن کریم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا دل نرم ہوا اور اس نے قرآن کی عظمت کا بڑے بلیغ انداز میں اعتراف کیا۔ وہ دین حق کی عقلی اپیل کو تسلیم کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔[1]

پروپیگنڈے کی یہ منظّم جنگ نبی ﷺ کی دعوت کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکی بلکہ آپ ان دشمنوں کے اس حصار کو توڑنے میں کامیاب رہے جنھوں نے نہ صرف اہل مکہ کو آپ سے نفرت دلانے اور آپ کی شہرت کو داغدار کرنے کا ارادہ کیا ہوا تھا بلکہ وہ مکہ آنے والوں کو آپ کی تعلیمات سے متنفر کرنے، آپ کو ان تک اپنی بات پہنچانے سے روکنے اور آپ کی دعوت کا اثر ختم کرنے کے لیے ہر آنے والے سے آگے بڑھ کر ملاقات کرتے تھے۔

نبی ﷺ نے اپنے دعوتی مشن میں عظیم کامیابی حاصل کی۔ آپ اپنے ہر مخاطب کے دل میں عمدہ اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے، آپ جس سے بھی ملاقات کرتے، اس سے گفتگو سے قبل ہی اس پر آپ کے رعب، عظمت اور وقار کا اثر نظر آنے لگتا، پھر جب آپ اس سے اپنی بلیغ گفتگو فرماتے تو وہ آپ کی عمدہ گفتگو سنتے ہی اس کا اسیر ہو جاتا جو عقل سلیم کے مطابق ہوتی اور اس میں محبت اور خلوص کا جذبہ اور وحی الٰہی کے مطابق

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 123/1.

خلوص نیت کے ساتھ امت کی ہدایت کا وافر سامان ہوتا۔[1]

نبی ﷺ کی اپنی پرتاثیر گفتگو کی طاقت اور عمدہ اخلاق سے کفارِ قریش کی قائم کردہ مضبوط دیواروں کے گرنے کی مثالیں اس وقت سامنے آتی ہیں جب ہم ضماد ازدی، طفیل بن عمرو دوسی، ابو ذر اور عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہم جیسی شخصیات کا آپ ﷺ کی گفتگو سے متاثر ہوکر اسلام قبول کرنے کا ذکر سنتے ہیں۔ اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

ضِمَاد اَزْدی رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام: ضِمَاد ازدی مکہ آئے اور نبی ﷺ کے خلاف مشرکین کے پروپیگنڈے کا شکار ہوگئے۔ یہاں تک کہ قریشی سرداروں کی طرف سے لگائی گئی جنون کی تہمت کی وجہ سے ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ نعوذ باللہ آپ کو دیوانگی کا مرض لاحق ہے۔ ضِمَاد ازد شنوءہ سے تعلق رکھتے تھے اور دیوانگی کا علاج جانتے تھے، جب انھوں نے مکہ کے ان کم عقلوں سے سنا کہ آپ کو نعوذ باللہ جنون کی بیماری ہے تو وہ بولے: ''کاش! اس آدمی سے میری ملاقات ہوجائے۔ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ اسے میرے ہاتھوں شفایاب فرمادے۔''

ضِمَاد کہتے ہیں کہ ان کی ملاقات نبی ﷺ سے ہوگئی اور انھوں نے کہا: ''اے محمد! (ﷺ) میں اس بیماری کا علاج کرتا ہوں اور اللہ جسے چاہیں میرے ہاتھ سے شفا بھی عطا فرماتے ہیں۔ کیا تو چاہتا ہے کہ میں تجھے اس بیماری کا دم کروں؟'' نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهُ وَ نَسْتَعِينُهُ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَ رَسُولُهُ، أَمَّا بَعْدُ»

''بلاشبہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ ہم اسی کی تعریف کرتے ہیں اور اس سے مدد مانگتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت نصیب فرمائے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 1/127-137.

اللہ گمراہ رکھے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور بلاشبہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں، اما بعد۔“

ضِمَاد عرض کرنے لگا: ”آپ مجھے یہ کلمات دوبارہ سنائیے۔“ تب نبی ﷺ نے تین مرتبہ یہ کلمات دہرائے۔ ضِمَادْ نے کہا: ”میں نے کاہنوں، جادوگروں اور شعراء کے کلام سنے ہیں لیکن آپ کے ان کلمات جیسے الفاظ آج تک نہیں سنے۔ ان میں تو سمندر کی سی گہرائی اور گیرائی ہے۔“ پھر انھوں نے نبی ﷺ سے عرض کیا: ”اپنا ہاتھ بڑھائیے، میں آپ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کرنا چاہتا ہوں۔“ جب ضِمَاد ازدی رضی اللہ عنہ نے بیعت کر لی تو نبی ﷺ نے فرمایا: «وَعَلٰى قَوْمِكَ؟» ”اپنی قوم کے بارے میں بیعت کرتے ہو؟“ ضِمَاد ازدی رضی اللہ عنہ نے کہا: ”ہاں، اپنی قوم کے بارے میں بھی بیعت کرتا ہوں۔“

مدینہ طیبہ میں جب اسلامی ریاست قائم ہوگئی اور نبی ﷺ کے لشکر مختلف اطراف میں روانہ ہونے لگے تو ایک لشکر ضماد رضی اللہ عنہ کی قوم پر سے گزرا، لشکر کے کمانڈر نے لشکر میں اعلان کیا: تم میں سے کسی نے اس قبیلے کی کوئی چیز تو نہیں اٹھائی؟ ایک آدمی نے کہا: میں نے ان کا ایک لوٹا اٹھایا ہے۔ اس پر کمانڈر نے کہا: ”وہ لوٹا انھیں واپس کردو۔ یہ تو ضِمَاد رضی اللہ عنہ کی قوم ہے۔“[1]

سیدنا ضماد رضی اللہ عنہ کے قصے سے حاصل شدہ اسباق و نتائج: ① قریشیوں کے پروپیگنڈے اور نبی ﷺ کی شخصیت کو متنازعہ بنانے کی کوشش اور آپ ﷺ پر دیوانگی کے الزام نے ضِمَاد ازدی رضی اللہ عنہ کو بغرض علاج آپ کے پاس پہنچا دیا اور یہ ملاقات ان کی اپنی روحانی تسکین کا ذریعہ بن گئی۔ یوں مکہ میں نبی ﷺ کے خلاف برپا ہونے والی سازش کی یہ جنگ ضماد ازدی اور اس کے قبیلے کے اسلام لانے کا سبب بنی۔

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 868، ومسند أحمد: 302/1.

② نبی ﷺ کے دو وصف صبر اور برد باری کا اظہار ہوتا ہے۔ ضماد ازدی رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو دیوانگی کے مرض کا علاج کرنے کی پیشکش کی اور یہ ناراضی کا مقام تھا لیکن رسول اللہ ﷺ نے نرمی اور برد باری کا مظاہرہ کیا جس سے ضماد ازدی رضی اللہ عنہ کے دل میں نبی ﷺ کا احترام پیدا ہوا۔

③ ان الفاظ کی اہمیت اجاگر ہوئی جو نبی ﷺ نے اپنی گفتگو سے پہلے استعمال کیے۔ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی تعظیم و تمجید اور خالص اسی کی عبادت پر دلالت کرتے ہیں، چنانچہ نبی ﷺ سے منقول ہے کہ آپ اپنے اکثر خطبات اور مواعظ کی ابتدا میں یہی الفاظ ارشاد فرماتے تھے۔

④ ضماد ازدی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی فصاحت اور زور بیان سے متاثر ہوئے کیونکہ یہ فرمودات عالیہ ایک ایسے دل سے صادر ہوئے تھے جو ایمان و یقین اور حکمت سے پر تھا، لہٰذا آپ کے الفاظ ضماد کے دل کی گہرائی تک پہنچے اور ان کے ایمان لانے کا سبب بن گئے۔

⑤ ضماد ازدی رضی اللہ عنہ کا اس قدر جلد اسلام لانے پر تیار ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اور جب دل کسی بھی داخلی یا خارجی دباؤ میں نہ ہو تو اکثر متأثر ہو کر قبولیت کے لیے مستعد ہو جاتا ہے اور اس میں دعوت پیش کرنے والے کی مؤثر بات یا اس کی عمدہ سیرت کا بھی دخل ہوتا ہے۔

⑥ اسلامی دعوت کے پھیلنے پر نبی ﷺ کے حرص کا اندازہ ہوا کیونکہ جب آپ ﷺ نے ضماد ازدی کا سچا ایمان، اسلام قبول کرنے کے لیے ان کی بیباکی اور ان کی طرف سے اسلام پر کامل اطمینان کا اظہار دیکھا تو ان سے ان کی قوم کی طرف سے بھی بیعت لے لی۔

⑦ دعوت اسلامی کی اہمیت اجاگر ہوئی۔ نبی ﷺ نے اس ملاقات کو دعوت اسلام پیش کرنے کا وسیلہ بنایا اور ضماد سے دین پر قائم رہنے کی بیعت لی اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان سے اپنی قوم کو اسلامی دعوت پیش کرنے پر بھی بیعت لی۔

⑧ اسلام میں سبقت حاصل کرنے والوں سے محبت اور حفظ مراتب کا سبق ملتا ہے، چنانچہ

اسلامی لشکر کے کمانڈر نے کہا تھا: ”اس لوٹے کو واپس کر دو یہ تو ضماد ازدی رضی اللہ عنہ کی قوم کے لوگ ہیں۔“ [1]

⑨ مذکورہ قصے میں بعض ایسے تربیتی ذرائع کا تذکرہ بھی ہے جن کا رسول اللہ ﷺ نے استعمال فرمایا، مثلاً: گفتگو میں متانت، افہام و تفہیم کا اسلوب اور بلاواسطہ رہنمائی کا قرینہ۔

نبی ﷺ کی شخصیت کی چند عظیم صفات بھی ظاہر ہوئیں جن میں تربیت کا جذبہ، بردباری، صبر اور خیر کثیر کی طرف مائل ہونا سرفہرست ہیں۔

عَمرو بن عَبَسہ رضی اللہ عنہ اسلام کی چھاؤں میں: عمرو بن عبسہ السُّلَمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جاہلی دور میں میرا گمان تھا کہ لوگ گمراہی پر ہیں اور ان کے سامنے کوئی واضح ضابطۂ حیات نہیں۔ یہ لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ میں نے اس دوران میں ایک شخصیت کے بارے میں سنا جو لوگوں کو مختلف خبریں دیتا تھا۔ میں اپنی سواری پر سوار ہوا اور مکہ پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف ان کی قوم بڑی دلیر ہوئی ہے اور آپ ﷺ مخفی انداز اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ میں مکہ میں بڑی لطافت اور ادب سے آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچا اور سوال کیا: ”آپ کیا ہیں؟“

رسول اللہ ﷺ: «أَنَا نَبِيٌّ» ”میں نبی ہوں۔“

عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ: ”کیسا نبی؟“

رسول اللہ ﷺ: «أَرْسَلَنِي اللّٰهُ» ”مجھے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔“

عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ: ”کس چیز کے ساتھ بھیجا ہے؟“

رسول اللہ ﷺ: «أَرْسَلَنِي بِصِلَةِ الْأَرْحَامِ وَكَسْرِ الْأَوْثَانِ وَأَنْ يُّوَحَّدَ اللّٰهُ لَا يُشْرَكُ بِهِ شَيْءٌ» ”مجھے اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی کرنے، بتوں کو ختم کرنے اور اللہ کی توحید کا ڈنکا بجانے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانے کا پیغام دے کر بھیجا ہے۔“

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 133,132/1، و الوحي و تبليغ الرسالة للدكتور يحيٰى اليحيٰى، ص: 113-111.

عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ: ”اس عقیدے پر آپ کے ساتھ کون لوگ کاربند ہیں؟“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم: «حُرٌّ وَّ عَبْدٌ» ”ایک آزاد اور ایک غلام۔“ اور ان دنوں آپ پر ایمان لانے والے ابوبکر اور بلال رضی اللہ عنہما تھے۔

عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ: ”میں بھی آپ کی اتباع کرنا چاہتا ہوں۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: «إِنَّكَ لَا تَسْتَطِيعُ ذٰلِكَ يَوْمَكَ هٰذَا أَلَا تَرٰى حَالِي وَحَالَ النَّاسِ؟ وَلٰكِنِ ارْجِعْ إِلٰى أَهْلِكَ، فَإِذَا سَمِعْتَ بِي قَدْ ظَهَرْتُ فَأْتِنِي»

”تم اس وقت اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ کیا تم میرا اور لوگوں کا حال نہیں دیکھ رہے؟ اس لیے تم واپس چلے جاؤ، جب میرے بارے میں سنو کہ مجھے اللہ نے غلبہ عطا فرما دیا ہے تو میرے پاس آنا۔“

عَمرو بن عَبَسہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس وقت میں لوٹ آیا، پھر اللہ کے رسول مدینہ طیبہ تشریف لے آئے۔ دریں اثنا میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ مقیم رہا اور لوگوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا یہاں تک کہ میرے پاس یثرب سے کچھ لوگ آئے۔ میں نے ان سے پوچھا: ”اس شخص کے بارے میں تم کیا جانتے ہو جو مدینہ میں آئے ہیں؟“ انھوں نے کہا: ”لوگ اس کی طرف دیوانہ وار لپک رہے ہیں۔ اس کی قوم نے اسے قتل کرنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔“ عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”میں مدینہ پہنچا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے مجھے پہچانا ہے؟“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «نَعَمْ! أَنْتَ الَّذِي لَقِيتَنِي بِمَكَّةَ» ”ہاں، تو وہی شخص ہے جو مجھ سے مکہ میں ملا تھا۔“

اسی حدیث میں ہے کہ عمرو رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز اور وضو کے بارے میں سوالات کیے۔[1]

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 832، و مسند أحمد: 112/4.

قصۂ عمرو بن عبسہ سے حاصل ہونے والے نتائج: ① عمرو بن عَبَسہ رضی اللہ عنہ دین حنیف کے پیروکار تھے اور زمانۂ جاہلیت میں بھی غیر اللہ کی عبادت کے منکر تھے۔

② مشرکین مکہ کی طرف سے نبی ﷺ کے خلاف برپا کی جانے والی میڈیا وار کے نتیجے میں عمرو بن عَبَسہ رضی اللہ عنہ آپ کے بارے میں تفصیل حاصل کرنا چاہتے تھے۔

③ قریش آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں بہت دلیر تھے اور بڑی سختی کرتے تھے۔ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے مکہ میں دیکھا کہ آپ چھپ کر دین کی تبلیغ کرتے تھے اور آپ کی قوم آپ کے خلاف دیدہ دلیری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

④ قدر ومنزلت والوں کے پاس حاضری میں انتہائی ادب ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بڑے ادب سے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

⑤ رسالت محمدیہ کی اساس دو چیزوں پر ہے: حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ نبی ﷺ نے فرمایا تھا: اللہ تعالیٰ نے مجھے صلہ رحمی کرنے اور بتوں کو پاش پاش کرنے کے لیے مبعوث فرمایا ہے۔ آپ کا یہ فرمان صلہ رحمی کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ صلہ رحمی جیسا عظیم وصف دعوت اسلامی کا ابتدا ہی سے حصہ رہا ہے۔ نبی ﷺ کے اس فرمان میں بتوں کی شدید مذمت پائی جاتی ہے، حالانکہ عرب کے ہاں یہ انتہائی مقدس سمجھے جاتے تھے۔ معلوم ہوا کہ جاہلیت کے نشانات کو ختم کرنا ضروری ہے اور اسلامی دعوت اس وقت تک قائم ہو سکتی ہے نہ پھیل سکتی ہے جب تک کفر وشرک کی علامتیں مٹا نہ دی جائیں۔

⑥ نبی ﷺ نے جلد از جلد بتوں کو ختم کرنے کا عندیہ ظاہر کیا، حالانکہ آپ اس وقت بتوں کو ختم کرنے کی قدرت بھی نہ رکھتے تھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کسی دینی امر کو لوگوں تک پہنچانے میں دیر نہیں ہو سکتی چاہے وقتی طور پر اس کے نفاذ میں رکاوٹ ہی کیوں نہ ہو۔ وہ داعی جو لوگوں کو صرف ان دینی امور سے آگاہ کرتے ہیں جن کا نفاذ ہو سکتا ہو اور ایسے امور سے آگاہ نہیں کرتے جس کے نفاذ میں جہاد اور ٹکراؤ کی ضرورت ہو ان کی دعوت ناقص ہے۔ وہ نبی ﷺ کے اسوہ سے ہٹے ہوئے ہیں کیونکہ آپ ﷺ نے تو جاہلیت اور

اس کے بڑے بڑے سرکشوں کا مقابلہ کیا، حالانکہ اس وقت آپ کے مددگار بھی کم تھے اور مکہ شہر کی مکمل سرداری دشمن کے ہاتھ میں تھی۔[1]

⑦ نبی ﷺ اپنے صحابہ کی خیر خواہی کے حریص تھے، ان کے لیے پر امن فضا پیدا کرنا، امن والی سرزمین کی طرف انھیں لے جانا اور انھیں مشکلات سے دور رکھنا آپ کا مقصود تھا، چنانچہ نبی ﷺ نے عَمرو بن عَبَسہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ جب تو میرے غلبے کا سنے تب مجھے ملنا۔

⑧ نبی ﷺ اپنے اصحاب کی خبر گیری رکھتے تھے اور انھیں پیش آنے والے واقعات یاد رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تو وہی آدمی ہے جو مجھ سے مکہ میں ملا تھا۔

⑨ نبی ﷺ ہر کسی کو اپنے پیروکاروں کی فہرست نہ دیتے تھے کیونکہ اس میں سائل کے لیے کوئی مصلحت بھی نہ تھی اور نہ یہ فہرست ہر ایک تک پہنچانا آپ کی ذمہ داری تھی، اس لیے جب عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے آپ کے پیروکاروں کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''ایک آزاد اور ایک غلام۔''

ابن کثیر رحمہ اللہ کے قول کے مطابق یہ تَوْرِیَہ (اشارتاً ذومعنی بات کہنا) تھا کیونکہ یہ الفاظ اسم جنس ہیں جنھیں عمرو بن عَبَسہ نے اسم عین، یعنی متعین اشخاص سمجھ لیا۔[2]

⑩ نبی ﷺ کا یہ فرمان کہ تم واپس چلے جاؤ۔ جب سنو کہ مجھے غلبہ حاصل ہوا ہے تو میرے پاس آنا، سے ہم دعوت کے میدان میں ایک اہم سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ مشقت اور ایذا رسانی کی فضا میں اسلام کے پیروکاروں اور ارکان جماعت کو جمع کر لینا دراصل مقصود نہیں، چنانچہ نبی ﷺ نے عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کو اپنی قوم کی طرف واپس جانے کا حکم دیا، نیز آپ ﷺ نے صحابۂ کرام کو حبشہ کی طرف دو دفعہ ہجرت کرنے کی اجازت دی جس سے پتہ چلتا ہے کہ دعوت اسلامی کے دوران مسلمانوں کی مشکلات میں کمی، ان کا خطرے کی جگہوں سے دور رہنا، اسلامی قوت کو صیغۂ راز میں رکھنا، تحریک کے قائد کو بلاوجہ مشغول رکھنے سے اجتناب، راز داری

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 109/1. [2] الوحي و تبليغ الرسالة للدكتور يحيى اليحيى، ص: 106-109.

کا اہتمام، جس جگہ ہجرت کا حکم ہو اس سے استفادہ اور مستقبل کے لیے تیاری، دعوت اسلامی کے تسلسل کا لحاظ رکھنا اور پیروکاروں کا مجموعی استیصال سے بچاؤ جیسے امور کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام: اس میڈیا وار کی وجہ سے مسلمان ہونے والوں میں طُفَیل بن عمرو دَوْسی رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں جن کا مفصل قصہ کتب سیرت میں منقول ہے۔[1]

---

[1] حضرت طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ اپنے قبول اسلام کا واقعہ خود بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: ایک دفعہ میں مکہ مکرمہ آیا جبکہ رسول اللہ ﷺ بھی مکہ ہی میں تھے۔ قریش کے چند لوگ میرے پاس آئے...... یاد رہے کہ حضرت طفیل رضی اللہ عنہ زبردست شاعر اور اپنی قوم کے نمائندہ تھے...... اور کہنے لگے: ’’آپ ہمارے شہر میں آئے ہیں (اور آپ کی خیر خواہی ہمارا فرض ہے۔) یہ شخص (محمد ﷺ) ہمارے دین کو چھوڑ کر ہم سے علیحدہ ہو گیا ہے اور ہماری جماعت کے اتحاد کو پارہ پارہ کر رہا ہے۔ اس کی باتوں میں جادو ہے۔ یہ باپ بیٹے، بھائیوں اور میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالتا ہے۔ ہمیں آپ کے اور آپ کی قوم کے بارے میں خدشہ ہے۔ لہٰذا آپ اس شخص سے نہ تو ملاقات کریں اور نہ اس کی کوئی بات سنیں۔‘‘ طفیل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ’’اللہ کی قسم! وہ لوگ مجھے اتنا ڈراتے رہے کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ ان سے نہیں ملوں گا۔‘‘ کہتے ہیں صبح جب میں مسجد حرام پہنچا تو رسول اللہ ﷺ بیت اللہ کے قریب کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ میں آپ کے قریب کھڑا ہو گیا، اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی یہی تھی کہ میں آپ ﷺ کا کلام سنوں۔ میں نے سنا تو وہ ایک عمدہ کلام تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں ایک اچھا بھلا شاعر ہوں، مجھے اچھے اور گھٹیا کلام کا فرق معلوم ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ میں آپ کا کلام نہ سنوں۔ اگر اچھا ہوا تو لے لیں گے ورنہ چھوڑ دیں گے۔ کہتے ہیں: میں کچھ دیر کے لیے وہیں ٹھہرا رہا۔ پھر رسول اللہ ﷺ اپنے گھر تشریف لے گئے تو میں بھی آپ کے پیچھے ہو لیا۔ میں نے آپ ﷺ سے عرض کی: ’’اے محمد (ﷺ)! آپ کی قوم نے تو مجھے بہت کچھ کہا لیکن اللہ کی مرضی تھی کہ میں آپ کا کلام سنوں، چنانچہ میں نے آپ کا عمدہ کلام سن لیا ہے۔ آپ مجھے بھی اپنی دعوت دیں۔‘‘ طفیل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور قرآن پاک کی آیات پڑھ کر سنائیں۔ اللہ کی قسم! میں نے زندگی میں کبھی اس سے اچھا کلام نہیں سنا تھا اور نہ ہی اس دین سے کوئی اچھا دین میں نے دیکھا تھا۔ (أسد الغابة: 40/2)

دکتور اکرم ضیاء عمری فرماتے ہیں: ''ان کے بارے میں صرف اتنا منقول ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کو حفاظت کی غرض سے اپنے قبیلے دوس کا قلعہ پیش کیا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا تھا۔[1]

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ طفیل رضی اللہ عنہ نے اپنی قوم کو اسلامی دعوت پیش کی تھی جس پر انھیں قوم کی طرف سے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ انھوں نے نبی ﷺ سے اپنی قوم کے خلاف بددعا کرنے کی استدعا کی لیکن آپ ﷺ نے ان کے لیے ہدایت کی دعا فرمائی۔[2]

نبی ﷺ ان دنوں مدینہ منورہ میں تھے۔[3]

عمران رضی اللہ عنہ کے والد حصین رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام: قریش حصین رضی اللہ عنہ کی بڑی عزت کرتے تھے، وہ ان کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''ہماری طرف سے اس آدمی سے گفتگو کیجیے، یہ ہمارے معبودوں کا اچھا ذکر نہیں کرتا اور انھیں برا بھلا کہتا ہے۔'' چنانچہ وہ حصین رضی اللہ عنہ کی معیت میں نبی ﷺ کے دروازے پر آئے۔

نبی ﷺ نے فرمایا: «أَوْسِعُوا لِلشَّيْخِ» ''اس بزرگ کے لیے جگہ بناؤ۔'' اس وقت حصین کے بیٹے عمران اور دیگر مسلمان وہاں موجود تھے۔

حصین نے کہا: ''اس خبر کی کیا حقیقت ہے جو ہمارے پاس پہنچی ہے کہ تو ہمارے بتوں کی برائی بیان کرتا ہے اور انھیں گالی دیتا ہے، حالانکہ تیرا باپ تو اپنے آباء و اجداد کے دین پر قائم تھا اور عقل مند آدمی تھا؟''

نبی ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ أَبِي وَأَبَاكَ فِي النَّارِ» ''اے حصین! میرا اور تیرا باپ دونوں آگ میں جائیں گے۔''

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 116. [2] صحيح البخاري، حديث: 2937، و صحيح مسلم، حديث: 2524. [3] السيرة النبوية لابن كثير: 76/2، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 146/1.

پھر آپ ﷺ نے سوال کیا: «كَمْ تَعْبُدُ مِنْ إِلٰهٍ؟»
''اے حصین! تو کتنے معبودوں کی عبادت کرتا ہے؟'' حصین ؓ نے کہا: ''سات زمین میں اور ایک آسمان میں ہے۔''

نبی ﷺ نے پوچھا: «فَإِذَا أَصَابَكَ الضُّرُّ مَنْ تَدْعُو؟» ''جب تجھے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کسے پکارتا ہے؟''

حصین ؓ نے کہا: ''اس خدا کو جو آسمان میں ہے۔''

نبی ﷺ نے پوچھا: «فَإِذَا هَلَكَ الْمَالُ مَنْ تَدْعُو؟» ''جب تیرے مال مویشی ہلاک ہوجائیں تب کس کو پکارتا ہے؟''

حصین ؓ نے کہا: ''جو آسمان میں ہے۔''

نبی ﷺ نے فرمایا: «فَيَسْتَجِيبُ لَكَ وَحْدَهٗ وَتُشْرِكُهُمْ مَّعَهٗ أَرَضِيتَهٗ فِي الشُّكْرِ أَمْ تَخَافُ أَنْ يَّغْلِبَ عَلَيْكَ» ''دیکھ تیری دعا کو وہ اکیلا قبول فرماتا ہے اور تو اس کے ساتھ غیروں کو شریک کرتا ہے۔ کیا تو دل سے اس کے شکر پر راضی ہے یا ڈرتا ہے کہ وہ تجھ پر غالب آجائے گا؟''

حصین نے کہا: ان دونوں میں سے کوئی بات بھی نہیں؟''

حصین ؓ مزید کہنے لگے: ''مجھے اس وقت یقین ہوگیا کہ میں نے زندگی میں آپ جیسے شخص سے گفتگو نہیں کی۔''

نبی ﷺ نے فرمایا: «يَا حُصَيْنُ! أَسْلِمْ تَسْلَمْ» ''اے حصین! مسلمان ہوجا، سلامتی پائے گا۔'' حصین ؓ نے کہا: ''میری قوم اور خاندان ہے۔ میں انھیں کیا جواب دوں گا؟''
نبی ﷺ نے فرمایا:

«قُلْ: اَللّٰهُمَّ أَسْتَهْدِيكَ لِأَرْشَدِ أَمْرِي وَ زِدْنِي عِلْمًا يَّنْفَعُنِي»

''اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت کا طلب گار ہوں تاکہ مجھے میرے معاملے میں

راہنمائی حاصل ہو اور مجھے ایسا علم عطا فرما جو میرے لیے نفع مند ہو۔‘‘

حصین رضی اللہ عنہ نے یہ کلمات ادا کر لیے تو ابھی وہ اپنی جگہ سے اٹھے بھی نہ تھے کہ مسلمان ہو گئے۔ اس وقت ان کے بیٹے عمران رضی اللہ عنہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنے باپ حصین رضی اللہ عنہ کے سر، ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیا۔ جب یہ منظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو رو پڑے اور فرمایا:

«بَكَيْتُ مِنْ صَنِيعِ عِمْرَانَ، دَخَلَ حُصَيْنٌ وَّهُوَ كَافِرٌ، فَلَمْ يَقُمْ إِلَيْهِ عِمْرَانُ وَلَمْ يَلْتَفِتْ نَاحِيَتَهُ، فَلَمَّا أَسْلَمَ قَضٰى حَقَّهُ، فَدَخَلَنِي مِنْ ذٰلِكَ الرِّقَّةُ»

’’میں عمران کے اس فعل پر آبدیدہ ہوا ہوں کہ اس کے باپ حصین جب یہاں آئے تو کافر تھے، عمران نے اس وقت اپنے باپ کا خیر مقدم نہیں کیا اور نہ اس کی طرف متوجہ ہوئے لیکن جب حصین مسلمان ہو گئے تو بیٹے نے اپنا حق ادا کیا، اس وجہ سے میرے دل میں رقت سی پیدا ہو گئی۔‘‘

پھر جب حصین رضی اللہ عنہ جانے لگے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: «قُومُوا فَشَيِّعُوهُ إِلٰى مَنْزِلِهِ» ’’اٹھو اور حصین رضی اللہ عنہ کو اس کے گھر تک چھوڑ کر آؤ۔‘‘ حصین رضی اللہ عنہ ابھی دروازے سے باہر نکلے ہی تھے کہ قریش نے دیکھتے ہی کہا: ’’یہ بے دین ہو گیا ہے اور سب اس سے دور چلے گئے۔‘‘ [1]

حصین رضی اللہ عنہ کو جس چیز نے اتنی جلدی اسلام لانے پر مجبور کیا وہ ان میں فطرتِ سلیمہ کی خوبی، قبول حق کی اچھی استعداد، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مضبوط دلائل اور آپ کی عمدہ گفتگو تھی۔ [2]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حصین رضی اللہ عنہ سے باہمی مکالمے کا انداز اپنایا تاکہ توحید ان کے دل کی

---

[1] الإصابة لابن حجر: 337/1، امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اسے مختصر بیان کیا ہے، دیکھیے: جامع الترمذي، حدیث: 3483، علامہ البانی رحمہ اللہ نے ترمذی کی حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ [2] فقه الدعوة الفردية للدكتور السيد محمد نوح، ص: 104.

گہرائیوں تک اتر جائے اور ہر قسم کے باطل نظریات ختم ہو جائیں۔

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اسلام کے سایۂ عاطفت میں: ابوذر رضی اللہ عنہ جاہلیت کی فضا کو ناپسند کرتے اور بتوں کی عبادت کے منکر تھے اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے ہر فرد کو برا خیال کرتے۔ اسلام لانے سے پہلے تین سال تک کسی قبلے کی تعیین کے بغیر نماز ادا کرتے رہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دین حنیف کے پابند تھے۔ جب انھوں نے مکہ میں نبی ﷺ کا ذکر خیر سنا تو کسی سے تحقیق کرنے کے بجائے خود عازم مکہ ہوئے۔ وہ رات کو مکہ پہنچے اور لیٹ گئے۔ انھیں علی رضی اللہ عنہ نے دیکھا اور محسوس کیا کہ یہ کوئی اجنبی ہے۔ علی رضی اللہ عنہ نے ان کی مہمانی کی اور ان سے کسی قسم کا سوال نہ کیا، پھر انھیں صبح کے وقت مسجد حرام میں چھوڑ کر چلے گئے۔ ابوذر وہاں شام تک رہے۔ شام کے وقت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں دوبارہ دیکھا اور ان کی مہمان نوازی کی، پھر تیسری رات بھی ایسا ہی ہوا۔ تیسری رات علی رضی اللہ عنہ نے ان سے آمد کا سبب دریافت کیا۔ جب سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اعتماد حاصل کر لیا تو بتایا کہ میں نبی ﷺ کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ”رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے برحق رسول ہیں۔ آپ صبح کے وقت میرے پیچھے چلتے آنا اور اگر مجھے آپ کے بارے میں کوئی خطرہ محسوس ہوا تو میں ٹھہر کر ایسا انداز اختیار کروں گا جیسے پانی انڈیل رہا ہوں اور اگر میں چل دوں تو میرے پیچھے چلتے رہنا۔“

ابوذر رضی اللہ عنہ علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے چلتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ کے پاس پہنچ گئے۔ انھوں نے نبی ﷺ کی گفتگو سنی اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

«اِرْجِعْ إِلٰی قَوْمِكَ فَأَخْبِرْهُمْ حَتّٰی يَأْتِيَكَ أَمْرِي»

”آپ اپنی قوم کی طرف واپس چلے جائیں۔ انھیں اپنے اسلام لانے کی خبر دیں اور میری طرف سے مزید حکم آنے کا انتظار کریں۔“

ابو ذر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ’’مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں تو اپنے قبولِ اسلام کا مکہ والوں کے درمیان ببانگ دہل اعلان کروں گا۔‘‘ ابو ذر رضی اللہ عنہ وہاں سے نکل کر مسجد حرام میں پہنچے اور بلند آواز سے بولے: ’’میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔‘‘ تمام لوگ یہ سن کر ان پر حملہ آور ہوئے یہاں تک کہ انھیں زمین پر گرا لیا۔ دریں اثنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ آئے اور لوگوں کو قبیلۂ غفار کے انتقام سے ڈرایا اور بتایا کہ شام کی طرف جانے والی تجارتی گزرگاہ، جو بنوغفار کے قریب سے گزرتی ہے، خطرے میں ہوگی، چنانچہ اس طرح عباس رضی اللہ عنہ نے ابو ذر رضی اللہ عنہ کو قریش کے پنجہ استبداد سے چھڑایا۔[1]

ابو ذر رضی اللہ عنہ نے خود مکہ آنے سے قبل اپنے بھائی کو مکہ روانہ کیا تھا تاکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آگاہی حاصل کرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنے اور واپس آئے۔ ان کا بھائی مکہ گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو سنی اور واپس آکر ابو ذر رضی اللہ عنہ کو خبر دی کہ وہ اچھے اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور ایسا کلام لائے ہیں جو شعر نہیں ہوسکتا۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ’’تیری بات سے میری تسلی نہیں ہوئی۔‘‘[2] اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ اس وقت ان کے بھائی نے کہا: ’’آپ مکہ والوں سے محتاط رہیے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت بغض رکھتے ہیں اور ان سے سختی سے پیش آتے ہیں۔‘‘

قصۂ ابو ذر رضی اللہ عنہ سے حاصل ہونے والے نتائج اور فوائد: ① نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر تمام قبائل میں عام ہو چکا تھا اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشرکین مکہ نے کردار ادا کیا کیونکہ وہ لوگوں کو آپ سے بچنے اور آپ کی دعوت میں شک و شبہ ڈالنے کی غرض سے لوگوں تک آپ کی خبریں پہنچاتے۔ اس طرح یہ خبر قبیلہ غفار تک پہنچی۔

---

[1] صحيح البخاري، حديث:3861، و صحيح مسلم، حديث:2474. [2] صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص:83، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:145/1.

② ابو ذر رضی اللہ عنہ مستقل مزاج تھے۔ ان پر قریش کی طرف سے پھیلائی جانے والی خبروں اور پروپیگنڈے کا کوئی اثر نہ ہوا، اس لیے انھوں نے اپنے بھائی کو نبی ﷺ کے بارے میں ٹھوس معلومات حاصل کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اور دوسرے ذرائع سے آنے والی خبروں سے متاثر نہ ہوئے۔

③ نبی ﷺ کے بارے میں ابو ذر رضی اللہ عنہ نے انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیا، اس لیے انھوں نے اپنے بھائی اُنَیس سے ملنے والی عام معلومات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود مکہ جا کر مکمل تحقیق کرنے کا ارادہ کیا کیونکہ معاملہ صرف اتنا نہ تھا کہ وہ آدمی نیکی کا حکم دیتا ہے یا نہیں بلکہ معاملہ یہ تھا کہ وہ شخص اپنے آپ کو نبی کہتا تھا۔

ابوذر رضی اللہ عنہ نے بہت سے مصائب، مشکلات، تنگیاں اور راہ حق میں اپنے اہل و عیال اور وطن سے جدائی برداشت کی اور صرف ایک تھیلے میں اپنا زاد راہ لیے نبی ﷺ کی نبوت کا حال جاننے کے لیے مکہ کو عازم سفر ہوئے۔[1]

④ مطلوبہ معلومات حاصل کرنے میں غور و فکر اور تحمل سے کام لینا چاہیے۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے غور و فکر کے بعد اندازہ لگایا کہ قریش ہر اس آدمی سے نفرت کرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے لیے آتا ہے، لہٰذا انھیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ اگر ابو ذر رضی اللہ عنہ کسی سے نبی ﷺ کے بارے میں سوال کر لیتے تو قریش کو ان کے مقصد کا علم ہو جاتا اور ممکن تھا انھیں نقصان پہنچتا اور مکہ سے بھی نکال دیا جاتا، پھر وہ اپنا مقصد حاصل نہ کر سکتے جس کے لیے انھوں نے اپنی قوم کو چھوڑا اور بہت سے مصائب اور سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔

⑤ معلومات دینے سے پہلے مکمل احتیاط و اعتماد لازم ہے۔ جب علی رضی اللہ عنہ نے ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ان کی آمد کے متعلق سوال کیا تو باوجودیکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان کی تین راتیں مہمان نوازی کی تھی ابوذر رضی اللہ عنہ نے احتیاطاً کچھ بتانے سے گریز کیا اور جب بات صیغۂ راز میں رہنے کا

---

[1] الوحي و تبليغ الرسالة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ: 91-93.

اعتماد حاصل ہوگیا تو علی رضی اللہ عنہ کو اپنے مقصد کے متعلق بتایا اور ساتھ ہی نبی ﷺ تک رہنمائی کی شرط ٹھہرائی۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ کا یہ انداز انتہائی احتیاط پسندی اور اپنے مقصد کو پورا کرنے کا ثبوت ہے۔

⑥ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کے پاس پہنچنے کے لیے پر امن اور خفیہ طریقہ استعمال کیا۔ علی رضی اللہ عنہ اور ابو ذر رضی اللہ عنہ کے مابین مخصوص اشارے یا معینہ حرکت مثلاً: جوتا درست کرنے یا پانی انڈیلنے پر اتفاق ہوگیا کہ چلتے ہوئے علی رضی اللہ عنہ کو تعاقب کا اندیشہ ہوگا تو وہ یہ کیفیت بنائیں گے یا اشارہ کریں گے۔ یوں نبی ﷺ کے پاس دار ارقم میں پہنچنے کے لیے ایک پر امن اور خفیہ طریقے سے کام لیا گیا۔ اس دوران میں ابو ذر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے کچھ فاصلے پر چلے آرہے تھے۔ ان کا یہ طرزِ عمل حفظ ماتقدم کے طور پر تھا تاکہ اثنائے سفر میں اچانک پیش آنے والی صورتِ حال میں اپنا بچاؤ کیا جاسکے۔

⑦ ان اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی احتیاط پسندی کتنی اعلیٰ اور امن سکیورٹی کا شعور کتنا وافر اور دلوں میں سمایا ہوا تھا حتی کہ یہ ان کے ہر خاص و عام کی امتیازی علامت بن چکی تھی اور ان کے تمام اقدامات سوچے سمجھے اور منظّم ہوتے تھے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اس خصوصیت پر عمل پیرا ہونے کی آج ہمیں بے حد ضرورت ہے، جبکہ اس دور میں قوموں کے عروج و زوال میں اس کی اہمیت ظاہر و باہر ہے۔[1]

آج کل سکیورٹی کے لیے جدید طریقے، مختلف ذرائع اور وسائل اور مستقل ساز و سامان کام میں لائے جاتے ہیں اور اس کے لیے خصوصی مراکز وانسٹیٹیوٹ کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ اس کام کے لیے لمبے چوڑے بجٹ مختص کیے جاتے ہیں۔ سکیورٹی سے متعلقہ عمومی اور خصوصی نوعیت کی معلومات دیگر ممالک کے انٹیلی جنس اداروں کے ہاں بہت زیادہ قیمت پر فروخت ہوتی ہیں اور بسا اوقات بوقت ضرورت ایسی معلومات کے حصول کے

---

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص:59,58.

لیے جان تک کی بازی لگا دی جاتی ہے۔

اسوۂ نبوی اور سیرت صحابہ کی روشنی میں یہ سب کچھ جان لینے کے بعد مسلمانوں کو اپنا سکیورٹی کا نظام مضبوط تر بنانا چاہیے تاکہ دشمنوں کو ہمارے امور میں نقب لگانے کا موقع نہ ملے اور ہمارے راز ان تک نہ پہنچیں۔[1]

⑧ ابوذر رضی اللہ عنہ نے حق کی تلاش میں سچائی اور اپنی عقل وفہم کو ترجیح دی، چنانچہ وہ اس وقت اسلام لائے جب ان پر بلا واسطہ اسلام پیش کیا گیا۔

⑨ نبی ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دفاع اور سلامتی کے لیے حریص اور فکر مند رہتے تھے۔ آپ ﷺ نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو واپس اپنے گھر جانے کا مشورہ دیا اور اپنے اسلام کو صیغۂ راز میں رکھنے کا حکم دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ دین اسلام کو غالب فرما دے۔

⑩ ابوذر رضی اللہ عنہ نے اعلائے کلمۂ حق کے لیے قوت وشجاعت کے اظہار سے بھی دریغ نہ کیا۔ انھوں نے قریش کی مجلسوں میں اپنے اسلام کا علانیہ اظہار کیا۔ اس طرح انھوں نے حق کا واشگاف اعلان بھی کیا اور مکہ والوں کو چیلنج بھی کیا۔[2]

گویا ابوذر رضی اللہ عنہ سمجھے کہ نبی ﷺ کا فرمان وجوب کے لیے نہیں بلکہ اسلام کو صیغۂ راز میں رکھنا نبی ﷺ کی ان پر مہربانی اور مصلحت کا تقاضا ہے، تاہم انھوں نے آپ ﷺ کو بتایا کہ انھیں اپنے اسلام کے اظہار میں قوت حاصل ہے، اس لیے نبی ﷺ نے انھیں اس پر کوئی ملامت نہیں کی۔

مذکورہ قصے سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر اظہار اسلام میں کسی کی طرف سے اذیت پہنچنے کا خدشہ ہو تو سکوت اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن اس کا برملا اظہار کرنا بھی جائز ہے۔ اور راجح مسلک یہ ہے کہ ایمان کا اظہار یا اخفاء حالات اور مقاصد کے اعتبار سے ہوگا اور اسی حساب سے صاحب ایمان اجر یا سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔[3]

---

[1] دروس في الكتمان لمحمود شيت خطاب، ص: 9. [2] الوحي و تبليغ الرسالة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص: 95. [3] فتح الباري، شرح الحديث: 3861.

⑪ ابوذر رضی اللہ عنہ کا کردار دعوت اسلامی کے لیے مفید اور نبی ﷺ کے خلاف قریش کی طرف سے جاری اعصابی جنگ میں کارگر ثابت ہوا۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کی شجاعت و مردانگی اور تحمل مزاجی کی وجہ سے کفار مکہ پر ان کے اپنے مضبوط مرکز میں ایک کاری ضرب لگی۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کے جسم سے خون بھی بہا لیکن وہ دوبارہ شہادت کی تمنا میں اسلام کا علانیہ اظہار کرنے لگے۔

⑫ عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی طرف سے ابوذر رضی اللہ عنہ کی مدافعت اور انھیں قریش کے چنگل سے آزاد کرانا ان کی مسلمانوں کے بارے میں نرمی کا ثبوت ہے اور اس سلسلے میں ان کے طرزِ عمل سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کفار مکہ کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے، چنانچہ انھیں ان خطرات سے آگاہ کیا جو ان کی تجارت کو بنو غِفار قبیلے کے قریب سے گزرتے ہوئے پیش آسکتے ہیں۔[1]

⑬ ابوذر رضی اللہ عنہ نے مکہ میں نبی ﷺ کی طرف سے اختیار کردہ تمام دفاعی طریقے اختیار کیے۔ اگرچہ وہ نبی ﷺ سے حد درجہ محبت اور ملاقات کا شوق رکھتے تھے لیکن اللہ کے رسول کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے انھوں نے مکہ چھوڑا، اپنی قوم کے پاس پہنچے اور اپنے گھر والوں کی اصلاح اور ہدایت کے لیے سرگرم عمل ہوگئے۔ انھیں اسلام کی دعوت دی۔ سب سے پہلے اپنے بھائی، پھر ماں اور پھر اپنی ساری قوم کو اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔

⑭ ابوذر رضی اللہ عنہ اپنی قوم کی اسلام کی طرف راہ نمائی کرنے اور انھیں اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے کی اثر آفریں صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کے باوجود وہ امارت کے مستحق نہ ٹھہرے۔ صحیح مسلم میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: ”کیا آپ مجھے کوئی ذمہ داری نہیں سونپیں گے؟“ ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور فرمایا: «يَا أَبَا ذَرٍّ! إِنَّكَ ضَعِيفٌ، وَّ إِنَّهَا أَمَانَةٌ، وَّ إِنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْيٌ وَّنَدَامَةٌ، إِلَّا مَنْ أَخَذَهَا

---

[1] الوحي و تبليغ الرسالة للدكتور يحيى اليحيىٰ، ص:95,94.

بِحَقِّهَا وَ أَدَّى الَّذِي عَلَيْهِ فِيهَا» ’’اے ابوذر! تو کمزور آدمی ہے اور منصب ایک امانت ہے جو قیامت کے دن رسوائی اور پشیمانی کا باعث ہوگا، سوائے اس آدمی کے جس نے اسے برحق حاصل کیا اور اس منصب کے متعلقہ تمام حقوق ادا کیے۔‘‘[1]

ہر انسان کا اپنا ایک دائرہ کار ہے جس کے لیے اللہ نے اسے صلاحیتوں سے نوازا ہے اور ایک خاص میدان ہے جس کا وہ شہسوار ہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کی دعوت کے میدان میں کامیابی اور لوگوں کو مطمئن کر لینے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہر منصب کے اہل ہو گئے تھے۔

⑮ ابوذر رضی اللہ عنہ نے منصب امامت قبیلۂ غِفار کے سردار ایماء بن رحضہ کے سپرد کر دیا باوجودیکہ وہ اسلام اور مرتبے کے لحاظ سے سب پر فائق تھے۔ یہ انتظامی امور میں ان کی مہارت کی دلیل ہے کہ انھوں نے تمام مناصب اپنے ہاتھ میں نہیں رکھے بلکہ ہر فرد کو اس کا مرتبہ عطا کیا۔[2]

⑯ ابوذر رضی اللہ عنہ دعوت کے میدان میں نمایاں کامیابی سے ہمکنار ہوئے، چنانچہ قبیلہ غفار کی نصف آبادی اس وقت اور نصف ہجرت کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی۔[3]

قریش کی طرف سے اسلام کے خلاف میڈیا وار ناکامی سے دوچار ہوگئی۔ اس طرح نظریاتی محاذ پر کفار کی اسلامی دعوت پر سنگباری بھی ناکام رہی کیونکہ نبی ﷺ کی آواز ان کی آواز سے قوی، آپ کے وسائل تبلیغ ان کے وسائل سے زیادہ دور رس اور آپ ﷺ کا اپنے عظیم الشان اصولی موقف پر قائم رہنا ان کی توقعات سے کہیں زیادہ مضبوط ثابت ہوا۔

نبی ﷺ اپنے گھر یا مسجد حرام کے کسی کونے میں نہیں بیٹھے کہ اپنی دعوت کو لیے وہاں چھپے رہیں اور دشمن کے زہریلے تیروں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں بلکہ آپ ﷺ نے جان پر کھیل کر علم دعوت سربلند کیا۔ آپ ﷺ عرب قبائل کے مکہ پہنچنے سے قبل ہی ان کے خیموں تک پہنچتے، مسجد حرام میں بلند آواز سے تلاوت فرماتے تاکہ جن لوگوں کے دلوں

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 1825. [2] الوحي و تبليغ الرسالة للدكتور يحيٰى اليحيٰى، ص: 100.

[3] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 45/1.

میں زندگی کے ولولے اور آزادی کے جذبے موجزن ہوں وہ اس آواز کو سنیں اور ہدایت کی روشن کرنیں اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتار لیں۔[1]

پیغام حق سے متاثر ہونے والوں میں ضماد ازدی، عمرو بن عبسہ، ابوذر غفاری، طفیل بن عمرو دوسی اور حصین رضی اللہ عنہم سرفہرست ہیں۔ ان کا قبول اسلام قریش کی طرف سے دین حق کے خلاف کی جانے والی گھناؤنی سازشوں اور نظریاتی حملوں کی ناکامی کا بین ثبوت ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان کے قبول اسلام کے نتائج و نصائح سے استفادہ کریں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچنے والی تکالیف

جب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا برملا اظہار کیا تھا، اس وقت سے مشرکین مکہ آپ کو مسلسل تکلیفیں دے رہے تھے یہاں تک کہ آپ کو مکہ سے جلا وطن ہونا پڑا اور پھر اللہ نے آپ کو مشرکین پر غلبہ عطا فرمایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹنے کا اندازہ ان آیات سے لگایا جاسکتا ہے جو اس دور ابتلا میں نازل ہوئیں جن میں آپ کو صبر کرنے اور اس کے اسباب اختیار کرنے کی تلقین کی گئی، غمزدہ ہونے سے روکا گیا اور سابق انبیاء کے قصص و امثال بیان کی گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝﴾

”اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر کیجیے اور انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دیجیے۔“[2]

اللہ تعالیٰ نے غم نہ کرنے کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝﴾

”اور (اے نبی!) آپ ان پر غم نہ کریں اور نہ ہی جو وہ مکر و فریب کر رہے ہیں (اس پر) تنگ دل ہوں۔“[3]

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 1/144. [2] المزمل 73:10. [3] النمل 27:70.

اللہ تعالیٰ نے دوسرے پیغمبروں کی مثال بیان کرتے ہوئے یوں تسلی دی:

﴿مَا یُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِیْمٍ ۝﴾

”آپ سے بھی وہی کچھ کہا جا رہا ہے جو آپ سے پہلے رسولوں سے کہا گیا، بے شک آپ کا رب معاف کر دینے والا بھی ہے اور دردناک عذاب دینے والا بھی۔“ [1]

نبی ﷺ کو پہنچنے والی تکالیف کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

① **ابوجہل کی ایک ناکام کوشش:** ایک دن ابوجہل نے کہا: ”کیا محمد سب کے سامنے اپنے خدا کو سجدہ کرتا ہے؟“ کسی نے کہا: ”ہاں!“ اس پر ابوجہل بولا: ”مجھے لات و عزیٰ کی قسم! اگر آئندہ میں نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو اس کی گردن روند ڈالوں گا یا اس کا چہرہ خاک آلود کر دوں گا۔“ (نعوذ باللہ) پھر ایک دن نبی ﷺ نماز پڑھ رہے تھے کہ ابوجہل آپ کی گردن روندنے کے لیے آگے بڑھا، مگر اچانک وہ اپنی ایڑیوں کے بل پیچھے لوٹنے اور دونوں ہاتھوں سے اپنا بچاؤ کرنے لگا۔ اس سے پوچھا گیا کہ اس کا سبب کیا ہے تو اس نے کہا: ”میرے اور اس کے درمیان آگ کی خندق حائل ہو گئی تھی اور میرے سامنے بہت سے پر تھے اور ہولناکی تھی۔“ نبی ﷺ نے فرمایا: «لَوْ دَنَا مِنِّي لَاخْتَطَفَتْهُ الْمَلَائِكَةُ عُضْوًا عُضْوًا» ”اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کا ایک ایک عضو اچک لیتے۔“ [2]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ ایک دفعہ نماز ادا کر رہے تھے کہ ابوجہل آیا اور کہنے لگا: ”کیا میں نے تجھے اس عمل سے منع نہیں کیا؟ کیا میں نے تجھے اس کام سے روکا نہیں تھا؟“ نبی ﷺ نماز سے سلام پھیرنے کے بعد اسے ڈانٹنے لگے، تو ابوجہل کہنے لگا: ”بے شک تو جانتا ہے کہ مکہ میں مجھ سے بڑی مجلس کسی کی نہیں۔“ تو اللہ تعالیٰ

---

[1] حٰمٓ السجدة 43:41. [2] صحیح مسلم، حدیث: 2797.

نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝ ﴾

’’چنانچہ اسے چاہیے کہ وہ اپنی مجلس والوں کو بلا لے، یقیناً ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلا لیں گے۔‘‘ [1]

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ’’اگر وہ اپنے مجلسی مددگاروں کو بلاتا تو اللہ کے زبانیہ فرشتے ان کا کام تمام کر دیتے۔‘‘ [2]

② **سجدے کی حالت میں آپ ﷺ پر گندگی کا بوجھ پھینکنا:** عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی ﷺ کعبے کے پاس نماز ادا کر رہے تھے اور قریش کے لوگ اپنی مجالس میں براجمان تھے۔ ان میں سے ایک آدمی نے کہا: ’’کیا تم اس ریاکار کی طرف نہیں دیکھتے؟‘‘ (نعوذ باللہ) اتنے میں کسی نے کہا: ’’کون ہے جو بنی فلاں کے اونٹوں کا گوبر، خون اور جیر (بچہ دانی کی جھلی) لائے اور جب محمد (ﷺ) سجدہ کریں تو ان کی پیٹھ پر ڈال دے۔‘‘ اس پر قوم کا بدبخت ترین آدمی اٹھا، جب نبی ﷺ نے سجدہ کیا تو اس نے اونٹنی کی جیر آپ کی پیٹھ پر دونوں کندھوں کے درمیان ڈال دی، اس کے بعد وہ ہنسی کے مارے ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ کسی نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جا کر خبر دی وہ ان دنوں نوعمر تھیں۔ وہ دوڑتی ہوئی آئیں۔ رسول اللہ ﷺ سجدے کی حالت میں تھے۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی پیٹھ سے جیر ہٹا کر پرے پھینکی اور سب کو برا بھلا کہنے لگیں۔ جب نبی ﷺ نے اپنی نماز مکمل فرمالی تو تین مرتبہ فرمایا: «اَللّٰهُمَّ! عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ» ’’اے اللہ! تو قریش کو پکڑ لے۔‘‘ پھر نبی ﷺ نے ہر ایک کا نام لے کر فرمایا کہ اے اللہ! تو عمرو بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی مُعَیط اور عُمارہ بن ولید کو پکڑ لے۔‘‘

---

[1] العلق 96:17، 18. [2] جامع الترمذي، حديث: 3349.

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں نے دیکھا جن لوگوں کے نام رسول اللہ ﷺ نے گن گن کر لیے تھے وہ سب بدر کے دن قتل ہوئے پڑے تھے، پھر انھیں بدر کے کنویں میں پھینک دیا گیا۔''

پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَ أُتْبِعَ أَصْحَابُ الْقَلِيبِ لَعْنَةً»

''ان کنویں والوں پر لعنت کی گئی۔''[1]

دیگر روایات میں آتا ہے کہ گندگی پھینکنے والا عُقبہ بن ابی مُعَیط اور اس کام پر ابھارنے والا ابوجہل تھا۔[2]

مشرکین اپنے خلاف نبی ﷺ کی بددعا کے مؤثر ہونے پر خائف تھے۔ ان پر یہ معاملہ گراں گزرتا تھا کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ مکہ میں کی گئی دعا قبول ہوتی ہے۔[3]

③ **قریشی سرداروں کا نبی ﷺ پر حملہ آور ہونا:** ایک دن قریش کے بڑے بڑے سردار حطیم میں اکٹھے ہوئے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہنے لگے: ''ہم نے جتنا صبر اس آدمی کے بارے میں کیا ہے کبھی کسی کے متعلق نہیں کیا۔ یہ ہمیں بے وقوف گردانتا ہے اور ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے۔ ہم نے بڑے اہم معاملے پر صبر کیا ہوا ہے۔'' اسی دوران میں رسول اللہ ﷺ وہاں تشریف لے آئے۔ قریشی سردار یکبارگی آپ کی طرف لپکے، انھوں نے آپ کو گھیرے میں لے لیا اور کہنے لگے: ''تو ہی وہ آدمی ہے جو ہمارے خداؤں اور دین کے بارے میں یہ یہ کہتا ہے۔ (کہ کچھ نہیں کر سکتے، ان کی پوجا مت کرو وغیرہ)۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ، أَنَا الَّذِي أَقُولُ ذٰلِكَ» ''ہاں میں ہی وہ آدمی ہوں جو یہ کہتا ہوں۔'' پھر ان میں سے ایک آدمی نے آپ ﷺ کی چادر بل دے کر کھینچی۔ اسی اثنا میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آ گئے۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہے تھے:

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 520، و صحيح مسلم، حديث: 1794. [2] صحيح مسلم، حديث: 1794. [3] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 149/1.

«أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ: رَبِّيَ اللّٰهُ؟» ”کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرنا چاہتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے؟“[1]

④ نبی ﷺ کا چچا ابولہب آپ کا سخت دشمن تھا۔ اسی طرح اس کی بیوی ام جمیل بھی آپ کی عداوت میں اپنے شوہر سے پیچھے نہ تھی۔ وہ نبی ﷺ اور لوگوں کے درمیان چغلی سے فتنے کی آگ بھڑکانے کی کوشش کرتی، آپ کے راستے میں کانٹے ڈالتی اور دروازے پر گندگی پھینک دیتی، ان دونوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ اللھب نازل فرمائی:

> ﴿تَبَّتْ یَدَاۤ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَاۤ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝﴾
>
> ”ٹوٹ جائیں دونوں ہاتھ ابولہب کے اور وہ ہلاک ہو گیا، نہ اس کے مال نے اسے کوئی فائدہ دیا اور نہ اس کی کمائی نے، عنقریب وہ ضرور بھڑکتی آگ میں داخل ہو گا اور اس کی بیوی بھی جو لکڑیاں ڈھونے والی ہے، اس کی گردن میں چھال کی بٹی ہوئی رسی ہو گی۔“[2]

جب ابولہب کی بیوی ام جمیل کو معلوم ہوا کہ اس کی اور اس کے شوہر کی مذمت میں قرآن نازل ہوا ہے تو وہ رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرتی ہوئی آئی۔ آپ ﷺ خانہ کعبہ کے پاس مسجد حرام میں تشریف فرما تھے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ وہ مٹھی بھر پتھر لیے ہوئے تھی۔ سامنے آکر کھڑی ہوئی (تو اللہ نے اس کی نگاہ پکڑ لی)۔ اس نے سوال کیا: ”ابوبکر! تمھارا ساتھی کہاں ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ میری ہجو کرتا ہے۔ واللہ! اگر میں نے اسے پالیا تو اس کے منہ پر یہ پتھر دے ماروں گی۔“ اس کے بعد وہ واپس چلی گئی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! کیا آپ کو اس نے نہیں دیکھا؟“

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3618و3856و4815، ودلائل النبوة للبيهقي:2/274، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص:96، وصحيح السيرة النبوية للألباني:1/149. [2] اللهب 111:1-5.

آپ نے فرمایا: «لَقَدْ أَخَذَ اللّٰهُ بِبَصَرِهَا عَنِّي» ’’نہیں، اللہ نے اس کی نگاہ پکڑ لی تھی وہ مجھے نہیں دیکھ پائی۔‘‘ ام جمیل نے یہ شعر بھی پڑھے:

«مُذَمَّمٌ أَبَيْنَا، وَدِينَهُ قَلَيْنَا وَأَمْرَهُ عَصَيْنَا»

’’ہم نے مُذَمَّم (جس کی مذمت کی جائے) کو تسلیم نہیں کیا، اس کے دین کو چھوڑ دیا اور اس کے امر کی نافرمانی کی۔‘‘

نبی ﷺ اس کی یہ بات سن کر مسکراتے اور فرماتے: «أَلَا تَعْجَبُونَ كَيْفَ يَصْرِفُ اللّٰهُ عَنِّي شَتْمَ قُرَيْشٍ وَّ لَعْنَهُمْ يَشْتِمُونَ مُذَمَّمًا وَّيَلْعَنُونَ مُذَمَّمًا وَّ أَنَا مُحَمَّدٌ» ’’کیا تم تعجب نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے قریش کی لعن طعن اور گالی گلوچ کس طرح مجھ سے پھیر دی۔ وہ مُذَمَّم کو لعن طعن کرتے اور گالی دیتے ہیں اور میں تو محمد ہوں۔‘‘[1]

ابولہب تو بازاروں، مجمعوں اور حج کے موسم میں نبی ﷺ کے پیچھے لگا رہتا اور آپ کی تکذیب کرتا۔[2]

نبی ﷺ کو پہنچنے والی ان تکالیف کے علاوہ مکی دور کے آخر میں اس وقت ایذا رسانی کی انتہا کر دی گئی جب مشرکین نے آپ ﷺ کو قتل کرنے کی سازش کی۔[3]

نبی ﷺ قریش کی طرف سے اپنے پیروکاروں کو پہنچنے والی تکالیف سے پہلے خود کو پہنچنے والی ایذا کا تذکرہ اس طرح فرماتے: «لَقَدْ أُخِفْتُ فِي اللّٰهِ وَمَا يَخَافُ أَحَدٌ وَلَقَدْ أُوذِيتُ فِي اللّٰهِ لَمْ يُؤْذَ أَحَدٌ، وَلَقَدْ أَتَتْ عَلَيَّ ثَلَاثُونَ مِنْ بَيْنِ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ وَّمَالِي وَلِبِلَالٍ طَعَامٌ يَّأْكُلُهُ ذُو كَبِدٍ إِلَّا شَيْءٌ يُّوَارِيهِ إِبْطُ بِلَالٍ» ’’بلاشبہ مجھے اللہ کے راستے میں اتنا ڈرایا گیا کہ کسی کو اتنے خوف کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بلاشبہ مجھے اللہ کے راستے میں اتنی اذیت دی گئی کہ کسی کو بھی اتنی اذیت سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ مجھ پر

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3533. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 293/1. [3] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 153/1.

مسلسل تیس دن رات گزر جاتے اور میرے اور بلال کے لیے کوئی ایسا کھانا نہ ہوتا جسے کوئی جاندار کھا سکے، سوائے اس چیز کے جو بلال اپنی بغل میں چھپا کر لے آتے۔"[1]

نبی ﷺ قدر و منزلت کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے۔ اس کے باوجود جب سے آپ ﷺ نے لوگوں کو علانیہ دعوت پیش کی تو انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ تکالیف برداشت کیں اور لمبی مشقت اٹھائی۔ نبی ﷺ نے قریش کے ان ناسمجھ لوگوں کی طرف سے بے پناہ تکالیف اٹھائیں حتی کہ جب کبھی آپ مکہ میں ان کی مجالس کے قریب سے گزرتے تو وہ مذاق کرتے ہوئے کہتے: "یہ ابو کبشہ[2] کا بیٹا ہے جو آسمانی باتیں کرتا ہے۔" اور کوئی ان میں سے آپ کے قریب سے گزرتا تو یوں کہتا: "کیا آج تیرے پاس آسمان سے کوئی خبر نہیں آئی؟"[3]

معاملہ صرف تمسخر و استہزا اور ذہنی اذیت پہنچانے تک ہی محدود نہ تھا بلکہ نوبت جسمانی تکلیف دینے تک پہنچ گئی تھی حتی کہ اُمَیَّہ بن خلف جیسے اللہ کے دشمن نے نبی ﷺ کے چہرۂ انور پر تھوکنے کی بھی جسارت کی۔[4]

ہجرت مدینہ کے بعد بھی نبی ﷺ پر اذیت اور ابتلا کا دور ختم نہ ہوا بلکہ ایک نیا انداز اختیار کیا گیا۔ نئے نئے دشمن پیدا ہوگئے، عداوت کی آگ مکہ والوں سے تجاوز کرتے ہوئے مدینہ کے قرب و جوار کے منافقوں، یہودیوں، ایرانیوں اور رومیوں اور ان کے حلیفوں تک پھیل گئی، مکہ میں دشمنی کا طریقہ کار جو استہزا، گالی گلوچ، گھیراؤ اور مار پیٹ تک محدود تھا، اب مسلح تصادم کی صورت اختیار کر گیا اور یہ جنگ اتنی تیزی اختیار کر گئی کہ اس میں بڑے کروفر سے تلواروں اور نیزوں کا استعمال ہوا۔ یہ ایک ایسی آزمائش ثابت ہوئی جس میں بکثرت اموال اور جانوں کا نقصان ہوا۔[5]

نبی ﷺ کی نبوت و رسالت کے سارے دور میں مشقت و ابتلا کا تسلسل رہا اور آپ نے اللہ کے راستے میں پہنچنے والی ان تکالیف پر صبر کیا اور اجر کی امید رکھی اور کسی قسم کی

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 2472. [2] ابو کبشہ آپ ﷺ کے رضاعی والد تھے۔ [3] الروض الأنف: 33/2 و ما بعدها. [4] الروض الأنف: 48/2. [5] زاد اليقين لأبي شنب، ص: 137.

کمزوری نہ دکھائی یہاں تک کہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔[1]

نبی ﷺ نے ایسی آزمائشوں، اذیتوں اور مشقتوں کا سامنا کیا جو کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں اور یہ تمام تکالیف آپ کے مرتبۂ رسالت کے مطابق تھیں، اس لیے آپ اپنے اللہ کے ہاں بلند مرتبے اور مقام محمود کے مستحق ٹھہرے۔ آپ نے یہ سب تکالیف اس لیے برداشت کرلیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انھیں بھی سابقہ امتوں پر آنے والا عذاب گھیر لے اور سب تباہ و برباد ہوجائیں اور اس طرح آنے والے داعیوں اور مصلحین کے لیے اسوہ مہیا ہوجائے۔ اسی لیے نبی ﷺ کو پہنچنے والی تکالیف آزمائش و مشقت میں سب سے بڑھی ہوئی تھیں اور دعوت کے میدان میں اللہ تعالیٰ کا یہی طریقۂ کار رہا ہے۔[2]

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! سب سے زیادہ کون لوگ آزمائش میں مبتلا ہوئے ہیں؟

آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ: يُبْتَلَى الرَّجُلُ عَلٰى حَسَبِ دِينِهٖ، فَإِنْ كَانَ فِي دِينِهٖ صُلْبًا اشْتَدَّ بَلَاؤُهُ، وَإِنْ كَانَ فِي دِينِهٖ رِقَّةٌ ابْتُلِيَ عَلٰى قَدْرِ دِينِهٖ، فَمَا يَبْرَحُ الْبَلَاءُ بِالْعَبْدِ حَتّٰى يَتْرُكَهٗ يَمْشِي عَلَى الْأَرْضِ وَمَا عَلَيْهِ خَطِيئَةٌ»

> ”انبیاء، پھر ان کے بعد سب سے زیادہ مرتبے والے اور پھر ان کے بعد جو زیادہ مرتبہ و مقام والے ہوں۔ آدمی اپنی دینی استعداد کے مطابق آزمایا جاتا ہے۔ اگر وہ دین میں پختہ ہو تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے۔ اور اگر وہ دین میں نرم اور کمزور ہو تو آزمائش اس اعتبار سے ہوگی۔ انسان آزمائش میں مسلسل مبتلا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ زمین پر اس حالت میں چل رہا ہوتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ باقی نہیں رہتا۔“[3]

---

[1] التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 243. [2] محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 197. [3] جامع الترمذي، حديث: 2398، وسنن ابن ماجه، حديث: 4023، و مسند أحمد: 172/1.

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو پہنچنے والی تکالیف

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پہنچنے والی تکالیف

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اتنی عظیم تکالیف برداشت کیں جن سے بڑے بڑے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے مال اور جانیں اللہ کے راستے میں قربان کیں اور انتہائی صبر و تحمل سے مصائب برداشت کیے حتی کہ مسلمانوں کے برگزیدہ افراد بھی ابتلا سے محفوظ نہ رہ سکے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی اللہ کے راستے میں تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے سر پر مٹی ڈالی گئی اور انھیں مسجد حرام میں جوتوں سے زد و کوب بھی کیا گیا حتی کہ ان کا چہرہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے دریں اثنا انھیں ایک کپڑے میں لپیٹ کر گھر پہنچایا گیا۔[1]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ایک جگہ جمع ہوئے اور ان کی تعداد اڑتیس (38) کے قریب تھی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علانیہ تبلیغ کرنے کا مشورہ دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «يَا أَبَا بَكْرٍ! إِنَّا قَلِيلٌ» ”اے ابوبکر! ابھی ہم تھوڑی تعداد میں ہیں۔“ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اصرار کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے اور تمام اہل اسلام مسجد حرام کے کناروں پر پھیل گئے۔ ہر آدمی اپنے خاندان کے درمیان تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پاس ہی تشریف فرما تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف دعوت دینے والے پہلے خطیب تھے۔ مشرکین ابوبکر رضی اللہ عنہ اور تمام مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے اور انھیں مسجد حرام میں کعبہ کے آس پاس شدید زدوکوب کیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زمین پر لٹا کر روندا گیا اور ان کے چہرے پر ضربیں لگائی گئیں۔ فاسق عتبہ بن ربیعہ آگے بڑھا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے سلے ہوئے دونوں جوتوں سے مارنے لگا۔ وہ جوتوں کا رخ

---

[1] التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص:243.

بدل بدل کر ان کے چہرے پر مارتا تھا، پھر ان کے پیٹ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ابوبکر ؓ کا چہرہ تشدد کے باعث پہچانا نہ جاتا تھا۔ اتنے میں بنو تیم کے لوگ انھیں بچانے کے لیے آگے بڑھے۔ انھوں نے مشرکین کو ان سے پرے ہٹایا اور پھر انھیں ایک کپڑے میں لپیٹ کر ان کے گھر پہنچایا۔ انھیں ابوبکر ؓ کی موت میں کوئی شک باقی نہ رہا تھا، چنانچہ وہ لوگ واپس مسجد حرام میں آئے اور اعلان کیا: ”واللہ! اگر ابوبکر ہلاک ہوگئے تو ہم عتبہ بن ربیعہ کو قتل کر دیں گے۔“ وہ دوبارہ ابوبکر ؓ کے پاس پہنچے۔ ان کے والد ابو قحافہ اور بنو تیم کے لوگ ابوبکر ؓ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے بالآخر دن کے آخری حصے میں وہ ہوش میں آئے اور بات کرنے کے قابل ہوئے تو انھوں نے سب سے پہلے یہی پوچھا: ”نبی ﷺ خیریت سے ہیں؟“

بنو تیم نے ابوبکر ؓ کو برا بھلا کہا اور ان کی ماں ام الخیر سے یہ کہہ کر چلے گئے کہ اسے کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دینا۔ جب ابوبکر ؓ اور ان کی ماں اکیلے رہ گئے تو ماں نے کھانے پینے پر اصرار کیا اور ابوبکر ؓ ابھی بھی یہی بات دہرا رہے تھے کہ ”رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟“ ام الخیر بولیں: ”اللہ کی قسم! مجھے تیرے ساتھی کا کوئی علم نہیں۔“ تب انھوں نے والدہ سے کہا: ”آپ ام جمیل بنت خطاب کے پاس جائیں اور ان سے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں سوال کریں۔“ وہ ام جمیل کے پاس آئیں اور کہا: ”ابوبکر تم سے محمد بن عبداللہ (ﷺ) کے متعلق پوچھتا ہے۔“ اس نے کہا: ”میں کسی محمد بن عبداللہ اور ابوبکر کو نہیں جانتی اور اگر تو چاہے تو میں تیرے ساتھ تیرے بیٹے کے پاس جاسکتی ہوں۔“ ام الخیر نے کہا: ”ٹھیک ہے۔“ یوں ام جمیل اس کے ساتھ آئی اور دیکھا کہ ابوبکر قریب المرگ حالت میں پڑے تھے۔ ام جمیل قریب ہوئی اور بلند آواز سے کہا: ”واللہ! جن لوگوں نے آپ کا یہ حال کیا ہے، وہ اہل فسق اور اہل کفر ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ ان سے ضرور انتقام لے گا۔“ ابوبکر ؓ نے اپنا سوال دہرایا کہ ”اللہ کے رسول ﷺ کا کیا حال ہے؟“

وہ بولی: ”تیری ماں سن رہی ہے۔“ اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”تو ان سے کسی قسم کا خوف نہ کھا۔“ تب اس نے بتایا کہ وہ صحیح سلامت ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ”وہ کہاں ہیں؟“ اس نے بتایا: ”وہ دار ارقم میں ہیں۔“

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اللہ کی قسم! میں اس وقت تک نہ کھانا کھاؤں گا اور نہ پانی پیوں گا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ پہنچ جاؤں۔“

ام الخیر اور ام جمیل دونوں کچھ دیر ٹھہری رہیں یہاں تک کہ جب لوگوں کا شور و غل ختم ہو گیا اور فضا پر سکون ہو گئی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ ان دونوں کا سہارا لیے گھر سے نکلے اور انھوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فوراً ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف لپکے اور انھیں بوسہ دیا، پھر دیگر مسلمان بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم شدید رقت کی حالت میں آ گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! آپ پر میرے ماں باپ قربان! اس فاسق نے جو میرے چہرے پر مارا، اس کے علاوہ کوئی تکلیف نہیں۔ اور یہ میری ماں ام الخیر ہیں جو میرے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہیں۔ آپ بابرکت ہستی ہیں۔ آپ انھیں اللہ کی طرف دعوت دیجیے اور اللہ سے ان کے حق میں دعا کیجیے۔ ممکن ہے آپ کی وجہ سے اللہ انھیں آگ سے بچا لے۔“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اسلام کی دعوت دی اور اللہ سے ان کے حق میں دعا کی تو وہ مسلمان ہو گئیں۔[1]

نصائح اور نتائج

① ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اسلام کا اعلان کرنا اور اسے کفار کے سامنے ظاہر کرنا ان کی ایمانی قوت اور شجاعت کا مظہر ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں بڑی تکلیف اٹھائی یہاں تک کہ ان کے قبیلے والوں کو ان کی موت کا یقین ہو چلا تھا۔

② ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت پوشیدہ تھی۔ وہ اتنی نازک حالت

---

[1] السيرة النبوية لابن كثير: 1/439-441، والبداية والنهاية: 30/3.

میں بھی رسول اللہ ﷺ کے بارے میں سوال کر رہے تھے اور ان کے سوال میں عجیب قسم کی دردمندی تھی، پھر انھوں نے قسم اٹھائی کہ جب تک وہ اللہ کے رسول کو دیکھ نہیں لیتے کچھ نہیں کھائیں پئیں گے، حالانکہ وہ اس وقت چلنا تو درکنار اپنی جگہ سے اٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن یہ محبت تو اللہ کے لیے تھی اور وہ پختہ ارادے جو مشکلات پر غالب آجاتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہوتے ہیں اور ہر وہ مصیبت جو اللہ کے راستے میں ہو اور اللہ کے رسول کی خاطر ہو وہ ہلکی اور آسان ہو جاتی ہے۔

③ عقیدہ مختلف ہونے کے باوجود قبائلی عصبیت کا پیش آمدہ واقعات سے گہرا تعلق ہوتا تھا۔ ابوبکر ؓ کے قبیلے والوں نے عتبہ کو دھمکی دی تھی کہ اگر ابوبکر ؓ ہلاک ہوگئے تو وہ عتبہ کو قتل کر دیں گے۔[1]

④ ام جمیل ؓ کی احتیاطی تدابیر جو ان کے مختلف طرزِ عمل سے واضح ہوتی ہیں، مندرجہ ذیل تھیں:

شخصیات اور معلومات کو پوشیدہ رکھنا: جب ام الخیر نے ام جمیل سے نبی ﷺ کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے ابوبکر ؓ اور محمد ﷺ کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ یہ ایک محتاط اور حفاظتی انداز تھا کیونکہ اس وقت ام الخیر مسلمان نہ تھیں اور ام جمیل مسلمان تھیں اور اپنے اسلام کو مخفی رکھے ہوئے تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ام الخیر کو اس کی خبر ہو، چنانچہ انھوں نے ام الخیر سے نبی ﷺ کی جائے قیام پوشیدہ رکھی مبادا وہ قریش کی جاسوس ہوں۔[2]

معلومات فراہم کرنے کے لیے موقع کی تلاش: ام جمیل ؓ نے بذات خود مطلوبہ معلومات ابوبکر ؓ تک پہنچانے کا ارادہ کیا اور ام الخیر کو راز داری کی غرض سے کچھ نہ بتایا، البتہ موقع غنیمت سمجھتے ہوئے اس سے کہا: ''اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کے ساتھ آپ کے بیٹے کے پاس چلوں تو میں جا سکتی ہوں۔'' ام جمیل کی یہ پیشکش ان کی ذہانت

---

[1] محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 79. [2] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 50.

اور معاملہ فہمی کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے یہ کہا: ”اگر آپ چاہتی ہیں۔“ ام الخیر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ماں تھیں اور پھر کہا: ”آپ کے بیٹے کے پاس۔“ یہ نہیں کہا: ابوبکر کے پاس۔ یہ تمام الفاظ ام الخیر میں ماں ہونے کے ناتے نرمی پیدا کرنے کے لیے کافی تھے۔ عام طور پر ایسی پیشکش کا انکار نہیں کیا جاتا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ام الخیر نے فوراً ہاں کہہ دی اور ام جمیل بذات خود معلومات ابوبکر رضی اللہ عنہ تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئیں۔

ام الخیر کے جذبۂ شفقت کو ابھارنے کے لیے ام جمیل کا کردار: واقعے کی تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ام جمیل نے ام الخیر کے جذبۂ شفقت کو ابھارنے کی کوشش کی اور انھوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس حالت کو سامنے رکھا جبکہ وہ قریب المرگ تھے۔ انھوں نے اونچی آواز میں گفتگو کی اور اس فعل کے ذمہ دار افراد کو برا بھلا کہتے ہوئے بولیں: ”بلاشبہ جن لوگوں نے آپ سے یہ سلوک کیا ہے وہ اہل فسق اور اہل کفر ہیں۔ مجھے امید ہے اللہ ان سے آپ کا انتقام لے گا۔“

ام جمیل کے اس طرز عمل سے ام الخیر کی قدرے تسلی و تشفی ہوئی اور ظلم کرنے والوں کے برے انجام کی بات سن کر اس کے دل کو سکون ہوا۔ ام جمیل ام الخیر کے دل میں محبت پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ جس میں وہ کامیاب رہیں۔ انھوں نے ام الخیر کا اعتماد حاصل کرنے اور مطلوبہ معلومات ابوبکر رضی اللہ عنہ تک پہنچانے میں کامیابی پالی۔[1]

ام جمیل کی احتیاطی تدابیر: ام جمیل انتہائی محتاط تھیں کہ اسلامی دعوت کے قائد کے بارے میں معلومات غلط آدمی کے ہاتھ نہ لگیں۔ وہ ام الخیر کے بارے میں مطمئن نہ تھیں کیونکہ وہ ابھی تک مشرکہ تھیں، لہٰذا جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کے متعلق سوال کیا تو وہ مُتَرَدِّد ہوئیں اور کہا کہ آپ کی ماں سن رہی ہے اور جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ ان کی فکر نہ کریں، تب ام جمیل نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ صحیح سلامت ہیں۔[2]

---

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 50.

[2] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 51.

مزید برآں ام جمیل نے انتہائی حزم و احتیاط اور معاملے کو صیغۂ راز میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے نبی ﷺ کے مکان کے بارے میں نہیں بتایا اور جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا تو جواب دیا کہ وہ دارارقم میں ہیں۔

مہم سر کرنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار: جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دارِارقم جانے کی خواہش ظاہر کی تو ام جمیل اس کے لیے فوراً تیار نہ ہوئیں بلکہ انھوں نے لوگوں کا شوروغل ختم ہونے اور فضا پرسکون ہونے کا انتظار کیا، تب وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی والدہ کے ہمراہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سہارا دیے وہاں سے نکلیں۔ اس مشکل مہم کا یہی مناسب وقت تھا کیونکہ اس دوران میں دعوت دین کے دشمنوں کی طرف سے جاسوسی اور بھید کھلنے کے مواقع کم ہوگئے تھے۔ یوں ام جمیل دشمنوں کو خبر ہوئے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئیں یہاں تک کہ وہ اور ام الخیر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو لیے دارارقم پہنچ گئیں۔[1]

مشقت کے بعد انعام کا ضابطہ: ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نبی ﷺ سے اپنی ماں کے بارے میں دعا کروانے اور انھیں اسلام میں داخل کرنے کی خواہش ظاہر کرنے کے بعد ام الخیر کا دائرہ اسلام میں داخل ہونا اس ضابطے کا حصہ تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی ماں کے اچھے سلوک سے بہت متأثر تھے اور نبی ﷺ تو تمام لوگوں کی ہدایت کے لیے کوشاں رہتے تھے جبکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کے قریبی ساتھی تھے۔[2]

⑤ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نبی ﷺ سے خاص تعلق تھا اور ان کٹھن مراحل میں جب آپ ﷺ نے بہت سی تکالیف برداشت کیں، معیت رسول کے باعث سب سے زیادہ مشقت اور آزمائش ابوبکر رضی اللہ عنہ کو برداشت کرنی پڑی۔ وہ نبی ﷺ کے دفاع میں پیش پیش رہے اور آپ ﷺ پر اپنی جان نچھاور کرتے نظر آئے حتی کہ اپنی قوم کے ناسمجھ افراد کی طرف سے بہت سی تکالیف برداشت کیں۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ قریش کے معروف ترین عقل و فہم کے

---

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 50-52. [2] محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 79.

مالک اور اچھا سلوک کرنے والوں میں سے تھے۔[1]

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو پہنچنے والی تکالیف

معاشرتی لحاظ سے کمزور مسلمانوں کے بارے میں مشرکین نے اتنی سختی سے کام لیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ انھیں ان کے عقیدے اور اسلام سے برگشتہ کرنا اور دیگر افراد کے لیے سامان عبرت بنانا چاہتے تھے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ انھیں بدترین ظلم وستم سے دوچار کر کے اپنے کینے اور غضب کو تسکین دینے کی کوشش کرتے تھے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''سب سے پہلے جن لوگوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا وہ سات افراد تھے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، ابوبکر، عمار، سمیہ، صہیب، بلال اور مقداد رضی اللہ عنہم'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے چچا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے قبیلے کی وجہ سے تحفظ مل گیا لیکن باقی ماندہ افراد کو مشرکین پکڑ کر لوہے کی زرہیں پہنا دیتے اور انھیں تیز دھوپ میں پھینک دیتے جس سے ان کی جلد جل جاتی۔ توحید کے نام لیوا ان تمام افراد میں بلال رضی اللہ عنہ کے سوا سب نے کفار کی باتیں مان لیں۔ بلال رضی اللہ عنہ نے اللہ کے راستے میں کسی تکلیف کی پروا نہ کی۔ مشرکین بلال رضی اللہ عنہ کو اپنے منچلے نوجوانوں کے حوالے کر دیتے جو انھیں مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے اور بلال رضی اللہ عنہ اپنی زبان سے أَحَدْ، أَحَدْ (اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے) کا نعرہ بلند کرتے۔''[2]

بلال رضی اللہ عنہ کا نہ کوئی مددگار تھا کہ وہ اس کا سہارا لیتے، نہ کوئی قبیلہ تھا جو ان کی حفاظت کرتا اور نہ کوئی تلوار تھی جو ان کا دفاع کرتی۔ ایسا انسان مکہ کے جاہلی معاشرے میں صرف گنتی میں شمار تو ہو سکتا تھا لیکن اس کا زندگی میں خدمت واطاعت کے سوا اور کوئی کردار نہ تھا۔ وہ تو صرف جانوروں کی طرح خریدا اور بیچا جا سکتا تھا۔ اور اگر ایسا شخص اپنی رائے اور فکر کا مالک یا صاحب حیثیت یا صاحبِ دعوت ہو تو مکہ کے جاہلی معاشرے میں اسے بہت بڑا جرم سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس سے جاہلی معاشرے کی بنیادیں ہل سکتی تھیں۔ لیکن جدید اسلامی دعوت

---

[1] محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 75. [2] سنن ابن ماجه، حديث: 150، مسند أحمد: 404/1.

جس میں مکہ کے نوجوان جوق در جوق داخل ہو رہے تھے، جو اپنے آباء و اجداد کی اندھا دھند پیروی کے منکر ہو کر ان کے فرسودہ خیالات کو چیلنج کر رہے تھے، اس تحریک نے ایسے گرے پڑے انسان کو اہمیت دی اور اسے ایک نئے انسان کا وجود عطا کیا۔[1]

بلال ؓ کے اسلام قبول کرنے کے بعد ایمان کے مطالب ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے اور وہ محمد ﷺ اور ان کے پیروکاروں کے اخوت پر مبنی عظیم ایمانی قافلے میں شامل ہو گئے۔ بلال ؓ اپنے عقیدے اور دین کی وجہ سے تکالیف سے دوچار ہو رہے تھے کہ نبی ﷺ کے وزیر ابوبکر ؓ وہاں پہنچے۔ انھوں نے امیہ بن خلف سے اس سلسلے میں مذاکرات کیے اور کہا: ”کیا تو اس مسکین کے بارے میں اللہ سے نہیں ڈرتا اور کب تک یہ ظلم کرتا رہے گا؟“ اس نے کہا: ”تو نے ہی تو اس کا دین برباد کیا ہے۔ تو چاہتا ہے تو اسے بچا لے۔“ ابوبکر ؓ نے کہا: ”میرے پاس ایک سیاہ فام غلام ہے جو اس سے زیادہ طاقتور اور تیرے دین کا پیروکار ہے، وہ میں بلال کے عوض تجھے دے دوں گا۔“ امیہ نے رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ”مجھے قبول ہے۔“ اس پر ابوبکر ؓ نے اپنا غلام اسے دے دیا اور بلال ؓ کو آزاد کر دیا۔[2]

اور دوسری روایت میں ہے کہ ابوبکر ؓ نے اسے سات یا چالیس اوقیہ سونے کے عوض خریدا۔[3]

بلال ؓ عزم و یقین کے پیکر اور صبر و استقامت کے پہاڑ ثابت ہوئے۔ وہ اسلام میں سچے اور دل کے پاکیزہ تھے، اس لیے وہ اپنے دین میں ثابت قدم رہے اور درپیش چیلنجوں اور تکالیف کے سامنے متزلزل نہ ہوئے۔ ان کا صبر و استقامت مشرکین مکہ کے لیے مزید غیظ و غضب اور کینے میں اضافے کا سبب بنتا کیونکہ وہ اکیلے شخص تھے جو کمزور لوگوں میں سے اپنے دین پر ثابت قدم رہے اور مشرکین انھیں اس سے برگشتہ نہ کر سکے

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 136/1۔ [2] السيرة النبوية لابن هشام: 394/1۔ [3] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 140/1۔

تھے۔ بلال رضی اللہ عنہ نے کفار کے ارادوں کی تکمیل کرنے سے انکار کر دیا اور وہ ببانگ دہل کلمہ توحید پکارتے تھے اور اللہ کے راستے میں پہنچنے والی تکالیف کو وہ معمولی سمجھتے تھے۔[1]

ہر مشقت اور تنگی کے بعد انعام ہوتا ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جذبۂ ایثار کے باعث بلال رضی اللہ عنہ نے سخت عذاب اور غلامی سے نجات پائی اور باقی زندگی نبی ﷺ کی خدمت میں گزاری۔ اللہ کے رسول اپنی وفات تک ان سے راضی رہے اور انھیں جنت کی بشارت دی۔ نبی ﷺ نے بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: «فَإِنِّي سَمِعْتُ اللَّيْلَةَ خَشْفَ نَعْلَيْكَ بَيْنَ يَدَيَّ فِي الْجَنَّةِ» ”میں نے آج رات اپنے آگے تیرے قدموں کی آہٹ جنت میں سنی ہے۔“[2]

بلال رضی اللہ عنہ کا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں بھی بڑا مرتبہ و مقام تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ”ابوبکر رضی اللہ عنہ ہمارے سردار ہیں اور انھوں نے ہمارے ایک سردار کو آزاد کرا دیا۔“ اس سے وہ بلال رضی اللہ عنہ کو مراد لیتے تھے۔[3]

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غلاموں کو آزاد کروانا

ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کمزور لوگوں کو آزاد کروانا اسلامی قیادت کے اس پروگرام کا حصہ بن گیا جس میں تکالیف اٹھانے والے کمزور مسلمانوں کو غلامی سے آزاد کرایا جاتا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ بعد ازاں دین اسلام میں داخل ہونے والے غلاموں کی آزادی کے لیے مسلسل مال خرچ کرتے رہے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہجرت مدینہ سے قبل چھ غلاموں کو آزاد کروایا جو اسلام قبول کر چکے تھے بلال رضی اللہ عنہ کا ساتواں نمبر تھا۔ علاوہ ازیں عامر بن فہیرہ بھی انھی کے آزاد کردہ تھے جو بدر و احد میں شامل ہوئے اور جنھوں نے بئر معونہ کے دن شہادت پائی۔ ام عُبیس اور زِنّیرہ رضی اللہ عنہما کو بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آزاد کرایا تھا۔ زِنّیرہ رضی اللہ عنہا کی نظر چلی گئی تو قریش نے کہنا شروع کر دیا کہ اس کی نظر لات و عزّٰی نے ختم کر دی۔ اس پر زِنّیرہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ”بیت اللہ کی قسم![4]

---

[1] محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 92.

[2] صحيح مسلم، حديث: 2458.

[3] الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 232/3.

[4] زنیرہ رضی اللہ عنہا کا بیت اللہ کی قسم کھانا دراصل اس معاشرے کی عام روش کا اظہار تھا۔ یہ بات بیت اللہ کی قسم کھانے کے لیے دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بیت اللہ کی قسم کھانے سے منع فرمایا ہے، دیکھیے: سنن النسائي، حديث: 3804.

انھوں نے جھوٹ بولا ہے۔ لات وعزیٰ کسی نفع ونقصان کے مالک نہیں ہو سکتے۔" اللہ تعالیٰ نے اس کی نظر لوٹا دی۔[1]

نَہدِیہ اور ان کی بیٹی بھی ان آزاد کردہ افراد میں شامل تھیں۔ وہ دونوں بنوعبدالدار کی ایک عورت کی ملکیت میں تھیں۔ ابوبکر ؓ وہاں سے گزر رہے تھے کہ ان کی مالکہ نے نہدیہ اور اس کی بیٹی کو آٹا پیسنے کے لیے دیا اور کہا: "واللہ! میں تمھیں کبھی آزاد نہیں کروں گی۔"

ابوبکر ؓ نے کہا: "اے فلاں کی ماں! قسم توڑ دے اور اس کا کفارہ ادا کر دے۔"

وہ بولی: "تم نے ہی انھیں بگاڑا ہے اب تمھی انھیں آزاد بھی کراؤ۔"

ابوبکر ؓ نے کہا: "تو کتنے میں انھیں فروخت کرے گی؟"

اس نے کہا: "اتنی رقم میں۔"

ابوبکر ؓ نے فرمایا: "میں انھیں خرید کر آزاد کرتا ہوں" پھر نَہدیہ اور اس کی بیٹی سے کہا: "اس کا آٹا واپس کر دو۔"

انھوں نے کہا: "اے ابوبکر! ابھی واپس کر دیں یا کام پورا کر کے؟" فرمایا "جیسے تم چاہو۔"[2]

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اسلام نے ابوبکر صدیق ؓ اور دونوں لونڈیوں کے درمیان کس قدر مساوات قائم کر دی یہاں تک کہ انھوں نے ابوبکر ؓ سے غلام اور آقا کے انداز کے بجائے برابری کی سطح پر گفتگو کی۔ ابوبکر ؓ نے اپنے مقام ومرتبہ اور جاہلیت اور اسلام میں بزرگی پانے کے باوجود ان کے اس لہجے کو بسر وچشم قبول فرمایا باوجود یکہ ابوبکر ؓ کا ان پر احسان تھا کہ انھوں نے ان دونوں کو آزادی دلائی۔ لونڈیوں نے اس وقت اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا جب انھوں نے آٹا پیس کر واپس کرنے کی بات کی۔[3]

ابوبکر ؓ قبیلہ عدی بن کعب کی شاخ بنومُؤمَّل کی ایک لونڈی کے پاس سے گزرے جو مسلمان تھی اور عمر بن خطاب ؓ اسے تکلیفیں دے رہے تھے کہ وہ اسلام چھوڑ دے۔ یہ

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام:1/393. [2] السيرة النبوية لابن هشام:1/393. [3] السيرة النبوية لأبي شهبة:1/346.

عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام سے پیشتر کا واقعہ ہے۔ وہ اسے مارتے مارتے تھک گئے اور کہا: ”میں صرف اس لیے رک گیا ہوں کہ تھک چکا ہوں۔“ لونڈی نے کہا: ”اللہ تم سے بھی ایسا ہی سلوک کرے۔“ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس لونڈی کو بھی خرید کر آزاد کر دیا۔[1]

یہ تھا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اعلیٰ کردار۔ وہ آزادیوں کے سفیر، غلاموں کو آزاد کرنے والے اور اسلام کی باوقار شخصیت تھے جو اپنی قوم میں مشہور تھے کہ وہ مفلسوں کی خبر گیری کرتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں، قرضداروں کے بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں اور راہ حق میں پہنچنے والے مصائب و آلام میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ وہ جاہلی دور میں بھی کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے۔ انسانوں سے الفت رکھنے والے اور پسندیدہ شخصیت کے مالک تھے، ان کا دل کمزور اور غلاموں کے لیے نرم اور شفیق تھا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اللہ کے لیے اور اللہ کے راستے میں غلاموں کی خریداری اور ان کی آزادی پر بہت سا مال خرچ کیا، حالانکہ ابھی آزادی دلانے اور اس پر عظیم اجر وثواب والے احکامات بھی نازل نہ ہوئے تھے۔[2]

مکی معاشرے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے افراد خال خال ہی پائے جاتے تھے جنھوں نے اپنا سارا مال کمزور طبقے کے مسلمانوں کے لیے خرچ کر دیا۔ ان کی نظر میں تمام کمزور افراد اس نئے دین کی رو سے ان کے بھائی تھے اور اس کرۂ ارض پر بسنے والے تمام مشرک اور سرکش انسان مل کر بھی ایک کمزور مسلمان کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے تھے۔ ایسے ہی افراد کی بدولت توحید پر مبنی اسلامی ریاست قائم ہو سکی اور اسلامی تہذیب پھل پھول سکی تھی۔[3]

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ ان کی تعریف ہو اور نہ وہ کسی دنیاوی مفاد یا مرتبے کے خواہش مند تھے۔ وہ تو صرف اللہ ذوالجلال والاکرام کی رضاجوئی کے خواہاں تھے۔ ایک دن ان کے والد نے کہا تھا: ”اے میرے پیارے بیٹے! میرا خیال ہے کہ تو

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 393/1. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 345/1. [3] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 347/1.

کمزور افراد کو آزادی دلاتا ہے۔ اگر تو نے آزادی دلانی ہے تو مضبوط اور طاقتور افراد کو آزادی دلا جو تیرے مددگار بن سکیں اور تیرا دفاع کریں؟“ اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اے میرے ابا جان! میں تو یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہوں۔“

یوں اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں قرآنی آیات نازل فرمائیں جو قیامت تک پڑھی جاتی رہیں گی۔[1]

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ۝ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ۝ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۝ لَا يَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقَى ۝ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝﴾

”پھر جس نے (اللہ کی راہ میں) دیا اور ڈرتا رہا اور اس نے نیک بات کی تصدیق کی تو یقیناً اسے عنقریب ہم آسان (راہ) کی توفیق دیں گے اور لیکن جس نے کنجوسی کی اور پروا نہ کی اور اس نے نیک بات کو جھٹلایا تو اسے عنقریب ہم تنگی کی (راہ کی) سہولت دیں گے اور جب وہ (دوزخ میں) گرے گا تو اسے اس کا مال کوئی فائدہ نہ دے گا، بے شک ہدایت دینا ہمارے ہی ذمے ہے اور بے شک آخرت اور دنیا ہمارے ہی اختیار میں ہے، بالآخر میں نے تمھیں بھڑکتی آگ سے ڈرا دیا ہے، اس میں بڑا بدبخت ہی داخل ہوگا، جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا اور بڑا متقی اس سے ضرور دور رکھا جائے گا، جو پاک ہونے کے لیے اپنا مال دیتا ہے اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں جس کا بدلہ اسے دیا جائے مگر صرف اپنے

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 319/1، و تفسير الآلوسي: 152/30.

رب برتر کا چہرہ (یعنی رضا) چاہتے ہوئے (مال خرچ کرتا ہے) اور یقیناً وہ (اللہ) جلد اس سے راضی ہوگا۔“[1]

اسلامی کارواں کے اس ہراول دستے کا آپس میں ایک دوسرے کا خیال رکھنا خیر خواہی، بھلائی اور مال خرچ کرنے کی یہ عظیم داستان ہے۔ یہی آزاد کردہ غلام عقیدۂ توحید اور نظریۂ اسلام کے عظیم سپوت بنے۔ وہ اسی نظریے کے بارے میں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے، اسی کے دفاع کی فکر کرتے اور اسی نظریے پر جہاد کرتے تھے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غلاموں کو خریدنا اور آزاد کرنا اس دین کی عظمت اور اس عظمت کے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دل میں راسخ ہونے کا بین ثبوت ہے۔ آج بھی اہل اسلام کو ایسی مثالیں قائم کرنے اور اپنے بلند جذبات و احساسات کو بیدار رکھنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ امتِ اسلامیہ دشمنان اسلام کی طرف سے عقیدۂ توحید کو نیست و نابود کرنے کی منظّم کوششوں کے مقابلے میں باہمی تعاون اور ربط ضبط کے ساتھ ایک دوسرے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوں۔

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما اور ان کے والدین کی آزمائش

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے والد یاسر رضی اللہ عنہ یمنی قبیلہ بنوعَنس کے ایک فرد تھے جو یمن سے مکہ آئے تھے۔ وہ اور ان کے دو بھائی حارث اور مالک اپنے ایک بھائی کی تلاش میں مکہ آئے تھے۔ مالک اور حارث تو واپس یمن چلے گئے لیکن یاسر مکہ میں ٹھہر گئے اور انھوں نے ابوحذیفہ بن مغیرہ مخزومی سے عہد و پیمان کر لیا۔[2]

ابوحذیفہ نے یاسر کی شادی اپنی ایک کنیز سُمَیّہ بنت خَبّاط سے کردی جن کے بطن سے عمار پیدا ہوئے، جنھیں ابوحذیفہ نے آزاد کردیا اور ابوحذیفہ کچھ ہی دنوں کے بعد فوت ہوگیا، پھر جیسے ہی اسلام کا ظہور ہوا، یاسر، سمیہ، عمار اور اس کا بھائی عبداللہ بن یاسر سب مسلمان ہوگئے۔ ان کے اسلام لانے پر ان کے موالی بنومخزوم سخت ناراض ہوئے اور ان

---

[1] اللیل 92:5-21۔ [2] أنساب الأشراف للبلاذري: 1/100 و 157۔

پر مصائب کے پہاڑ توڑ دیے۔ وہ انھیں سخت دوپہر کے وقت مکہ کی تپتی زمین پر لٹاتے[1] اور ان کے پہلو بدل بدل کر اذیت دیتے۔[2]

نبی ﷺ اس حالت میں ان کے قریب سے گزرتے تو فرماتے: «صَبْرًا آلَ يَاسِرٍ! فَإِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةُ» ''اے آل یاسر! صبر کرو۔ بلاشبہ تمھارا مقام جنت ہے۔''[3]

ایک روز ابوجہل سمیہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا اور بولا: ''تو محمد پر صرف اس لیے ایمان لائی ہے کہ تو اس کے جمال پر فریفتہ ہوگئی ہے۔'' یہ سن کر سمیہ رضی اللہ عنہا نے اسے سخت جواب دیا تو اس نے سمیہ رضی اللہ عنہا کی اندام نہانی میں نیزہ مار کر انھیں قتل کر دیا۔ سمیہ رضی اللہ عنہا عورتوں میں پہلی شہید ہیں۔[4]

سمیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے کردار سے ایسی اعلیٰ اور گرانقدر شجاعت کی داستان رقم کی جو کسی اور عورت کے حصے میں نہیں آئی۔ اس میں رہتی دنیا تک آنے والی ہر عورت کے لیے دعوت ہے کہ وہ ان کے نقش قدم پر چلے اور اس کا دل بے ساختہ ان کی پیروی کی طرف مائل ہو۔ سمیہ بنت خباط کی شہادت کے بعد ہر مسلمان عورت پر لازم ہے کہ وہ جان کا نذرانہ پیش کرنے سے پیچھے نہ ہٹے۔[5]

عثمان رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ روایت میں ہے: ''میں نبی ﷺ کے ساتھ بطحا میں چلا جا رہا تھا اور نبی ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا یہاں تک کہ آپ ﷺ آل یاسر کے پاس پہنچے۔ ابوعمار رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! کیا ہم پر وقت ایسا ہی رہے گا؟'' نبی ﷺ نے فرمایا: «اِصْبِرْ» ''تم صبر سے کام لو۔'' پھر فرمایا: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِآلِ يَاسِرٍ وَّقَدْ فَعَلْتَ» ''اے اللہ! آل یاسر کو معاف فرما دے اور یقیناً تو ہی بخشنے والا ہے۔''[6]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 68/2.

[2] بهجة المحافل للعامري: 92/1.

[3] المستدرك للحاكم: 383/3، والحلية الأولياء لأبي نعيم: 140/1، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 98,97.

[4] محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 99.

[5] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 217/1.

[6] مسند أحمد: 62/1، و صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 98، اس حدیث کی سند منقطع ہونے کی بنا پر ضعیف ہے۔

پھر چند ہی دنوں کے بعد یاسر رضی اللہ عنہ ظلم سہتے سہتے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

نبی ﷺ کے پاس اس وقت آل یاسر کو حوصلہ دینے کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ وہ غلام تھے کہ انھیں خرید کر آزاد کر دیا جاتا اور نہ ہی نبی ﷺ کے پاس اتنی قوت تھی کہ آپ انھیں ظلم و تکالیف سے نجات دلا سکیں۔ آپ ﷺ اس وقت صرف مغفرت اور جنت کی بھرپور خوشخبری سنا سکتے تھے اور صبر کی تلقین کر سکتے تھے تاکہ یہ مبارک خاندان آنے والی نسلوں کے لیے اسوہ بن جائے اور وہ اس نعرے کے ساتھ تاریخ کا حصہ بن جائیں:

”آل یاسر! صبر کرو۔ بلاشبہ تمھارا مقام جنت ہے۔“[1]

عمار رضی اللہ عنہ اپنے ماں باپ کے بعد ایک عرصہ کفار کی طرف سے مختلف عذاب سہتے رہے۔ ان کا شمار مکہ کے اس کمزور طبقے میں ہوتا ہے جن کا وہاں کوئی قبیلہ نہیں تھا جو ان کی حفاظت کرتا اور نہ خود ان کے پاس کوئی طاقت اور دفاعی صلاحیت تھی کہ وہ اپنے آپ کو بچاتے۔ قریش انھیں دوپہر کے وقت مکہ کی تپتی ریت پر لٹاتے تاکہ انھیں ان کے دین سے برگشتہ کیا جا سکے اور بسا اوقات عمار رضی اللہ عنہ کو بھی یہ احساس نہیں رہتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔[2]

ایک دفعہ مشرکین نے ان پر اتنا ظلم کیا کہ انھوں نے نبی ﷺ کو بھی برا بھلا کہہ دیا اور ان کے جھوٹے خداؤں کا بھی ذکر خیر کر دیا، پھر جب وہ نبی ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے پوچھا: ”معاملہ کیا ہے؟“ عمار رضی اللہ عنہ نے کہا: ”بہت برا ہے۔ واللہ، مجھے مشرکین نے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کہ میں نے آپ کی شان میں گستاخی نہیں کی اور ان کے جھوٹے خداؤں کی تعریف نہیں کی۔“ نبی ﷺ نے فرمایا: ”تیرے دل کی حالت کیسی تھی؟“ عمار رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”وہ تو ایمان پر مطمئن تھا۔“ نبی ﷺ نے فرمایا: ”اگر وہ پھر ایسا کریں تو تو بھی ایسا جواب دے دے۔“[3]

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 1/217،218. [2] محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 100. [3] المستدرك للحاكم: 2/357، و نصب الراية للزيلعي: 4/158، و فقه السيرة للغزالي، ص: 103.

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عمارؓ کے ایمان کی سچائی پر گواہی نازل ہوئی:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○﴾

”جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ سے کفر کرے، سوائے اس کے جس پر جبر کیا گیا اور اس کا دل ایمان پر مطمئن تھا لیکن جس نے کفر کے لیے (اپنا) سینہ کھول دیا (راضی خوشی کفر کیا) تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔“[1]

عمارؓ نبی ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔[2]

بلال اور عمارؓ کے واقعات میں عزیمت اور رخصت دونوں کا ثبوت ملتا ہے۔ داعیوں کو چاہیے کہ وہ ان واقعات کا بالاستیعاب مطالعہ کریں اور ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھیں اور افراط و تفریط کے بغیر ان کا باریک فرق قائم رکھیں۔

سعد بن ابی وقاصؓ کی آزمائش

سعدؓ اپنی والدہ کی طرف سے آزمائش میں مبتلا ہوئے جو کھانے اور پینے سے اس لیے رک گئی تھی کہ سعد اپنے دین سے برگشتہ ہو جائے۔ امام طبرانی سعدؓ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ میرے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، اللہ نے فرمایا:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ط﴾

”اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہرائے جس کا تجھے علم نہیں تو ان دونوں کی اطاعت نہ کرنا۔“[3]

سعدؓ فرماتے ہیں: ”میں اپنی والدہ کا فرمانبردار بیٹا تھا۔ جب میں دائرہ اسلام میں

---

[1] النحل 106:6. [2] فقه السيرة للغزالي، ص: 103. [3] العنكبوت: 8:29.

داخل ہوگیا تو اس نے کہا: ”اے سعد! یہ کیسا دین ہے جسے تو نے اختیار کرلیا ہے۔ تجھے یہ دین ضرور چھوڑنا پڑے گا، ورنہ میں کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی اور اسی حالت میں مرجاؤں گی اور لوگ تجھے میرا نام لے کر عار دلائیں گے۔ کہا جائے گا یہ اپنی ماں کا قاتل ہے۔“ میں نے کہا: ”میری اماں جان! آپ ایسا قدم نہ اٹھائیں میں کسی صورت اپنا دین نہیں چھوڑ سکتا۔“

سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”میری ماں نے ایک دن اور ایک رات کچھ نہ کھایا اور وہ پریشان نظر آئی، پھر دوسرے دن اور رات بھی نہ کھایا تو زیادہ نڈھال ہوگئی اور جب تیسرے دن اور رات بھی نہ کھایا تو وہ بہت زیادہ نڈھال ہوگئی، پھر اس وقت میں نے کہا: ”اے اماں جان! آپ جانتی ہیں، واللہ! اگر آپ کی سو جانیں بھی ہوتیں اور ایک ایک کرکے سب ختم ہوجاتیں تو بھی میں اپنے اس پیارے دین کو نہ چھوڑتا۔ اب آپ کی مرضی ہے آپ کھانا کھائیں یا نہ کھائیں۔“ یہ سن کر اس نے کھانا شروع کردیا۔“[1]

سیدنا سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”ام سعد نے قسم اٹھائی تھی کہ وہ سعد سے کبھی کلام نہ کرے گی اور نہ کچھ کھائے پیے گی۔ جب تک کہ وہ اپنے دین کا انکار نہ کردے۔ اس نے سعد رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ”تو سمجھتا ہے کہ اللہ نے تجھے اپنے والدین کے بارے میں نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور میں تیری ماں ہوں اور میں تجھے یہ دین چھوڑنے کا حکم دیتی ہوں۔“

سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تین دن کے بعد وہ نڈھال ہوکر بے ہوش ہوگئی، اس کے ایک اور بیٹے عمارہ نے بڑھ کر اسے پانی پلایا۔ وہ سعد رضی اللہ عنہ کو بددعا دینے لگی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ○﴾

”اور ہم نے انسان کو اپنے والدین سے نیک سلوک کرنے کی وصیت کی اور اگر وہ

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1748، وتفسیر ابن کثیر: 3/446.

دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہرائے جس کا تجھے علم نہیں تو ان دونوں کی اطاعت نہ کرنا، میری ہی طرف تمھیں لوٹ کر آنا ہے، پھر میں تمھیں بتاؤں گا جو کچھ تم عمل کرتے تھے۔‘‘ [1]

اور والدین کے بارے میں فرمان باری ہے:

﴿وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ز﴾

’’اور دنیا میں بھلے طریقے سے ان دونوں سے اچھا سلوک کر۔‘‘ [2]

سعد رضی اللہ عنہ مزید فرماتے ہیں: ’’لوگ جب اسے کھانا کھلاتے تو اس کا منہ ایک چھڑی کی مدد سے کھولتے، پھر اس میں کھانا ڈالتے۔‘‘ [3]

سعد رضی اللہ عنہ کی آزمائش بڑی سخت اور ان کا کردار منفرد تھا جو ان کے ایمانی جوش کا پتہ دیتا ہے کہ نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو، وہ کسی صورت اپنے ایمان پر سودے بازی نہیں کریں گے۔ [4]

مکی دور میں نازل ہونے والی آیات مبارکہ میں اگرچہ ایک مسلم اور اس کے کافر قرابتداروں کے درمیان محبت و تعاون اور دلی دوستی ناجائز قرار دی گئی ہے مگر کفار کے ساتھ صلہ رحمی، اچھے سلوک اور احسان کا درس دیا گیا ہے، جبکہ دلی دوستی ممنوع ہے کیونکہ دلی دوستی تو صرف اللہ، اس کے رسول، دین اور اہل ایمان کے ساتھ ہوتی ہے۔ [5]

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی آزمائش

مصعب بن عمیر نازونعم میں پلنے والے بہت خوش پوش نوجوان تھے۔ ان کے ماں باپ ان سے حد درجہ محبت کرتے تھے۔ ان کی ماں ایک مالدار خاتون تھیں جو انھیں باریک اور بہت عمدہ لباس پہناتیں۔ وہ مکہ کے سب سے زیادہ خوشبو لگانے والے اور حضرمی جوتا

---

[1] العنكبوت 8:29.
[2] لقمٰن 15:31.
[3] صحيح مسلم، حديث:(44)-1748 قبل الحديث: 2413. و جامع الترمذي، حديث: 3189.
[4] محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 106.
[5] الولاء و البراء لمحمد سعيد القحطاني، ص: 175,174.

پہننے والے تھے۔[1]

مصعب ؓ کی والدہ ان کا حد درجہ خیال رکھتی۔ وہ سوئے ہوتے تو وہ کھجور، پنیر اور گھی سے تیار کردہ حلوہ ایک برتن میں تیار رکھتی جیسے ہی مصعب نیند سے بیدار ہوتے تو وہ حلوہ کھاتے۔[2]

جب مصعب ؓ کو علم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ دار ارقم میں تشریف فرما ہیں اور اسلام کی دعوت دے رہے ہیں تو وہ وہاں پہنچے۔ دین حق کی تعلیمات سن کر مسلمان ہو گئے اور نبی ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی۔ انھوں نے اپنی ماں اور قوم کے ڈر سے اپنا اسلام مخفی رکھا لیکن مسلسل اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ ایک دن عثمان بن طلحہ نے انھیں نماز پڑھتے دیکھ لیا تو ان کی ماں اور قبیلے والوں کو خبر کر دی۔[3]

قبیلے والوں نے مُصعَب ؓ کو پکڑ کر قید میں ڈال دیا، وہ اسی حالت میں رہے حتی کہ موقع پا کر حبشہ کی طرف پہلی ہجرت میں شریک ہو گئے۔[4]

سیدنا سعد بن ابی وقاص ؓ فرماتے ہیں: ”میں نے مصعب بن عمیر ؓ کو دیکھا کہ وہ اسلام لانے کی وجہ سے سخت مصائب و مشکلات کا شکار رہے اور نڈھال ہو گئے تھے اور میں نے دیکھا ان کی جلد سانپ کی جلد کی طرح اڑی ہوئی تھی، پھر ہم انھیں پالان پر بٹھاتے تو بڑی مشکل سے بٹھا پاتے تھے۔[5]

نبی ﷺ جب بھی مصعب ؓ کا تذکرہ فرماتے تو کہتے:

«مَا رَأَيْتُ بِمَكَّةَ أَحَدًا أَحْسَنَ لِمَّةً وَّلَا أَرَقَّ حُلَّةً، وَّلَا أَنْعَمَ نِعْمَةً مِّنْ مُّصْعَبِ بْنِ عُمَيْرٍ»

---

[1] الطبقات الكبرى لابن سعد: 116/3. [2] الروض الأنف للسهيلي: 195/2. [3] سير أعلام النبلاء: 12-10/3. [4] محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 107. [5] السير و المغازي لابن إسحاق، ص: 193.

”میں نے مکہ میں عمدہ زلفوں، نرم و گداز لباس اور عمدہ ترین نعمتوں میں بسنے والا مصعب بن عمیر سے بڑھ کر کوئی نہیں دیکھا۔“ [1]

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ آزمائشیں اور مصائب جھیلنے، جسمانی کمزوری اور اپنوں کے ظلم کے باوجود صحابۂ کرام کے دوش بدوش بھلائی، فضیلت اور اللہ کے راستے میں جہاد جیسی عظمتوں کو حاصل کرتے رہے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں غزوۂ احد میں شہادت سے سرفراز فرمایا۔ [2]

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نعمتوں میں پلنے والے خوشحال نوجوانوں کے لیے اسلامی تربیت کا انمول اسوہ بنے۔ اسلام لانے کے بعد انھوں نے کمزوری اور سستی نہ دکھائی اور نہ انھیں نفسانی خواہشات دبا سکیں کہ وہ دھوکا دینے والی دنیا کے دوزخ میں جا گرتے۔ [3]

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے جب دین اسلام اختیار کر لیا تو اپنے ماضی کی ہر آسائش، لذت اور خوشگواری کو خیر باد کہہ دیا اور اسلام پر بیعت کر لی۔ راہ حق میں انھیں آزمائش کے راستے سے گزرنا پڑا تاکہ ان کا ایمان مضبوط اور یقین محکم ہو جائے۔

مصعب رضی اللہ عنہ اپنی زندگی سے انتہائی مطمئن اور خوش تھے، حالانکہ ان کے اردگرد مظالم اور خطرات منڈلا رہے تھے۔ ان پر فقر، تنگی اور ظلم وجور کا باب کھل چکا تھا اور وہ ہر قسم کی راحت اور فارغ البالی سے محروم ہو چکے تھے۔ [4]

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے فقر، مقام و مرتبہ سے محرومی، اہل خانہ، قریبی رشتہ داروں اور خاندان کی طرف سے مخالفت، بھوک، ظلم اور وطن سے دوری جیسی آزمائشوں کا مقابلہ کیا اور دین و ایمان کی بدولت کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ وہ دل کی گہرائیوں تک مطمئن اور پہاڑوں کی طرح مضبوط تھے۔ [5]

---

[1] المستدرك للحاكم: 221/3، امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کی سند کے متعلق سکوت اختیار کیا ہے۔ [2] محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 108. [3] مصعب بن عمير لمحمد حسن بريغش، ص: 105. [4] مصعب بن عمير لمحمد حسن بريغش، ص: 105-107. [5] مصعب بن عمير لمحمد حسن بريغش، ص: 126.

خَبَّاب بن اَرَتّ ؓ کا دور ابتلا

خباب ؓ لوہار تھے۔ مکہ میں رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ابتدا ہی میں انھیں ہدایت سے سرفراز فرما دیا تھا۔ وہ دارارقم (کے مرکز بننے) سے پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے۔[1]

وہ مکہ کے کمزور مسلمانوں میں سے تھے جنھیں ان کے دین سے برگشتہ کرنے کے لیے ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور یہ ظلم اس حد تک پہنچ گیا کہ مشرکین انھیں پشت کے بل گرم پتھر پر لٹا دیتے حتی کہ ان کی پیٹھ کی چربی پگھل گئی۔[2]

نبی ﷺ خَبَّاب سے محبت کرتے تھے اور ان کے مسلمان ہونے کے بعد ان کی خبر گیری کے لیے تشریف لے جاتے۔ جب خباب ؓ کی مالکہ ام انمار خزاعیہ کو ان کے اسلام لانے کی خبر ہوئی تو اس نے لوہے کا ایک ٹکڑا گرم کیا اور خباب ؓ کے سر پر رکھ دیا۔ خباب ؓ نے اس کی شکایت رسول اللہ ﷺ سے کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰھُمَّ انْصُرْ خَبَّابًا» ”اے اللہ! خباب کی مدد فرما۔“

اس کے بعد اُم اَنمار کے سر میں تکلیف ہوگئی اور وہ کتوں کے ساتھ بھونکتی۔ اس سے کہا گیا کہ اپنے سر پر داغ لگاؤ۔ وہ خباب ؓ کے پاس آئی اور داغ لگانے کو کہا۔ خباب ؓ نے وہی لوہے کا ٹکڑا لیا جسے وہ گرم کر کے خباب ؓ کو لگایا کرتی تھی، اسے گرم کیا اور اس کے سر پر لگایا۔ اس قصے میں صاحب بصیرت احباب کے لیے عبرت کا سامان ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد اللہ کے صابر و ایماندار بندوں کے کس قدر قریب ہے! دیکھیں کس طرح وہ خود بخود خباب ؓ کے پاس آئی کہ وہ اس کے سر پر گرم لوہے سے داغ لگائیں۔[3]

جب مشرکین کا کمزور مسلمانوں پر ظلم و تشدد انتہا کو پہنچ گیا اور انھیں سخت آزمائشوں کا

---

[1] سیر أعلام النبلاء: 479/2. [2] محنة المسلمین في العهد المکي للدکتور سلیمان السویکت، ص: 95. [3] أسد الغابة: 315/1، ومحنة المسلمین في العهد المکي للدکتور سلیمان السویکت، ص: 96.

سامنا کرنا پڑا تو خباب ؓ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت آپ ﷺ کعبۃ اللہ کے سایے میں اپنی چادر کا سرہانہ بنائے (لیٹے) ہوئے تھے، چنانچہ خباب ؓ نے عرض کیا: ”کیا آپ ہمارے لیے (اللہ کی) مدد طلب نہیں کریں گے؟ کیا آپ ہمارے حق میں دعا نہیں کریں گے؟“ نبی ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے، آپ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا کہ فرمایا:

«كَانَ الرَّجُلُ فِيمَنْ قَبْلَكُمْ يُحفَرُ لَهٗ فِي الْأَرْضِ، فَيُجْعَلُ فِيهِ، فَيُجَاءُ بِالْمِيشَارِ فَيُوضَعُ عَلٰى رَأْسِهٖ فَيُشَقُّ بِاثْنَتَيْنِ، وَمَا يَصُدُّهٗ ذٰلِكَ عَنْ دِينِهٖ، وَيُمْشَطُ بِأَمْشَاطِ الْحَدِيدِ مَادُونَ لَحْمِهٖ مِنْ عَظْمٍ أَوْ عَصَبٍ وَّمَا يَصُدُّهٗ ذَالِكَ عَنْ دِينِهٖ، وَاللّٰهِ! لَيَتِمَّنَّ هٰذَا الْأَمْرُ حَتّٰى يَسِيرَ الرَّاكِبُ مِنْ صَنْعَاءَ إِلٰى حَضْرَمَوْتَ لَا يَخَافُ إِلَّا اللّٰهَ أَوِ الذِّئْبَ عَلٰى غَنَمِهٖ وَلٰكِنَّكُمْ تَسْتَعْجِلُونَ»

”تم سے پہلے لوگوں کے ساتھ تو یہ ہوتا تھا کہ ایک آدمی کو لایا جاتا اس کے لیے زمین میں گڑھا کھودا جاتا۔ اسے اس میں ڈال کر آرا لایا جاتا اور اس کے سر پر رکھ کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا۔ یہ سارا ظلم اسے اس کے دین سے روک نہ سکا۔ اسی طرح لوہے کی کنگھیوں سے گوشت، ہڈیوں اور پٹھوں سے نوچ لیا جاتا، پھر بھی کسی کو اس کے دین سے روکا نہ جاسکا۔ اللہ کی قسم! یہ دین کا معاملہ ضرور مکمل ہوگا یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضرموت کا سفر اس طرح طے کرے گا کہ وہ صرف اللہ سے ڈرے گا یا صرف بھیڑیے سے کہ اس کی بکری نہ پھاڑ کھائے لیکن تم جلد بازی سے کام لے رہے ہو۔“[1]

دکتور سلمان عودہ حفظہ اللہ اس حدیث میں ایک باریک نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”سبحان اللہ! کیا وجہ تھی کہ مصطفیٰ ﷺ کا چہرہ سرخ ہوگیا، آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3612، ومسند أحمد: 5/109-111، وسنن أبي داود، حديث: 2649.

اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے پرزور اور مؤثر طریقے سے خطاب فرمایا، پھر ان کی جلد بازی پر سرزنش کی۔ کیا یہ سب اس لیے تھا کہ انھوں نے نبی ﷺ سے اللہ کے حضور مدد کی درخواست کے لیے کہا تھا؟ ہرگز نہیں! نبی ﷺ قطعاً سخت مزاج نہیں تھے۔ آپ تو اپنی امت کے لیے شفیق اور مہربان تھے۔ دراصل صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے سوالات کا یہ انداز کہ کیا آپ ہمارے لیے دعا نہیں کریں گے؟ کیا آپ ہمارے لیے مدد طلب نہیں کریں گے؟ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کے دل کی گہرائیوں سے اٹھے تھے کیونکہ ظلم وتشدد نے انھیں نڈھال کر دیا تھا اور مسلسل جدوجہد اور آزمائش نے انھیں کمزور اور خستہ حال کر دیا تھا۔ وہ جلد از جلد مشکلات سے چھٹکارا چاہتے تھے اور اللہ کی مدد کو دور خیال کرتے ہوئے دعا کے طلبگار ہوئے، جبکہ نبی ﷺ خوب جانتے تھے کہ ہر کام اپنے وقت پر ہونے والا ہے اور اس کے خاص اسباب ہیں اور مدد سے پہلے آزمائش شرط ہے۔ رسولوں کی پہلے آزمائش ہوتی ہے، پھر اچھا انجام ان کے لیے مقدر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿حَتّٰۤی اِذَا اسۡتَیۡـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوۡۤا اَنَّہُمۡ قَدۡ کُذِبُوۡا جَآءَہُمۡ نَصۡرُنَا ۙ فَنُجِّیَ مَنۡ نَّشَآءُ ؕ وَلَا یُرَدُّ بَاۡسُنَا عَنِ الۡقَوۡمِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ○﴾

”حتی کہ جب رسول مایوس ہوگئے اور وہ (لوگ) گمان کرنے لگے کہ انھیں خلاف واقعہ خبر دی گئی ہے تو ان (انبیاء ورسل) کے پاس ہماری مدد آ پہنچی، پھر نجات ملی اسے جسے ہم نے چاہا اور مجرم قوم سے ہمارا عذاب ٹالا نہیں جاتا۔“[1]

نبی ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات وواقعات کی طرف دیکھ کر اندازہ لگایا کہ وہ ظلم کی چکی میں پسنے کی وجہ سے تنگ آ چکے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ دین سے برگشتہ ہو جائیں اور ان پر کافر غالب آ جائیں اور ممکن ہے ان میں سے بعض ظلم کی تاب نہ لاتے ہوئے ہلاک ہو جائیں۔

---

[1] یوسف 110:12.

کسی بھی آدمی کے لیے یہ آسان نہیں کہ وہ صرف کتابوں سے پڑھ کر صحابہ کی حقیقتِ حال جان سکے کہ انھوں نے کن حالات میں دعا و مدد کی درخواست کی تھی یا پھر ان کے دل میں اٹھنے والے خیالات و احساسات کا اندازہ کر سکے۔ یہ صرف اس وقت ممکن ہے کہ وہ بھی ایسے حالات سے دوچار ہو اور انھی کی طرح اللہ کے راستے میں مصائب برداشت کرے۔

نبی ﷺ نے ان خطوط پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت فرمائی:

اللہ تعالیٰ کے راستے میں مصائب برداشت کرتے ہوئے سابقہ انبیاء اور رسولوں اور ان کے پیروکاروں کی اقتدا کرنا۔ نبی ﷺ اس سلسلے میں سابقہ انبیاء کے قصص بیان فرماتے تھے۔

اہل ایمان کے دلوں میں جنت میں تیار نعمتوں کی رغبت پیدا کرنا اور کافروں کو میسر دنیاوی زیب و زینت کے دھوکے میں نہ آنا۔

مستقبل پر نگاہ رکھنا کہ اللہ اسلام کو دنیا میں اپنی مدد سے نوازے گا اور اہل کفر اور نافرمانوں کو رسوا کرے گا۔

یہاں یہ بات بطور خاص قابل ذکر ہے کہ مذکورہ تمام روحانی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ نبی ﷺ مختلف قسم کے مادی ذرائع بھی بروئے کار لاتے اور اس سلسلے میں مکمل منصوبہ بندی فرماتے تاکہ آپ کے پیروکار ظلم و اذیت سے چھٹکارا پائیں اور مشرکین کے فتنوں سے محفوظ رہیں اور ایک ایسی ریاست قائم ہو جائے جس میں ہر مسلمان کو اپنی مرضی کے مطابق اپنے رب کی عبادت کے مواقع میسر ہوں اور دعوت الی اللہ کے راستے میں حائل تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں۔[1]

خباب رضی اللہ عنہ نے مشرکین کی طرف سے ملنے والی ایذاؤں، بدسلوکی اور حقوق چھیننے کا ذکر کیا۔ وہ یہ سب کچھ انھیں کفر کی طرف لوٹانے کے لیے کرتے تھے۔ خبّاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”میں ایک لوہار پیشہ آدمی تھا۔ میری عاص بن وائل کے ذمے کچھ رقم تھی۔ میں اس کے

---

[1] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص:146,145۔

پاس گیا تا کہ اپنی رقم وصول کر سکوں۔ اس نے کہا: ”میں تجھے اس وقت تک تیری رقم ادا نہیں کروں گا جب تک کہ تو محمد (ﷺ کی رسالت) کا کفر نہ کرے۔“ میں نے جواب دیا: ”تو مر کر دوبارہ بھی زندہ ہو جائے، پھر بھی میں کفر نہ کروں گا۔“ اس نے کہا: ”کیا مجھے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا؟ اگر اس طرح ہوگا تو سن لے! اس وقت مجھے میرا مال اور میری اولاد لوٹائی جائے گی اور میں تیری رقم واپس کر دوں گا۔“ عاص بن وائل کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ○ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ○ كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ○ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ○ ﴾

”پھر آپ اس شخص کے بارے میں بتلائیے جس نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا: مجھے ضرور مال اور اولاد دی جائے گی، کیا اس نے غیب کی اطلاع پا لی یا رحمٰن کے ہاں کوئی عہد لے لیا ہے؟ ہرگز نہیں! ہم ضرور لکھیں گے جو کچھ وہ کہتا ہے اور ہم اس کے لیے عذاب بہت بڑھا دیں گے اور ان چیزوں کے ہم وارث ہوں گے جو وہ کہتا ہے اور وہ ہمارے پاس اکیلا آئے گا۔“ [1]

کہا جاتا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں خباب رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں پہنچنے والی تکالیف کے متعلق سوال کیا تو خباب رضی اللہ عنہ نے اپنی پشت سے کپڑا اٹھایا جو پھلبہری کی طرح ہو چکی تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”تو نے اس دن جیسا سخت دن نہ دیکھا ہوگا۔“ خباب رضی اللہ عنہ بولے: ”اے امیر المومنین! انھوں نے میرے سامنے آگ جلائی، پھر مجھے اس میں جھونک دیا اور ایک آدمی نے اپنا پاؤں میرے سینے پر رکھا۔ آگ میری چربی سے بجھی اور زمین میری پشت کی وجہ سے ٹھنڈی ہوگئی۔“ [2]

---

[1] مریم 19:77-80 [2] الروض الأنف للسهيلي: 2/98.

عبداللہ بن مسعود ؓ کی آزمائش

تبلیغ کے لیے لوگوں سے میل جول میں نبی ﷺ کا طریقۂ کار حکیمانہ تھا۔ آپ بڑے لوگوں اور قبائلی سرداروں سے بڑی نرمی اور پیار سے گفتگو فرمایا کرتے تھے اور اسی طرح بچوں سے شفقت کے ساتھ پیش آتے۔ عبداللہ بن مسعود ؓ نبی ﷺ کے ساتھ ملاقات کا ایک عمدہ قصہ بیان فرماتے ہیں کہ میرے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ میں عُقبہ بن ابی معیط کا غلام تھا اور اس کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر ؓ میرے پاس آئے اور کہا: ''اے لڑکے! کیا تیرے پاس دودھ ہے؟ میں نے کہا، ہاں لیکن یہ تو میرے پاس امانت ہے۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: «هَلْ مِنْ شَاةٍ لَّمْ يَنْزُ عَلَيْهَا فَحْلٌ؟» ''کیا تیرے پاس ایسی بکری ہے جس سے نر نے جفتی نہ کی ہو؟'' میں ایسی بکری آپ ﷺ کے پاس لے آیا۔ آپ نے اس کے تھن پر ہاتھ پھیرا تو دودھ اتر آیا اور انھوں نے اسے ایک برتن میں دوہ لیا، پھر آپ ﷺ اور ابوبکر ؓ نے وہ دودھ پیا اور تھن سے کہا: «اِقْلِصْ» ''سکڑ جا۔'' تو وہ سکڑ گیا۔ عبداللہ بن مسعود ؓ فرماتے ہیں کہ پھر میں ان کے پاس آیا اور کہا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے بھی یہ مبارک کلام سکھا دیجیے۔'' آپ ﷺ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: «يَرْحَمُكَ اللّٰهُ، فَإِنَّكَ غُلَيِّمٌ مُّعَلَّمٌ» ''اللہ تجھ پر رحمت فرمائے۔ بلاشبہ تو چھوٹی سی عمر میں بڑا پڑھا لکھا بچہ ہے۔''[1]

اس طرح دو جملے عبداللہ بن مسعود ؓ کے اسلام لانے کا سبب بنے، پہلا وہ جو خود عبداللہ بن مسعود ؓ نے کہا: ''یہ میرے پاس امانت ہے۔'' اور دوسرا وہ جو نبی ﷺ صادق و مصدوق نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ تو چھوٹی سی عمر میں بڑا پڑھا لکھا بچہ ہے۔''

---

[1] مسند أحمد: 379/1 و 462، ومسند أبي يعلى، حديث: 4985، و مسند أبي داود الطيالسي، حديث: 353، وحلية الأولياء لأبي نعيم: 125/1، والبداية والنهاية: 32/3، وسير أعلام النبلاء: 465/1.

ان دو جملوں کا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زندگی میں بڑا عمل دخل تھا۔ بعد ازاں وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جید علمائے کرام کی صف میں شمار ہوئے۔ وہ اہل ایمان کے قافلے میں شامل ہوگئے اور اس بتکدے میں شرک کا قلع قمع کرتے نظر آنے لگے۔ وہ ان ابتدائی ایمان لانے والوں میں سے تھے جن کی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مدح سرائی فرمائی ہے۔[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں: ”وہ اسلام میں مسابقت کرنے والوں میں سے ایک تھے، ابتدائی دور ہی میں مسلمان ہوئے اور دونوں ہجرتیں کیں۔ بدر اور دیگر تمام غزوات میں شرکت کی، نبی ﷺ کے ساتھ ساتھ رہے اور وہ آپ کے نعلین مبارک اٹھانے والے تھے۔“[2]

سب سے پہلے بلند آواز سے قرآن مجید پڑھنے کی سعادت: باوجودیکہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کسی کے حلیف تھے، ان کا اپنا کوئی قبیلہ نہ تھا جو ان کی حفاظت کرتا اور وہ خود کمزور جسم اور باریک پنڈلیوں والے تھے، ان کی شجاعت اور قوت ارادی میں کوئی کمی نہ آئی۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے دعوتی سلسلے میں کارنامے قابل فخر ہیں۔ ان میں سے ایک کارنامہ وہ تھا جو مکہ میں دعوت اسلامی کے ظہور کے بعد پیش آیا اور قریش نے ان پر بہت ظلم کیا۔ وہ سرداران قریش کے پاس کھڑے ہوکر بلند آواز سے قرآن کی تلاوت کرنے لگے اور اس طرح انھوں نے ان کفار کے بند کانوں اور مُقفّل دلوں پر ضرب لگائی۔[3]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کے بعد مکہ میں سب سے پہلے بلند آواز سے قرآن کریم کی تلاوت کی۔ ہوا یوں کہ ایک دن سب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جمع تھے، انھوں نے کہا: ”واللہ! قریش نے آج تک بلند آواز سے قرآن نہیں سنا۔ کون ہے جو انھیں قرآن سنائے؟“ عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں: ”میں۔“ انھوں نے کہا: ”ہمیں آپ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے ہم تو ایسا آدمی چاہتے ہیں جس کا کوئی اپنا خاندان ہو۔ اگر قریش اس سے

---

[1] عبداللہ بن مسعود لعبد الستار الشیخ، ص: 43. [2] الإصابة: 214/6. [3] عبداللہ بن مسعود لعبد الستار الشیخ، ص: 45.

بدسلوکی کریں تو اس کا خاندان اس کا دفاع کر سکے۔“ عبداللہ بن مسعود ؓ نے کہا: ”آپ مجھے چھوڑ دیں۔ میری اللہ حفاظت فرمائے گا۔“ عبداللہ بن مسعود ؓ چاشت کے وقت مقام ابراہیم کے پاس پہنچے۔ قریشی اپنی مجلسوں میں بیٹھے تھے۔ عبداللہ بن مسعود ؓ نے مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہو کر تلاوت شروع کی اور بلند آواز سے کہا:

﴿اَلرَّحْمٰنُ ۙ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝﴾

”(اللہ) رحمٰن نے، قرآن سکھایا۔“[1]

پھر وہ کفار کی طرف بڑھے اور آیات پڑھتے چلے گئے۔ قریش نے ان کی آواز پر دھیان دیا اور کہنے لگے: ”یہ ابن ام عبد کیا کہہ رہا ہے؟“ پھر بولے: ”یہ تو اس کلام کی تلاوت کر رہا ہے جو محمد (ﷺ) لے کر آیا ہے۔“ وہ عبداللہ بن مسعود ؓ کی طرف بڑھے اور ان کے چہرے پر مارنا شروع کر دیا۔ عبداللہ بن مسعود ؓ مسلسل پڑھتے چلے گئے اور جتنا ممکن تھا پڑھا، پھر وہ صحابۂ کرام ؓ کے پاس واپس آئے تو ان کے چہرے پر زخموں کے نشانات تھے۔ صحابہ نے کہا: ”اس بات سے ہم ڈرتے تھے۔“ عبداللہ بن مسعود ؓ نے جواب دیا: ”اب مجھے اللہ کے دشمنوں کی کوئی پروا نہیں۔ اگر تم چاہو تو میں کل دوبارہ اسی طرح کر سکتا ہوں۔“ انھوں نے کہا: ”نہیں، بس اتنا ہی کافی ہے۔ آپ نے کفار کو وہ کلام سنا دیا ہے جو وہ سننا نہیں چاہتے۔“[2]

اس طرح عبداللہ بن مسعود ؓ وہ شخص تھے جنھوں نے نبی ﷺ کے بعد مکہ میں سب سے پہلے بلند آواز سے قرآن کی تلاوت کی اور بلاشبہ ان کا یہ کارنامہ قریش کے لیے ایک عملی چیلنج تھا جس کا جواب دینے کے وہ متحمل نہ ہو سکے۔ دیکھا جائے تو کفار کی طرف سے اذیت پانے کے باوجود یہ عبداللہ بن مسعود ؓ کی جرأت و دلیری کا بیّن ثبوت ہے۔[3]

---

[1] الرحمٰن 2,1:55. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 315,314/1، وأسد الغابة: 386,385/3. [3] محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 88.

خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کی آزمائش

خالد رضی اللہ عنہ ابتدائی زمانے ہی میں مسلمان ہوگئے تھے۔ انھوں نے نبی ﷺ کے ظہور کے وقت خواب دیکھا تھا کہ وہ آگ کے گڑھے پر ہیں اور وہاں ایک آدمی انھیں آگ میں پھینکنا چاہتا ہے اور نبی ﷺ انھیں بچانا چاہتے ہیں۔ وہ گھبرا کر نیند سے اٹھے اور یقین کرلیا کہ یہ خواب برحق ہے۔ انھوں نے یہ خواب جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سنایا تو انھوں نے ان سے فرمایا: ”میں تمھاری بھلائی کا ارادہ رکھتا ہوں یہاں اللہ کے رسول موجود ہیں۔ تم ان کی اتباع کرلو۔“ خالد وہاں پہنچے اور مسلمان ہوگئے۔ اپنے باپ سے ڈرتے ہوئے انھوں نے اپنا اسلام مخفی رکھا لیکن جب بکثرت گھر سے غائب رہنے لگے تو ان کے باپ کو علم ہوگیا، چنانچہ ایک روز اس نے اپنے دوسرے بیٹوں کو، جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے، بھیجا تاکہ خالد رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر لائیں۔ وہ انھیں لے کر آئے تو باپ نے انھیں ڈانٹا اور اس کے ہاتھ میں کوڑا یا لاٹھی جو بھی تھا اس سے اتنا مارا کہ لاٹھی ان کے سر پر ٹوٹ گئی، پھر انھیں مکہ میں قید کرلیا اور ان کے بھائیوں کو ان سے کلام کرنے سے منع کردیا اور ان کے عمل (قبول اسلام) سے بچنے کی تلقین کی، پھر اس نے خالد رضی اللہ عنہ کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی، انھیں بھوکا رکھا اور تین دن پانی نہ پینے دیا۔ لیکن خالد رضی اللہ عنہ نے صبر سے کام لیا اور اجر کی امید رکھی، پھر ان کے باپ نے کہا: ”واللہ! میں تیری خوراک بھی بند کردوں گا۔“ خالد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ”اگر آپ میری خوراک بند کردیں گے تو اللہ مجھے رزق عطا فرمائے گا جس سے میں زندہ رہوں گا۔“ آزادی پاتے ہی وہ نبی ﷺ کے پاس آگئے۔ وہ آپ ﷺ کی عزت کرتے تھے اور آپ کے ساتھ رہتے تھے، پھر جب مسلمان دوسری بار ہجرت کے لیے حبشہ جانے لگے تو انھوں نے ان کے ہمراہ ہجرت کی۔[1]

---

[1] سیر أعلام النبلاء: 260/1.

عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی آزمائش

جب عثمان رضی اللہ عنہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو ان کے قبیلے بنو جُمَح نے انھیں اذیتیں دیں۔ ان کا سب سے بڑا مخالف اور اذیتیں دینے والا امیہ بن خلف تھا، اسی لیے انھوں نے ہجرت حبشہ کے وقت امیہ بن خلف کو ڈانٹتے ہوئے یہ اشعار کہے تھے:

أَخْرَجْتَنِي مِنْ بَطْنِ مَكَّةَ آثِمًا وَّأَسْكَنْتَنِي فِي صَرْحِ بَيْضَاءَ تَقْذَعُ
تَرِيشُ نِبَالًا لَّا يُوَاتِيكَ رِيشُهَا وَتَبْرِي نِبَالًا رِّيشُهَا لَكَ أَجْمَعُ
وَحَارَبْتَ أَقْوَامًا كِرَامًا أَعِزَّةً وَأَهْلَكْتَ أَقْوَامًا بِهِمْ كُنْتَ تَفْزَعُ
سَتَعْلَمُ إِنْ نَّابَتْكَ يَوْمًا مُّلِمَّةٌ وَأَسْلَمَكَ الْأَوْبَاشُ مَا كُنْتَ تَصْنَعُ

”کیا تو نے گناہ کرتے ہوئے مجھے وادی مکہ سے نکال دیا اور مجھے سفید محل میں رہنے پر مجبور کر کے گالیاں بک رہا ہے۔ تو تیروں کو پر لگاتا ہے اور تجھے تیرا یہ عمل موافق نہ آئے گا۔ تو تیر بناتا ہے جس کے سارے پر تیرے لیے ہیں۔ تو نے ایسی قوم سے لڑائی مول لی ہے جو عزت دار ہیں اور ایسی قوم سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے جن کی طرف تو پناہ لیتا تھا۔ اگر تجھے کسی دن کوئی مصیبت آئے تو تجھے کمینے لوگ اسی طرح چھوڑ کر چلے جائیں جس طرح تو کیا کرتا ہے۔“[1]

عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کچھ دیر حبشہ مقیم رہے، پھر ان لوگوں کے ساتھ وہ بھی واپس مکہ آگئے جو پہلی ہجرت حبشہ کے بعد واپس لوٹ آئے تھے۔ مجبوراً وہ ولید بن مغیرہ کی پناہ لیے قلعے میں داخل ہوئے اور اس کی پناہ میں امن وسکون کے ساتھ رہنے لگے لیکن جب انھوں نے خود کو محفوظ اور نبی ﷺ اور آپ کے دیگر اصحاب کو آزمائش میں مبتلا دیکھا تو انھیں اچھا نہ لگا، چنانچہ انھوں نے کہا:

---

[1] السيرة النبوية للذهبي، ص: 112.

”واللہ! میری صبح و شام تو مشرک آدمی کی پناہ کی وجہ سے محفوظ ہو اور میرے دوسرے دینی بھائی آزمائش اور تکالیف میں مبتلا ہوں۔ یہ تو میرے لیے بڑے عیب کی بات ہے۔“[1]

عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ ولید بن مغیرہ کے پاس گئے اور کہا: ”اے ابوعبدشمس! تیرا ذمہ پورا ہوگیا۔ اب میں تیری پناہ واپس کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا: ”میرے بھتیجے! آخر کیوں؟“ تجھے کسی نے تکلیف دی ہے یا تیری عزت پامال کی ہے۔“ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ”نہیں، میں اب صرف اپنے اللہ کی پناہ پر راضی رہنا چاہتا ہوں اور اس کے سوا کسی کی پناہ میں نہیں آنا چاہتا۔“ اس پر ولید نے کہا: ”تو مسجد حرام میں جا اور لوگوں کے سامنے جس طرح میں نے تجھے پناہ میں لیا تھا، اس طرح میری پناہ واپس کردے۔“ دونوں مسجد حرام میں پہنچے اور عثمان رضی اللہ عنہ نے ولید کی پناہ لوٹا دی، پھر عثمان ایک قریشی مجلس میں پہنچے، وہاں شاعر لبید بن ربیعہ اپنے اشعار پڑھ کر سنا رہا تھا، لبید نے کہا:

«أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَّا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلُ»

”خبردار! اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔“ تو عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ”تو نے سچ بولا۔“ لبید شعر سناتا چلا گیا، اس نے کہا:

«وَكُلُّ نَعِيمٍ لَّا مَحَالَةَ زَائِلُ»

”اور ہر نعمت آخرکار ضرور ختم ہونے والی ہے۔“

عثمان رضی اللہ عنہ بولے: ”تو نے جھوٹ کہا، جنت کی نعمتیں کبھی ختم نہ ہوں گی۔“ لبید نے کہا: ”اے قریشیو! اس سے پہلے تو تمھارے ہاں مہمان کی اس طرح تذلیل نہیں ہوتی تھی؟“ ایک آدمی بولا: ”دراصل یہ ان ناسمجھ لوگوں میں سے ہے جنھوں نے ہمارے دین کو چھوڑ دیا ہے۔ آپ اس کی بات کا برا نہ مانیں۔“ لیکن عثمان رضی اللہ عنہ نے دوبارہ اپنی بات دہرائی

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 120/2.

اور معاملہ بگڑ گیا تو اسی آدمی نے بڑھ کر عثمان ؓ کو تھپڑ مارا جس سے ان کی آنکھ سوج گئی۔ ولید، عثمان ؓ کو قریب سے بیٹھا دیکھ رہا تھا، اس نے کہا: ”اے میرے بھتیجے! تیری یہ آنکھ اس چوٹ سے محفوظ تھی اور تو بلاشبہ ایک محفوظ پناہ گاہ میں تھا۔“ عثمان ؓ نے کہا: ”واللہ! میری دوسری آنکھ بھی اللہ کے راستے میں ایسی ہی تکلیف برداشت کرنے کی خواہش مند ہے۔ ابوعبدشمس! میں اس ذات کی پناہ میں ہوں جو تجھ سے زیادہ طاقتور اور قدرت رکھنے والا ہے۔“ ولید نے دوبارہ اپنی پناہ کی پیشکش کی جسے عثمان ؓ نے ٹھکرا دیا۔[1]

عثمان ؓ کے کردار سے ان کی ایمانی قوت، اجر حاصل کرنے کا شوق اور اللہ کے ہاں ان کے ثواب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، چنانچہ جب وہ انتقال کر گئے تو ام العلاء انصاریہ ؓ نے خواب میں دیکھا کہ عثمان ؓ کے لیے ایک چشمہ ہے جو زور شور سے بہہ رہا ہے۔ وہ نبی ﷺ کے پاس آئیں اور خواب بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «ذٰلِكَ عَمَلُهُ» ”یہ اس کے عمل کا صلہ ہے۔“

ام العلاء ؓ وہ خاتون ہیں کہ جب مہاجرین کو مدینہ میں قرعہ اندازی کے ذریعے پناہ گاہیں فراہم کی گئیں تو عثمان بن مظعون ؓ ان کے گھر ٹھہرے تھے۔[2]

علاوہ ازیں بہت سے دیگر صحابۂ کرام ؓ نے بھی اللہ کے راستے میں اذیتیں برداشت کیں اور بہت سے قریشی نوجوان جنھوں نے اپنے آباء و اجداد اور دیگر رشتہ داروں کے سخت رویے کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو بسروچشم قبول کیا، اس پر عمل کیا اور نبی ﷺ کے گرد جمع ہوگئے، انھوں نے اپنے متشدد آباء و اجداد اور عزیز و اقارب کے موقف کے برعکس اللہ سے اجروثواب کی امید پر اسلام لانے سے قبل دستیاب تمام سہولتوں کو خیر باد کہہ دیا اور آزمائش و ابتلا سے دوچار ہوئے اور اذیتیں برداشت کیں۔ جب ایمان دل کی گہرائیوں میں اتر جائے تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔ مومن ہر قسم کی سختی اور محرومی کو

---

[1] السیر و المغازي لابن إسحاق، ص: 178-180. [2] صحیح البخاري، حدیث: 7003,7004.

برداشت کر لیتا ہے خصوصاً جب اسے اللہ کی رضا اور جنت سامنے نظر آ رہی ہو۔

مردوں کے علاوہ بہت سی عورتوں نے بھی آزمائش و ابتلا کا دور دیکھا اور اسلام لانے کی وجہ سے معتوب ٹھہریں، جن میں سمیہ بنت خباط، فاطمہ بنت خطاب، بنو مومل کی کنیز لبیبہ، زنیرہ رومیہ، نہدیہ اور اس کی بیٹی، ام عُبَیْس اور حمامہ ام بلال وغیرہ شامل ہیں۔[1]

مکہ میں قتال سے اجتناب کی حکمت اور کردار سازی کا اہتمام

مسلمان اپنا دفاع کرنے کے حق میں تھے اور خود کو محفوظ کرنے کی سوچ نے بعض لوگوں کو غصہ بھی دلایا جن میں نوجوان طبقہ پیش پیش تھا۔ عبدالرحمٰن بن عوف اور ان کے دیگر ساتھی رضی اللہ عنہم مکہ میں نبی ﷺ کے پاس آئے اور کہا: ”اے اللہ کے نبی! جب ہم مشرک تھے تو طاقتور تھے اور جب ایمان لے آئے تو بے حیثیت بن گئے۔“ نبی ﷺ نے فرمایا: «إِنِّي أُمِرْتُ بِالْعَفْوِ، فَلَا تُقَاتِلُوا الْقَوْمَ» ”مجھے ابھی درگزر کرنے کا حکم ہے، اس لیے تم کسی سے مت الجھو۔“[2]

بعض سیرت نگاروں نے مکہ میں قتال فرض نہ ہونے کی حکمت بیان کی ہے جن میں استاذ سید قطب رحمہ اللہ بھی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: ”ہم یقین سے کوئی سبب یا علت بیان نہیں کر سکتے کیونکہ ایسا کرتے ہوئے ہم اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی مرضی سے ایسی حکمت منسوب کریں گے جو اس نے ہمیں نہیں بتائی اور ہم ایسے ایسے اسباب و علل بیان کر دیتے ہیں جو حقیقتاً اسباب و علل نہیں ہوتے اور کبھی اتفاقاً ہو بھی سکتے ہیں۔

مومن کی شان تو یہ ہونی چاہیے کہ وہ ہر حکم الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے کیونکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی علیم و خبیر ہے اور ہم تو صرف اپنے اجتہاد اور احتمال سے یہ اسباب و علل

---

[1] محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 117,116. [2] السنن الكبرٰى للنسائي: 3/6، والسنن الكبرٰى للبيهقي: 11/9، والمستدرك للحاكم: 2/67,66 و307، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 1/158.

بیان کر دیتے ہیں کیونکہ کسی بھی حکم کی علت تو صرف اللہ ہی جانتا ہے اور اس مالک نے کسی واضح نص کے ساتھ انھیں متعین نہیں کیا اور نہ ہمیں اس سے مطلع کیا ہے۔“[1]

مکی دور میں قتال کی عدم فرضیت کے مندرجہ ذیل اسباب ہو سکتے ہیں:

① ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ مکی دور مخصوص حالات میں ایک خاص قوم کی تربیت اور تیاری کا دور تھا۔ اس لیے اس میں ظلم پر صبر کرنے کی تلقین کی گئی کیونکہ عام عرب معاشرے میں صبر نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ اس لیے تھا کہ تربیت حاصل کرنے والے شخص کی ذات دنیاوی اغراض سے پاک ہو جائے اور وہ کسی بھی جذبات ابھارنے والے عامل کو خاطر میں نہ لائے اور اس کی طبیعت اور معمولات میں اعتدال پیدا ہو جائے۔

عرب معاشرے میں صبر و تحمل کی تربیت کے ساتھ یہ بھی مقصود تھا کہ لوگ نئی قیادت کے احکامات کو تسلیم کرتے ہوئے ایک نئے معاشرے کے قیام کی طرف بڑھیں اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ نسل در نسل چلی آنے والی عادات و اطوار کو چھوڑ کر اس نئی قیادت کی پیروی کریں اور ایک مسلم تشخص کی ساخت اور نشو ونما کے لیے یہی تربیت سنگِ میل ثابت ہوئی۔

② مکی دور میں قتال کی عدم فرضیت کا سبب یہ بھی تھا کہ قریشی معاشرے میں ایک پر امن دعوت انتہائی موثر اور کامیاب ہو سکتی تھی کیونکہ وہ معاشرہ اکھڑ مزاج اور خود نمائی کا حامل تھا۔ ایسے حالات میں قتال کا حکم آپس میں مزید عناد اور سرکشی کا سبب بن جاتا، جاہلی جنگوں، داحس وغبراء اور بسوس کی طرز پر ایک نئی خونی جنگ کا آغاز ہو جاتا اور لوگ اسلام کے بنیادی نظریے کو بھول کر جدال اور قتال میں مصروف نظر آتے۔

③ مکی دور میں قتال کا حکم ہر گھر میں کشاکش اور معرکہ آرائی کا سبب بھی بن سکتا تھا کیونکہ وہاں کوئی منظّم ریاست نہیں تھی جو اسلامیان مکہ کو اذیتیں پہنچاتی تھی بلکہ جب کوئی فرد مسلمان ہو جاتا تو اس کے عزیز و اقارب ہی تھے جو اس پر ظلم کے پہاڑ توڑتے تھے، لہٰذا

---

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 714/2.

حکم قتال ملنے پر ہر گھر میں قتل وخون کا دور دورہ ہوتا۔

اس صورت میں قریش کو اسلام کے خلاف منظّم پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا۔ فی الحال تو وہ حج کے موسم میں یہ کہتے تھے کہ اے لوگو! محمد اپنی قوم اور خاندان کے علاوہ باپ بیٹے کے درمیان جدائی ڈال دیتا ہے اور اگر قتال فرض ہوتا تو وہ کہتے کہ محمد بیٹے کو باپ اور باپ کو بیٹے کے قتل کرنے کا حکم دیتا ہے۔

④ عدم قتال کا حکم اس لیے بھی تھا کہ آغاز میں جو لوگ اسلام کے سخت مخالف تھے اور مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے کے لیے اذیتیں دیتے اور آزمائشوں میں ڈالتے تھے، ہوسکتا ہے بعد میں وہ نہ صرف اسلام کے مخلص پیروکار بلکہ رہنما اور کمانڈر بن جاتے اور عمر بن خطاب ؓ اور خالد بن ولید ؓ ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

⑤ مکی دور میں عدم قتال کا حکم اس لیے بھی تھا کہ عرب معاشرہ اگرچہ قبائلی نظام میں جکڑا ہوا تھا اور ہر فرد اپنے قبیلے کی وجہ سے تکبر ونخوت کا شکار تھا لیکن ان کی عادت تھی کہ کسی بھی اذیتیں برداشت کرنے والے کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو ان میں انتہائی باعزت خیال کیے جاتے تھے۔ جیسا کہ سیدنا ابوبکر ؓ جو ایک کریم النفس انسان تھے، ان کی مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت اور جلا وطنی پر ابن دَغِنَہ راضی نہ ہوا۔ اسے وہ اہل عرب کے لیے باعثِ عار سمجھتا تھا، چنانچہ اس نے ابوبکر ؓ کو اپنی پناہ اور حمایت دی۔ اس قسم کے بہت سے واقعات رونما ہوئے جن میں آخری واقعہ شعب ابی طالب میں بنو ہاشم کے مقاطعے کے بارے میں لکھے جانے والے صحیفے کا چاک کیا جانا تھا۔

⑥ یہ حکم اس لیے بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد تھوڑی تھی اور وہ مکہ ہی میں محصور تھے۔ اسلام کی دعوت ابھی جزیرہ نمائے عرب کے باقی قبائل تک پہنچی ہی نہ تھی یا پہنچی تھی تو غیر منظّم حالت میں پہنچی تھی اور قبائل عرب قریش اور اس نئی دعوت کے علمبرداروں کے درمیان جاری معرکے کو دیکھ رہے تھے تاکہ وہ اس کا انجام دیکھ کر کوئی رائے قائم کر

سکیں۔ اگر مکی دور میں قتال فرض ہو جاتا تو بالفرض مسلمان جو قلیل تعداد میں تھے، اپنے سے کہیں زیادہ افراد کو قتل کر ڈالتے لیکن وہ خود بھی تہ تیغ ہو جاتے، شرک باقی رہ جاتا اور اللہ کی اس زمین پر اسلامی نظام ختم ہو جاتا اور اس دین کا کوئی تشخص قائم نہ ہو پاتا، حالانکہ یہ دین تو سب لوگوں کی دنیا و آخرت بہتر بنانے کے لیے آیا ہے۔

⑦ عدم قتال کا حکم اس لیے بھی تھا کہ اس وقت مذکورہ بالا اسباب کو نظر انداز کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں کودنے اور تشدد کے مقابلے میں اجتماعی دفاع کرنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس وقت اسلامی دعوت کو جو بنیادی معاملہ درپیش تھا وہ خود اس دعوت کا وجود برقرار رکھنا تھا جو کہ اس کے محرک محمد ﷺ کی شخصیت پر منحصر تھا جن کی حمایت میں بنو ہاشم کی تلواریں تھیں۔ آپ ﷺ کے خلاف اٹھنے والے ہاتھ کو یہ ڈر ہوتا تھا کہ وہ کاٹ دیا جائے گا، اس لیے آپ ﷺ کعبے کے ارد گرد آراستہ قریش کی مجلسوں میں علانیہ اپنا موقف بیان فرماتے تھے۔ آپ ﷺ نے صفا پہاڑی پر اور دیگر عمومی اجتماعات میں بھی اپنی دعوت پیش کی اور کسی نے بھی آپ ﷺ کے خلاف کوئی بڑا یا انتہائی اقدام نہ کیا۔ وہ آپ ﷺ کو قید یا قتل نہ کر سکے حتی کہ آپ کی بات سرعام رد کرنے کی بھی ہمت نہ پا سکے۔

مندرجہ بالا اسباب ہی کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی حکمت عالیہ متقاضی ہوئی کہ مسلمانوں کو عدم قتال کے ساتھ ساتھ نماز قائم کرنے اور زکاۃ ادا کرنے کا حکم دیا جائے تاکہ ان کی تربیت ہو سکے اور وہ آنے والے حالات کا مقابلہ کر سکیں، نیز اپنی قیادت کی طرف سے مناسب وقت پر حکم کے منتظر رہیں، تمام مسائل و مشکلات سے نبٹ سکیں اور ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر خالص اللہ کے راستے میں اپنی کاوشوں کو بروئے کار لائیں۔[1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم سے مصالح اور مفاسد کی سوجھ بوجھ حاصل کی اور پیش آمدہ حالات میں اسے استعمال کرنے کا گُر بھی سیکھا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] الولاء والبراء لمحمد سعيد القحطاني، ص: 169-171، وتفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 714/2.

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۠ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾

’’اور مشرکین اللہ کو چھوڑ کر جنھیں پکارتے ہیں، تم انھیں گالی مت دو، پھر وہ بھی جہالت میں، حد سے گزرتے ہوئے اللہ کو گالی دیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر امت کے لیے ان کے عمل میں کشش پیدا کر دی ہے، پھر انھیں اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ انھیں بتائے گا کہ وہ کیا کچھ کرتے رہتے تھے۔‘‘[1]

اسی طرح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ بھی جان لیا کہ کوئی مصلحت اختیار کرنے سے کسی بڑے فساد کا خطرہ ہو تو اسے ترک کر دینا چاہیے۔[2] قرآن کریم کے اس حکم میں اخلاقی شائستگی اور ایمان کی بلندی اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ حقائق سے بے خبر اور اللہ کی معرفت و تقدیس سے بے بہرہ افراد سے کنارہ کش ہونے کا سبق دیا گیا ہے۔

علمائے کرام کہتے ہیں کہ یہ حکم تا حال باقی ہے۔ آج بھی اگر کوئی کافر اپنے کسی محفوظ علاقے میں ہو۔ اسلام اور مسلمانوں کے تابع نہ ہو اور یہ ڈر ہو کہ اگر اس کی صلیب، دین اور گرجے کو برا کہا جائے تو وہ اسلام، اللہ کے رسول یا اللہ تعالیٰ کے بارے میں نازیبا الفاظ کہے گا تو اسے برا بھلا کہنا ناجائز ہوگا۔ اور نہ کوئی ایسا رویہ اختیار کیا جائے جو اس کی دشنام طرازی کا سبب بنے کیونکہ یہ فعل بھی مخالف کو گناہ پر ابھارنے کے مترادف ہوگا۔ یہ مصالحت کی ایک قسم اور اس بات کی دلیل ہے کہ برائی کا راستہ روکنے کے لیے ہر ممکن ذریعے کا استعمال ضروری ہے۔[3]

تیرہ سالہ مکی دور جو افراد کی تربیت، تیاری اور دلوں میں لا الٰہ الا اللہ کی جوت جگانے میں گزرا، اگر کوئی اس پر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ صبر کے ساتھ وقت گزارنے کے طرزِ فکر

---

[1] الأنعام 108:6. [2] التفسير المنير للدكتور وهبة الزحيلي: 325/7. [3] التفسير المنير للدكتور وهبة الزحيلي: 326/7.

کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ پہلے عقیدۂ توحید کا بیج دلوں میں بونے اور پھر اس کی نگہبانی، پختگی اور اس پر مداومت کی ضرورت ہوتی ہے، اس میں کسی قسم کی جلد بازی اور ہنگامہ آرائی درکار نہیں ہوتی۔ اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کو آج اشد ضرورت ہے کہ وہ نبی ﷺ کی اپنے اصحاب کو ''طویل وقفۂ انتظار'' کے نظریے پر تربیت دینے کی سنت کو اپنائیں۔ اس سے نصیحت اور عملی نمونہ حاصل کریں کیونکہ جاہلیت چاہے قدیم ہو یا جدید یا کسی بھی آنے والے دور کی ہو، اس کے مقابلے میں وہی افراد ثابت قدم رہتے ہیں جن کے دلوں میں اس عقیدۂ ربانیہ کی تروتازگی رچ بس گئی ہو اور توحید کے درخت کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہوں۔[1]

نبی ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ضبط نفس اور صبر سے بہرہ ور ہونے کا درس دیتے، ان کی اپنی آنکھوں کے سامنے تربیت فرماتے اور انھیں اللہ سے تعلق جوڑنے اور عبادت کے ذریعے اس کا قرب حاصل کرنے کا حکم دیتے جیسا کہ مکی دور میں سورۂ مزمل نازل ہوئی۔ ارشاد ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ○ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ○ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ○
اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ○ ﴾

''اے چادر میں لپٹنے والے! رات میں قیام کیجیے مگر تھوڑا سا، (یعنی) رات کا نصف، یا اس سے تھوڑا سا کم کیجیے، یا اس پر (کچھ) زیادہ کیجیے اور قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے۔''[2]

سورۂ مزمل نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سبق دیا کہ داعیوں کو تہجد گزار، ہمیشہ اللہ کا ذکر کرنے والے، تمام امور میں اللہ پر بھروسا کرنے والے اور صابر ہونا چاہیے۔ کفار سے اچھی طرح کنارہ کشی اختیار کرنی چاہیے اور نیک اعمال کے ساتھ ساتھ اللہ سے بخشش طلب کرنا بھی ضروری ہے۔

---

[1] الولاء والبراء لمحمد سعيد القحطاني، ص: 171. [2] المزمل 73:1-4.

سورۂ مزمل کی ابتدائی آیات میں نبی ﷺ کو رات کا ایک حصہ نماز کے لیے مختص کرنے کا حکم ہے اور انھیں اختیار دیا گیا کہ وہ آدھی رات تک اس سے کچھ کم یا زیادہ قیام کر سکتے ہیں۔ نبی ﷺ اور صحابۂ کرام نے تقریباً ایک سال رات کا قیام کیا حتی کہ ان کے پاؤں سوج گئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے دیکھ لیا کہ وہ اس کی رضا کے حصول اور اس کے ہر حکم اور خواہش کی تکمیل کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں تو رحمت و شفقت فرماتے ہوئے ان کے لیے تخفیف فرما دی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۚ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ۚ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۚ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۚ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۚ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۖ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○﴾

”یقیناً آپ کے رب کو علم ہے کہ آپ قریباً دو تہائی رات یا نصف رات یا ایک تہائی رات قیام کرتے ہیں اور آپ کے ساتھیوں میں سے ایک گروہ بھی۔ اور اللہ ہی رات اور دن کا (پورا) اندازہ کرتا ہے۔ اسے علم ہے کہ تم اسے نبھا نہیں سکو گے، چنانچہ اس نے تم پر مہربانی کی، پھر قرآن میں سے جتنا آسان ہو تم پڑھو۔ اسے علم ہے کہ تم میں کتنے بیمار ہوں گے اور کتنے دوسرے زمین میں اللہ کا فضل ڈھونڈتے پھریں گے اور کتنے اللہ کی راہ میں لڑیں گے، چنانچہ اس (قرآن) میں سے جتنا آسان ہو پڑھو اور نماز قائم کرو اور زکاۃ دو اور اللہ کو قرض حسنہ دو۔ اور تم اپنے آپ کے لیے جو نیکی آگے بھیجو گے تو اسے اللہ کے ہاں بہتر اور زیادہ

اجر والی پاؤ گے۔ اور اللہ سے استغفار کرو۔ بے شک اللہ خوب بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اپنی خواب گاہوں میں آرام اور نیند میں کمی کرنا اور دیگر جسمانی حقوق نظر انداز کرنا ان کی سخت کوشی کی تربیت کا حصہ تھا اور نفسانی خواہشات سے چھٹکارا پانا پورے عالم میں اسلامی قیادت اور زمامِ اقتدار سنبھالنے کے لیے ضروری تھا، چنانچہ اس مقصد کے لیے اعلیٰ درجے کی روحانیت درکار تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان نفوس قدسیہ کو اپنی دعوت کا امین بنایا اور انھیں پیغام رسالت عام کرنے کے لیے منتخب فرمایا ادر انھیں لوگوں پر گواہ بنایا۔ اس تاریخی دور میں دسیوں اہل ایمان تھے جن کے سامنے لوگوں کو دعوت توحید پیش کرنے اور انھیں شرک سے نجات دلانے جیسے اہم ترین امور تھے۔ بلاشبہ اتنے عظیم مقاصد کے لیے صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے لوگ ہی مناسب تھے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ز﴾

''ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں (اور) وہ اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے رات کے قیام کی خصوصیت یوں بیان فرمائی کہ اس میں نماز پڑھی جائے اور قراءت قرآن کی جائے جو ادائیگی اور حسن بیان سے آراستہ ہو۔ ارشاد ہے:

﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝﴾

''بلاشبہ رات کا اٹھنا (نفس) کچلنے میں زیادہ سخت اور دعا و ذکر کے لیے مناسب تر ہے۔''[3]

رات کا قیام دل کی اثر پذیری کے لیے عمدہ وقت ہے کیونکہ اس وقت رات پرسکون

---

[1] المزمل 20:73. [2] السجدة 16:32. [3] المزمل 6:73.

اور ساری مخلوق آرام کی غرض سے غیر متحرک ہوتی ہے۔ اس وقت دل ہر طرح کی مشغولیت سے خالی، دنیا کے تعلقات سے دور اور دن کے کاموں سے فارغ ہو کر ذکر و مناجات کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس طرح وہ لازمی تربیت بروئے کار آ سکتی تھی جو وحی الٰہی کی برکات حاصل کرنے کے لیے ضروری تھی۔ ارشاد ہے:

﴿إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝﴾

''یقیناً ہم جلد آپ پر ایک بھاری بات ڈالیں گے۔''[1]

آیت میں ''قول ثقیل'' سے مراد قرآن کریم ہے۔

صحابۂ کرام کی اس قدر کٹھن تربیت ہی کی وجہ سے ان کا میدان جہاد کی مشقتیں برداشت کرنا، مدینہ میں اسلامی ریاست قائم کرنا، اسلام کے لیے مخلص ہونا، پھر اس دین کو ساری دنیا میں عام کرنے کے لیے قربانیاں پیش کرنا اور اسے گھر گھر تک پہنچانا ممکن ہوا۔[2]

نبی ﷺ نے اس اندرونی محاذ (کردار سازی) پر خصوصی توجہ فرمائی۔ آپ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں ایسا اسلامی عقیدہ راسخ کر دینا چاہتے تھے جو نہ متزلزل ہو اور نہ کمزور پڑے۔ اس سے ان کے دلوں میں ارفع روحانی طاقت پیدا ہو گئی، ان کے لیے دعوتی میدان میں اذیتیں برداشت کرنا اور اپنا دفاع ممکن ہوا اور امت اسلامیہ کا یہ ہراول دستہ اس قدر مربوط اور مضبوط شکل اختیار کر گیا کہ دشمنوں کا کوئی بھی نفسیاتی حملہ کارگر ثابت نہ ہوا اور ان کے باہمی بھائی چارے کی وجہ سے کسی کو دخل اندازی کا موقع نہ ملا۔ یہ اسلامی اخوت خونی اور نسبی تعلق پر بھی فوقیت حاصل کر گئی اور اسے دین اسلام میں بڑی فضیلت حاصل ہے۔ امت اسلامیہ کے اس ابتدائی کارواں کی روح رواں شاندار اسلامی اخوت تھی جو محبت و الفت اور ایثار کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔

نبی ﷺ کے فرامین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں اتر گئے اور ان فرامین کی وجہ سے

---

[1] المزمل 73:5. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 160/1.

ان میں باہمی اخوت، ربط ضبط، تعاون اور مشکلات میں کام آنے کا جذبہ پیدا ہوا اور یہ سب کچھ کوئی دنیاوی صلہ حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لیے ہوتا تھا۔ مسلمان یہ صرف اپنے رب کی خوشنودی کے لیے کرتا ہے۔ یہی بنیادی اصول اسلامی اخوت کے تسلسل اور بقا کا راز اور اسلامی معاشرے کے استحکام کا باعث بنا۔[1]

نبی ﷺ نے ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان اپنے صحابہ تک پہنچایا:

«اَلْمُتَحَابُّونَ فِي جَلَالِي لَهُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُورٍ يَغْبِطُهُمُ النَّبِيُّونَ وَالشُّهَدَاءُ»

> ”میرے جلال کے لیے آپس میں محبت کرنے والوں کے لیے نور کے منبر ہوں گے جن پر پیغمبر اور شہید رشک کریں گے۔“[2]

اسی طرح قائم ہونے والی یہ سچی اخوت اور اللہ تعالیٰ کی خاطر پیدا ہونے والی محبت بلند ترین اور افضل اعمال کا حصہ بن گئی جسے اللہ کے ہاں عظیم مقام حاصل ہوا۔

نبی ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس رابطے کے کمزور ہوجانے سے خبردار کیا اور اس اخوت کی حفاظت کا بنیادی قانون بھی بیان فرما دیا:

«لَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَدَابَرُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا، وَ لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَّهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ»

> ”آپس میں ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور ایک دوسرے سے رخ نہ موڑو اور اے اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔ اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترکِ تعلق رکھے۔“[3]

---

[1] الحرب النفسية ضد الإسلام للدكتور عبدالوهاب كحيل، ص: 128. [2] جامع الترمذي، حديث:2390، و مسند أحمد:239/5. [3] صحيح البخاري، حديث:6076، و صحيح مسلم، حديث:2559.

نبی ﷺ نے اس مقامی معاشرے کو مربوط اور یکجا رکھنے کے لیے تمام افراد کے درمیان مساوات قائم کی تاکہ مشرکین کی طرف سے چھیڑی گئی نفسیاتی جنگ کے خلاف یہ مورچہ مضبوط ترین رہے۔ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو آزادی بھی عطا فرمائی کیونکہ وہ اس نئے اسلامی معاشرے میں آزادی کے بغیر داخل نہ ہو سکتے تھے۔ انھیں فکر، تعبیر اور مشورے کی آزادی حاصل تھی، نبی ﷺ نے تمام لوگوں، حاکم و محکوم، مالدار اور فقیر حتی کہ سارے طبقات کے درمیان مساوات کا قانون لاگو فرمایا۔ اس کا نبی ﷺ کے پیروکاروں کے دلوں میں گہرا اثر ہوا۔ انھوں نے آپس میں محبت کا ایسا تعلق قائم کر لیا کہ ایک دوسرے پر جان چھڑکنے لگے اور اپنی پوری طاقت و عزیمت سے نبی ﷺ کا دفاع کیا۔

نبی ﷺ نے ان کے درمیان قبیلے، علاقے، حسب و نسب، وراثت اور رنگ کا کوئی امتیاز باقی نہ رہنے دیا اور ان امتیازات کی بنا پر لوگوں کے حقوق، واجبات اور عبادات میں فرق نہ آنے دیا بلکہ سب کو اللہ تعالیٰ کے حضور برابری کا درجہ دے دیا۔

جب مکہ کے سرداروں نے نبی ﷺ سے مطالبہ کیا کہ ان کے لیے علیحدہ مجلس قائم کی جائے جس میں غلام اور کمزور طبقے کے افراد نہ ہوں تو نبی ﷺ نے انھیں بتایا کہ سب لوگ وحی اور ہدایت کو حاصل کرنے میں ایک جیسے ہیں۔ یہ سن کر قریشی سرداروں نے غلاموں اور کمزور طبقے کے لوگوں کے ساتھ مجلس میں بیٹھنے سے صاف انکار کر دیا۔ جو نبی ﷺ کے پیروکار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی:

> ”اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روک رکھیں جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، وہ اس کی رضا چاہتے ہیں اور آپ کی آنکھیں ان سے تجاوز نہ کریں کہ دنیاوی زندگی کی زینت چاہنے لگیں اور اس شخص کی اطاعت نہ کریں جس کا دل ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا اور اس کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا ہے۔“[1]

---

[1] الکھف 28:18.

یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے سورۂ انعام، آیت: 52 میں بھی بیان کیا ہے۔

جب نبی ﷺ نے بعض سرداران مکہ سے گفتگو میں مشغولیت کے باعث عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ سے بے رخی برتی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو یوں تنبیہ فرمائی:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ○ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ○ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ○ اَوْ يَذَّكَّرُ
فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ○ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ○ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ○ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا
يَزَّكّٰى ○ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ○ وَهُوَ يَخْشٰى ○ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ○ كَلَّآ
اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ○ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ○﴾

”(اس نے) ماتھے پہ شکن ڈالے اور منہ پھیر لیا، (اس لیے) کہ اس کے پاس ایک نابینا آیا اور (اے نبی!) آپ کو کیا خبر شاید کہ وہ پاکیزگی حاصل کرتا، یا نصیحت سنتا تو اسے نصیحت نفع دیتی لیکن جو شخص پروا نہیں کرتا ہے تو آپ اس کی فکر میں ہیں، حالانکہ اگر وہ نہیں سنورتا تو آپ پر (کوئی گناہ) نہیں اور جو شخص آپ کے پاس دوڑتا ہوا آیا اور وہ ڈرتا بھی ہے تو آپ اس سے بے رخی برتتے ہیں، ہرگز نہیں! بے شک یہ (صحیفہ) تو ایک نصیحت ہے، چنانچہ جو چاہے اسے یاد کرے۔“ [1]

نبی ﷺ نے اسلامی معاشرے کو مربوط، متحد، طاقتور اور مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے جو ذرائع اختیار کیے ان میں سے اہم ذریعہ یہ تھا کہ آپ نے مسلمانوں کے درمیان باہمی مادی اور روحانی ہمدردی اور کفالت کا جذبہ پیدا کیا۔ تاکہ طاقتور کمزوری اور مالدار ناداروں کی مدد کریں۔ نبی ﷺ نے کوئی ایسا رخنہ نہ چھوڑا جہاں سے ان ابتدائی اسلامی صفوں پر نفسیاتی جنگ اثر انداز ہو سکتی۔ تب یہ ہراول دستہ اتنی مضبوط چٹان ثابت ہوا جس کے خلاف کفار مکہ کی تمام تر کوششیں اور منصوبے ناکام رہے جو انھوں نے دعوتِ اسلامی کو نیست و نابود کرنے کے لیے اختیار کیے تھے۔ [2]

---

[1] عبس 1:80-12. [2] الحرب النفسية ضد الإسلام للدكتور عبد الوهاب كحيل، ص: 125-140.

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بلند ہمتی میں قرآن مجید کی اثر آفرینی

قرآن کریم نے ایک طرف اہل ایمان کی قوت مضبوط کرنے اور دوسری طرف کفار کو عذاب الٰہی سے ڈرانے میں، جس سے ان کے دلوں پر شعلے سے گرتے تھے، موثر کردار ادا کیا۔ قرآن کریم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا جس طرح دفاع کیا اسے دو نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے:

① قرآن کریم نے نبی ﷺ کو صحابۂ کرام پر توجہ دینے، ان سے حسن سلوک اور خندہ پیشانی سے ملنے کا پابند بنایا اور دعوتی امور میں مصروف ہونے کی وجہ سے صحابہ کرام کی طرف توجہ نہ دینے پر آپ ﷺ کی تنبیہ کی۔

② قرآن کریم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے پیش آمدہ تکالیف کا بوجھ کم کرنے کے لیے ان کے سامنے سابقہ امتوں اور انبیاء کے قصے اور مثالیں بیان کیں اور بتایا کہ کس طرح ان انبیاء نے اپنی قوم سے ملنے والی اذیتوں کو برداشت کیا تا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی صبر کر سکیں اور آنے والے مصائب کو برداشت کر سکیں۔

قرآن کریم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بعض اقدامات کی تعریف کرتے ہوئے انھیں ثواب اور جنت میں مستقل نعمتوں کی نوید سنائی اور اسی طرح ان کے دشمنوں کو جو انھیں دکھ اور تکلیف دیتے تھے سخت عذاب کی وعید بھی سنائی۔[1]

پہلے نکتے کی وضاحت اس طرح ہے کہ ایک دفعہ نبی ﷺ مسجد میں اپنے کمزور ساتھیوں خباب، عمار، ابن فکیہہ، صفوان بن امیہ کے غلام یسار اور صہیب رضی اللہ عنہم جیسے دیگر صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ جب قریش نے انھیں دیکھا تو بطور مذاق ایک دوسرے سے کہنے لگے: ”یہ اس کے ساتھی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے ہدایت اور حق کے لیے احسان فرمایا ہے۔ محمد (ﷺ) جو لے کر آئے ہیں اگر وہ خیر اور بھلائی پر مشتمل ہوتا تو یہ

---

[1] الحرب النفسية ضد الإسلام للدكتور عبد الوهاب كحيل، ص: 269.

لوگ ہم پر سبقت نہ لے جاتے اور اللہ تعالیٰ ہمیں چھوڑ کر انھیں خاص مقام عطا نہ کرتا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے کفار کے اس استہزا کو رد کرتے ہوئے ان پر واضح کیا کہ میری رضا میرے بندوں کو ان کے دنیاوی مقام و مرتبہ کے مطابق حاصل نہیں ہوتی اور نبی ﷺ کو اس کی تاکید فرمائی کہ آپ ﷺ کفار کی ان باتوں سے متاثر نہ ہوں جو وہ صحابہ کی شان گھٹانے کے لیے کرتے رہتے تھے، نیز اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کے مقام و مرتبہ کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ○ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ؕ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○﴾

”اور ان لوگوں کو اپنے سے مت دور کریں جو اپنے رب کو صبح اور شام پکارتے ہیں، وہ اپنے رب کی رضا مندی چاہتے ہیں، ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بوجھ آپ پر نہیں اور آپ کے حساب میں سے کسی چیز کا بوجھ ان پر نہیں، پھر (اگر) آپ ان کو اپنے سے دور کریں گے تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔ اور ہم نے اسی طرح لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے تاکہ وہ (انھیں دیکھ کر) کہیں: کیا ہم میں سے یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہے؟ (ہاں) کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو (ان سے) زیادہ نہیں جانتا؟ اور جب وہ لوگ آپ کے پاس آئیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں تو کہہ دیجیے: تم پر سلام ہو، تمھارے رب نے مہربانی کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔

---

[1] الحرب النفسية ضد الإسلام للدكتور عبد الوهاب كحيل، ص:271,270.

بے شک تم میں سے جو شخص جہالت سے برا عمل کرے، پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرلے تو یقیناً وہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔‘‘[1]

اس طرح اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کی شان اور قدر و منزلت سے آگاہ کیا جسے یا تو کفار جانتے ہی نہیں تھے یا جان بوجھ کر لاعلم بنتے اور انھیں اذیت پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو انھیں اپنے سے دور کرنے سے منع کردیا اور انھیں اچھے طریقے سے سلام کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ انھیں یہ بتادیں کہ اللہ نے توبہ کے بعد ان کے گناہوں کی بخشش کا وعدہ کیا ہے۔

اس کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ہمت اور حوصلہ کس قدر بلند ہوا ہوگا اور وہ کفار کی دی ہوئی اذیتوں کو کیسا محسوس کرتے ہوں گے؟ وہ تو ایسی اذیتیں بسرو چشم قبول کرتے ہوں گے جن کے سبب انھیں یہ عظیم مراتب حاصل ہوئے۔[2]

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کس طرح ان آیات میں تنبیہ فرمائی جن کی قیامت تک تلاوت ہوگی۔ یہ تنبیہ ایک نابینا صحابی کے بارے میں تھی جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک مرتبہ بے رخی کی تھی اور بعض سرداران مکہ سے محو گفتگو ہونے کی وجہ سے اس کے سوال کا جواب نہ دیا تھا۔[3]

دعوتِ حق کے میدان میں کسی سے حسب ونسب یا مال و مرتبے کی بنیاد پر کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جاتا۔ یہ دعوت تو انسان میں ایک خاص نکتہ راسخ کرتی اور اسے نسل انسانی کی وحدت کا سبق دیتی ہے جس میں برابری اور مساوات کا درس دیا گیا ہے۔ اس سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کی گئی تنبیہ سمجھ میں آتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں ابی بن خلف کی طرف زیادہ توجہ فرمائی تھی جبکہ

---

[1] الأنعام6:52-54. [2] الحرب النفسية ضد الإسلام للدكتور عبدالوهاب كحيل، ص:270,271.

[3] الحرب النفسية ضد الإسلام للدكتور عبد الوهاب كحيل، ص:271.

ابن ام مکتوم حق کی ترازو میں ابی بن خلف جیسے اربوں انسانوں سے کہیں زیادہ وزنی تھے۔[1]

اس قصے میں بہت سے پند ونصائح پائے جاتے ہیں جن سے امت اسلامیہ کے ہراول دستے اور بعد میں آنے والے مسلمانوں نے استفادہ کیا۔ ان میں اہم ترین نصیحت اہل ایمان کی طرف خصوصی توجہ دینا ہے کیونکہ اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کا ذمہ تبلیغِ رسالت ہے نہ کہ ہدایت کو لوگوں کے دلوں میں داخل کرنا۔

اس قصے میں نبی ﷺ کی نبوت پر دلیل بھی ہے کہ اگر بالفرض نبی ﷺ اللہ کے رسول نہ ہوتے تو یہ واقعہ ضرور چھپا لیتے اور لوگوں کو خبر نہ دیتے کیونکہ اس میں آپ کو تنبیہ کی گئی تھی۔ پورے قرآن میں سے اگر اللہ کے رسول کچھ چھپانا چاہتے تو ایک یہ قصہ اور دوسرا زید وزینب رضی اللہ عنہما والا قصہ چھپا لیتے۔[2]

داعیوں پر لازم ہے کہ وہ اہل ایمان اور اہل خیر کو مقدم رکھیں۔[3]

دوسرے نکتے کی وضاحت اس طرح ہے کہ قرآن کریم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تسلی دی اور بتایا کہ انھیں پہنچنے والی اذیتیں نئی نہیں، یہ تو سابقہ امتوں میں سے اہل ایمان بھی برداشت کر چکے ہیں۔ قرآن کریم میں سیدنا نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام اور دیگر انبیاء کے واقعات اہل اسلام کو استقامت دینے اور ان میں صبر اور قربانی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے بیان کیے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام کے سامنے گزشتہ زمانے کے انبیاء کا اسوہ پیش کیا ہے۔ قرآنی قصص میں بہت سی نصیحتیں، حکمتیں اور مثالیں پوشیدہ ہیں۔

اس طرح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دفاع اور ان کی تسکین کے لیے قرآن کریم نے ان کی اور ان کے کردار کی مدح سرائی کی ہے جس کی رہتی دنیا تک تلاوت کی جاتی رہے گی، جیسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر آیا ہے جنھوں نے سات ایسے کمزور افراد کو مشرکین سے نجات دلائی جو انھیں اذیتوں سے دوچار کرتے تھے اور یہی آیات بلال رضی اللہ عنہ پر ظلم کے پہاڑ توڑنے

---

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 167/1. [2] تفسير ابن عطية: 316/15، و تفسير القاسمي: 54/17. [3] المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 89/2.

والے امیہ بن خلف کو ڈانٹ بھی پلاتی ہیں۔

قرآن کریم نے اپنے اخلاقی دستور کے مطابق جزا و سزا کے قوانین وضع کیے ہیں، اہل ایمان کو حوصلہ دیا اور مخالفین کو انجام بد سے ڈرایا ہے۔ قرآن کا یہ اسلوب گہرے مقاصد کا حامل ہے۔ اس نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے راستوں کو روشن کر دیا اور یہ بات کفار کے لیے کرب و غم کا سبب بنی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۚ لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۙ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۭ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۙ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۚ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۙ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۚ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ○﴾

”بالآخر میں نے تمھیں بھڑکتی آگ سے ڈرا دیا ہے، اس میں بڑا بدبخت ہی داخل ہوگا، جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا اور بڑا متقی اس سے ضرور دور رکھا جائے گا، جو پاک ہونے کے لیے اپنا مال دیتا ہے اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں جس کا بدلہ اسے دیا جائے مگر صرف اپنے رب برتر کی رضا چاہتے ہوئے (مال خرچ کرتا ہے) اور یقیناً وہ (اللہ) جلد اس سے راضی ہوگا۔“ [1]

اسی طرح قرآن کریم نے نجران کے عیسائی وفد کی اسلام پر استقامت کا ذکر کیا ہے جن کا کفار نے مذاق اڑایا اور انھیں اسلام سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔ بعض مؤرخین کے مطابق انھی کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ○ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ○ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا

---

[1] الیل 92:14-21.

رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا
وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ○﴾

''وہ لوگ جنھیں ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب دی تھی، وہی اس پر ایمان لاتے ہیں اور جب ان پر (قرآن) تلاوت کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے، بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، بلاشبہ ہم تو اس سے پہلے ہی مسلمان تھے، ان لوگوں کو ان کا دوبار اجر دیا جائے گا کیونکہ انھوں نے صبر کیا اور وہ بھلائی کے ساتھ برائی کو دور کرتے ہیں اور جو ہم نے انھیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جب وہ بیہودہ بات سنتے ہیں تو وہ اس سے اعراض کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال ہیں، تمھیں سلام ہو، ہم جاہلوں کو نہیں چاہتے۔''[1]

اس کے بعد قرآنی آیات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بہت بڑے ثواب اور جنت کی مستقل نعمتوں کی نوید سناتی ہیں کہ یہ ان کے اعمال کی جزا ہے جو انھوں نے صبر کیا اور اذیتوں کو برداشت کیا اور ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انھیں دعوت دین کا سلسلہ جاری رکھنے کی ترغیب ملے اور وہ کسی بات یا پیش آمدہ رکاوٹ کی پروا نہ کریں۔ آخر کار کامیابی اور غلبہ انھی کے حصے میں آئے گا جیسا کہ قرآن و حدیث میں اس مضمون کی وضاحت موجود ہے۔ قرآن کریم میں کفار مکہ کا انجام بد بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ○
يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ○﴾

''بلاشبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد دنیاوی زندگی میں بھی کرتے ہیں اور اس دن بھی (کریں گے) جب گواہ کھڑے ہوں گے، اس دن ظالموں کو ان کی معذرت کوئی نفع نہیں دے گی اور ان کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے

---

[1] القصص 28:52-55.

برا گھر ہے۔"[1]

قرآن نے مومنوں کے قرآن پر ایمان لانے اور اس پر مضبوطی سے عمل کرنے کا تذکرہ بھی کیا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُونَ تِجٰرَةً لَّنْ تَبُورَ ○ لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ إِنَّهٗ غَفُورٌ شَكُورٌ ○﴾

"بلاشبہ جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دے رکھا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جو ہرگز تباہ نہیں ہوگی، تاکہ وہ (اللہ) انھیں ان کے اجر پورے دے اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ دے، بے شک وہ بہت بخشنے والا، نہایت قدردان ہے۔"[2]

اذیتوں اور تشدد کے باوجود صحابۂ کرام اللہ تعالیٰ کی عبادت پر ڈٹے رہے، چنانچہ اللہ نے ان کی اس فضیلت اور اس پر صبر کی جزا کا تذکرہ اس طرح فرمایا:

﴿أَمَّنْ هُوَ قٰنِتٌ اٰنَاءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبٰبِ ○ قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَأَرْضُ اللّٰهِ وٰسِعَةٌ ؕ إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○﴾

"کیا (یہ مشرک بہتر ہے یا وہ) جو رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتے اور قیام کرتے ہوئے عبادت (فرماں برداری) کرتا ہے، جبکہ وہ آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت کی امید بھی رکھتا ہے؟ کہہ دیجیے: کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں

---

[1] المؤمن 40:51،52. [2] فاطر 35:29،30.

رکھتے، برابر ہوسکتے ہیں؟ بس عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔ کہہ دیجیے: اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! اپنے رب سے ڈرو، جنھوں نے اس دنیا میں اچھے عمل کیے ان کے لیے بھلائی ہے اور اللہ کی زمین وسیع ہے، بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا۔‘‘[1]

قرآن کریم کا یہی وہ اسلوب تھا جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تسلی دیتا، ان کا دفاع کرتا اور انھیں نفسیاتی جنگ کے حملے سے محفوظ رکھتا تھا، اس لیے قرآنی منہج اور پرحکمت نبوی راہِ عمل کی بدولت صحابۂ کرام پر کفار کے حملوں اور تعذیبی ہتھکنڈوں کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ رسول اللہ ﷺ اور امت کے اس ہراول دستے یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو صحیح عقیدے اور درست منہج سے ہٹانے کے لیے مشرکین کا کوئی بھی حربہ کامیاب نہ ہوسکا۔

مذاکرات کا اسلوب

ایک دن مشرکین ایک جگہ اکٹھے ہوئے اور کہا: ’’تم جادو، کہانت اور شعر کو سب سے زیادہ جاننے والے آدمی کی تلاش کرو، پھر اسے اس آدمی کے پاس بھیجو جس نے ہماری جماعت کو منتشر کردیا ہے، ہمارے اتفاق کو اختلاف میں بدل دیا ہے اور ہمارے دین میں عیب نکالے ہیں۔ وہ اس سے اس سلسلے میں مذاکرات کرے اور دیکھے اسے کیا جواب ملتا ہے؟‘‘ سب نے کہا: ’’عتبہ بن ربیعہ کے سوا کوئی دوسرا آدمی ایسی قابلیت نہیں رکھتا۔‘‘ انھوں نے عتبہ سے کہا: ’’اے ابوالولید! آپ اس کے پاس جائیں۔‘‘

چنانچہ وہ نبی ﷺ کے پاس آیا اور کہا: ’’اے محمد! کیا تو بہتر ہے یا عبدالمطلب؟‘‘

نبی ﷺ خاموش رہے۔

اس نے کہا: ’’اگر تو سمجھتا ہے کہ یہ تمام اشراف تجھ سے بہتر تھے تو انھوں نے ایسے خداؤں کی عبادت کی ہے جن میں تو عیب نکالتا ہے اور اگر تو سمجھتا ہے کہ تو ان سے بہتر

---

[1] الزمر 39:9,10.

ہے تو ہم سے مذاکرات کر، ہم تیرا موقف سننا چاہتے ہیں۔ بخدا ہم نے کوئی بکری کا بچہ بھی اپنی قوم کے حق میں تیرے جیسا منحوس نہیں دیکھا۔ (نقل کفر، کفر نہ باشد) تو نے ہماری جماعت میں جدائی ڈال دی ہے، ہمارا شیرازہ منتشر کردیا ہے اور ہمارے دین میں عیب نکالے ہیں اور ہمیں سارے عرب میں ذلیل کردیا ہے۔ عرب میں یہ مشہور ہے کہ قریش میں ایک جادوگر اور ایک کاہن ہے۔ تمھاری وجہ سے قوم میں اس قدر دشمنی پیدا ہوچکی ہے کہ ہر لمحے خطرہ ہے کہ ہم میں ایک دوسرے کے خلاف تلوار چلے اور ہم ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے نابود ہوجائیں۔ بھلے آدمی! اگر تو محتاجی سے تنگ ہے تو ہم تجھے اتنا مال جمع کردیتے ہیں کہ تو سارے قریش سے زیادہ مالدار ہوجائے گا۔ اگر شادی کرنا چاہتا ہے تو قریش کی جس عورت کو پسند کرے گا ہم ایسی دس عورتوں سے تیری شادی کردیتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَرَغْتَ» ''کیا تم اپنی بات ختم کرچکے ہو؟''

اس نے کہا: ''ہاں'' پھر نبی ﷺ نے یہ آیات تلاوت فرمائیں:

﴿حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝﴾

''حٰمٓ، (یہ قرآن) بڑے مہربان، نہایت رحم کرنے والے کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے، (یہ) ایسی کتاب ہے جس کی آیات کھول کر بیان کی گئی ہیں، درآں حالیکہ (یہ) قرآن عربی ہے، ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔''[1]

یہاں تک کہ آپ ﷺ اس آیت پر پہنچے:

﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ۝﴾

''پھر اگر وہ اعراض کریں تو کہہ دیجیے: میں نے تمھیں ایسی چیخ (آسمانی عذاب) سے ڈرادیا ہے جو عاد اور ثمود کی چیخ (عذاب) کے مانند ہوگی۔''[2]

---

[1] حٰمٓ السجدۃ 41:1-3. [2] حٰمٓ السجدۃ 41:13.

یہ سن کر عتبہ ''بس، بس'' پکار اٹھا اور بولا: ''تمھارے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔''

اتنی گفتگو کے بعد عتبہ قریش کی طرف لوٹ گیا۔ انھوں نے اس سے پوچھا: ''کیا خبر لائے ہو؟'' اس نے کہا: ''جو کچھ تم اس کے متعلق کہتے ہو، میں نے وہ سب کچھ اس سے کہا ہے۔'' بولے: ''پھر اس نے تمھیں کوئی جواب دیا ہے؟'' اس نے کہا: ''ہاں، جواب دیا ہے۔''[1]

ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ جب تمام قریش عتبہ کے گرد جمع ہوئے اور انھوں نے پوچھا: ''کیا خبر لائے ہو؟'' تو اس نے کہا: ''خبر یہ ہے کہ میں نے ایسا کلام سنا ہے اللہ کی قسم! اس جیسا کلام پہلے کبھی نہیں سنا۔ اللہ کی قسم! میں نے جو کلام سنا ہے، وہ جادو، شعر یا کہانت نہیں۔ اے جماعتِ قریش! میری بات مانو اور اس کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ اس شخص (محمد) کو اپنا مشن جاری رکھنے دو اور اسے کچھ نہ کہو۔ اللہ کی قسم! میں نے جو کلام اس سے سنا ہے، وہ کسی بڑی خبر کا پتا دیتا ہے۔ اگر عربوں نے اسے مار ڈالا تو تمھاری بلا ٹل گئی اور اگر وہ عربوں پر غالب آگیا تو اس کی بادشاہت تمھاری بادشاہت ہے اور اس کی عزت تمھاری عزت ہے اور تم اس کی وجہ سے سب لوگوں سے زیادہ سعادت مند ہو گے۔''

یہ سن کر قریشی کہنے لگے: ''اے ابوالولید! واللہ! اس نے تم پر جادو پھونک دیا ہے۔'' وہ بولا: ''اس کے بارے میں میری یہی رائے ہے۔ اب جو تمھاری مرضی ہے وہ تم کرلو۔''[2]

درس و عبرت

① نبی ﷺ نے اپنے باپ دادا یا اپنی فضیلت کے بارے میں عتبہ کو کوئی جواب اس لیے نہ دیا کہ بات ایک اور ہی رخ اختیار کر جائے گی اور عتبہ کوئی بات آپ کی زبان سے نہ سن سکے گا۔

② نبی ﷺ نے عتبہ کی تمام پیشکشیں اور غصہ دلانے والے الزامات کو سن کر ان تمام باتوں

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 314,313/1، والسنن الكبرٰى للبيهقي: 204,203/2، والبداية والنهاية: 69,68/3. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 294/1.

سے پہلو تہی اختیار کی اور عظیم مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے باتوں میں الجھنا گوارا نہ کیا۔ آپ ﷺ نے عتبہ کو اپنی تمام بات کہنے دی اور اس کے ساتھ اخلاق کے ساتھ پیش آئے اور کہا: ''اے ابوالولید! کیا تم اپنی بات ختم کر چکے ہو؟''[1]

③ نبی ﷺ کا عتبہ کو جواب فیصلہ کن تھا۔ آپ کا سورۂ حٰم السجدہ ہی کی آیات تلاوت کرنا خاص حکمت کی وجہ سے تھا۔ ان آیات میں بڑے عظیم امور بیان کیے گئے ہیں کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، پھر کافروں کے طرز عمل اور ان کے قرآن سے منہ موڑنے کا ذکر ہوا، نیز نبی ﷺ کے مشن کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا کہ نبی بشر ہیں، زمین و آسمان کا خالق صرف اللہ ہے اور کس طرح سابقہ امتوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا، پھر ان کے ساتھ کیسا سلوک ہوا اور ساتھ ہی قریشیوں کو عاد و ثمود پر آنے والی کڑک اور بجلی سے ڈرایا گیا۔[2]

④ **مبلغین کے لیے مال، منصب اور عورتوں کا فتنہ:** کتنے ہی داعی ایسے ہیں جو مال کی چمک کی وجہ سے اپنی ذمہ داری پوری نہ کر سکے اور کتنے ہی ایسے بھی ہیں جنھیں دعوت پیش کرنے سے روکنے کے لیے لاکھوں روپے خرچ کیے گئے اور جو لوگ مالی پیشکشوں کے سامنے ثابت قدم رہے، وہی نبی ﷺ کے سچے پیروکار ہیں۔

منصب کا فتنہ بھی واضح ہے جسے شیطان مزین کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے اور بڑی چالبازی اور برے طریقے سے گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ واللہ! مبلغ وہ ہوتا ہے جو اپنی حرکت، بات اور فعل میں نبی ﷺ کی پیروی کرتا ہے اور اپنے اس مقصد کو نہیں بھولتا جو اس کی زندگی اور موت کا مقصد ہے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝
لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝﴾

''کہہ دیجیے: بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت،

---

[1] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 33. [2] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 75.

(سب کچھ) اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی (بات، یعنی توحید) کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔‘‘ [1]

اور عورت کے بارے میں نبی ﷺ کا فرمان ہے:

«مَا تَرَكْتُ بَعْدِي فِتْنَةً أَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ»

’’میرے بعد مردوں کے لیے سب سے خطرناک فتنہ عورتوں کا ہے۔‘‘ [2]

عورت چاہے بیوی ہو جو دعوت و جہاد کے سلسلے میں اس کی ہمت پست کر دے یا پھر فاحشہ اور پیشہ ور ہو جو اسے اپنے جال میں پھانس لے اور اسے گناہ، سرکشی اور بے حیائی میں مبتلا کر دے، کوئی بھی صورت ہو، عورت دین کے معاملے میں بہت بڑا فتنہ ہے۔

قریش نے نبی ﷺ کو پیشکش کی کہ اگر آپ چاہیں تو ان کے لیے بہترین اور خوبصورت ترین دس قریشی عورتوں کو آپ کے نکاح میں دیا جا سکتا ہے اور وہ عورت جو دیندار نہ ہو اور اللہ کے منہج سے دور ہو، اس کا فتنہ گردن پر سونتی ہوئی تلوار سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ [3]

اسلامی دعوت پیش کرنے والے مبلغین کو چاہیے کہ نبی ﷺ کا اسوہ ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کی بات یاد رکھیں:

﴿قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ۖ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُن مِّنَ الْجَاهِلِينَ ○ فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○﴾

’’یوسف نے کہا: اے میرے رب! مجھے قید خانہ اس سے زیادہ پسند ہے جس کی طرف وہ (عورتیں) مجھے بلاتی ہیں اور اگر تو نے ان کا مکر مجھ سے دور نہ کیا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور میں جاہلوں میں سے ہوں گا، چنانچہ اس کے رب نے اس کی دعا قبول کر لی، پھر اس نے اس سے ان (عورتوں) کا مکر دور

---

[1] الأنعام 6:162,163. [2] صحيح البخاري، حديث: 5096، وصحيح مسلم، حديث: 2740,2741. [3] فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 169.

کر دیا، بے شک وہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔“[1]

⑤ عتبہ کا نبی ﷺ کے کردار سے متاثر ہونا: یہ اثر اتنا واضح تھا کہ اس کے ساتھیوں نے اسے دیکھتے ہی قسم اٹھا کر اس کا اظہار کر دیا تھا، حالانکہ ابھی اس نے نبی ﷺ کے متعلق انھیں کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ اللہ کا دشمن عتبہ جو اس دعوت کو ختم کرنے کے لیے آگے بڑھا تھا، اب اچانک اسے معاملہ الٹ نظر آنے لگا۔ وہی اب قریش سے کہہ رہا تھا کہ تم اس کے اور اس کے مشن کے راستے سے ہٹ جاؤ۔[2]

⑥ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی ﷺ اور عتبہ کے مابین ہونے والے مذاکرات سنے اور دیکھا کہ کس طرح آپ ﷺ نے عتبہ کی یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ یہ ایسا سبق تھا جو ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ اس سے انھوں نے عقیدے کی پختگی، اپنے اصولی موقف پر استقامت اور ہر قسم کی پیشکش کو قدموں تلے روندنے کا سبق حاصل کیا۔

⑦ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا نبی ﷺ سے بردباری اور کشادہ ظرفی کی تعلیم حاصل کرنا: نبی ﷺ نے عتبہ بن ربیعہ کی تمام باطل باتیں سنیں اور اپنی ہتک بھی برداشت کی۔ ”قریش میں ایک جادوگر ہے۔“ ”قریش میں ایک کاہن ہے۔“ ”ہم نے کوئی بکری کا بچہ بھی اپنی قوم کے لیے تمھارے جیسا منحوس نہیں دیکھا“ اور ”اگر تیرے پاس بڑا جن آتا ہے تو ہم اس کا علاج کرائے دیتے ہیں۔“ اس کی یہ باتیں آپ ﷺ نے نظر انداز کر دیں اور اس کی بدتمیزی سے چشم پوشی کر لی تاکہ دعوت دین اور بنو عبد شمس کے سردار کے سامنے اسلام کی تبلیغ سے توجہ نہ ہٹنے پائے۔

نبی ﷺ کی زبان اطہر سے صادر ہونے والا ہر کلمہ قابلِ اتباع اور آپ کا ہر عمل قابلِ اقتدا ہے، نیز آپ کی ہر چشم پوشی آپ کا ایسا خلق ہے جو امت کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔[3]

---

[1] يوسف 12:33,34. [2] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 87. [3] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 1/304.

سیرت کی بعض کتابوں میں منقول ہے کہ عتبہ کے مذاکرات کے بعد مکہ کے بہت سے سرداروں نے آپ سے مزید مذاکرات بھی کیے اور ایسی ایسی پیشکشیں کیں جنھیں سن کر ایسے انسان کا دل للچا جاتا جو دنیادار اور دنیاوی ساز وسامان کا طلبگار ہو۔ صرف نبی ﷺ کی ذات ہی وہ بلند ترین ہستی تھی جس نے کسی مداہنت اور سودے بازی یا سیاسی چالبازی کے بغیر کفار کی تمام پیشکشوں کے سامنے فیصلہ کن موقف اختیار کیا اور قریشی سرداروں سے رابطہ استوار کرنے یا تعلقات بہتر بنانے کی کوشش نہ کی۔[1]

نبی ﷺ نے فیصلہ کن موقف اس لیے اختیار کیا کہ یہ عقیدے کا مسئلہ تھا جو بالکل واضح اور اظہر من الشّمس تھا جس میں کسی قسم کی مداہنت اور پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہ تھی، اس لیے نبی ﷺ نے فرمایا تھا:

«مَا بِي مَا تَقُولُونَ، مَاجِئْتُكُمْ بِمَا جِئْتُكُمْ بِهِ أَطْلُبُ أَمْوَالَكُمْ، وَلَا الشَّرَفَ فِيكُمْ وَلَا الْمُلْكَ عَلَيْكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِي رَسُولًا، وَّأَنْزَلَ عَلَيَّ كِتَابًا، وَّأَمَرَنِي أَنْ أَكُونَ لَكُمْ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا، فَبَلَّغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ، فَإِنْ تَقْبَلُوا مِنِّي مَاجِئْتُكُمْ بِهِ فَهُوَ حَظُّكُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَإِنْ تَرُدُّوهُ عَلَيَّ أَصْبِرُ لِأَمْرِ اللّٰهِ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ»

”میرا ہرگز وہ مقصد نہیں ہے جو تم خیال کرتے ہو۔ میں جو چیز تمھارے پاس لایا ہوں اس کا مقصد یہ نہیں کہ تم سے مال طلب کروں یا مقام و مرتبہ اور بادشاہت کا سوال کروں۔ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ مجھ پر کتاب اتاری ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں جنت کی خوشخبری دوں اور جہنم سے ڈراؤں۔

---

[1] الوفود في العهد المكي لعلي الأسطل، ص: 37.

میں نے تمھیں اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور تمھاری خیر خواہی کی۔ اگر تم میری دعوت قبول کر لو تو وہ تمھارا دنیا اور آخرت کا نصیب ہے اور اگر اسے ٹھکرا دو تو میں اس وقت تک صبر کروں گا جب تک کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ نہ فرما دے۔''[1]

نبی ﷺ کے اس پختہ ایمانی موقف کی وجہ سے قریش کے سرداروں کا مکروفریب ناکام ہو گیا اور اسلامی عقیدے کا اہم ترین مسئلہ ثابت ہو گیا کہ یہ عقیدہ ہر قسم کی بیرونی آلائشوں سے پاک ہے۔[2]

تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین

مشرکین نے جب مسلمانوں کی استقامت، اپنے دین سے گہری وابستگی اور ہر باطل کے خلاف سینہ سپر ہونا دیکھا تو ان کے دلوں میں نوامیدی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ جان گئے کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنا ممکن نہیں۔ تب انھوں نے مسلمانوں کو غصہ دلانے اور اپنی بیوقوفی اور رعونت کا اظہار کرنے کے لیے ایک اور بیہودگی کا ارتکاب کیا۔ انھوں نے اسود بن عبدالمطلب، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف اور عاص بن وائل کو نبی ﷺ کے پاس بھیجا۔ وہ کہنے لگے: ''اے محمد! آؤ جسے تم پوجتے ہو اسے ہم بھی پوجیں اور جسے ہم پوجتے ہیں اسے تم بھی پوجو، اس طرح ہم اور تم پوجا میں شراکت دار ہو جائیں۔ اگر تمھارا معبود ہمارے معبود سے بہتر ہے تو ہم اس سے اپنا حصہ (ثواب) حاصل کر چکے ہوں گے اور اگر ہمارے معبود تمھارے معبود سے بہتر ہوئے تو تم ان سے اپنا حصہ حاصل کر چکے ہو گے۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی:

﴿قُلْ يَاأَيُّهَا الْكَافِرُونَ ○ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ○ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ○ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ○ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ○ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ○﴾

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 197/1، والتربية القيادية للدكتور الغضبان: 305/1. [2] تاريخ صدر الإسلام لعبد الرحمٰن الشجاع، ص: 39.

’’(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: اے کافرو! میں ان (بتوں) کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین۔‘‘[1]

اس سورت جیسا مضمون کچھ دوسری آیات میں بھی نازل ہوا جن میں کفر اور اہل کفر سے براءت کا اعلان پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ○﴾

’’اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو کہہ دیجیے: میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل۔ تم اس سے بری ہو جو میں عمل کرتا ہوں اور میں اس سے بری ہوں جو تم عمل کرتے ہو۔‘‘[2]

اللہ تعالیٰ نے مزید ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَاْ مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ○ قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ۚ مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ۚ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ يَقُصُّ الْحَقَّ ۭ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ○﴾

’’(اے نبی!) کہہ دیجیے: بے شک مجھے منع کیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، کہہ دیجیے: میں تمھاری خواہشات کے پیچھے نہیں چلتا، اس صورت میں، میں گمراہ ہو جاؤں گا اور میں ہدایت پانے والوں میں سے نہ ہوں گا۔ کہہ دیجیے: بے شک میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہوں

---

[1] الکٰفرون 109:1-6. [2] یونس 10:41.

اور تم نے اس دلیل کو جھٹلایا ہے، میرے پاس وہ چیز نہیں ہے جسے تم جلدی طلب کر رہے ہو، فیصلے کا (سارا) اختیار اللہ ہی کو ہے، وہ حق بات بیان کرتا ہے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔"[1]

سورۂ کافرون نے یہ وضاحت کر دی کہ حق کا راستہ ایک ہی ہے جس میں کوئی ٹیڑھ پن نہیں ہے اور نہ اس سے ادھر اُدھر راستے نکلتے ہیں۔ وہ تو ایسی خالص عبادت کا نام ہے جو صرف رب العالمین کے لیے ہے۔

یہ سورت نبی ﷺ پر دو قسم کی عبادتوں، دو قسم کے مناہج، دو قسم کے نظریات اور دو راستوں کے درمیان حتمی اور قطعی فرق کو بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی۔ اس میں مسلسل نفی، تاکید اور توثیق کے صیغے مکرر استعمال کیے گئے کہ حق و باطل اور روشنی و اندھیرے کے درمیان کوئی سمجھوتا نہیں ہوسکتا۔ یہ اختلاف مکمل طور پر بنیادی اختلاف ہے جس میں کوئی درمیانہ راستہ تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں کسی قسم کی مداہنت یا فریب کاری کی گنجائش نہیں۔ اس میں ذاتی مصلحت اور دنیاوی رغبت کا دخل نہیں اور نہ یہ شہد میں زہر والا معاملہ ہے۔ اور یہ کہنا بھی درست نہیں ہے جیسے آج کے جاہلیت پسند کہتے ہیں یا منافق اور مغرب زدہ لوگ جو گمراہ اور قابلِ غضب لوگوں کے پیچھے چلتے ہیں، وہ خیال کرتے ہیں اور ہر جگہ بے دین لوگ بھی اس نظریے کو اپنائے ہوئے ہیں کہ "دین اللہ کے لیے اور وطن عوام کے لیے۔"

یہاں مشرک قریشی سرداروں کی سوچ کے فیصلے کی تردید کی گئی ہے۔ اس میں کسی قسم کی سودے بازی، مشابہت، درمیانی راستے اور ذاتی پسند کا دخل نہیں۔ ہر جگہ اور ہر زمانے میں جاہلیت جاہلیت ہے اور اسلام اسلام ہے۔ دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے جس طرح سونے یا چاندی کی ڈلی اور مٹی کے مابین فرق ہوتا ہے۔ یہاں صرف ایک ہی راستہ

---

[1] الأنعام 6:56، 57.

ہے کہ مکمل جاہلیت کو خیر باد کہہ کر مکمل اسلام کو اپنا لیا جائے، اس کی ہر عبادت کو اپنایا جائے اور ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے، وگرنہ حق و باطل کے درمیان ہر دور میں باہمی افتراق، قطعی دوری اور واضح فرق رہا ہے۔[1]

پہلے وفد کی ناکامی کے بعد عبداللہ بن ابی امیہ، ولید بن مغیرہ، مکرز بن حفص، عمرو بن عبداللہ بن ابی قیس اور عاص بن عامر پر مشتمل دوسرا وفد آپ ﷺ کے پاس آیا تاکہ آپ کو بعض قرآنی آیات سے دست بردار کر دیا جائے۔[2]

انھوں نے مطالبہ کیا کہ آپ قرآن کریم کی ان آیات سے دست بردار ہو جائیں جو ان کے خداؤں کو برا کہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ فیصلہ کن جواب نازل فرمایا:

﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝﴾

”اور جب ان پر ہماری واضح آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ لوگ، جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں: تو اس کے علاوہ کوئی (دوسرا) قرآن لے آ، یا اسے (کچھ) بدل دے۔ کہہ دیجیے: مجھے اختیار نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، بے شک اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے (سخت) دن کے عذاب سے ڈر لگتا ہے۔“[3]

نبی ﷺ کے پاس آنے والے وفود اور ان کے مذاکرات قریشی سرداروں کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت تھے کہ وہ نبی ﷺ کو اسلام سے دست بردار ہونے پر راضی نہ کر سکے۔ اسلام کے مسلسل فروغ نے انھیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ نبی ﷺ کو قرآن کی بعض آیات

---

[1] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 3991/6. [2] أسباب النزول لأبي الحسن الواحدي، ص: 200، ونور اليقين لمحمد الخضري، ص: 61 بتصرف. [3] يونس 15:10.

سے دست بردار ہونے ہی پر آمادہ کرلیں۔

قابل غور بات یہ ہے کہ کفار کا آپ ﷺ سے دوسرا مطالبہ پہلے سے کم تھا گویا وہ ایک بڑے مطالبے سے چھوٹے مطالبے پر اتر آئے تھے، اس خیال سے کہ شاید اس دعوت کا قائد ان کی کوئی بات ہی تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوجائے۔ علاوہ ازیں انھوں نے وفد کے ارکان بھی تبدیل کر کے دیکھ لیے۔ جنھوں نے پہلے وفد میں آپ سے ملاقات کی وہ ان افراد کے علاوہ تھے جو دوسرے وفد میں شریک ہوئے، سوائے ولید بن مغیرہ کے وہ دونوں وفود میں شریک ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک ہی قسم کی گفتگو بار بار نہ ہو اور مذاکرات کرنے والوں کی سوچ اور ان کے مراتب بھی مختلف ہوتے رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ طریقۂ کار مؤثر ہوسکتا ہے۔

اس سارے قصے میں قیامت تک آنے والے دعوت اسلامی کے مبلغین کے لیے سبق ہے کہ وہ ذرہ برابر بھی اپنے اسلامی موقف سے پیچھے نہ ہٹیں۔ اسلام ایک ربانی دعوت کا نام ہے۔ اسے ترک کرنے کے بظاہر کتنے ہی اسباب و وجوہات اور جواز کیوں نہ ہوں اس پر کسی طور سودے بازی نہیں ہوسکتی۔

دورِ حاضر کے اسلامی مبلغین اور داعیوں کو ایسی پیشکشوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ مادی ترغیبات بعض اوقات بلاواسطہ نہیں ہوتیں بلکہ بالواسطہ، مثلاً: خطیر وظائف یا ایسے معاہدات کی شکل میں ہوتی ہیں جن سے بہت بڑے مالی منافع وابستہ ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو نہایت سودمند تجارت کی پیشکش بھی ہوتی ہے۔ آج کل بعض جرائم پیشہ (مشکوک) عالمی تنظیمیں اسلامی دعوت عام کرنے والوں بالخصوص ان کے قائدین کو روکنے کے لیے اسی طرح کی منصوبہ بندی کرتی ہیں۔ یہ تنظیمیں جو عالم اسلامی کو نیست و نابود کرنے کی مسلسل سازشیں کرتی رہتی ہیں، آپس میں ہر قسم کی معلومات کا تبادلہ کرتی رہتی ہیں۔[1]

---

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 89.

مشرق وسطیٰ میں اسلامی تحریک کے مطالعے پر مامور ایک بہت بڑا مغربی دانشور رچرڈ بی مائیکل اپنی ایک رپورٹ میں لکھتا ہے کہ ایک نئی منصوبہ بندی سے اسلامی تحریکوں کا مکمل صفایا کیا جاسکتا ہے۔ وہ دعوت اسلامی کے قائدین کو دنیاوی پیشکش کرنے کی راہ سجھاتے ہوئے مندرجہ ذیل مشورے دیتا ہے:

① ایسے افراد تلاش کیے جائیں جنھیں خطیر وظائف دے کر ان کے مقصد سے دور کیا جاسکے تاکہ وہ صرف کارروائی کے طور پر اپنی ذمہ داریاں انجام دیں۔ انھیں ایسے کاموں میں مشغول کر دیا جائے جن سے ان کی توانائیاں ضائع ہوں اور یہ اسی صورت ممکن ہے کہ ان پر منصبی اور مادی انعامات کی بارش کی جائے اور ان کے لیے بہت سی سہولتیں مہیا کی جائیں۔ اس طرح وہ مقامی طور پر بظاہر اپنی ذمہ داری پوری کرتے نظر آئیں گے مگر درحقیقت وہ ضائع ہو چکے ہوں گے اور اپنے بہت سے اصول وقواعد سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوں گے۔

② اصحاب ثروت وتجارت کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے محنت کی جائے اور ان کی توجہ جزیرہ نمائے عرب میں ان مخفی منصوبوں کی طرف مبذول کرائی جائے جن کا فائدہ دشمن کو ہو اور ان کے ناپاک عزائم کی تکمیل ہو۔

③ عرب کے مالدار علاقوں کو ایسے کاموں میں مصروف رکھا جائے۔ اور ان سے مالی مفادات پر مبنی ایسے معاہدے کیے جائیں جو انھیں اسلامی سرگرمیوں سے دور کر دیں۔[1]

مندرجہ بالا تین نکات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب بلا واسطہ مادی پیشکشیں ہیں اور موجودہ عالم اسلام کا بنظر غائر جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ ان نکات پر بڑی تندہی سے عمل کیا جارہا ہے۔ اعلیٰ مناصب نے بعض داعیوں کو دین سے لاتعلق کر دیا ہے، قدرتی نعمتوں سے مالا مال عرب ممالک نے مبلغین کی بہت بڑی جماعت کو ضائع کر دیا ہے اور بعض داعیوں کو تجارت نے ہلاکت خیز غفلت میں مبتلا کر دیا ہے۔[2]

---

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 89. [2] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 91.

کفار کے ساتھ بحث و مباحثہ

نبی ﷺ نے اپنی پیش کردہ دعوت کی صحت پر بہت سے دلائل اور براہین پیش کیے۔ آپ مناسب موقع اور وقت سے فائدہ اٹھانے پر یقین رکھتے تھے اور دعوت اسلامی کے خلاف پیدا کیے جانے والے ہر قسم کے شبہات کا مکمل رد کرتے۔ آپ ﷺ نے کفار سے مجادلے کے لیے بہت سے اسالیب اختیار فرمائے جن کی بنیاد اللہ کی کتاب تھی۔ آپ ﷺ نے عقلی دلائل، منطقی قیاسات اور اپنی دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان شبہات کے جوابات دیے۔ نبی ﷺ نے جو اسالیب اختیار فرمائے مندرجہ ذیل تھے:

تقابلی انداز: یہ اسلوب معاملے کے دونوں پہلو سامنے رکھ کر اختیار کیا جاتا ہے۔ اول اس بھلائی کا تذکرہ ہوتا ہے جس کی ترغیب مطلوب ہو، دوسری طرف اس برائی کا تذکرہ ہوتا ہے جس سے لوگوں کو خبردار کرنا مقصود ہو، پھر عقل کو ان دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کی دعوت دی جاتی ہے اور آخر کار ایک تقابلی جائزے کے بعد بھلائی اور اسے اختیار کرنے والوں کی فضیلت کو ثابت کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾

”کیا ایک ایسا شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس کے لیے نور بنا دیا، وہ اس کی روشنی میں لوگوں میں چلتا ہے، (کیا) وہ اس شخص جیسا (ہوسکتا) ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں پڑا ہے، ان سے نکلنے والا نہیں؟ اسی طرح کافروں کے لیے ان کاموں میں کشش رکھی گئی ہے جو وہ کرتے ہیں۔“[1]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ”یہ ایک مثال ہے جسے اللہ تعالیٰ

---

[1] الأنعام 6:122۔

نے اس مومن کے لیے بیان فرمایا ہے جو مردہ تھا، یعنی گمراہی میں گرا ہوا، ہلاک ہونے والا تھا۔ اللہ نے اسے زندہ فرمایا، یعنی اس کے دل میں ایمان کا شعلہ روشن کر دیا اور اسے ہدایت بخشی اور اپنے پیغمبروں کی اتباع کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔“[1]

اقرار کروانا: اس اسلوب میں عقلی دلائل کے بعد لوگوں سے اپنا مطلوبہ موقف منوایا جاتا ہے اور یہی دعوت کا مقصد بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ○ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ○ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ○ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ○ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ○ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ○ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ○ اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۗ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ○ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ○ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ○﴾

”کیا وہ بغیر کسی شے کے پیدا کیے گئے ہیں، یا وہی (خود اپنے) خالق ہیں؟ کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؟ بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے، کیا ان کے پاس آپ کے رب کے خزانے ہیں؟ یا وہ (ان پر) محافظ و نگران ہیں؟ کیا ان کے لیے کوئی سیڑھی ہے کہ وہ اس کے ذریعے سے (چڑھ کر آسمان کی باتیں) سن لیتے ہیں؟ پھر چاہیے کہ ان کا سننے والا کوئی واضح دلیل لے آئے، کیا اس (اللہ) کے لیے بیٹیاں ہیں اور تمھارے لیے بیٹے؟ کیا آپ ان سے کوئی اجر مانگتے ہیں کہ وہ (اس کے) تاوان سے بوجھ تلے دب گئے ہیں؟ یا ان کے پاس (علم) غیب ہے تو وہ لکھتے ہیں، کیا وہ کسی فریب کا ارادہ کرتے ہیں؟ تو جن لوگوں نے کفر کیا وہی

---

[1] تفسیر ابن کثیر: 172/2.

فریب خوردہ ہیں، کیا ان کے لیے اللہ کے سوا اور کوئی معبود ہے؟ اللہ پاک ہے اس سے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں اور اگر وہ آسمان سے گرتا ہوا کوئی ٹکڑا بھی دیکھیں تو وہ کہیں گے: (یہ) تہ بہ تہ بادل ہے، لہٰذا (اے نبی!) آپ انھیں (ان کے حال پر) چھوڑ دیجیے، حتی کہ وہ اپنے اس دن سے ملیں جس میں وہ بے ہوش کیے جائیں گے۔"[1]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "قرآن کے اس مقام پر توحید ربوبیت اور توحید الوہیت کا اثبات کیا گیا ہے، یعنی وہ بغیر کسی پیدا کرنے والے کے معرض وجود میں آگئے ہیں یا پھر انھوں نے خود ہی اپنے آپ کو وجود عطا کیا ہے؟ یعنی ان دونوں میں سے کوئی بھی نظریہ درست نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی نے انھیں جب وہ کچھ نہ تھے، پیدا فرمایا اور وجود عطا کیا۔"[2]

یہ آیت کریمہ عقلی اعتبار سے ایک مضبوط دلیل ہے کیونکہ انسانوں کے اس طرح خود بخود معرض وجود میں آجانے کو عقل فطری طور پر تسلیم نہیں کرتی اور اس میں کسی قسم کی بحث کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک ان کے خود کو پیدا کرنے کا تعلق ہے، وہ اس کے دعویدار ہی نہیں تھے اور نہ مخلوق یہ دعویٰ کر سکتی ہے۔ جب یہ دونوں مفروضے فطرتاً عقل کے مطابق نہیں تو اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ کار نہیں، جیسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے کہ سب اس ایک اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔[3]

مفسر سعدی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اللہ کی ربوبیت و الوہیت کے اقرار کو لازم ٹھہراتے ہوئے لکھا ہے: "یہ ایک ایسا استدلال ہے جس کے بعد لوگوں کو حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا یا بصورت دیگر وہ عقل و دین سے عاری سمجھے جائیں گے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے منکر اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو جھٹلانے والے

---

[1] الطور 52:35-45. [2] تفسیر ابن کثیر: 244/4. [3] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 3399/6.

ہیں اور یہ نظریہ اس لیے پیدا ہوا کہ وہ تسلیم نہیں کرتے کہ اللہ نے انھیں پیدا کیا ہے، حالانکہ عقلاً اور شرعاً یہ بات طے شدہ ہے کہ یہ معاملہ تین باتوں میں سے ایک کے درست ہونے پر دلالت کرتا ہے:

① ان کا کوئی خالق نہیں بلکہ وہ بغیر تخلیق کے پیدا ہو گئے ہیں اور انھیں کوئی وجود میں لانے والا نہیں۔ یہ بات یکسر محال ہے۔

② انھوں نے خود کو پیدا کر لیا ہے، یہ بھی محال ہے کیونکہ یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی اپنا ہی خالق ہو۔

③ جب یہ دونوں باتیں باطل قرار پائیں اور ان کا ناممکن ہونا ثابت ہو گیا تو تیسری بات مُسلَّم ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ ہی نے انھیں پیدا فرمایا ہے۔

جب یہ تیسری بات تسلیم کر لی گئی تو معلوم ہوا کہ معبود صرف اور صرف ایک اللہ ہے جس کے سوا کسی کی بندگی روا نہیں اور نہ یہ کسی کے شایان شان ہے۔[1]

مخالفین کے ثانوی دلائل نظر انداز کر کے ان کا ابطال کرنا: یہ ایک پرزور اسلوب ہے جو غرور اور تکبر میں مبتلا سرکشوں کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں ان کی معاندانہ باتوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے اور ان کی باطل حجت بازی پر اعتراض نہیں کیا جاتا تاکہ بے مقصد جھگڑے اور نزاع سے بچا جا سکے۔ اس کے برعکس ان کے خلاف ایسے قطعی دلائل پیش کیے جاتے ہیں جو ان کے نظریے کا بودا پن ظاہر کر دیتے ہیں اور ان کے باطل دلائل خود بخود ختم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے قصے میں اسی اسلوب کا ایک مُفَصَّل نمونہ پایا جاتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے ہر اعتراض اور شبہے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے دعوائے الوہیت کو باطل قرار دیا اور بہت سے واضح عقلی دلائل سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و الوہیت ثابت

---

[1] تفسير السعدي: 7/195,196.

کی۔[1] سورۂ شعراء میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَآ ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ○ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ○ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ○ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ○ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَآ ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ○﴾

’’فرعون نے کہا: اور رب العالمین کیا ہے؟ اس (موسیٰ) نے کہا: وہ آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، ان کا رب ہے، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ اس (فرعون) نے اپنے اردگرد والوں (درباریوں) سے کہا: کیا تم سنتے نہیں ہو؟ اس (موسیٰ) نے کہا: (وہ) تمھارا اور تمھارے اگلے آباء و اجداد کا رب ہے۔ اس (فرعون) نے کہا: بلاشبہ تمھارا یہ رسول، جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، یقیناً دیوانہ ہے۔ اس (موسیٰ) نے کہا: (وہ) مشرق و مغرب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ان کا رب ہے، اگر تم عقل رکھتے ہو۔ اس (فرعون) نے کہا: البتہ اگر تو نے میرے سوا کوئی اور معبود پکڑا تو میں ضرور تجھے قیدیوں میں سے کردوں گا۔‘‘ [2]

یہ وہ چند قرآنی اسالیب تھے جنھیں اللہ کے رسول ﷺ نے بنیادی طور پر مشرکین سے بحث مباحثے کے وقت اختیار فرمایا۔

جب مشرکین نے نبی ﷺ کی دعوت کو مشکوک سمجھ کر جھٹلایا اور آپ کی تصدیق میں پس و پیش سے کام لیا تو درحقیقت وہ پیغمبر کو نہیں جھٹلاتے تھے بلکہ اپنی سرکشی اور کفر ہی کا اظہار کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] مقومات الداعية الناجح للدكتور علي بادحدح، ص:59-69. [2] الشعرآء26:23-29.

﴿قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِیْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ○﴾

”(اے نبی!) تحقیق ہم جانتے ہیں کہ بے شک آپ کو وہ بات غمگین کرتی ہے جو وہ کہتے ہیں، پس بے شک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ دراصل یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔“ [1]

کفار کی ٹیڑھی سوچ نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے ایسے مطالبات کریں جن کا مقصد نبی ﷺ کی صداقت کو تسلیم کرنا ہرگز نہ تھا۔ وہ تو سرکشی اختیار کرتے ہوئے آپ کو عاجز کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے نبی ﷺ سے مندرجہ ذیل مطالبات کیے:

① آپ ﷺ ان کے لیے زمین سے چشموں کی صورت میں پانی جاری کر دیں۔

② نبی ﷺ کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس میں نہریں جاری ہوں۔

③ وہ آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان پر گرا دیں جس طرح قیامت کے دن ہوگا۔

④ وہ اللہ اور فرشتوں کو ان کے سامنے لا کھڑا کریں۔

⑤ نبی ﷺ کے لیے سونے کا ایک گھر ہو۔

⑥ آپ ﷺ آسمان پر چڑھ جائیں، یعنی ایک سیڑھی لیں اور ان کے سامنے آسمان پر جا چڑھیں۔

⑦ نبی ﷺ آسمان سے ان پر ایک کتاب اتار لائیں جسے وہ خود پڑھیں۔

امام مجاہد رحمہ اللہ اس کا مفہوم یہ بتاتے ہیں کہ ”ہر ایک کے نام ایک چٹھی ہو جس میں لکھا ہو کہ یہ اللہ کی طرف سے فلاں ابن فلاں کے لیے ایک کتاب ہے اور وہ ہر ایک کے سرہانے پڑی ہو۔“ [2]

⑧ انھوں نے پیغمبر ﷺ سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ وہ ان کے لیے اپنے اللہ سے دعا کریں

---

[1] الأنعام 33:6. [2] المعوّقون للدعوة الإسلامية للدكتورة سميرة محمد، ص: 172,171.

کہ یہ پہاڑ وہاں سے ہٹا دے اور زمین کو پھاڑ کر ان کے آباء واجداد کو زندہ کرے۔[1]

خرق عادت امور اور معجزات کے مطالبات عرصۂ دراز سے انسانی تاریخ کا حصہ رہے ہیں باوجودیکہ نبی ﷺ اپنی قوم کے ایمان لانے پر حریص تھے اور اس سلسلے میں آپ نے بڑی مشقتیں برداشت کیں لیکن اپنی قوم کے یہ مطالبات تسلیم نہ کیے کیونکہ قرآن کے حوالے سے آپ جانتے تھے کہ اگر وہ اپنے ان مطالبات کے پورا ہونے کے بعد بھی ایمان نہ لائے تو سخت عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے، چنانچہ آپ ﷺ نے انھیں یہ جواب دیا:

«مَا بِهٰذَا بُعِثْتُ إِلَيْكُمْ، إِنَّمَا جِئْتُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ بِمَا بَعَثَنِي بِهٖ، وَقَدْ بَلَّغْتُكُمْ مَّا أُرْسِلْتُ بِهٖ إِلَيْكُمْ، فَإِنْ تَقْبَلُوهُ فَهُوَ حَظُّكُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَإِنْ تَرُدُّوهُ عَلَيَّ، أَصْبِرْ لِأَمْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ»

”مجھے تو اللہ نے تمھاری طرف رسول بنا کر مبعوث کیا ہے اور میں نے تمھیں رب کا پیغام پہنچا دیا۔ اگر تم میری دعوت قبول کر لو تو تمھارا دنیا و آخرت کا نصیب ہے۔ اور اگر تم میری دعوت کو ٹھکرا دو تو میں اس وقت تک صبر کروں گا حتی کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ فرما دے۔“[2]

نبی ﷺ جب اپنی قوم کے بارے میں مطلوبہ نتائج حاصل نہ کر سکے اور دعوت پیش کرنے کے بعد انھیں خود سے دور ہوتے دیکھا تو غمزدہ اور افسردگی کی حالت میں واپس ہوئے۔[3]

اللہ تعالیٰ نے کفار کی سرکشیوں اور ان کے تمام مطالبات کا رد اپنے اس فرمان میں بیان کیا ہے:

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 311/1. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 459/1. [3] السيرة النبوية لأبي شهبة: 317/1.

﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا○ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا○ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا○ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا○ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا○ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا○ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا○﴾

”اور وہ بولے: ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، حتی کہ تو ہمارے لیے زمین سے چشمہ جاری کر دے، یا تیرے لیے کھجوروں اور انگور کا ایک باغ ہو، پھر تو اس (باغ) کے درمیان (جگہ جگہ) نہریں جاری کر دے، یا تو آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے جیسے تو کہا کرتا ہے، یا اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے لے آ، یا تیرے لیے سونے کا گھر ہو، یا تو آسمان میں چڑھ جائے اور ہم تیرے چڑھنے پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتی کہ تو ہم پر ایک کتاب اتار لائے جسے ہم پڑھیں، کہیے: میرا رب پاک ہے، میں تو بس ایک بشر رسول ہوں اور لوگوں کے پاس ہدایت آجانے کے بعد ان کو ایمان لانے سے صرف اس چیز نے روکا کہ انھوں نے کہا: کیا اللہ نے بشر رسول بھیجا ہے؟ کہہ دیجیے: اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو یہاں مطمئن ہو کر چلتے پھرتے تو ہم ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ ہی رسول بنا کر نازل کرتے، کہہ دیجیے: میرے اور تمھارے درمیان اللہ (بطور) گواہ کافی ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں سے خوب باخبر اور (انھیں) خوب دیکھنے والا ہے۔“ [1]

---

[1] بنيٓ إسرآءيل 17:90-96.

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی نازل ہوا:

﴿وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا﴾

''اور اگر بلاشبہ (قرآن ایسا ہوتا) کہ اس کے ذریعے سے پہاڑ چلائے جاتے یا اس سے زمین قطع کی جاتی یا اس سے مردے بلوائے جاتے (تو بھی کفار ایمان نہ لاتے) بلکہ سارا معاملہ (اختیار) اللہ ہی کے پاس ہے۔''[1]

کفار کے مطالبات تسلیم نہ کیے جانے کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے یہ مطالبات ہدایت پانے کے لیے اور معاملے کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے نہ کیے تھے۔ انھوں نے تو صرف بطور استہزا و سرکشی یہ مطالبات کیے تھے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ اگر ان کے مطالبات کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو وہ اسے دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے بلکہ وہ اپنی سرکشی میں مزید آگے بڑھیں گے اور کفر و ضلالت میں سرگرداں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؗ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ○﴾

''اور انھوں نے اللہ کے نام کی پختہ قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس (مخصوص) نشانی آجائے تو وہ اس پر ضرور ایمان لے آئیں گے، (اے نبی!) کہہ دیجیے: نشانیاں تو صرف اللہ کے پاس ہیں اور تمھیں یہ بات کون سمجھائے کہ بے شک جب وہ نشانی آجائے گی تو بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے اور ہم (اسی طرح) ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر دیتے ہیں جس طرح یہ پہلی بار اس (قرآن) پر ایمان نہیں لائے

---

[1] الرعد 31:13.

تھے اور ہم انھیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیں گے اور اگر بے شک ہم ان کی طرف فرشتے نازل کرتے اور ان سے مردے کلام کرتے اور ہم (ان کی) ہر (مطلوبہ) شے ان کے سامنے پیش کر دیتے تو بھی وہ ایمان نہ لاتے۔ ہاں اگر اللہ ایسا چاہتا (تو اور بات تھی) لیکن ان میں سے اکثر جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔‘‘[1]

یہی وہ حکمتِ الٰہی اور رحمت ربانی تھی کہ ان کے مطالبات پورے نہ کیے گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ جب کوئی قوم نشانیاں دیکھ لینے کے بعد ایمان نہ لائے تو ان پر جڑ سے اکھیڑ دینے والا عذاب آتا ہے جیسا کہ قوم فرعون، عاد اور ثمود پر آیا تھا۔

کفار مکہ نے سرکشی اختیار کی، حق کا مذاق اڑایا اور دعوت حق کی راہ میں روڑے اٹکائے اور غیر سنجیدہ رویہ اپنایا، حالانکہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کریم کی شکل میں زندۂ جاوید معجزہ موجود تھا جو سب سے بڑی دلیل اور نبی ﷺ کی صداقت کا بین ثبوت ہے،[2] چنانچہ جب انھوں نے مذکورہ معجزات کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ جواب دیا:

﴿قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○﴾

’’آپ کہہ دیجیے: میرے اور تمھارے درمیان اللہ بطورِ گواہ کافی ہے، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ اسے جانتا ہے اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور انھوں نے اللہ کے ساتھ کفر کیا، وہی خسارہ پانے والے ہیں۔‘‘[3]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں: ’’قریش نے نبی ﷺ سے مطالبہ کیا کہ آپ اپنے اللہ سے دعا کریں کہ وہ صفا پہاڑ کو سونے میں تبدیل کر دے، پھر ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: «وَتَفْعَلُونَ؟» ’’کیا تم واقعی ایمان لے آؤ گے؟‘‘

---

[1] الأنعام 6:109-111. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة:1/321,320. [3] العنكبوت 29:52.

انھوں نے جواب دیا: ”ہاں!“ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی تو جبریل علیہ السلام آئے اور کہا: «إِنَّ رَبَّكَ عَزَّوَجَلَّ- يَقْرَأُ عَلَيْكَ السَّلَامَ، وَيَقُولُ: إِنْ شِئْتَ أُصْبِحُ لَهُمُ الصَّفَا ذَهَبًا فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْهُمْ عَذَّبْتُهُ عَذَابًا لَّا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ، وَإِنْ شِئْتَ فَتَحْتُ لَهُمْ أَبْوَابَ التَّوْبَةِ وَالرَّحْمَةِ» ”بلاشبہ آپ کا رب آپ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے: اگر آپ چاہیں تو میں ان کے لیے اس پہاڑ کو سونے میں تبدیل کردوں گا لیکن اس کے بعد اگر کسی نے کفر کا رستہ اختیار کیا تو انھیں ایسا عذاب دوں گا جو آج تک کسی کو نہ دیا ہوگا اور اگر آپ چاہیں تو میں ان کے لیے توبہ و رحمت کا دروازہ کھول دیتا ہوں۔“ اس پر نبی ﷺ نے عرض کی:

«بَلْ بَابَ التَّوْبَةِ وَالرَّحْمَةِ!»

”باری تعالیٰ! میں تو رحمت و توبہ کا دروازہ کھلوانا چاہتا ہوں۔“ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝﴾

”اور ہمیں نشانیاں بھیجنے سے صرف اس چیز نے روکا ہے کہ پہلے لوگوں نے ان کو جھٹلایا تھا اور ہم نے ثمود کو ایک اونٹنی (بطور) واضح نشانی دی تھی، پھر انھوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم تو صرف ڈرانے کے لیے نشانیاں بھیجتے ہیں۔“[1]

قریشی سرداروں کے ان مطالبات کا مقصد صرف پیغمبر اور ان کی دعوت کے خلاف ذرائع ابلاغ کی ایک جنگ کا آغاز کرنا اور حق کے خلاف آمرانہ رویے کا اظہار تھا تاکہ عرب قبائل نبی ﷺ سے دور رہیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انھوں نے ایسے مطالبات کیے ہیں جو اس دعوت کے اسلوب کے خلاف ہیں، اسی لیے انھوں نے ان پر اصرار کیا، تاہم

---

[1] بنيّ إسرآءيل 59:17.

انھوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر ان کا کوئی مطالبہ پورا ہو بھی گیا تو بھی وہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ یوں ان کی یہ ساری تگ و دو نبی ﷺ کو عاجز کرنے اور لوگوں کو آپ کی اتباع سے روکنے کے لیے تھی۔[1]

مکی دور میں یہود کا کردار اور مشرکین مکہ سے تعاون

قرآن کریم نے بہت سی سورتوں میں بنی اسرائیل کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ ان کا صرف مکی دور کا کردار تقریباً پچاس سورتوں میں ملتا ہے۔ ان کا مدنی دور اللہ کے نور کو بجھانے، اسلامی دعوت کو ختم کرنے اور نبی ﷺ کی جان لینے کی کوششوں میں گزرا۔ قرآن کریم نے کسی بھی امت کے کردار پر اتنی روشنی نہیں ڈالی جتنی تفصیل سے قوم یہود کا تذکرہ کیا ہے۔

قرآن مجید کے بیانات میں یہود کے حوالے سے ان تمام دعوتی مراحل کا تذکرہ کیا گیا ہے جن سے دعوت اسلامی گزر رہی تھی۔ قرآن کریم میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ مشرکین مکہ نے حق سے جو غفلت برتی اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی کوئی پروا نہ کی، اس کی مثالیں پہلی امتوں میں بھی ملتی ہیں، مثلاً: عاد، ثمود، فرعون اور بنی اسرائیل، قوم تُبَّع اور اصحاب الرّس وغیرہ[2]

سورۂ مزمل میں اس بارے میں اشارات موجود ہیں جو قرآن کی ترتیب نزولی کے اعتبار سے تیسری سورت ہے:

﴿إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَٰهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ ٱلرَّسُولَ فَأَخَذْنَٰهُ أَخْذًا وَبِيلًا ۝﴾

”بے شک ہم نے تمھاری طرف ایک رسول بھیجا جو تم پر شاہد ہے جیسے ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا، چنانچہ فرعون نے رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے

---

[1] الوفود في العهد المكي لعلي الأسطل، ص: 40-51. [2] معالم قرآنية في الصراع مع اليهود لمصطفى مسلم، ص: 31,30.

اسے نہایت سختی سے پکڑ لیا۔“ [1]

اسی طرح سورۂ اعلیٰ جو قرآن کی ترتیب نزولی کے لحاظ سے آٹھویں سورت ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی بعض صفات جلیلہ بیان کرنے کے بعد ان دنیاوی اور اخروی نعمتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں پر نازل فرمائیں۔ علاوہ ازیں دنیا میں راہ نجات متعین فرمائی گئی اور بتایا گیا ہے کہ آخرت سب سے بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اور سورت کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے:

﴿اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۙ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝﴾

”بے شک یہ (بات) پہلے صحیفوں میں بھی (کہی گئی) تھی، (یعنی) ابراہیم اور موسیٰ (علیہما السلام) کے صحیفوں میں۔“ [2]

سورۂ فجر میں بھی گزری ہوئی اقوام کے تذکرے میں قوم فرعون کا تذکرہ موجود ہے۔ سورۂ نجم میں بھی بنی اسرائیل کا تذکرہ ملتا ہے۔ وہاں اس حوالے سے ان کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان پر بہت سی آزمائشیں آئیں اور ظلم ہوئے۔ ان میں سے بعض آزمائش کا مقابلہ نہ کر سکے اور گمراہ ہوگئے اور بعض ثابت قدم رہے اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ ارشاد ہے:

﴿اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ۝﴾

”کیا اسے (منہ موڑنے والے کو) ان (باتوں) کی خبر نہیں دی گئی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہیں؟“ [3]

گویا یہ تمام اصول اور ضابطے موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں (الواح موسیٰ) میں موجود ہیں جو بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے۔ قریش کو چاہیے تھا کہ اگر انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت میں شک تھا تو ان صحیفوں کی طرف رجوع کرتے اور اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں کی طرف رجوع کرتے کیونکہ قریش کا خیال تھا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام سے نسبت رکھتے

---

[1] المزمل 16,15:73. [2] الأعلی 19,18:87. [3] النجم 36:53.

ہیں اور ان کی شریعت کی تعظیم کرتے ہیں اور اس کے وارث بنتے چلے آرہے ہیں، جیسا کہ وہ کعبے کی تولیت اور حُجاج کی خدمت جیسے مناصب پر فائز ہیں۔[1]

سورۂ صٓ، یٰسٓ، مریم اور طٰہٰ میں بھی بہت سے انبیاء اور ان کی اقوام کے قصص اور انھیں پہنچنے والی آزمائشوں کا تذکرہ ملتا ہے اور یہ کہ کس طرح انھوں نے صبر کا مظاہرہ کیا، نیز اس دعوت حق کے حاملین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت کا ذکر بھی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ○ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ
ذُو الْاَوْتَادِ ○ وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ ؕ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ ○ اِنْ كُلٌّ اِلَّا
كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ○ وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ
فَوَاقٍ ○ وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ○ اِصْبِرْ عَلٰى مَا
يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ○﴾

''(یہ تو) یہاں کے شکست خوردہ لشکروں میں سے ایک (معمولی سا) لشکر ہے، ان سے پہلے قوم نوح اور عاد اور میخوں والے فرعون نے (حق کو) جھٹلایا اور قوم ثمود اور قوم لوط اور اصحاب اَیکہ نے بھی (جھٹلایا) (واقعی) یہ بہت بڑے (اور طاقتور) لشکر تھے، (ان میں سے) ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا، لہٰذا (ان پر) میرا عذاب ثابت ہوگیا۔ یہ لوگ تو بس ایک (ہولناک) چیخ کا انتظار کر رہے ہیں، جس میں کوئی وقفہ نہیں ہوگا۔ اور انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہمیں ہمارا (عذاب کا) حصہ یوم حساب سے پہلے جلد دے دے۔ (اے نبی!) جو کچھ یہ کہتے ہیں آپ اس پر صبر کیجیے اور ہمارے بندے داود کو یاد کیجیے جو صاحب قوت تھا، بے شک وہ بہت رجوع کرنے والا تھا۔''[2]

ان آیات میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے تربیتی رہنمائی تھی کہ ان لوگوں نے کس طرح

---

[1] معالم قرآنية في الصراع مع اليهود لمصطفى مسلم، ص: 316. [2] صٓ 38:11-17.

دعوت حق کے خلاف محاذ آرائی کی اور پیغمبروں کو جھٹلایا اور کس طرح ان پر عذاب برحق نازل ہوا اور اہل حق کامیابی اور فلاح سے ہمکنار ہوئے۔

کوئی بھی پیغمبر چاہے اس کا مقام و مرتبہ اپنے معاشرے میں کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو اسے اپنی قوم کی طرف سے بڑی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر ہم سیدنا نوح، موسیٰ، ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کو عامۃ الناس تصور کرلیں تو داوٗد علیہ السلام کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو قوت وحشمت اور بادشاہت کے مالک تھے۔ ان کے معجزات اتنے واضح تھے کہ پہاڑ ان کے ساتھ تسبیح بیان کرتے، پرندے ان کی تلاوت اور آواز سننے کے لیے جمع ہوجاتے۔ بنی اسرائیل نے ان کے بارے میں کیا کہا اور ان کی سیرت کے متعلق کیسی کیسی باتیں اپنی کتابوں میں لکھی ہیں۔ انھوں نے داوٗد علیہ السلام کی ذات سے ہر عیب منسوب کیا، حالانکہ وہ ایک عبادت گزار اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے پیغمبر تھے۔

اسی طرح بنی اسرائیل نے مریم علیہا السلام کے بارے میں جو انتہائی برگزیدہ خاتون تھیں، بہت کچھ کہا، حالانکہ قرآن کریم نے ان کے حمل، ولادت اور ان کے اور ان کے بیٹے کے ساتھ پیش آنے والے خرق عادت امور کو اپنی نشانیاں قرار دیا:

﴿قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ○﴾

”اس (فرشتے) نے کہا: اسی طرح ہوگا، تیرے رب نے کہا ہے کہ وہ مجھ پر بہت آسان ہے تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیے نشانی اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں اور یہ امر طے شدہ ہے۔“[1]

اگر بنی اسرائیل کے اہل کتاب ہونے کے باوجود اپنے پیغمبروں سے ان کا یہ سلوک رہا ہے، حالانکہ ان کے پاس تورات تھی جس میں ہدایت و نور تھا تو قریش کی طرف سے

---

[1] مریم 21:19.

دعوت اسلامی کی مخالفت میں ایسے الفاظ استعمال کرنا جو خود ان کی ضلالت و جہالت کا مظہر تھے، انوکھی بات نہ تھی۔

دعوت اسلامی لوگوں کو حق قبول کرنے اور اللہ کے دشمنوں، مشرکین اور ایسے اہل کتاب جو اللہ کو جھٹلاتے اور اس پر بہتان طرازی کرتے ہیں، کے خلاف ثابت قدم رکھنے کی تربیت دیتی ہے۔

بنی اسرائیل نہ صرف دیگر انبیاء پر ایمان لانے کے بجائے ان کی تکذیب کرتے ہیں بلکہ اپنے سب سے بڑے نبی سیدنا موسیٰ علیہ السلام جن سے منسوب ہو کر نہ صرف فخر محسوس کرتے اور اپنے آپ کو ان کی کتاب اور شریعت کا حامل بتاتے ہیں، ان کے متعلق بھی ان کا برتاؤ بڑا تمسخر آمیز اور عجیب رہا ہے۔

سورۂ طٰہٰ میں بنی اسرائیل کا ان کے ساتھ سلوک واضح کرتے ہوئے یہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی ناسمجھی، سرکشی اور جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو برداشت کیا۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو بغرض اصلاح اپنی قوم میں چھوڑ کر خود اپنے رب سے ہم کلام ہونے کے لیے کوہ طور پر تشریف لے گئے تھے۔ پیچھے قوم نے ہارون علیہ السلام کے خلاف باغیانہ رویہ ظاہر کیا۔ ساری قوم نے اپنے زیورات اکٹھے کیے تاکہ سامری ان کے لیے ایسا بچھڑا تیار کر دے جس سے گائے کی آواز بھی آتی ہو اور لوگ اس کا بغرض عبادت طواف کریں اور زبان سے کہیں:

﴿ هٰذَآ اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ ۝ ﴾

”یہ تمھارا اور موسیٰ کا رب ہے پس وہ (موسیٰ) بھول گیا۔“[1]

جب موسیٰ علیہ السلام کو حقیقت سے آگاہی ہوئی تو انھوں نے سامری کو طلب کیا اور اس سے اس جاہلانہ حرکت کے بارے میں سوال کیا تو اس نے جواب دیا:

---

[1] طٰہٰ 88:20.

﴿قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ○﴾

”اس (سامری) نے کہا: میں نے وہ چیز دیکھی جو ان لوگوں نے نہ دیکھی، چنانچہ میں نے (مٹی کی) ایک مٹھی رسول (جبریل کے گھوڑے) کے نقش قدم سے بھرلی اور وہ اس میں ڈال دی اور اسی طرح میرے نفس نے (اسے) میرے لیے خوشنما بنا دیا۔“ [1]

بلاشبہ ایک ایسی قوم جس کی کم عقلی گمراہی، فساد اور کج روی کو پہنچ چکی تھی، اب کیا اس کی طرف سے کسی اچھے سلوک یا بھلائی اور حق کے ساتھ تعاون کی امید کی جا سکتی تھی؟ بنی اسرائیل کے ان واقعات کی وجہ سے دعوت حق کے مکی مرحلے میں تمام مذاہب اور گروہوں سے الگ شان کی حامل اسلامی شخصی کردار سازی میں دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ [2]

قرآنی رموز اور ان کی عمدہ مناسبتوں کا تقاضا ہے کہ عالمی دعوت اسلامی کے بارے میں بحث کرتے ہوئے بنی اسرائیل سے لیے گئے اس عہد و پیمان کا ضرور تذکرہ کر دیا جائے جس میں انھیں اس دعوت کی آمد پر نبی ﷺ پر ایمان لانے کو کہا گیا ہے اور اس بات کا تذکرہ سورۂ اعراف میں موجود ہے۔

بنی اسرائیل کی کج روی کی داستان بیان کرنے کا مقصد اہل ایمان کو خبردار کرنا تھا کہ اگر یہود انھیں برا سمجھیں تو ان کی کسی بات سے متاثر نہ ہوں، یہ تو ایک بہتان طراز قوم ہے اور ان کا اپنے پیغمبروں سے بہت برا سلوک رہا ہے۔ یہود نے اپنی کتابوں میں نبی ﷺ کے اوصاف موجود ہونے کے باوجود اگر آپ ﷺ کو اور اسلامی دعوت کو جھٹلایا ہے تو ایک فسادی قوم سے اس طرح کا ارتکاب بعید نہیں۔ [3]

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] طٰہٰ 96:20. [2] معالم قرآنية في الصراع مع اليهود لمصطفىٰ مسلم، ص:39,40. [3] معالم قرآنية في الصراع مع اليهود لمصطفىٰ مسلم، ص:54.

﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○﴾

”اور (ان کے لیے بھی رحمت ہے) جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، (یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ انھیں اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں برے کاموں سے روکتا ہے۔ اور وہ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام ٹھہراتا ہے اور ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر تھے، چنانچہ جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انھوں نے اس کی تعظیم کی اور اس کی مدد کی اور اس نور (ہدایت) کی پیروی کی جو اس پر نازل کیا گیا، وہی فلاح پانے والے ہیں، کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، جس کے پاس آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے، لہٰذا تم اللہ پر اور اس کے رسول اُمی نبی پر ایمان لاؤ، جو (خود بھی) اللہ اور اس کے (تمام) کلمات پر ایمان لاتا ہے اور تم اس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔“ [1]

---

[1] الأعراف 7:157، 158۔

جی ہاں! یہ پیغام مکہ کی گھاٹیوں اور پہاڑوں پر مشتمل سنگلاخ زمین سے نکل کر سارے عالم میں پھیلنے والا تھا۔ ایک عظیم روحانی انقلاب برپا ہونے والا تھا۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ آیات اس عالمی دعوت کے خدوخال کی وضاحت کرتی ہیں کہ وہ مکہ سے نکل کر پورے عالم کی زینت بنے گی، نیز سورۂ اعراف کی یہ آیات امت محمدیہ کے لیے عظیم ترین اسباق کی حامل ہیں جو بنی اسرائیل کی تاریخ میں بیان کیے گئے بڑے بڑے واقعات سے حاصل ہوتے ہیں۔

یہی وہ واقعات ہیں جو ایک طرف رسول اللہ ﷺ کی امت اور اس کے لیے عالمی قیادت میں کردار و اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو دوسری طرف انھیں بنی اسرائیل کی کج رویوں سے کنارہ کشی کا حکم بھی دیتے ہیں۔

قرآن کریم میں یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد سے تشکیل پانے والی اس قوم کا تذکرہ اس طرح آیا ہے کہ ان کی کھانے پینے کی تنگی دور کر کے زمین سے چشمے جاری کر دیے گئے، مَنّ و سَلْویٰ ان پر نازل ہوا، بادل کی مدد سے گھنے سایے کا اہتمام ہوا لیکن مقام غور یہ ہے کہ کیا انھوں نے ان نعمتوں کا شکر ادا کیا یا شرعی احکام کے بارے میں ان کا کیا رویہ رہا؟ وہ ہمیشہ حق کی مخالفت، احکامِ الٰہی میں تحریف اور حیلہ سازی اور سرکشی کی روش اختیار کیے رہے۔

انسانیت کی تکمیل خالق ارض و سماء کی طرف سے نازل شدہ وحی کی اتباع سے ہوتی ہے اور اللہ کی رضا کے لیے اعمال انسان کو درجۂ کمال تک پہنچا دیتے ہیں کیونکہ اس طرح اس کا مقصد تخلیق پورا ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول میں کوتاہی اور وحی الٰہی سے دوری اسے اوج کمال تک پہنچنے سے روک کر جانور اور چوپاؤں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے اور بسا اوقات وہ جانوروں کے درجے سے بھی نیچے گر جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنی عقل کو مزید کمینگی اور پستیوں میں دھکیل دیتا ہے جبکہ جانور اس طرح نہیں کر سکتے۔ ان کی فطرت متعین کر دی گئی ہے اور ان کے کام طے شدہ ہیں۔

سورۂ اعراف جو مکی دور میں نازل ہوئی بنی اسرائیل کے واقعات کے حوالے سے بہت سے تربیتی پہلو سامنے لاتی ہے اور ربانی مقاصد اور اللہ کے نافذ العمل قوانین کی نشاندہی کرتی ہے۔[1]

جب قریش نے دیکھا کہ وہ اس برحق دعوت کے سامنے عاجز آ چکے ہیں اور یہ عاجزی نضر بن حارث کی اس بات سے عیاں ہوتی تھی جس نے بآواز بلند کہا تھا: ''اے قریشیو! اللہ کی قسم! تم پر ایک ایسی مصیبت نازل ہوئی ہے کہ تم کبھی اس کا مقابلہ نہ کرسکو گے، لہٰذا تم اپنی فکر کرو۔ اللہ کی قسم! تم پر ایک عظیم آفت اتری ہے۔''

بعد ازاں انھوں نے فیصلہ کیا کہ نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو مدینہ کے یہودی علماء کی طرف بھیجا جائے، اس لیے نہیں کہ وہ اس دعوت کی اتباع کرنے پر آمادہ تھے بلکہ وہ تو صرف اس دعوت کی حقیقت کو جاننا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ یہود ان سے تعاون کریں اور انھیں ایسی باتیں بتائیں جو رسول اللہ ﷺ کو عاجز کر دیں۔ مکہ کے سردار جانتے تھے کہ یہود تمام اہل حق اور انبیاء سے کینہ رکھتے ہیں اور نبی ﷺ کی بعثت یہود کے لیے بڑا صدمہ تھا۔ وہ تو جزیرہ نمائے عرب میں عرصۂ دراز سے اس امید پر رہ رہے تھے کہ یہاں ایک نبی مبعوث ہوگا جو انھیں ان کے درمیان پیدا ہونے والے ہر افتراق اور اختلاف سے نجات دلائے گا اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ نبی زمان و مکان کے لحاظ سے انھی میں سے ہوگا۔[2]

یہود اور اہل کفر وشرک اسلامی دعوت کی مخالفت کی وجہ سے مشترکہ مفادات رکھتے تھے، اس لیے مشرکین مکہ نے اپنا ایک وفد یہود کی طرف بھیجا تاکہ نبی ﷺ کو عاجز کرنے کے لیے کچھ سوالات تیار کیے جاسکیں۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ''قریش نے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی

---

[1] معالم قرآنية في الصراع مع اليهود لمصطفى مسلم، ص:55-60. [2] اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبدالله الشقاري:1/188.

معیط کو مدینہ میں یہودی علماء کی طرف بھیجا اور ان سے کہا: ”آپ ان سے محمد (ﷺ) کے بارے میں سوال کریں اور انھیں محمد (ﷺ) کے اوصاف اور ان کی باتوں سے بھی آگاہ کریں، وہ پرانے اہل کتاب ہیں جو آسمانی علم ان کے پاس ہے وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔“

وہ دونوں مدینہ پہنچے اور یہود کو نبی ﷺ کے اوصاف اور اقوال کی خبر دی اور آپ کے بارے میں رائے دریافت کی تو علمائے یہود نے کہا: ”ہم آپ کو تین باتیں بتاتے ہیں۔ آپ اس (نبی) سے ان کے بارے میں سوال کریں۔ اگر وہ درست خبر دے تو سمجھ لیں کہ وہ سچا نبی ہے۔ وگرنہ وہ خودساختہ نبی ہے۔ اس کے بارے میں جو آپ کے جی میں آئے کر گزریں۔“

① اس سے اس جماعت کے متعلق سوال کرو جو زمانہ قدیم میں کہیں غائب ہوگئے تھے، ان کی حقیقت کیا ہے؟ ان کے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔

② اس سے اس آدمی کے بارے میں سوال کرو جو ساری دنیا میں گھومتا تھا اور اس نے دنیا کے مشرق و مغرب تک رسائی حاصل کی تھی، اس کا قصہ کیا ہے؟

③ اور اس سے روح کی حقیقت کے متعلق سوال کرو کہ وہ کیا ہے؟ اگر وہ تمھیں یہ تمام خبریں بتا دے تو جان لو کہ وہ سچا نبی ہے۔ تم اس کی اتباع کرو ورنہ وہ جعلی نبی ہے، پھر تم اپنی مرضی کے مطابق کوئی فیصلہ کر سکتے ہو۔

نضر اور عقبہ واپس مکہ آئے اور کہا: ”اے قریشیو! ہم تمھارے اور محمد (ﷺ) کے درمیان فیصلہ کن معاملہ لے کر آئے ہیں۔ ہم سے یہودی علماء نے کہا ہے کہ ہم اس سے تین باتوں کا سوال کریں، پھر ساری بات کہہ سنائی۔“

اب وہ تمام لوگ نبی ﷺ کے پاس آئے اور کہا: ”اے محمد! ہمیں ان (تین) باتوں کی تفصیل سے آگاہ کیجیے۔“ نبی ﷺ نے فرمایا: ”میں تمھیں کل ان سوالات کے جواب دوں گا“ اور آپ ﷺ نے ان شاء اللہ نہ کہا۔ یہ سن کر قریشی واپس چلے گئے۔ دوسری طرف نبی ﷺ پندرہ دن تک وحی کا انتظار کرتے رہے، نہ تو جبریل علیہ السلام آئے اور نہ اللہ کی طرف

سے کوئی وحی آپ کے پاس آئی حتی کہ اہل مکہ نے خبریں پھیلانا شروع کر دیں کہ محمد (ﷺ) نے ہمارے ساتھ کل کا وعدہ کیا تھا اور اب پندرہ دن گزر چکے ہیں، اس نے ہمارے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ ادھر نبی ﷺ وحی کی تاخیر پر غمگین تھے۔ آپ ﷺ اہل مکہ کی یہ باتیں سن کر مزید تنگ دل ہو جاتے، پھر جبریل علیہ السلام آئے اور سورۂ کہف کا نزول ہوا جس میں آپ کو قریش کی باتوں پر غمزدہ نہ ہونے کی تلقین کی گئی اور اصحاب کہف اور ذوالقرنین (رَجُل طَوَّاف دنیا میں گھومنے والا) کے بارے میں تفصیلات بتائی گئیں۔ اور روح کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ط قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا○﴾

”اور وہ آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہیے: روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمھیں تو بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔“[1]

جب یہود نے یہ آیت سنی تو کہنے لگے ہمارے پاس تورات ہے اور جسے تورات مل گئی، اسے تو خیر کثیر مل گئی۔ تب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا○﴾

”کہہ دیجیے: اگر میرے رب کی باتوں (کے لکھنے) کے لیے سمندر روشنائی ہو تو یقیناً میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا اور اگرچہ ہم اس کے مثل (اور سمندر) بطور مدد لے آئیں۔“[2]

سورۂ کہف میں مشرکین مکہ کے سوالوں کے جوابات تھے اور اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ غار اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک پناہ گاہ تھی۔ عنقریب اس جماعت کی طرح نبی ﷺ

---

[1] بنيٓ إسرآء يل 85:17. [2] الكهف 109:18.

کے کمزور صحابہ بھی ایک پناہ گاہ کی طرف ہجرت کرنے والے ہیں جو انھیں پناہ دے گی بالکل اسی طرح جس طرح فتنے کے ڈر سے بھاگنے والے چند اہل ایمان کو غار نے پناہ فراہم کی تھی۔ عنقریب یہ لوگ یثرب میں اللہ کے دین کی مددگار قوم کے پاس چلے جائیں گے جو انھی لوگوں کے پاس آباد ہے جنھوں نے قریش سے ہمدردی ظاہر کر کے اسلام کے متعلق ان کے شک کو پختہ کیا، نور حق کو مٹانے کی کوشش کی اور نبوت کی تحقیق و توثیق کے لیے ایک ایسا منصوبہ پیش کیا جو ان کے خیال میں نبی ﷺ کو لاجواب کر دینے والا تھا۔ یہ ایک غلط طریقہ تھا۔ کسی بھی صاحب رسالت و نبوت کی رسالت جانچنے کا یہ کوئی طریقہ نہ تھا، اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام ہی کو دیکھا جائے جو بنی اسرائیل کے سب سے برگزیدہ نبی تھے تو وہ بھی حضرت خضر علیہ السلام اور ان کے مابین پیش آنے والے واقعات کی تاویل سے بے خبر تھے۔ انھوں نے حضرت خضر علیہ السلام پر تنقید کی، حالانکہ انھوں نے کسی قسم کے سوال یا تنقید سے منع کیا ہوا تھا جب تک کہ وہ خود بیان نہ کریں، لہٰذا ان تمام باتوں کے باوجود جب موسیٰ علیہ السلام کی نبوت میں کسی قسم کا شک و شبہ پیدا نہ ہوا تو بنی اسرائیل نے نبی ﷺ کی صداقت کو جاننے کے لیے اس قسم کا رویہ کیوں اپنایا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے ان سوالوں کے جواب میں اہل ایمان کے لیے اشارہ دے دیا کہ وہ عنقریب نوجوان مومنوں کے اس گروہ کی طرح ایک پناہ گاہ حاصل کر لیں گے اور اہل مدینہ خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کریں گے بعینہ جس طرح اصحاب کہف کا شہر والوں نے استقبال کیا تھا، پھر وہ ان کے مقام رہائش پر پہنچے تھے تاکہ ان کی تکریم کریں اور ان کی یاد قائم رکھیں۔[2]

قرآن کریم اس لیے نازل ہوا کہ ایک ایسی بہترین امت تشکیل دے جو لوگوں کی بھلائی کے لیے مامور کی گئی ہو اور اس کے اپنے اصول اور اپنی پہچان ہو۔ مکی دور کی ابتدا

---

[1] الروض الأنف للسهيلي: 52/2، ومباحث في التفسير الموضوعي لمصطفى مسلم، ص: 189. [2] تأمّلات في سورة الكهف لأبي الحسن الندوي، ص: 46، ومعالم قرآنية في الصراع مع اليهود لمصطفى مسلم، ص: 61.

میں نازل ہونے والی سورت سورۂ فاتحہ تھی جس میں مومن کی رجوع الی اللہ کے ساتھ صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کی گئی ہے اور غضب الٰہی کے مستحق یہود اور گمراہ نصاریٰ کے راستے سے بچنے کا درس دیا گیا ہے اور یہی تفسیر عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی ہے کہ ''مغضوب علیھم'' سے مراد یہود اور ''الضالین'' سے مراد نصاریٰ ہیں۔ [1]

سورۂ فاتحہ میں بیان کیے گئے اس منہج کی تعیین اور صراط مستقیم کا بیان دیگر تمام گمراہ راستوں کا علم حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ ان تمام متفرق راستوں سے بچا جا سکے جو ہلاکت و گمراہی کا سبب بنتے ہیں۔

یہودیوں کے عقائد، تحریفات اور پیغمبروں سے ناروا سلوک، یہ سب کچھ ان اسباب اور ذرائع کا متقاضی ہے کہ اسلام کا امتیازی تشخص قائم دائم رہے۔ یہودیوں کے اور ہمارے درمیان معرکہ آج بھی برپا ہے جو درحقیقت اسی منہج اور صراط مستقیم اور ان جاہلی مناہج کے مابین معرکہ ہے جو اللہ کے کلمات کو بدلنے والے اور زمین میں فساد پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ [2]

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 2954، و مسند أحمد: 4/379,378. [2] معالم قرآنية في الصراع مع اليهود لمصطفى مسلم، ص: 79.

باب 4

اقتصادی و معاشرتی بائیکاٹ (شعب ابی طالب)

نبی ﷺ اور اہلِ اسلام کے صبر کے سامنے قریشی مشرکین کا ظلم بڑھتا چلا گیا جبکہ آپ ﷺ اور آپ کے پیروکار مسلسل اللہ کی طرف دعوت دیتے رہے۔ قبائل میں اسلام کے پھیلنے کے باعث قریش کی طرف سے اذیتوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا، یہاں تک کہ مسلمانوں کا مادی وسماجی بائیکاٹ شروع کر دیا گیا جس کا آغاز قریش نے ظلم اور دشمنی کی وجہ سے کیا تھا۔ اس کی زد میں اہل اسلام اور نبی ﷺ کی حمایت کرنے والے قرابتدار بھی آگئے۔ ①

علامہ زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''بعدازاں مشرکین نے اپنی پوری طاقت سے مسلمانوں پر سختیاں کیں یہاں تک کہ ان پر آزمائشوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور ان کی ہمت جواب دینے لگی، مزید برآں قریش نے علی الاعلان نبی ﷺ کے قتل پر اتفاق کر لیا۔ ابو طالب نے جب معاملہ سنگین ہوتا دیکھا تو بنوعبدالمطلب کو یکجا کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو شعب ابی طالب میں لے چلیں اور ان کا دفاع کریں۔ اس بات سے تمام بنوعبدالمطلب نے، خواہ کافر ہوں یا مسلمان، اتفاق کیا۔ بعض نے قبائلی عصبیت اور بعض نے ایمان و یقین سے یہ کام کیا۔ جب قریش نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی قوم ان کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ہے تو انھوں نے طے کیا کہ کوئی ان کے ساتھ میل جول نہ رکھے، نہ ان سے لین دین کرے اور نہ ان کی گھریلو تقریبات میں شرکت کرے جب تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو ان کے حوالے نہ کر دیں تاکہ انھیں قتل کر دیا جائے۔ انھوں نے مکرو

---

① ظاهرة الإرجاء. للدكتور سفر الحوالي: 1/50.

فریب سے کام لیتے ہوئے آپس میں ایک معاہدہ بھی تحریر کیا جس میں مختلف دفعات تھیں کہ وہ بنو ہاشم سے کبھی صلح کریں گے نہ ان کے بارے میں کوئی نرمی برتی جائے گی حتی کہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کے لیے ان کے سپرد کر دیا جائے۔[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ ان سے شادی بیاہ اور خرید و فروخت کے تعلقات قائم نہ کیے جائیں، ان کے پاس خوراک کا کوئی دانہ تک نہ پہنچنے دیا جائے، نہ ان سے صلح کی جائے، نہ ان کے بارے میں نرمی برتی جائے، نہ کوئی ان سے میل جول رکھے اور نہ ان کی مجلس میں بیٹھے۔ نہ کوئی ان سے کلام کرے اور نہ ان کے گھروں میں جائے یہاں تک کہ وہ رسول اللہ کو قتل کرنے کے لیے ان کے سپرد کریں۔ یہ معاہدہ طے کر کے انھوں نے ایک تحریر لکھی اور اعلان عام کے طور پر یہ دستاویز بیت اللہ کے اندر لٹکا دی گئی۔[2]

شِعب ابی طالب میں جب سب لوگ سونے کے لیے جاتے تو جناب ابو طالب رسول اللہ ﷺ کو اپنے بستر کی طرف جانے کا کہتے اور خود قریش کی ہر قسم کی چالبازی اور اچانک حملے کا جائزہ لیتے، پھر جب لوگ سو جاتے تو اپنے کسی بیٹے، بھائی یا چچا زاد کو رسول اللہ ﷺ کے بستر پر لٹا دیتے اور رسول اللہ ﷺ سے کہتے کہ تم اس کے بستر پر لیٹ جاؤ، چنانچہ آپ وہاں آرام فرماتے۔[3]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور بنو ہاشم و بنو مطلب کا بائیکاٹ اتنا سخت ہوتا چلا گیا کہ وہ درختوں کے پتے کھانے پر مجبور ہو گئے حتی کہ ان کی زندگی اتنی تنگ اور مشکل ہو گئی کہ ان میں سے کوئی پیشاب کرنے کے لیے جاتا اور اچانک اپنے پاؤں کے نیچے کھڑ کھڑاہٹ کی آواز سنتا اور دیکھتا کہ وہاں اونٹ کی کھال کا ٹکڑا ہے تو وہ اسے اٹھاتا، پانی سے صاف کرتا، پھر اسے جلاتا

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 2/80-85، و السيرة النبوية لابن كثير: 2/43-72، و الروض الأنف للسهيلي: 2/101-129، والسيرة النبوية لابن هشام: 1/375,376. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 1/350، و زاد المعاد: 2/46، و الكامل في التاريخ: 2/87. [3] فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان: 180.

اور سفوف بنا لیتا اور تھوڑا تھوڑا پھانکتا رہتا، پھر پانی پی لیتا اور تین دن اس پر گزارا کرتا۔[1]

پھر یہ بائیکاٹ اتنا شدید ہو گیا کہ قریش گھاٹی کے باہر بچوں کے بلبلانے کی آوازیں سن سکتے تھے۔

یہ بائیکاٹ تین سال تک جاری رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے چند قریشی سرداروں کو اس ظالمانہ دستاویز کو چاک کرنے پر لگا دیا۔ اس انقلابی سوچ کا روح رواں ہشام بن عمرو الہاشمی تھا۔ وہ زہیر بن ابو امیہ مخزومی کے پاس گیا جس کی ماں عاتِکہ بنت عبدالمطلب تھی۔ ہشام نے کہا: ''اے زہیر! کیا تو اس بات پر خوش ہے کہ تو پیٹ بھر کر کھائے، اچھے کپڑے پہنے، عورتوں سے نکاح کرے اور تیرے ننھیال سے جیسا کہ تو جانتا ہے نہ کوئی چیز خریدی جائے، نہ بیچی جائے، نہ وہ کسی سے نکاح کریں اور نہ ان سے کوئی نکاح کرے؟ بخدا اگر ابو الحکم بن ہشام کے ننھیال کا مسئلہ ہوتا، پھر تو اسے اس بات (بائیکاٹ) کی طرف بلاتا جس کی اس نے تجھے دعوت دی ہے تو وہ کبھی تیری آواز پر لبیک نہ کہتا۔'' زُہیر نے کہا: ''افسوس! میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں تو تنہا ایک آدمی ہوں۔ ہاں، اگر میرے ساتھ کوئی اور آدمی ہوتا تو میں اس دستاویز کو پھاڑنے کے لیے یقیناً اٹھ کھڑا ہوتا۔'' اس نے کہا: ''اچھا تو ایک آدمی اور موجود ہے۔'' پوچھا: ''کون ہے؟'' کہا: ''میں ہوں۔'' اس پر زہیر نے کہا: ''اچھا تو اب تیسرا آدمی تلاش کرو۔''

ہشام مطعم بن عدی کے پاس پہنچا اور کہا: ''اے مطعم! کیا تو اس بات سے متفق ہے کہ بنو عبد مناف کے دو قبیلے ہلاک ہو جائیں اور تو دیکھتا رہے اور قریش کا ہمنوا بنا رہے؟'' اس نے کہا: ''افسوس! میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں؟'' ہشام نے کہا: ''میں نے ایک اور آدمی تلاش کیا ہے۔'' اس نے کہا: ''وہ کون ہے؟'' ہشام نے کہا: ''میں'' اس پر مطعم نے کہا: پھر ہمیں تیسرا آدمی تلاش کرنا چاہیے۔'' ہشام نے کہا: ''یہ کام بھی میں نے کر لیا ہے۔''

---

[1] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 148.

مطعم نے پوچھا: ''وہ کون ہے؟'' ہشام نے کہا: ''وہ زہیر بن ابوامیہ ہے'' پھر اس نے کہا: ''ہمیں چوتھا آدمی تلاش کرنا چاہیے۔'' اب ہشام ابوالبختری بن ہشام کے پاس پہنچا اور اس سے مطعم بن عدی جیسی گفتگو کی۔ اس نے کہا: ''افسوس! کیا اس میں کوئی اور بھی ہماری تائید کرے گا؟'' ہشام نے کہا: ''ہاں زہیر بن ابوامیہ، مطعم بن عدی اور میں'' تب اس نے کہا: ''ہمیں پانچواں آدمی تلاش کرنا ہوگا۔'' اب ہشام اسود بن مطلب بن اسد کے پاس پہنچا اور اس سے اپنی قرابت اور محصورین کے حق میں بات کی۔ اس نے کہا: ''جس چیز کی تم مجھے دعوت دے رہے ہو کیا کوئی اور بھی اس سے متفق ہے؟'' ہشام نے کہا: ''ہاں'' پھر ان تمام افراد کے نام لیے جو ان سے متفق ہو چکے تھے، پھر سب نے رات کے وقت بالائی مکہ میں حَجُون کی چوٹی پر جمع ہو کر فیصلہ کیا کہ اس دستاویز کو چاک کیا جانا چاہیے۔ زہیر نے کہا: ''میں اس کی ابتدا کروں گا اور سب سے پہلے اس سلسلے میں بات کروں گا۔''

پھر جب صبح ہوئی اور سب اپنی اپنی محفلوں میں جا پہنچے تو زہیر بن ابوامیہ ایک حلہ زیب تن کیے وہاں آیا۔ پہلے اس نے بیت اللہ کے سات چکر لگائے، پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: ''کیا ہم تو کھانا کھائیں، کپڑے پہنیں اور بنوہاشم تباہ و برباد ہو جائیں، وہ کسی سے خرید و فروخت نہ کریں؟ واللہ! میں اس وقت تک چین سے نہ بیٹھوں گا جب تک کہ یہ ظالمانہ بائیکاٹ والی دستاویز چاک نہ کر دی جائے۔'' یہ بات سن کر ابوجہل جو مسجد کے ایک کونے میں بیٹھا تھا، بول اٹھا: ''تو جھوٹ کہتا ہے، اللہ کی قسم! یہ دستاویز چاک نہیں ہوگی۔'' اس پر زَمْعَہ بن اسود نے کہا: ''واللہ! تو سب سے بڑا جھوٹا شخص ہے۔ ہم تو اس کے لکھے جانے کے وقت بھی راضی نہ تھے۔'' ابوالبختری نے کہا: ''زمعہ درست کہتا ہے۔ ہم اس دستاویز کے مندرجات سے راضی نہیں ہیں اور نہ اس کا اقرار کرتے ہیں۔'' مطعم بن عدی نے کہا: ''تم دونوں سچ کہتے ہو۔ جو اس سے ہٹ کر بات کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے۔ ہم اس دستاویز اور جو اس میں لکھا ہے اللہ کے حضور براءت کا اعلان کرتے ہیں۔''

ہشام بن عمرو نے بھی اس جیسی بات کہی تو ابوجہل بولا: ’’یہ تو رات کی گھڑیوں میں طے کیا گیا پروگرام لگتا ہے جو کسی اور جگہ طے کیا گیا ہے۔‘‘

اس وقت ابو طالب بھی مسجد کے ایک کونے میں خاموشی سے بیٹھے تھے۔ مطعم بن عدی دستاویز کو چاک کرنے کی غرض سے آگے بڑھا۔ دیکھا کہ اس کو دیمک نے کھا لیا ہے اور وہاں صرف باسمك اللّٰهم۔ (اے اللہ! تیرے نام سے) کے سوا کوئی لفظ باقی نہیں۔[1]

ابن ہشام کہتے ہیں کہ بعض اہل علم بیان کرتے ہیں: ’’رسول اللہ ﷺ نے ابو طالب سے کہا: ’’چچا جان! اللہ تعالیٰ نے قریش کی دستاویز پر دیمک مسلط کر دی ہے۔ اس نے اس دستاویز میں اللہ کے نام کے سوا تمام الفاظ جو ظلم، بائیکاٹ اور بہتان طرازی پر مبنی تھے، کو چاٹ لیا ہے۔‘‘ ابو طالب نے پوچھا: ’’کیا تمھارے رب نے تمھیں یہ خبر دی ہے؟‘‘ رسول اللہ نے فرمایا: ’’ہاں۔‘‘ تب ابو طالب نے کہا: ’’واللہ! کوئی تمھارا بال بیکا نہیں کر سکے گا‘‘ پھر جا کر اپنی قوم کو اس سے آگاہ کیا اور کہا: ’’اے گروہ قریش! میرے بھتیجے نے مجھے یہ بتایا ہے، سو تم اپنی دستاویز لاؤ۔ اگر وہ اسی طرح ہے جس طرح میرے بھتیجے نے بتایا ہے تو تم ہمارا بائیکاٹ ختم کر دو اور اس دستاویز میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے دستبردار ہو جاؤ اور اگر میرے بھتیجے نے خلاف حقیقت بات کہی ہے تو میں اسے تمھارے حوالے کر دوں گا۔‘‘ سب اس بات سے متفق ہو گئے، پھر جب انھوں نے اس دستاویز کو دیکھا تو ویسا ہی نکلا جیسے نبی ﷺ نے بیان فرمایا تھا۔ اس پر بھی ان کے شر میں اضافہ ہی ہوا، پھر قریش کی اس دستاویز کی منسوخی میں جس نے جو کرنا تھا وہ کر گزرا۔[2]

دروس و نصیحتیں

① اس عہد و پیمان پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ قریش نے اس عہد نامہ کی دفعات کو اتنا

---

[1] السیرۃ النبویۃ لابن کثیر:2/43-50 و67-69. [2] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام:1/377.

مضبوط بنایا تھا کہ کوئی ایسا رخنہ نہ چھوڑا تھا جس سے مقاطعے کی خلاف ورزی ممکن ہو۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عہد نامہ وسیع پیمانے پر باہمی مشوروں اور افہام و تفہیم سے طے کیا گیا تھا اور اسے طے کرنے میں انتہائی سمجھ دار اور سرد و گرم چشیدہ افراد نے شرکت کی تھی۔

② اس دستاویز میں بنو عبدالمطلب سے شادی بیاہ کے تعلقات استوار کرنا ممنوع قرار دیا گیا تھا، لہٰذا یہ ایک سماجی بائیکاٹ تھا کیونکہ شادی بیاہ کی وجہ سے آپس میں نرمی، الفت، رحم، صلہ رحمی اور ایک دوسرے سے میل ملاپ ایک قدرتی امر تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ بائیکاٹ ناکام ہو کر رہ جاتا، اسی لیے اس دستاویز میں شادی بیاہ نہ کرنے کی شق پر اتفاق کیا گیا تھا۔

③ خرید و فروخت پر پابندی مؤثر اقتصادی بائیکاٹ کے لیے لگائی گئی تھی۔ قریش نے اس دفعہ کے تحت مسلمانوں کو بھوکا رکھنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب بھی رہے۔ روایات میں ہے کہ ان کی ہمت تقریباً جواب دے گئی اور وہ درختوں کے پتے اور جانوروں کے چمڑے کھانے پر مجبور ہو گئے۔[1]

④ اقتصادی بائیکاٹ مزید موثر بنانے کے لیے انھوں نے دستاویز کی دفعات میں یہ اضافہ بھی کیا تھا کہ وہ بیرونی قافلوں سے مہنگے داموں غلہ خرید لیں گے تاکہ صحابۂ کرام ان سے کچھ بھی نہ خرید سکیں۔ یوں بیرونِ مکہ سے آنے والے تاجروں کے ساتھ لین دین کا راستہ بھی مسلمانوں کے لیے بند کر دیا گیا تھا، چنانچہ صحابہ واپس گھاٹی میں اس حالت میں پہنچتے کہ ان کے ہاتھ خالی ہوتے، ان کے بچے بھوک پیاس سے بلک رہے ہوتے اور بچوں کے رونے کی آواز دور تک سنائی دیتی تھی۔[2]

اور یہ تنگی اس شق کی وجہ سے پیدا ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ ”وہ کھانے پینے کی کوئی شے ان محصورین تک نہ پہنچنے دیں گے۔“ اگر کوئی شخص یہ کہہ کر محصورین تک غلہ پہنچانا

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 377/1، و الرحيق المختوم، ص: 129. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 377/1، و السيرة النبوية لأبي الحسن الندوي، ص: 120.

چاہتا کہ وہ ان کے ساتھ خرید و فروخت نہیں کر رہا بلکہ انھیں ہدیہ دے رہا ہے تو بھی مذکورہ شق کی بنا پر ممکن نہ تھا۔ قریش نے پوری پوری کوشش کی تھی کہ کسی بھی نام سے کھانے پینے کی کوئی چیز ان تک پہنچنے نہ پائے، اسی لیے انھوں نے اس شق کا اضافہ کیا تھا۔[1]

⑤ اس کے بعد والی شق جس میں کہا گیا تھا کہ "کوئی بھی ان محصورین سے صلح نہ کرے گا۔" نبی ﷺ کو قریش کے سپرد کرنے کے سوا ہر اختیار کو باطل قرار دیتی تھی۔ اب کوئی بھی درمیانی راستہ نہیں نکال سکتا تھا۔

اور وہ شق جس میں کہا گیا تھا کہ کوئی بھی ان کے بارے میں اپنے دل میں نرمی نہ رکھے گا، اس کا مقصد یہ تھا کہ اس عہد نامے سے متفق ہونے والے کے دل میں اہل ایمان کے بارے میں کوئی نرمی اور الفت پیدا نہ ہو کیونکہ دلوں کی نرمی بائیکاٹ ختم ہونے کا سبب ہوسکتی تھی اور یوں قریش کی ساری کوشش پر پانی پھر جاتا لیکن قریش ایسا ہرگز نہ چاہتے تھے، لہٰذا اس احساس کو دبانے اور ختم کرنے کے لیے خصوصاً اس دفعہ کو دستاویزِ مقاطعہ کا حصہ بنایا گیا۔

⑥ محصورین کے ساتھ کلام کرنے، ان سے میل جول رکھنے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے اس لیے منع کر دیا گیا تھا کہ باہمی میل جول، کلام اور نشست و برخاست سے ہوسکتا تھا کہ مسلمان اس عہد و پیمان میں شامل بعض افراد کو ان کی غلطی کا احساس دلانے میں کامیاب ہوجاتے کیونکہ مسلمانوں کے پاس حق اور ایسے دلائل موجود تھے جن سے وہ کسی کو بھی اپنی بے گناہی کا احساس دلا سکتے تھے تو ایسے حالات کو پیدا ہونے سے روکنے کے لیے ان سے میل جول، کلام اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔

⑦ بائیکاٹ کی دستاویز میں یہ شق کہ کوئی محصورین کے گھروں میں داخل نہ ہوگا، سابقہ دفعات کی طرح مؤثر نتائج کی حامل تھی کیونکہ ان کے گھروں میں داخل ہونے سے دلوں

---

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 96.

میں انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوسکتا تھا۔ جب کوئی آدمی کسی ایسے گھر میں داخل ہوتا جہاں زندگی کی بنیادی ضروریات بھی میسر نہ ہوں اور گھر والے بھوک اور بیماریوں کا شکار ہوں اور ان کا گناہ صرف یہ ہو کہ انھوں نے قریش کا دین چھوڑ کر کوئی اور دین اختیار کر لیا ہے تو بلاشبہ اس کے دل میں انسانی احساسات بیدار ہوجاتے اور وہ اس شقاوت اور ظلم کو ختم کرنے کے درپے ہوجاتا، اس قسم کی صورت حال سے بچنے کے لیے قریش نے محصورین کے گھروں میں داخل ہونے سے منع کر دیا تھا۔

⑧ دستاویز کو بیت اللہ میں لٹکانے کا مطلب اسے انتہائی مقدس خیال کرنا اور اس کی تمام دفعات کو اتنا عزت و احترام بخشنا تھا تا کہ ان پر عمل کرنا لازمی ہو اور سب اس کے پابند رہیں۔ تمام اہل عرب کعبے کی حد درجہ تعظیم کرتے تھے اور اسے حرمت و تقدس کا اعلیٰ مقام دیتے تھے، اس لیے قریش نے یہ ظالمانہ دستاویز بیت اللہ کے اندر لٹکا دی تھی۔[1]

⑨ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے مشرکین نے نبی ﷺ کے ساتھ مکمل یکجہتی کا اظہار کیا اور جاہلی رواج کے تحت آپ کی مکمل حفاظت کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کفر کے ان قوانین سے مستفید ہوسکتا ہے جن سے اسلامی دعوت کو فائدہ ہوتا ہو بشرطیکہ اہل رائے کا صحیح فتویٰ موجود ہو۔[2]

⑩ آج کل کے جدید انسانی قوانین و حقوق مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں اور اکثر علاقوں میں مذہبی آزادی کے انھی قوانین و حقوق کا نتیجہ ہے کہ دنیا بھر میں اہل اسلام کو دعوتی میدان میں بہت سے مواقع میسر ہیں، لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ باریک بینی سے تقابلی جائزہ لیں اور ایسے مواقع سے مستفید ہونے کی کوشش کریں۔[3]

⑪ ایک اہم بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قریبی رشتے دار آپ کی حمایت و حفاظت

---

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص:97,96. [2] الأساس في السنة لسعيد حوّى:264/1 . [3] الأساس في السنة لسعيد حوّى:264/1.

اس لیے نہیں کررہے تھے کہ آپ رسول اللہ تھے بلکہ وہ آپ کی شخصی اور نسبی بنیاد پر حمایت کررہے تھے۔ چنانچہ اگر کوئی حاکم و مقتدا مسلمانوں کی اس حمایت کو جہاد اور کافروں پر غلبے کے ایک وسیلے کے طور پر حاصل کرسکتا ہو جس کا مقصد کفار کی تدابیر اور ان کی دشمنی کا سدباب کرنا ہو تو یہ قابل صد شکریہ عمل ہے۔[1]

⑫ ابو طالب اس باغیانہ اور ظالمانہ معاہدے کا مقابلہ صرف سیاسی طریقے اور اس عہد نامہ کو چاک کرنے کی کوشش کی صورت میں کرسکے۔ انھوں نے اپنے لکھے ہوئے مشہور قصیدے لامیہ کی ابتدا میں کہا:

وَ لَمَّا رَأَيْتُ الْقَوْمَ لَا وُدَّ عِنْدَهُمْ　　　وَ قَدْ قَطَعُوا كُلَّ الْعُرَا وَالْوَسَائِلِ
وَ قَدْ حَالَفُوا قَوْمًا عَلَيْنَا أَظِنَّةً　　　يَعَضُّونَ غَيْظًا خَلْفَنَا بِالْأَنَامِلِ

> ”جب میں نے قوم کو دیکھا کہ ان میں محبت نہیں رہی اور انھوں نے تمام تعلقات اور رشتوں کو توڑ دیا ہے۔ انھوں نے ہمارے خلاف تہمت زدہ لوگوں سے معاہدے کیے جو ہماری پیٹھ پیچھے غصے سے انگلیاں چباتے ہیں۔“[2]

اس قصیدے کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ مکہ کی فضا میں ہلچل مچ گئی اور اس قصیدے نے بنو ہاشم کے قرابتداروں میں چھپی عصبیت کو جگا دیا۔ انھوں نے خفیہ طور پر مشورہ کیا اور عہد نامہ چاک کرنے کا فیصلہ کرلیا۔[3]

⑬ ابو طالب اپنے ضخیم قصائد کی وجہ سے قریشی معاشرے کی سوچ اور فکر کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگئے جس نے ان کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا اور اس ظالمانہ عہد نامے کو چاک کرنے کے لیے مذکورہ بالا پانچ افراد اٹھ کھڑے ہوئے جو بنو ہاشم اور بنو مطلب سے رشتے داری اور صلہ رحمی کا لحاظ کرتے ہوئے مسلمانوں اور ان کے حلیفوں اور مددگاروں پر

---

[1] فقه السيرة للبوطي، ص: 88. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 245/1. [3] التحالف السياسي للدكتور الغضبان، ص: 35-37.

ڈھائے جانے والے ظلم وستم کو ختم کرانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جاہلی معاشرے کے علمبرداروں کے دلوں میں بھی ظلم و سرکشی کے خلاف نفرت موجزن تھی اور وہ ہر قسم کے ظلم کو ختم کرنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔

اہل اسلام کو ان تمام باتوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور مسئلے کی تہ تک پہنچنا چاہیے۔ یہ باتیں قرآن کریم اور سنت رسول کی حقیقت کو واضح کرنے میں معاون ثابت ہوں گی اور بتائیں گی کہ مسلمانوں، یہود و نصاریٰ اور لادینیت کے علمبرداروں کے درمیان وجہ اختلاف کیا ہے اور ان لوگوں سے اسلام کے مفاد میں کہاں تک مدد لی جاسکتی ہے۔[1]

⑭ ابولہب کا کردار انتہائی قابل توجہ اور سمجھنے کے لائق ہے۔ تاریخ اسلامی میں یہ کردار بار بار سامنے آیا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعیوں کو ان کے قریبی حلیفوں سے سخت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے اور وہ اپنی طرف داری بدل لیتے ہیں اور ان داعیان اسلام کے خلاف اتنے سرگرم نظر آتے ہیں کہ ان کا سخت ترین جھگڑالو دشمن بھی اتنا متشدد نہیں ہوتا۔[2]

⑮ نبی ﷺ کی مسلمانوں کو یہ ہدایات تھیں کہ وہ دشمن سے ٹکر نہ لیں اور اپنے جذبات قابو میں رکھیں۔ وہ کسی قسم کی جنگ بھڑکانے سے گریز کریں اور خود کسی جنگ کا ایندھن بننے سے اجتناب کریں۔

اس مرحلے میں نبی ﷺ کی تربیت کا عظیم الشان پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ اس دنیا کے عظیم بہادروں حمزہ، عمر، ابوبکر اور عثمان رضی اللہ عنہم وغیرہ نے بغیر کسی ٹکراؤ کے اعلیٰ صبر کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے سمع وطاعت کو اپنا شعار بنائے رکھا، ہر قسم کی اذیت، دشمنی اور ظلم کو برداشت کیا اور اپنے ہاتھ روک کر رکھے۔ انھوں نے صبر کا مظاہرہ کسی ایک حادثے یا ایک دن پر نہیں کیا بلکہ انھوں نے تو خشک سالی والے تین سال صبر کا مظاہرہ کیا جس میں ان

---

[1] فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 185.

[2] فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 186.

کے اعصاب تک شل ہو گئے اور انھیں ایک بھی تیر پھینکنے یا کسی ایک شخص کا سر پھوڑنے کی بھی اجازت نہ ملی۔[1]

⑯ ان واقعات نے اہل ایمان کو اپنے قائد کے احکامات کی پابندی کرنے اور کسی بھی قسم کی جذباتی کارروائی نہ کرنے کی راہ دکھائی اور وہ اس پر کاربند رہے۔ وہاں ابوجہل پر حملہ کرنا یا سوچے سمجھے بغیر کوئی بھی غیر متوازن جنگ شروع کرنا بہت آسان تھا۔ ایسی جنگ کب تک جاری رہتی، یہ اللہ ہی جانتا تھا۔

⑰ اسلامی دعوت ان دنوں حبشہ، نجران، اَزْدِ شَنُوءَہ، یمن اور غفار میں ایک واضح اور درست سمت میں کامیابی سے ہمکنار ہو رہی تھی جو زمانہ مستقبل میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے سہارا بن سکتی تھی۔ ایسے قوی مراکز بھی قائم ہو رہے تھے جو فیصلہ کن مراحل کے وقت متحرک ہو سکتے تھے اور یہ کامیابی اسلامی دعوت کے مکہ جیسی سنگلاخ زمین اور اس کے اڑیل لوگوں سے تجاوز کر کے دیگر علاقوں میں پھیلنے کا سبب بن سکتی تھی۔

⑱ بائیکاٹ کے تین سال اسلام کے اس ہراول دستے کے لیے تربیت اور کردار سازی کے میدان میں عظیم توشہ ثابت ہوئے۔ ان میں بھوک، خوف، آزمائش میں صبر کرنے، اعصاب کو قابو میں رکھنے، اپنے دلوں اور خواہشات کو دبانے اور اپنے جذبات کو کنٹرول کرنے جیسے اوصاف راسخ ہو گئے۔

⑲ مشرکین کی صفوں میں بعض لوگ اپنے اندر نبوی تربیت اور آپ کی شخصیت کی عظمت کا اثر محسوس کر رہے تھے اور اس نئے دین کے پیش کردہ اصولوں کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرتے تھے لیکن متکبر سرداروں کی وجہ سے وہ اس کا اظہار نہ کر سکتے تھے۔ ان کا دعوت سے یہ لگاؤ، تربیت کا اثر اور پھر اس مقاطعے کا اختتام ہمیں انھی حالات و کیفیات کی خبر دیتے ہیں۔[2]

⑳ مضبوط اور قطعی دلائل اور خرق عادت معجزات بھی اپنی خواہشات پر چلنے والوں اور دنیاوی

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان:1/371. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان:1/384,385.

منافع کے پجاریوں پر اثر انداز نہیں ہوتے کیونکہ ایسے لوگ حق کے معاملے میں اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتے، عقل اور دل سے غور وفکر نہیں کرتے، کانوں کو حق سننے سے بند کر لیتے ہیں اور آنکھوں کو حق دیکھنے سے محروم رکھتے ہیں۔ وہ فکر و تدبر سے کام نہیں لیتے اور راہ حق سے دور رہتے ہیں، حالانکہ اس پر بہت سے دلائل قائم ہو چکے ہوتے ہیں۔

ابو طالب نے نبی ﷺ سے سنی ہوئی خبر قریشیوں کو بتائی کہ عہد نامے کو دیمک چاٹ چکی ہے اور صرف اللہ کا نام بایں الفاظ: باسمك اللّٰهم باقی رہ گیا ہے۔ انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ بھی لیا لیکن پھر بھی کوئی ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ یہی تو وہ خواہشات ہیں جو لوگوں کو حق سے دور رکھتی اور ان کے کانوں کو حق سننے سے روک دیتی ہیں۔[1]

㉑ اس اقتصادی اور معاشرتی بائیکاٹ نے اسلامی دعوت کے فروغ اور تمام قبائل عرب میں اس دعوت کا پیغام پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ حج کے موسم میں تمام عرب قبائل میں یہ خبریں عام ہوگئیں اور جزیرہ نمائے عرب کی نظریں اس دعوت پر مرتکز ہوگئیں جس کے لیے داعی اعظم ﷺ اور آپ کے صحابہ بھوک، پیاس اور بائیکاٹ جیسے ظلم برداشت کر رہے تھے اور ان خبروں نے سب کے دلوں میں یہ بات بٹھا دی کہ یہ دعوت برحق ہوگی کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو نبی ﷺ اور آپ کے پیروکار کبھی اتنی کٹھن مشکلات اور مصائب برداشت نہ کر پاتے۔

㉒ اس بائیکاٹ نے کفار مکہ کے خلاف سارے عرب کو غصہ دلایا کہ وہ بنو ہاشم اور بنو مطلب پر اس قدر ظلم کر رہے ہیں اور دوسری طرف نبی ﷺ اور آپ کے رفقاء کے حق میں نرم گوشہ پیدا کر دیا، چنانچہ جیسے ہی یہ بائیکاٹ ختم ہوا لوگ اسلام کی طرف متوجہ ہوئے اور اسلامی دعوت کا پھیلاؤ تیز ہوگیا اور اس کی گونج پورے جزیرہ نمائے عرب میں سنائی دینے لگی۔ اس طرح بائیکاٹ کرنے والوں کی چال انھی پر الٹ گئی اور مشرکین کے ارادوں کے

---

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 167.

برخلاف یہ بائیکاٹ دعوت اسلامی کے پھیلنے کا بہت بڑا سبب بن گیا۔[1]

㉓ بنو ہاشم اور بنو مطلب کا نبی ﷺ کا ساتھ دینے اور اقتصادی اور معاشرتی بائیکاٹ میں ان کے ساتھ اذیتیں برداشت کرنے کی وجہ سے ان کے بارے میں اسلام کا یہ قانون بنا کہ خمس میں سے جو ذوی القربیٰ (قرابتداروں) کا حصہ ہوگا وہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کو دیا جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى
عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾

”اور (اے مسلمانو!) جان لو کہ تم جو کچھ بھی مال غنیمت حاصل کرو، اس میں سے پانچواں حصہ یقیناً اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور (اس کے) رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن اتارا جس دن دو فوجوں میں ٹکراؤ ہوا تھا اور اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے۔“[2]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”آیت میں مذکور قرابتداروں کا حصہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کو ملے گا کیونکہ بنو مطلب نے جاہلیت اور ابتدائے اسلام دونوں ادوار میں بنو ہاشم سے تعاون کیا اور نبی ﷺ کی خاطر شعب ابی طالب میں محصور ہوئے۔ ان کے مسلمان تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے جذبے سے معمور تھے اور ان کے کافر خاندانی عصبیت کی بنا پر محصور ہوئے جو صرف آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے حکم کے مطابق چل رہے تھے اور بنو عبد شمس اور بنو نوفل اگرچہ وہ بھی ان کے چچا زاد تھے لیکن انھوں نے ان کا ساتھ نہ دیا، وہ ان سے الگ ہو گئے اور کفارِ قریش کی ہمنوائی کر کے نبی ﷺ اور آپ کے تمام

---

[1] الحرب النفسية ضد الإسلام للدكتور عبد الوهاب كحيل، ص:101. [2] الأنفال 8:41.

معاونین سے دشمنی مول لی، اس لیے ابو طالب نے اپنے قصیدہ لامیہ میں قرابتداری کی وجہ سے ان کے اس اقدام کی سخت مذمت کی۔

نبی ﷺ نے بنو مطلب کے بارے میں ارشاد فرمایا:

«أَنَا وَ بَنُو الْمُطَّلِبِ لَا نَفْتَرِقُ فِي جَاهِلِيَّةٍ وَّلَا إِسْلَامٍ، وَ إِنَّمَا نَحْنُ وَ هُمْ شَيْئٌ وَّاحِدٌ»

”میں اور بنو مطلب نہ تو جاہلیت میں علیحدہ ہوئے اور نہ اسلام میں۔ ہم اور وہ ایک ہی ہیں۔“ [1]

اور جمہور علماء کے قول کے مطابق اس (خمس کے حقداروں) سے مراد بنو ہاشم اور بنومطلب ہیں۔ [2]

㉔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی مدد فرمائی، اپنے رسول کو عزت عطا فرمائی، مکہ فتح ہو گیا اور نبی ﷺ حجۃ الوداع ادا فرما رہے تھے تو آپ چاہتے تھے کہ وادی بنی کنانہ میں قیام کیا جائے تاکہ اس دور کے ظلم اور تنگیوں کا ذکر کریں اور اللہ کی طرف سے عطا کردہ عظیم احسانات فتح مکہ اور اس مکہ میں داخل ہونے پر اللہ کا شکر ادا کریں جہاں سے آپ کو نکال دیا گیا تھا۔ اور یہ بات ثابت کر دیں کہ اللہ تعالیٰ حق کی ضرور مدد فرماتا ہے، اسے غلبے سے نوازتا ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کو اس کائنات میں عظیم درجات و مراتب عطا فرماتا ہے۔ [3]

حج کے دوران اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: ”اے اللہ کے رسول! آپ کل کہاں قیام فرمائیں گے؟ نبی ﷺ نے فرمایا:

«وَ هَلْ تَرَكَ لَنَا عَقِيلٌ مَّنْزِلًا؟ ثُمَّ قَالَ: نَحْنُ نَازِلُونَ غَدًا بِخَيْفِ بَنِي

---

[1] سنن أبي داود، حديث 2980، و مسند أحمد: 4/81. [2] تفسير ابن كثير 2/312.

[3] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 149.

كِنَانَةَ الْمُحَصَّبِ حَيْثُ قَاسَمَتْ قُرَيْشٌ عَلَى الْكُفْرِ»

"کیا عقیل نے ہمارے لیے کوئی جگہ چھوڑی ہے؟" پھر فرمایا: "ہم کل بنو کنانہ کی اس وادی میں قیام کریں گے جسے محصب کہا جاتا ہے اور جہاں قریش نے کفر پر باہم قسمیں کھائی تھیں۔"

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بنو کنانہ نے بنو ہاشم کے خلاف قریش سے معاہدہ کیا تھا کہ وہ بھی بنو ہاشم سے نہ خرید و فروخت کریں گے نہ انھیں جگہ دیں گے اور "خَیف" سے مراد وادی ہے۔"[1]

㉕ قانون الٰہی کے نفاذ کے سلسلے میں کسی بھی موڑ پر اور کسی بھی وقت اہل باطل کی طرف سے بائیکاٹ اور مقاطعے کا اندیشہ ہوسکتا ہے کیونکہ کفر ایک ہی ملت ہے، لہٰذا قائدین امت اسلامیہ کو اس قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ جونہی ایسے حالات پیدا ہوں تو وہ اسوۂ رسول کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب اقدامات کریں تاکہ کسی بھی قسم کے بائیکاٹ کے سامنے امت اسلامیہ ایک مضبوط چٹان بن جائے۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 1590و3058، وفتح الباري: 571/3، حديث: 1590. [2] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 98.

حصہ 6

ہجرت حبشہ، سفرِ طائف اور معراج

باب : 1 آنحضرت ﷺ کا قانون ''اختیارِ ذرائع'' پر عمل

باب : 2 ہجرت حبشہ

باب : 3 عام الحزن اور سفرِ طائف

باب : 4 اسراء و معراج

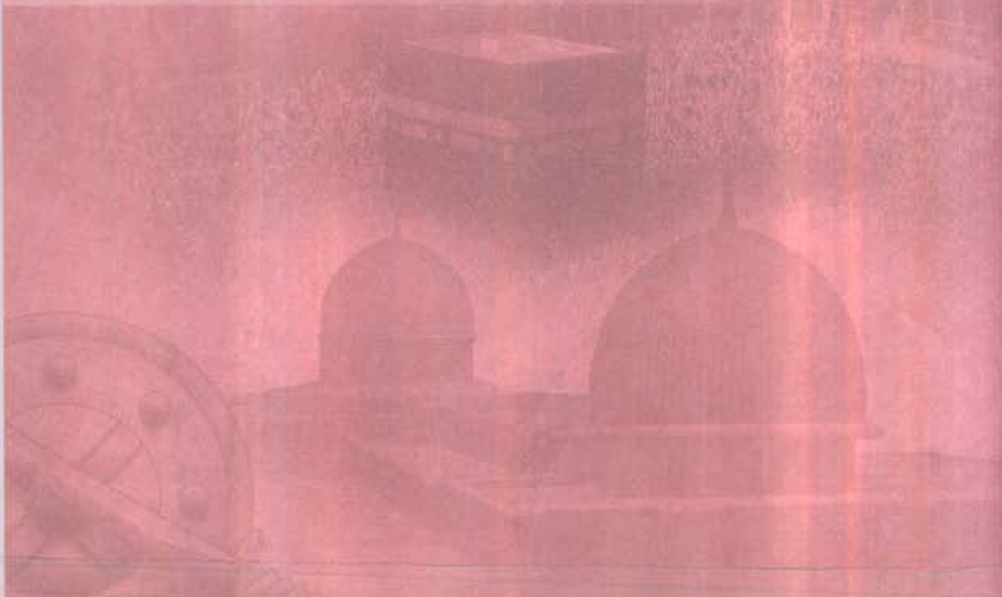

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا
لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ
اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

”اور جن لوگوں نے ظلم وستم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، البتہ ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش! وہ علم رکھتے۔“

(النحل 41:16)

* * *

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا
مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا

”پاک ہے وہ اللہ جو اپنے بندے کو رات کے کچھ حصے میں
مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔“

(بنی اسرآئیل 1:17)

باب 1

آنحضرت ﷺ کا قانون ''اختیارِ ذرائع'' پر عمل

اسباب و ذرائع اختیار کرنے کا قانون اللہ تعالیٰ کے ان قوانین میں سے ہے جنھیں رسول اللہ ﷺ نے بھی اختیار کیا۔ اسباب، سبب کی جمع ہے جو ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جس کے ذریعے کسی منزل مقصود تک پہنچا جاسکے اور یہ قانون اللہ تعالیٰ کی اس عظیم کائنات میں واضح طور پر نافذ نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا فرمایا، پھر اس میں ایسے قوانین اور ضابطے بنائے جو اس کے قائم دائم رہنے کی ضمانت ہیں۔ اس نے اپنے ارادے نافذ العمل ہونے کے بعد نتائج کا تعلق اسباب سے قائم کر دیا، جیسے عرش الٰہی کو فرشتوں کا اٹھانا، زمین کی حرکت روکنے کے لیے اس میں پہاڑوں کو گاڑنا اور پانی کی مدد سے کھیتی اگانا وغیرہ۔

اور اگر اللہ چاہتا کہ دنیا کی تمام اشیاء کسی سبب یا ذریعے کے بغیر صرف اس کی قدرت کاملہ سے قائم رہتیں تو ایسا بھی ممکن تھا لیکن اس کی حکمت عالیہ کا تقاضا یہ تھا کہ اپنی مخلوق کو ذرائع اختیار کرنے کا قانون عطا فرمائے تاکہ زندگی اللہ کریم کے ارادے اور طریقے کے مطابق چلتی رہے۔ ہمیں اس کائنات میں ذرائع اختیار کرنے کا قانون واضح طور پر کارفرما نظر آتا ہے۔ کتاب اللہ میں بھی اس کے شواہد ملتے ہیں۔ اللہ عزوجل نے ہمیں اس قانون کو اپنے تمام دنیوی اور اخروی معاملات میں اختیار کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ﴾

''اور (اے نبی!) کہہ دیجیے: تم عمل کرو، پھر اللہ تمھارے عمل کو عنقریب دیکھے گا اور اس کا رسول اور مومنین بھی۔''[1]

قرآن کریم کے حوالے ہی سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ جب حضرت مریم علیہا السلام انتہائی کمزوری کی حالت میں تھیں تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اسباب اختیار کرنے کا حکم فرمایا:

﴿وَهُزِّيٓ إِلَيْكِ بِجِذْعِ ٱلنَّخْلَةِ تُسَٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا۝﴾

''اور تو کھجور کا تنا اپنی طرف ہلا، وہ تجھ پر تازہ پکی ہوئی کھجوریں گرائے گا۔''[2]

گویا کہ اللہ ہمیں تمام معاملات و حالات میں اسباب و ذرائع اختیار کرنے کی تاکید فرماتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قانون ''اختیارِ ذرائع'' کی مکمل پاسداری کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی مملکت کے قیام کے لیے اٹکل پچو اور اندازوں سے کام لینے کے بجائے تمام ممکنہ اسباب و ذرائع اختیار کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اسباب و ذرائع اختیار کرنے کی تلقین کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ وہ اپنے دنیوی اور اخروی امور میں اس قانون ربانی پر چلیں۔[3]

امت اسلامیہ کے ابتدائی دور میں، جو کہ اس امت کا سنہری دور تھا، یقین کیا جاتا تھا کہ ہمارا ایمان اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور قدرت کاملہ کی بدولت عطا ہوا ہے جو کہ ظاہری اسباب و وسائل اختیار کرنے کے منافی نہیں اور وہ یقین رکھتے تھے کہ اس کائنات اور انسانی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے ایسے قوانین نافذ العمل ہیں جو تبدیل نہیں ہو سکتے اور اس کے ساتھ ساتھ بعض قوانین مقتضائے عادت کے خلاف بھی پائے جاتے ہیں جن کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکمت سے نظام کائنات کے لیے عمومی طور پر اسباب و ذرائع کا قانون مقرر کیا اور مقتضائے عادت کے خلاف قانون کو استثنائی صورت قرار دیا۔ اور حقیقت میں دونوں کا تعلق یہ

---

[1] التوبة 105:9. [2] مريم 25:19. [3] التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد حمد يوسف، ص: 248-250.

مشیّت الٰہی سے ہے، اس لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سمجھتے تھے کہ قانون اختیارِ ذرائع اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے، لہٰذا جب وہ اپنی زندگی میں کسی خاص مقصد کو حاصل کرنا چاہتے تو اس کے مطابق ذرائع اور وسائل اختیار کرتے۔[1]

اگر دیکھا جائے کہ مسلمانوں سے عالمی شرف اور قیادت کیوں چھن گئی تو معلوم ہوگا کہ ان پر کوئی ظلم نہیں کیا گیا بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک طرف تو انھوں نے شریعت کو بھلا دیا، اس کا مرتبہ کم کر دیا اور اس میں اپنی ادنیٰ خواہشات کی کثافتیں شامل کر لیں اور یوں ان کے علم و عمل اوہام کی نذر ہو گئے۔ دوسری طرف انھوں نے قوانین الٰہیہ سے پہلو تہی اختیار کرتے ہوئے یہ یقین کر لیا کہ شاید اسباب و ذرائع اختیار کیے بغیر صرف آرزوؤں اور پراگندہ خوابوں ہی کی مدد سے شرف و عزت حاصل کی جا سکتی ہے، حالانکہ ایسا ناممکن ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۝﴾

''یہ تمھارے ہاتھوں کی کمائی کا بدلہ ہے اور بے شک اللہ اپنے بندوں پر ہرگز ظلم کرنے والا نہیں۔''[2]

اور اگر کوئی سوال کرے کہ اہل ایمان تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے عتاب کے مستحق ٹھہرے لیکن وہ کفار جنھوں نے اللہ تعالیٰ کا یکسر انکار کر دیا، اس کے باوجود انھیں جاہ و حشمت اور قیادت کیونکر حاصل ہوئی تو جواب یہ ہوگا کہ انھوں نے یہ مقام اس لیے حاصل نہیں کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے یا وہ کسی جادو اور غیر عادی امور کے توسط سے یا کوئی انوکھی مخلوق ہونے کی وجہ سے اس مرتبے پر فائز ہوئے ہیں۔ انھوں نے جو صنعتی ترقی کی ہے اور سمندروں اور ہواؤں کو مُسخّر کیا ہے تو وہ اس لیے نہیں کہ ان کا عقیدہ سچا ہے یا ان کی فکر درست ہے۔ انھوں نے یہ کامیابیاں

---

[1] مفاهيم ينبغي أن تصحح لمحمد قطب، ص: 262.

[2] آل عمرٰن 3:182.

اس لیے حاصل کی ہیں کہ دنیا میں ترقی کا راستہ ہر ایک کے لیے کھلا ہے، چاہے مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا برا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ○﴾

”جو شخص دنیاوی زندگی اور اس کی زینت چاہتا ہے تو ہم انھیں ان کے اعمال کا پورا بدلہ اسی (دنیا) میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی۔“ [1]

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے شرف و عزت اور ترقی کے حصول کا ذریعہ اس کی محنت و طاقت کو قرار دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس کائنات میں نافذ ہونے والے ایسے قوانین کے مطابق ہو جو ہر قسم کی تحریف اور تبدیلی سے محفوظ ہیں، لہٰذا جو شخص قانونِ الٰہی کے مطابق لگن سے محنت کرے گا اس کے مطابق اللہ عزوجل کی عطا کا مستحق ٹھہرے گا۔

معلوم یہ ہوا کہ قانون ”اختیارِ ذرائع“ اللہ تعالیٰ کی مشیّت و ارادے کے ساتھ منسلک ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کافر دنیا میں جتنی بھی ترقی کر لے اس کی بدولت جنت کے دروازے اس کے لیے نہیں کھل سکیں گے اور مسلمان اگر کوتاہی کرتا ہے تو گناہ ہے اور اس کا محاسبہ ہو گا۔ [2]

اللہ تعالیٰ پر بھروسا اور ذرائع اختیار کرنا

اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنا نظریہ اختیار ذرائع کے منافی نہیں۔ مومن اللہ تعالیٰ کا حکم مانتے ہوئے ذرائع تو اختیار کرتا ہے لیکن وہ یہ اعتقاد نہیں رکھتا کہ بس ذرائع ہی نتیجہ خیز ہیں بلکہ اس کا اعتقاد یہ ہوتا ہے کہ نتائج اللہ کریم کی مشیّت و ارادے سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ایک مومن آدمی کی سمجھ کے مطابق ذریعے اور نتیجے میں کوئی تعلق نہیں۔ ذرائع اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہے اور نتیجے کا معرض وجود میں آنا صرف اللہ تعالیٰ کی طرف

---

[1] هود 11:15. [2] لقاء المؤمنين لعدنان نحوي: 2/124.

سے ہے، کوئی اور اس پر قادر نہیں ہے۔ اسی سوچ کے ساتھ مومن کا شعور اسباب و ذرائع کی پرستش اور ان کے ساتھ چمٹے رہنے سے آزاد ہو جاتا ہے اور وہ اطاعت الٰہی کے مطابق نتیجہ پالیتا ہے۔ یوں حصول نتیجہ کی شکل میں اسے اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کا ثواب مل جاتا ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے متعدد فرامین میں اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے کے ساتھ ساتھ اسباب و وسائل اختیار کرنے کا حکم بھی دیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک آدمی اپنی اونٹنی کے ہمراہ مسجد کے دروازے پر کھڑا تھا اور مسجد میں داخل ہونے سے پہلے اس نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا: ''کیا میں اپنی سواری کو کھلا چھوڑ کر اللہ پر توکل کر سکتا ہوں؟'' گویا وہ اختیارِ ذرائع کو اللہ پر بھروسے کے خلاف سمجھتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی تصحیح فرمائی کہ اسباب و ذرائع اختیار کرنا شریعت کا حکم ہے اور یہ کسی حال میں بھی اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے کے مخالف نہیں ہو سکتا بشرطیکہ وہ انھیں سچی نیت سے اختیار کرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «اِعْقِلْهَا وَ تَوَكَّلْ» ''اس کو باندھ، پھر اللہ پر بھروسا کر۔''[2]

مندرجہ بالا حدیث ان احادیث میں سے ایک ہے جو وضاحت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے کے ساتھ اسباب و ذرائع اختیار کرنا غلط نہیں بشرطیکہ ذرائع پر اتنا یقین اور اعتماد نہ ہو کہ توکل علی اللہ کو یکسر بھول جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کا فرمان نقل کرتے ہیں:

«لَوْ أَنَّكُمْ تَتَوَكَّلُونَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ، تَغْدُو خِمَاصًا وَّ تَرُوحُ بِطَانًا»

''اگر تم اللہ تعالیٰ پر کماحقہ بھروسا کرو تو وہ تمھیں پرندں کی طرح رزق عطا

---

[1] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 1476/3. [2] جامع الترمذي، حديث: 2517، والمستدرك للحاكم: 623/3، ومجمع الزوائد: 291/10.

فرمائے جو بھوک کی حالت میں صبح کو جاتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر لوٹتے ہیں۔"[1]

اس فرمان رسول میں اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے کی ترغیب کے ساتھ ساتھ اسباب و ذرائع اختیار کرنے کی اہمیت و ضرورت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، اس لیے فرمان نبوی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق کی ضمانت کو پرندوں کے صبح جانے اور شام کو سیر ہو کر لوٹنے کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے۔

شریعت کی نظر میں قانون اختیار ذرائع کا خلاصہ

① اسلام اختیارِ ذرائع کی تلقین کرتا ہے، وگرنہ شریعت و دیگر دنیاوی مصالح کو ترک کرنا لازم آتا ہے۔

② اللہ کریم پر بھروسا چھوڑ کر صرف اسباب ظاہری پر اعتماد کرنا شرک ہے۔

③ اسلام ہمیں سبق سکھاتا ہے کہ اسباب و ذرائع اختیار کرنا توحید ہے، اس یقین کے ساتھ کہ تمام اسباب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔

لٰہذا مسلمان سے مطلوب یہ ہے کہ وہ اللہ پر توکل کرتے ہوئے اسباب و ذرائع اختیار کرے۔[2]

امت اسلامیہ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ دنیا میں کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے لیے مادی ذرائع اختیار کرے، پھر اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔

مذکورہ قانون کے ضمن میں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی استطاعت سے زیادہ اسباب و ذرائع اختیار کرنے کا مطالبہ نہیں

---

[1] مسند أحمد: 30/1 و 52، و جامع الترمذي، حديث: 2344، و سنن ابن ماجه، حديث: 4164، و المستدرك للحاكم: 318/4، و مسند أبي يعلٰى، حديث: 247. [2] التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 254.

فرمایا۔ میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے کی تیاری کے سلسلے میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾

''اور ان (کافروں کے مقابلے) کے لیے تم مقدور بھر قوت تیار رکھو۔''[1]

گویا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اپنی پوری طاقت صرف کرو اور حتی المقدور زیادہ سے زیادہ سامان حرب اکٹھا کرو اگرچہ وہ دشمن کے مقابلے میں کم ہی کیوں نہ ہو۔ پس زیادہ سے زیادہ کوشش کرنے کا نام استطاعت ہے۔ اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طاقت و قدرت بے انتہا ہے۔ زیادہ کوشش اخلاص کی دلیل اور یہی شرط مطلوب ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ اپنی مدد نازل فرماتا ہے۔[2]

اس میں ساری امت اسلامیہ کے لیے درس ہے کہ وہ کمزوری اور حقارت کی زندگی چھوڑ کر قوت اور عزت کی زندگی اختیار کرے، خواب و خواہشات ترک کر کے اسباب و ذرائع اختیار کرے تاکہ اسلامی مملکت کا قیام ممکن ہو اور انسانی تہذیب کی تشکیل اس طرح ہو کہ مالک حقیقی سے انسان کا تعلق مضبوط ہو جائے۔ اور امت اسلامیہ کو چاہیے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے نافذ شدہ قوانین کو اپنائے اور قرآن کریم کے واضح احکامات کی پیروی کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ روشنی میں ترقی کے راستے پر چل سکے۔

آنحضرت ﷺ نے بعثت سے وفات تک سنت الٰہی کے مطابق بغیر کوتاہی کے تمام ممکنہ اسباب و ذرائع اختیار کیے۔ آپ لوگوں کو راہ راست پر لانے، باطل کا مقابلہ کرنے، جماعت اور ریاست کی بتدریج تشکیل کرنے اور ابتلا برداشت کرنے میں اسباب و وسائل کے الٰہی قانون پر کاربند رہے۔ دنیا میں عزت و شرف کا مقام حاصل کرنے کے لیے آپ نے مناسب ذرائع اختیار کیے۔ ہجرتِ حبشہ، واقعہ طائف، قبائل کو دعوت اسلام، ہجرتِ مدینہ، پھر مملکت اسلامیہ کی تشکیل، اس کے استحکام کے لیے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کیے،

---

[1] الأنفال 60:8. [2] الإسلام في خندق لمصطفیٰ محمود، ص: 64.

بعدازاں اصحاب رسول ﷺ بھی اسی طریقے پر گامزن رہے اور انتہائی غور وفکر اور بصیرت کے ساتھ اسباب و ذرائع اختیار کرتے رہے اور اتنی ترقی حاصل کی کہ انسانی تاریخ میں آج تک اس کی مثال ناپید ہے۔

یقیناً رسول اللہ ﷺ کی تحریک امت اسلامیہ کی تربیت اور اسلامی مملکت کے حصولِ مقام کے سلسلے میں ایک ایسا نور ہے جس سے ہدایت ملتی ہے اور ایسی سنت ہے کہ ہلاکت خیز موجوں، تغیر پذیر حالات اور گہرے اندھیروں میں بھی اس سے رہنمائی حاصل ہوتی ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسے اختیار کرنا انتہائی آسان ہے۔

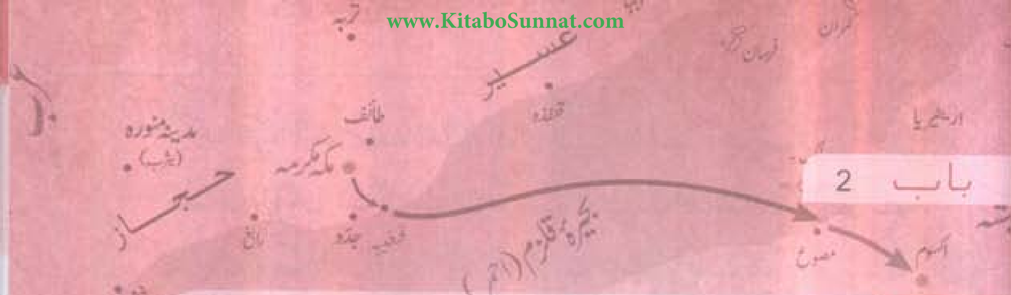
تربہ
نجران
عسیر
قنفذہ
طائف
مدینہ منورہ
(یثرب)
حجاز
مکہ مکرمہ
رابغ
جدہ
شعیبہ
بحیرۂ قلزم (احمر)
ارتیریا
مصوع
اکسوم
ینبع

باب 2

ہجرت حبشہ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾

”اور جن لوگوں نے ظلم وستم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، البتہ ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش! وہ علم رکھتے۔“ ①

امام قرطبی رحمہ اللہ حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت کا مصداق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جن پر مشرکین نے ظلم کیا اور انھیں مکہ سے نکال دیا۔ ان میں سے ایک گروہ نے حبشہ کی جانب ہجرت کی۔ بعدازاں اللہ تعالیٰ نے انھیں ہجرت مدینہ کی بھی توفیق دی اور سچے ایمانداروں (انصار) کے ذریعے ان کی مدد فرمائی۔“ ②

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿قُلْ يَا عِبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۗ وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ ۗ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾

---

① النحل 16:41. ② تفسير القرطبي: 10/107.

"کہہ دیجیے: اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! اپنے رب سے ڈرو، جنھوں نے اس دنیا میں اچھے عمل کیے ان کے لیے بھلائی ہے اور اللہ کی زمین وسیع ہے، بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا۔"[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "اس آیت کے مصداق حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ حبشہ کی جانب ہجرت کرنے والے ہیں۔"[2]

ارشاد الٰہی ہے: ﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ○﴾

"اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! بلاشبہ میری زمین وسیع ہے تو تم میری ہی عبادت کرو۔"[3]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ کا اپنے ایماندار بندوں کو حکم ہے کہ وہ ایسے شہر سے ہجرت کر جائیں جہاں دین پر قائم رہنا مشکل ہو جائے اور ایسی زمین کی طرف ہجرت کریں جہاں وہ شریعت اسلامی کو آزادانہ اپنا سکیں۔ اللہ تعالیٰ کی زمین بہت کشادہ ہے، اس لیے جب اہل مکہ نے کمزور مسلمانوں پر ظلم کیے تو وہ اپنے دین کو بچانے کی غرض سے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے، وہاں انھوں نے نجاشی اصحمہ رحمہ اللہ جیسا بہترین مہمان نوازی کرنے والا حبشہ کا بادشاہ پایا۔"[4]

ہجرت حبشہ کے اسباب

جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں پر سخت مصائب ڈھائے جانے لگے اور کفار انھیں حبس بے جا اور مختلف قسم کی سزائیں دینے لگے، جیسے مارنا، بھوکا پیاسا رکھنا، مکہ کی گرم ریتلی زمین اور آگ پر لٹانا تاکہ انھیں ان کے دین سے برگشتہ کیا جا سکے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سخت تکالیف برداشت کرتے رہے یہاں تک کہ بعض کو سولی پر لٹکا دیا گیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کو سلامت رکھا، جبکہ بعض کلمۂ کفر کہنے پر بھی مجبور ہوئے لیکن ان کا دل

---

[1] الزمر 10:39. [2] تفسیر القرطبي: 240/15. [3] العنکبوت 56:29. [4] تفسیر ابن کثیر: 335/5.

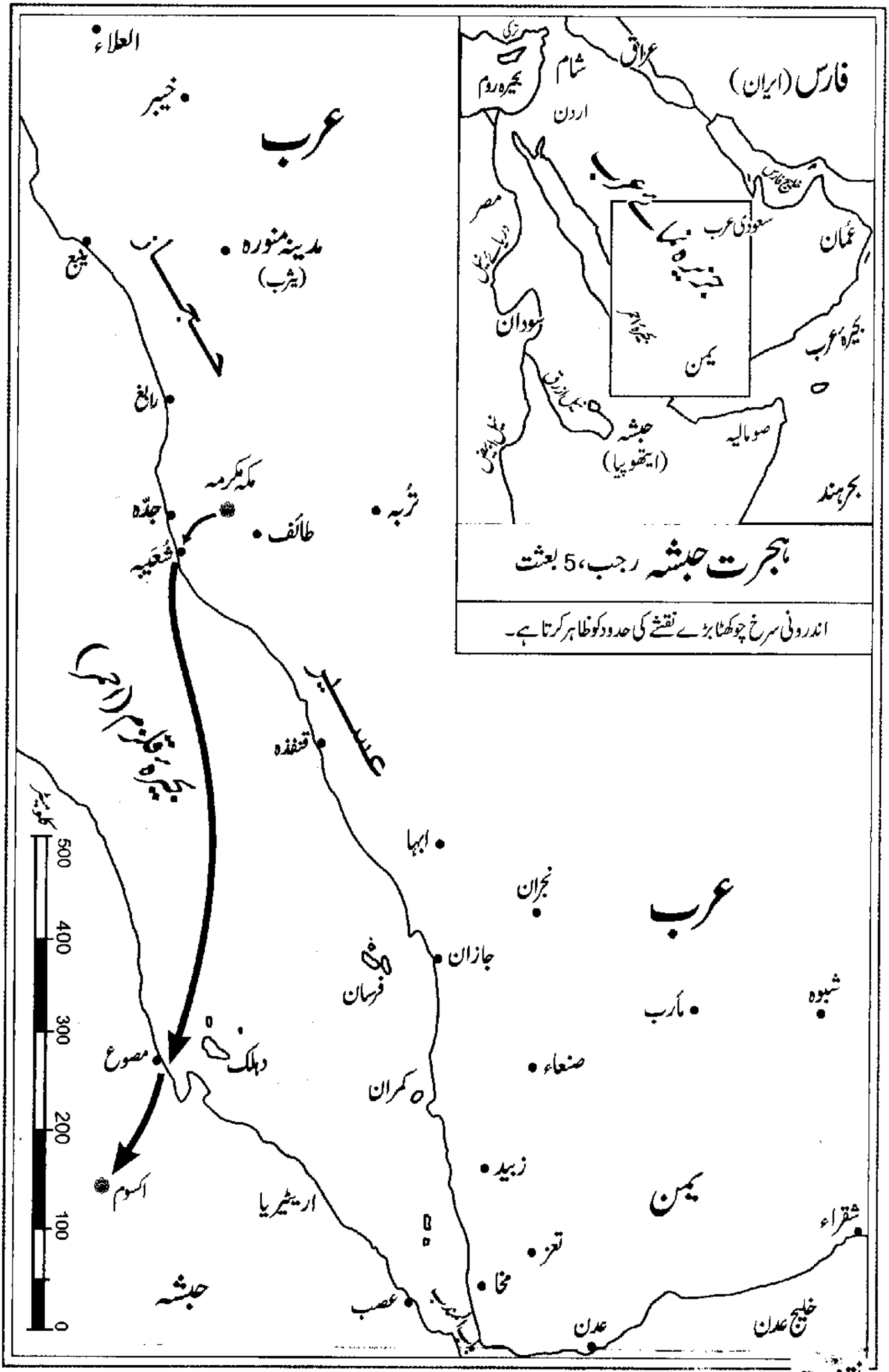
العلاء
خیبر
عرب
مدینہ منورہ
(یثرب)
ینبع
حجاز
رابغ
مکہ مکرمہ
جدّہ
شُعَیبہ
طائف
تُربہ
بحیرۂ قلزم (احمر)
قنفذہ
عسیر
کلومیٹر
500
400
300
200
100
0
ابہا
نجران
عرب
جازان
فرسان
مأرب
شبوہ
دہلک
مصوع
صنعاء
کمران
زبید
اکسوم
اریٹیریا
یمن
شقراء
تعز
مخا
حبشہ
عصب
عدن
خلیج عدن
ترکی
بحیرہ روم
شام
عراق
فارس (ایران)
اردن
عرب
مصر
جزیرہ نمائے عرب
سعودی عرب
خلیج فارس
عمان
سودان
بحیرۂ احمر
یمن
بحیرۂ عرب
حبشہ
(ایتھوپیا)
صومالیہ
بحرِ ہند

ہجرت حبشہ رجب، 5 بعثت

اندرونی سرخ چوکھٹا بڑے نقشے کی حدود کو ظاہر کرتا ہے۔

نقشہ: 7

ایمان سے سرشار رہا۔ ایسی حالت میں نبی ﷺ نے غور فرمایا کہ وہ خود تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ مرتبے اور ابوطالب کے دفاع کی وجہ سے عافیت میں ہیں لیکن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سخت امتحان میں مبتلا ہیں اور آپ ﷺ ان کی تکالیف کا مداوا بھی نہیں کر سکتے تو آپ ﷺ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا:

«لَوْ خَرَجْتُمْ إِلٰی أَرْضِ الْحَبَشَةِ، فَإِنَّ بِهَا مَلِكًا لَّا يُظْلَمُ عِنْدَهُ أَحَدٌ، وَّ هِيَ أَرْضُ صِدْقٍ، حَتّٰی يَجْعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ فَرَجًا مِّمَّا أَنْتُمْ فِيهِ»

”اگر تم حبشہ کی طرف ہجرت کر جاؤ تو تمھارے لیے بہتر ہے کیونکہ وہاں ایک بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور حبشہ سچائی کی سرزمین ہے۔ تم وہاں رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے کوئی کشادگی پیدا کر دے۔“[1]

چنانچہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آزمائشوں سے بچنے اور اپنا دین بچانے کی غرض سے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ یہ اسلام میں پہلی ہجرت ہے۔

دینِ اسلام کی نشر واشاعت: اسلام میں لوگ کثرت سے داخل ہو رہے تھے اور نظریہ اسلام کی حقانیت کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ ہر طرف لوگ اسی کا تذکرہ کرنے لگے۔ علامہ زُہری حضرت عُروہ سے ہجرت حبشہ کے سلسلے میں نقل فرماتے ہیں کہ مشرکوں نے اپنے قبائل میں سے ایمان لانے والوں کو قید و بند کی صعوبتیں اور مختلف تکالیف دینی شروع کر دیں اور انھیں ایمان سے برگشتہ کرنے کا ارادہ کیا۔ جب رسول اللہ ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ نے اہل ایمان سے فرمایا: «تَفَرَّقُوا فِي الْأَرْضِ» ”زمین میں پھیل جاؤ۔“ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا: ”اللہ کے رسول! ہم کہاں جائیں؟“ آپ نے ارشاد فرمایا: «هَاهُنَا» ”اس طرف“ اور یہ کہتے ہوئے سرزمین حبشہ کی طرف اشارہ کیا۔[2]

---

[1] سلسلة الأحاديث الصحيحة، حديث: 3190، والسيرة النبوية لابن هشام: 344/1. [2] المصنف لعبد الرزاق: 159/5، والمغازي النبوية للزهري تحقيق سهيل زكار، ص: 96، روایت مرسل ہے۔

اپنے دین کو فتنے سے بچانا: اپنے دین کو فتنے میں مبتلا ہونے سے بچانا ہجرت حبشہ کا ایک اہم سبب ہے۔ ابن اسحاق لکھتے ہیں: ”پس سختیوں کے وقت اصحاب رسول ﷺ سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے کہ کہیں وہ آزمائش میں نہ پڑ جائیں اور ان کے دین کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔“[1]

بیرونِ مکہ دعوتِ دین کو پھیلانا: ہجرت حبشہ کا ایک سبب بیرون مکہ ایک دعوتی مرکز قائم کرنا تھا۔ سید قطب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”ایسے حالات میں اللہ کے رسول ﷺ مکہ کے علاوہ کسی اور مرکز کے متلاشی تھے جہاں مسلمان عقیدۂ توحید کی حفاظت کرسکیں اور انھیں ایسی آزادی نصیب ہو کہ اسلامی دعوت عام ہو اور اہل اسلام کو ظلم اور فتنے سے چھٹکارا ملے۔ میری نظر میں ہجرت حبشہ کا سب سے اہم سبب یہی ہے اور یہ کہنا بلا دلیل ہے کہ صحابۂ کرام محض اپنی جان بچانے کی غرض سے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو پھر وہ لوگ جو اپنی قوم میں کوئی اونچا مقام نہ رکھتے تھے اور نہ قوت و حشمت کے مالک تھے وہ ضرور حبشہ کی طرف ہجرت کرتے، حالانکہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ ایسے کمزور لوگ اور غلاموں نے جو ظلم و سزا کی چکی میں پس رہے تھے، ہجرت نہ کی اور ہجرت کرنے والے وہ لوگ تھے جو اپنے قبائلی معاشرے میں اونچا مقام رکھتے تھے، نیز وہ اپنی جانوں کی حفاظت بھی کرسکتے تھے اور فتنے سے محفوظ بھی رہ سکتے تھے اور مہاجرین حبشہ میں سے اکثر لوگ قریشی تھے۔“[2]

علامہ منیر غضبان بھی سید قطب کی موافقت کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”جس سبب کی طرف سید قطب رحمہ اللہ نے توجہ مبذول کرائی ہے سیرت النبی سے اس کے مزید شواہد بھی ملتے ہیں۔ میری رائے میں اس نظریے کو اس بات سے بھی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ دیکھا جائے کہ مہاجرین حبشہ مدینہ طیبہ کب تشریف لائے۔ ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اور نہ ہی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت مدینہ کے بعد انھیں طلب کرلیا ہو،

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام:398/1. [2] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب:29/1.

بلکہ غزوۂ بدر اور حدیبیہ بھی گزر گئے اور پانچ سال تک مدینہ سخت مشکلات کا شکار رہا۔ مکہ والوں کی طرف سے آخری خطرناک حملہ غزوۂ خندق کے موقع پر ہوا۔ بعدازاں جب آنحضرت ﷺ مطمئن ہو گئے کہ مدینہ طیبہ ایک محفوظ اسلامی مرکز کی شکل اختیار کر گیا ہے تو آپ نے مہاجرین حبشہ کو مدینہ بلا لیا کیونکہ اب اس احتیاطی مرکز کی ضرورت نہ رہ گئی تھی کہ اللہ نہ کرے اگر مدینہ طیبہ دشمنوں کے قبضے میں چلا جائے تو وہ حبشہ منتقل ہو سکیں۔‘‘[1]

جناب استاد دروزہ کی رائے کے مطابق ہجرت حبشہ دعوتی سرگرمیوں میں وسعت پیدا کرنے کے لیے پیش آئی۔ وہ لکھتے ہیں: ’’حبشہ میں عیسائیوں کی حکومت تھی، لہٰذا نبی ﷺ کے دل میں خیال آیا ہو گا کہ ممکن ہے وہاں اسلامی دعوت پھیل سکے اور اس خیال کی پیروی میں حضرت جعفر ؓ کو ذمہ داری سونپی گئی۔‘‘[2]

شیخ ڈاکٹر سلمان بن حمد عودہ نے بھی اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ’’نجاشی اور دیگر افرادِ حبشہ کا اسلام لانا اس سوچ کو تقویت دیتا ہے کہ ہجرتِ حبشہ اصل میں ایک دعوتی مشن تھا اور مہاجرینِ حبشہ کا ہجرتِ مدینہ کے بعد وہاں غزوۂ خیبر تک مقیم رہنا نبی ﷺ کے حکم اور مشورے سے تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جب اشعری قبیلے کے لوگوں کی حضرت جعفر ؓ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا: ’’بے شک رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہاں بھیجا ہے اور یہاں رکنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا تم بھی ہمارے پاس ٹھہرو۔‘‘[3]

اس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت اصحابِ رسول ایک خاص مہم پر حبشہ گئے تھے اور جب یہ مہم مکمل ہوئی تو انھیں واپس بلا لیا گیا اور وہ اعلیٰ مہم دعوت دین کی مہم تھی۔‘‘[4]

مسلمانوں کے لیے امن والی جگہ کی تلاش: ہجرت حبشہ کا ایک سبب مسلمانوں کے لیے جائے امن کا دریافت ہونا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے امن حاصل کرنے کے لیے جو پروگرام

---

[1] المنهج الحركي للسيرة النبوية للدكتور الغضبان: 68,67/1. [2] سيرة الرسول ﷺ للأستاذ محمد عزة دروزة: 265/2، ومعين السيرة لصالح الشامي، ص: 111. [3] صحيح البخاري، حديث: 4230. [4] الهجرة الأولىٰ في الإسلام للدكتور سلمان العودة، ص: 34.

تشکیل دیا تھا اس کا مقصد ایک خالص اور ایمان کی حامل جماعت کو تحفظ فراہم کرنا تھا، لہٰذا آپ کی نظر میں سرزمین حبشہ اس اعتبار سے امن کا گہوارہ ثابت ہوسکتی تھی اور یہ جماعت اتنی دیر وہاں ٹھہر سکتی تھی کہ اسلام کی جڑیں مضبوط ہو جائیں اور بادِ مخالف بھی ٹھہر جائے، نتیجتاً ایسا ہی ہوا۔ سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مہاجرین نے امن اور سکھ کا سانس لیا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”جب ہم نے حبشہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو نجاشی بادشاہ کو بہترین سلوک کرنے والا پایا۔ ہمیں دین کا تحفظ ملا اور ہم وہاں غم و تکلیف کے بغیر اپنے رب کی عبادت کرتے تھے۔“ [1]

ہجرت کے لیے حبشہ کا انتخاب کیوں؟

نبی ﷺ نے ہجرت کے لیے سرزمین حبشہ کو درج ذیل اسباب کی بنا پر اختیار کیا:

نجاشی کا عادل ہونا: نبی ﷺ نے نجاشی کے عادل ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا: «لَوْ خَرَجْتُمْ إِلٰى أَرْضِ الْحَبَشَةِ، فَإِنَّ بِهَا مَلِكًا لَّا يُظْلَمُ عِنْدَهٗ أَحَدٌ» ”بہتر ہے کہ تم سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت کر جاؤ کیونکہ وہاں کا بادشاہ کسی پر ظلم نہیں ہونے دیتا۔“ [2]

نجاشی کا نیک ہونا: نبی ﷺ سے منقول ہے:

«قَدْ تُوُفِّيَ الْيَوْمَ رَجُلٌ صَالِحٌ مِّنَ الْحَبَشَةِ، فَهَلُمَّ فَصَلُّوا عَلَيْهِ»

”آج حبشہ کا ایک نیک آدمی وفات پا گیا، پس آؤ اس کی نماز جنازہ ادا کریں۔“ [3]

مسلمانوں کی حمایت، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی زبان سے قرآن کریم سن کر متاثر ہونا اور عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اس کا صحیح العقیدہ ہونا بھی واضح دلیل ہے کہ وہ نیک اور

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام تحقيق: همام أبو صعيليك: 413/1. [2] سلسلة الأحاديث الصحيحة، حديث: 3190، والسيرة النبوية لابن هشام تحقيق: همام أبوصعيليك: 397/1. [3] صحيح البخاري، حديث: 1320، و صحيح مسلم، حديث: 952.

باصلاحیت انسان تھا۔

حبشہ کا قریش کے لیے مرکز تجارت ہونا: یقیناً تجارت کا پیشہ قریشی اقتصادیات کا ستون سمجھا جاتا تھا اور حبشہ جزیرہ نمائے عرب کا اہم تجارتی مرکز تھا۔ مسلمانوں کے سامنے یہ راز اس وقت کھلا جب وہ پہلے پہل تجارت کی غرض سے وہاں گئے یا پھر کچھ تاجروں کی معرفت انھیں یہ علم ہوا۔ علامہ طبری رحمہ اللہ ہجرت حبشہ کے اسباب ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ’’حبشہ قریش کا تجارتی مرکز تھا۔ قریش وہاں تجارت کی غرض سے جاتے اور قابل قدر نفع کماتے، لٰہذا یہ سرزمین ایک جائے امن اور تجارتی مرکز کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔‘‘[1]

حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’جب رسول اللہ ﷺ شِعب ابی طالب میں تھے تو آپ نے اہل ایمان کو ہجرت حبشہ کا حکم دے دیا جو کہ قریش کا تجارتی مرکز تھا۔‘‘[2]

ابن حبان رحمہ اللہ اسباب ہجرت حبشہ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ’’سرزمین حبشہ گرم تھی اور قریش سردیوں میں وہاں کا سفر اختیار کرتے تھے۔‘‘[3]

حبشہ کا پرامن ہونا: تاریخی تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عرب قبائل قریش کے فرمانبردار اور ان کی سمع و طاعت پر کمربستہ رہتے تھے اور قریش ان پر برتری کے حامل تھے کیونکہ تمام قبائل حج، تجارت اور دیگر ضروریات میں قریش کی ضرورت محسوس کیا کرتے تھے حتی کہ نبی ﷺ کی دعوت کو ٹھکرانے میں بھی قریش کا ساتھ دیتے۔ ابن اسحاق نے اس سلسلے میں چند شواہد بھی ذکر کیے ہیں۔[4] جزیرہ نمائے عرب کے باہر سب سے زیادہ پرامن علاقہ حبشہ کا تھا جو قریش کے غلبے سے محفوظ تھا اور اہل حبشہ دیگر قبائل عرب کی طرح قریش کی خوشنودی حاصل کرنے کی جستجو بھی نہیں کرتے تھے۔[5]

---

[1] مغازي رسول اللہ ﷺ لعروة بن الزبير، ص: 104.

[2] الدرر في اختصار المغازي والسير لابن عبدالبر، ص: 27.

[3] السيرة النبوية و أخبار الخلفاء لأبي حاتم التميمي، ص: 72.

[4] السير والمغازي لابن إسحاق، تحقيق سهيل زكار، ص: 232.

[5] هجرة الرسول و صحابته في القرآن و السنة لأحمد عبد الغني، ص: 97.

ابن اسحاق ہجرت حبشہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''وہ سچائی کی سرزمین تھی۔ وہاں کا بادشاہ کسی پر ظلم نہیں ہونے دیتا تھا۔''[1]

نبی ﷺ کی سرزمین حبشہ سے واقفیت و محبت: علامہ زہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''سرزمین حبشہ رسول اللہ ﷺ کو اس لحاظ سے پسند تھی کہ وہاں ہجرت کی جائے۔''[2]

نبی ﷺ کی حبشہ سے محبت کے چند اسباب مندرجہ ذیل تھے:

① ایک عادل بادشاہ نجاشی اس کا فرمانروا تھا۔

② حبشی لوگ عیسائی مذہب پر مضبوطی سے قائم تھے اور بت پرستی کی نسبت نصرانیت اسلام کے زیادہ قریب تھی۔ اور قرآن کریم کے حوالے سے ہمیں علم ہوا ہے کہ مکی دور میں جب نبوت کے آٹھویں سال عیسائی مجوسیوں پر غالب آئے تو مسلمان انتہائی خوش ہوئے۔[3]

③ آپ ﷺ اپنی دایہ ام ایمن رضی اللہ عنہا کے توسط سے حبشہ کے حالات سے واقف تھے۔ صحیح مسلم کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ ام ایمن رضی اللہ عنہا حبشیہ تھیں۔[4] ابن ماجہ میں ہے کہ جب حبشی طریقے سے آپ کے لیے کھانا تیار کرتیں تو آپ ان سے پوچھتے: «مَاهٰذَا؟» ''یہ کیا ہے؟'' وہ کہتیں: ''یہ کھانا سرزمین حبشہ میں کھایا جاتا ہے۔ میرا دل چاہا کہ آپ کے لیے بھی اسی انداز سے ایک روٹی بنادوں۔''[5]

ام ایمن رضی اللہ عنہا باوجود کوشش کے اپنا حبشی لہجہ تبدیل نہ کرسکیں تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں حبشی لہجے کی رخصت عطا فرمائی، لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ ام ایمن رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے اپنے ملک کے خدوخال، معاشرے اور فرمانرواؤں کے بارے میں ضرور تبادلۂ خیال کیا ہوگا۔[6]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 397/1. [2] المغازي النبوية للزهري، ص: 96. [3] صحيح السيرة النبوية للطرهوني: 152/2. [4] صحيح مسلم، حديث: 1771. [5] سنن ابن ماجه، حديث: 3336.

[6] الهجرة الأولى في الإسلام للدكتور سلمان العودة، ص: 48.

ہجرتِ حبشہ کب ہوئی؟ اور مہاجرین کی تعداد کتنی تھی؟

مہاجرین صحابہ کا قافلہ بعثتِ نبوی کے پانچویں سال رجب میں راز داری سے عازمِ سفر ہوا۔ یہ قافلہ دس مردوں اور چار یا پانچ عورتوں پر مشتمل تھا۔ قریش انھیں واپس مکہ لانے کے لیے ان کے پیچھے نکلے اور ساحل تک پہنچے لیکن تب تک اہل حق کا یہ قافلہ سمندر میں خاصا دور چلا گیا تھا۔[1]

جب مہاجرین سرزمین حبشہ میں پہنچے تو نجاشی بادشاہ نے ان کی عزت افزائی اور بہتر انداز سے ان کا خیر مقدم کیا اور وہاں مہاجرین نے ایسا امن وسکون پایا جو اپنی سرزمین میں نہ پاسکے تھے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”جب ہم حبشہ پہنچے ہمیں بہترین ہمسائے، نجاشی کا ساتھ نصیب ہوا، ہمارے دین کو تحفظ ملا اور ہم نے اپنے رب کی عبادت کی، جبکہ ہمیں وہاں کوئی دکھ تکلیف نہ تھی اور نہ کوئی ناخوشگوار بات سننی پڑتی تھی۔“[2]

حبشہ کی جانب پہلی ہجرت کرنے والوں کے نام

اس قافلے میں شامل مرد حضرات مندرجہ ذیل تھے:

① عثمان بن عَفّان بن ابی العاص بن اُمَیَّہ بن عبد شمس۔

② عبداللہ بن عَوْف بن عوف بن عبد بن الحارث بن زہرہ۔

③ زُبَیر بن عوام بن خُوَیلد بن اَسَد۔

④ ابو حُذَیفہ بن عُتْبہ بن رَبیعہ بن عبد شمس۔

⑤ مُصْعَب بن عُمَیر بن ہاشم بن عبد مناف بن عبدالدار۔

⑥ ابوسَلَمہ بن عبدالاسد بن ہلال بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم۔

⑦ عثمان بن مظعون بن حَبِیب بن وَہب بن حُذَافہ بن جُمَح۔

---

[1] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 291,290.

[2] مسند أحمد: 202,201/1.

⑧ عامر بن ربیعہ جو آل خطاب کے حلیف تھے اور ان کا تعلق عَنز بن وائل سے تھا۔

⑨ سُہیل بن وَہب بن رَبیعہ بن ہلال بن اُہَیب بن ضَبہ بن الحارث، المعروف سُہیل بن بیضاء۔

⑩ ابوسَبْرہ بن ابی رُہم بن عبدالعزیٰ بن ابی قیس عبدِوُد بن نصر بن مالک بن حِسل بن عامر۔

مندرجہ بالا دس مرد اس قافلے میں شریک تھے جنھوں نے سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ مہاجر خواتینِ اسلام کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

① رُقَیہ بنت رسول اللہ ﷺ۔

② سہلہ بنت سُہیل بن عمرو۔ سہیل عامر بن لوی کی اولاد میں سے تھا۔ حضرت سہلہ نے اپنے خاوند ابوحذیفہ کے ساتھ ہجرت کی اور محمد بن ابی حذیفہ حبشہ ہی میں پیدا ہوئے۔

③ اُم سَلَمہ بنت ابی اُمیہ بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم، یہ ابوسلمہ کی بیوی تھیں۔

④ لَیْلیٰ بنت ابی حَثمہ بن حُذافہ بن غانم بن عامر بن عبداللہ بن عوف بن عُبَید ابن عُوَیج بن عدی بن کعب۔ یہ عامر بن ربیعہ کی بیوی تھیں۔

⑤ ام کلثوم بنت سہیل بن عمرو بن عبدشمس۔ یہ ابوسَبرہ بن ابی رُہم کی بیوی تھیں۔[1]

مندرجہ بالا افراد میں سے سب سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی رُقَیہ بنت رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کی۔ یعقوب بن سفیان روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”عثمان وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے حضرت لوط علیہ السلام کے بعد اپنی بیوی کے ہمراہ ہجرت فرمائی۔“[2]

مندرجہ بالا افراد کے بارے میں اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زیادہ تر مہاجرین کا تعلق ایسے قبائل سے تھا جو قریش میں سے حسب و نسب اور مقام و مرتبے کے

---

[1] البداية والنهاية: 97,96/3، والسيرة النبوية لابن هشام: 1/344-352، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 292-294. [2] البداية والنهاية: 3/67، و فتح الباري، شرح الحديث: 3872، روایت ضعیف ہے۔

حامل سمجھے جاتے تھے اور ان غلاموں میں سے کوئی فرد دکھائی نہیں دیتا جنھوں نے سب سے زیادہ قریش کی طرف سے سزائیں اور تکالیف برداشت کیں۔ ظلم و ستم کا نشانہ بننے والے ان افراد میں سرفہرست حضرت بلال، خباب اور عمار رضی اللہ عنہم کے نام ہیں۔

اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ اگر ہجرت حبشہ کا سبب صرف دکھوں اور تکالیف سے تحفظ کی فراہمی تھا تو سب سے پہلے ان غلاموں کو ہجرت کرنی چاہیے تھی۔ اسی نظریے کی تائید میں ابن اسحاق اور دیگر سیرت نگاروں نے مشرکوں کی طرف سے کمزور لوگوں پر ظلم کی داستانیں تو تحریر کی ہیں لیکن ان کی حبشہ کی طرف ہجرت کا ذکر نہیں کیا۔[1]

غرضیکہ ہجرت حبشہ صرف اپنی جانیں بچانے کے لیے عمل میں نہیں لائی گئی تھی، بلکہ بہت سے دوسرے اسباب بھی تھے جنھیں مدنظر رکھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل سے صحابۂ کرام کی ایک جماعت تشکیل دی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب قریش نے اہل حبشہ کو مہاجرین کی واپسی پر رضامند کرنا چاہا تو کامیاب نہ ہوسکے۔ مہاجرین کو اہل حبشہ کی حمایت حاصل ہوئی اور قریش کے اکثر قبائل کے مسلمانوں میں ہجرت کا شوق پیدا ہوگیا کیونکہ اب اہل ایمان کو سرزمین مکہ تنگ محسوس ہونے لگی تھی۔

ایک اور پہلو سے اگر دیکھا جائے تو مہاجرین کو دنیا میں اللہ کا دین پھیلانے کا موقع میسر آیا اور حبشہ اس کے لیے بڑا موزوں اور بابرکت ثابت ہوا۔ جب کچھ قلوب و اذہان پر تالے لگ جاتے ہیں جیسے کفار مکہ پر لگے تو بعض قلوب و اذہان دعوت کو قبول کرنے کے لیے کھل بھی جاتے ہیں۔ جیسے اہل حبشہ۔[2]

قصۂ غرانیق

بعض مورخین و مفسرین مسلمانوں کی حبشہ سے واپسی کا سبب وہ قصہ قرار دیتے ہیں جو

---

[1] أنساب الأشراف للبلاذري:1/156-198، و السيرة النبوية لابن هشام:1/392-396. [2] الهجرة الأولى في الإسلام للدكتور سلمان العودة، ص:37.

زبان زدعام ہو چکا ہے اور مستشرقین نے اس قصے کو پھیلانے کی غرض سے اسے اپنی کتابوں میں جگہ دی اور دعوتِ اسلامی کی تاریخ میں اسے حقیقت کا روپ دینے کی کوشش کی۔ دوسری طرف اس قصے کا تذکرہ کرنے والے مختلف خیالات کے حامل ہیں۔ بعض تو تذکرے کے بعد خاموشی اختیار کرتے ہوئے تردید یا تصدیق نہیں کرتے مگر کچھ لوگ اثبات یا نفی پر دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔[1]

مختصر طور پر قصہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک دفعہ نبی ﷺ بیت اللہ کے قریب تشریف فرما تھے اور سورۂ نجم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب آپ اس آیت پر پہنچے:

﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى○ وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى○﴾

”کیا تم نے لات اور عزّٰی کو دیکھا؟ اور تیسری (دیوی) مناۃ کو جو گھٹیا ہے۔“[2]

تو اس کے بعد آپ ﷺ نے پڑھا:

«تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى، وَ إِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى»

”یہ خوبصورت غرانیق مقدس ہستیاں اور یقیناً ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔“

تو مشرکین نے کہا کہ آج سے قبل اس نے ہمارے معبودوں کا کبھی تذکرہ خیر نہیں کیا اور ہمیں تو یقین ہے کہ رزق، زندگی اور موت کے معاملات صرف اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ ہم تو صرف یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ہمارے معبود اللہ کے ہاں ہماری سفارش کریں گے۔ بعدازاں جب آپ نے آیتِ سجدہ کی تلاوت فرمائی تو مسلمانوں کے ساتھ مشرکوں نے بھی سجدہ کیا، سوائے قریش کے ایک بوڑھے آدمی کے جس نے صرف زمین سے مٹھی بھر کنکریاں اٹھا کر پیشانی سے لگانے پر اکتفا کیا۔[3]

اس قصے کے بعد مشرکین اللہ کے رسول ﷺ سے چاہت سے پیش آنے لگے اور

---

[1] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص:295. [2] النجم53:19,20. [3] مختصر سيرة الرسول ﷺ لمحمد بن عبدالوهاب، ص:84.

مسلمانوں کی ایذا رسانی سے بھی رک گئے۔ یہ قصہ اتنا عام ہوا کہ سرزمین حبشہ پر جب اس کی خبر پہنچی تو مہاجرین نے یہی خیال کیا کہ مسلمانوں کے حالات مکہ میں بہتر ہو چکے ہیں اور وہ اپنے رب کی عبادت امن وسکون سے کر سکتے ہیں، لہٰذا وہ مکہ واپس آ گئے۔

مذکورہ قصے میں مختلف خیال رکھنے کے باوجود مفسرین اسے بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب نبی ﷺ سے قریش مکہ نے کہا کہ تم نے ہمارے معبودوں کو تسلیم کر لیا ہے تو ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ نبی ﷺ پر یہ بات اتنی گراں گزری کہ آپ شام تک اپنے گھر ہی میں رہے، پھر جبریل علیہ السلام نے آکر سورۂ نجم کی تلاوت سنائی اور دریافت کیا: کیا یہ کلمات «تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلىٰ وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجىٰ» میں آپ کے پاس لے کر آیا تھا؟ تو آپ اتنے غمگین ہوئے کہ اپنے اللہ کی ناراضی سے ڈرنے لگے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

”اور ہم نے آپ سے پہلے جو بھی رسول اور نبی بھیجا جب وہ تلاوت کرتا تو شیطان اس کی تلاوت میں (اپنی طرف سے کچھ) ڈال دیتا، پھر اللہ اسے زائل کر دیتا جو شیطان نے (وسوسہ) ڈالا ہوتا، پھر اللہ اپنی آیات کو محکم کر دیتا اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔“[1]

بعد ازاں رسول اللہ ﷺ دوبارہ معبودان باطلہ کی خامیاں عام کرنے لگے اور قریش مکہ کو کم عقل گردانے لگے نتیجتاً قریش مکہ پھر سے مسلمانوں کے درپے آزار ہو گئے۔

---

[1] الحج 52:22، وفتح القدير: 416/3، و فتح الباري: 355/8، و أسباب النزول للسيوطي على هامش جلالين: 16/2، و الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 296.

من گھڑت قصے کا رد: مندرجہ بالا قصے کا خیر القرون کے علماء و محدثین رد کرتے ہیں۔ اگر عقلی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ پیغمبر ﷺ کی عصمت کو داغدار اور آپ کی نبوت کو مشکوک کرنے کی مذموم کوشش ہے اور تحقیقی اور علمی لحاظ سے بھی یہ قصہ بے وقعت نظر آتا ہے۔ اس کے باطل ہونے پر مندرجہ ذیل نقلی دلائل موجود ہیں:

قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کے کلام میں اپنی مرضی سے دخل اندازی نہیں کرسکتے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ○ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ○ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ○﴾

”اور اگر یہ ہم پر کوئی بات گھڑ کر لگاتا۔ تو یقیناً ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے۔ پھر البتہ ہم اس کی شہ رگ کاٹ ڈالتے۔“ [1]

اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ میرے اس کلام میں کوئی کمی یا زیادتی یا تبدیلی نہیں ہوسکتی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○﴾

”بے شک ہم ہی نے یہ ذکر (قرآن) نازل کیا اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔“ [2]

بالفرض مذکورہ قصہ صحیح تسلیم کیا جائے تو قرآن کریم میں مذکورہ کلمات کا اضافہ لازم آتا ہے اور یہ صریح نص کے خلاف ہے اور اس طرح قرآن کریم غیر محفوظ ٹھہرتا ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی انسان ایمان میں سچا اور اللہ کریم پر بھروسا کرنے والا نہیں ہوسکتا اور خاص طور پر خاتم الانبیاء ﷺ کا معیار ایمان و توکل سب سے بلند ہے اور ابلیس نے تو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں پر اپنے غلبے کی نفی کی ہے۔ ابلیس نے کہا:

---

[1] الحآقّة 69:44-46۔ [2] الحجر 15:9۔

﴿ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ○ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ○ ﴾

”تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو ضرور گمراہ کروں گا، سوائے تیرے ان بندوں کے جو ان میں سے مخلص و برگزیدہ ہوں۔“[1]

انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ برگزیدہ اور مخلص بندے ہوتے ہیں اور ہمارے پیغمبر آخر الزمان تو سب سے زیادہ برگزیدہ اور مخلص ہیں۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”قصۂ غرانیق کو کسی مفسر یا محدث نے متصل سند کے ساتھ بیان نہیں کیا اور نہ ہی اسے کسی نے صحابی کی طرف سے مرفوع بیان کیا ہے، سوائے امام بزار کی روایت کے اور وہ بھی ضعف سے خالی نہیں۔“[2]

اور ابن حجر رحمہ اللہ کی رائے کی مطابق مذکورہ بالا قصے کے سبب مشرکین کے سجدہ کرنے میں کوئی عقلی اور نقلی صداقت نہیں۔[3]

ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بہت سے مفسرین قصۂ غرانیق کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مہاجرین حبشہ قریش مکہ کو مسلمان خیال کرتے ہوئے مکہ واپس آ گئے، حالانکہ اس تمام قصے کی ایک بھی سند صحیح نہیں اور جتنے بھی طُرق ملتے ہیں سب مُرسَل ہیں۔[4]

عقلی اعتبار سے قصے کا باطل ہونا: عقلی اعتبار سے اجماع امت سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ اس قسم کے الفاظ نہیں کہہ سکتے کیونکہ آپ ﷺ کا خلاف حقیقت بات کرنا محال ہے، لہٰذا مذکورہ قصہ بے بنیاد ہے اور آپ ﷺ سے اس قسم کے الفاظ کا صادر ہونا ناممکن ہے۔ اگر بالفرض آپ ﷺ نے عمداً یا سہواً اللہ کے کلام میں اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے تو عصمت انبیاء باقی نہیں رہتی اور یہ قصہ عقیدۂ توحید، جو کہ بعثت انبیاء کا بنیادی مقصد ہے، کے بھی خلاف ہے۔

---

[1] صٓ 38:82,83. [2] الشفا للقاضي عياض: 117/2. [3] فتح الباري، شرح الحديث: 4862.

[4] تفسير ابن كثير: 600/6، وما بعدها.

لغوی اعتبار سے قصے کا باطل ہونا: لغوی اعتبار سے ''غرنوق'' کا لفظ ایک آبی پرندے پر بولا جاتا ہے جو سفید یا کالا ہوتا ہے۔ اسی طرح سفید رنگت والے خوبصورت نوجوان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عرب نے کبھی اپنے کلام، شعر یا نثر میں اس لفظ کو اپنے معبودوں کے لیے استعمال نہیں کیا۔[1]

اور فصیح کلام کو مدنظر رکھتے ہوئے غرانیق اور معبودان باطلہ کے درمیان کوئی وصف مشترک نہیں پایا جاتا تو کس طرح ممکن ہے کہ کفار ان کلمات کو سن کر خوش ہوئے ہوں گے اور اسے اپنے خداؤں کا ذکر خیر سمجھتے ہوں گے۔[2]

نتیجہ یہ نکلا کہ یہ قصہ من گھڑت ہے جسے بے دین لوگوں نے مسلمانوں کے عقیدہ اور دین کو گدلا کرنے اور سید الانبیاء کی سیرت طیبہ کو داغدار کرنے کے لیے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے، نیز قرآن کریم اور عقلی اور لغوی دلائل بھی اس کی تردید کرتے ہیں۔[3]

مہاجرینِ حبشہ کی واپسی کے حقیقی اسباب: ہجرت حبشہ کے بعد تقریباً تین ماہ کا عرصہ گزرا تھا کہ مکہ کے مسلمانوں کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہوئی اور ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ مسلمانوں میں دعوتِ اسلامی پروان چڑھنے کی امید پیدا ہوگئی۔ ہوا یہ کہ اس دوران میں پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہوگئے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ وہ اپنے بھتیجے کے دفاع کی خاطر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے ان کا سینہ کھول دیا اور خالص اور پکے مسلمان بن گئے۔ وہ قریش میں سب سے زیادہ طاقتور نوجوان اور دادرسی کرنے والے تھے۔ ان کے اسلام لاتے ہی قریش نے سمجھ لیا کہ اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم طاقتور اور مضبوط ہوچکے ہیں اور ان کا چچا ان کا دفاع کرسکتا ہے، اس لیے انھوں نے حتی المقدور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی سے ہاتھ کھینچ لیا۔[4]

---

[1] القاموس المحيط: 281/3 مادة الغرنوق۔ [2] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 299,298۔ [3] السيرة النبوية لأبي شهبة: 372/1۔ [4] مختصر سيرة الرسول ﷺ لمحمد بن عبد الوهاب، ص: 90.

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی مسلمان ہو گئے۔ عمر رضی اللہ عنہ بھی داد رسی کے وصف میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ یوں مسلمانوں کو حمزہ اور عمر رضی اللہ عنہما کی معیت اور تحفظ کا احساس ہوا اور قریش پر قدرے غلبہ حاصل ہو گیا۔[1]

مذکورہ بالا دو عظیم ہستیوں کے اسلام لانے کے واقعات ہجرت حبشہ کے بعد پیش آئے۔ ان کا اسلام مسلمانوں کے لیے باعث شرف اور مشرکین کے خلاف غلبے کا سبب بنا اور رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو کھلے عام اپنے عقیدے کے اظہار کا موقع ملا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ’’عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا فتح، ان کی ہجرت مدد اور ان کی خلافت امت کے لیے رحمت ثابت ہوئی۔ ہم مکہ میں بیت اللہ کے پاس نماز نہیں پڑھ سکتے تھے لیکن جب عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو وہ قریش سے ٹکرا گئے یہاں تک کہ ہم سب نے ان کے ساتھ مسجد حرام میں نماز ادا کی۔‘‘[2]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو انھوں نے پوچھا: ’’قریش میں سب سے زیادہ بات کی تشہیر کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟‘‘ جواب ملا کہ جمیل بن مَعمر جُمَحِی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے پاس پہنچے، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بھی پیچھے پیچھے گیا تاکہ دیکھوں وہ کیا کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جمیل سے کہنے لگے: ’’کیا تجھے علم ہوا کہ میں مسلمان ہوں اور محمد ﷺ کا دین اختیار کر چکا ہوں۔‘‘ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس نے کوئی جواب نہ دیا، جلدی سے اٹھا اور چل دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے پیچھے اور میں اپنے والد کے پیچھے جا رہا تھا۔ اچانک وہ مسجد الحرام کے دروازے کے قریب کھڑا ہو کر کعبے کے اردگرد بیٹھے قریش سے مخاطب ہوا کہ ابن خطاب بے دین ہو چکا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قریش سے بولے: ’’یہ جھوٹ بولتا ہے۔ میں تو مسلمان ہوا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام:294/1. [2] السيرة النبوية لابن هشام:365/1.

بندے اور رسول ہیں۔" قریش مکہ نے یہ الفاظ سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ کر دیا، پھر مسلسل لڑائی جاری رہی اور سورج کافی بلندی پر پہنچ گیا۔ حتی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھک کے بیٹھ گئے اور اپنے قریب کھڑے لوگوں سے کہنے لگے: "جو تمھارے جی میں آئے کر گزرو، میں اللہ کی قسم اٹھاتا ہوں کہ اگر ہم تین سو افراد ہوتے تو ہم مکہ میں رہتے یا تم۔"[1]

اب مسلمانوں کی حیثیت وہ نہ رہی تھی جو ہجرت حبشہ سے پہلے تھی۔ سیدنا حمزہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کے اسلام لانے سے وہ محفوظ ہو چکے تھے۔ پہلے وہ مسجد حرام میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے، اب وہ دار ارقم سے علی الاعلان نکلتے اور مسجد حرام میں بیت اللہ کے سامنے نماز ادا کرتے اور قریش مکہ انھیں ناقابل برداشت تکالیف دینے سے بھی رک گئے جو ان دونوں کے اسلام لانے سے پہلے وہ مسلمانوں پر روا رکھتے تھے۔ اب مسلمان صاحب حیثیت ہو گئے تھے، حالات یکسر بدل گئے تھے اور بہتری کی طرف مائل تھے۔ یہ تمام حالات مہاجرینِ حبشہ سے کیسے مخفی رہ سکتے تھے؟ مکہ میں مسلمانوں کی زندگی میں پیش آنے والی تبدیلیاں ضرور ان تک پہنچی ہوں گی اور ہوسکتا ہے کہ ان ملاحوں کے ذریعے، جو اکثر جدہ کی بندرگاہ[2] سے گزرتے تھے، یہ خبریں مہاجرین تک پہنچی ہوں۔

بلاشبہ ایسا ہی ہوا کہ مہاجرین بہت خوش ہوئے اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ طبعی تقاضوں کے مطابق انھیں اپنے وطن واپسی کا شوق چرایا، اپنے وطن عزیز ام القریٰ (مکہ) کی طرف پلٹنے کو دل چاہا اور وہاں ان کے خاندان اور قبیلے کے لوگ بھی تو تھے۔ یوں نئے حالات کے پیش نظر وہ مکہ لوٹ آئے، نیز حرم مکہ اور بیت اللہ کو دیکھنے کی بے قراری بھی

---

[1] سبل الهدىٰ والرشاد للصالحي: 499,498/2. [2] ہجرت حبشہ کے زمانے میں اہل مکہ بحری سفر کے لیے شعیبہ کی بندرگاہ استعمال کرتے تھے جو مکہ سے جنوب مغرب میں تقریباً 100 کلومیٹر دور بحیرۂ قلزم کے ساحل پر واقع ہے۔ اور یہ جدہ سے تقریباً اتنے ہی فاصلے پر جنوب میں واقع ہے۔ تب جدہ نے بطور بندرگاہ ابھی ترقی نہ کی تھی۔ (اٹلس سیرت نبوی مطبوعہ دارالسلام، ص:119)

واپسی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔[1]

گویا مہاجرین کی واپسی کا اصل سبب سیدنا حمزہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کا اسلام لانا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب مسلمان طاقتور ہوں گے اور اسلام کی شان و شوکت مضبوط ہوگی لیکن دوسری طرف قریش نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے نئی تدابیر اختیار کیں جن میں ایک طرف مکر و فریب اور دوسری طرف سختی اور تعصب شامل تھے۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو ڈرانے کے لیے اقتصادی بائیکاٹ کا ہتھیار بھی استعمال کیا اور جب مہاجرین حبشہ نے قریش کا یہ سخت رویہ دیکھا تو دوبارہ حبشہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کرلیا اور بہت سے مزید مسلمان ان کے ساتھ ہولیے۔[2]

دوسری ہجرتِ حبشہ

ابن سعد لکھتے ہیں کہ جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حبشہ سے پہلی ہجرت کے بعد مکہ آئے تو ان کی قوم نے ان پر بہت سختیاں کیں، ان کے خاندانوں پر حملے کیے اور سخت تکلیفیں پہنچائیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو دوسری مرتبہ ہجرت حبشہ کا حکم دیا اور یہ دوسری ہجرت مہاجرین کے لیے پہلے سے زیادہ باعث مشقت ثابت ہوئی۔ نجاشی کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ حسن سلوک قریش پر بہت گراں گزرا تھا، لہٰذا ان کے عناد اور ایذا رسانی میں اضافہ ہوگیا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! ہم دوسری دفعہ حبشہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں اور آپ ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَنْتُمْ مُهَاجِرُونَ إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى وَإِلَيَّ، لَكُمْ هَاتَانِ الْهِجْرَتَانِ جَمِيعًا»

---

[1] تأملات في سيرة الرسول ﷺ لمحمد سيد الوكيل، ص: 59، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 302. [2] القول المبين في سيرة سيدالمرسلين ﷺ للدكتور محمد النجار، ص: 111، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 302.

"تم اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے والے ہو۔ تمھارے لیے ان دونوں ہجرتوں کا ثواب ہے۔"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے: "اے اللہ کے رسول! ہم مطمئن ہیں۔"[1]

اس ہجرت میں پہلے سے زیادہ لوگ شامل تھے۔ ابن اسحاق اور دیگر کی رائے کے مطابق ان کی تعداد تراسی (83) تھی اور اگر عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو شامل نہ کیا جائے تو تعداد بیاسی (82) ہوگی۔ سیرت نگاروں کے مطابق عورتوں کی تعداد اٹھارہ (18) تھی، علامہ سہیلی، واقدی اور ابن عقبہ کی بھی یہی رائے ہے۔ ان عورتوں میں گیارہ قریشی اور سات دیگر قبائل سے تھیں اور یہ مذکورہ تعداد ان بچوں کے علاوہ ہے جو ان کے ساتھ گئے یا ارض حبشہ میں پیدا ہوئے۔[2]

مہاجرین حبشہ کی واپسی کے لیے قریش کی کوشش

قریش نے دیکھا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سرزمین حبشہ میں امن وسکون سے رہ رہے ہیں۔ وہاں انھیں بہترین گھر، مستقل مرکز اور شاہ حبشہ نجاشی کا حسن سلوک حاصل ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، جبکہ وہاں انھیں کوئی تکلیف دینے والا نہیں۔ اس پر انھوں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی واپسی کے لیے نجاشی کے پاس ایک وفد بھیج کر اسے مسلمانوں سے بدگمان کیا جائے لیکن اس وفد کا مسلمانوں کو وہ فائدہ پہنچا جو ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور نجاشی کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے کفار کی تدبیریں خاک میں مل گئیں، نجاشی کے اسلام کا انکشاف ہوا اور مہاجرین پہلے سے زیادہ محفوظ ہو گئے۔[3]

---

[1] سبل الهدىٰ والرشاد للصالحي: 389/2، والطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 207/1، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 303. [2] الروض الأنف للسهيلي: 228/3، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 303. [3] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 304.

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ہم سرزمین حبشہ میں پہنچے تو نجاشی کے حسن سلوک سے ہمارا دین محفوظ ہوا، ہم وہاں بغیر کسی پریشانی کے اللہ کی عبادت کرتے تھے اور کوئی ناپسندیدہ بات سننے کو نہ ملتی تھی۔ جب قریش کو ہمارے حالات کا علم ہوا تو انھوں نے دو قوی اور باصلاحیت لوگوں کو نجاشی کی طرف بھیجنے کا فیصلہ کیا جو مکہ کے پسندیدہ تحائف خاص طور پر رنگا ہوا چمڑا ساتھ لے جائیں تاکہ بادشاہ اور اس کے پادریوں کو تحائف پیش کیے جاسکیں، چنانچہ دو آدمی عبداللہ بن ابی ربیعہ مخزومی اور عمرو بن عاص بن وائل سہمی رضی اللہ عنہ (جو اس وقت مسلمان نہیں تھے) خصوصی ہدایات کے ساتھ روانہ کیے گئے کہ پہلے ہر پادری اور پھر نجاشی کو تحائف پیش کیے جائیں اور اس کے بعد مہاجرین کی واپسی کا مطالبہ کیا جائے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب قریش کے نمائندے وہاں پہنچے تو پروگرام کے مطابق سب سے پہلے ہر پادری کو تحفہ پیش کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ ہمارے کچھ ناسمجھ لڑکے بے دین ہو کر یہاں پناہ گزیں ہوئے ہیں وہ ہمارے دین کو تسلیم کرتے ہیں نہ آپ کے مذہب میں داخل ہیں بلکہ ہم اور آپ میں سے کوئی بھی اس دین کو نہیں پہچانتا۔ ہمیں ان کے آباء واجداد اور بڑوں نے، جو اشراف قوم ہیں، انھیں واپس لانے کے لیے بھیجا ہے۔ جب ہم بادشاہ سے گفتگو کریں تو آپ براہِ کرم ان کی واپسی کی سفارش کر دیں۔ نجاشی کے پادریوں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ ایسا ہی ہوگا۔

جب بادشاہ کو تحائف پیش کیے گئے اور قبول بھی کر لیے گئے تو نمائندۂ قریش یوں گویا ہوا: ''اے بادشاہ! ہمارے کچھ ناسمجھ نوجوان بے دین ہو کر آپ کے ہاں چلے آئے ہیں۔ نہ وہ اپنے بڑوں کے دین پر قائم رہے نہ آپ کے دین میں داخل ہوئے، بلکہ ایک نیا دین و مذہب اختیار کر چکے ہیں۔ ہمیں ان کے آباء اجداد اور بڑوں نے، جو اشراف قوم سمجھے جاتے ہیں، انھیں واپس لانے کے لیے بھیجا ہے اور ظاہر ہے وہی ان کے بارے میں بہتر جانتے ہیں۔''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عبد اللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو بن عاص کو سب سے زیادہ خطرہ اس بات کا تھا کہ کہیں نجاشی مسلمانوں کی باتیں (دلائل) نہ سننے لگ جائے۔ وعدے کے مطابق پادریوں نے ان نمائندگان کی سفارش بھی کردی اور ان کی بات کی تصدیق بھی کی لیکن نجاشی برہم ہوکر بولا: ''اللہ کی قسم! ایسے لوگ جنھوں نے ساری دنیا نظرانداز کر کے میرے پاس پناہ حاصل کی، میں انھیں واپس نہیں کروں گا اور نہ ان کے خلاف کوئی تدبیر کامیاب ہونے دوں گا۔ ہاں، ان سے گفتگو کے بعد فیصلہ ہوگا۔ اگر یہ نمائندگان سچے ہوئے تو انھیں واپس کردوں گا، وگرنہ میں خود ان مہاجرین کا دفاع کروں گا اور وہ جب تک چاہیں میرے ملک میں رہ سکتے ہیں۔''[1]

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور نجاشی کے درمیان گفتگو

نجاشی نے اصحابِ رسول کی طرف دربار میں حاضری کا پیغام بھیجا تو سب آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ وہاں کون سی بات کی جائے۔ آخر متفقہ فیصلہ ہوا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے ہم وہی بات کریں گے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور ہمیں اس کی تعلیم دی۔ دوسری طرف نجاشی نے علمائے نصاریٰ کو بلا رکھا تھا۔ انھوں نے اناجیل اپنے سامنے کھول رکھی تھیں۔ جب وہاں مہاجرین سے سوال کیا گیا: ''یہ کیسا دین ہے جس کی بدولت تم نے اپنی قوم کو خیرباد کہہ دیا، اسی طرح تم ہمارے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے اور نہ ہی تمھارا دین یہاں کے کسی دوسرے مذہب سے میل کھاتا ہے؟''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہمارے نمائندے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے، انھوں نے کہا: ''اے بادشاہ! ہم فرسودہ خیالات کی حامل قوم تھے، بتوں کی عبادت کرتے، مردار کھاتے اور بے حیائی کے کاموں میں ملوث تھے۔ قطع رحمی اور پڑوسیوں سے بدسلوکی ہمارا شعار تھا اور ہم جنگل کا قانون مانتے تھے۔ طاقتور کمزور کو ہڑپ کر جاتا تھا، پھر

---

[1] مسند أحمد: 290/5.

اللہ تعالیٰ نے ہمارے پاس ایسا رسول بھیجا جس کے حسب ونسب، صداقت، امانت اور پاکدامنی سے ہم واقف تھے۔ اس نے ہمیں غیر اللہ، یعنی پتھر اور بتوں کی عبادت سے روک کر ایک اللہ کی عبادت کا راستہ دکھایا۔ ہمیں سچ بولنے، امانت ادا کرنے، صلہ رحمی اور پڑوسیوں سے حسن سلوک کا حکم دیا اور ناحق قتل اور دیگر حرام کاموں سے روکا۔ بے حیائی، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے منع فرمایا۔ اس نے ہمیں صرف ایک اللہ کی عبادت کرنے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانے کا حکم دیا اور نماز ادا کرنے، روزہ رکھنے اور زکاۃ ادا کرنے کی تلقین کی۔‘‘

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے بادشاہ کے سامنے اسلامی تعلیمات پیش کرتے ہوئے کہا: ’’ہم نے اس نبی کی تصدیق کی، اس پر ایمان لائے اور اس کے لائے ہوئے دین کی پیروی کی۔ اب ہم صرف ایک اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اس کی حرام کردہ چیزوں سے بچتے ہیں اور اس کی حلال کردہ چیزوں کو حلال سمجھتے ہیں۔ لیکن ہماری قوم ہماری دشمن بن گئی۔ اس نے ہمیں تکلیفیں دیں، ہمیں اس دین سے برگشتہ کرنے کے لیے آزمائش میں ڈالا تاکہ ہم اللہ کی عبادت چھوڑ کر دوبارہ بتوں کی عبادت کرنے لگیں اور وہی گندے کام کریں جو پہلے کیا کرتے تھے۔ جب انھوں نے ہم پر ظلم وستم کی انتہا کردی اور اتنی سختی کی کہ ہمارے دین کی راہ میں حائل ہونے لگے تو ہم نے آپ کے شہر میں پناہ حاصل کی، آپ کے سوا کسی پر اعتبار نہیں کیا۔ اے بادشاہ! اب ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ظلم نہیں ہوگا۔‘‘[1]

ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس کے بعد نجاشی نے جعفر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ’’کیا تمھارے پاس تمھارے پیغمبر پر اللہ کی طرف سے نازل شدہ کوئی چیز ہے؟‘‘ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ’’ہاں۔‘‘ نجاشی نے سننے کی خواہش ظاہر کی تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورۂ مریم کی

---

[1] مسند أحمد: 203,202/1.

ابتدائی آیات تلاوت فرمائیں جس کے نتیجے میں نجاشی اتنا رویا کہ اس کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی اور علمائے نصاریٰ بھی رونے لگے حتی کہ ان کی انجیلیں بھی تر ہوگئیں، پھر نجاشی کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! یہ کلام اور جسے موسیٰ لائے تھے ایک ہی مشعل کی کرنیں ہیں۔ اے قریش کے نمائندگان! تم واپس چلے جاؤ۔ نہ تو میں انھیں واپس کروں گا اور نہ ان کے خلاف کوئی تدبیر کامیاب ہونے دوں گا۔''[1]

نجاشی اور مہاجرین کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کی ایک اور سازش

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''جب عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ نجاشی کے دربار سے باہر آئے تو عمرو بن عاص کہنے لگا: ''کل میں ان مہاجرین کے خلاف ایسا حربہ استعمال کروں گا جو ان کی بیخ کنی کر دے گا۔'' عبداللہ جو قدرے ہمارے حق میں تھا، اس نے کہا: ''ایسا نہ کرنا۔ اگرچہ وہ ہمارے مخالف ہیں، پھر بھی ہمارے رشتہ دار تو ہیں۔''

عمرو کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! میں نجاشی کو ضرور بتاؤں گا کہ یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کو بشر مانتے ہیں، پھر جب اگلا دن آیا تو عمرو بن عاص نے بادشاہ کو بتایا کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ کے بارے میں ناروا عقیدہ رکھتے ہیں۔ آپ انھیں بلا بھیجیں اور ان سے پوچھیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں۔ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نجاشی نے انھیں بلا بھیجا، وہ ان سے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا۔ ہمیں اس سے پہلے ایسی صورت حال سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا، چنانچہ سب اکٹھے ہوئے اور باہم مشورہ کیا کہ جب بادشاہ نے تم سے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق پوچھا تو تم کیا کہو گے۔ سب نے اللہ کی قسم کھا کر کہا: ''ہم ان کے بارے میں وہی کہیں گے جو اللہ نے فرمایا ہے اور جو ہمارے نبی پر اترا ہے'' پھر ایسا ہی ہوا۔ جب نجاشی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''ہمارا نظریہ ان کے بارے میں وہی ہے جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

---

[1] مسند أحمد: 1/ 203,202.

وہ اللہ کے بندے، اس کے رسول اور اس کی پاکیزہ روح اور اس کا ایسا کلمہ ہیں جو اللہ نے پاکدامن کنواری مریم کی طرف القا کیا۔''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''نجاشی اپنا ہاتھ نیچے لے گیا، اس نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا: ''عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں تمھارا جو عقیدہ ہے اس میں اس تنکے کے برابر بھی فرق نہیں۔'' نجاشی کی اس بات پر اس کے پادریوں نے غصے اور نفرت کا اظہار کیا، تاہم بادشاہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! تم چاہے ناراض ہو جاؤ، میں یہی درست سمجھتا ہوں۔'' پھر وہ ہماری طرف متوجہ ہوا اور بولا: ''تم میری سرزمین میں امن سے رہو گے۔ تمھیں برا بھلا کہنے والا ہر بار نقصان اٹھائے گا۔ کوئی مجھے تمھارے بدلے میں سونے کا ڈھیر بھی دے دے تو قبول نہیں کروں گا اور میری طرف سے کسی کو کوئی تکلیف نہ ہوگی'' پھر اس نے اپنے اہلکاروں سے کہا کہ ان دونوں (نمائندگان قریش) کے تحائف واپس کر دو ہمیں ان کی ضرورت نہیں۔ جب اللہ نے مجھے بادشاہت دی تھی تو کوئی رشوت نہ لی تھی، اس لیے میں بھی کوئی رشوت قبول نہیں کروں گا جو میرے خیر خواہ ہیں میں ان کا خیر خواہ رہوں گا۔''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ دونوں قریشی بڑے بے آبرو ہو کر وہاں سے نکلے ان کے تحفے بھی واپس کر دیے گئے اور ہمیں نجاشی کے ہاں اچھا ٹھکانا اور اچھا پڑوس میسر آ گیا۔[1]

نجاشی کا اسلام لانا

بلاشبہ نجاشی مسلمان ہو گیا تھا اور اس نے نبی ﷺ کی نبوت کو درست تسلیم کر لیا تھا، تاہم جب اپنی قوم کو باطل پرست، گمراہی کی حریص اور عقل و نقل کے صریحًا خلاف اور غلط نظریات پر قائم پایا تو اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا۔[2] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب نجاشی فوت ہوا تو نبی ﷺ نے ہمیں اس کی خبر دی، اپنے اصحاب کو لے کر جنازہ گاہ میں آئے، صفیں درست کیں اور چار تکبیرات سے جنازہ پڑھایا۔[3]

---

[1] مسند أحمد: 203/1. [2] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 309.

[3] صحيح البخاري، حديث: 1333، و صحيح مسلم، حديث: 951.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب نجاشی فوت ہوا تو نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَاتَ الْيَوْمَ رَجُلٌ صَالِحٌ، فَقُومُوا فَصَلُّوا عَلٰى أَخِيكُمْ أَصْحَمَةَ»

’’آج ایک نیک آدمی انتقال کر گیا ہے۔ تم سب اپنے بھائی اصحمہ کی نماز جنازہ ادا کرو۔‘‘ [1]

نجاشی کی وفات اکثر مورخین کے نزدیک 9 ہجری کو ہوئی اور ایک قول 8 ہجری قبل از فتح مکہ بھی ہے۔ [2]

درس و عبرت: ① مومن اگر شر پسندوں کی طرف سے ظلم اور تکلیف سہنے کے باوجود اپنے دین پر قائم رہیں تو یہ ان کے ایمان کی سچائی، عقیدے کے اخلاص اور قلب و روح کی بلندی کی علامت ہے۔ ان کا ضمیر، عقل اور دل مطمئن رہتا ہے کیونکہ انھیں پہنچنے والی تکالیف، محرومیاں اور ظلم سہنے کے مقابلے میں جو چیز ملتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور جیت ہمیشہ اللہ کے نیک بندوں اور مخلص طلبگاروں کی ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ روحانی جیت کو جسمانی کامیابی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اپنی روحانی ترجیحات کو جسمانی ترجیحات پر فوقیت دیتے ہیں۔ اسلامی تحریکیں اسی جذبے سے کامیاب ہوتی ہیں اور لوگ جہالت اور اندھیروں سے چھٹکارا پاتے ہیں۔ [3]

② ہجرت حبشہ سے نبی ﷺ کا اپنے اصحاب کے لیے شفقت و مہربانی کا جذبہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ آپ ﷺ کا اپنے اصحاب کے لیے کوئی جائے امن تلاش کرنا اس کا بین ثبوت ہے۔ اسی جذبے کے تحت آپ ﷺ نے ایک عادل بادشاہ کے ملک کی طرف ہجرت کرنے کا مشورہ دیا جہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا تھا اور ایسا ہی ہوا کہ حبشہ میں مسلمانوں

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3877. [2] أسد الغابة لابن الأثير: 99/1، و الإصابة لابن حجر: 109/1.

[3] السيرة النبوية للدكتور مصطفٰى السباعي، ص: 57.

کا دین محفوظ ہو گیا اور انھیں بہترین ٹھکانا میسر آیا۔[1]

اگر بنظر عمیق دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نبی ﷺ ہی نے صحابۂ کرام کی توجہ حبشہ کی طرف مبذول کرائی اور ایک پرامن سرزمین ان کے اور ان کی دعوت کے لیے منتخب فرمائی تاکہ حاملین دعوت تباہ ہونے سے بچ جائیں۔ اس سے ہر دور کے مسلمان قائدین کے لیے یہ رہنما اصول اخذ کیا جاسکتا ہے کہ دعوت اسلامی اور مسلمانوں کے لیے حکمت اور دوراندیشی سے منصوبہ بندی کی جائے اور ایک پرامن سرزمین تلاش کی جائے جو دعوت کے لیے محفوظ مرکز ثابت ہو تاکہ اگر بالفرض بڑے مرکز کو کوئی خطرہ درپیش ہو تو اس عارضی مرکز سے استفادہ کیا جاسکے۔

اصل میں حاملین دعوت ہی اسلام کا سرمایہ ہیں۔ انھی کی بقا اور حمایت کے لیے تمام کوششیں بروئے کار لائی جائیں اور انھیں روحانی ترقی اور امن کا ماحول فراہم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔ اور ایک مسلمان دنیا کے ان تمام انسانوں سے بہتر ہے جو اللہ تعالیٰ کے دین سے خارج اور اس کی توحید سے بے بہرہ ہیں۔[2]

③ ہجرت حبشہ کے متعدد مقاصد تھے۔ نبی ﷺ نے اقدامات طے کیے تاکہ مطلوبہ مقاصد کو حاصل کیا جاسکے، مثلاً: اسلامی نظریے اور اس کے متعلق قریش کے موقف کی تشریح و توضیح اور مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں رائے عامہ کو ہموار کرنا، جیسے آج کل کے صاحب اقتدار لوگ کرتے ہیں کہ پہلے سیاسی تحریک اٹھائی جاتی ہے، پھر اپنا منشور پیش کیا جاتا ہے اور اس کے بعد رائے عامہ کو اپنا ہمنوا بنایا جاتا ہے۔[3]

اس سلسلے میں ایک نئی سرزمین کے دروازے دعوت اسلام کے لیے کھولنے کا مقصد بھی کارفرما تھا، اسی لیے شروع میں عظیم المرتبت صحابہ نے ہجرت فرمائی، پھر دیگر صحابہ ان سے

---

[1] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 312. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 1/333. [3] أضواء على الهجرة لتوفيق محمد سبع، ص: 427.

جا ملے اور دربار نجاشی میں ان کی نمائندگی کا فریضہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو تفویض ہوا۔[1]

④ ہجرت حبشہ میں نبی ﷺ کے چچا کا بیٹا جعفر، داماد عثمان اور بیٹی رقیہ رضی اللہ عنہم مہاجرین کی صف اول میں نظر آتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ کسی بھی تحریک کے سربراہ کے اہل خانہ اور رشتہ دار خطرات کو قبول کرنے میں پیش پیش ہونے چاہئیں۔ اگر قائد تحریک کے خاص آدمی تو محفوظ رہیں اور عامۃ الناس خطرات میں گھرے رہیں تو یہ نبوی طریقہ نہیں۔[2]

⑤ ہجرت حبشہ سے واضح ہوتا ہے کہ اپنا دین بچانے کی خاطر ہجرت کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہے، چاہے چھوڑا جانے والا شہر مکہ ہی کیوں نہ ہو اور جائے ہجرت دارالاسلام بھی نہ ہو۔ حبشہ کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں کے باشندے عیسائی تھے اور عیسیٰ علیہ السلام کے پجاری تھے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو مہاجرین کہلائے اور دونوں ہجرتوں میں حصہ لینے کی وجہ سے قابل تعریف ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾

”اور مہاجرین اور انصار میں سے (قبول اسلام میں) سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنھوں نے احسان کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔“[3]

ایک تفسیر کے مطابق اس آیت کا مصداق بیعت رضوان والے صحابۂ کرام ہیں۔[4]

ایسے لوگوں کی شان کتنی بلند ہے جو اپنے دین کو بچانے اور اپنے رب کی امن و سکون

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 333/1. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 333/1.

[3] التوبة 9:100. [4] تفسير الطبري: 6/11، و تفسير ابن كثير: 331/2.

سے عبادت کرنے کی غرض سے حرم جیسے شہر کو بھی چھوڑ کر دارالکفر کی طرف ہجرت کر گئے اور یہی حکم ہمیشہ ہر اس آدمی کے لیے ہے جس کے شہر میں خلاف شریعت کام ہو رہے ہوں، مومن کو اختیارِ حق پر تکالیف کا سامنا ہو، باطل زبردستی حق کو دبا رہا ہو اور مومن کو کوئی ایسی سرزمین نظر آئے جہاں وہ اپنے دین پر قائم رہ سکے، اپنے رب کی عبادت کر سکے تو پھر چاہے دارالکفر ہی کیوں نہ ہو اسے اس سرزمین کی طرف ضرور ہجرت کرنی چاہیے۔ یہی وہ ہجرت ہے جو قیامت تک جاری وساری رہے گی۔[1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○﴾

”اور مشرق و مغرب اللہ ہی کے لیے ہیں، لہٰذا تم جس طرف بھی منہ کرو گے وہیں ہے اللہ کا چہرہ، بے شک اللہ وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔“[2]

⑥ مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ حالات کے پیش نظر غیر مسلموں کی پناہ حاصل کر لیں، چاہے پناہ دینے والے عیسائی ہوں جیسا کہ نجاشی تھا۔ بعد میں وہ مسلمان ہوا۔ اور چاہے پناہ دینے والے مشرک ہی کیوں نہ ہوں جیسے پہلی ہجرت حبشہ سے واپس آکر مسلمانوں نے مشرکین مکہ کی پناہ حاصل کی۔ نبی ﷺ ابو طالب اور مطعم بن عدی کی پناہ میں رہے۔[3]

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ غیر مسلم کی پناہ صرف اس صورت میں جائز ہے جب اسلامی دعوت کو نقصان نہ پہنچتا ہو، دین کے کسی حکم میں تبدیلی یا کسی حرام کردہ امر پر خاموشی لازم نہ آئے۔ بصورت دیگر مسلمانوں کے لیے ہرگز جائز نہیں کہ غیر مسلم کی پناہ لیں۔ اس کا ثبوت نبی ﷺ کا اپنے چچا کے سامنے دوٹوک الفاظ میں قریش کی باتوں کا انکار ہے۔ جبکہ ابوطالب نے کہا تھا: ”آپ اپنی جان کی حفاظت کیجیے اور مجھ پر میری استطاعت

---

[1] الروض الأنف للسهيلي: 92/2، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 312. [2] البقرة 115:2. [3] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 316.

سے زیادہ بوجھ نہ ڈالیے۔ مشرکین کے معبودوں کو برا کہنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔'' اس پر آپ اپنے چچا کی پناہ سے نکلنے کے لیے تیار ہو گئے اور آپ ﷺ نے دینِ حق کو کھول کھول کر بیان کرنے کی ذمہ داری ترک کرنے سے انکار کر دیا۔[1]

⑦ نبی ﷺ کا سرزمین حبشہ کو ہجرت کے لیے منتخب کرنا ایک اہم دفاعی نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کی اپنے اردگرد کے شہر اور ممالک پر گہری نظر تھی۔ آپ ہر اچھی اور بری سرزمین، عادل اور ظالم حکمران کی پہچان رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ نے ہجرت کے لیے ایک دارالامن کو آسانی سے منتخب کر لیا اور ایک رہنما کے لیے یہ ضروری بھی ہے کہ وہ اپنے اردگرد پر نظر رکھے، قوموں اور حکومتوں کے احوال اور طور اطوار سے آگاہ رہے۔[2]

⑧ ہجرت حبشہ سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ تمام چلنے والی تحریکات حتی المقدور دشمن سے پوشیدہ رکھی جائیں تاکہ تحریک اور اس کے منشور کو نقصان نہ پہنچ سکے۔ پہلی ہجرت حبشہ میں آہستہ اور خفیہ انداز سے روانگی ہوئی تاکہ قریش کو علم نہ ہو، چھوٹے پیمانے پر صرف سولہ افراد کا ہجرت کرنا تاکہ اس مختصر قافلے کے کوچ پر کسی کی توجہ مبذول نہ ہو جبکہ وقت کے تقاضے کے مطابق تیزی سے سفر کرنا اسی اصول کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

حبشہ کا رخ کرنے والے مہاجرین سوچ رہے تھے کہ کسی بھی وقت ان کا پیچھا کیا جا سکتا ہے اور شاید ان کی راز داری کا پردہ فاش ہونے پر دشمن انھیں آلے گا لیکن قریش کو اس ہجرت کا علم تاخیر سے ہوا۔ اس وقت انھوں نے مہاجرین کا پیچھا کیا لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ جب وہ ساحل سمندر پر پہنچے تو وہاں کسی کو نہ پایا۔ معلوم ہوا کہ مومن کو وقت کے تقاضے کے مطابق اپنی دعوتی تحریک کو بچانے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنی

---

[1] فقه السيرة للبوطي، ص: 126، و الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 317.

[2] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 101.

چاہئیں تا کہ دشمن ان کے رازوں کو جان سکے نہ دعوت کو نقصان پہنچا سکے۔[1]

⑨ ہجرت حبشہ سے ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ ہمیں دشمن کے پروگراموں سے آگاہ رہنا چاہیے۔ اپنے دشمن کو کمزور سمجھنے کے بجائے ان کی طاقت کا صحیح اندازہ لگائیں تا کہ ان کی شاطرانہ چالوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔

مسلمانوں کی ہجرت حبشہ پر قریش کسی طور پر خوش نہ تھے اور وہ محسوس کر رہے تھے کہ مستقبل میں ان کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسلامی تحریک حبشہ میں پھلنے پھولنے لگے اور ان کے لیے خطرہ بن کے ابھرے، لہٰذا انھوں نے ایک ٹھوس منصوبہ بندی کے تحت مسلمانوں کو واپس لانے اور انھیں اس نئے دعوتی مرکز سے محروم کرنے کی کوشش کی۔ مکی سرداروں کی تیار کردہ اسکیم یہ تھی کہ نجاشی اور اس کے پادریوں کو تحائف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں سفارتی مہارت سے متاثر کیا جائے، چنانچہ سفارتی وفد کی قیادت ذہین ترین سفیر عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) کو سونپی گئی جو بہت سمجھدار اور نجاشی کے دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔[2]

⑩ قریش نے پوری سمجھ داری سے پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ نجاشی ایک نیک دل انسان تھا جس نے مسلمانوں کا موقف سننے سے پہلے انھیں قریش کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اس طرح مسلمانوں کو اپنا جائز موقف اور دین قیم کی تعلیمات نجاشی کے سامنے پیش کرنے کا موقع میسر آیا۔

⑪ جس امر کا فیصلہ شورائی طریقے سے کیا جائے اس کی کامیابی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس جب نجاشی کا ایلچی انھیں طلب کرنے آیا تو انھوں نے آپس میں مشورہ کر کے ایک متفقہ موقف طے کیا، چنانچہ ایسا فیصلہ کامیابی کا ضامن ہوتا ہے کیونکہ اس میں ایک سے زیادہ آراء شامل ہوتی ہیں۔

---

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 101. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 317/1.

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ہر حالت میں اسلام کے احکامات اسی طرح پیش کرنے کا عزم کیا جس طرح نبی ﷺ سے حاصل کیے تھے۔ انھوں نے اختلاف کا شکار ہونے کے بجائے ایک متفقہ موقف اختیار کیا اور یہ طے کیا کہ وہ عزت و وقار کے ساتھ اسلام کو اسی طرح پیش کریں گے جس طرح رسول اللہ ﷺ اسے لائے، خواہ اس میں ہلاک ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ اس سے ہمیں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عظیم الشان تربیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔[1]

⑫ ہجرت حبشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ موقع و محل کے مطابق قیادت کا منصب عطا کرتے تھے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو اس ہجرت میں قیادت سونپی گئی اور نجاشی کے دربار میں گفتگو کے لیے بھی متفقہ طور پر انھیں چنا گیا تاکہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جیسے عرب کے انتہائی ہوشیار آدمی کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا انتخاب مندرجہ ذیل امور کی وجہ سے ہوا:

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے قریب ترین رہنے والے آدمی تھے اور انھوں نے نبی ﷺ کے ساتھ ایک ہی گھر میں زندگی بسر کی، لہٰذا وہ تمام مہاجرین میں سے نبی ﷺ اور ان کی دعوتی سرگرمیوں سے زیادہ واقف تھے۔

نجاشی کے سامنے گفتگو کرنے کے لیے فصاحت و بلاغت کی ضرورت تھی اور بنو ہاشم نسب اور فضیلت کے اعتبار سے فوقیت رکھنے والے تھے۔ جعفر رضی اللہ عنہ بنو ہاشم کے گل سر سبد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہاشم کو بنو کنانہ میں سے اور ہمارے پیغمبر ﷺ کو بنو ہاشم میں سے منتخب فرمایا، جو فصیح اللسان اور عالی نسب کے حامل تھے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے چچا زاد تھے، اس لیے نجاشی کے لیے یہ بات قابل اطمینان ہو سکتی تھی کہ وہ آپ ﷺ کے بارے میں قابل اعتماد گفتگو کریں گے۔[2]

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی سیرت و اخلاق میں نبوی کمال نظر آتا ہے، اسی طرح بنو ہاشم کا

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 92/2. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 335/1.

خاندانی جمال بھی ان میں موجود تھا، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«أَشْبَهْتَ خَلْقِي وَ خُلُقِي»

"اے جعفر! تو سیرت وصورت دونوں میں میرے مشابہ ہے۔"[1]

صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے لیے سفارت کے میدان میں ایک نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں وہ تمام صفات پائی جاتی تھیں جو ایک اسلامی سفیر میں ہونی چاہئیں، علم، فصاحت، حسن خلق، صبر، بہادری، دانائی، سیاسی بصیرت اور پرکشش شخصیت![2]

⑬ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جو اس وقت مسلمان نہیں تھے، نہایت ذہین، عقل مند اور حیلہ ساز سمجھے جاتے تھے، انھوں نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے دربار میں پہنچنے سے پہلے ہی اپنے تمام دلائل نجاشی کے سامنے رکھ دیے جو مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھے:

محمد ﷺ کی دعوت سے مکہ کی فضا بھڑک اٹھی ہے اور آپس میں نفرتیں پیدا ہوئی ہیں۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اس وقت اہل مکہ کے سفیر وترجمان تھے۔ نجاشی کے نزدیک وہ ثقہ آدمی تھے، لہٰذا شک کی گنجائش بھی نہ تھی۔

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کے پیروکاروں کے متعلق آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ ہوسکتا ہے یہ آپ کی سلطنت پر قبضہ کرلیں جس طرح کہ انھوں نے مکہ کی فضا خراب کی ہے۔ اگر قریش کی آپ کے ساتھ محبت و دوستی نہ ہوتی تو ہم یہاں آنے کی مشقت نہ اٹھاتے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے الفاظ کچھ اس طرح تھے: "آپ سچ پر مبنی ہماری کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہیں، ہمارے قبائل سے اچھا سلوک کرتے ہیں اور ہمارے تاجر آپ کے پاس امن سے رہتے ہیں، لہٰذا میں بھی آپ کے ساتھ خیر خواہی کرنا چاہتا ہوں اور اس

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 2699، و جامع الترمذي، حديث: 3765. [2] سفراء النبي ﷺ لمحمود شيت خطاب: 2/252-317.

خطرناک فتنے سے آپ کو بچانا چاہتا ہوں۔"

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی گفتگو میں خطرناک ترین پہلو یہ تھا کہ اے شاہ حبشہ! مہاجرین آپ کے عقیدے کا انکار کرتے ہیں۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "الٰہ" نہیں مانتے۔ یہ لوگ ہمارے دین پر ہیں نہ آپ کے مذہب میں داخل ہیں بلکہ ایک نئے دین کے موجد ہیں جو کہ فتنہ ہے۔

مزید یہ بھی کہا گیا کہ یہ لوگ آپ کو حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں، اس لیے آپ کو حسب رواج سجدہ نہیں کیا، لہٰذا یہ آپ کے زیر سایہ رہنے کے مستحق نہیں۔

اس گفتگو سے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے نجاشی اَصْحَمہ کے دل میں مہاجرین کی نفرت اجاگر کرنے کی سعی لا حاصل کی کہ جو لوگ آپ کا احترام نہیں کرتے وہ بھی لائق احترام نہیں ہو سکتے، بہر حال حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے ذمے تھا کہ وہ ان تمام باطل الزامات کا جواب دیں جو سفیر قریش نے ان پر لگائے تھے۔

⑭ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے سوالوں کا جواب انتہائی سمجھداری، سیاسی مہارت اور دعوت و عقیدے سے لبریز گفتگو کے ساتھ پیش کیا جو کہ مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھا:

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جاہلیت کے عیوب اس طرح بیان فرمائے کہ سننے والا متنفر ہو جائے۔ ان کا مقصد نجاشی کے سامنے قریش کی برائی ظاہر کرنا تھا، چنانچہ ان کے ایسے عیوب کا تذکرہ کیا جن کا خاتمہ کوئی نبی ہی کر سکتا تھا۔

پھر انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو اس فاسد اور بری عادات والے معاشرے میں اس انداز سے پیش کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام رذائل سے مُبرّا ہیں، آپ کا حسب و نسب، صداقت، امانت، پاک دامنی سب پر عیاں ہے، لہٰذا آپ مستحق رسالت ٹھہرے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی خوبیاں اور خدوخال بیان فرمائے اور باور کرایا کہ یہی تمام انبیاء کی دعوت رہی ہے۔ تا کہ نجاشی اور اس کے حکّام جو عیسائیت کے حامل تھے، سمجھ

جائیں کہ سیدنا موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے دور ہی سے انبیاء کی دعوت انھی خوبیوں کی حامل رہی ہے۔ اور وہ خوبیاں یہ ہیں: بتوں کی عبادت سے پہلو تہی، سچ بولنا، امانت ادا کرنا، صلہ رحمی، پڑوسی سے حسن سلوک، محارم اور قتل کے ارتکاب سے رکنا، نماز قائم کرنا اور زکاۃ ادا کرنا وغیرہ۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب پر ایمان لے آئے ہیں۔ ہم نے سیرت پیغمبر کو اپنی عملی زندگی میں اختیار کیا ہے اور بت پرستی ترک کردی ہے، لہٰذا قریش ہمارے دشمن بن گئے ہیں۔

انھوں نے نجاشی کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اس کی مناسب حد تک تعریف بھی کی کہ اپنی رعایا میں اس کا عدل بے مثال ہے اور اس کی سلطنت میں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ ان لوگوں کے ظلم و تکالیف سے بچنے کے لیے ہم نے ساری دنیا چھوڑ کر آپ کے پاس پناہ حاصل کی ہے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی طرف سے مندرجہ بالا واضح نکات پیش کرنے پر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی فصاحت کا اثر ختم ہوگیا اور یوں جعفر رضی اللہ عنہ نجاشی اور دربار میں موجود فوجی افسران اور پادریوں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ جب نجاشی نے کتاب اللہ کی آیات سننے کی خواہش ظاہر کی تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے بڑی متانت، عمدگی اور مؤثر لہجے میں سورۂ مریم کی ابتدائی آیات پڑھ کر سنائیں حتی کہ نجاشی اور مذہبی پیشوا سب رونے لگے اور ان کی ڈاڑھیاں اور مذہبی کتابیں بھیگ گئیں۔

مہاجرین کے نمائندے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے دانشمندی سے کام لیتے ہوئے قرآن کی تلاوت کے لیے سورۂ مریم کو چنا کیونکہ اس میں قصۂ مریم و عیسیٰ علیہما السلام بیان کیا گیا ہے۔[1]

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے خدا داد صلاحیت سے کام لیتے ہوئے مناسب وقت پر کھلے دل سے بہتر موضوع گفتگو اختیار کیا اس سے نجاشی کے دل میں ان کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوگیا۔[2]

---

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 106. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 337/1.

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا جواب ان کی دانائی اور فراست پر دلالت کرتا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ ابن مریم کو معبود نہیں مانتے اور نہ جھوٹے لوگوں کی طرح مریم علیہا السلام کی عزت کو پامال کرتے ہیں بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کا کلمہ تھے، جسے اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ اور کنواری مریم علیہا السلام کی طرف القا کیا اور نجاشی کے سامنے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اسلامی عقیدے کی جو تشریح کی اس کے اور نجاشی کے عقیدے میں ایک تنکے کے برابر بھی فرق نہ تھا۔[1]

رہی یہ بات کہ مسلمانوں نے نجاشی کو سجدہ نہ کیا تو حقیقت میں مسلمان کسی کو اللہ کا شریک نہیں سمجھتے اور نہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا جائز ہے۔ ہاں! نجاشی بادشاہ کی انھوں نے تحقیر نہیں بلکہ عزت کی۔ وہ اسے ایسے ہی سلام کہتے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے تھے۔ اہل جنت آپس میں سلام کا جو تحفہ پیش کریں گے وہی تحفہ انھوں نے نجاشی کی خدمت میں پیش کیا۔

آخر کار نجاشی نے مہاجرین کی صداقت جان لی اور خواہش ظاہر کی کہ کاش! وہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو سکے جن کے پاس موسیٰ علیہ السلام پر آنے والا فرشتہ آتا ہے اور آپ کے ساتھیوں کی حمایت سے وہ اللہ کا قرب حاصل کر سکے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو اس نے کہہ دیا کہ قریش کی تجارت، مالی لین دین حتی کہ تمام تعلقات منقطع ہونے کا اسے کوئی خوف نہیں۔[2]

⑮ قریش کو سیاسی، روحانی اور سفارتی محاذ پر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ مسلمانوں کی کامیاب ثابت قدمی، طریق کار اور طے شدہ پروگرام کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔

⑯ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کا موقف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے عین مطابق تھا:

«مَنِ الْتَمَسَ رِضَا اللّٰهِ بِسَخَطِ النَّاسِ كَفَاهُ اللّٰهُ مُؤْنَةَ النَّاسِ، وَ مَنِ الْتَمَسَ رِضَا النَّاسِ بِسَخَطِ اللّٰهِ وَكَلَهُ اللّٰهُ إِلَى النَّاسِ»

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان:342/1. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان:342/1.

> ”جو شخص لوگوں کی ناراضی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرے اسے اللہ تعالیٰ لوگوں کی ضرورتوں سے آزاد کر دیتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے لوگوں کی رضا تلاش کرے اسے اللہ تعالیٰ لوگوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔“ [1]

مہاجرینِ حبشہ نے اللہ تعالیٰ کی رضا کو ترجیح دی باوجودیکہ انھیں عیسائیوں کی ناراضی کا خطرہ تھا اور وہ فی الوقت ان کے محافظ بھی تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے نجاشی کا دل ان کی طرف مائل کر دیا اور اس نے دعوت نبوی کے مطابق شہادت دی، اگرچہ وہ ان کے اس تحریف شدہ عقیدے کے صریحاً خلاف تھی جس پر ان کی بادشاہت قائم تھی اور متعصب عیسائیوں کی جانب سے بادشاہ کے خلاف بغاوت کا خطرہ بھی موجود تھا۔ [2]

⑰ حبشہ میں کچھ عیسائی اپنے درست دین پر قائم تھے لیکن تحریف شدہ دین کے پیروکاروں کے غلبے سے ڈرتے ہوئے وہ اپنا دین چھپاتے تھے، ان میں حبشہ کا حکمران نجاشی بھی تھا۔ وہ اپنی قوم کی دلجوئی کرتا اور اپنی جان اور بادشاہت بچانے کی غرض سے اپنا نظریہ چھپائے رکھتا، جب اس کے لیے آزمائش کا یہ وقت آیا تو اس نے نتائج کی پروا کیے بغیر صرف اپنے رب کو راضی، اپنے ضمیر کو مطمئن اور اللہ کے مومن بندوں کی حمایت کرتے ہوئے اپنا ایمان ظاہر کر دیا اور ایسے لوگ ہی تاریخ میں عظیم لوگ خیال کیے جاتے ہیں۔ [3]

⑱ ہجرت حبشہ سے یہ مسئلہ بھی واضح ہے کہ کسی راجح مصلحت کی خاطر اسلام کے کسی حکم کو نظر انداز کرنا قابل مواخذہ نہیں۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ جہالت کی وجہ سے عذر کا اثبات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب ہجرت مدینہ کے بعد حضر کی نماز سفر سے زیادہ کر دی گئی تو مہاجرینِ حبشہ اور اہل مکہ دو رکعت ہی پڑھتے رہے اور آپ نے انھیں نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا۔ [4]

علامہ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”کوئی مسلمان لاعلمی میں اپنی کسی کوتاہی پر قابل مواخذہ نہیں

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 2414، و صحيح ابن حبان، حديث: 276، و الزهد لابن المبارك، حديث: 66.

[2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 105/2.

[3] التاريخ الإسلامي للحميدي: 106/2.

[4] الفتاوىٰ لابن تيمية: 43/22.

اور حجت قائم ہونے پر ہی گنہگار ٹھہرے گا۔ نبی ﷺ پر واجبات و محرمات کے احکام اترنے کے مہینوں بعد مہاجرین حبشہ تک پہنچے جو مدینہ سے بہت دور تھے، لہٰذا وہ لوگ عدمِ علم کی وجہ سے معذور سمجھے جائیں گے یہاں تک کہ ان کے پاس واضح نص آ جائے۔‘‘[1]

⑲ ہجرت حبشہ کا ایک سبق یہ بھی ہے کہ حسب مقصد کبھی جہاد کا ثواب دوگنا ہو جاتا ہے۔ ہجرت مدینہ ایک جہاد تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین مدینہ کا خصوصی مقام و مرتبہ اور فضیلت بیان فرمائی اور یہ فضیلت مہاجرین حبشہ کو بھی نصیب ہوگئی اگرچہ انھیں ہجرت مدینہ کا شرف فتح خیبر کے بعد حاصل ہوا اور وہ نبی ﷺ سے آ ملے کیونکہ ان کا حبشہ میں اس وقت تک ٹھہرنا ضروری تھا۔ اور یہ دوگنا ثواب رسول اللہ ﷺ سے اصحاب سفینتین، یعنی ہجرت حبشہ والوں کے لیے ثابت ہے۔[2]

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات کی غرض سے آئیں اور وہ مہاجرینِ حبشہ میں شامل تھیں۔ دریں اثنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اچانک وہاں تشریف لائے تو اسماء رضی اللہ عنہا کے بارے میں پوچھا۔ حضرت حفصہ نے کہا: ’’ہاں، یہ اسماء بنت عمیس ہیں۔‘‘ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: ’’کیا یہ وہ ہیں جنھوں نے سمندر کے راستے حبشہ کا سفر اختیار کیا تھا؟‘‘ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے ہاں میں جواب دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ’’ہم نے آپ سے پہلے (مدینہ کی طرف) ہجرت کی۔ ہم آپ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کے قریب ہیں۔‘‘ اس پر وہ ناراض ہوئیں اور کہا: ’’ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! آپ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے، آپ میں سے بھوکوں کو کھانا کھلایا جاتا اور آپ میں سے لاعلم کو بروقت نصیحت کی بات حاصل ہوتی جبکہ ہم اپنی سرزمین سے دور دشمنوں کی زمین حبشہ میں رہتے تھے اور یہ سب کچھ ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر برداشت کیا۔ اللہ کی قسم! میں اس وقت تک کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی

---

[1] الكبائر للذهبي، ص: 12. [2] الهجرة الأولى في الإسلام للدكتور سلمان العودة، ص: 205.

یہاں تک کہ آپ کی بات رسول اللہ ﷺ کے سامنے رکھ دوں۔ ہم تو حبشہ میں بڑی تکلیف اور خوف میں مبتلا تھے۔ میں تو نبی ﷺ سے ضرور اس بارے میں دریافت کروں گی۔ اور اللہ کی قسم! جھوٹ بولوں گی نہ توڑ مروڑ کر بات کروں گی اور نہ اضافہ کروں گی۔‘‘

پھر جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ نبی ﷺ نے پوچھا: «فَمَا قُلْتِ لَهُ؟» ’’پھر تو نے اسے کیا کہا؟‘‘ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے وہ بھی بتا دیا۔ اس پر آپ نے فرمایا: «لَيْسَ بِأَحَقَّ بِي مِنْكُمْ، وَ لَهُ وَ لِأَصْحَابِهِ هِجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ، وَّلَكُمْ أَنْتُمْ أَهْلَ السَّفِينَةِ هِجْرَتَانِ» ’’میرے ساتھ تمھارے جیسا تعلق کسی کا نہیں ہوسکتا۔ عمر اور اس کے ساتھیوں کے لیے ایک ہجرت ہے اور تم اے اہل سفینہ (کشتی والو!) دو ہجرتوں والے ہو۔‘‘

پھر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ اصحابِ سفینہ گروہوں کی شکل میں آیا کرتے تھے اور یہ حدیث سنا کرتے تھے۔ ان کے لیے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان دنیا جہان کی خوشیوں سے زیادہ خوش کن اور عظیم تر تھا۔[1]

⑳ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ارض حبشہ ہی میں اسلام کی طرف مائل ہوگئے تھے جس سے پتا چلتا ہے کہ ہجرتِ حبشہ کے کیا اثرات رونما ہوئے اور مہاجرین نے وہاں دعوتی میدان میں جو فوائد حاصل کیے یہ اس کا بیّن ثبوت ہے۔ اور بہت سی روایات بھی شاہد ہیں کہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نجاشی کے ہاتھ پر اسلام لائے اور یہی مشہور ہے جیسا کہ ابن حجر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[2]

اور یہاں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ایک صحابی تابعی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے جیسا کہ علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[3] اور بعض روایات کے مطابق وہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔

---

[1] صحيح البخاري، حديث:4231,4230، و صحيح مسلم، حديث:2503,2502. [2] الهجرة الأولى في الإسلام للدكتور سلمان العودة، ص: 167. [3] شرح المواهب للزرقاني:271/1.

㉑ نبی ﷺ کا حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا بھی ہجرت حبشہ سے گہرا تعلق ہے۔ مہاجرین حبشہ میں سے ایک عورت کے ساتھ آپ ﷺ کا نکاح کرنا عظیم مقصد کا حامل تھا۔ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ کا نکاح سرزمین حبشہ میں ہوا جس کی گواہی کتب احادیث سے ملتی ہے۔ امام ابوداود رحمہ اللہ صحیح سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''وہ (ام حبیبہ رضی اللہ عنہا) عبید اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں کہ وہ سرزمین حبشہ میں وفات پا گئے تو نجاشی نے چار ہزار درہم حق مہر کے عوض ان کا نکاح نبی ﷺ سے کر دیا اور شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں انھیں نبی ﷺ کی طرف بھیج دیا۔[1]

سیرت کا مطالعہ کرنے والا اس واقعے سے نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مہاجرین کے احوال سے مسلسل واقفیت حاصل کرتے تھے، ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے، صبر کرنے والوں کی دلجوئی فرماتے اور ثابت قدم رہنے والوں کو حوصلہ دیتے اور اسی طرح مہاجرات کے حالات پر بھی نظر رکھتے۔ صرف ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ایسی خاتون نہ تھیں جن سے آپ ﷺ نے دلجوئی فرماتے ہوئے نکاح کیا بلکہ اس سے پہلے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی بھی دلجوئی فرما چکے تھے۔[2]

حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا جب اپنے خاوند کے ہمراہ حبشہ سے مکہ پہنچیں تو ان کے خاوند سکران بن عمرو رضی اللہ عنہ وفات پا گئے۔ جب ان کی عدت ختم ہوگئی تو آپ ﷺ نے پیغام نکاح بھیجا۔ وہ کہنے لگیں: ''میرے معاملے کا آپ کو اختیار ہے۔'' اس پر نبی ﷺ نے فرمایا: «مُرِي رَجُلًا مِّنْ قَوْمِكِ يُزَوِّجُكِ» ''اپنے خاندان میں سے کسی کو اپنا ولی مقرر کرو جو تمھاری شادی کرادے۔'' تو حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے حاطب بن عمرو بن عبدشمس بن عبدود کو اپنا ولی مقرر کیا، پھر نبی ﷺ نے ان سے نکاح کرلیا اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد یہ سب سے پہلے آپ کے نکاح میں آئیں۔[3]

---

[1] سنن أبي داود، حديث: 2107. [2] الهجرة الأولٰى في الإسلام للدكتور سلمان العودة، ص: 188. [3] الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 3/8، وسير أعلام النبلاء: 2/267.

مذکورہ بالا نکاح کے دونوں واقعات بظاہر تعدد ازواج پر دلالت کرتے ہیں لیکن خصوصی طور پر ان میں مجاہد عورتوں کے خیال رکھنے کی حکمت اور دلالت بھی موجود ہے۔ اگرچہ عمومی طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے آپ کا نکاح اصل میں بنی امیہ سے عداوت کم کرنے کے لیے تھا، بالخصوص ان کے والد ابوسفیان کی دشمنی ختم کرنا مقصود تھا جو اسے اسلام، پیغمبر اسلام اور عام مسلمانوں سے تھی لیکن پہلی توجیہ زیادہ قرین قیاس ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں اسلام کی خاطر تالیف قلب کا نظریہ پایا جاتا ہے اور نبی ﷺ اپنی قوم کی بہتری کے لیے ہر طریقہ بشرطیکہ وہ اسلامی اقدار کے خلاف نہ ہو اختیار فرما لیتے تھے۔[2]

㉒ بعض سیرت نگار خیال کرتے ہیں کہ نبی ﷺ مختلف اسباب کے پیش نظر ہجرت حبشہ کے حق میں نہیں تھے، وہ اسباب مندرجہ ذیل تھے:

نبی ﷺ کا دار ہجرت کا مشاہدہ کرنا کہ وہ زمین دو حروں (کالے پتھر والی زمینوں) کے درمیان واقع ہے اور وہاں کھجوروں کے درخت ہیں، آپ نے اس سے ہجرت کے شہر کا اندازہ لگایا تھا۔

سرزمین حبشہ کا جغرافیائی محل وقوع ایسا تھا کہ وہ پورے عالم میں اسلامی دعوت کے فروغ اور اسلامی سلطنت کے پھیلاؤ کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا تھا۔

جزیرہ نمائے عرب خصوصاً مکہ اور مدینہ کا نزول وحی اور دین پھیلانے کے لیے انتخاب کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ بہت سی خوبیوں کی بنا پر تھا۔[3]

اہل حبشہ نے اس پناہ گزین دعوتِ دین کو مسیحیت کے دوش بدوش پھیلنے سے روکے رکھا اور اس دور میں جبکہ رومی سلطنت کو پورے عالم میں مسیحیت کی محافظ سمجھا جاتا تھا، وہ حبشہ

---

[1] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص:707,706. [2] شرح المواهب للزرقاني:271/1.

[3] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص:170,169.

میں دین اسلام پھیلانے کی کیسے اجازت دے سکتی تھی۔[1]

㉓ ہجرت حبشہ کی وجہ سے قریش عرب میں اپنا مقام ومرتبہ کھو بیٹھے اور ان میں دعوت دین کی پہلی سی مخالفت کا یارا نہ رہا۔ کیونکہ عرب معاشرے میں اجنبی کو پناہ دینا، پڑوسی کی عزت کرنا اور اس سلسلے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا فخر سمجھا جاتا تھا۔ اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو قابل ملامت اور برا خیال کرتے تھے۔ دوسری طرف حبشی لوگ قریش پر سبقت لے گئے۔ جن لوگوں کو قریش نے دھتکارا اور ان سے برا سلوک کیا، اہل حبشہ نے انھیں پناہ دی۔ ان مہاجرین میں قریش کے معزز، کمزور اور غریب سب لوگ شامل تھے۔[2]

---

[1] أضواء على الهجرة لتوفيق محمد سبع، ص: 156-161، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 320. [2] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 171,170.

باب 3

عام الحزن اور سفرِ طائف

ابو طالب کی وفات

جب ابو طالب کی وفات ہوئی تو بعثت نبوی کے دسویں سال کے آخری دن تھے اور بنو ہاشم شِعب ابی طالب میں محصور رہنے کے بعد آزاد ہو چکے تھے۔[1]

ابو طالب نبی ﷺ کی حفاظت اور مدد کرتے تھے۔ قریش ان کا احترام کرتے تھے۔ جب ابو طالب کا آخری وقت آیا تو مشرکین کے سردار جمع ہوئے اور انھیں اپنے آبائی دین پر قائم رہنے کی تلقین کرنے لگے۔ وہ انھیں اسلام سے روکتے ہوئے کہتے: ”کیا تو عبدالمطلب کے دین سے پھر جانا چاہتا ہے؟“ دوسری طرف نبی ﷺ ان پر اسلام پیش کرتے ہوئے فرماتے: «قُلْ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ أَشْهَدُ لَكَ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ» ”آپ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لیجیے، میں قیامت کے دن آپ کے ایمان کی گواہی دوں گا“ لیکن ابو طالب نے کہا: ”اگر مجھے قریش کی طرف سے عار دلانے کا ڈر نہ ہوتا کہ اب مرتے ہوئے کلمہ پڑھ رہا ہے تو میں ضرور تیری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا۔“ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ○﴾

”(اے نبی!) بے شک جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جسے

---

[1] فتح الباري، شرح الحديث: 3883.

چاہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔“ [1]

معلوم ہوتا ہے جاہلیت کے نظریات ابوطالب کے ذہن میں پختہ تھے اور اس بڑھاپے کی حالت میں اپنے آبائی دین اور فکر کو تبدیل کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا اور ان کے ساتھی بھی اس وقت پاس تھے۔ وہ اس بات سے خوفزدہ تھے کہ اگر لوگوں تک ابوطالب کے اسلام کی خبر پہنچ گئی تو وہ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو سکتے ہیں۔ [2]

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات

بعثت نبوی کے دسویں سال ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی وفات پا گئیں اور یہ وہی سال تھا جب ابوطالب فوت ہوئے۔ [3]

ابوطالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی یکے بعد دیگرے وفات کے بعد آپ پر دکھ اور غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ درحقیقت دعوتی مشکلات میں یہ دونوں نبی ﷺ کے لیے مضبوط ستونوں کی حیثیت رکھتے تھے جن پر آپ اعتماد کرتے تھے۔ ابوطالب نبی ﷺ کا قوم کے مقابلے میں دفاع کرتے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا گھر کی چار دیواری میں آپ کی مشکلات اور دکھ کم کرنے کی کوشش کرتیں۔ اب ان دونوں کی وفات کے بعد کفار قریش اس دلیری سے آپ کی مخالفت کرنے لگے جو ابوطالب کی زندگی میں ممکن نہ تھی۔ [4]

اب نبی ﷺ کی زندگی میں ایک ایسے مشکل ترین مرحلے کی ابتدا ہوئی جس میں آپ ﷺ نے بہت سی مشکلات، کٹھن مراحل، تکالیف اور آزمائشوں کا سامنا کیا کیونکہ آپ اب میدان میں اکیلے تھے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ اس مخالفت و اذیت کے باوجود آپ اپنے رب کا پیغام پوری دنیا تک پہنچانے کی کوشش کرتے رہے۔

---

[1] القصص 28:56. صحيح مسلم، حديث:(42)25، وجامع الترمذي، حديث: 3188، ومسند أحمد: 434/2. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 184/1. [3] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 185/1. [4] محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 34.

نبی ﷺ نے اتنی تکالیف برداشت کیں کہ پہاڑ بھی برداشت نہ کر سکتے تھے اور اتنی مشقتیں اور آزمائشیں آئیں کہ وہ شہر، جہاں آپ پیدا ہوئے اور وہاں کا ہر چھوٹا بڑا آپ کو جانتا تھا، آپ کو چھوڑنا پڑا اور اسلامی دعوت پیش کرنے کے لیے کسی دوسرے شہر اور دوسری قوم کا انتخاب کرنا پڑا۔ یہی سوچتے ہوئے آپ مکہ کے قریب ترین شہر طائف کی طرف نکلے کہ ہوسکتا ہے وہ دعوتِ دین قبول کرلیں اور کچھ دادرسی بھی ہوسکے۔[1]

سفر طائف

نبی ﷺ دعوت کے میدان میں سابقہ انبیاء و مرسلین کی اقتدا کیا کرتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام بحیثیت داعی اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال تبلیغ کرتے رہے۔ اس طویل عرصے میں حضرت نوح علیہ السلام مسلسل اور مختلف انداز سے دعوت دین میں مصروف رہے۔ آپ نے قوم کو ہر انداز میں دعوت دی مگر قوم اپنی ضد اور تکبر پر اڑی رہی، اس کے باوجود نوح علیہ السلام نے دعوت کو روکا نہ تبلیغ رسالت میں کوئی کمزوری دکھائی اور نہ مختلف اوقات میں مختلف دعوتی اسلوب اختیار کرنے میں ان کی بصیرت متأثر ہوئی۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ایمان اور اطاعت الٰہی کی طرف بلاتوقف اور مسلسل دعوت پیش کی مگر قوم بے رخی اور غیر اللہ کی دعوت پر مصر رہی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے انھیں وقفے وقفے سے اور مسلسل، خفیہ و علانیہ ہر انداز میں دعوت پیش کی مگر قوم انکار پر اڑی رہی۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے بھی دعوتِ دین میں مختلف اور نئے نئے انداز اختیار فرمائے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو پوشیدہ و علانیہ طور پر، نرمی و سختی سے، مجمع اور تنہائی میں سفر اور حضر میں اسلامی دعوت پیش کی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے سابقہ امتوں کے واقعات بیان فرمائے، محاورات

---

[1] محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 36-45. [2] تفسير الآلوسي: 10/89.

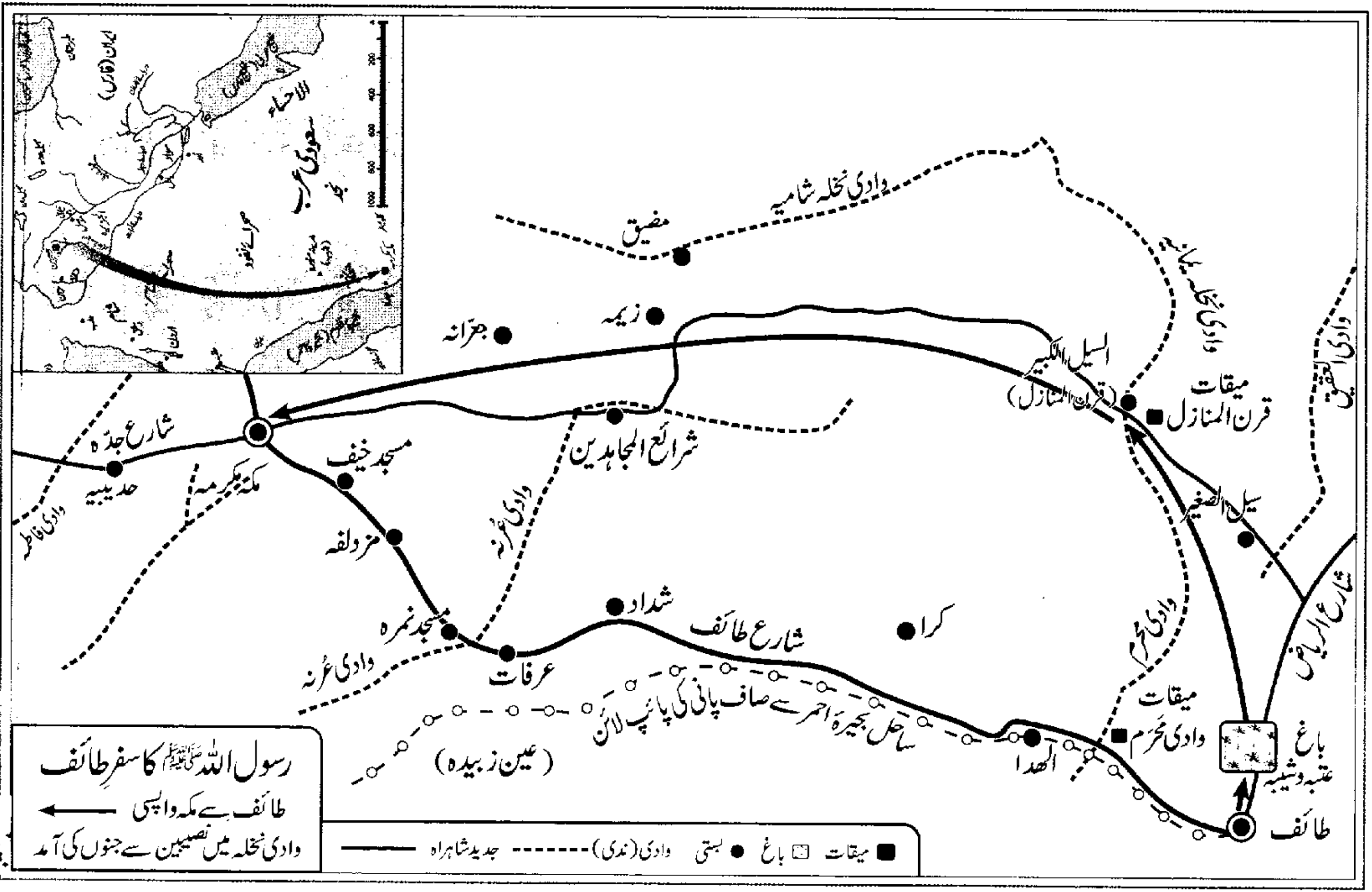
رسول اللہ ﷺ کا سفر طائف
طائف سے مکہ واپسی
وادی نخلہ میں نصیبین سے جنوں کی آمد
میقات
باغ
بستی
وادی (ندی)
جدید شاہراہ
طائف
باغ عتبہ وشیبہ
شارع الریاض
وادی العقیق
وادی نخلہ یمانیہ
وادی نخلہ شامیہ
میقات قرن المنازل
السیل الکبیر (قرن المنازل)
سیل الصغیر
میقات وادی محرم
وادی محرم
الھدا
کرا
شارع طائف
شداد
ساحل بحیرہ احمر سے صاف پانی کی پائپ لائن
(عین زبیدہ)
عرفات
مسجد نمرہ
وادی عرنہ
مزدلفہ
مسجد خیف
شرائع المجاہدین
مضیق
زیمہ
جعرانہ
مکہ مکرمہ
شارع جدہ
حدیبیہ
وادی فاطمہ
سعودی عرب
الاحساء
ایران (فارس)

نقشہ 8

کا استعمال بھی کیا اور توضیح وتشریح کے تمام ذرائع سے استفادہ کیا حتی کہ آپ نے زمین پر خط کھینچ کر بھی اپنی بات سمجھائی، نیز ترغیب وترہیب، خوشخبری اور ڈراوا بھی آپ کے اسالیب دعوت کا حصہ بنے، گویا آپ نے میدان دعوت میں ہر وقت اور ہر حال میں دعوت دی اور اس کے لیے ہر انداز اختیار فرمایا۔[1]

نبی ﷺ دعوت دین ہی کے سلسلے میں طائف گئے اور طائف کے ہر ہر قبیلے کے سامنے دعوت پیش کی، پھر نبی ﷺ نے ہجرت فرمائی اور دعوت الی اللہ کے مشن کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔

آپ ﷺ درحقیقت ایک نئے دعوتی مرکز کی تلاش میں تھے اور اس سلسلے میں آپ نے بنوثقیف سے مدد طلب کی لیکن انھوں نے مدد دینے کے بجائے اپنے منچلے نوجوانوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگادیا جنھوں نے آپ پر پتھر برسائے، واپسی پر آپ ﷺ کی عداس سے ملاقات ہوئی، پہلے یہ عیسائی تھا اب مسلمان ہوگیا۔

علامہ واقدی رحمہ اللہ نے یہ سفر بعثت کے دسویں سال شوال میں قرار دیا ہے جب ابوطالب اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا وفات پاچکے تھے اور طائف میں آپ ﷺ کی مدت اقامت بھی دس دن بتائی ہے۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے طائف کو کیوں منتخب فرمایا؟: طائف کا علاقہ قریشی سرداروں کے لیے ایک دفاعی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا اور انتہائی توجہ کا حامل تھا۔ گزشتہ زمانے میں انھوں نے طائف کی سرزمین پر قبضہ کرنے کے لیے وادی ''وَجّ'' پر حملہ بھی کیا تھا تاکہ یہ درختوں اور کھیتوں سے بھرا زرخیز علاقہ ان کے زیرنگیں آجائے۔ بنوثقیف نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے آئندہ کے لیے قریش سے حلیفانہ معاہدہ کرلیا اور ان کے ساتھ بنو دَوس کو بھی شامل کرلیا۔[3]

---

[1] مقومات الداعية الناجح للدكتور علي بادحدح، ص: 123.

[2] الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 221/1.

[3] فتح الباري، شرح الحديث: 2294.

علاوہ ازیں بہت سے اصحاب ثروت نے طائف میں جائیدادیں خرید رکھی تھیں اور گرمیوں کا موسم وہیں گزارتے تھے۔ قبیلہ بنو ہاشم، بنو عبد شمس اور بنو مخزوم طائف سے مستقل رابطہ رکھتے تھے، مزید برآں بنو مخزوم کے بنو ثقیف کے ساتھ کچھ مالی مفادات بھی وابستہ تھے۔[1]

نبی ﷺ کا طائف کی طرف متوجہ ہونا ایک سوچا سمجھا پروگرام تھا۔ اگر آپ وہاں دعوتی مرکز قائم کرنے میں اور ایک مددگار جماعت تیار کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو قریش چونک اٹھتے اور انھیں اپنی سلامتی اور اقتصادی مفادات براہ راست خطرے میں نظر آتے حتی کہ وہ محصور ہو جاتے اور بیرونی دنیا سے بھی کٹ جاتے۔

نبی ﷺ کے اس دعوتی، سیاسی اور دفاعی اقدام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ظاہری اسباب بروئے کار لا کر اسلامی مملکت یا ایک جدید طاقتور جماعت کے قیام کے خواہاں تھے جو میدانِ کارزار میں دشمن کو پچھاڑ سکے کیونکہ اب ایک مملکت یا طاقتور جماعت کا قیام لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دینے کے سلسلے میں انتہائی ضروری تھا۔ جب نبی ﷺ طائف پہنچے تو آپ سیدھے ان کے مرکز اقتدار میں تشریف لے گئے جہاں سے سیاسی فیصلے صادر ہوتے تھے۔[2]

طائف کا مرکز اقتدار کہاں تھا؟ بنو مالک اور اَحلاف پرانے زمانے سے طائف کے رہائشی تھے۔ اسی وجہ سے انھی کا طائف پر غلبہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ مذہبی اور سیاسی قیادت بھی انھی قبائل کو حاصل تھی۔ عبادت خانے کی دیکھ بھال کا مسئلہ ہو یا عمومی سیاست کا، خارجی تعلقات ہوں یا اقتصادی ترقی کا معاملہ درپیش ہو، ان دونوں قبائل ہی کا حکم مانا جاتا تھا لیکن سرزمین طائف، جو عرب کا سب سے زیادہ زرخیز اور خوبصورت علاقہ تھا، وہ اس علاقے کے دفاع کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ اہل طائف ہَوازن، قریش اور بنو عامر سے خوفزدہ رہتے تھے کیونکہ مذکورہ قبائل طائف کو برباد کرنے یا اس پر قبضہ کرنے پر قادر تھے، اسی لیے سردارانِ طائف نے مصالحت کی پالیسی اختیار کی اور اپنی سیاسی پوزیشن کے

---

[1] أصول الفكر السياسي للتجاني عبد القادر، ص: 173. [2] أصول الفكر السياسي للتجاني عبد القادر، ص: 174.

تحفظ کی غرض سے معاہدے کیے اور مفادات کی جنگ لڑی۔ یہ بعینہٖ وہی طریقہ تھا جسے قریش اپنائے ہوئے تھے، چنانچہ بنو مالک نے ہوازن سے اور اَحلاف نے قریش سے تعلقات قائم کیے تاکہ ان کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔[1]

ایسی صورت حال میں جب رسول ﷺ نے طائف کا رخ کیا تو آپ ان دو طرفہ معاہدات اور تعلقات سے ہرگز غافل نہ تھے، بلکہ جانتے تھے کہ طائف والوں کی کوئی ایک مرکزی طاقت نہیں، وہ ایک اندرونی معاہدے کے تحت اپنی طاقت دو حصوں میں تقسیم کیے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جسے کسی بیرونی قبیلے کی حمایت حاصل ہوتی وہی زیادہ طاقتور ہوتا۔ عمومی لحاظ سے نبی ﷺ دونوں میں سے کسی ایک کو اپنی طرف مائل کر لیتے تو آپ کی سیاسی قوت مضبوط ہو سکتی تھی۔

اگر آپ بالخصوص احلاف کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو آپ کا دعوتی پروگرام انتہائی کامیاب رہتا کیونکہ احلاف فوجی لحاظ سے قریش کے حلیف تھے اور یہ معاہدہ کسی مذہبی ہم آہنگی یا دینی دوستی پر مبنی نہ تھا، یہ تو صرف قریش کے ڈر کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا تھا، لہٰذا انھیں اپنی طرف مائل کرنا ناممکن نہ تھا۔ اس غرض سے نبی ﷺ جب سرزمین طائف میں پہنچے تو سیدھے بنو عُمرو بن عمیر کے ہاں گئے جو احلاف کے سردار اور قریش کے حلیف تھے اور بنو مالک کا رخ نہیں کیا جو بنو ہوازن کے تعلق دار تھے۔[2]

ابن ہشام رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”جب نبی ﷺ طائف پہنچے تو بنو ثقیف کے لیڈروں اور سرداروں کے گروہ سے ملے اور وہ تین بھائی تھے۔ عبد یالیل بن عمرو بن عمیر، مسعود بن عمرو بن عمیر اور حبیب بن عمرو بن عمیر۔ اور ان میں سے ایک نے قریش کے قبیلہ بنو جمح کی ایک عورت سے نکاح بھی کر رکھا تھا۔[3]

---

[1] أصول الفكر السياسي للتجاني عبد القادر، ص: 174. [2] أصول الفكر السياسي للتجاني عبدالقادر، ص: 175. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 78/2.

بنو عمرو ڈرے ہوئے تھے اور عدمِ تحفظ کا شکار تھے، اس لیے انھوں نے نبی ﷺ کی دعوت کو ٹھکرا دیا اور آپ کے ساتھ بے وقوفی اور بدتہذیبی کا معاملہ کیا۔ آپ ﷺ بنو ثقیف کے سرکردہ لوگوں سے نا امید ہو کر چل دیے اور یہ کہا: ''جو تمھیں سلوک کرنا تھا تم نے کیا لیکن اسے چھپا کر رکھنا۔''[1]

آپ ﷺ نہیں چاہتے تھے کہ قریش کو خبر ہو اور وہ آپ کے خلاف مزید کمر بستہ ہو جائیں۔ آپ کی یہ خواہش تھی کہ یہ تعلقات خفیہ خفیہ قائم ہوں اور قریش کو آپ کے اس اقدام کی کانوں کان خبر نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے سفرِ طائف میں بچاؤ کے لیے مندرجہ ذیل احتیاطی تدابیر اختیار فرمائیں:

آپ ﷺ مکہ سے پیدل عازمِ سفر ہوئے تاکہ قریش یہ نہ سوچ سکیں کہ آپ مکہ سے باہر جا رہے ہیں کیونکہ اگر آپ سوار ہو کر نکلتے تو شکوک وشبہات پیدا ہو سکتے تھے اور آپ کا ارادۂ سفر ان پر عیاں ہو جاتا۔ اس طرح وہ بغیر کسی رکاوٹ کے آپ کو اس سفر سے روک دیتے اور کسی کو اس پر اعتراض بھی نہ ہوتا۔

نبی ﷺ نے اپنے سفر میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے جانا پسند کیا کیونکہ اس میں سلامتی کے پہلو موجود تھے۔ ایک تو یہ کہ زید رضی اللہ عنہ آپ کے منہ بولے بیٹے تھے۔ کوئی دونوں کو اکٹھا دیکھ کر ان کے آپس میں تعلقات کے باعث کسی قسم کا اندیشہ نہیں کر سکتا تھا، دوسرا یہ کہ نبی ﷺ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بڑے قریب سے دیکھا تھا۔ ان میں اخلاص، امانت اور سچائی جیسے اوصاف نمایاں تھے۔ اس لحاظ سے آپ ﷺ حضرت زید رضی اللہ عنہ کی طرف سے مطمئن تھے کہ وہ کوئی راز افشا نہیں کرے گا اور آپ کا سچا رفیق ثابت ہوگا اور اس کا ثبوت اس وقت مل گیا جب نبی ﷺ کو پتھروں سے بچاتے ہوئے خود زید رضی اللہ عنہ کا سر زخمی ہو گیا۔

جب طائف کے سرداروں نے آپ کی دعوت کو انتہائی برے طریقے سے رد کر دیا جس

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 78/2.

میں استہزا اور حقارت شامل تھی تو آپ ﷺ نے اس طرزِ عمل کو برداشت کیا اور غضبناک نہیں ہوئے اور نہ ان پر حملہ آور ہوئے بلکہ ان سے اس معاملے کو چھپانے کا کہا۔ یہ انتہائی احتیاط کا پہلو تھا کیونکہ اگر قریش کو اس ملاقات کا علم ہو جاتا تو وہ آپ سے صرف استہزا پر اکتفا نہ کرتے بلکہ مزید ظلم و ستم کرنے لگتے اور آپ کی مکہ میں داخلی اور خارجی تمام سرگرمیوں پر پابندی لگا دیتے۔[1]

دعا اور گریہ و زاری

بنو عمرو بڑے لئیم ثابت ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی خبر افشا کی بلکہ غلاموں اور منچلے جوانوں کو آپ ﷺ کی مخالفت پر ابھارا جو آپ کو گالی دیتے اور آپ پر پتھر برساتے یہاں تک کہ آپ کی دونوں ایڑیاں زخمی ہوگئیں اور دونوں جوتے خون سے بھر گئے اور سرزمین طائف پر آپ ﷺ کا پاکیزہ لہو نچھاور ہوا۔ نبی ﷺ اور حضرت زید ؓ نے اسی اثنا میں عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کے باغ میں پناہ لی اور ایک انگور کی بیل کے سایے میں تشریف فرما ہوئے۔ پیچھے آنے والے ثقیف کے منچلے واپس چلے گئے۔ آپ ﷺ اور زید ؓ پہنچنے والے غم کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کچھ دیر وہاں آرام کرتے رہے۔ اس دوران ربیعہ کے دونوں بیٹے اہل طائف سے نبی ﷺ کو پہنچنے والی تکالیف کا مشاہدہ کرتے رہے لیکن انھوں نے کسی قسم کی دخل اندازی نہ کی۔

اس انتہائی دکھ و غم اور نفسیاتی و جسمانی مصائب کی کیفیت میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے اللہ کے سامنے جو دعا فرمائی وہ آپ ﷺ کے ایمان و یقین، اللہ کے راستے میں پہنچنے والی تکالیف پر صبر اور مزید رضائے الٰہی کے حصول پر دلالت کرتی ہے۔ دعا یہ ہے:

«اَللّٰهُمَّ! إِلَيْكَ أَشْكُو ضُعْفَ قُوَّتِي، وَ قِلَّةَ حِيلَتِي وَ هَوَانِي عَلَى النَّاسِ، يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ! أَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِينَ، وَ أَنْتَ رَبِّي،

---

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 110,109.

إِلٰى مَنْ تَكِلُنِي؟ إِلٰى بَعِيدٍ يَّتَجَهَّمُنِي؟ أَمْ إِلٰى عَدُوٍّ مَّلَّكْتَهُ أَمْرِي؟ إِنْ لَّمْ يَكُنْ بِكَ عَلَيَّ غَضَبٌ فَلَا أُبَالِي، وَ لٰكِنْ عَافِيَتُكَ أَوْسَعُ لِي. أَعُوذُ بِنُورِ وَجْهِكَ الَّذِي أَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ، وَ صَلُحَ عَلَيْهِ أَمْرُ الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ، مِنْ أَنْ تَنْزِلَ بِي غَضَبُكَ، أَوْ يَحِلَّ عَلَيَّ سَخَطُكَ، لَكَ الْعُتْبٰى، حَتّٰى تَرْضٰى، وَلَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِكَ»

”الٰہی! میں تجھی سے اپنی کمزوری و بے بسی اور لوگوں کے نزدیک اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے اور تو میرا بھی رب ہے۔ تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے حوالے جو میرے ساتھ تندی سے پیش آئے! یا کسی دشمن کے حوالے جسے تو نے میرے معاملے کا مالک بنا دیا ہے؟ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے کوئی پروا نہیں لیکن تیری عافیت میرے لیے زیادہ کشادگی کا باعث ہے۔ میں تیرے چہرے کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے تاریکیاں روشن ہوگئیں اور دنیا و آخرت کے معاملات درست ہوئے، کہ مجھ پر تیرا غضب اترے یا تیرا عتاب مجھ پر نازل ہو۔ مجھے تیری ہی رضا مطلوب ہے یہاں تک کہ تو راضی ہوجائے اور تیرے بغیر کوئی زور اور طاقت نہیں۔“[1]

اس دعا سے رسول اللہ ﷺ کے عقیدۂ توحید کی گہرائی اور تقرب الٰہی کا پتا چلتا ہے۔ آپ ﷺ مسلسل پہنچنے والے دکھوں کے باوجود اپنی جان سے تکالیف کی دوری چاہتے تھے نہ اپنے لیے سکون اور نعمتوں کے متلاشی تھے بلکہ آپ اللہ تعالیٰ کے راستے میں پیش آنے والی ہر تکلیف پر خوش ہوتے۔ آپ ﷺ سوچتے تھے کہ کہیں دعوت کے ابلاغ میں لاشعوری طور پر کوئی غلطی نہ ہو جائے جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی ﷺ کا مقصود و مطلوب اللہ کریم کی رضامندی تھا جس کے سامنے دنیا کے تمام

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام:62,61/2، وتفسير القرطبي: 195/16، والمعجم الكبير للطبراني: 346/25، و مجمع الزوائد: 35/6، روایت ضعیف ہے۔

مقاصد ہیچ نظر آتے ہیں۔ یوں اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی مومن پر مصائب آنے سے اس کی رضامندی حاصل ہو اور اس کی ناراضی دور ہوتی ہو تو ایسی مصیبت کا آنا برکت کا باعث اور نعمت و آسودگی کا حامل ہوگا۔

نبی ﷺ نے اپنی دعا کا اختتام ایک ایسے کلمے سے کیا جسے آپ خود بھی پڑھتے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی مشکل وقت میں پڑھنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ مومن کی سختیوں اور مشکلات کا مقابلہ اور حالتِ خوف میں امن کا حصول صرف اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہی سے ممکن ہے۔ مصائب کی شدت کا مقابلہ اور مصیبتوں کو برداشت کرنے کی ہمت بھی اللہ عزوجل کے لطف و کرم ہی سے ممکن ہے۔[1]

بے شک دعا ایک بلند ترین عبادت ہے اور اسے انسانی تحفظ اور امن کے حصول کے لیے موثر ترین ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔ انسانی عقل فہم و فراست کی کتنی ہی منزلیں طے کر لے، پھر بھی انسان لغزش و ناکامی سے دو چار ہوسکتا ہے اور بعض اوقات وہ ایسے مسائل میں گھر جاتا ہے کہ اس کی تمام تر سوچ اور تدبیر اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ تب بذریعہ دعا بارگاہ الٰہی میں گڑگڑانے کے سوا کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا تاکہ انسان کشادگی اور آسانی پا سکے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو اہل طائف کی طرف سے اذیت، تمسخر اور حقارت کا سامنا کرنا پڑا تو آپ طائف میں حیران و پریشان تھے تب آپ ﷺ نے بواسطہ دعا اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہی۔ ابھی دعا ختم نہ ہوئی تھی کہ حضرت جبریل علیہ السلام اور پہاڑوں کا فرشتہ قبولیت کا ثبوت بن کر سامنے آگئے۔[2]

عفو و درگزر

بہت ہی مشکل مراحل میں رسول اللہ ﷺ کی رحمدلی اور بے پایاں مہربانی کا ظہور

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 20/3. [2] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 113,112.

ہوا۔ آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں سخت ترین مشکلات کا سامنا کیا جس میں آپ اپنے دل اور سینے کے قویٰ کو مجتمع کرتے تاکہ ان مشکلات کو برداشت کرسکیں اور ان کا مقابلہ کرنے کی عادت پڑ جائے۔ ان مواقع پر آپ کا بڑا پن اور عظیم رحمدلی ہمیشہ غالب نظر آتی۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ آپ پر جنگ اُحد سے زیادہ بھی کوئی مشکل دن گزرا؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: «لَقَدْ لَقِيتُ مِنْ قَوْمِكِ مَا لَقِيتُ، وَكَانَ أَشَدَّ مَا لَقِيتُ مِنْهُمْ يَوْمَ الْعَقَبَةِ، إِذْ عَرَضْتُ نَفْسِي عَلَى ابْنِ عَبْدِ يَالِيلَ بْنِ عَبْدِ كُلَالٍ فَلَمْ يُجِبْنِي إِلٰى مَا أَرَدْتُّ، فَانْطَلَقْتُ وَأَنَا مَهْمُومٌ عَلٰى وَجْهِي، فَلَمْ أَسْتَفِقْ إِلَّا وَأَنَا بِقَرْنِ الثَّعَالِبِ، فَرَفَعْتُ رَأْسِي، فَإِذَا أَنَا بِسَحَابَةٍ قَدْ أَظَلَّتْنِي، فَنَظَرْتُ فَإِذَا فِيهَا جِبْرِيلُ فَنَادَانِي، فَقَالَ: إِنَّ اللّٰهَ قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْمِكَ لَكَ وَمَا رَدُّوا عَلَيْكَ وَقَدْ بَعَثَ اللّٰهُ إِلَيْكَ مَلَكَ الْجِبَالِ لِتَأْمُرَهُ بِمَا شِئْتَ فِيهِمْ، فَنَادَانِي مَلَكُ الْجِبَالِ فَسَلَّمَ عَلَيَّ ثُمَّ قَالَ: يَا مُحَمَّدُ! فَقَالَ: ذٰلِكَ فِيمَا شِئْتَ، إِنْ شِئْتَ أَنْ أُطْبِقَ عَلَيْهِمُ الْأَخْشَبَيْنِ»

”مجھے تیری قوم سے بہت سی تکالیف پہنچی ہیں لیکن زیادہ تکلیف اس وقت پہنچی جب مجھے (طائف کی) گھاٹی والے دن② ان کی طرف سے پریشانی آئی، جب میں نے اپنی دعوت ابن عبد یالیل بن عبد کُلال کے سامنے پیش کی۔ وہاں مجھے حسبِ خواہش قبولیت نہ ملی تو میں غمزدہ سر جھکائے وہاں سے چل دیا۔ اسی حالت میں قرن ثعالب پہنچا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ میرے اوپر بادل نے سایہ کیا ہوا ہے اور اس میں جبریل علیہ السلام ہیں۔ وہاں سے جبریل علیہ السلام نے مجھے آواز دی کہ اللہ تعالیٰ نے طائف والوں کی گفتگو سن لی ہے اور جو انھوں

---

[1] مقومات الداعية الناجح للدكتور علي بادحدح، ص: 76. [2] يوم العقبة: اس کے متعلق مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رقم طراز ہیں: ...... ”چنانچہ عقبہ“ سے یہاں منیٰ کی گھاٹی مراد نہیں ہے۔ یہاں مراد طائف کی گھاٹی ہے۔ اور یہ طائف سے مکہ کے قدیم راستے پر طائف سے نکلتے ہی واقع تھی۔ (منة المنعم: 3/217,218)

نے آپ کے ساتھ سلوک کیا دیکھ لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے نگران فرشتے کو آپ کی مدد کے لیے بھیجا ہے تاکہ آپ جو چاہیں اسے حکم دیں۔ پہاڑوں کے فرشتے نے مجھے پکارا، پھر سلام کیا اور کہا: ''اے محمد (ﷺ)! اگر آپ چاہیں تو میں ان دو پہاڑوں کو آپس میں ملا کر انھیں ہلاک کر دوں؟'' نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«بَلْ أَرْجُو أَنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ مِنْ أَصْلَابِهِمْ مَّنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهُ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا»

''بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں میں ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو صرف اللہ کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔''[1]

اگرچہ اُحد کے دن بھی آپ پر مشکلات آئیں لیکن وہ جسمانی تھیں اور یہ سخت ترین ذہنی مشقتیں تھیں کیونکہ یہاں ظلم کی انتہا ہوئی اور آپ کو اتنا ذہنی دھچکا لگا کہ اسی حالت میں آپ ﷺ قرن ثعالب پہنچ گئے۔[2]

دعوتی منصوبہ بندی میں تبدیلیاں

پہاڑوں کے فرشتے کا مشورہ کہ ان لوگوں پر دونوں پہاڑ ملا دیے جائیں، دراصل جڑ سے اکھیڑ دینے والے اس عذاب کی طرف اشارہ تھا جو قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم لوط پر اترا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○﴾

''پھر ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ پر پکڑا، چنانچہ ان میں سے کوئی تو وہ تھے جن پر

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3231، و صحيح مسلم، حديث: 1795. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 27,26/3.

> ہم نے پتھروں بھری آندھی بھیجی اور ان میں سے کوئی وہ تھے جنھیں چنگھاڑ نے آن پکڑا اور ان میں سے کوئی وہ تھے جنھیں ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کوئی وہ تھے جنھیں ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔"[1]

یہاں ایک اور مشورہ بھی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کی طرف سے سامنے آیا کہ آپ مکہ اور طائف کو پیچھے چھوڑتے ہوئے محوِ ہجرت رہیں کیونکہ مکہ والوں نے آپ کو نکال دیا اور طائف والوں نے رسوا کرنے کی کوشش کی۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "جب نبی ﷺ نے اپنا طائف میں کوئی مددگار نہ پایا تو آپ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ غمزدہ حالت میں مکہ کی طرف واپس چلے اور اپنے اللہ سے مذکورہ مشہور دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے نگران فرشتے کو بھیجا تاکہ آپ کے حکم سے وہ دونوں پہاڑ جن کے درمیان طائف واقع ہے، آپس میں ملا دے تو آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں، بلکہ میں انھیں مہلت دینا چاہتا ہوں، ہوسکتا ہے ان کی نسلوں سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو صرف ایک اللہ کے عبادت گزار ہوں اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرائیں۔"

نبی ﷺ وادی نخلہ میں کچھ دن ٹھہرے رہے۔ دریں اثنا حضرت زید رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے کہ آپ ایسے شہر میں کیسے داخل ہوں گے جہاں سے آپ کو نکالا گیا، پھر آپ مدد حاصل کرنے کے لیے طائف گئے لیکن وہاں سے کوئی تائید یا مدد نہ ملی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ جَاعِلٌ لِّمَا تَرٰى فَرَجًا وَّ مَخْرَجًا وَّ إِنَّ اللّٰهَ نَاصِرٌ دِينَهٗ وَمُظْهِرٌ نَّبِيَّهٗ»

"اے زید! اللہ تعالیٰ ضرور کشادگی کا راستہ نکالے گا، یقیناً اللہ کو اپنے دین کی مدد کرنی ہے اور اپنے نبی کو ضرور غالب کرنا ہے۔"[2]

---

[1] العنکبوت40:29.

[2] زاد المعاد:46/2.

اب نہ تو نبی ﷺ نے کفار کی تباہی کا راستہ منتخب کیا اور نہ اسلامی دعوت سے علیحدگی یا کسی اور طرف ہجرت کا مشورہ قبول کیا بلکہ واپس مکہ میں داخلے کا فیصلہ کیا کہ بابرکت جہاد کا سلسلہ وہیں سے قائم رکھا جائے اور دعوت توحید کی وجہ سے حاصل ہونے والے فوائد کو سمیٹا جائے، لہٰذا آپ ﷺ نے سابقہ طریق کار اختیار نہ کیا بلکہ پالیسی میں ترمیم کی۔ آپ کا نیا طریق کار اس سوچ پر مبنی تھا کہ مکہ میں داخل ہوا جائے پیچھے نہ ہٹا جائے اور اسی زمین پر دعوتی تحریک جاری رکھی جائے جہاں کافر رہتے ہیں۔ ان کے انتظامات اور ان کے علاقوں سے فائدہ حاصل کیا جائے اور ان کافروں کے مقاصد کو ناکام بنایا جائے تاکہ اہل ایمان کا ایسا معاشرہ پروان چڑھ سکے جو ان کے اندر سے جنم لے۔

اب نبی ﷺ کا منصوبہ یہ تھا کہ کفار کی نسل ہی سے مسلمانوں کی جماعت تیار کی جائے جو اللہ کے راستے میں جہاد کریں۔ آپ ﷺ کی یہ سوچ مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے واضح طور پر درست تھی اور اس سے پیچھے ہٹنا مناسب نہیں تھا۔[1]

اگر تجزیہ کیا جائے تو صورت حال کچھ یوں نظر آتی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ظاہری حالات کے مخالف ہونے کے باوجود مکہ واپسی کا ارادہ فرمایا۔ یہ کام نہ تو آسان تھا اور نہ سلامتی کا ضامن بلکہ قریش کی طرف سے احتمال تھا کہ وہ آپ سے غداری کرتے یا آپ کو (معاذ اللہ) قتل کر ڈالتے کیونکہ وہ آپ کے متعلق مزید صبر نہیں کر سکتے تھے۔ آپ ﷺ کا طائف جانا قریش کے خلاف خروج کی ایک صورت تھی۔ آپ دوسرے قبائل سے مدد کے لیے نکلے تھے۔ اس سے قریش اور ان کے حلیفوں کے درمیان پھوٹ پڑ سکتی تھی۔ اب اگر قریش سے آپ کو کوئی خطرہ نہ بھی ہوتا اور آپ مکہ میں حسب معمول داخل ہو بھی جاتے تو قریش اسے مسلمانوں کی شکست جان کر ان کے خلاف پہلے سے زیادہ دلیر ہو جاتے اور کوئی اور احمقانہ حرکت کرتے۔ اس لیے اب نبی ﷺ نے اہل مکہ پر باہر سے دباؤ ڈالنے کے بجائے اندرون مکہ ہی میں قریشی قبائل کے اندر دعوت پھیلانے کی کوشش کی تاکہ یہیں

---

[1] أصول الفكر السياسي للتجاني عبد القادر، ص: 176.

سے ہم خیال لوگ پیدا ہوں اور مکہ ہی سے ایک ایمان دار جماعت کا وجود ظاہر ہو۔[1]

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”پھر جب نبی ﷺ طائف سے اس حال میں واپس آئے کہ وہاں کسی نے آپ کی تصدیق کی نہ مدد۔ اور آپ واپس حرا پہنچے تو اَخْنَس بن شریق کی پناہ حاصل کرنے کے لیے پیغام بھیجا۔ اس نے جواب دیا کہ ہم حلیف ہیں اور حلیف کسی (حریف) کو پناہ نہیں دے سکتا، پھر سہیل بن عمرو کی طرف پیغام بھیجا تو جواب ملا کہ بنو عامر بنو کعب کے خلاف کسی کو پناہ نہیں دے سکتے۔ بعدازاں مطعم بن عدی، جو قبیلہ بنو نوفل بن عبد مناف کے سردار تھے، کی طرف پناہ حاصل کرنے کے لیے بنو خزاعہ کا ایک آدمی بھیجا تو مطعم بن عدی نے آپ کو پناہ دی اور اپنے بیٹوں اور قوم کو ہتھیار پہننے اور بیت اللہ کے اطراف میں کھڑا ہونے کا حکم دیا اور انھیں بتایا کہ میں نے محمد (ﷺ) کو پناہ دی ہے۔ تب نبی ﷺ اور زید رضی اللہ عنہ مکہ میں داخل ہوئے اور مسجد حرام میں پہنچے تو مطعم بن عدی اپنی سواری پر سوار تھے اور کہہ رہے تھے: ”اے قریش کے لوگو! میں نے محمد (ﷺ) کو پناہ دی ہے، لہٰذا کوئی ان کے خلاف حرکت نہ کرے۔“ نبی ﷺ نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور دو رکعت ادا کرنے کے بعد گھر پہنچے۔ مطعم اور اس کے بیٹے تلواروں سے لیس ہو کر نبی ﷺ کو گھر پہنچا کر لوٹے۔“[2]

علامہ زرقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”اخنس اور سہیل کے عذر قابل اعتراض ہیں کیونکہ اگر وہ پناہ دینے کے اہل نہ ہوتے تو رسول اللہ ﷺ ان سے پناہ ہی نہ مانگتے اور آپ اچھی طرح اپنی قوم کے احوال و عادات جانتے تھے۔ عامر اور کعب دونوں بھائی تھے، ان کا باپ لؤی تھا اور عامر سہیل کا جد امجد تھا، لہٰذا بنو عامر اور بنو کعب دونوں ایک دوسرے کو پناہ دے سکتے تھے۔[3]

رسول اللہ ﷺ کے اس طریقۂ کار کی وجہ سے مکہ کی فضا مکمل طور پر تبدیل ہو چکی تھی۔ کجا یہ کہ آپ مکہ میں شکست خوردہ اور چھپ کر داخل ہوتے، آپ ایک سردار کی پناہ میں

---

[1] أصول الفكر السياسي للتجاني عبدالقادر، ص: 176-178. [2] زاد المعاد: 2/47. [3] محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 2/324.

تلوار کی حفاظت میں گھر پہنچے اور سب دیکھ اور سن رہے تھے اور آپ نے پناہ حاصل کرنے کے لیے بنوخزاعہ کا آدمی منتخب کیا جسے بطور پیغام رساں مطعم کے پاس بھیجا۔ یوں مطعم اور اس آدمی کا انتخاب درحقیقت نبی ﷺ کی انتہائی اعلیٰ سیاسی بصیرت، تاریخی شعور اور شاندار سیاسی حکمت عملی پر مبنی تھا۔ اس حکمت و بصیرت سے آگاہی کے لیے اس تفصیل کو جاننا ضروری ہے۔ دراصل مطعم بن عدی ان دنوں بنونوفل کے سردار تھے اور بنونوفل کا جد اکبر نوفل تھا اور نوفل عبدالمطلب کا مخالف تھا۔ ایک دفعہ نوفل نے (اپنے بھتیجے) نبی ﷺ کے دادا عبدالمطلب کے محلے پر حملہ کیا اور ان کے گھروں اور زمینوں پر قبضہ کرلیا۔ عبدالمطلب نے پریشانی میں اپنی قوم سے مدد طلب کی مگر کوئی سردار مدد کے لیے نہ آیا۔ تب انھوں نے اپنے ماموں بنونجار کے قبیلہ خزرج کو قصیدہ لکھ بھیجا جس کے نتیجے میں خزرج کی ایک بڑی جماعت کعبے کے صحن میں آن اتری اور وہ گلے میں ڈھالیں آویزاں کیے اپنی کمانوں پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوگئے۔ جب نوفل نے دیکھا تو بولا کہ یہ تو کسی لڑائی کے لیے آئے ہیں۔ جب اس نے ان سے گفتگو کی تو ڈر گیا اور عبدالمطلب کے مکانات اور زمینیں واپس کردیں۔ اس صورت حال کو دیکھ کر طاقتور اور عزت دار بنوخزاعہ والوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! ہم نے اس وادی میں عبدالمطلب سے خوبصورت، صحت منداور بردبار شخص نہیں دیکھا، ان کے ننھیال خزرج نے ان کی مدد کی ہے۔ اور جس طرح خزرج ان کے ننھیال ہیں، اسی طرح ہم بھی ان کے ننھیال ہیں کیونکہ ان کے دادا عبد مناف ہمارے سردار حلیل بن حبشیہ کی بیٹی حُبّی کے بیٹے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم آپس میں حلیف بن جائیں، ایک دوسرے کی مدد کریں اور فائدہ حاصل کریں۔'' چنانچہ بنوخزاعہ کے سردار عبدالمطلب کے پاس آئے اور کہا: ''اے ابوالحارث! جس طرح بنونجار سے آپ کا تعلق ہے کہ وہ آپ کے ننھیال ہیں اسی طرح ہم بھی آپ کے ننھیال سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر ہم ایک دوسرے کے پڑوسی بھی ہیں۔ پرانے دن گزر گئے اور دلوں سے کینے نکل گئے۔ آئیے! آپس میں

ایک دوسرے کے حلیف بن جائیں۔'' عبدالمطلب کو یہ بات پسند آئی اور انھوں نے اس مشورے کو فوراً قبول کرلیا۔ بنونوفل اور عبدشمس نے اس معاہدے میں شرکت نہ کی۔[1]

مندرجہ بالا تاریخی مطالعے سے خزاعہ اور قریش کے درمیان جاری رہنے والی جنگ کے اسباب کا پتا چلتا ہے کہ ایک زمانے میں جب بیت اللہ کا انتظام اور عرب کی سرداری خزاعہ کے پاس تھی، قصی بن کلاب نے مختلف مقامات سے قریش کو اکٹھا کیا اور خزاعہ کو وہاں سے نکال دیا اور مکہ کو چار عہدوں میں قریش پر تقسیم کردیا۔ اس دن سے خزاعہ قریش سے دشمنی اور نفرت رکھتے تھے۔ اب جبکہ قریش اور عبدالمطلب کے درمیان اختلاف پیدا ہوا تو خزاعہ نے عبدالمطلب سے حلیفانہ معاہدہ کرلیا اور اس کا مقصد قریش سے بدلہ لینا اور اپنی تعداد بڑھانا تھا اور ان کی یہ بات قطعاً درست نہیں تھی کہ قریش کے بارے میں ان کے دل صاف ہوچکے ہیں، بلکہ کینے موجود تھے اور جنگ جاری تھی کیونکہ بنونوفل اور بنوعبدشمس اس معاہدے کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھتے ہوئے، اس میں شریک نہ ہوئے۔

اب جبکہ نبی ﷺ نے بنوخزاعہ کا آدمی بنی نوفل کے سردار کے پاس بھیجنے کے لیے منتخب کیا تو یہاں درحقیقت مذکورہ تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کرنا اور عبدالمطلب اور بنوخزاعہ کے درمیان معاہدے کی یاددہانی کرنا مقصود تھا جو بنونوفل اور بنوعبدشمس کے خلاف طے پایا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ سمجھ لیں کہ رسول اللہ ﷺ مکہ میں کمزور بن کر بیٹھے نہیں رہیں گے، بلکہ بنوخزاعہ سے تعلقات قائم کریں گے یا خزرج سے مدد مانگیں گے جیسے آپ کے دادا عبدالمطلب نے کیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ درحقیقت مطعم بن عدی سے اس لیے پناہ حاصل کرنا چاہتے تھے کہ اس کی طرف سے آپ ﷺ کو ڈرانے اور دھمکانے کا سلسلہ رک جائے۔ اور مطعم بن عدی آپ ﷺ کی حمایت کسی مہربانی اور نیکی کے جذبے سے نہیں کررہا تھا بلکہ وہ تو صرف اپنے

---

[1] أنساب الأشراف للبلاذري، تحقيق محمد حميد الله: 71/1.

مفاد اور پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے کر رہا تھا اور قریش نبی ﷺ کو بنو نوفل کے پہرے میں جاتے خاموشی سے اس لیے دیکھ رہے تھے کہ وہ بنو نوفل کی تلواروں سے خائف نہ تھے، بلکہ وہ بنو خزاعہ کی تلواروں اور خزرج کے تیر کمانوں سے خائف تھے۔[1]

اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مطعم بن عدی ہی وہ شخص تھا جس نے مقاطعے کے ظالمانہ عہدنامے کو چاک کرنے میں دیگر احباب کی مدد کی تھی اور یہ وہی تھا جسے ابو طالب نے دھمکایا تھا اور اس کے بعد سے اس کا رویہ بہتر ہو گیا تھا۔ ابو طالب نے کہا تھا:

> ”اے مطعم! کوئی ایسا دن جس میں تجھے مدد کی ضرورت ہو یا کوئی بڑا سانحہ پیش آئے، میں تجھے تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ اللہ کریم عبد شمس اور نوفل کو جلد از جلد ہماری طرف سے بری سزا دے جس میں تاخیر نہ ہو۔“[2]

رسول اللہ ﷺ نے مطعم بن عدی کے اس احسان کو یاد رکھا اور آپ کو اس انتہائی خطرناک صورتحال کا احساس تھا جب اس نے اپنے آپ، اپنی اولاد اور قبیلے کو نبی ﷺ کی خاطر داؤ پر لگا دیا تھا، لہٰذا جب بدر کے ستر قیدیوں کا مسئلہ پیش آیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: «لَوْ كَانَ الْمُطْعِمُ بْنُ عَدِيٍّ حَيًّا ثُمَّ كَلَّمَنِي فِي هٰؤُلَاءِ النَّتْنٰى لَتَرَكْتُهُمْ لَهٗ»

> ”اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور ان بدبودار قیدیوں کے بارے میں مجھ سے سفارش کرتے تو میں اس کے باعث ان سب کو چھوڑ دیتا۔“[3]

نظریاتی اختلاف اور دشمنی کے باوجود نبی ﷺ اسلامی نظریے سے دشمنی کرنے اور لڑائی مول لینے والوں اور مسلمانوں سے تعاون اور دوستی کا برتاؤ کرنے والوں کے مابین فرق روا رکھتے تھے، خواہ وہ کفار ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ نبی ﷺ کی شان سے بعید تھا کہ آپ کسی

---

[1] أصول الفكر السياسي للتجاني عبد القادر، ص: 180. [2] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 36. [3] صحيح البخاري، حديث: 4024، وسنن أبي داود، حديث: 2689.

کا احسان نہ مانیں۔[1] رسول اللہ ﷺ کے شاعر حسان بن ثابت ؓ نے مطعم کے اس احسان پر اپنے اشعار میں اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

> ”اگر آج کسی شخص کو اس کی بزرگی اور نیک نامی نجات دے سکتی تو وہ مطعم بن عدی ہوتا۔ اے مطعم! تو نے رسول اللہ ﷺ کو لوگوں سے تحفظ دلایا تو سب تیرے ایسے مطیع ہوگئے کہ تیری اجازت کے بغیر کسی نے نہ تلبیہ پکارا اور نہ احرام باندھا۔
>
> پس اگر مطعم کے بارے میں بنومعد، بنوقحطان اور بنو جرہم کے باقی ماندہ قبائل سے پوچھا جائے تو وہ کہیں گے: اپنے پڑوسی سے عہد نبھانے والا اور ذمہ داری عائد ہونے کی صورت میں اسے پورا کرنے والا تھا۔
>
> اور اس سے زیادہ عزت وشرف کے مالک شخص پر آج تک روشن سورج طلوع نہیں ہوا۔ وہ عزت نفس اور اچھی طبیعت کا مالک ہے اور جب رات کا اندھیرا چھا جائے تو وہ پڑوسی سے برا سلوک نہیں کرتا۔“[2]

رسول اللہ ﷺ کا حسان بن ثابت ؓ کی طرف سے مطعم بن عدی کی تعریف پر اعتراض نہ کرنا بلکہ آپ ﷺ کا خود اس کے بارے میں اچھے کلمات کہنا اور یہ خواہش ظاہر کرنا کہ اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور بدر کے قیدیوں کے بارے میں سفارش کرتے تو میں تمام قیدیوں کو ان کے کہنے پر چھوڑ دیتا، یہ سب کچھ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اسلامی شریعت اہل فضیلت کو ان کا مقام دیتی ہے اور ان کی خوبیوں کی معترف ہوتی ہے اگرچہ وہ مسلمان نہ بھی ہوں۔[3]

اسی طرح نبی ﷺ دینی مصلحت کی خاطر معاشرے کے رواج اور عادات کو بھی اختیار فرما لیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ ایک جمے جمائے معاشرے کو مسلمہ تاریخی حقیقت خیال کرتے تھے اور ایک کافر انسان کو بھی معاشرے سے الگ شمار نہیں کرتے تھے بلکہ اسے اس

---

[1] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 44. [2] البداية والنهاية: 136/3. [3] التاريخ الإسلامي للحميدي: 32/3.

معاشرے کے توسیع شدہ ڈھانچے کا حصہ سمجھتے جس میں افرادِ معاشرہ باہمی تعلقات اور ضروریات میں گندھے ہوئے ہیں۔

ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے جب بھی کوئی موقع میسر آئے تو وہ اپنے آپ کو بدل لے اور اپنے منشور کو ایک موثر معاشرتی قوت میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔ وہ خودمختار ہے کہ اپنی اقدار کے مطابق معاہدے کرے یا توڑ دے۔ جہاں تک مطعم بن عدی کا تعلق ہے، وہ ایک فرد نہیں بلکہ ایک ادارہ تھا جس کے ڈانڈے عرب معاشرے کی پرانی تاریخ سے ملتے تھے جس میں توحید اور شرک آپس میں نبرد آزما نظر آتے تھے، اس لیے آج بھی اگر کوئی غیر مسلم تنظیم سامنے آئے تو اس سے فائدہ حاصل کرنے اور اسے توحید و ایمان کی طرف مائل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔[1]

سفر طائف کے دوران رسول اللہ ﷺ کو بہت بڑی دعوتی کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں جن میں نصرانی غلام عدّاس کا قبول اسلام اور ان سات جنوں کا اسلام لانا شامل ہے جو مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد اپنی قوم کو شرک سے ڈرانے اور اسلام کی دعوت دینے کے لیے روانہ ہو گئے۔[2]

عدّاس کا قصۂ قبولِ اسلام

جب نبی ﷺ کو اہل طائف نے اذیت پہنچائی اور آپ کو مجبوراً عتبہ و شیبہ کے باغ میں پناہ لینی پڑی اور ان دونوں نے آپ پر ترس کھایا اور اپنے غلام عدّاس نصرانی سے کہا کہ انگور کا ایک خوشہ تھال میں رکھ کر کھانے کے لیے انھیں دو تو عداس نے ایسے ہی کیا اور نبی ﷺ کو تناول کرنے کے لیے کہا۔ جب آپ نے اس تھال سے خوشہ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ”بسم اللہ“ کہا، پھر کھایا۔ عدّاس نے آپ کے چہرے کو دیکھ کر کہا: ”ایسا کلام تو اس علاقے میں کوئی بھی نہیں کہتا۔“ آپ ﷺ نے پوچھا: «وَ مِنْ أَهْلِ أَيِّ الْبِلَادِ

---

[1] أصول الفكر السياسي للتجاني عبدالقادر، ص:181. [2] الرسول المبلغ للخالدي، ص:40,39.

أَنْتَ يَا عَدَّاسُ؟ وَمَا دِينُكَ؟» ”تم کس علاقے سے تعلق رکھتے ہو اے عداس! اور تمھارا دین کیا ہے؟“ عدّاس نے کہا: ”میں نینویٰ سے ہوں اور عیسائی ہوں۔“ یہ سنتے ہی آپ ﷺ نے فرمایا: «مِنْ قَرْيَةِ الرَّجُلِ الصَّالِحِ يُونُسَ بْنِ مَتّٰى؟» ”تم بلند کردار کی حامل شخصیت یونس بن متیٰ کی بستی سے ہو؟“ اس پر عدّاس بول اٹھا: ”آپ انھیں کیسے جانتے ہیں؟“ نبی ﷺ نے فرمایا: «ذَاكَ أَخِي، كَانَ نَبِيًّا وَّ أَنَا نَبِيٌّ» ”وہ میرا بھائی ہے، وہ نبی تھا اور میں بھی نبی ہوں۔“ تب عدّاس نے جھک کر آپ ﷺ کے سر، ہاتھوں اور پاؤں کو بوسہ دیا۔ یہ دیکھ کر ربیعہ کے ایک بیٹے نے دوسرے سے کہا: ”تیرے غلام کو اس نے برباد کردیا“ پھر عدّاس کے واپس آنے پر انھوں نے کہا: ”تو ہلاک ہو، اس کے ہاتھ پاؤں پر بوسے کیوں دے رہا تھا؟“ عدّاس نے کہا: ”اے میرے آقا! اس سے بہتر آدمی آج روئے زمین پر اور کوئی نہیں کیونکہ اس نے مجھے جو خبر دی وہ سوائے نبی کے کوئی نہیں جانتا۔“ دونوں نے کہا: ”تیری تباہی ہو، اپنے دین سے کبھی نہ پھرتا۔ تیرا دین اس کے دین سے بہتر ہے۔“[1]

کھانے سے پہلے نبی ﷺ کا بسم اللہ پڑھنا اسلام کے واضح احکامات میں سے ایک ہے اور اس کی برکت سے ایک عیسائی غلام اسلام کی طرف مائل ہوا۔ جیسے ہی نبی ﷺ نے کھانے سے قبل اللہ کا نام لیا اس عیسائی غلام کے دل کی دنیا بدل گئی اور اس کے احساسات جوش مارنے لگے۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ اس علاقے میں اللہ کے نام کا رواج ہی نہیں اور اسی وجہ سے مجھے تعجب ہوا ہے۔

تمام ظاہر سنتوں کی طرح کھانے سے قبل بسم اللہ پڑھنا مسلمانوں اور بت پرستوں کے درمیان حد فاصل ہے اور یہی فرق کافروں کو متوجہ کرتا ہے، پھر وہ اس بارے میں سوال کرتے ہیں اور یہی فرق انھیں دین اسلام کی طرف کھینچ کر لاسکتا ہے۔[2]

---

[1] صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 137,136، ودلائل النبوة للبيهقي: 288/2.

[2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 22/3.

عدّاس کو نبی ﷺ کی نبوت پر پکا یقین تھا، اس کا واضح ثبوت اس وقت ملا جب عتبہ و شیبہ نے بدر کے دن آپ کے خلاف جنگ کے لیے عدّاس کو تیاری کا حکم دیا تو اس نے کہا: ''اللہ کی قسم! اس آدمی (نبی ﷺ) کے مقابلے میں پہاڑ بھی نہیں ٹھہر سکتے۔'' اس پر ان دونوں نے کہا: ''تو تباہ ہو، محسوس ہوتا ہے اس نے تجھ پر جادو کر دیا ہے۔''[1]

عدّاس نے جب یہ کہا کہ ''اللہ کی قسم! روئے زمین پر اس سے بہتر کوئی شخص نہیں'' تو یہ جملہ نبی ﷺ کے لیے انتہائی غمگساری کے جذبات کا حامل تھا۔ اگر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ اپنا اپنا نصیب کہ قریب والے لوگوں نے آپ کو جھٹلایا اور دوسری طرف نینویٰ (عراق) سے آنے والا آدمی نبی ﷺ کی رسالت کا اقرار کرتے ہوئے آپ ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں کو جھک کر بوسے دے رہا ہے۔ یہ محض اللہ کی توفیق سے ہے۔[2]

جنات کا مسلمان ہونا

جب رسول اللہ ﷺ سرداران بنوثقیف سے ناامید ہو کر واپس مکہ تشریف لا رہے تھے تو آپ ﷺ نے وادیِ نخلہ میں قیام کیا اور رات کو نماز کے لیے کھڑے ہوئے، اس وقت وہاں سے نُصیبین علاقے کے جنوں کا قافلہ گزرا۔ انھوں نے آپ ﷺ کی زبان سے قرآن سنا تو وہ مسلمان ہو گئے اور اسی وقت ڈرانے کی غرض سے اپنی قوم کی طرف روانہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس قصے سے آگاہ فرمایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ○ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○﴾

''اور (یاد کیجیے) جب ہم نے جنوں کی ایک جماعت کو آپ کی طرف متوجہ کیا،

---

[1] سبل الهدیٰ والرشاد للصالحي:578/2. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان:347/1.

> جبکہ وہ قرآن سنتے تھے، پھر جب وہ اس (کی تلاوت سننے) کو حاضر ہوئے، تو (ایک دوسرے سے) کہا: خاموش رہو، چنانچہ جب (تلاوت) ختم ہوگئی تو وہ اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر پھرے۔ انھوں نے کہا: اے ہماری قوم! بے شک ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، وہ ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے کی ہیں، وہ حق کی طرف اور صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔'' [1]

یہ جنّ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وادی نخلہ میں اترے۔ قرآن سنا تو ایک دوسرے کو خاموش رہنے کی تاکید کرنے لگے اور مسلمان ہوگئے۔ یہی وہ دعوت ہے جسے مشرکینِ طائف نے رد کر دیا تو اس کی قبولیت عالَم جنّ کی طرف منتقل ہوگئی، پھر وہ جنات یہ دعوت لے کر اپنی قوم کی طرف اس طرح روانہ ہوئے جس طرح ابوذر غِفاری، طُفَیل بن عمرو اور ضماد ازدی رضی اللہ عنہم اپنی اپنی قوم کی طرف گئے تھے۔ یوں جنات بھی اللہ کے داعیوں کی صفوں میں شامل ہوگئے۔ انھوں نے اپنی قوم سے کہا:

﴿يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○﴾

> ''اے ہماری قوم! اللہ کے داعی کی بات کو قبول کر لو اور اس پر ایمان لے آؤ، وہ تمھارے لیے تمھارے (کچھ) گناہ بخش دے گا اور وہ تمھیں نہایت دردناک عذاب سے پناہ دے گا۔'' [2]

اب نامِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف انسانوں کے دلوں کا مرکز نہیں، بلکہ جنات کے دلوں کا مرکز بھی بن گیا اور جنات میں سے بھی ایسے جاں نثار پیدا ہوگئے جنھوں نے علمِ توحید اٹھایا اور اپنے آپ کو دعوت الی اللہ کی طرف مائل کر لیا اور ان کے حق میں اترنے والا قرآن

---

[1] الأحقاف 46:29، 30. [2] الأحقاف 46:31.

سورۂ جن میں شامل آیات کی صورت میں قیامت تک پڑھا جاتا رہے گا۔

جب نبی ﷺ میدانِ دعوت میں اس ربانی فتح سے ہمکنار ہوئے، آپ وادیِ نخلہ میں تھے اور مکہ میں داخل ہونے سے عاجز تھے۔ اب کیا طائف اور مکہ کے سرکش لوگ ان ایماندار جنوں کو قید یا مختلف تکالیف سے دوچار کر سکتے تھے؟ ہرگز نہیں!

بعدازاں جب نبی ﷺ مطعم بن عدی کی پناہ میں آئے اور اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو سورۂ جن پڑھ کر سنائی تو دعوت اسلامی کی اس عظیم فتح سے متاثر ہو کر ان کے دل جھومنے لگے اور اسلام کا جھنڈا بلند ہوتا دکھائی دینے لگا۔ کیونکہ اب اس جنگ میں صرف انسان ہی نہیں، ان کے بھائی بند جنات بھی شرک کا مقابلہ کرتے نظر آنے لگے تھے۔ پہلی ملاقات کے چند مہینے بعد جنّات کا ایک اور وفد آپ ﷺ کی زیارت کا شوق لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھوں نے اللہ کا کلام سنا۔

حضرت علقمہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال کیا: کیا آپ میں سے کوئی جنات والی رات نبی ﷺ کے ساتھ تھا؟ انھوں نے فرمایا: ’’نہیں بلکہ قصہ یوں ہے کہ ہم ایک رات آپ ﷺ کے ساتھ تھے کہ اچانک آپ مفقود ہو گئے۔ ہم نے وادیوں اور گھاٹیوں میں آپ ﷺ کو تلاش کیا لیکن آپ نہ ملے اور ہم کہہ رہے تھے کہ آپ کو کوئی اڑا کر یا اٹھا کر لے گیا ہے۔ یہ رات ہماری بدترین رات تھی، صبح کے وقت آپ ﷺ حرا کی طرف سے تشریف لائے تو ہم نے عرض کیا: ’’اے اللہ کے رسول! ہم نے آپ کو نہ پا کر بہت تلاش کیا لیکن آپ نہیں ملے اور ہم نے رات بہت تکلیف میں گزاری۔‘‘ آپ ﷺ یوں گویا ہوئے: «أَتَانِي دَاعِي الْجِنِّ فَذَهَبْتُ مَعَهُ، فَقَرَأْتُ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنَ» ’’میرے پاس جنوں کا ایک داعی آیا تو میں اس کے ساتھ چلا گیا اور میں نے انھیں قرآن سنایا۔‘‘ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ ہمیں لے گئے اور ان کی بستیاں اور وہ جگہیں دکھائیں جہاں ان کی آگ جلتی

تھی۔ ان جنوں نے آپ ﷺ سے اپنے زادِ حیات کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «لَكُمْ كُلُّ عَظْمٍ ذُكِرَاسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ، يَقَعُ فِي أَيْدِيكُمْ أَوْفَرَ مَا يَكُونُ لَحْمًا وَكُلُّ بَعْرَةٍ عَلَفٌ لِّدَوَابِّكُمْ» ”تمھارے لیے ہر وہ ہڈی ہے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو جب وہ تمھارے ہاتھ میں آئے گی، گوشت سے بھری ہوگی اور گوبر تمھارے جانوروں کا چارہ ہے۔“ اس لیے آپ ﷺ نے انسانوں سے ارشاد فرمایا:

> «فَلَا تَسْتَنْجُوا بِهِمَا، فَإِنَّهُمَا طَعَامُ إِخْوَانِكُمْ»
>
> ”ان دونوں (گوبر اور ہڈی) کے ساتھ استنجا مت کرو۔ یہ دونوں تمھارے بھائیوں (جنات) کا کھانا ہیں۔“[1]

جنات کی دنیا میں حاصل ہونے والی یہ عظیم فتح اور واضح مدد عالمِ انسان میں حاصل ہونے والی عظیم کامیابیوں کی تمہید اور اساس ثابت ہوئی۔ اس کے چند ہی مہینوں بعد انصار کے وفد سے ملاقات کا واقعہ پیش آیا۔

ڈاکٹر بوطی سفر طائف سے واپسی پر جنات کا واقعہ پیش آنے پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں: ”جو چیز اس واقعے میں اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان جنات کے وجود کو مانیں اور تسلیم کریں کہ وہ بھی ایک جیتی جاگتی دنیا ہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں بھی ہماری طرح مکلّف بنایا ہے۔ اگرچہ ہمارے احساسات اور عقلیں ان کا ادراک نہیں کرسکتیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہماری آنکھوں میں جو دیکھنے کی صلاحیت رکھی ہے وہ جنات کو نہیں دیکھ سکتی۔ ہماری آنکھیں تو موجودات کی چند مقررہ اقسام کو ایک خاص اندازے اور خاص شرائط کے دائرے میں رہ کر ہی دیکھ سکتی ہیں۔ ان مخلوقات کا وجود آیاتِ قرآن اور متواتر احادیث سے ثابت اور واجب التسلیم ہے اور ان کا انکار اللہ اور رسول کی طرف سے پہنچنے والے ارشاداتِ عالیہ کی نفی ہے۔ کسی سمجھدار آدمی کو انتہائی غفلت اور جہالت کا مظاہرہ کرتے ہوئے

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 450.

یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میرا علم جنات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے کیونکہ جو چیز نظر نہ آئے اور محسوس بھی نہ ہو سکے تب بھی اس کے وجود کا عقیدہ رکھنا ممکن نہیں۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ ایسا جاہل اور ظاہری علم کا دعویدار، نظر نہ آنے والی ہر چیز کا انکار کر دے گا، حالانکہ اہل علم کا کلیہ ہے کہ کسی چیز کا علم و شعور نہ ہونا اس کے عدم وجود کی دلیل نہیں ہوتا، یعنی اگر ایک چیز دکھائی نہ دے تو نظر نہ آنے والی اس چیز کا وجود اور عدم وجود لازم نہیں آتے۔''[1]

اس خدا داد عزت افزائی کے بعد کہ آپ ﷺ کی دعوت جن و انس میں پھیل گئی، وہ وقت آن پہنچا تھا کہ آپ آسمانوں تک پہنچیں اور فرشتوں کی دنیا سے ہوتے ہوئے رب جلیل تک آپ کی رسائی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تمام مخلوقات میں سے منتخب فرمایا۔ آپ ﷺ آسمانوں پر تشریف لے گئے اور واپس آ کر اس بابرکت سفر کی سرگزشت سنائی اور آپ نے ایسی معلومات فراہم کیں کہ قیامت تک کوئی بھی ایسی معلومات فراہم نہ کر سکتا۔[2]

---

[1] فقه السيرة للبوطي، ص:106,105. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان:1/446.

باب 4

اسراء ومعراج

پس منظر

ابو طالب کا وجود دراصل نبی ﷺ کے لیے مضبوط باڑ کی حیثیت رکھتا تھا جس سے آپ قریش کا دفاع کرتے تھے اور قریش ابو طالب کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے لیکن یہ رکاوٹ ابو طالب کی وفات کے بعد ختم ہو گئی۔ نبی ﷺ کو بہت زیادہ جسمانی اذیتوں سے گزرنا پڑا۔

اسی طرح آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا مشرکوں کی طرف سے پہنچنے والے روحانی زخموں کی مرہم پٹی کا کام انجام دیتی تھیں۔ جب وہ بھی وفات پا گئیں تو یہ زخم کھلے رہ گئے۔ بعد ازاں جب قریش نے آپ کو ناقابل برداشت اذیتیں دیں تو آپ ﷺ نے سفر طائف اختیار کیا اور سردارانِ طائف سے نصرت و حمایت طلب کی تاکہ اللہ کا دین لوگوں تک پہنچ سکے۔ انھوں نے نہ صرف انکار کیا بلکہ کفار مکہ کو خبر کر دی کہ طائف میں آپ ﷺ پر کیا گزری تھی۔ تب کفار مکہ نے آپ کے خلاف بری نیت سے گھناؤنے منصوبے بنائے، چنانچہ آپ علیہ السلام ایک کافر آدمی کی پناہ میں مکہ میں داخل ہونے پر مجبور ہو گئے۔ چونکہ قریش نے نبی ﷺ سے بہت برا سلوک کیا تھا، لہٰذا آپ انتہائی غمزدہ تھے۔ اس وجہ سے اس سال کا نام ''غم کا سال'' پڑ گیا۔①

---

① دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص: 128.

اسراء و معراج کے مقاصد

اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کے دل کو مضبوط اور اللہ پر اعتماد کو تقویت دینے کی غرض سے اپنی قدرت کی نشانیاں اسی طرح دکھلانا چاہتا تھا جس طرح اس نے موسیٰ علیہ السلام کو دکھائیں۔ تاکہ سرزمین عرب میں کفار کے غلبے کا مقابلہ کیا جا سکے۔

اسراء و معراج کے سفر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی آخرالزماں کو اپنے عجائبات قدرت دکھائے جو ہجرت مدینہ کا پیش خیمہ تھے اور ان میں کفر و ضلالت اور فسق و فجور کی تاریخ کی سب سے بڑی معرکہ آرائی کے لیے تیاری کی طرف اشارہ تھا۔

جو عجائبات اور نشانیاں آپ ﷺ نے دیکھیں ان میں سے بیت المقدس جانا، آسمانوں کی سیر، انبیاء و مرسلین اور فرشتوں سے ملاقات، نیز جنت، دوزخ اور انعام و عذاب کے مشاہدات وغیرہ شامل ہیں۔

اسراء کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں اور معراج کا تذکرہ سورۂ نجم میں ہے۔ اسراء کی حکمت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لِنُرِيَهُۥ مِنْ ءَايَٰتِنَآ ۚ﴾

”تاکہ ہم انھیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔“[1]

معراج کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا:

﴿لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ ءَايَٰتِ رَبِّهِ ٱلْكُبْرَىٰٓ ۝﴾

”البتہ تحقیق انھوں (رسول ﷺ) نے اپنے رب کی بعض بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔“[2]

قصۂ اسراء و معراج میں بہت سے علوم، راز، لطافتیں، اسباق اور نصیحت آموز باتیں شامل ہیں۔[3]

---

[1] بنیٓ إسرآء یل 1:17. [2] النجم 18:53. [3] الأساس في السنة لسعید حوّی: 292,291/1.

مولانا ابو الحسن ندوی لکھتے ہیں: ’’قصہ اسراء محض ایک انوکھا واقعہ ہی نہ تھا جس میں رسول اللہ ﷺ نے عجائبات قدرت کا مشاہدہ کیا اور آپ ﷺ پر زمین و آسمان کے راز عیاں ہوئے بلکہ یہ واقعہ بہت سی باریکیوں اور دوررس نتائج کا بھی حامل تھا۔ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ نجم جن میں یہ قصہ مذکور ہے، ان میں بتایا گیا کہ آپ ﷺ دونوں قبلوں کے نبی، مشرق و مغرب کے امام، سابقہ انبیاء کے وارث اور بعد میں آنے والے لوگوں کے پیشوا ہیں۔ آپ کے سفر اسراء میں مکہ بیت المقدس سے اور بیت الحرام مسجد اقصیٰ سے جاملا اور تمام انبیاء نے آپ ہی کی اقتدا میں نماز ادا کی جہاں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کی رسالت تمام انسانیت کے لیے، آپ کی امامت قیامت تک کے لیے اور آپ کی تعلیمات تمام انسانوں اور ہر زمانے اور ہر مقام کے لیے ہیں، نیز یہ بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کی شخصیت کا تعارف کیا ہے، آپ کی قیادت و امامت کے اوصاف کیا ہیں اور آپ کی امت کا مقام و مرتبہ کیا ہے جس میں آپ مبعوث ہوئے اور جو آپ پر ایمان لائے۔ آپ کی رسالت اور آپ کے پیغمبرانہ کردار کا شعور حاصل ہوتا ہے جو دنیا اور اقوام و قبائل پر اپنے گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔‘‘ [1]

اسراء و معراج احادیث کی روشنی میں

حضرت انس بن مالک ؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ’’میرے پاس بُراق لایا گیا جو ایک سفید رنگ کا لمبا سا جانور تھا۔ جس کا قد گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا۔ وہ اپنا ہر قدم نظر کی انتہا پر رکھتا تھا۔ میں اس پر سوار ہوگیا اور بیت المقدس جا پہنچا اور اسے اس حلقے سے باندھ دیا جہاں پیغمبر اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے، پھر میں مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا اور دو رکعت ادا کیں اور جب میں باہر نکلا تو جبریل میرے پاس دو پیالے لائے، ایک میں

---

[1] الأساس في السنة لسعيد حوّى: 292/1.

دودھ تھا اور دوسرے میں شراب تھی۔ میں نے دودھ لے لیا۔'' جبریل نے کہا:

''آپ نے فطرت کا انتخاب کیا ہے۔''[1]

حضرت مالک بن صَعْصَعہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصۂ اسراء بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''میں حطیم میں (ایک روایت میں حجر کے لفظ ہیں) بیٹھا تھا، ایک آنے والا (جبریل) آیا۔ اس نے مجھے یہاں سے یہاں تک چیر دیا۔'' ایک روایت میں شق (پھاڑنے) کا لفظ ہے۔

مالک کہتے ہیں: میرے پاس جارود بیٹھے ہوئے تھے میں نے اس اشارے (یہاں سے یہاں تک) کا مطلب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ مراد حلق سے زیر ناف تک ہے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پھر اس نے میرا دل نکالا اور اسے سونے کے تھال میں جو ایمان سے بھرا ہوا تھا رکھ دیا، پھر میرے دل کو دھویا گیا اور ایمان سے بھر کر دوبارہ میرے سینے میں رکھ دیا گیا، پھر میرے پاس ایک جانور جو گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا لایا گیا جس کا رنگ سفید تھا۔''

جارود کہنے لگے: ''اے ابوحمزہ! کیا وہ براق تھا؟''

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''ہاں۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ اپنا قدم انتہائے نظر پہ رکھتا تھا، پھر مجھے اس پر سوار کیا گیا اور جبریل علیہ السلام مجھے لے کر آسمان دنیا تک پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ پوچھا گیا: ''کون ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''میں ہوں۔''

پھر پوچھا گیا: ''آپ کے ساتھ کون ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 162.

پوچھا گیا: ’’کیا انھیں بلایا گیا ہے؟‘‘

جبریل علیہ السلام نے کہا: ’’ہاں۔‘‘ تب مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا اور دروازہ کھل گیا۔

(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:) جب میں پہلے آسمان پر پہنچا تو وہاں آدم علیہ السلام موجود تھے۔ کہا گیا کہ یہ آپ کے والد آدم علیہ السلام ہیں، آپ انھیں سلام کہیے۔ میرے سلام کہنے پر انھوں نے جواب دیا، پھر کہا: ’’نیک بیٹے اور نیک نبی کا آنا مبارک ہو۔‘‘

پھر مجھے دوسرے آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ وہاں بھی دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔

پوچھا گیا: ’’کون ہے؟‘‘

جبریل علیہ السلام نے کہا: ’’میں ہوں۔‘‘

پوچھا گیا: ’’آپ کے ساتھ کون ہے؟‘‘

جبریل علیہ السلام نے کہا: ’’محمد ﷺ ہیں۔‘‘

پوچھا گیا: ’’کیا انھیں یہاں بلایا گیا ہے؟‘‘

جبریل علیہ السلام نے کہا: ’’ہاں‘‘ پھر مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا اور دروازہ کھل گیا۔ جب میں دوسرے آسمان پر پہنچا تو وہاں یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام کو پایا۔ وہ دونوں خالہ زاد ہیں۔

جبریل علیہ السلام نے کہا: ’’یہ یحییٰ و عیسیٰ ہیں، انھیں سلام کیجیے۔‘‘

میں نے انھیں سلام کیا۔

انھوں نے مجھے سلام کا جواب دیا اور کہا: ’’نیک بھائی اور نیک نبی کو خوش آمدید۔‘‘

پھر مجھے تیسرے آسمان کی طرف لے جایا گیا، جبریل علیہ السلام نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پوچھا گیا: ’’کون ہے؟‘‘

جبریل علیہ السلام نے کہا: ’’میں ہوں۔‘‘

پھر پوچھا گیا: ’’آپ کے ساتھ کون ہیں؟‘‘

جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ محمد (ﷺ) ہیں۔

پوچھا گیا: ''کیا انھیں یہاں آنے کی دعوت دی گئی ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''ہاں۔'' پھر مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا اور دروازہ کھل گیا۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:) جب میں تیسرے آسمان پر پہنچا تو حضرت یوسف علیہ السلام کو وہاں پایا۔

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''یہ یوسف علیہ السلام ہیں، انھیں سلام کیجیے۔''

میں نے انھیں سلام کیا اور انھوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا: ''نیک بھائی، نیک نبی کا آنا مبارک ہو۔''

پھر مجھے چوتھے آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ جبریل علیہ السلام نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پوچھا گیا: ''کون ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''میں۔''

پوچھا گیا: ''آپ کے ساتھ کون ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔

پوچھا گیا: ''کیا انھیں یہاں بلوایا گیا ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے بتایا: ''ہاں۔''

پھر مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا اور دروازہ کھل گیا۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:) جب میں اندر پہنچا تو ادریس علیہ السلام کو وہاں پایا۔

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''یہ ادریس علیہ السلام ہیں، انھیں سلام کہیے۔''

میں نے انھیں سلام کیا تو انھوں نے مجھے سلام کا جواب دیا اور کہا: ''اچھے بھائی اور اچھے نبی کا یہاں آنا مبارک ہو۔''

پھر مجھے پانچویں آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ جبریل علیہ السلام نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پوچھا گیا: ''کون ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے کہا: ”میں ہوں۔“

پوچھا گیا: ”آپ کے ساتھ کون ہے؟“

جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ محمد ﷺ ہیں۔

پوچھا گیا: ”کیا انھیں یہاں آنے کی دعوت ملی ہے؟“

جبریل علیہ السلام نے بتایا: ”ہاں، پھر مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا اور دروازہ کھل گیا۔

جب میں اندر پہنچا تو حضرت ہارون علیہ السلام کو وہاں پایا۔

جبریل علیہ السلام نے کہا: ”یہ ہارون علیہ السلام ہیں، انھیں سلام کیجیے۔“ میں نے انھیں سلام کیا۔

انھوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا: ”صالح بھائی اور صالح نبی کا آنا مبارک ہو۔“

پھر مجھے چھٹے آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ جبریل علیہ السلام نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پوچھا گیا: ”کون ہے؟“

جبریل علیہ السلام نے کہا: ”میں ہوں۔“

پوچھا گیا: ”آپ کے ساتھ کون ہے؟“

جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ محمد (ﷺ) ہیں۔

پوچھا گیا: ”کیا انھیں بلایا گیا ہے؟“

جبریل علیہ السلام نے کہا: ”ہاں۔“

تب مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا اور دروازہ کھل گیا۔

(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:) جب میں اندر پہنچا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہاں پایا۔

جبریل علیہ السلام نے کہا: ”یہ موسیٰ ہیں، انھیں سلام کیجیے۔“

میں نے موسیٰ علیہ السلام کو سلام کیا۔ انھوں نے مجھے سلام کا جواب دیا اور کہا: ”اچھے بھائی اور صالح نبی کا آنا مبارک ہو۔“

جب میں آگے بڑھنے لگا تو وہ رو پڑے۔ پوچھا گیا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: ’’میں اس لیے روتا ہوں کہ ایک لڑکا جو میرے بعد نبی بن کر مبعوث ہوا، اس کی امت کے لوگ میری امت سے زیادہ جنت میں جائیں گے۔‘‘

پھر مجھے ساتویں آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ جبریل علیہ السلام نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پوچھا گیا: ’’کون ہے؟‘‘

جبریل علیہ السلام نے کہا: ’’میں ہوں۔‘‘

پوچھا گیا: ’’آپ کے ساتھ کون ہے؟‘‘

جبریل علیہ السلام نے کہا: ’’محمد (ﷺ) ہیں۔‘‘

پوچھا گیا: ’’کیا انھیں یہاں آنے کی دعوت دی گئی ہے؟‘‘

جبریل علیہ السلام نے کہا: ’’ہاں۔‘‘

اس پر مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا اور دروازہ کھل گیا۔

(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:) میں اندر داخل ہوا تو وہاں ابراہیم علیہ السلام کو پایا۔

جبریل علیہ السلام نے کہا: ’’یہ ابراہیم ہیں، انھیں سلام کیجیے۔‘‘

میں نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے میرے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: ’’نیک بیٹے اور صالح نبی کا یہاں آنا مبارک ہو۔‘‘

(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:) پھر سدرۃ المنتہٰی میرے قریب کر دیا گیا۔ اچانک دیکھتا ہوں کہ اس کے بیر ہَجَر[1] شہر کے مٹکوں جتنے بڑے تھے اور اس کے پتے ہاتھیوں کے کانوں کی طرح تھے۔

حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا: ’’یہ سدرۃ المنتہٰی ہے۔‘‘

پھر میں نے چار نہریں دیکھیں۔ دو باطنی (پوشیدہ) اور دو ظاہری تھیں۔

میں نے جبریل علیہ السلام سے ان کے بارے میں پوچھا تو جبریل علیہ السلام نے بتایا: ’’پوشیدہ نہریں جنت میں جاتی ہیں اور ظاہری نہریں نیل اور فرات ہیں۔‘‘

---

[1] ہجر: یہ قدیم بحرین (سعودی عرب کا مشرقی علاقہ الاحساء) کا ایک قصبہ ہے۔

پھر بیت المعمور کو میرے قریب کر دیا گیا، پھر میرے پاس تین برتن لائے گئے، ایک میں شراب، دوسرے میں دودھ اور تیسرے میں شہد تھا۔ میں نے دودھ کو پسند کیا تو جبریل علیہ السلام نے کہا: ''آپ نے فطرت کو پسند کیا ہے جس پر آپ اور آپ کی امت کار بند ہیں۔''

نبی ﷺ نے فرمایا: ''پھر مجھ پر دن رات کے لیے پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ جب میں واپس آیا اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو انھوں نے پوچھا: ''کیا حکم ملا؟''

میں نے بتایا ''روزانہ پچاس نمازوں کا حکم ہوا ہے۔''

موسیٰ علیہ السلام فرمانے لگے: ''آپ کی امت روزانہ پچاس نمازیں ادا نہیں کر سکتی۔ اللہ کی قسم! میں نے آپ سے قبل لوگوں کو آزمایا ہے اور بنی اسرائیل سے اس معاملے میں میری بہت زیادہ کشمکش رہی ہے، واپس اپنے رب کے پاس جا کر امت کے لیے تخفیف کا سوال کریں۔''

میں واپس گیا تو اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں کم کر دیں۔ جب دوبارہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزر ہوا تو انھوں نے پھر پہلے والی بات دہرائی۔ اب دس نمازیں اور کم ہو گئیں۔ تیسری دفعہ پھر موسیٰ علیہ السلام نے وہی بات دہرائی، اب دس نمازیں مزید کم ہو گئیں، پھر جب چوتھی مرتبہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو انھوں نے پہلے والی بات دہرائی، میں واپس گیا تو (مزید دس نمازیں کم ہو گئیں) اب میری امت پر روزانہ دس نمازیں فرض ہو گئیں۔ پانچویں دفعہ پھر موسیٰ علیہ السلام نے وہی مشورہ دیا تو میں نے اپنے اللہ سے امت کے لیے تخفیف کا سوال کیا۔ یوں مجھے پانچ نمازوں کا حکم مل گیا۔ اب جب موسیٰ علیہ السلام کے پاس واپس آیا تو انھوں نے پوچھا: ''کیا حکم ہوا؟''

میں نے کہا: ''مجھے روزانہ پانچ نمازوں کا حکم ہوا ہے۔''

موسیٰ علیہ السلام گویا ہوئے: ''آپ کی امت روزانہ پانچ نمازیں بھی ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ میں نے لوگوں کا آپ سے پہلے تجربہ کیا ہے اور بنی اسرائیل کا میں نے سخت ترین تجربہ کیا ہے، آپ واپس جائیں اور امت کے لیے مزید آسانی کا سوال کریں۔''

اس پر نبی ﷺ نے فرمایا: ”میں نے اپنے رب سے اتنی بار سوال کیا ہے کہ اب مزید سوال کرتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہوں۔ اب میں اس پر راضی ہوں اور تسلیم کرتا ہوں۔“

نبی ﷺ نے فرمایا: ”جب میں آگے بڑھا تو ایک پکارنے والے نے آواز دی کہ میں نے اپنا فرض کردہ حکم جاری کردیا اور اپنے بندوں سے تخفیف کردی۔“[1]

اسراء و معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الشفاء میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔[2]

جب رسول اللہ ﷺ اپنے اس سفر مبارک سے واپس آئے تو اپنی قوم کو اس کی خبر دی اور آپ ایک ایسی مجلس میں تشریف لائے جس میں مطعم بن عدی، ابوجہل (عَمرو بن ہِشَام) اور وَلید بن مغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے انھیں بتایا کہ میں نے عشاء کی نماز مسجد حرام میں ادا کی تھی، پھر صبح کی نماز بھی یہاں ادا کی۔ اسی دوران میں بیت المقدس گیا اور بہت سے انبیائے کرام علیہم السلام سے بھی ملاقات ہوئی جن میں ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام سرفہرست ہیں۔ میں نے ان کی امامت بھی کی اور ان سے گفتگو بھی کی تو ابوجہل نے مزاحیہ انداز میں کہا: ”میرے سامنے ذرا ان کا حلیہ بیان کیجیے۔“

آپ ﷺ نے فرمایا: ”عیسیٰ علیہ السلام درمیانہ قد سے ذرا بڑے تھے لیکن زیادہ لمبے نہ تھے۔ ان کا سینہ چوڑا اور بال لمبے گھنگھریالے تھے، رنگ سرخ سفیدی مائل تھا۔ ان کی شکل عُروہ بن مسعود ثقفی سے مشابہت رکھتی تھی۔ اور موسیٰ علیہ السلام موٹے گندم گوں اور لمبے قد والے تھے جیسے شنوءہ علاقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے دانت ملے ہوئے، ہونٹ سکڑے ہوئے اور قدرے ترش رو دکھائی دیتے تھے اور ابراہیم علیہ السلام، اللہ کی قسم! وہ سیرت اور صورت میں ہو بہو میرے جیسے تھے۔“[3]

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3887. [2] الشفاء للقاضي عياض: 108/1. [3] التاريخ الإسلامي للحميدي: 37/3.

اب اہل مجلس نے کہا کہ آپ ہمیں بیت المقدس کی نشانیاں بتائیں۔ نبی ﷺ نے معذرت کرتے ہوئے کہا: ”میں رات کے وقت وہاں پہنچا اور رات ہی کو واپس آ گیا۔“ اسی اثناء میں حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور آپ کے پہلو میں کھڑے ہو گئے۔ نبی ﷺ جبریل علیہ السلام کی رہنمائی میں بتانے لگے: ”بیت المقدس کا فلاں دروازہ فلاں جگہ ہے اور دوسرا دروازہ فلاں جگہ ہے۔“

پھر انھوں نے اپنے قافلے کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں رَوحاء نامی مقام پر ایک قافلے کے پاس سے گزرا۔ ان کی ایک اونٹنی گم ہو گئی تھی اور وہ اسے تلاش کر رہے تھے۔ میں ان کے کجاووں کی طرف بڑھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا اور ایک پیالے میں پانی موجود تھا۔ میں نے وہ پانی بھی پیا تھا۔ اب آپ بطور تصدیق اس قافلے سے دریافت کر لیں۔“

قریش نے کہا: ”اللہ کی قسم! یہ نشانی ہو سکتی ہے۔“

آپ ﷺ نے مزید فرمایا: ”پھر میں ایک اور قافلے سے ملا۔ ان کے اونٹ بدکنے لگے اور ایک اونٹ بیٹھ گیا جس کا رنگ سرخ تھا۔ اس پر سفید دھاری دھار جھول بھی تھا۔ اب علم نہیں کہ ان کے اونٹ ملے یا نہیں۔ آپ ان قافلے والوں سے پوچھ لیں۔“

اس پر سب نے کہا: ”بالکل یہ نشانی ہو سکتی ہے۔“

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ”پھر میں ایک اور قافلے سے ابواء میں ملا۔ سب سے آگے ایک خاکستری اونٹ تھا اور وہ ابھی تنعیم گھاٹی سے تمھارے پاس پہنچنے والا ہے۔“

اب ولید بن مغیرہ نے کہا: ”یہ تو جادوگر محسوس ہوتا ہے“ پھر سب اٹھ کر نشانیاں دیکھنے کے لیے چل دیے۔ دیکھا تو ساری نشانیاں پوری ہو گئیں۔ بالآخر سب نے آپ ﷺ پر جادوگر ہونے کی تہمت لگائی اور کہنے لگے: ”وَلید بن مُغیرہ نے جو کہا سچ کہا۔“ [1]

---

[1] المطالب العالية لابن حجر: 4/201-204، والسيرة النبوية لابن هشام: 2/11، و مجمع الزوائد: 1/75,76.

یہ واقعہ ایک طرف تو بعض لوگوں کے لیے جو (نئے نئے) دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے، آزمائش ثابت ہوا اور وہ مرتد ہوگئے۔ اور دوسری طرف کچھ لوگ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور کہا: ''کیا تجھے تیرے پیغمبر کی خبر ہے جو گمان کرتا ہے کہ رات ہی رات بیت المقدس کا سفر کرکے لوٹا ہے؟''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کیا فی الواقع انھوں نے اس طرح کہا ہے؟''

انھوں نے جواب دیا: ''ہاں۔''

اب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے تو سچ فرمایا ہے۔''

لوگوں نے حیران ہوکر پوچھا: ''کیا آپ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ رات ہی رات صبح طلوع ہونے سے قبل بیت المقدس کا سفر کرکے آسکتے ہیں؟''

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہاں، میں ان کے بارے میں اس سے بڑی بات پر یقین رکھتا ہوں وہ یہ کہ صبح وشام ان پر آسمان سے خبریں آتی ہیں۔''

اور یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کا لقب عطا ہوا۔[1]

دروس وعبرتیں

① ہر محنت اور مشقت کے بعد انعام ضرور ملتا ہے۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بہت سی مشقتیں اٹھائیں۔ کبھی قریش نے دعوت کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کیں تو کبھی بنوثقیف اور دیگر قبائل عرب نے مخالفت کی۔ گویا دعوت اسلامی اور اس دعوت کے پیروکاروں کے اردگرد گھیرا تنگ کردیا گیا جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے حمایتی ابوطالب بھی وفات پاگئے تھے، تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذمہ داری نبھاتے رہے، اپنے رب کا حکم پہنچانے کے لیے صبر سے کام لیتے رہے۔ نہ کسی ملامت گر یا لڑنے والے سے گھبرائے اور نہ کسی مذاق کرنے

---

[1] المستدرك للحاكم: 62/3، والسلسلة الصحيحة: 615/1، حديث: 306.

والے کی تدبیر کو خاطر میں لائے۔

اب نبی ﷺ کو ایک بڑے انعام سے نوازنے کا وقت آگیا تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق آپ ﷺ کو اسراء و معراج سے نوازا گیا اور صرف آپ کو اس عظیم اکرام کے لیے منتخب کیا گیا تاکہ آپ ﷺ کو آپ کے صبر و جہاد کا صلہ دیا جاسکے، آپ کو عالمِ ملکوت کی سیر کروائی جائے اور آپ عجائبات قدرت کے نظارے کرسکیں، نیز آپ کی ملاقات آپ کے دیگر انبیاء بھائیوں سے ہوسکے تاکہ آپ ان کے امام اور پیشوا بنیں۔ بلاشبہ محمد ﷺ آخری نبی ہیں جن کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔[1]

② یقیناً اب نبی ﷺ ایک نئے مرحلے کی طرف جو کہ ہجرت مدینہ اور ایک نئی اسلامی مملکت کے قیام کا مرحلہ تھا، پیش قدمی کرنے والے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس مملکت کے بنیادی پتھر صحیح سلامت، ٹھوس، ایک دوسرے کے قریب اور آپس میں مضبوطی سے جڑے ہونے چاہئیں۔ نبی ﷺ کو ایک صبر آزما امتحان و آزمائش سے گزارا تاکہ آپ کے پیروکاروں کا ہراول دستہ کمزوری، دلوں کی بیماری اور شک سے پاک ہو جائے اور طاقتور، مخلص اور ایماندار لوگ جنھوں نے آپ کی تصدیق کی، اب فی الواقع پیغمبر ﷺ کی صداقت کا پکا یقین کرسکیں اور اپنے محبوب مصطفیٰ ﷺ کا یہ عظیم اعزاز دیکھ کر اندازہ لگائیں کہ آپ کتنے عظیم بخت والے ہیں اور کتنی عظیم سعادتیں آپ پر سایہ فگن ہیں، جبکہ وہ نبی ﷺ کے ماننے والے، آپ پر ایمان لانے والے اور اپنی زندگیاں آپ اور آپ کے لائے ہوئے دین پر نچھاور کرنے والے ہیں۔ اور یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ قصۂ معراج جو طائف کی مشکلات، طائف کے شرپسندوں کی اذیت رسانی اور ایک کافر آدمی کی پناہ میں داخلے کے بعد پیش آیا، اس کی وجہ سے ان کا ایمان ان کے دلوں میں کس قدر راسخ ہو گیا ہوگا![2]

③ قصۂ معراج سے آپ ﷺ کی اعلیٰ شجاعت کا پتا چلتا ہے کہ آپ نے قریش کی مخالفت

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان:447/1. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان:451/1.

اور ان کی طرف سے بدسلوکی اور استہزاء کے اندیشے کے باوجود ان کے سامنے اسراء و معراج کے ایسے حقائق رکھے کہ ان کا انکار کرنا تو درکنار وہ اس کا تصور بھی محال سمجھنے لگے۔ گویا کہ نبی ﷺ نے اپنی امت کے لیے اہل باطل کے سامنے حق گوئی کی ایک عمدہ مثال قائم فرمادی، اگرچہ بظاہر قریش نے حق کے خلاف محاذ آرائی اور اپنی پوری طاقت سے مقابلے کی روش جاری رکھی۔ نبی ﷺ نے بڑی حکمت و دانائی سے کفار کے سامنے اسراء و معراج کی حقیقت رکھی اور فی الوقت اللہ تعالیٰ نے تمام علامات بیان کرنے کا موقع بھی فراہم کیا تاکہ کفار کے لیے تصدیق کے بغیر چارۂ کار نہ رہے اور عمومی طور پر مشرکین پر حجت بھی قائم فرمادی۔ وہ علامات مندرجہ ذیل ہیں:

رسول اللہ ﷺ کا بیت المقدس کا نقشہ بیان فرمانا: اللہ تعالیٰ نے مسجد اقصیٰ کو آپ ﷺ کے سامنے منکشف فرمادیا تاکہ آپ مشرکین کو وضاحت سے بتاسکیں۔ کیونکہ ان میں سے بعض شام کا سفر کرچکے تھے اور مسجد اقصیٰ بھی دیکھ چکے تھے، اس لیے انھوں نے اس کی تصدیق بھی کی۔

آپ ﷺ کا رَوحَا نامی جگہ پر قافلے سے ملاقات، ان کے ایک اونٹ کا گم ہونا اور ان کے پیالے سے پانی پینے کی خبر دینا۔

نبی ﷺ کا دوسرے قافلے کی خبر دینا جس میں اونٹ منتشر ہوگئے تھے اور ایک اونٹ کا بالتفصیل حلیہ بیان فرمانا۔

نبی ﷺ کا تیسرے قافلے کی خبر دینا جو ابواء نامی جگہ پر آپ سے ملا اور ان کے پیشرو اونٹ کا حلیہ بتانا، پھر آپ کا ذکر کرنا کہ وہ اب تنعیم کی گھاٹیوں سے نکلنے ہی والا ہے۔ جب مشرکین نے تحقیق کی تو نبی ﷺ کی سب باتیں درست ثابت ہوئیں۔ گویا آپ ﷺ کے تمام دلائل بڑے واضح اور تسلی بخش تھے جنھیں وہ جھٹلا نہ سکے۔

درحقیقت معراج آپ ﷺ کی اللہ تعالیٰ کی جانب سے اعلیٰ تربیت کا حصہ تھا۔ اللہ

کے رسول ﷺ اتنے بلند مقام پر پہنچے جہاں سے کائنات اور اس کی تمام مخلوقات کا مشاہدہ کر سکتے تھے جبکہ کفار اس وسیع کائنات میں ایک نقطے کے مانند اور انتہائی کم حیثیت کے مالک تھے، لہٰذا وہ اس ہستی کے خلاف کس طرح کامیاب ہو سکتے تھے جسے اللہ تعالیٰ نے اس بلند اور مبارک سفر کے لیے ساری مخلوق میں سے منتخب فرمالیا، فرشتوں اور انبیاء سے ملاقات کروائی اور پھر سات آسمانوں، سدرۃ المنتہٰی اور بیت المعمور کا مشاہدہ کروانے کے ساتھ ساتھ بلا واسطہ کلام بھی فرمایا۔ [1]

④ قصۂ معراج میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان بھی نکھر کر سامنے آ گیا جب انھوں نے برملا کہا کہ اگر فی الواقع نبی ﷺ نے یونہی مشاہدۂ معراج کا دعویٰ کیا ہے تو بلاشبہ حق اور سچ ہے کیونکہ میں اس سے بڑے دعوے کی تصدیق کرتا ہوں کہ صبح و شام جبریل علیہ السلام آپ پر پیغام الٰہی لے کر اترتے ہیں۔ یہی وہ علم و یقین کی منزل ہے جس کے باعث آپ صدیق کہلانے کے مستحق ٹھہرے۔ انھوں نے قصۂ معراج کے دعوے اور نزول وحی کے دعوے کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے لوگوں کو بتایا کہ عام آدمی کے لیے ایسا دعویٰ محال اور ناممکن ہے جبکہ نبی ایسا دعویٰ کر سکتا ہے۔ [2]

⑤ سفر معراج میں شق صدر اور آپ ﷺ کے دل میں ایمان وحکمت بھرنے کا تذکرہ کیا گیا تاکہ آپ میں اسراء ومعراج کے مشاہدے کی لیاقت پیدا ہو جائے۔ نہ تو شق صدر سے آپ نے کوئی تکلیف محسوس کی اور نہ دل نکالنے سے آپ کسی قسم کے خوف میں مبتلا ہوئے۔ ایسے خرق عادت واقعات کو تسلیم کرنا اور مبنی برحقیقت ماننا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے کوئی امر محال نہیں ہے۔ [3]

⑥ آپ ﷺ کا دودھ اور شراب کے پیالوں میں سے دودھ والے پیالے کو پسند کرنا اور

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 3/41,42. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 3/43. [3] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 1/189.

جبریل علیہ السلام کا یہ کہنا کہ آپ کی فطرت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ہی دین فطرت ہے اور فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ فطرت اور دین دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور یہ دین انسانوں کی ضروریات کو پورا اور مسائل کو حل کرتا ہے، جائز خواہشات کا احترام کرتا ہے اور خودسری کو لگام دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○﴾

"چنانچہ (اے نبی!) آپ یکسو ہو کر اپنا رخ دین کے لیے سیدھا رکھیں، اللہ کی فطرت (اختیار کرو) جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"[1]

⑦ اس بات پر یقین رکھنا چاہیے کہ آپ ﷺ بیداری کی حالت میں یعنی روح اور جسد کے ساتھ بیت المقدس اور آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ یہی جمہور سلف و خلف کی رائے ہے اور اس شخص کی رائے کو تسلیم نہیں کیا جائے گا جو اسراء و معراج کو روحانی اور نیند کی حالت میں قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہی ہوتا تو اس میں معجزے والی کوئی بات نہ ہوتی اور کفار بھی اسے بعید از عقل سمجھتے نہ جھٹلاتے کیونکہ ایسے خوابوں کو تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا۔[2]

نیز فرمان الٰہی: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ﴾ میں "عبد" سے مراد سیدنا محمد ﷺ ہیں کیونکہ "عبد" کا لفظ روح اور جسد دونوں پر بولا جاتا ہے۔[3]

⑧ نبی ﷺ کا انبیاء کی امامت فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کی قیادت اور پیشوائی کو تسلیم کر رکھا ہے اور شریعت اسلامی تمام شرائع کی ناسخ ہے۔ اب سابقہ انبیاء کی امتوں کو بھی چاہیے کہ آپ ﷺ کی قیادت اور رسالت کو تسلیم کریں جس میں

---

[1] الروم 30:30. [2] المستفاد من قصص القرآن لعبد الکریم زیدان: 91/2. [3] تفسیر ابن کثیر: 23/3، وتفسیر القاسمي: 189/10.

ذرہ بھر باطل شامل نہیں۔

اور جو لوگ ''وحدت ادیان'' کے موضوع پر کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں، انھیں اس حقیقت کو سمجھنا چاہیے اور لوگوں کو قیادت نبوی تسلیم کرنے کی دعوت دینی چاہیے تاکہ وہ منحرف مذاہب سے کنارہ کشی اختیار کریں اور نبی کریم ﷺ کی رسالت پر ایمان لائیں۔ صاحبانِ علم کو چاہیے کہ وہ جاہلیت کے رسم ورواج پر مشتمل نظام کی حامل دعوت کا سختی سے رد کریں۔

اگر عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک طرف الوہیت مسیح، مسیح ابن اللہ، اقانیم ثلاثہ، عزیر ابن اللہ اور تحریف کلام اللہ جیسے نظریات پائے جائیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی الوہیت جس میں کسی کی شراکت نہ ہو اور نہ اس کے باپ بیٹے یا بیوی کا نظریہ پایا جاتا ہو تو تقارب ادیان کی کوشش سرے سے لاحاصل اور بے فائدہ نظر آتی ہے۔[1]

⑨ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کا سفر، اس میں بہت سی حکمتیں، راز اور فوائد پائے جاتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

مسجد اقصیٰ کی اہمیت کو اجاگر کرنا تاکہ مسلمان اس سے محبت کریں اور اسے بابرکت اور مقدس خیال کریں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ کو پہلے بیت المقدس لے جایا گیا، پھر مسجد اقصیٰ کو معراج کی ابتدا قرار دیا گیا اور یاد رہے کہ بیت المقدس ہی مکی دور کا قبلہ تھا۔

مسجد اقصیٰ اور مسجد حرام کا تعلق ہمیں یاد دہانی کرواتا ہے کہ جس طرح مسجد حرام کو شرک کے میل کچیل اور بتوں کی عبادت سے پاک کرنے کا حکم ہے اسی طرح مسجد اقصیٰ کی آزادی اور اسے شرک کی گندگی اور عقیدہ اقانیم ثلاثہ سے پاک کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

اس سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ مسجد اقصیٰ پر تسلط گویا مسجد حرام اور مکہ پر تسلط ہے اور اگر کفار نے مسجد اقصیٰ پر چڑھائی کی ہو تو وہ مسجد حرام پر بری نظر ڈالنے کی تمہید ہے، گویا کہ مسجد اقصیٰ ہی وہ دروازہ ہے جہاں سے گزر کر مسجد حرام تک پہنچا جا سکتا ہے اور مسجد اقصیٰ

---

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 213.

کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر یہود کے قبضے میں چلے جانا اس امر کی دلیل ہے کہ حرم و حجاز کا امن خطرے میں ہے اور دشمن اسے ہڑپ کرنے کے لیے تیار ہے۔

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ صلیبی جنگوں کی تاریخ میں قلعہ کَرَک پر قابض ارناط (ریجنالڈ Reginald) صلیبی نے رسول اللہ ﷺ کے روضہ مبارک کی بے حرمتی اور جسدِ اطہر نکال لے جانے کی غرض سے ایک دستہ روانہ کیا تھا۔ اسی طرح کیتھولک مسیحی پرتگالیوں نے سولھویں صدی عیسوی میں حرمین شریفین پہنچنے کی کوشش کی تھی جس میں وہ ناکام رہے۔ ممالیک اور عثمانیوں نے ان کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا۔

جون 1967ء میں یہودیوں کے بیت المقدس پر قبضے کے بعد ان کے رہنماؤں نے اعلان کیا تھا کہ ان کا اگلا ہدف حجاز پر قبضہ کرنا ہے اور مدینۂ رسول سے پہلے خیبر پر تسلط حاصل کیا جائے گا۔

اسرائیل کے پہلے وزیراعظم ڈیوڈ بن گورین (David ben Gurion) نے بیت المقدس پر قبضے کے بعد یہودی نوجوانوں اور سپاہیوں کو مسجد اقصیٰ کے قریب جمع کر کے پرجوش انداز میں کہا تھا: ''ہم نے قدس حاصل کرلیا ہے اور اب ہم یثرب کی طرف پیش قدمی کریں گے۔''[1]

اسرائیلی وزیراعظم مسز گولڈ مائیر (Gold meir) نے بیت المقدس پر قبضے کے بعد خلیج عقبہ کی بندرگاہ ایلات میں گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا: ''میں مدینہ اور حجاز سے اپنے آباء واجداد کی بُو سونگھ رہی ہوں۔ یہ ہماری ہی سرزمین ہے جسے ہم عنقریب واپس حاصل کرلیں گے۔''[2]

بعدازاں یہودیوں نے اپنے تصورات کی سرزمین کا نقشہ تیار کیا جس میں فرات سے نیل تک کا علاقہ شامل کیا اور جزیرہ نمائے عرب، اردن، شام، عراق، مصر، یمن، کویت اور خلیج عربی کے سارے علاقے کی نشاندہی کی، پھر 1967ء میں بیت المقدس پر قبضے کے

---

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 314. [2] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 314.

بعد یہ نقشہ پورے یورپ میں تقسیم کیا گیا۔[1]

⑩ سورۂ بنی اسرائیل کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے قصۂ اسراء کا ایک ہی آیت میں ذکر فرمایا ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ○﴾

’’پاک ہے وہ (اللہ) جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے ماحول کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہی خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔‘‘[2]

پھر یہود کے جرائم اور برائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان پر واضح کیا گیا کہ قرآن کریم سب سے زیادہ سیدھی راہ دکھلانے والا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیات کا سیاق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عنقریب یہودی انسانیت کے منصب قیادت سے معزول کر دیے جائیں گے کیونکہ ان کے جرائم کی فہرست اتنی طویل ہے کہ وہ اس منصب کے اہل نہیں رہے۔ اب یہ منصب رسول اللہ ﷺ کو عطا ہونے والا ہے اور دونوں ابراہیمی مرکز آپ ﷺ کے زیر نگیں آنے والے ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل میں پہلے فلسطین پر اسرائیلی تسلط بیان کیا گیا ہے، پھر فارس (ایران)[3] اور روم کی دست برد سے نیست و نابود ہونے کا ذکر ملتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو سفرِ اسراء میں عجائبات قدرت دکھانے کی حکمت بھی کچھ اس طرح سمجھ میں آتی ہے کہ دراصل مسجد اقصیٰ کے حوالے سے واضح ترین آیات الٰہی وہ تاریخی آیات ہیں جن میں قبل اسراء رومی ایرانی اسرائیلی کشمکش کا ذکر کیا گیا ہے۔[4]

---

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 215. [2] بني إسرآء يل 1:17. [3] پہلی مرتبہ یہود کی تباہی و بربادی اہل فارس کے ہاتھوں عمل میں نہیں آئی تھی بلکہ یہ تباہی بابل (عراق) کا بادشاہ بخت نصر لایا تھا۔

[4] أصول الفكر السياسي للتجاني عبدالقادر، ص: 149.

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ.......مَا عَلَوْا تَتْبِیْرًا○﴾

”اور ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) دی اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا (اور انھیں حکم دیا) کہ تم میرے سوا کسی کو کارساز نہ ٹھہراؤ، اے ان لوگوں کی اولاد جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا، بے شک وہ شکر گزار بندہ تھا اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (تورات) میں فیصلہ سنا دیا کہ تم زمین میں دو بار ضرور فساد کرو گے اور ضرور بہت بڑی سرکشی کرو گے، پھر جب دونوں میں سے پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے سخت جنگجو بندے بھیج دیے، چنانچہ وہ (فساد انگیزی کے لیے) شہروں کے درمیان گھس (پھیل) گئے اور یہ وعدہ (پورا) کیا ہوا تھا، پھر ہم نے پھیر کر تمھیں ان پر غلبہ دیا اور تمھیں مال اور بیٹوں کے ساتھ مدد دی اور ہم نے تمھیں نفری میں خوب زیادہ کر دیا اگر تم بھلائی کرو گے تو اپنے ہی نفس کے لیے کرو گے اور اگر برائی کرو گے تو (وہ بھی) اسی کے لیے ہوگی، پھر جب آخری بار کا وعدہ آیا (تو ایک اور قوم تم پر غالب آئی) تاکہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (اقصیٰ) میں داخل ہو جائیں جیسے پہلی بار اس میں داخل ہوئے تھے اور تاکہ وہ جس پر غلبہ پائیں اسے یکسر تباہ کر دیں۔“[1]

علامہ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں رقم طراز ہیں کہ ”بخت نصر نے فارسی بادشاہ کے ایماء پر یہود کو تباہی سے ہمکنار کیا اور ان کی سرزمین میں اندر تک گھس گیا۔ مجبوراً انھیں یہ علاقہ چھوڑنا پڑا۔ ان میں سے کچھ حجاز، کچھ یثرب، کچھ وادی القریٰ اور تھوڑے مصر کی طرف چلے گئے۔ یہ تباہی و بربادی جو سلطنت فارس کی[2] طرف سے یہودیوں پر مسلط کی گئی، چھٹی

---

[1] بني إسرآئيل 17:2-7. [2] صنعاء یونیورسٹی (یمن) کے استاذ تاریخ فرست مرعی کی رائے ہے کہ ”بخت نصر کلدانی تھا، فارسی نہیں تھا اور کلدانی بادشاہ کے حکم پر اس نے حملہ کیا تھا۔ جیسا کہ اس سے »

صدی قبل مسیح میں پیش آئی۔[1]

یہودی مملکت کی تعمیر نو کے بعد دوسری دفعہ ان کی بربادی کا سامان رومیوں کے ہاتھوں 70 عیسوی میں ہوا۔ رومی کمانڈر ٹائٹس نے ہیکل سلیمانی کو گرا دیا اور رومیوں کے سیاسی اور مذہبی ظلم و ستم کی تاب نہ لاتے ہوئے یہودیوں نے راہ فرار اختیار کی، پھر ان کی ہجرتیں مسلسل ہوتی رہیں اور ان کے بعض گروہ جزیرہ نمائے عرب کے جنوب میں پہنچے جہاں پہلے سے ان کے آباء و اجداد موجود تھے۔[2]

جزیرہ نمائے عرب میں یہودیوں کا پہنچنا صرف ہجرت برائے تحفظ جان نہ تھا بلکہ یہ جزیرہ نما میں وسیع پیمانے پر فساد کے جراثیم پھیلانے کی سازش تھی۔ اور رسول اللہ ﷺ جہاں قریشی سازشوں کو جان کر ان کی پیش بندی کر چکے تھے، لازمی بات ہے کہ آپ کو اس خطرناک عنصر کی چالاکیوں پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت تھی۔[3]

یہودی عاد و ثمود کی طرح صرف تاریخی قوم نہیں تھی کہ ان کے حالات باعث عبرت ہوں، بلکہ جزیرہ نمائے عرب میں جہاں رسول اللہ ﷺ بھی رہائش پذیر تھے، یہود کی خاصی کثیر تعداد موجود تھی اور نبی ﷺ وہاں اسلامی مملکت کے قیام کے خواہاں تھے۔ یہودی نہ صرف اقتصادیات پر قابض تھے بلکہ وہ مضبوط نظریے کے بھی حامل تھے۔ ان کی ایک تاریخ تھی۔ علماء اور ان کے پیغمبروں کی وراثت کتب کی شکل میں موجود تھی، لہٰذا وہ اتنی قابلیت

» پہلے حاشیے میں ذکر ہو چکا ہے، فلسطین کے اندر بنی اسرائیل کی ریاست ''یہودیہ'' کی تباہی سلطنت فارس کے ہاتھوں عمل میں نہیں آئی تھی اور نہ بخت نصر نے کسی فارسی بادشاہ کے ایماء پر یہ مہم سر کی تھی بلکہ محقق تاریخ کے مطابق بخت نصر بابل (عراق) کا خود مختار حکمران تھا اور اس کی فتوحات کا دائرہ ایران سے مصر تک پھیلا ہوا تھا۔ بخت نصر نے یہودیہ (فلسطین) پر پہلا حملہ 597 ق م میں کیا تھا اور دوسری بار 86-587 ق م میں اس نے بیت المقدس اور ہیکل سلیمانی کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ (محسن فارانی)

[1] أصول الفكر السياسي للتجاني عبدالقادر، ص: 152,151. [2] تاريخ ابن خلدون: 206/2.

[3] أصول الفكر السياسي للتجاني عبدالقادر، ص: 152.

کے مالک تھے کہ اوصاف نبوت کو جانچ سکیں۔ معجزات کا طلب کرنا، رسولوں کی سچائی کے لیے شرائط لگانا اور رسالت کی صحت کی پڑتال کرنا وہ جانتے تھے۔ قریش نے جس طرح بیت اللہ کی حرمت کی آڑ میں اسلام کا مقابلہ کیا، یہود تورات کی آڑ میں قرآن کریم کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے، لہٰذا نبی ﷺ جہاں قریش کے خلاف معرکہ آرائی کی توقع رکھتے تھے، وہیں یہود کے خلاف ایک لمبی معرکہ آرائی کو بھی متوقع سمجھتے تھے۔[1]

سورۂ بنی اسرائیل جس میں فارس، روم اور یہودیوں کی باہمی معرکہ آرائیوں کا تذکرہ ہے، اس کے بعد سورۂ روم نازل ہوئی جس میں تقریباً ایسا ہی موضوع بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿الٓمّٓ ○ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ○ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِہِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ ○ فِیۡ بِضۡعِ سِنِیۡنَ ۬ؕ لِلّٰہِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ وَمِنۡۢ بَعۡدُ ؕ وَیَوۡمَئِذٍ یَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ○ بِنَصۡرِ اللّٰہِ ؕ یَنۡصُرُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ○ وَعۡدَ اللّٰہِ ؕ لَا یُخۡلِفُ اللّٰہُ وَعۡدَہٗ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ○ یَعۡلَمُوۡنَ ظَاہِرًا مِّنَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚۖ وَہُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ غٰفِلُوۡنَ ○﴾

”الٓمّٓ، رومی مغلوب ہوگئے، قریب ترین سرزمین (شام و فلسطین) میں اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد جلد غالب ہوں گے، چند برسوں میں، اقتدار و اختیار اللہ ہی کے لیے ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی اور اس (غلبے والے) دن مومن بھی (اپنی فتح پر) خوش ہوں گے، اللہ کی مدد سے، وہ جسے چاہتا ہے مدد دیتا ہے اور وہ نہایت غالب، بہت رحم کرنے والا ہے، (یہ) اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، وہ دنیاوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور وہ آخرت سے تو بالکل ہی غافل ہیں۔“[2]

---

[1] أصول الفكر السياسي للتجاني عبدالقادر، ص: 153. [2] الروم 30:1-7.

مشرکین مکہ چاہتے تھے کہ اہل فارس رومیوں پر غالب آئیں کیونکہ وہ بھی بت پرست تھے جبکہ مسلمان رومیوں کے اہل فارس پر غلبے کے خواہاں تھے کیونکہ وہ اہل کتاب تھے۔ مفسرین نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور بعض مشرکوں کے درمیان لگائی جانے والی شرط کا ذکر کیا ہے جو فارس اور روم کے درمیان پیش آنے والی جنگ کے بارے میں تھی اور قرآن کریم میں اہل فارس کی شکست اور رومیوں کی فتح یابی کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔[1]

ابن عطیہ رومیوں کے غلبے کے سلسلے میں ایک قابل توجہ نظریے کو بیان کرتے ہیں کہ دراصل مسلمانوں کی خوشی اس بنیاد پر تھی کہ رومی جوان کے لیے چھوٹے دشمن تھے اور ان کا مقابلہ بھی آسان تھا وہ فارس پر غالب آگئے تھے اور اہل فارس اگر غالب آجاتے تو مسلمانوں کے لیے ڈر اور خوف کے آثار زیادہ نمایاں ہوجاتے کیونکہ اس صورت میں دین اور شریعت کے غلبے کی امید ختم ہوجاتی اور تمام امتوں پر غلبہ خواب بن کر رہ جاتا۔ کافر بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ اس بڑی طاقت کی حمایت کریں جو اس دین کو جڑ سے اکھیڑ دے اور ان کے لیے سبب راحت بن سکے۔[2]

ابن عطیہ کی رائے کچھ اس طرح سے ہے کہ مسلمانوں کے لیے خوشی کا سبب یہ نہ تھا کہ رومی اہل کتاب تھے اور نہ یہ کہ قرآنی صداقت کے لیے ایک واضح دلیل ملے گی بلکہ سبب یہ تھا کہ عنقریب رومی غلبے سے اہل اسلام کو جو ابھی کمزور تھے فائدہ حاصل ہونے والا تھا۔ وہ اس طرح کہ مستقبل میں اہل روم سلطنت فارس کے ٹکڑے کریں گے اور ان کی شان و شوکت ختم کردیں گے اور جنگ جیت جائیں گے لیکن اس ٹکراؤ سے دونوں کی قوت کمزور ہوچکی ہوگی اور مسلمانوں کے لیے عالم کفر کے خلاف کامیابیوں کے دروازے کھلیں گے اور اسلام کے لیے ان دونوں قوتوں کو پامال کرتے ہوئے ایک عالمی طاقت کے طور پر ابھرنے کا موقع فراہم ہوگا۔[3]

---

[1] تفسير الطبري: 12/21. [3] تفسير ابن عطية: 425/11. [3] أصول الفكر السياسي للتجاني عبدالقادر، ص: 158.

⑪ قصۂ معراج سے نماز کی اہمیت و مرتبہ پر بھی روشنی پڑتی ہے اور صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نماز امت مسلمہ پر معراج کی رات فرض ہوئی۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''فرضیت کے اس انداز میں نماز کے شرف و مرتبے کا لحاظ رکھا گیا ہے۔'' [1]

اسلامی دعوت کا پرچار کرنے والوں کو خصوصی طور پر نماز کی اہمیت اور اس کی حفاظت کے سلسلے میں معراج کی رات فرضیت نماز ضرور بیان کرنا چاہیے، نیز نماز کا تاکیدی حکم نبی ﷺ کے آخری لمحات کی وصیت میں بھی موجود ہے۔

⑫ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: «نُورٌ أَنّٰى أَرَاهُ» ''وہ نور ہے، میں کیسے دیکھ سکتا ہوں؟'' [2]

⑬ نبی ﷺ نے معاشرے میں پیدا ہونے والی خطرناک بیماریوں اور معراج کی رات دکھائی جانے والی ان کی سزاؤں کا بھی تذکرہ کیا جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

چغلی اور چغل خوروں کی سزا بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ مردار کھا رہے تھے تو جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ لوگ لوگوں کے گوشت کھایا کرتے تھے (چغل خور تھے)۔ [3]

یتیموں کا مال ہڑپ کرنے والوں کی سزا کے بارے میں ہے کہ نبی ﷺ نے کچھ آدمی دیکھے جن کے بڑے بڑے ہونٹ تھے جیسے اونٹوں کے ہونٹ ہوتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے آگ کے ٹکڑے تھے جیسے پتھر ہوں جنھیں وہ نگل لیتے، پھر وہ ان کی پشتوں سے خارج ہوجاتے۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ یتیموں کا مال بطور ظلم ہڑپ کرجاتے تھے۔ [4]

رسول اللہ ﷺ کو ایسی قوم دکھائی گئی جن کے پیٹ بڑے بڑے گھڑوں کی طرح تھے جن میں باہر ہی سے سانپ نظر آرہے تھے۔ جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ سود خور ہیں۔ [5]

---

[1] تفسیر ابن کثیر: 23/3. [2] صحیح مسلم، حدیث: 178. [3] مسند أحمد: 257/1، اس روایت کی سند ضعیف ہے۔ [4] السیرۃ النبویۃ لابن هشام: 47/2. [5] مسند أحمد: 353/2، و سنن ابن ماجه، حدیث: 2273.

زنا کرنے والے، زکاۃ ادا نہ کرنے والے، فتنہ ڈالنے والے خطیب اور امانت میں خیانت کرنے والے۔ بہت سی روایات میں ان جرائم اور ان کی سزاؤں کا تذکرہ ملتا ہے۔[1]

مجاہدین کا ثواب: معراج کی رات آپ ﷺ ایک ایسی قوم سے گزرے کہ وہ ایک ہی دن میں بیج ڈالتے ہیں اور پھر اسی دن اس کی فصل بھی کاٹتے ہیں۔ ایک دفعہ کاٹنے کے بعد دوبارہ اسی طرح کٹائی کے قابل ہو جاتی تھی۔ جبریل علیہ السلام نے فرمایا: ''یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والے ہیں۔ ان کی نیکیاں سات سو گنا تک بڑھائی جا رہی ہیں اور جو بھی خرچ کریں گے اللہ تعالیٰ اس کا نعم البدل عطا فرمائیں گے۔''[2]

⑭ قصۂ معراج سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے مسجد اقصیٰ کی اہمیت مزید اجاگر ہوتی ہے۔ اس طرح انھوں نے اپنی ذمہ داری کا احساس بھی کیا۔ مسجد اقصیٰ کسی زمانے میں رومیوں کے زیر تسلط تھی، پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسے آزادی ملی اور تقریباً پانچ صدیوں تک امن و امان کی نعمت سے مالا مال رہی، پھر 492ھ/1099ء میں صلیبیوں نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور تقریباً ایک صدی تک فساد برپا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں نے 583ھ/1187ء میں صلاح الدین ایوبی کی سرکردگی میں اسے آزاد کروا لیا اور اب 1967ء سے یہودی اس پر قابض ہیں۔ مقام فکر یہ ہے کہ اسے یہودیوں کے پنجوں سے کیسے آزاد کرایا جا سکتا ہے![3]

---

[1] مسند أحمد: 120/3 و 180 و 231 و 239، و مسند عبد بن حميد، حديث: 1222. [2] مسند البزار، حديث: 55، ومجمع الزوائد: 67/1-72، والترغيب والترهيب للمنذري، حديث: 1129.

[3] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 220.

حصہ 7

دعوت اسلام اور صحابہ کی ہجرت مدینہ

باب : 1 قبائل کو دعوت اور نصرت وحمایت کی طلب

باب : 2 کاروانِ خیر وبرکت اور نورانی دستے

باب : 3 بیعت عقبہ ثانیہ

باب : 4 صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ہجرتِ مدینہ

وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً

''اور جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کی بہت جگہ بھی پائے گا اور کشادگی بھی۔''

(النساء 4: 100)

باب 1

قبائل کو دعوت اور نصرت وحمایت کی طلب

مختلف قبائل کے پاس طلبِ امداد کے لیے جانا

جب رسول اللہ ﷺ طائف سے واپس تشریف لائے تو مختلف قبائل کے سامنے موسمی تہواروں میں اسلامی دعوت پیش کرنے لگے۔ آپ ﷺ ان سے پناہ اور مدد کے طلب گار ہوئے تا کہ لوگوں تک کلام اللہ پہنچایا جا سکے۔ نبی ﷺ مختلف تجارتی میلوں اور حج کے موسم میں دعوتی سرگرمیوں میں مصروف رہتے اور اپنا سیاسی و دعوتی پروگرام قبائل کے سامنے پیش کرتے۔ حضرت ابوبکر ؓ جو عرب کے انساب اور تاریخ سے اچھی طرح واقف تھے، آپ کی معیت میں ہوتے، یہ دونوں مل کر ہر قبیلے کے لیڈر اور سرداروں سے ملاقات کرتے، حضرت نبی ﷺ کی دعوت سے پہلے ابوبکر ؓ ان سے سوال کرتے: ”تمھاری تعداد کتنی ہے؟ تمھاری قوت وشوکت کی بنیاد کیا ہے؟ نیز تمھاری جنگوں کا کیا حال ہے؟“ ①

علامہ مقریزی ؒ فرماتے ہیں: ”رسول اللہ ﷺ نے مختلف تہواروں میں قبائل اور شخصیات کے سامنے اسلامی دعوت پیش کی۔ ان قبائل میں بنو عامر، غسان، بنو فزارہ، بنو مُرَّہ، بنو حنیفہ، بنو سُلَیم، بنو عَبس، بنو نصر، ثعلبہ بن عُکابہ، کِندہ، کلب، بنو الحارث بن کعب اور بنو عذرہ شامل ہیں اور شخصیات میں سے قیس بن خَطیم اور ابوالحیسر انس بن ابی رافع شامل ہیں۔ علامہ واقدی ؒ نے ان تمام قبائل کی تاریخ پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ یوں

---

① الأنساب للسمعاني: 36/1.

کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ سب سے پہلے قبیلہ کندہ کے پاس گئے اور انھیں اسلام کی طرف دعوت دی، پھر کلب، پھر بنو حنیفہ اور پھر بنو عامر کے پاس تشریف لے گئے اور ہر ایک سے یہی فرمایا:

«مَنْ رَجُلٌ يَحْمِلُنِي إِلٰى قَوْمِهِ، فَيَمْنَعُنِي، حَتّٰى أُبَلِّغَ رِسَالَةَ رَبِّي فَإِنَّ قُرَيْشًا قَدْ مَنَعُونِي أَنْ أُبَلِّغَ رِسَالَةَ رَبِّي؟»

”کوئی ہے جو مجھے اپنی قوم کی طرف لے جائے اور میرا دفاع کرے تاکہ میں اپنے رب کا پیغام لوگوں تک پہنچا سکوں کیونکہ قریش نے مجھے میرے رب کا پیغام پہنچانے سے روک رکھا ہے۔“

ادھر ابولہب آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے لوگوں سے کہتا کہ اس کی بات نہ سننا یہ (نعوذ باللہ) جھوٹا ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے اس میدان میں شدید تکالیف برداشت کیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جب اپنی دعوت پیش فرماتے تو کہتے:

«أَلَا رَجُلٌ يَحْمِلُنِي إِلٰى قَوْمِهِ؟ فَإِنَّ قُرَيْشًا قَدْ مَنَعُونِي أَنْ أُبَلِّغَ كَلَامَ رَبِّي»

”کیا ہے کوئی آدمی جو مجھے اپنی قوم کی طرف لے جائے؟ میری قوم قریش نے مجھے اپنے رب کا پیغام پہنچانے سے روک دیا ہے۔“[2]

اسی طرح آپ ﷺ مختلف قبائل کے پاس جاتے اور دعوت پیش کرتے رہے۔ وہ لوگ آپ ﷺ کی بات کو بڑے برے انداز سے رد کر دیتے اور تکلیف بھی پہنچاتے اور

---

[1] مسند أحمد:493,492/3، وجامع الترمذي، حديث: 2925، السيرة النبوية لابن هشام: 65,64/2.

[2] جامع الترمذي، حديث:2925، وسنن أبي داود، حديث:4734، وسنن ابن ماجه، حديث:201، و مسند أحمد:390/3.

کہتے: ''اس کی قوم اسے خوب جانتی ہے۔ جب اس نے اپنی قوم میں فساد برپا کردیا ہے تو وہ ہماری اصلاح کیسے کرسکتا ہے؟'' لہٰذا وہ آپ کی دعوت رد کردیتے۔ [1]

علاوہ ازیں وہ افواہیں جو قریش حُجّاج میں پھیلا دیا کرتے تھے، وہ بڑی عام ہوجاتیں، مثلاً: آپ کو صابی کہنا اور یہ کہ بنو ہاشم کا ایک لڑکا جسے وہم ہوگیا ہے کہ وہ نبی ہے وغیرہ وغیرہ، نعوذ باللہ۔ اور ایسے ہتھکنڈوں سے آپ کو زور وشور سے رد کردیا جاتا اور آپ کا دکھ دگنا ہوجاتا۔ [2]

نبی ﷺ نے کچھ ایسے مصائب بھی برداشت کیے جو سخت ترین تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ اور امام طبرانی رحمہ اللہ نے المعجم الکبیر میں منیب بن مدرک بن منیب ازدی رضی اللہ عنہ سے، انھوں نے اپنے باپ مدرک سے اور پھر اپنے دادا منیب ازدی رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں آپ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا: «يَا أَيُّهَا النَّاسُ! قُولُوا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوا» ''لوگو! لا الہ الا اللہ پڑھ لو، کامیاب ہوجاؤ گے۔'' مگر ان میں سے بعض نے آپ ﷺ کے چہرۂ انور پر تھوکنے کی جسارت کی، بعض نے آپ ﷺ پر مٹی ڈالی اور بعض نے برا بھلا کہا یہاں تک کہ زوال کا وقت ہوگیا۔ اسی دوران ایک بچی اپنے ہاتھ میں پانی کا پیالہ لے کر آئی اور اس نے آپ کے ہاتھ اور منہ کو دھویا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «يَا بُنَيَّةُ! لَا تَخْشَيْ عَلٰى أَبِيكِ غَلْبَةً وَّ لَا ذِلَّةً» ''اے میری پیاری بیٹی! اپنے باپ پر (کفار کے) غلبے اور ذلت کا خوف نہ کھا۔'' میں نے پوچھا: ''یہ کون ہے؟'' لوگوں نے بتایا: ''یہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی زینب رضی اللہ عنہا ہیں'' اور وہ ایک خوب رو بچی تھیں۔ [3]

ایک طرف نبی ﷺ کو کفار کی طرف سے انکارِ دعوت کی تکلیف برداشت کرنا پڑتی تو دوسری طرف ابوجہل اور ابولہب باری باری آپ ﷺ کو اس وقت اذیت پہنچاتے جب

---

[1] الدرر في اختصار المغازي والسير لابن عبدالبر، ص: 35، والسيرة النبوية لابن كثير: 185/2.

[2] محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 53. [3] التاريخ الكبير للبخاري: 14/2/4، و المعجم الكبير للطبراني: 342/20، و مجمع الزوائد: 21/6.

آپ ﷺ موسمی میلوں اور مختلف تہواروں میں لوگوں کو دعوت پہنچانے میں مصروف ہوتے، اس طرح آپ ﷺ کو انتہائی زیادہ مشقت اٹھانا پڑتی۔

قبائل کو دعوت اور ابوجہل و مشرکین کے ہتھکنڈوں کا دفاع

قبائل سے رات کے اندھیرے میں ملاقات: نبی ﷺ اپنی اعلیٰ دانائی بروئے کار لاتے ہوئے رات کے اندھیرے میں قبائل کے پاس جانے لگے تاکہ آپ اور ان کے درمیان کوئی مشرک حائل نہ ہو سکے۔[1] یوں آپ مخالفانہ پروپیگنڈے سے جو آپ کی دعوتی مصروفیات کے وقت پھیلایا کرتے تھے، نجات پا گئے، چنانچہ آپ ﷺ نے رات کے اندھیرے میں اوس وخزرج کے قبائل سے ملاقات کی اور بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ کے اہم واقعات بھی رات کو پیش آئے۔[2]

رسول اللہ ﷺ کا اہل قبائل کی رہائش گاہوں میں تشریف لے جانا: نبی ﷺ قبیلہ کلب، بنوحنیفہ اور بنو عامر کے پاس ان کی رہائش گاہوں میں تشریف لے گئے۔[3] غرض یہ تھی کہ آپ قریش کی مخاصمت سے محفوظ رہیں، قبائل سے مناسب طریقے سے گفتگو کر سکیں اور قریش کی طرف سے کوئی پریشانی یا فساد انگیزی بھی آڑے نہ آئے۔

مددگاروں کو ساتھ رکھنا: قبائل کے ساتھ گفتگو میں بعض اوقات سیدنا ابوبکر اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما آپ کے ساتھ ہوتے تاکہ لوگ یہ نہ خیال کریں کہ آپ اس میدان میں اکیلے ہیں اور آپ کا کوئی قریبی یا قبیلے کا اہم شخص آپ کے ساتھ نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ معرفتِ انساب میں مہارت رکھنے والے تھے،[4] چنانچہ ان کے توسط سے آپ ﷺ ہر قبیلے اور ہر بڑے سردار کے پاس پہنچتے اور ان میں سے اچھے قبیلے کا انتخاب کر کے اپنی دعوت پیش کرتے تاکہ وہ قبیلہ دعوتی ذمہ داریاں قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

---

[1] تاريخ الإسلام للنجيب آبادي: 129/1. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 44/2 و 52. [3] البداية والنهاية: 140/3. [4] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 116.

آپ ﷺ کا ہر قبیلے سے حمایت کا وعدہ لینا: نبی ﷺ امن وتحفظ کے نقطۂ نظر سے ہر قبیلے کی قوت واہمیت کے بارے میں سوال کرتے، پھر دعوت پیش کرتے اور حمایت کے طلب گار ہوتے کیونکہ اسلامی دعوت کی حفاظت کے لیے اس کی شدید ضرورت تھی۔ اور اس لیے بھی کہ یہ قبیلہ دعوت کے خلاف ہر شر اور باطل کا مقابلہ کر سکے۔ اور وہ اخلاقی اور مادی وسائل کا حامل بھی ہو، جنھیں دیکھ کر دشمن ڈر جائیں اور اسلامی دعوت کو پناہ حاصل ہو، اس کے پھیلنے کے اسباب فراہم ہوں اور راستے کی ہر رکاوٹ دور جائے۔ [1]

بنو عامر سے مذاکرات

رسول اللہ ﷺ نے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت بنو عامر سے مذاکرات کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ آپ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ بخوبی جانتے تھے کہ بنو عامر کے جنگجو بہت زیادہ ہیں اور ان کی اہمیت قریش اور بنوخزاعہ کی طرح قابل داد ہے بلکہ وہ ان پانچ قبائل میں سے تھے کہ نہ کبھی ان کی کوئی عورت لونڈی بنی، نہ ہی وہ کسی کے زیرنگین رہے اور نہ انھوں نے کبھی تاوان ادا کیا۔

نبی ﷺ یہ بھی جانتے تھے کہ قبیلہ بنو عامر اور بنوثقیف پرانے دشمن تھے۔ اب جبکہ بنوثقیف نے اندرون حجاز آپ ﷺ کی تکذیب کی تو آپ ﷺ نے انھیں بیرونی جانب سے گھیرنے اور بنوعامر بن صعصعہ کا تعاون حاصل کرنے کا پروگرام بنایا کیونکہ اگر آپ بنوعامر کے حلیف بن جاتے تو بنوثقیف خطرے سے دوچار ہوتے اور ان کی مخالفت دم توڑ دیتی۔ [2]

سیرت نگار لکھتے ہیں کہ جب آپ ﷺ بنو عامر کے پاس آئے اور دعوت پیش کی تو ان میں سے بَیْحَرَہ بن فِراس نامی آدمی کہنے لگا: ”اللہ کی قسم! اگر یہ قریشی جوان میرے ہاتھ آجائے تو میں پورے عرب کو نگل جاؤں۔“ پھر وہ آپ سے یوں مخاطب ہوا: ”اگر ہم

---

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 117,116. [2] أصول الفكر السياسي للتجاني عبدالقادر، ص: 182.

آپ کے تابع ہوجائیں اور اللہ آپ کو دشمنوں پر فتح عطا فرمادے تو کیا آپ کے بعد سرداری ہمیں مل سکتی ہے؟'' آپ ﷺ نے جواب دیا: «اَلْأَمْرُ لِلّٰهِ يَضَعُهُ حَيْثُ يَشَاءُ» ''یہ معاملہ اللہ کا ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔'' اس پر وہ کہنے لگا: ''پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کی خاطر ہم سارے عرب سے ٹکر لیں اور جب اللہ تعالیٰ آپ کو غالب کردے تو قیادت کسی اور کو مل جائے! ہمیں اس دعوت کی کوئی ضرورت نہیں۔'' یوں انھوں نے دعوتِ حق کا انکار کردیا۔[1]

بنوشیبان سے مذاکرات

حضرت علی بن ابی طالب ؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ اللہ کے حکم کے مطابق قبائل عرب کے سامنے دعوت پیش کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے تو میں اور ابوبکر ؓ بھی آپ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ ہم ایک ایسی مجلس میں پہنچے جو سکون اور وقار کی حامل تھی۔ ابوبکر ؓ نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور پوچھا: ''تم کون لوگ ہو؟'' جواب ملا: ''شیبان بن ثعلبہ سے ہیں!'' ابوبکر ؓ واپس آئے اور کہا: ''اللہ کے رسول! آپ پر میرے ماں باپ قربان! یہ انتہائی قابل قدر لوگ ہیں۔''

ان میں پیکر حسن اور زبان آور مفروق نامی آدمی بھی موجود تھا۔ اس کے گیسو سینے پر لٹک رہے تھے۔ وہ حضرت ابوبکر ؓ کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ ابوبکر ؓ نے پوچھا: ''تمھاری تعداد کتنی ہے؟'' اس نے کہا: ''ہم ہیں تو ایک ہزار لیکن کوئی ہم پر غالب نہیں آسکتا۔'' ابوبکر ؓ نے سوال کیا: ''تمھاری قوت و طاقت کا راز کیا ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''ہم سب سے زیادہ غضبناک حالت جنگ میں ہوتے ہیں اور ہماری لڑائی قابل دید ہوتی ہے۔ ہم اپنی اولاد کی حفاظت سے زیادہ گردنیں کٹوانے پر اور دودھ والی اونٹنی سے زیادہ اسلحے پر

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 66/2، ودلائل النبوة لأبي نعيم، حديث: 215، و تاريخ الطبري: 351,350/2، والطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 216/1 مختصراً.

توجہ دیتے ہیں اور مدد جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے کبھی ہمارے حق میں اور کبھی مخالف کے حق میں ہوتی ہے۔ تم شاید قریش سے تعلق رکھتے ہو۔" ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اگر تمھیں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کوئی خبر پہنچی ہے تو وہ رسول یہ ہیں۔" مفروق نے کہا: کہ آپ کی دعوت کیا ہے؟ اس پر نبی ﷺ گویا ہوئے: "میں تمھیں دعوت دیتا ہوں کہ تم اللہ کے ایک ہونے اور اس کا کوئی شریک نہ ہونے کو مان لو اور مجھے اللہ کا بندہ و رسول تسلیم کرلو اور مجھے تمھاری پناہ اور مدد کی ضرورت ہے کیونکہ قریش نے اللہ کے خلاف محاذ آرائی کی ہے، اس کے رسول کی تکذیب اور حق سے منہ موڑتے ہوئے باطل سے تعلقات قائم کیے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ بے پروا اور تعریف کے لائق ہے۔" مفروق نے کہا کہ اپنی دعوت کے مزید خدوخال بیان کیجیے اور اللہ کی قسم! آپ کے اس کلام سے بہتر میں نے کوئی کلام نہیں سنا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے کلام اللہ کی تلاوت فرمائی:

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝﴾

"کہہ دیجیے: آؤ میں پڑھ کر سناتا ہوں جو کچھ تمھارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور اپنی اولاد کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں بھی اور انھیں بھی رزق دیتے ہیں اور بے حیائی کے کاموں کے قریب نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر ہوں یا چھپے ہوئے ہوں اور کسی ایسی جان کو قتل مت کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہو، سوائے اس کے جس کا قتل برحق ہو، ان ساری باتوں کی اللہ نے تمھیں تاکید کی ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔"[1]

---

[1] الأنعام 151:6.

مفروق نے کہا: ”اللہ کی قسم! آپ نے اچھے اخلاق اور بہترین اعمال کی دعوت دی ہے۔ قریش نے آپ کی ناجائز تکذیب اور آپ کے خلاف بے بنیاد محاذ آرائی کی ہے۔“

پھر مفروق نے ہانی بن قَبِیصہ کی طرف بات بڑھاتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے بزرگ اور مذہبی پیشوا ہیں۔ وہ بولا: ”اے قریشی بھائی! میں نے تمھاری گفتگو سنی۔ میری رائے کے مطابق ہماری اس مختصر گفتگو کے بعد جس کی کوئی ابتدا اور انتہا نہ تھی ہمارا اپنا دین چھوڑ کر تمھاری اتباع کرنا ضعفِ رائے اور عاقبت نا اندیشی سمجھا جائے گا۔ جلد بازی سے لغزش پیدا ہوتی ہے۔ ہم اپنے قبیلے والوں کی مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتے۔ آپ بھی بے شک واپس چلے جائیں اور ہم بھی واپس چلتے ہیں اور پھر ہم مشورہ اور مزید غور کریں گے۔“

بعدازاں ہانی بن قَبِیصہ نے بات آگے مُثنیٰ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”یہ ہمارے بزرگ اور جنگی کمانڈر ہیں۔“ حضرت مُثنیٰ جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے انھوں نے کہا: ”اے قریشی بھائی! میں نے آپ کی بات سن لی ہے۔ میرا جواب بھی وہی ہے جو ہانی بن قَبِیصہ کا تھا کہ اپنا دین چھوڑنا اور آپ کے دین کی اتباع کرنا جلد بازی ہے اور جنگی نقطۂ نظر سے ہم تو دو حدوں (صریان) کے درمیان بستے ہیں۔ ایک یمامہ اور دوسرا سمامہ!“ آپ ﷺ نے پوچھا: «مَا هٰذَانِ الصَّرْيَانِ» ”یہ صریان کیا ہیں؟“ مُثنیٰ نے کہا: ”ایک طرف کسریٰ کے دریا (دجلہ و فرات اور ان کی شاخیں) اور دوسری طرف عرب کے چشمے۔ انہارِ کسریٰ (عراق) کی صورت حال یہ ہے کہ کسریٰ کی مخالفت کرنے والا سزا پاتا ہے اور اس کا عذر ناقابل قبول ٹھہرتا ہے اور ہم نے کسریٰ سے یہ معاہدہ کر رکھا ہے کہ ہم اپنی طرف سے کوئی نیا کام نہیں کریں گے اور نہ کسی ایسے آدمی کو پناہ دیں گے جو نئے خیالات کا پرچار کرتا ہو۔ میرے خیال میں آپ کی دعوت بادشاہوں کو پسند نہیں آئے گی۔ ہاں! اگر آپ چاہیں تو عرب والوں سے ہم آپ کو پناہ دے سکتے اور آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔“

نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَا أَسَأْتُمْ فِي الرَّدِّ إِذْ أَفْصَحْتُمْ بِالصِّدْقِ، وَ إِنَّ دِينَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ لَنْ يَنْصُرَهُ إِلَّا مَنْ حَاطَهُ مِنْ جَمِيعِ جَوَانِبِهِ، أَرَأَيْتُمْ إِنْ لَّمْ تَلْبَثُوا إِلَّا قَلِيلًا حَتّٰى يُوَرِّثَكُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى أَرْضَهُمْ وَ دِيَارَهُمْ وَ يُفْرِشَكُمْ نِسَائَهُمْ، أَتُسَبِّحُونَ اللّٰهَ وَ تُقَدِّسُونَهُ»

’’تم نے سچ بولا اور کوئی برا جواب نہیں دیا۔ بے شک اللہ کے دین کا مددگار وہی ہوسکتا ہے جو ہر پہلو سے اس کی حفاظت کرے۔ کیا تم یہ نہیں خیال کرتے کہ تھوڑے ہی عرصے میں اللہ تمھیں ان (اہل فارس) کی سرزمین اور ان کے گھروں کا وارث بنادے گا اور ان کی عورتیں تمھاری لونڈیاں ہوں گی۔ کیا تم اپنے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس نہیں کرتے؟‘‘

نعمان بن شریک نے فوراً کہا: ’’اے اللہ! تسبیح و تقدیس سب تیرے لیے ہے۔‘‘[1]

درس و عبرت

رسول اللہ ﷺ نے عمائدین قبائل سے جو تعاون و مدد طلب فرمائی وہ مخصوص خصوصیات کی حامل اور مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھی:

① نبی ﷺ کے چچا ابو طالب جو آپ کی حمایت و نصرت کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد آپ ﷺ نے بیرون مکہ سے حمایت و نصرت طلب کی کیونکہ اس دوران قریش کی طرف سے ایذا رسانی میں پھر شدت آگئی تھی۔ بیرونی تعاون حاصل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ حاملین دعوت اپنی دعوت پھیلانے میں جلد از جلد کامیاب ہوں اور لوگ زیادہ سے زیادہ اسلامی تعلیمات اپنے دل و دماغ میں اتار سکیں کیونکہ سختی، دباؤ اور ڈر کی فضا میں یہ امر ناممکن تھا۔

② نبی ﷺ کا قبائل سے مدد طلب کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا اور یہ آپ کی ذاتی سوچ نہیں

---

[1] دلائل النبوة لأبي نعيم، حديث: 214، البداية والنهاية: 3/142-145، و سبل الهدیٰ والرشاد للصالحي: 2/596,597.

تھی بلکہ یہ مکہ میں دعوت کے راستے میں پیش آمدہ حالات کا تقاضا تھا۔

③ رسول اللہ ﷺ نے صرف قبائلی سرداروں اور صاحب رتبہ افراد سے مدد طلب کی کیونکہ ان کے پیروکاران کی بات سنتے اور ان کے فرمانبردار تھے اور وہ لوگ آپ کی حمایت اور دعوت اسلامی کے پھیلاؤ میں مددگار بھی ثابت ہو سکتے تھے۔

④ جو لوگ دین اسلام کی نصرت و حمایت کے عوض ولی عہدی کی ضمانت کے طلب گار تھے، نبی ﷺ نے انھیں ایسی ضمانت دینے سے انکار کر دیا کیونکہ یہ اسلامی دعوت تو اللہ کی طرف دعوت ہے اور اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ جو شخص اسلام پر ایمان لائے اور اس کی مدد کرے، اسے اخلاص اور اللہ کی رضا کا طالب ہونا چاہیے اور یہی دو مقاصد ایسے ہیں جن کی خاطر ہر قسم کی مدد اور قربانی پیش کی جانی چاہیے، نہ کہ مطمح نظر حصول اقتدار یا سرداری کا شوق ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز سے وابستہ مقصد ہی انسان میں اس کے حصول کا جذبہ پیدا کرتا ہے، چنانچہ یہ ضروری ہے کہ نصرت دین کے مقصد کے پیچھے کوئی مادی جذبہ کارفرما نہ ہو اور دعوتِ اسلامی کی مستقل تائید، ہر قسم کے انحراف سے بچ کر اس کا تحفظ اور ہر ممکن مدد اور اس کی اشاعت کے لیے ہر قربانی پیش کرنے کا جذبہ کسی مادی غرض سے آلودہ نہ ہو۔[1] اگر اس کی غرض طلبِ جاہ ہو تو یہ خرابیِ نیت کی نمایاں علامت ہے۔[2]

یحییٰ بن معاذ رازی فرماتے ہیں: ”جو شخص دعوت دین کی آڑ میں سرداری کا خواہش مند ہو وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔“[3]

⑤ نبی ﷺ قبائلی سرداروں کی حمایت حاصل کرنے میں یہ امر ملحوظ رکھتے تھے کہ وہ ایسے معاہدات میں شریک نہ ہوں جن کی شرائط دعوت دین کے اصولوں کے منافی ہوں اور بعد میں ان سے خلاصی ممکن نہ ہو کیونکہ اس قسم کے سرداروں کی طرف سے دعوتِ دین کی مشروط حمایت کی وجہ سے ان بیرونی طاقتوں کی طرف سے خطرات لاحق ہو سکتے تھے جن سے

---

[1] الجهاد والقتال لمحمد خير هيكل: 411/1. [2] وقفات تربوية من السيرة النبوية لعبد الحميد البلالي، ص: 72. [3] صفة الصفوة لابن الجوزي: 94/4.

ان کے معاہدے تھے۔ اور وہ طاقتیں اسلامی مقاصد کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی تھیں۔[1]

اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو رسول اللہ ﷺ کے بنوشیبان سے مذاکرات ناکام ہو گئے تھے کیونکہ وہ کسریٰ کے خلاف جنگ کے حامی نہ تھے۔ بالفرض اگر کسریٰ کا لشکر آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب پر حملہ آور ہوتا تو بنوشیبان ان سے معاہدات کے پیشِ نظر آپ ﷺ کی مدد سے انکاری ہوتے، لہٰذا نبی ﷺ کو اس جزوی اور مشروط حمایت کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس سے تکمیلِ مقاصد میں رکاوٹ پیدا ہوتی۔[2]

⑥ ”بے شک اللہ کے دین کا مددگار وہی ہو سکتا ہے جو ہر پہلو سے اس کی حفاظت کرے۔“

نبی ﷺ نے مُثنّٰی بن حارثہ کو یہ جواب اس وقت دیا جب انھوں نے اہلِ فارس کے بجائے صرف اہلِ عرب کے خلاف آپ کی حمایت کا ارادہ ظاہر کیا۔ سیاسی امور میں درک رکھنے والا کوئی بھی شخص آپ ﷺ کی اس بے مثال دور اندیشی کو بخوبی محسوس کر سکتا ہے۔[3]

⑦ بنوشیبان کے ساتھ مذاکرات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچھے خصائل، عمدہ اخلاق اور مردانگی کے حامل تھے، انھوں نے نبی ﷺ کی بے حد تعظیم کی اور آپ نے وضاحت سے اپنا مدعا بیان فرمایا۔ ان لوگوں نے اپنی محدود حمایت کے سلسلے میں اپنی مجبوری بیان کی اور کہا کہ ایسی دعوت کو بادشاہ پسند نہیں کرتے۔

بعد ازاں تقریباً دس سال بعد ان کے دل نورِ اسلام سے منور ہوئے اور سب سے پہلے بنوشیبان ہی ایرانی لشکروں کے سامنے صف آراء ہوئے۔ ان کے جنگجو رہنما مُثنّٰی بن حارثہ شیبانی رضی اللہ عنہ ہی تھے جنھوں نے قبولِ اسلام کے بعد خلافتِ صدیقی میں سرزمینِ عراق میں فتوحات کا سہرا اپنے سر سجایا۔[4]

کل کے بنوشیبان جو اہلِ فارس سے خائف نظر آتے تھے آج شاہانِ فارس کے بڑے

---

[1] الجهاد والقتال لمحمد خير هيكل: 412/1. [2] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 53. [3] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 64. [4] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 20/2.

بڑے لشکروں کے سامنے ڈٹ گئے۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے نبی ﷺ کی دعوت کو رد کر دیا تھا مبادا انھیں سلطنت فارس سے جنگ کرنی پڑے جس کے متعلق انھوں نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ ان تاریخی حقائق سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دین کتنا عظیم ہے اور اس کے حاملین کو کس طرح اس زمین کی خلافت و سیادت نصیب ہوئی اور آخرت میں انھیں ہمیشہ رہنے والی نعمتیں بھی حاصل ہوں گی۔ [1]

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 3/69.

باب 2

کاروانِ خیر و برکت اور نورانی دستے

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (اعلان نبوت کے بعد) مکہ معظمہ میں دس سال تک اس طرح اقامت گزیں رہے کہ آپ لوگوں کے گھروں اور عکاظ، مجنہ اور منیٰ کے تجارتی میلوں میں ان کے پاس جاتے اور کہتے:

«مَنْ يُؤْوِينِي، مَنْ يَنْصُرُنِي، حَتّٰى أُبَلِّغَ رِسَالَةَ رَبِّي وَلَهُ الْجَنَّةُ؟»

> ”کوئی ہے جو مجھے پناہ دے اور میری مدد کرے تاکہ میں اپنے رب کا پیغام لوگوں تک پہنچا سکوں؟ اور اس کے لیے جنت ہے۔“

جب یمن یا مُضر قبیلے سے کوئی آدمی رختِ سفر باندھتا تو اس کی قوم کے لوگ آ کر کہتے: ”قریشی جوان سے بچنا، کہیں وہ تمھیں فتنے میں مبتلا نہ کر دے۔“ اور نبی ﷺ اپنی قوم کے لوگوں میں جا رہے ہوتے تو وہ انگلیوں سے آپ کی طرف اشارے کرتے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں یثرب سے آپ کے پاس (مکہ) بھیج دیا، ہم آپ ﷺ کے پشتیبان بن گئے اور آپ کی تصدیق بھی کی۔ اب ہمارے قبائل سے انفرادی طور پر لوگ آتے، آپ پر ایمان لاتے، قرآن سنتے، پھر جب واپس گھر آتے تو گھر والے بھی مسلمان ہو جاتے یہاں تک کہ انصار کا کوئی محلہ ایسا نہ رہا جس میں مسلمانوں کی ایک قابل قدر جماعت تیار نہ ہو گئی ہو جو کھل کر اسلام کا اظہار کرتے تھے۔ ①

---

① مسند أحمد: 3/322,323 و339,340.

انصار کے ساتھ ابتدائی تعلقات

سُوَید بن صامت رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام: نبی ﷺ اپنی عادت مبارکہ کے مطابق مکہ میں آنے والے ہر فرد سے اس کا نام و مرتبہ دریافت کرتے، پھر اسے اللہ کی طرف بلاتے اور اس کے سامنے دعوت حق پیش کرتے۔ ایک دفعہ سُوَید بن صامت جو بنو عَمرو بن عوف قبیلے سے تھے، حج یا عمرہ کی غرض سے مکہ آئے۔ سُوَید کو ان کی قوم نے مضبوط جسم، عمدہ اشعار اور شرف ونسب کی وجہ سے ”مرد کامل“ کا خطاب دے رکھا تھا۔ جب نبی ﷺ کو علم ہوا تو آپ اس کے پاس آئے اور دعوت پیش کی۔ سُوَید بولے: ”شاید جو کچھ آپ کے پاس ہے وہ میرے پاس بھی ہے۔“

نبی ﷺ نے پوچھا: «وَمَا الَّذِي مَعَكَ؟» ”تیرے پاس کیا ہے؟“

تو سوید بولے: ”میرے پاس حکمت لقمان ہے۔“

آپ ﷺ نے فرمایا: «أَعْرِضْهَا عَلَيَّ» ”میرے سامنے بیان کرو۔“ جب سُوَید نے بات ختم کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ هٰذَا الْكَلَامَ حَسَنٌ، وَّالَّذِي مَعِي أَفْضَلُ مِنْ هٰذَا، قُرْآنٌ أَنْزَلَهُ اللّٰهُ عَلَيَّ، وَ هُوَ هُدًى وَّ نُورٌ»

”یہ کلام منجملہ اچھا ہے لیکن جو میرے پاس ہے وہ اس سے کہیں افضل و بہتر ہے۔ وہ قرآن ہے جو ہدایت اور نور کی شکل میں مجھ پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔“

پھر آپ ﷺ نے قرآن کریم کا کچھ حصہ اسے پڑھ کر سنایا اور اسلام کی دعوت دی تو اس نے فوراً کہا: ”یہ بہت عمدہ کلام ہے۔“

پھر جب سوید واپس اپنی قوم کے پاس مدینہ پہنچے تو جنگِ بعاث میں مارے گئے۔ کچھ لوگوں نے اس بات کی گواہی دی کہ وہ ہمارے خیال میں مسلمان ہو چکا تھا۔[1]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 2/67-69، و دلائل النبوة للبيهقي: 2/418، و تاريخ الطبري: 2/351,352.

بہر حال سوید بن صامت کا اپنی قوم کو دعوتِ اسلام دینا ثابت نہیں۔ [1]

اِیاس بن معاذ رضی اللہ عنہ اسلام کی چھاؤں میں

ایک دفعہ ابوالحیسر انس بن رافع نامی شخص مکہ گیا اور اس کے ساتھ بنوعبدالاشہل کے کچھ نوجوان بھی تھے۔ ان میں اِیاس بن معاذ بھی تھے جو دراصل خزرج کے خلاف قریش کے حلیف بننا چاہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو جب علم ہوا تو آپ ان کے ہاں تشریف لے گئے، ان کے پاس بیٹھے اور کہا: «هَلْ لَّكُمْ فِي خَيْرٍ مِّمَّا جِئْتُمْ لَهُ؟» ”اگر تمھیں اس مقصد سے بہتر چیز مل جائے جسے حاصل کرنے کے لیے تم یہاں آئے ہو تو کیسا ہے؟“ انھوں نے پوچھا: ”وہ کیا ہے؟“ آپ ﷺ گویا ہوئے:

«أَنَا رَسُولُ اللّٰهِ، بَعَثَنِي إِلَى الْعِبَادِ، أَدْعُوهُمْ إِلٰى أَنْ يَّعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا، وَّ أُنْزِلَ عَلَيَّ الْكِتَابُ»

”میں اللہ کا رسول ہوں۔ مجھے اللہ نے لوگوں کی طرف بھیجا ہے تاکہ انھیں اس بات کی طرف بلاؤں کہ وہ ایک اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور مجھ پر کتاب بھی نازل کی گئی ہے۔“

پھر آپ ﷺ نے اسلام کی وضاحت فرمائی اور انھیں قرآن بھی پڑھ کر سنایا۔ اِیاس بن معاذ جو ایک نوجوان تھے، کہنے لگے: ”یہ تو واقعتاً اس مقصد سے بہتر ہے جس کے لیے تم یہاں آئے ہو۔“ اس پر ابوالحیسر نے مٹی کی ایک مٹھی بھری اور اِیاس کے منہ پر دے ماری، پھر کہا: ”ہمیں چھوڑ دیجیے ہم تو کسی اور کام سے آئے ہیں۔“ یوں اِیاس خاموش ہوگئے اور اللہ کے رسول وہاں سے اٹھ گئے اور وہ لوگ مدینہ لوٹ گئے۔ وہاں اوس و خزرج کے درمیان جنگ بعاث جاری تھی۔ اس جنگ میں اِیاس مارے گئے۔ ان کی قوم کے لوگ کہا کرتے تھے کہ وہ ہمیشہ تکبیر و تحمید اور تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتے تھے یہاں تک کہ اسی

---

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 1/195.

حالت میں فوت ہوئے اور وہ اس کے اسلام میں شک نہیں کرتے تھے۔ دراصل جس مجلس میں اِیاس نے آپ ﷺ سے قرآن سنا وہ اسی وقت اسلام کی حقانیت سمجھ چکے تھے۔[1]

انصار میں اسلام کی ابتدا

نبی ﷺ کی وفد خزرج سے پہلی نتیجہ خیز ملاقات موسم حج میں منٰی کی گھاٹی کے قریب ہوئی۔ آپ ﷺ نے ان سے سوال کیا: «مَنْ أَنْتُمْ؟» ''تم کون ہو؟'' انھوں نے جواب دیا: ''ہم خزرج کی ایک جماعت ہیں۔'' آپ ﷺ نے پھر سوال کیا: «أَمِنْ مَّوَالِي يَهُودَ؟» ''کیا تم یہود کے حلیف ہو؟'' انھوں نے ہاں میں جواب دیا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے انھیں بیٹھنے اور بات سننے کو کہا۔ وہ بیٹھ گئے تو آپ ﷺ نے انھیں ایک اللہ کی عبادت کی طرف بلایا، اسلام پیش کیا اور قرآن کریم پڑھ کر سنایا۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے جب اس گروہ کو دعوت پیش کی تو وہ آپس میں گفتگو کرنے لگے: ''اے قوم! اللہ کی قسم! تم جانتے ہو کہ یہ وہی نبی ہے جس کا نام لے کر یہود تمھیں ڈراتے ہیں۔ کیوں نہ ہو کہ تم ان سے پہلے اس پر ایمان لے آؤ۔'' لہٰذا وہ مسلمان ہو گئے۔ انھوں نے آپ کا پیش کردہ دین مکمل طور پر قبول کر لیا اور کہا: ''ہم اپنے پیچھے ایک ایسی قوم چھوڑ کر آئے ہیں کہ باہمی عداوت اور جنگ کے سلسلے میں اس جیسی کوئی اور قوم نہیں، ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی برکت سے ان میں اتفاق پیدا کر دے۔ ہم ان کے پاس جا کر آپ کی دعوت پیش کریں گے اور جو دین ہم نے اختیار کیا ان کے سامنے بھی بیان کریں گے۔ اگر اللہ نے ان سب کو آپ کی رسالت پر جمع کر دیا تو آپ کی بہت زیادہ قدر افزائی ہو گی۔'' آخر کار وہ ایمان باللہ اور تصدیقِ رسالت کے ساتھ اپنے وطن روانہ ہو گئے۔[3]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام:70,69/2، و مسند أحمد:427/5، و المعجم الكبير للطبراني، حديث:805.

[2] السيرة النبوية لابن هشام:71,70/2، والطبقات الكبرىٰ لابن سعد:219,218/1، ودلائل النبوة للبيهقي:435-433/2، وفقه السيرة للألباني:146/1.

[3] البداية والنهاية:149,148/3.

مدینہ طیبہ کا یہ گروہ چھ اشخاص پر مشتمل تھا: ابو امامہ اَسعَد بن زرارہ اور عوف بن حارث بنونجار سے تھے، علاوہ ازیں رافع بن مالک، قُطبہ بن عامر، عُقبہ بن عامر اور جابر بن عبداللہ بن رئاب رضی اللہ عنہم تھے۔ [1]

حسب وعدہ جب وہ یثرب (مدینہ) میں اپنی قوم کے پاس پہنچے تو رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ کیا اور دعوت اسلام پیش کی۔ یوں آہستہ آہستہ مدینے میں اسلام کا چرچا ہونے لگا اور تقریباً ہر محلے میں آپ ﷺ کا ذکر خیر ہونے لگا۔ [2]

یثرب سے آنے والا یہ ایمان و خیر کا ہراول دستہ تھا جو نہ صرف ایمان لایا بلکہ انھوں نے تہیہ کرلیا کہ اپنی قوم کو بھی اپنے ساتھ شامل کریں گے۔ انھوں نے دین اسلام کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیا۔ وہ مدینہ واپس پہنچتے ہی دعوتِ دین میں سرگرم ہوگئے۔ لوگوں اور اپنے اہل خانہ و عزیز و اقارب کے سامنے پیغامِ ہدایت پیش کیا اور اب مدینے کے ہر گھر میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر ہونے لگا۔ یقیناً جب اللہ چاہے تو قوم کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ آن پہنچتا ہے۔ اب مذکورہ لوگ بظاہر اتفاقاً آپ سے ملے لیکن حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے اس کا انتظام فرمایا تھا تاکہ ایک نیا چشمۂ خیر جاری ہو، تاریخ کا دھارا بدلے اور پتھروں کی عبادت سے خلاصی کا وقت آن پہنچے۔ درحقیقت یہ تاریخ عالم کا ایک انتہائی اہم موڑ ثابت ہوا اور زندگی اندھیروں سے نکل کر روشنیوں میں پہنچ گئی۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ تھوڑے ہی عرصے میں یہ متعصب بت پرست دعوت اسلامی کے مددگار، حق کے مخلص جاں نثار اور علانیہ دعوت کے پیامبر بن جائیں گے۔ وہ اپنی قوم کے پاس پہنچے، ان کے دلوں اور چہروں پر نور ہی نور تھا اور وہ ایک روشن عقیدے کے حامل ہوچکے تھے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی مشیّت تھی کہ دعوت اسلامی کو ایک زرخیز زمین اور محفوظ پناہ گاہ مل گئی۔

اب قحط سالی کا وہ دور، جسے رسول اللہ ﷺ نے نیزوں کی انیوں پر مسلسل کشمکش میں رہ

---

[1] شرح المواهب للزرقاني: 361/1. [2] البداية والنهاية: 147/3.

کر حمایت طلب کرنے کے لیے قبائل کے چکر لگاتے ہوئے گزارا تھا، بدل چکا تھا۔ اب اسلام کو انتہائی طاقتور اور شجاعت سے بھرپور لشکر میسر آنے والا تھا۔ حق اور باطل کا ٹکراؤ ہونے والا تھا تاکہ گئے دنوں کی تلافی ممکن ہو اور بہتر انجام بلاشبہ متقین کے لیے ہوتا ہے۔ آج کے بعد مکہ معظّمہ میں خیر اور بھلائی کے قافلے اور نورانی ہراول دستے اترنے والے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے انسانی فلاح کے لیے منتخب فرمالیا تھا تاکہ وہ ہدایت پاسکیں، چشمہ نور سے سیراب ہوں اور جب یثرب لوٹیں تو خیر اور نور کے حامل ہوں۔[1]

یاد رہے کہ اس ملاقات میں خزرج کے لوگ صرف مسلمان ہوئے لیکن بیعت نہ کی[2] کیونکہ یہ ایک چھوٹی جماعت تھی جو اسلام کے پیغام کے مخلص مبلغ تو بن گئے لیکن انھوں نے مدینہ میں اپنے قبائل سے مشورے کے بغیر کوئی معاہدہ کرنا ابھی مناسب نہ سمجھا۔[3]

پہلی بیعت عقبہ

خزرج والوں سے پہلی ملاقات کے ایک سال بعد موسم حج میں انصار کے بارہ آدمی آکر نبی ﷺ سے عقبہ (گھاٹی) میں ملے اور آپ کی بیعت کی۔ ان میں دس خزرج اور دو اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پچھلے سال مسلمان ہونے والے خزرجی دعوتی میدان میں سرگرم ثابت ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے قبیلے کو دعوت پیش کی بلکہ اپنے مخالف قبیلے کے کچھ آدمیوں کو بھی اسلام کی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان کی یہ کاوش اوس و خزرج کے درمیان الفت و محبت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور اس طرح پہلی بیعت عقبہ عمل میں آئی۔[4]

حضرت عبادہ بن صامت خزرجی رضی اللہ عنہ اس بیعت کے بارے میں اظہار خیال کرتے

---

[1] أضواء علی الهجرة لتوفیق محمد سبع، ص: 274,273. [2] هجرة الرسول ﷺ و صحابته لأحمد عبدالغني، ص: 143. [3] السیرة النبویة الصحیحة للدکتور العمري: 1/197. [4] السیرة النبویة الصحیحة للدکتور العمري: 1/197.

ہیں: ''میں اس بیعت میں شامل تھا اور ہم بارہ افراد تھے جنھوں نے بیعۃ النساء (یعنی انھی شرائط پر جن پر رسول اللہ ﷺ نے بعد میں عورتوں سے بیعت لی تھی) پر بیعت کی اور یہ واقعہ ہم پر جہاد فرض ہونے سے پہلے کا ہے، بہر حال ہم نے شرک نہ کرنے اور چوری، زنا اور اولاد کے ناحق قتل سے باز رہنے پر بیعت کی، نیز از خود گھڑ کر کوئی بہتان نہ لگانا اور بھلی بات میں اللہ کی نافرمانی نہ کرنا بھی اس بیعت کا حصہ تھا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَمَنْ وَفٰى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَهُوَ إِلَى اللّٰهِ، إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَ إِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ»

''اگر تم اس معاہدے کی پاسداری کرو تو تمھارا اجر اللہ پر ہے۔ اور اگر کوئی ان میں سے کسی بات کا ارتکاب کر بیٹھے اور اسے دنیا میں سزا مل جائے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جو کوئی ان میں سے کسی کا ارتکاب کرے، پھر اللہ دنیا میں اس کی پردہ پوشی فرمائے تو اس کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، چاہے تو بخش دے اور چاہے تو عذاب دے۔''[1]

مذکورہ دفعات دراصل وہی دفعات تھیں جن پر رسول اللہ ﷺ نے بعد ازاں عورتوں سے بیعت لی، اس لیے اس بیعت کو ''بیعۃ النساء'' کہا گیا۔[2]

اسلام کی بیعت کرنے والے ان پاکیزہ نفوس کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تاکہ وہ انھیں دین سکھائیں اور قرآن کریم کی تعلیم دیں، اس لیے ان کا نام مدینہ میں ''المقرئ'' (پڑھانے والا) مشہور ہوا اور وہ ان کی امامت بھی کرتے تھے۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نہ صرف دینی غیرت اور قوت ایمانی میں ممتاز تھے بلکہ

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 18، و صحیح مسلم، حدیث: 1709. [2] الغرباء الأولون للدکتور سلمان العودة، ص: 185.

ایک منفرد شخصیت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ نبی ﷺ پر تا حال نازل شدہ قرآن کو فوراً حفظ کرنے والے بھی تھے۔ چونکہ وہ قوت ایمانی اور دینی جذبے کے ساتھ ساتھ ذہانت، خلق اور دانائی سے بہرہ ور تھے، اسی بنا پر نبی ﷺ نے انھیں اپنی سفارت کے لیے منتخب فرمایا اور پھر چند ہی مہینوں کے اندر مدینہ کے اکثر گھرانوں میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ حضرت سعد بن معاذ اور اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہما جیسے سردارانِ قوم دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے اور پھر ان کی قوم کے اکثر لوگ مشرف بہ اسلام ہوتے چلے گئے۔ [1]

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بطور سفیر کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ انھوں نے اس نئے دین کی مکمل تشریح وتوضیح فرمائی، قرآن کریم کی قراءت وتفسیر لوگوں کے سامنے بیان کی اور علاوہ ازیں دعوتی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے کی خاطر ایک پرامن مرکز کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ ایک طرف نئے مسلمانوں میں اسلامی اخوت کے روابط کو تقویت دیتے تو دوسری طرف رسول اللہ ﷺ اور مکہ میں بسنے والے صحابۂ کرام سے بھی رابطہ استوار رکھے ہوئے تھے۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ یثرب میں اَسعد بن زُرارہ کے گھر قیام پذیر ہوئے۔ [2] اور ان کی رہنمائی میں تمام مسلمان دعوت الی اللہ کے میدان میں سرگرم ہوگئے۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے اس جماعت کی قیادت کرتے ہوئے دعوتی میدان میں اپنے معلم حقیقی سے سیکھا ہوا قرآنی اسلوب اختیار کیا، وہ قرآن کریم کی آیات کی اس طرح شرح فرماتے کہ وہ خود اس آیت کی عملی تصویر بن گئے:

﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ﴾

”(اے نبی!) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ کے ساتھ دعوت دیجیے اور ان سے احسن طریقے سے بحث کیجیے۔“ [3]

---

[1] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 187,186 [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 441/1.

[3] النحل 125:16.

اُسید بن حضیر اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما کا قبولِ اسلام

اسید اور سعد اوسی قبیلہ بنو عبد الاشہل کے افراد تھے اور اپنی قوم کے سردار تھے۔ وہ ابھی تک اپنی قوم کے دین بت پرستی پر کاربند تھے۔ جب انھیں مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور ان کی دعوتی سرگرمیوں کا پتا چلا تو سعد بن معاذ نے اسید بن حضیر سے کہا کہ ہمارے محلے میں یہ دو شخص (مصعب اور اسعد رضی اللہ عنہما) ہمارے سادہ لوح افراد کو گمراہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ انھیں آپ ڈانٹ پلائیں اور یہاں آنے سے منع کریں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اسعد بن زُرارہ میری خالہ کا بیٹا ہے، وگرنہ یہ کام میں خود کرتا۔ اسید بن حضیر اپنا نیزہ اٹھائے ان کی طرف چل دیے۔ جب اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ نے انھیں آتے دیکھا تو مصعب رضی اللہ عنہ سے کہا: ”یہ اپنی قوم کا سردار ہے جو آپ کی طرف آرہا ہے، اس کے سامنے دعوت پیش کریں۔“

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اگر یہ بیٹھ جائے تو میں کلام کروں گا۔“

لیکن اسید آکر کھڑا کھڑا انھیں برا بھلا کہنے لگا: ”تم ہمارے سادہ لوح افراد کو کیوں گمراہ کرتے ہو؟ اگر جان کی خیر چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ؟“

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے پختہ کار ہدایت یافتہ مومن کی طرح نرم زبان سے کہا: ”آپ تشریف رکھیں۔ اگر آپ کو ہماری بات اچھی لگے تو قبول کرلیں، ورنہ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“

اُسید کہنے لگے: ”آپ نے انصاف کیا۔“ پھر اپنا نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور بیٹھ گئے۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے اسلامی تعلیمات پیش کیں اور قرآن پڑھ کر سنایا۔

اسعد اور مصعب رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں: ”اللہ کی قسم! ہم اس کے کلام سے پہلے اس کی نرم روی اور خندہ پیشانی ہی سے اس کا مسلمان ہونا بھانپ گئے تھے۔“

بہر حال اسید بن حضیر نے کہا: ”یہ کلام کتنا عمدہ اور حسین ہے، اب مجھے اس دین میں داخل ہونے کا طریقہ بتاؤ۔“

دونوں نے کہا کہ آپ غسل کریں، پھر صاف کپڑے پہنیں، بعد ازاں حق کی گواہی دیں اور دو رکعت نماز پڑھیں۔

پھر اُسَید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا اور کہا: ''ہمارے ہاں ایک معتبر شخص ہیں اگر وہ مسلمان ہو گئے تو ان کی ساری قوم دائرۂ اسلام میں داخل ہو سکتی ہے۔ میں انھیں آپ کی طرف بھیج رہا ہوں وہ ہیں سعد بن معاذ۔''

پھر اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے اپنا نیزہ اٹھایا اور واپس سعد کی طرف چل دیے جو اپنی قوم کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ جب سعد رضی اللہ عنہ نے ان کے چہرے پر نظر ڈالی تو بھانپ گئے کہ اسید بن حضیر جیسا یہاں سے گیا تھا ویسا نہیں لگتا۔ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ مجلس کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ سعد بن معاذ نے پوچھا: ''کیا ہوا؟''

اسید کہنے لگے: ''میں نے ان دونوں آدمیوں سے گفتگو کی ہے۔ کوئی خطرناک مسئلہ نہیں، پھر بھی میں نے انھیں منع کر دیا ہے اور انھوں نے میری بات تسلیم کر لی ہے۔ ہاں! مجھے معلوم ہوا ہے کہ بنو حارثہ اسعد بن زرارہ کو قتل کرنے کی غرض سے نکلے ہیں کیونکہ وہ آپ کی خالہ کا بیٹا ہے اور بنو حارثہ آپ سے بدعہدی کرنا چاہتے ہیں۔''[1]

یہ سن کر سعد بن معاذ جلدی سے اٹھے، اپنا نیزہ ہاتھ میں لیا اور یہ کہتے ہوئے وہاں سے چل دیے کہ تو نے کوئی تسلی بخش کام نہیں کیا۔ وہ ان دونوں کے پاس پہنچے جو پرسکون بیٹھے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ دراصل اسید چاہتے تھے کہ میں دین کے بارے میں کچھ سن لوں۔

حضرت سعد کھڑے کھڑے انھیں برا بھلا کہنے لگے، پھر اسعد بن زُرارہ سے کہا: ''اللہ کی قسم، اے ابو امامہ! اگر تمھارے ساتھ رشتے داری نہ ہوتی تو تم میری طرف سے اتنے نرم رویے کا مستحق نہ ٹھہرتے۔ کیا تم ہماری مرضی کے خلاف ہمارے محلے میں اپنے نظریات پھیلا رہے ہو؟''

---

[1] السيرة النبوية لابي شهبة:1/442.

حضرت مصعب ؓ نے حضرت اسعد بن زُرَارہ ؓ کی یہ بات مدنظر رکھی کہ یہ اپنی قوم کا سردار ہے۔ اگر یہ مسلمان ہوگیا تو کوئی دو آدمی بھی قبول اسلام میں ان سے پیچھے نہیں رہیں گے، چنانچہ مصعب ؓ نے بڑی نرمی سے کہا: ”آپ بیٹھ کر ہماری بات تو سنیں، اگر پسند آئے تو قبول کرلیں، وگرنہ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“

سعد بن معاذ نے کہا: ”تم نے انصاف کی بات کہی۔“ اور نیزہ گاڑ کر بیٹھ گئے۔

حضرت مصعب ؓ نے اسلام پیش کیا اور قرآن پڑھ کر سنایا۔

موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ سورۂ زخرف کا ابتدائی حصہ تلاوت کیا۔ اسعد اور مصعب رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ اس کی نرم روی اور خندہ پیشانی ہی سے اس کا مسلمان ہونا بھانپ گئے تھے۔

پھر حضرت سعد نے ان سے کہا: ”جب آپ مسلمان ہونا اور اس دین میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں؟“

ان دونوں نے کہا: ”آپ غسل کریں، پھر پاکیزہ کپڑے زیب تن کریں، حق کی گواہی دیں اور دو رکعت نماز پڑھیں۔“

حضرت سعد ؓ نے ایسا ہی کیا، پھر اپنا نیزہ پکڑا اور اسید بن حضیر ؓ کے ساتھ اپنی قوم کے پاس آئے۔ قوم نے دیکھتے ہی کہا: ”ہم اللہ کی قسم اٹھاتے ہیں کہ سعد جس حالت میں گئے تھے اس حالت میں واپس نہیں آئے۔“

جب حضرت سعد ان کے پاس پہنچے تو سوال کیا: ”اے بنی عبد الاشہل! میرے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟“

انھوں نے جواب دیا: ”آپ ہمارے سردار اور بہترین سوچ کے مالک ہیں اور آپ کی قیادت بے مثال ہے۔“

اس پر حضرت سعد ؓ نے کہا: ”میں تمھارے مردوں اور عورتوں سے کلام نہ کروں گا جب تک کہ تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہ لے آؤ۔“

موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں: ”اللہ کی قسم! بنو عبد الاشہل کے تمام خواتین و حضرات دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔“ [1]

حضرت اسعد اور مصعب رضی اللہ عنہما واپس گھر لوٹ گئے اور وہیں لوگوں کو اسلام کی دعوت پیش کرتے رہے حتی کہ انصار کے ہر گھر میں مرد و زن دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے، سوائے اُصَیرِم کے جس کا پورا نام عمرو بن ثابت بن وَقْش تھا۔ وہ احد کے دن مسلمان ہوئے اور احد ہی میں شہادت سے سرفراز ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں خبر دی کہ وہ جنتی ہیں۔ ابن اسحاق حسن سند سے روایت کرتے ہیں کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”مجھے بتاؤ کہ کون شخص ہے جس نے کبھی نماز نہیں پڑھی لیکن وہ جنتی ہے۔“ جب لوگ جواب نہ دے سکے تو انھوں نے بتایا: ”وہ بنو عبدالاشہل کا اُصَیرِم عمرو بن ثابت بن وقش ہے۔“ [2]

درس و عبرت

① رسول اللہ ﷺ نے ایک منظّم پروگرام کے تحت یثرب پر خصوصی توجہ دی اور وہ چھ باشندے جو ابتدا میں مسلمان ہوئے۔ انھوں نے اسی سال دعوت اسلامی کو پھیلانے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

② چند اسباب ایسے رونما ہوئے کہ مدینہ طیبہ میں اسلام زور شور سے پھیلا۔ وہ اسباب مندرجہ ذیل تھے:

اوس و خزرج فطری طور پر نرم خو اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے، چنانچہ وہ متکبر اور حق کے منکر نہ ہوئے۔ دراصل یہ ان کے خونی اور نسلی اوصاف تھے جن کی طرف رسول اللہ ﷺ نے اس وقت اشارہ کیا تھا جب یمن سے ایک آدمی آیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا: «أَتَاكُمْ

---

[1] تاريخ الطبري: 359-357/2، والطبقات الكبرٰى لابن سعد: 421,420/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 432,431/2، و المعجم الكبير للطبراني: 362/20.

[2] مسند أحمد: 429,428/5، و مجمع الزوائد: 364/9، و السيرة النبوية لأبي شهبة: 444/1، و صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 291.

أَهْلُ الْيَمَنِ، هُمْ أَرَقُّ أَفْئِدَةً وَّ أَلْيَنُ قُلُوبًا» ”تمھارے پاس اہل یمن آئے ہیں یہ فطرتاً نرم مزاج اور نرم دل ہیں۔“[1]

قحطانی نژاد اوس وخزرج بھی یمن کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ پرانے زمانے میں ان کے آباء واجداد نے اسی علاقے سے ہجرت کی تھی۔[2]

قرآن کریم میں انصار کی تعریف کچھ یوں ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمٰنَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○﴾

”اور (مالِ فَے ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“[3]

اوس وخزرج کے درمیان بغض وعناد اور جنگوں کا سلسلہ زمانہ قدیم ہی سے جاری تھا اور بُعاث جیسی خونریز جنگیں بھی ہو چکی تھیں جن میں ان کے بڑے بڑے سردار مارے جا چکے تھے جو مکہ اور طائف کے سرداروں کی طرح دعوت اسلامی کے راستے میں رکاوٹ بن سکتے تھے۔ لیکن اب صرف نوجوان قیادت باقی تھی جو قبول حق کے لیے تیار تھی۔ کوئی بڑا لیڈر نہ ہونے کی وجہ سے وہ کسی ایسے رہنما کے متلاشی تھے جو ان میں اتحاد پیدا کر سکے اور اس کے زیر سایہ وہ اپنے اختلافات ختم کر سکیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”بعاث کا معرکہ

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 4388. [2] السيرة النبوية لأبي الحسن الندوي، ص: 154. [3] الحشر 9:59.

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے پیغمبر کے لیے پیش بندی کے طور پر پیش آیا تھا۔ آپ ﷺ مدینہ طیبہ آئے تو ان لوگوں کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا، ان کے سردار مارے جا چکے تھے اور انھیں شدید زخم لگے تھے۔ تب اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے رسول ﷺ کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہونے کا موقع عطا فرما دیا۔''[1]

اوس و خزرج یہودیوں کی ہمسائیگی میں رہتے تھے، اس لیے وہ آسمانی ادیان اور پیغمبروں کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے تھے۔ ان کے ہاں یہ معاملات روزانہ زیر بحث آیا کرتے تھے اور وہ قریش کی طرح نہ تھے کہ جن کے پاس اہل کتاب سکونت پذیر نہ تھے جس کی وجہ سے وہ صرف رسالت اور وحی الٰہی کے بارے میں سرسری طور پر مختلف باتیں سنا کرتے تھے، کوئی خاص آسمانی دین ان کے ہاں زیر بحث آتا نہ وہ اس سلسلے میں سنجیدگی سے غور وفکر کرتے تھے۔

یہودی اوس و خزرج کو ڈرایا کرتے تھے کہ ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے اور ہم عنقریب اس کے پیروکار بن کر تمھیں قوم عاد اور عاد ارم کی طرح نیست و نابود کر دیں گے، حالانکہ اوس و خزرج یہود کی نسبت اکثریت کے حامل تھے۔[2]

یہودیوں کے اس قول کو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ○﴾

''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آ گئی جو اس (کتاب) کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس ہے اور اس سے پہلے وہ ان لوگوں کے خلاف فتح مانگتے تھے جنھوں نے کفر کیا، پھر جب ان کے پاس وہ (حق) آ گیا جسے انھوں

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3777، و مسند أحمد: 61/6، و دلائل النبوة للبيهقي: 421/2.

[2] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 183.

نے پہچان لیا تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا، لہٰذا کافروں پر اللہ کی لعنت ہے۔"[1]

اوس وخزرج زمانۂ جاہلیت میں یہود پر تا دیر غالب رہے اور وہ مشرک تھے، لہٰذا اہل کتاب، یعنی یہودی کہا کرتے تھے کہ ایک نبی کا زمانہ قریب آچکا ہے، ہم عنقریب تمھیں عاد اور عاد ارم کی طرح نیست و نابود کریں گے۔[2]

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو غالب کرنے کا فیصلہ کر لیا تو مدینہ سے چھ افراد کو منتخب فرمایا جو رسول اللہ ﷺ سے منیٰ کی گھاٹی کے پاس ملے۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور مسلمان ہو گئے اور پہچان لیا کہ درحقیقت یہی وہ نبی ہے جس کے بل بوتے پر یہود انھیں خوفزدہ کرتے ہیں۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو ہر گھر میں ان کا ذکر خیر ہونے لگا اور سیرت نگاروں کی رائے کے مطابق یہی دن مدینہ میں ابتدائے اسلام کے دن تھے۔[3]

③ پہلی بیعت عقبہ میں قبیلۂ اوس کے دو فرد بھی شامل ہوئے اور یہ اسلام کے حق میں ایک اہم تبدیلی تھی۔ درحقیقت خزرج کے چھ نو مسلم افراد نے بُعاث جیسی سخت ترین جنگ کے بعد یہ کوشش جاری رکھی کہ وہ اوس وخزرج کی باہمی خانہ جنگی کو بھلا دیں اور ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔ ان کی کوششوں سے مزید سات آدمی مسلمان ہوئے جن میں سے دو آدمی قبیلۂ اوس سے تھے جو خزرج کا مخالف تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چھ افراد نے اپنی ذمہ داریاں پوری طرح ادا کیں اور مدینے میں اسلام کی ترویج کے لیے موزوں فضا تیار کی تاکہ پچھلی جنگوں کو بھول کر اوس اور خزرج کے سب لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں۔

④ بیعت عقبہ سے پیدا ہونے والی تبدیلی کے بعد مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کے نمائندۂ خاص بن کر تشریف لے گئے۔ انھوں نے لوگوں کو قرآن سکھایا، اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور کیا اور اپنی دانشمندی، دانائی اور سیاسی بصیرت سے اسلام کے

---

[1] البقرة 2:89. [2] الدر المنثور للسيوطي 1/216. [3] السيرة النبوية لابن هشام 1/39-44.

لیے عظیم کامیابیاں حاصل کیں۔ [1]

⑤ سفیر رسول نے ایک ہی سال میں عظیم کارنامہ سرانجام دیا اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مبلغ کی سچائی اور اخلاص کا نتیجہ تھا۔ اگر آج عالم اسلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو امت مسلمہ کا کوئی ایسا سفیر نظر نہیں آتا۔ اسلامی حکمرانوں کو چاہیے کہ ایماندار، باشرع اور عبادت گزار سفیر مقرر کریں جو اپنے ملک اور دین کی درست نمائندگی کر سکیں اور ان کا قول، عمل، سیرت اور کردار درست ہو تاکہ لوگ انھیں دیکھیں اور ان کی بات غور سے سنیں۔

⑥ سفیر رسول نے ایک عمدہ معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کی تاکہ اسلامی حکومت کے لیے موزوں مرکز میسر آئے۔ سیدنا مصعب رضی اللہ عنہ نے پہلی بیعت عقبہ کی عملی تصویر بن کے دکھایا اور وہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ قوانین شریعت سے مکمل ہم آہنگی ہو۔ [2]

⑦ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں اسلامی اقدار کے فروغ کے لیے انتھک محنت کی اور حتی المقدور اس سلسلے میں کوتاہی سے اجتناب کیا تاکہ ایک انتہائی مضبوط بنیاد فراہم ہو جس پر ایک جدید حکومت کی تشکیل ہونا تھی۔ دعوت کی اس کوشش میں مکمل دو سال صرف ہوئے۔ [3]

⑧ ایمانی جذبہ انصاری مسلمانوں کے دلوں میں داخل ہو گیا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ ایک نئی مملکت کے قیام کا وقت قریب آچکا ہے، جیسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک طاقتور مملکت کے قیام کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا تھا: ”کب تک ہم اللہ کے رسول کو اس حالت میں رہنے دیں گے کہ آپ مکہ کے پہاڑوں میں جلاوطن رہیں اور ڈر اور خوف سے زندگی گزاریں۔“ [4]

⑨ بعثت نبوی کے تیرھویں سال حج کے موسم سے پہلے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مکہ پہنچے اور مدینہ میں مسلمانوں کے احوال اور آئندہ امکانات کا مکمل جائزہ پیش کیا اور بتایا کہ کس طرح اسلام اوس و خزرج کے تمام قبائل میں داخل ہو چکا ہے اور اب ساری قوم آپ سے

---

[1] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 71. [2] دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 356. [3] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 71. [4] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 72.

بیعت کرنے کے لیے تیار ہے اور آپ کی حمایت و نصرت کے لیے پرعزم ہے۔ [1]

⑩ بعثت نبوی کے تیرھویں سال پیش آمدہ ملاقات نے تاریخ کا رخ موڑ دیا جب ستر سے زائد یثربی افراد حج کی ادائیگی کے لیے مکہ آئے۔ مکہ میں ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان خفیہ رابطے قائم ہوئے اور ایام تشریق میں عقبۂ منیٰ میں ملاقات پر اتفاق رائے ہوا جو کہ جمرۂ اولیٰ کے قریب واقع تھی اور یہ بھی طے پایا کہ یہ ملاقات رات کے اندھیرے میں کامل راز داری سے ہوگی۔ [2]

---

[1] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 72. [2] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 73.

باب 3

بیعت عقبہ ثانیہ

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم کہا کرتے تھے: ”کب تک ہم اللہ کے رسول کو خوف کی حالت میں مکہ کے پہاڑوں میں جلاوطنی کی زندگی گزارتے دیکھتے رہیں گے“ اسی اثنا میں ہمارے تقریبا ستر آدمی موسم حج میں وہاں پہنچے اور رسول اللہ ﷺ سے عقبہ منیٰ میں ملاقات کا وعدہ کیا۔ وہاں ہم ایک ایک دو دو کر کے پہنچے اور یوں آپ ﷺ سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ہم نے پوچھا: ”اللہ کے رسول! ہم کن امور پر آپ کی بیعت کریں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا:

«تُبَايِعُونِي عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي النَّشَاطِ وَالْكَسَلِ وَالنَّفَقَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَ عَلَى الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَ أَنْ تَقُولُوا فِي اللّٰهِ لَا تَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ، وَ عَلَى أَنْ تَنْصُرُونِي، فَتَمْنَعُونِي إِذَا قَدِمْتُ عَلَيْكُمْ مِمَّا تَمْنَعُونَ مِنْهُ أَنْفُسَكُمْ وَأَزْوَاجَكُمْ وَأَبْنَاءَكُمْ وَ لَكُمُ الْجَنَّةُ»

”تم مجھ سے ہر اچھے اور برے وقت میں میری اطاعت پر کمر بستہ رہنے، تنگی و آسانی میں خرچ کرنے، اچھائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے، اللہ کے بارے میں حق بات کہنے پر کسی ملامت گر کی پروا نہ کرنے اور جس طرح تم اپنی جانوں، بچوں اور بیویوں کی حفاظت کرتے ہو جب میں تمھارے پاس آجاؤں تو میری بھی اسی

طرح حفاظت کرنے پر بیعت کرو، اس کے بدلے میں تمھارے لیے جنت ہے۔‘‘

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم آپ کی بیعت کرنے کی غرض سے آگے بڑھے تو اَسعَد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ نے جو سب سے چھوٹے تھے آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیا اور یوں گویا ہوئے: ’’اے اہل یثرب! ذرا ٹھہر جاؤ۔ ہم نے اتنا لمبا سفر اس یقین پر کیا ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں لیکن یہ سوچ لو کہ آپ ﷺ کے یہاں سے (مدینہ کی طرف) ہجرت کرنے کا مطلب پورے عرب سے مکمل طور پر کٹ جانا، تمھارے سرداروں کا اپنی جان ہتھیلی پر رکھنا اور تمھیں تلواروں کا سامنا کرنا ہے۔ اگر تم صبر کرو گے تو تمھارا اجر اللہ کے ہاں ہے اور اگر بزدلی دکھانی ہے تو ابھی سے کہہ دو، اللہ کے ہاں تمھارا یہ عذر مقبول ہوگا۔‘‘ اس پر سب نے بیک آواز کہا: ’’اے اسعد! راستے سے ہٹ جائیے، ہم یہ بیعت کسی قیمت پر بھی ترک نہ کریں گے۔‘‘ جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ’’ہم سب نے آپ ﷺ کی بیعت کی۔ آپ ﷺ نے بیعت کی تمام شرائط کا تذکرہ کیا اور ہمیں جنت کی ضمانت دی۔‘‘[1]

گویا کہ انصار نے رسول اللہ ﷺ سے اطاعت، نصرت اور جنگ پر بیعت کی، اس لیے عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اسے بیعت حرب کہا کرتے تھے۔[2]

یہ قصہ بیان کرنے والے ایک صحابی حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بھی ہیں جس میں مزید اہم تفصیلات موجود ہیں۔ کعب رضی اللہ عنہ خود اس بیعت میں شامل تھے، وہ فرماتے ہیں: ’’ہم سب مشرکین کے ساتھ ہی حج کی غرض سے روانہ ہوئے اور ہم اسلامی تعلیمات جانتے تھے اور نمازی تھے، پھر جب مکہ پہنچے تو رسول اللہ ﷺ سے ایام تشریق کی درمیانی رات عقبہ مِنٰی میں ملاقات کا وعدہ کرلیا۔ ہم نے اپنے قافلے کے مشرکین سے اپنے پروگرام کو خفیہ رکھا، چنانچہ وعدے والی رات ہم اپنے خیموں میں سوئے۔ جب رات کا تیسرا حصہ گزر گیا تو نبی ﷺ سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے لیے کسی آہٹ کے بغیر آہستگی سے نکلے

---

[1] مسند أحمد:3/323,322، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:1/199. [2] مسند أحمد:5/316.

اورخفیہ طور پر عقبۂ منیٰ میں جمع ہوگئے۔ ہم تقریباً ستر آدمی تھے اور دو عورتیں نسیبہ بنت کعب اور اسماء بنت عمرو رضی اللہ عنہما ہمارے ساتھ تھیں۔ ہم وہاں رسول اللہ ﷺ کا انتظار کر رہے تھے کہ آپ تشریف لے آئے اور آپ کے ساتھ حضرت عباس بن عبدالمطلب بھی تھے۔ وہ اگرچہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن اپنے بھتیجے کے معاملے میں پختہ عہد لینا چاہتے تھے، چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے کلام کا آغاز کیا کہ دیکھو رسول اللہ ﷺ بنو ہاشم کی حفاظت میں ہیں اور اب وہ مدینہ ہجرت کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا آپ سے میں حمایت کا مکمل وعدہ لینا چاہتا ہوں، ورنہ آپ ان کا راستہ چھوڑ دیں۔ انصار نے خواہش ظاہر کی کہ رسول اللہ ﷺ گفتگو فرمائیں اور آپ ﷺ اپنے اور اپنے رب کے حق میں جو بھی شرائط چاہیں طے کرسکتے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: «أُبَايِعُكُمْ عَلٰى أَنْ تَمْنَعُونِي مِمَّا تَمْنَعُونَ مِنْهُ نِسَاءَ كُمْ وَ أَبْنَاءَ كُمْ» ”میں تم سے اس بات پر بیعت لینا چاہتا ہوں کہ تم میری اسی طرح حفاظت کرو گے جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہو۔“ اس پر حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور کہا: ”ہم ضرور آپ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہیں تو آپ ہم سے بیعت لے لیجیے۔ اللہ کی قسم! ہم نسل در نسل آزمودہ کار جنگجو اور اسلحہ بردار ہیں۔“ ابوالہیثم بن تَیِّہان نے ان کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا: ”اے اللہ کے رسول! ہمارے یہودیوں سے معاہدات ہیں اور آپ کی خاطر ہم انھیں ختم کر رہے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ جب اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی عطا فرمائے تو آپ واپس اپنی قوم کے پاس آجائیں؟“ رسول اللہ ﷺ مسکرا دیے اور فرمایا: «بَلِ الدَّمُّ الدَّمُّ وَالْهَدْمُ الْهَدْمُ، أَنَا مِنْكُمْ وَ أَنْتُمْ مِنِّي، أُحَارِبُ مَنْ حَارَبْتُمْ وَ أُسَالِمُ مَنْ سَالَمْتُمْ» ”(نہیں ایسا نہیں ہوگا) بلکہ آج کے بعد میرا جینا اور مرنا تمھارے ساتھ ہوگا۔ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔ میری اور تمھاری صلح اور جنگ مشترک ہوگی۔“

پھر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: «أَخْرِجُوا إِلَيَّ مِنْكُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا لِّيَكُونُوا

عَلٰی قَوْمِهِمْ بِمَا فِیهِمْ» ''اپنے افراد میں سے بارہ آدمی علیحدہ کرلو۔ میں انھیں اپنی اپنی قوم کا سربراہ بنانا چاہتا ہوں۔'' انھوں نے ایسا ہی کیا۔ نو افراد خزرج سے اور تین اوس سے منتخب ہوئے۔ اب آپ ﷺ نے انھیں واپس اپنی قیام گاہوں کی طرف جانے کا حکم دیا۔ سب نے یہ آواز سنی کہ شیطان قریش کو بلند آواز سے ڈرا رہا ہے۔ عباس بن عُبادہ بن نَضلہ نے کہا: ''اس اللہ کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا! اگر آپ چاہیں تو صبح ہم تمام اہل منٰی پر تلواروں سے حملہ کر دیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَمْ نُؤْمَرْ بِذٰلِكَ، وَلٰكِنِ ارْجِعُوا إِلٰی رِحَالِكُمْ» ''مجھے ابھی اس کا حکم نہیں ملا۔ بس تم واپس اپنی قیام گاہوں میں چلے جاؤ۔'' یوں وہ سب واپس چلے آئے۔

صبح کے وقت سرداران قریش ان کے خیموں میں پہنچے اور ان سے پوچھا کہ ہمیں نبی ﷺ سے ان کی بیعت اور آپ ﷺ کی ہجرت کے متعلق خبر ملی ہے؟ اوس و خزرج کے مشرکین نے حلف دیا کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا اور مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔[1]

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''قریش واپسی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان میں حارث بن ہشام بن مغیرہ مخزومی بھی تھا جس نے نئے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جابر رضی اللہ عنہ کے والد عبد اللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اے ابو جابر! آپ ہمارے سردار ہیں، کیا آپ کے پاس ایسے جوتے ہیں؟'' اور اس کلام سے میں صرف شریک گفتگو ہونا چاہتا تھا۔ یہ بات حارث نے سن لی اور اپنے جوتے اتار کر میری طرف پھینک دیے اور کہا: ''اللہ کی قسم! تو ضرور انھیں پہنے گا۔'' ابو جابر مجھ سے کہنے لگے: ''واللہ! تو نے اس جوان کو غصہ دلایا ہے۔ اس کے جوتے واپس کردو۔'' میں نے کہا: ''نہیں! اللہ کی قسم! جوتے واپس نہیں کروں گا، یہی تو نیک فال ہے، اگر سچ ثابت ہوئی تو میں ضرور اس کا سلب (سامان) حاصل کروں گا۔''[2]

---

[1] مسند أحمد:3/460-462، والسيرة النبوية لابن هشام: 61/2، والسيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 201/1. [2] مسند أحمد:3/460-462، والمستدرك للحاكم: 425,424/2.

درس وعبرت

① بیعت عقبۂ ثانیہ اپنے اندر بہت سی خوبیاں، اسباب اور آثار سموئے ہوئے تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ یہ ایک عظیم فتح تھی کیونکہ بعدازاں تمام فتوحات اسلامیہ جو درجہ بدرجہ حاصل ہوئیں، ان کی کڑیاں اس بیعت سے ملتی ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس موقع پر انصار کے اس ہراول دستے سے عہد و میثاق لیا جو اپنے عہد نبھانا بخوبی جانتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی پاسداری میں ہر قسم کی قربانی پیش کر سکتے تھے اور حسب ضرورت اپنی جانیں، اموال اور عزتیں بھی داؤ پر لگا سکتے تھے۔ اگر سیاق پر نظر ڈالی جائے تو درحقیقت یہ حق اور اس کی نصرت و تعاون کی بیعت تھی اور یہ ایسی قوت تھی جس نے تمام فسادی قوتوں سے ٹکر لینی تھی اور ایسا ہی ہوا۔ انصار نے تمام جنگوں اور معرکوں میں اس کی قدر و منزلت کم نہ ہونے دی۔ اس بیعت کے نتیجے میں کلمۃ اللہ کے لیے تمام حاملین دعوت نے اپنے جہادی وسائل پیش کیے تاکہ اس سرزمین میں ہر متکبر کا خاتمہ ہو اور دین صرف اللہ کا نافذ ہو۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ یہ دین سچائی، عدل، نصرت، شہادت اور اسلامی پیغام لوگوں تک پہنچانے کا نام ہے۔“[1]

② جب حقیقی ایمان دلوں میں اثر پذیر ہوتا ہے تو اس کے آثار قد آور قیادتوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں جو اپنی جان اور مال اللہ اور اس کے رسول کی رضا جوئی کی خاطر قربان کرتے ہیں اور اس سرزمین پر کسی جاہ و منصب، قیادت اور سرداری کے خواہاں نہیں ہوتے۔

اگر غور کیا جائے تو یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے لمبا زمانہ حصول اقتدار اور طلب جاہ کے لیے جنگیں لڑیں لیکن آج اللہ پر ایمان کی برکت سے جو ان کے دلوں میں داخل ہو چکا تھا، وہ صرف اللہ کی رضا چاہتے تھے۔[2]

③ اس واقعے سے آپ ﷺ کی عظیم منصوبہ بندی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ انتہائی مشکل حالات

---

[1] محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 2/400. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 2/103.

میں بیعت عقبہ ثانیہ منعقد ہوئی جو کہ ایک جرأت مندانہ اقدام اور تمام مشرک طاقتوں کے لیے ایک چیلنج تھا، اس لیے آپ ﷺ نے اس منصوبے کی کامیابی کے لیے اس میں انتہائی درستی اور پختگی سے کام لیا جو کہ مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھا:[1]

بیعت کرنے والوں کا اپنی سرگرمیوں کو پوشیدہ رکھنا تا کہ یہ راز کھل نہ جائے۔ اس بیعت میں شریک ستر آدمی اور دو عورتیں تھیں جو پانچ سو افراد کے قافلے میں شامل تھے، لہٰذا یہ کام بڑا مشکل تھا۔ ان کی نقل و حرکت آسان نہیں تھی۔ ایام تشریق کی درمیانی رات بیعت کے لیے موزوں خیال کی گئی کہ جب رات کا تہائی حصہ گزر چکا ہوگا، لوگ سو جائیں گے اور ان کا ازدحام کم ہو جائے گا تب گھاٹی میں جائیں گے۔ اس کے لیے ایک محفوظ گھاٹی کا انتخاب کیا گیا جو لوگوں کی نگاہوں سے دور تھی تا کہ اگر کوئی کسی ضرورت سے جاگے تو وہاں نہ پہنچ سکے۔[2]

اصحاب بیعت کا منظّم انداز اور چپکے چپکے چھپ کر، ایک ایک دو دو کی شکل میں مقررہ جگہ پر پہنچنا۔

مقررہ جگہ کو صیغۂ راز میں رکھنا جسے سوائے عباس بن عبدالمطلب، علی بن ابی طالب اور ابوبکر رضی اللہ عنہم کے کوئی نہ جانتا تھا۔ حضرت عباس آپ ﷺ کے لیے پختہ عہد لینے کے خواہاں تھے۔[3] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گھاٹی کے کنارے کھڑے ہو کر جاسوسی کے فرائض انجام دیے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ گھاٹی کے راستے میں کھڑے یہ فریضہ انجام دے رہے تھے۔[4]

ان تین افراد کے سوا کوئی بھی اس واقعے کو نہ جانتا تھا اور اصحاب بیعت کو بھی حکم تھا کہ وہ اپنی آواز پست رکھیں اور لمبی گفتگو سے گریز کریں کہیں کوئی جاسوس ان کی آواز یا حرکت کو سن یا دیکھ نہ لے۔[5]

مسلسل راز داری کا اہتمام۔ جب شیطان نے بیعت کا راز فاش کر دیا تو آپ ﷺ

---

[1] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص:61. [2] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص:61. [3] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص:62. [4] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 109/2. [5] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 62.

نے انھیں واپس اپنی قیام گاہوں پر جانے کا حکم دیا اور اسے مکمل صیغۂ راز میں رکھنے کا حکم دیا اور مسلح جدوجہد سے منع فرما دیا کیونکہ ایسے فوری اقدام کی ابھی ضرورت نہ تھی۔ اور جب قریش بغرض تفتیش وہاں پہنچے تو اصحاب بیعت نے یا تو خاموشی سے کام لیا یا پھر گفتگو کا رخ موڑنے کے لیے نئے کلام کا سہارا لیا۔[1]

موسم حج کی آخری رات کا انتخاب اور یہ ذوالحجہ کی تیرھویں رات تھی کیونکہ اگلے روز نماز ظہر کے فوراً بعد انھیں اپنے شہر روانہ ہوجانا تھا تاکہ بالفرض اگر بیعت کا راز کھل بھی جائے تو قریش انھیں اس امر سے باز رکھ سکیں نہ روک سکیں، جبکہ اس کا خدشہ موجود تھا۔[2]

④ بیعت کی پانچوں دفعات اتنی واضح اور ٹھوس تھیں کہ کسی صورت میں اسلام کمزور یا ناکام ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا اور وہ یہ دفعات تھیں: ”ہر اچھے اور برے وقت میں فرماں برداری، تنگی اور آسانی میں مال خرچ کرنا، بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی پروا نہ کرنا اور رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لے آئیں آپ ﷺ کی نصرت کرنا۔“[3]

⑤ ابوالہیثم بن تیہان ؓ نے کہا تھا کہ یہود سے ہمارے معاہدے ہیں جو ہم آپ کی خاطر ختم کررہے ہیں۔ اگر آپ غالب آگئے تو کیا واپس مکہ اپنی قوم میں تشریف لے جائیں گے اور ہمیں چھوڑ دیں گے؟ اس پر رسول اللہ ﷺ مسکرائے تھے اور فرمایا تھا: ”نہیں، اب جینا مرنا تمھارے ساتھ ہے۔ تم مجھ میں سے اور میں تم میں سے ہوں۔ میری اور تمھاری صلح اور جنگ مشترکہ ہے۔“

مذکورہ اعتراض سے اس کامل آزادی کی طرف اشارہ ملتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی بدولت مسلمانوں کو عطا فرمائی کیونکہ ابو الہیثم نے کامل آزادی سے کھل کر اظہار خیال کیا

---

[1] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص: 65. [2] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص: 67. [3] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 82.

تھا۔[1] رسول اللہ ﷺ کا جواب بھی بہت شاندار تھا کہ آپ نے خود کو انصار کا اور انصار کو اپنا حصہ قرار دیا۔[2]

⑥ انصار کا بلا تردد دعوت قبول کرنا، براء بن مَعْرور نے فوراً کہا تھا: ''اس ذات کی قسم جس نے آپ کو برحق مبعوث فرمایا! ہم آپ کا تحفظ اپنے بیوی بچوں کی طرح کریں گے۔ آپ ہم سے بیعت لے لیں۔ اللہ کی قسم! ہم نسل در نسل جنگجو اور اسلحہ بردار لوگ ہیں۔'' گویا اس قافلے کا قائد اپنی قوم کی صلاحیتوں سے آپ ﷺ کو آگاہ کرتا ہے کہ وہ جنگجو لوگ ہیں۔[3]

براء بن معرور رضی اللہ عنہ کا بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا

یہاں حضرت براء کے حوالے سے ایک اہم قصے کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے کہ جب وہ اپنی قوم کے ہمراہ یثرب سے مکہ آ رہے تھے تو انھوں نے قوم سے کہا: ''میری ایک رائے ہے۔ مجھے نہیں علم کہ تم اس سے اتفاق کرو گے یا نہیں۔'' قوم نے پوچھا: ''وہ کیا ہے؟'' براء نے کہا: ''میرا دل چاہتا ہے کہ میں کعبے کی طرف پشت نہ کروں اور نماز میں رخ اُس کی طرف پھیر لوں۔'' سب نے کہا: ''ہمیں تو یہی خبر ملی ہے کہ نبی ﷺ شام، یعنی بیت المقدس کی جانب رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور ہمیں اس کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔'' اب براء کعبے کی طرف اور باقی حضرات بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے اور اسی حالت میں مکہ پہنچے۔ وہ نبی ﷺ کو خبر دینے کے لیے مسجد حرام میں پہنچے۔ آپ ﷺ اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تشریف فرما تھے۔ آپ نے عباس رضی اللہ عنہ سے کہا: «هَلْ تَعْرِفُ هٰذَيْنِ الرَّجُلَيْنِ يَا أَبَا الْفَضْلِ؟» ''ابو الفضل! کیا آپ ان دو آدمیوں کو جانتے ہیں؟'' عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہاں، یہ براء بن معرور اپنی قوم کے سردار اور یہ کعب بن مالک ہیں۔'' نبی ﷺ نے پوچھا: «اَلشَّاعِرُ؟» ''کعب جو شاعر ہیں؟'' عباس رضی اللہ عنہ نے

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي:3/97. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان:2/67. [3] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص:82.

کہا: ”ہاں!“ تب براء نے تمام قصہ کہہ سنایا کہ وہ سفر میں کعبے کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے رہے ہیں، پھر آپ ﷺ سے رائے دریافت کی۔ نبی ﷺ نے فرمایا: «قَدْ كُنْتَ عَلٰى قِبْلَةٍ لَّوْ صَبَرْتَ عَلَيْهَا» ”جس قبلے پر تم تھے کاش اسی پر کاربند رہتے۔“ [1]

حضرت کعب رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ براء رضی اللہ عنہ نے دوبارہ نبی ﷺ کا قبلہ اختیار کرلیا اور ہمارے ساتھ شام (بیت المقدس) کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے لگے۔ انھوں نے مرض الموت میں اہل خانہ سے کہا کہ انھیں قبلہ رخ کردیں۔ اسی دوران اپنے ایک تہائی مال کی وصیت نبی ﷺ کے لیے کی۔ براء نبی ﷺ کی مدینہ آمد سے قبل ہی ماہ صفر میں انتقال کرگئے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کا ایک تہائی مال قبول فرمایا اور بعدازاں انھی کے بیٹے کو عطا کردیا اور وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اپنے مال میں سے ایک تہائی کی وصیت کی تھی۔ [2]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کے فرامین اور آپ کی سیرت طیبہ پر عمل کا غایت درجہ التزام کیا، چنانچہ کوئی بھی تجویز چاہے اس کی بنیاد اپنی جگہ کتنی ہی مضبوط ہو مگر تعلیمات نبوی سے میل نہ کھائے تو وہ مسترد کردی جائے گی۔ یہ اسلامی تعلیمات کا پہلا سبق تھا جس پر وہ زندگی بھر کاربند رہے، حالانکہ اس وقت وہ لوگ اسلام کی پیروی کے ابتدائی دور میں تھے۔

قیادت و سیادت صرف نبی ﷺ کے لائق ہے۔ صرف وہی انسان احترام کے قابل ہوسکتا ہے جو نبی ﷺ کے احکامات کی پابندی اور سیرت طیبہ اپنانے، جاہلی رسومات سے چھٹکارا حاصل کرنے اور ایمانی اقدار پر کاربند رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وہ ٹھوس بنیاد ہے جس پر لوگوں کی تنظیم نو کی جاسکتی ہے۔ [3]

⑦ نقیبوں کے انتخاب میں درج ذیل نکات قابل توجہ ہیں:

---

[1] مسند أحمد: 461/3، والسيرة النبوية لأبي شهبة: 444/1. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 445/1.

[3] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 135.

رسول اللہ ﷺ نے اپنی طرف سے نقیب مقرر نہیں کیے بلکہ یہ کام بیعت کرنے والوں پر چھوڑ دیا تاکہ منتخب افراد بہتر نمائندے اور ذمہ دار داعی ثابت ہو سکیں۔ انسان کے لیے بہتری بھی اسی میں ہے کہ وہ خود اپنے نمائندے اور مختارِ کار چنے۔ درحقیقت یہ شورائی معاملہ تھا اور آپ ﷺ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں اس کی عملی تربیت دی۔

اس انتخاب میں اکثریت کو مدنظر رکھا گیا۔ خزرجی لوگ اوس کے مقابلے میں تین گنا زیادہ تھے، اس لیے ان میں سے نو اور اوس میں سے تین نقیب مقرر ہوئے۔ [1]

رسول اللہ ﷺ نے ایسے وقت نقیب مقرر فرمائے جب یثرب میں اسلام کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں اور اسلام اختیار کرنے والے روز بروز بڑھ رہے تھے۔ آپ ﷺ انھیں احساس دلانا چاہتے تھے کہ وہ اجنبیوں کی حیثیت سے واپس نہیں جا رہے کہ اُن پر ان کے علاوہ کسی اور کو قائد مقرر کیا گیا ہو بلکہ وہ اسلامی برادری میں شامل ہو چکے ہیں اور اس دین کے حمایتی اور مددگار ہیں۔ [2]

⑧ بیعت عقبۂ ثانیہ کے بارے میں سردارانِ مکہ کو جب علم ہوا تو انھوں نے فوراً اہل یثرب کا تعاقب کیا اور دو افراد سعد بن عبادہ اور مُنذر بن عمرو رضی اللہ عنہما کو اذاخر نامی جگہ پر گھیرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مُنذر رضی اللہ عنہ تو ان کے ہاتھ نہ لگے لیکن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو انھوں نے پکڑ لیا اور کجاوے کی رسی سے باندھ لیا۔ یاد رہے یہ دونوں ان بارہ سرداروں میں سے تھے، بہر حال سعد رضی اللہ عنہ کو وہ مارتے ہوئے اور ان کے لمبے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے مکہ لے آئے۔ [3] بالآخر انھیں حارث بن امیہ اور جبیر بن مطعم کی سفارش سے رہائی ملی کیونکہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اپنے شہر میں ان کی تجارت کے نگہبان ہوتے تھے، چنانچہ جاہلیت کے تعلقات ان کے کام آئے لیکن مسلمانوں کی تلواریں انھیں نہ چھڑا سکیں۔ سعد رضی اللہ عنہ

---

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 209. [2] دراسات في السيرة النبوية للدكتور عماد الدين خليل، ص: 132. [3] التاريخ الإسلامي للحميدي: 107/3.

نے اس سلسلے میں کسی ناراضی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مسلمان تو خود مکہ میں چھپتے پھر رہے ہیں اور اپنی حفاظت کرنے سے بھی عاجز ہیں۔[1]

اس موقع پر ضرار بن خطاب بن مرداس نے دو شعر کہے جو ہجرت کے سلسلے میں پہلے اشعار تھے۔ اس نے فخریہ انداز میں کہا تھا:

> ”میں نے سعد پر زبردستی قابو پالیا اور اسے پکڑ لیا۔ اگر منذر کو بھی پکڑ لیتا تو مجھے تسلی ہو جاتی۔“ ”اگر میں اسے پکڑ لیتا تو اس کا وہیں خون بہا دیا جاتا۔ اور وہ ذلت کا اور قتل ہونے ہی کا مستحق تھا۔“

ادھر حضرت حسان رضی اللہ عنہ جواب دینے کے لیے تیار تھے۔ انھوں نے برمحل چند اشعار کہے: جنھیں قافلے والے ایک دوسرے کو سنایا کرتے تھے:

> ”تو سعد کا ہم پلہ نہیں اور نہ کوئی آدمی مُنذر کا ہمسر ہے۔ جب قریش کے گھڑسواروں اور شتربانوں نے ان دونوں کو گھیرا۔“
>
> ”تو اس سوئے ہوئے شخص کی طرح نہ ہو جو خواب میں دیکھتا ہے کہ میں کسریٰ یا قیصر کے شہر میں ہوں۔“
>
> ”پس بے شک ہماری اور جو ہماری طرف قصیدے بھیجتا ہے اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو کھجوروں کی سرزمین خیبر میں کھجوریں بیچنے چلا آئے، یعنی ”الٹے بانس بریلی کو“ والا معاملہ ہے۔“[2]

⑨ حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: ”اس ذات کی قسم جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر مبعوث فرمایا! اگر آپ حکم دیں تو علی الصباح ہم اہل منیٰ پر تلواروں سے ٹوٹ پڑیں۔“ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ”مجھے ابھی اس کا حکم نہیں ملا، لہٰذا تم اپنی قیام گاہوں پر واپس چلے جاؤ۔“ یہ ایک عظیم تربیتی سبق تھا کہ اسلام کا دفاع اور دشمنوں سے سلوک کا

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 116/2. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 65/2.

تعین مسلمانوں کی مرضی سے نہ ہوگا بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے حکمت بھرے احکامات کے مطابق ہوگا، اب کسی امر کا جائزہ لیے یا آپس میں مشورہ کیے بغیر کوئی بھی اقدام یا حملہ درست نہ ہوگا۔[1] اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ سیاسی منصوبہ بندی جتنی مضبوط ہوگی اتنی ہی زیادہ کامیابیوں کا امکان ہوگا اور اپنے طے شدہ منصوبوں پر عمل پیرا ہونے کے لیے جتنی بھی راز داری اختیار کی جائے گی اسی قدر کامیابی کا حصول ممکن ہوگا، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم اپنی خواب گاہوں میں واپس چلے جاؤ۔“[2]

⑩ مرد حضرات سے بیعت کا طریقہ یوں ہوتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنا دست مبارک پھیلاتے اور لوگ اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر بیعت کرتے لیکن دو عورتیں جو اس بیعت میں شامل تھیں انھوں نے آپ سے ہاتھ نہیں ملایا بلکہ نبی ﷺ نے کبھی کسی اجنبی عورت کے ہاتھ کو چھوا تک نہیں، بہر حال ان دونوں نے بھی بیعت کی جسے ”بیعت حرب“ کہا جاتا ہے اور یہ عہد ساری عمر نبھایا۔ ام عمارہ نسیبہ بنت کعب مازنیہ رضی اللہ عنہا احد میں شدید زخمی ہوئیں اور تقریباً بارہ زخم کھائے۔ وہ درحقیقت اپنے شوہر زید بن عاصم بن کعب رضی اللہ عنہ کے ہمراہ وہاں پہنچی تھیں اور اپنے مشکیزے سے مسلمانوں کو پانی پلاتی تھیں۔ جب مسلمانوں کے قدم اکھڑے تو وہ جلدی سے آپ ﷺ کی طرف متوجہ ہوئیں، عملاً جنگ میں حصہ لیا اور تلوار سے رسول اللہ ﷺ کا دفاع کرتی رہیں اور انھیں ایک گہرا زخم لگا تھا۔ وہ بیعت رضوان میں بھی شریک ہوئیں۔[3]

مسیلمہ کذاب نے ان کے لخت جگر حبیب بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہما کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے لیکن نہ وہ کمزور ہوئیں اور نہ ڈگمگائیں۔[4]

فتنۂ ارتداد میں جنگ یمامہ میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں باقاعدہ شریک ہوئیں

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 104/3. [2] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 96. [3] المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص: 108. [4] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 87.

اور جنگ میں انھیں بارہ زخم آئے اور ایک بازو بھی کٹ گیا۔[1]

اور بیعت کرنے والی دوسری خاتون اسماء بنت عمرو بنو سلمہ سے تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی والدہ یا معاذ رضی اللہ عنہ کی پھوپھی کی بیٹی تھیں۔[2]

⑪ سیرت صحابہ رضی اللہ عنہم پر لکھی گئی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عقبہ ثانیہ میں شریک قریباً تہتر افراد میں سے ایک تہائی افراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یا کچھ دیر بعد شہید ہوگئے اور تقریباً نصف تعداد ہر معرکے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو بہ پہلو شریک جنگ رہی اور جنگِ بدر میں ان میں سے تقریباً ستر افراد نے شرکت کی۔

بیعتِ عقبہ کے تمام حاضرین نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے وعدے کو پورا کیا۔ ان میں سے بعض آپ کی زندگی ہی میں رتبۂ شہادت سے سرفراز ہوگئے اور بعض نے امت اسلامیہ کی قیادت میں اہم کردار ادا کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عظیم معرکوں میں حصہ لیا۔ تاریخ اپنے تمام ادوار اور زمانے کھنگال ڈالے مگر اس کے صفحات میں ان افراد کی نظیر نہیں ملے گی۔ وہ لوگ ایسے تھے جنھوں نے لوگوں کو عطا کیا اور خود سوائے جنت کے کسی چیز کے طلبگار نہ ہوئے اور رہتی دنیا کے لیے ایک یادگار چھوڑ گئے۔[3]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 80/2، و أسد الغابة: 395/5، و البداية والنهاية: 3/158-166، والإصابة: 8/8. [2] المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص: 108. [3] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 140/2.

باب 4

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ہجرتِ مدینہ

ہجرت کی ابتدائی تیاریاں

ہجرت مدینہ سے قبل اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مہربانی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مکمل منصوبہ بندی اور تیاری فرمائی اس کے دو پہلو تھے: ایک طرف مہاجرین میں جذبہ پیدا کرنا اور دوسری طرف یثرب کی فضا اس ہجرت کے لیے سازگار بنانا۔

مہاجرین کی تیاری: ہجرت مدینہ کوئی سیر وتفریح کا سفر نہ تھا کہ لوگ اسے راحتِ جان کے لیے اختیار کرتے۔ یہ تو اپنی سرزمین، خاندان، قریبی تعلقات، دوستی ومحبت کے رابطے اور وسائل رزق کو اپنے عقیدے کی حفاظت کے لیے خیر باد کہنا تھا، اس لیے مہاجرین کو ایک اعلیٰ درجے کے جذبۂ قناعت وصبر کی اشد ضرورت تھی جس کے لیے سخت محنت درکار تھی۔ مندرجہ ذیل وسائل اس کے حصول کا سبب بنے:

- گہری ایمانی تربیت جسے گزشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا۔
- مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم جن سے کفار کے ساتھ گزارا نہ ہونے کے خیال نے جنم لیا اور وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔
- قرآن کریم کی مکی سورتوں میں قصدِ ہجرت کی ترغیب دی گئی اور اس بات کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی کہ اللہ کی زمین بڑی وسیع ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَاَرْضُ اللّٰهِ وٰسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○﴾

”کہہ دیجیے: اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! اپنے رب سے ڈرو، جنھوں نے اس دنیا میں اچھے عمل کیے ان کے لیے بھلائی ہے اور اللہ کی زمین وسیع ہے، بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا۔“ [1]

پھر اس کے بعد سورۂ کہف کا نزول ہوا جس میں ایمان دار نوجوانوں کی ایک جماعت کا تذکرہ ہے کہ وہ کس طرح ہجرت کر کے ایک غار میں پہنچے۔ اس سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ ہمیں بھی اپنے عقیدے کے تحفظ کے لیے عزیز و اقارب اور وطن کو چھوڑ دینا چاہیے۔

اس کے بعد سورۂ نحل میں صریحاً ہجرت مدینہ کا یوں تذکرہ کیا گیا:

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○﴾

”اور جن لوگوں نے ظلم وستم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، البتہ ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش! وہ علم رکھتے، وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔“ [2]

اسی سورت کے آخر میں اس مفہوم کو پھر بطور تاکید بیان کیا گیا:

﴿ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْۤا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○﴾

”پھر بے شک آپ کا رب ان لوگوں کے لیے (مہربان ہے) جنھوں نے آزمائش میں پڑنے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور صبر کیا، بے شک آپ کا رب ان (آزمائشوں)

---

[1] الزمر 10:39۔ [2] النحل 42,41:16۔

کے بعد (ان لوگوں کے لیے) البتہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔''[1]

قبل ازیں ہجرت حبشہ میں بھی اعزہ واقربا اور وطن چھوڑنے کا عملی تجربہ ہو چکا تھا۔

یثرب میں حمایت اسلام: نبی ﷺ نے مکہ سے یثرب (مدینہ) انصار کے پاس منتقل ہونے میں جلد بازی سے کام نہیں لیا بلکہ دو سال انتظار کیا تاکہ مدینہ میں دعوت کی ایک وسیع بنیاد قائم ہو جائے اور کچھ مدت وہ لوگ قرآنی تعلیمات کی روحانی لذتوں سے فیض یاب ہوں۔ ان کی یہ تربیت حضرت مصعب بن عمیر ؓ کی خصوصی توجہ سے عمل میں آئی۔

جب نبی ﷺ کو یقین ہو گیا کہ انصار کی قبول اسلام کی استعداد کمال کو پہنچ گئی ہے تو آپ ﷺ عازم سفر ہوئے۔ انصار کا آپ کو ہجرت کی دعوت دینا، بیعت عقبہ ثانیہ میں گفتگو اور تحفظات کی بات کرنا، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیے گئے وعدے کو اپنی زندگی کا اہم میثاق سمجھنا، اہل منیٰ جنھوں نے نبی ﷺ کو اذیتیں دی تھیں، ان کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہونا۔ اگرچہ آپ ﷺ نے اس سے منع فرما دیا کہ ہمیں ابھی اس کا حکم نہیں۔ یہ سب امور اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت تھے کہ انصارِ مدینہ اسلام کے دست و بازو بننے کے لیے پوری طرح آمادہ ہیں۔ گویا اہل یثرب کی تیاری مکمل ہو چکی تھی کہ وہ مہاجرین کا کما حقہ استقبال کر سکیں اور اس کے بعد پیش آنے والے مسائل کا خندہ پیشانی سے سامنا کر سکیں۔

سورۂ عنکبوت کے توجہ طلب مقامات

سورۂ عنکبوت مکی دور کے آخری ایام میں نازل ہونے والی سورت ہے جس میں دعوتی میدان میں پیش آمدہ آزمائشوں کا ذکر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الٓمّٓ ○ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ○ وَلَقَدْ
فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ○
اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ○﴾

---

[1] النحل 110:16.

''الٓمّٓ، کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ صرف یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انھیں آزمایا نہیں جائے گا اور البتہ تحقیق ہم نے ان لوگوں کو آزمایا ہے جو ان سے پہلے تھے، چنانچہ اللہ ان لوگوں کو ضرور ظاہر کرے گا جنھوں نے سچ بولا اور وہ ضرور ظاہر کرے گا ان کو جو جھوٹے ہیں، کیا جو لوگ برے عمل کرتے ہیں انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ ہم سے بچ کر نکل جائیں گے۔ بہت برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔''[1]

سورۂ عنکبوت کے تین مقامات انتہائی غور طلب ہیں:

منافقین کا ذکر حالانکہ نفاق اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب مسلمانوں کا غلبہ ہو۔ تب کچھ لوگ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اسلام کا اظہار کرتے ہیں مگر دل سے بدستور شرک پر قائم رہتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو مکہ میں جاہلیت غالب تھی۔ اور مشرکین کو قوت اور غلبہ حاصل تھا، پھر منافقین کا ذکر کس بنا پر کیا گیا جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝ ﴾

''اور اللہ انھیں ضرور ظاہر کرے گا جو ایمان لائے اور وہ منافقوں کو بھی ضرور ظاہر کرے گا۔''[2]

سورۂ عنکبوت مکی ہے۔ تو کیا اہل ایمان کو مستقبل قریب میں کوئی واضح مدد یا کشادگی کے آثار نظر آرہے تھے (جس کی وجہ سے بعض منافق لوگ ان میں شامل ہوگئے تھے)؟ یا مذکورہ بالا آیت مدنی ہے، جبکہ سورت مکی ہے جس طرح کہ بعض مفسرین کی یہ رائے ہے کیونکہ ابھی نفاق تو وجود میں نہیں آیا تھا؟[3]

اہل کتاب کے ساتھ افہام وتفہیم کا بہتر انداز اختیار کرنا: درحقیقت یہ حکم پیش آمدہ مرحلے

---

[1] العنکبوت 29:1-4.

[2] العنکبوت 29:11.

[3] اس کی وضاحت کے لیے ملاحظہ کیجیے المعجم المفہرس اس کے مؤلف محمد فواد عبدالباقی نے اس آیت کے ساتھ ''م'' کی رمز لگائی ہے جو کہ آیت کے مدنی ہونے کی علامت ہے۔ اور ملاحظہ کیجیے: تفسیر القرطبي: 323/13.

کے حوالے سے تھا کہ عنقریب اہل کتاب سے واسطہ پڑے گا اور اے اہل ایمان! تمھیں اہل کتاب سے ٹکر لینے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔

اللہ کی وسیع زمین میں ہجرت کے لیے لوگوں کو تیار کرنا: دراصل پہلی بیعت عقبہ کے بعد ہی مہاجرین کے استقبال کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ جب سورۂ عنکبوت نازل ہوئی تو حالات دگرگوں تھے لیکن اس سورت میں واضح طور پر ہجرت مدینہ کا اشارہ دیا گیا کہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ہر ایک کو ہر وقت اور ہر مقام پر رزق عطا کرتا ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ○﴾

”اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! بلاشبہ میری زمین وسیع ہے تو تم میری ہی عبادت کرو۔“[2]

مذکورہ بالا آیت اہل ایمان کو مکہ سے ہجرت کرنے پر ابھارتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زمین بہت وسیع ہے اور اس زمین میں رہنا درست نہیں جہاں کفار کی اذیتیں برداشت کرنا پڑیں بلکہ درست سوچ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے اچھے لوگ اور بہتر سرزمین منتخب کی جائے، گویا کہ آیت میں کہا گیا ہے: ”اے اہل ایمان! اگر مکہ میں اظہار ایمان مشکل ہے تو اظہار توحید کے لیے ہجرت کر جاؤ کیونکہ اللہ کی سرزمین بہت وسیع ہے۔“[3]

بعدازاں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ فراوانیِ رزق کسی خاص خطۂ زمین سے منسلک نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق جہاں کہیں آباد ہوگی وہیں انھیں رزق پہنچایا جائے گا اور مہاجرین کا رزق مدینہ ہی میں مقدر تھا، چنانچہ وہاں انھوں نے پہلے سے زیادہ اور عمدہ رزق پایا، نیز تھوڑے ہی عرصے میں وہ بہت سے شہروں اور ملکوں کے حکام بن گئے۔[4]

---

[1] معالم قرآنية في الصراع مع اليهود للدكتور مصطفى مسلم، ص:63,62. [2] العنكبوت56:29.

[3] تفسير القرطبي:5073/6. [4] تفسير ابن كثير:360/3.

اسی لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝﴾

''اور کتنے ہی (زمین پر) چلنے پھرنے والے ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ انھیں اور تمھیں بھی رزق دیتا ہے اور وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔''[1]

سورۂ عنکبوت میں اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح کی موت کی طرف یہ کہہ کر اشارہ فرمایا:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۖ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝﴾

''ہر جاندار موت کا مزہ چکھنے والا ہے، پھر تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''[2]

گویا انسان موت کی تلخی اور کرب کو ایسے محسوس کرے گا جس طرح کوئی کھانے کا ذائقہ حاصل کرتا ہے تو فرمانِ الٰہی کا مطلب یوں ہوگا کہ تم سب مرنے والے ہو اور عنقریب دنیاوی اعمال کا بدلہ پانے والے ہو، لہٰذا ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ آخرت کے لیے پونجی جمع کرے۔[3]

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اس آیت کریمہ میں ہجرت کی رغبت دلائی گئی ہے کیونکہ جب یقینی موت کا تصور دل میں بیٹھ جائے تو وطن چھوڑنا آسان ہوجاتا ہے۔[4]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ مذکورہ آیت کے ضمن میں فرماتے ہیں: ''فرمان الٰہی ہے کہ تم جہاں بھی ہوگے موت بہر صورت برحق ہے، اس لیے حکم الٰہی کے مطابق ہمیشہ اللہ کی فرماں برداری اختیار کرو اور یہی تمھارے لیے بہتر ہے کیونکہ موت سے کوئی انسان بھاگ نہیں سکتا۔ موت یقینی امر ہے اور اللہ کا فرمانبردار بندہ جب اس کے پاس لوٹے گا تو بہترین جزا کا مستحق قرار پائے گا۔''[5]

---

[1] العنكبوت 60:29. [2] العنكبوت 57:29. [3] الكشاف للزمخشري: 310/3، وتفسير أبي السعود: 45/7، وفتح القدير للشوكاني: 210/4. [4] الأساس في التفسير لسعيد حوى: 4223/8.
[5] تفسير ابن كثير: 359/2.

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ○ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○﴾

”اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ہم انھیں جنت کے بالا خانوں میں ضرور جگہ دیں گے، ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، (نیک) عمل کرنے والوں کا اجر بہت اچھا ہے، جن لوگوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔“[1]

اس آیت میں مومنین کی دین اسلام پر ثابت قدمی، ہجرت الی اللہ، دشمنوں کے خلاف تیاری اور اپنے اعزہ و اقربا کو چھوڑنے کا ذکر ہے، جبکہ وہ رضائے الٰہی کے خواہش مند اور اللہ کے حسب وعدہ ثواب کی امید رکھتے ہیں، نیز ان تمام امور میں وہ اللہ ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔[2]

مہاجرین کے قافلے

جب خیر و برکت سے معمور نورانی ہراول دستوں نے یثرب سے آکر نبی ﷺ کی اسلام اور آپ کے دفاع پر بیعت کر لی تو مشرکین مکہ بھڑک اٹھے اور مسلمانوں کو پہلے سے زیادہ اذیتیں دینے لگے۔ تب رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ہجرت مدینہ کا حکم دیا جس کا مقصد وہاں ایک اسلامی مملکت کا قیام تھا جہاں دعوتِ اسلامی کو فروغ مل سکے اور اس کی اشاعت کے لیے مستقل محنت کی جا سکے یہاں تک کہ سارا فتنہ وفساد ختم ہو جائے اور دین الٰہی سب دینوں پر غالب آجائے۔[3]

نبی ﷺ کا حکم ہجرت رضائے الٰہی کے مطابق تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”جب

---

[1] العنکبوت 29:58,59. [2] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 325.

[3] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص: 33، 34.

دوسری بیعت عقبہ ہوئی اور ستر انصارِ مدینہ واپس روانہ ہوئے تو نبی ﷺ کو خوشی اور اطمینان میسر آیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی حفاظت کے لیے ایسی قوم پیدا فرما دی تھی جو جنگجو بھی تھے اور آپ کے لیے کمک اور بوقت ضرورت مدد بھی فراہم کر سکتے تھے۔ جب مشرکینِ مکہ کو علم ہوا تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر سختیاں بڑھ گئیں اور وہ انھیں بلاوجہ ستانے لگے اور پہلے سے زیادہ دشنام طرازی کرنے اور اذیتیں دینے لگے۔ اصحابِ رسول نے جب شکایت پیش کی اور ہجرت کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«قَدْ أُرِيتُ دَارَ هِجْرَتِكُمْ، رَأَيْتُ سَبْخَةً ذَاتَ نَخْلٍ بَيْنَ لَابَتَيْنِ وَلَوْ كَانَتِ السَّرَاةُ أَرْضَ نَخْلٍ وَّ سِبَاخٍ، لَقُلْتُ: هِيَ هِيَ»

”مجھے تمھارا دار ہجرت دکھایا گیا ہے، وہ ایک شوریدہ اور کھجوروں والی زمین ہے جو دو سیاہ پتھریلی زمینوں کے درمیان واقع ہے[1] اور اگر ”سُرَاۃ“ کھجوروں والی زمین ہوتا تو میں اسے دار ہجرت سمجھتا۔“[2]

پھر کچھ ہی دنوں بعد آپ ﷺ اپنے اصحاب کے پاس خوشی خوشی تشریف لائے اور فرمایا:

«قَدْ أُخْبِرْتُ بِدَارِ هِجْرَتِكُمْ وَ هِيَ يَثْرِبُ فَمَنْ أَرَادَ الْخُرُوجَ فَلْيَخْرُجْ إِلَيْهَا»

”مجھے تمھارا دارِ ہجرت بتا دیا گیا ہے۔ وہ یثرب ہے۔ اب تم میں سے جو چاہے یثرب کی جانب ہجرت کر سکتا ہے۔“[3]

یوں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یکے بعد دیگرے یثرب کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ وہ آپس

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 2297. [2] سبل الهدىٰ والرشاد للصالحي: 224/3. ”سراۃ“ عرفات یا طائف سے لے کر صنعاء (یمن) تک پھیلا ہوا پہاڑی علاقہ ہے، اس کے ایک طرف تہامہ اور دوسری طرف نجد ہے۔ اس میں سراۃ ثقیف، سراۃ ازد، سراۃ فہم وعدوان، سراۃ بنی شبابہ وغیرہ شامل ہیں۔ (معجم البلدان: 204/3) [3] سبل الهدىٰ والرشاد للصالحي: 224/3.

میں مشورہ کرتے، ایک دوسرے کی ڈھارس بندھاتے اور اتفاق رائے سے پوشیدہ طور پر عازم سفر ہوجاتے۔ سب سے پہلے مدینہ طیبہ تشریف لانے والے ابوسلمہ بن عبدالاسد تھے، پھر عامر بن ربیعہ اپنی بیوی لیلیٰ بنت ابی حثمہ کے ساتھ مدینہ پہنچے۔ یہ وہ پہلی خاتون تھیں جنھوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی، پھر قافلوں کی شکل میں لوگ پہنچنے لگے اور انصار مدینہ نے مہاجرین کو اپنے گھروں میں جگہ دی اور ان کی مدد اور غمخواری کی۔ ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے غلام سالم رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی آمد سے قبل قباء میں مہاجرین کی امامت فرماتے رہے۔

مسلمانوں کی ہجرت مدینہ کی خبر سنتے ہی قریش انتہائی غضبناک ہوئے۔ انھوں نے اپنے قبائل کے مسافر نوجوانوں سے مال واسباب چھین کر غصہ اتارنے کی کوشش کی۔

یہاں اس قافلے کا ذکر ضروری ہے جنھوں نے دوسری بیعت عقبہ میں شرکت کی اور جب مہاجرین قباء پہنچنے شروع ہوئے تو وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس مکہ پہنچ گئے اور مہاجرین صحابہ کے ساتھ مل کر عازمِ مدینہ ہوئے۔ اس لحاظ سے وہ بیک وقت مہاجرین بھی ہوئے اور انصاری بھی کہلائے۔ یہ ذکوان بن عبدقیس، عُقْبہ بن وہب بن کلدہ، عباس بن عبادہ بن نضلہ اور زِیَاد بن لَبِید رضی اللہ عنہم تھے۔

دریں اثنا تقریباً تمام مسلمان مکہ سے ہجرت کر چکے تھے اور وہاں صرف رسول اللہ ﷺ، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے یا کوئی مصیبت زدہ، بیمار یا ہجرت سے معذور ہی رہ گیا تھا۔[1]

ہجرتِ مدینہ اور قریش کی رکاوٹیں

ابوسلمہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما کی ہجرت: حضرت ام سلمہ ہند بنت ابوامیہ رضی اللہ عنہا اپنی اور اپنے خاوند کی ہجرت مدینہ کے سلسلے میں اپنے ایمانی جذبے اور یقین محکم کا تذکرہ اس طرح فرماتی ہیں: ”جب ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے ہجرت مدینہ کا فیصلہ کرلیا تو مجھے اور میرے بیٹے سلمہ بن

---

[1] الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 325/1.

ابی سلمہ کو اونٹ پر سوار کیا اور سفر شروع کیا۔ جب بنومغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم کے لوگوں نے دیکھا تو وہ آ کر کہنے لگے:

''جہاں تک تمھاری ذات کا تعلق ہے اس سلسلے میں ہم بے بس ہیں لیکن ہم اپنے گھر کی لڑکی کس لیے چھوڑ دیں کہ تم اسے شہر شہر گھماتے پھرو۔''

چنانچہ انھوں نے اونٹنی کی مہار ہاتھ میں لی اور مجھے پکڑ لیا۔ اس پر ابوسلمہ کے گھر والوں کو تاؤ آ گیا۔ انھوں نے کہا:

''جب تم لوگوں نے اس عورت کو ہمارے آدمی سے چھین لیا تو ہم اپنا بیٹا اس کے پاس نہیں رہنے دیں گے۔''

چنانچہ فریقین نے اس بچے پر کھینچا تانی کی جس سے اس کا بازو اکھڑ گیا اور ابوسلمہ کے قبیلے والے اسے لے گئے۔ مجھے بنومغیرہ اپنے ہاں لے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے خاوند ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے اکیلے یثرب کا سفر کیا۔ اس طرح میرے، میرے خاوند اور بیٹے کے درمیان جدائی پیدا ہوگئی۔

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ''میں ہر روز صبح ابطح نامی جگہ پر جاتی اور سارا دن وہاں رو رو کر گزار دیتی یہاں تک کہ تقریباً ایک سال گزر گیا، پھر اچانک ایک روز میرے خاندان کا ایک آدمی وہاں سے گزرا تو اسے مجھ پر رحم آ گیا۔ اس نے بنومغیرہ سے کہا: ''تم اس بیچاری کو جانے کیوں نہیں دیتے اور خواہ مخواہ اس کے شوہر اور بیٹے سے اسے جدا کر رکھا ہے۔''

تب انھوں نے کہا کہ اگر تو چاہے تو جا سکتی ہے اور بنوعبدالاسد نے میرا بیٹا بھی واپس کر دیا۔ میں اپنے اونٹ پر سوار ہوئی، بیٹا گود میں لیا اور اکیلی عازم سفر ہوئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ جو کوئی راستے میں ملا، اس سے گزارش کروں گی کہ مجھے میرے خاوند کے پاس پہنچا دے۔ جب میں تنعیم پہنچی تو عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ سے ملاقات ہوگئی جو کہ بنوعبدالدار کے ایک فرد تھے، وہ بولے: ''اے بنت ابوامیہ! کہاں کا ارادہ ہے؟''

میں نے کہا: ''اپنے خاوند کے پاس مدینہ جانا چاہتی ہوں۔''

عثمان نے پوچھا: ''کیا تمھارے ساتھ کوئی ہے؟''

میں نے کہا: ''اللہ کی قسم! سوائے اللہ اور اس چھوٹے بیٹے کے کوئی نہیں۔''

اس پر عثمان نے کہا: ''اللہ کی قسم! تمھیں اس طرح اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔''

پھر انھوں نے اونٹ کی نکیل پکڑی اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

ام سلمہ فرماتی ہیں: ''اللہ کی قسم! میں نے عرب میں عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ باحیا آدمی نہیں دیکھا۔ جب بھی کہیں پڑاؤ ڈالتے، اونٹ بٹھا دیتے اور خود دور چلے جاتے، جب میں نیچے اترتی تو اونٹ کو لے جاتے اور سامان نیچے اتارتے اور درخت سے اسے باندھ دیتے، پھر مجھ سے دور کسی درخت کے نیچے لیٹ جاتے۔ اور جب کوچ کا وقت آتا، اونٹ لیے میرے پاس پہنچتے اور اسے بٹھا دیتے اور خود دور جا کر آواز دیتے: ''سوار ہو جاؤ'' جب میں سوار ہو جاتی، اونٹ کی نکیل پکڑے چل دیتے۔ اس طرح وہ مجھے مدینہ تک لے آئے۔

جب قباء میں بنو عمرو بن عوف کے محلے میں پہنچے تو انھوں نے کہا: ''آپ کے خاوند ابو سلمہ اس بستی میں ہیں۔'' ابو سلمہ وہیں قیام پذیر تھے۔

پھر عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''اللہ آپ کو برکت دے! قبا میں داخل ہو جائیں۔'' اور ان الفاظ کے ساتھ وہ مکہ واپس روانہ ہو گئے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اکثر فرمایا کرتی تھیں: ''میرے علم کے مطابق ہجرت کے سلسلے میں سب سے زیادہ تکلیف ابو سلمہ کے گھرانے کو پیش آئی اور عثمان بن طلحہ جیسا نیک سیرت انسان میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''[1]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 2/ 112، 113، والسيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 1/ 202، 203.

مندرجہ بالا قریشی طرز عمل شقاوت قلبی کا واضح ثبوت ہے کہ وہ کس طرح ابو سلمہ ؓ کو ہجرت سے روکنا چاہتے تھے کہ ایک آدمی کو اس کی بیوی اور دل کے ٹکڑے کو نظروں کے سامنے چھین لیا جائے تاکہ ہجرت مدینہ سے روکا جاسکے لیکن جب ایمان دلوں میں راسخ ہو جائے تو صاحبِ ایمان اپنے دین پر کسی کو بھی، چاہے وہ اس کا لخت جگر یا بیوی کیوں نہ ہو، ترجیح نہیں دیتا۔ اس لیے ابوسلمہ ؓ بلا تردد مدینہ روانہ ہو گئے اور قریشی حربہ ناکام ہو گیا۔ اس میں اللہ کی طرف بلانے والے داعیوں کے لیے بہترین نمونہ ہے۔[1]

ایمانی حرارت جب دلوں میں داخل ہوتی ہے تو پھر اس کا اثر بھی ظاہر ہوتا ہے جس طرح کہ ابوسلمہ ؓ کا گھرانہ تھا کہ ان کا شیرازہ بکھیر دیا گیا۔ ایک طرف عورت زاروقطار روتی ہے تو دوسری طرف اس کے بیٹے کا بازو اکھڑ گیا اور اسے والدین سے جدا کر دیا گیا۔ خاوند اور باپ کی حیثیت رکھنے والے عظیم انسان نے اللہ کی راہ میں قربانی دینے اور اکیلے ہی سفر کرنے کی عظیم داستان رقم کی تاکہ سب سے پہلے مدینہ طیبہ پہنچے۔ انھوں نے اللہ کے راستے میں پہنچنے والی ہر تکلیف کو خندہ پیشانی سے قبول کیا، پختہ ارادے کے ساتھ اپنے ایمان پر کاربند رہے اور ہدایت یافتہ گروہ سے جا ملے۔ مقام غور یہ ہے کہ ایسے باہمت افراد کا مقابلہ کفار کیسے کر سکتے تھے!

عثمان بن طلحہ ؓ بعد میں (صلح حدیبیہ کے بعد اور) فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوئے، جبکہ اس وقت حالت کفر میں تھے، تاہم حضرت ام سلمہ ؓ ان کی طرف سے کریمانہ برتاؤ کی گواہی دیتی ہیں۔ یہ عربوں کے انتہائی خلوص، مردانگی اور کمزور طبقے کی حمایت جیسی خوبیوں کی واضح دلیل ہے۔[2]

حضرت عثمان بن طلحہ ؓ کی مردانگی اور خالص عربی کردار نے ایک شریف عورت کا

---

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 131,130. [2] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 124.

خوفناک صحرا میں اکیلے سفر کرنا گوارا نہ کیا، حالانکہ وہ ابھی کفر پر تھے اور جانتے تھے کہ یہ عورت انھیں اور دیگر کفار قریش کو چھوڑ کر جا رہی ہے۔

امت مسلمہ کے لیے غور کا مقام ہے۔ وہ عربی اخلاق آج کہاں ہیں؟ آج بیسویں صدی کی اخلاقیات کا یہ عالم ہے کہ آزادیوں پر حملے ہوتے اور عزتوں پر ڈاکے پڑتے ہیں اور راہزنی کے واقعات عام ہو چکے ہیں۔ ہر روز اخبارات کے صفحات کی زینت بننے والی مسلح ڈکیتی، گینگ ریپ اور لوگوں کے اموال پر زبردستی قبضہ کرنے کی کارروائیاں انسانیت کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔

اس قصے سے اور اس جیسے دیگر واقعات سے عربوں کے نمایاں فضائل کا پتا چلتا ہے اور یہ کہ ان کی خوبیاں اور فضائل، ان کے عیوب اور گھٹیا حرکتوں سے زیادہ تھے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان میں سے آخری نبی اور رسول مبعوث فرمایا کیونکہ وہ رسالت کو قبول کرنے اور پوری دنیا تک پیغامِ رسالت پہنچانے کی قابلیت رکھنے والے تھے۔ [1]

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کی طرف کتنی توجہ فرماتا ہے اور انھیں دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عثمان بن طلحہ کا دل حضرت ام سلمہ ؓ کے حق میں کس طرح نرم کر دیا اور پھر عثمان نے ان کی خاطر مشقت اٹھائی اور وقت کی قربانی بھی دی۔ [2]

اس سے عثمان بن طلحہ ؓ کی فطرت سلیمہ کا علم بھی ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہو گئے اور شاید ام سلمہ ؓ کی ہمراہی میں کیے ہوئے سفر کی وجہ سے ان کا دل ضبط حق کے لیے روشن ہو گیا تھا۔ [3]

زبردستی مدینہ سے واپس لانا

قریشی قیادت نے مسلمانوں کو حدود مکہ میں ہجرت سے روکنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 461/1. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 128/3. [3] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 204/1.

مدینہ پہنچنے والے مہاجروں کو زبردستی واپس لانے کی کوششیں بھی کیں۔ وہ ایک مہاجر کو زبردستی واپس لانے میں کامیاب ہوگئے۔ [1]

اس تاریخی واقعے کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ یوں بیان کرتے ہیں: ’’میں، عیاش بن ابی ربیعہ اور ہشام بن عاص بن وائل سہمی نے جب ہجرت مدینہ کا فیصلہ کیا تو مقام سَرِف [2] سے آگے اَضاۃ بنی غِفار [3] میں تَنَاضِب [4] نامی مقام پر جمع ہونے پر اتفاق کیا اور یہ طے پایا کہ جو بھی وہاں نہ پہنچ پایا تو سمجھا جائے گا کہ اسے مکہ والوں نے قید کر لیا ہے، لہٰذا باقی دونوں عازم سفر ہو جائیں گے۔‘‘ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ’’میں اور عیاش بن ابی ربیعہ تو اس جگہ پہنچ گئے لیکن ہشام قید کر لیا گیا اور آزمائش میں ڈالا گیا۔‘‘ [5]

پھر ہم مدینہ طیبہ کے قریب قباء میں بنو عمرو بن عوف کے ہاں پہنچ گئے۔ دوسری طرف ابوجہل بن ہشام اور حارث بن ہشام جو عیاش کے چچا زاد تھے اور عیاش ان کا اخیافی بھائی تھا، عیاش کو واپس لینے مکہ سے نکلے اور ہمارے پاس پہنچ گئے جبکہ اللہ کے رسول ﷺ ابھی تک مکہ ہی میں تھے۔ ان دونوں نے گفتگو اس طرح شروع کی کہ تیری ماں نے نذر مان رکھی ہے کہ تجھے دیکھے بغیر سر میں کنگھی نہیں کرے گی اور نہ سائے میں بیٹھے گی۔ یہ بات سن کر عیاش کا دل نرم پڑ گیا۔ میں نے عیاش سے کہا: ’’دیکھو! یہ لوگ تمھیں تمھارے دین کے بارے میں آزمائش میں ڈالنا چاہتے ہیں، لہٰذا تم محتاط رہو۔ اللہ کی قسم! تمھاری ماں جوؤں کی تکلیف سے کنگھی کرنے اور مکہ کی گرمی سے تنگ آکر سایے میں بیٹھنے پر

---

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم العلي ص: 132.

[2] سرف: یہ مکہ کی ندیوں میں ایک متوسط طول کی ندی ہے، نیز مکہ سے چھ میل کے فاصلے پر ایک مقام کا نام سرف ہے۔ (معجم البلدان: 212/3)

[3] اضاۃ بنی غِفار: یہ مکہ سے دس میل کے فاصلے پر تناضب کے قریب (سرف کے بالائی جانب) ایک مقام ہے۔ (معجم البلدان: 214/1)

[4] تناضب: یہ مکہ کے قریب ایک مقام ہے۔ تناضب تنضیب کی جمع ہے اور یہ دراصل ایک درخت کا نام تھا۔

[5] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 129.

خود بخود مجبور ہو جائے گی۔'' لیکن عیاش بن ابی ربیعہ نے کہا: ''نہیں، میں اپنی ماں کی قسم پوری کروں گا اور میرا کچھ مال مکہ میں ہے وہ بھی حاصل کرلوں گا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: ''اللہ کی قسم! تم جانتے ہو میں ایک مالدار قریشی ہوں۔ تم میرا آدھا مال لے لینا مگر واپس مت جاؤ۔'' لیکن عیاش رضی اللہ عنہ نہ مانے تو میں نے کہا: ''اگر تم نے واپسی کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو میری سواری لے جاؤ کیونکہ یہ ایک عمدہ اور تجربہ کار اونٹنی ہے۔ اس پر سوار رہنا اور اگر کوئی خطرہ ہوا تو بھاگ نکلنا۔'' عیاش ان دونوں کے ساتھ واپس چل نکلے۔ راستے میں ابوجہل نے کہا کہ یہ میرا اونٹ تو بہت اکھڑ ہے، مجھے تم اپنی اونٹنی کے پیچھے بٹھالو۔

عیاش نے کہا: ''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر اونٹنی بٹھائی اور ان دونوں نے بھی اپنی اپنی سواریاں بٹھائیں، پھر اچانک وہ دونوں عیاش رضی اللہ عنہ پر ٹوٹ پڑے اور انھیں رسیوں سے باندھ لیا اور یوں وہ آزمائشوں میں ڈالے گئے۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ہم دل میں کہا کرتے تھے کہ ایسے لوگ جنھوں نے اللہ کی معرفت حاصل کرلی اور پھر دوبارہ مکہ پلٹ گئے، ان سے اللہ تعالیٰ کبھی نہ فدیہ قبول کرے گا اور نہ توبہ، پھر اللہ کے رسول ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ○ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○﴾

''آپ کہہ دیجیے: (اللہ فرماتا ہے:) اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم و

---

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 205/1.

زیادتی کی ہے! تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ سب گناہ معاف کردیتا ہے، یقیناً وہی بڑا بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے اور تم اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرماں بردار ہوجاؤ اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آجائے، پھر تمھاری مدد نہ کی جائے گی۔''[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے یہ آیات لکھ کر ہشام بن عاص کے پاس مکہ روانہ کردیں۔'' ہشام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''جب مجھے یہ آیات پہنچیں، میں ذی طویٰ میں ایک پہاڑ پر چڑھ رہا تھا اور انھیں درست پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کررہا تھا، پھر میں نے دعا کی: ''اے اللہ تعالیٰ! مجھے اس کا مطلب سمجھا دے۔'' تب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ یہ آیات تو ہمارے بارے میں اور جو ہم دل میں ایک دوسرے کے متعلق سوچا کرتے تھے، اس کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، پھر میں جلدی سے اپنی سواری کے قریب پہنچا، اس پر بیٹھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ جا پہنچا۔''[2]

مندرجہ بالا واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں ساتھیوں عیاش اور ہشام سے مل کر ہجرت مدینہ کے لیے ایک عمدہ پروگرام ترتیب دیا۔ یہ تینوں مختلف قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے اور انھوں نے حدود حرم سے دور مدینہ کے راستے میں ایک جگہ اور وقت مقرر کیا اور یہ طے کرلیا کہ اگر کوئی وہاں نہ پہنچ سکا تو باقی افراد انتظار نہ کریں اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ہشام بن عاص کو روک لیا گیا۔[3]

دوسری طرف قریش نے مہاجرین کے تعاقب کا فیصلہ کررکھا تھا۔ انھوں نے ایک پختہ منصوبہ تیار کیا جسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ابوجہل اور حارث بن ہشام مدینہ پہنچے۔ مذکورہ دونوں افراد عیاش رضی اللہ عنہ کے اخیافی بھائی بھی تھے، اس لیے اس نے ان پر اعتبار کرلیا۔

---

[1] الزمر 39:53-55. [2] دلائل النبوة للبيهقي: 462,461/2، و مجمع الزوائد: 61/6، و مسند البزار، حديث: 1746، والهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 131. [3] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 159/2.

ابوجہل نے عیاش کو ان کی ماں کے حوالے سے ایک خودساختہ کہانی سنائی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ عیاش اپنی ماں کے لیے شفقت اور نرمی کا جذبہ رکھتے ہیں، لہٰذا وہ ان کے ساتھ لوٹنے کے لے تیار ہو گئے۔ اس واقعے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے امن و تحفظ کے اعلیٰ شعور کا بھی پتا چلتا ہے کہ عیاش کو زبردستی قیدی بنا لینے کا ان کا خدشہ درست نکلا۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اخوت اسلامی کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے عیاش رضی اللہ عنہ کو آدھے مال کی پیشکش کی تا کہ ان کا بھائی سلامت رہے اور مشرکوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ لیکن عیاش پر اپنی ماں کے حق میں نرمی اور شفقت کے جذبات غالب آ گئے۔ وہ اپنی ماں کی قسم پوری کرنے اور اپنا مال حاصل کرنے کی امید میں دھوکا کھا گئے۔ ادھر حضرت عیاش رضی اللہ عنہ نے بھی اخوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا آدھا مال لینے سے انکار کر دیا، جبکہ ان کا اپنا مال مکہ میں موجود تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سوچ زیادہ گہری تھی جیسا کہ وہ عیاش کے مکہ واپسی کے سفر کو منحوس سمجھ کر انھیں آزمائش میں مبتلا ہوتے دیکھ رہے تھے۔ جب عیاش نہ مانے تو انھوں نے اپنی عمدہ اور سدھائی ہوئی سواری پیش کر دی۔ اور پھر وہی ہوا جس کا عمر رضی اللہ عنہ کو ڈر تھا کہ مشرکین غداری پر اتر آئے۔[2]

مسلمانانِ مدینہ منورہ میں یہ بات عام تھی کہ جو لوگ جاہلی معاشرے میں رہنا پسند کرتے ہیں، آزمائشوں میں بھی مبتلا ہیں اور ہجرت نہ کر کے مصائب سے دوچار ہیں تو ایسے لوگوں سے فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس پر مذکورہ آیات نازل ہوئیں۔ ان آیات کا نازل ہونا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دلی دوست عیاش و ہشام کو لکھ بھیجا تا کہ وہ لشکر کفار سے نجات حاصل کریں۔ عمر رضی اللہ عنہ کتنے عظیم انسان تھے کہ پہلے تو اپنا نصف مال عیاش کو دینے کے لیے تیار ہو گئے تا کہ وہ واپس مکہ نہ جائے اور پھر اپنی تیز رو اونٹنی دے دی باوجودیکہ عیاش رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ کی رائے قبول نہ کی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی کو

---

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم العلي، ص: 134. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان:2/160.

برا نہیں کہا، نہ اس کی خیر خواہی سے پہلو تہی اختیار کی اور نہ آئندہ اپنی رائے سے اجتناب کیا بلکہ ایک مسلمان بھائی کی اخوت ان پر غالب رہی اور جیسے ہی آیات مذکورہ نازل ہوئیں، فورًا اپنے دونوں بھائیوں ہشام وعیاش کو بالخصوص اور تمام ایمانداروں کو بالعموم روانہ کر دیں تاکہ وہ نئے سرے سے اہل ایمان کے ساتھ آ ملنے کی جدوجہد کریں۔ [1]

مومنین کو قید میں رکھنا

قریشیوں نے مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے کے لیے انھیں قید میں ڈالنا شروع کر دیا۔ جو بھی ہجرت کرنا چاہتا اسے کسی ایک گھر میں ہاتھ اور پاؤں باندھ کر پھینک دیا جاتا اور بھاگنے کی کوشش ناکام بنانے کے لیے سخت پہرہ بٹھایا جاتا، کبھی ایسا ہوتا کہ بغیر چھت کے کسی باغ میں قید کیا جاتا جیسا کہ عیاش اور ہشام بن عاص رضی اللہ عنہما کے ساتھ کیا گیا۔ [2]

یوں قید کے دوران مکہ جیسے پہاڑی علاقے کی سخت گرمی بھی برداشت کرنا پڑتی۔

قریشی سرداروں کا اس طرز عمل سے ایک طرف ان قیدیوں کو ہجرت سے روکنا مقصود تھا تو دوسری طرف ہجرت کی سوچ رکھنے والوں کے لیے نصیحت آموز سبق تھا لیکن اس کے باوجود وہ ہجرت مدینہ کے راستے میں رکاوٹ نہ بن سکے، جیسا کہ عیاش اور ہشام رضی اللہ عنہما وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے اور مدینہ طیبہ پہنچ گئے۔

رسول اللہ ﷺ مدینہ میں مکہ کے کمزور مسلمانوں کے لیے بالعموم اور کچھ دیگر افراد کے لیے بالخصوص قنوت فرماتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ جب آخری رکعت میں رکوع سے سر اٹھاتے تو دعا کرتے:

«اَللّٰهُمَّ أَنْجِ عَيَّاشَ بْنَ أَبِي رَبِيعَةَ، اَللّٰهُمَّ أَنْجِ سَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ، اَللّٰهُمَّ أَنْجِ الْوَلِيدَ بْنَ الْوَلِيدِ، اَللّٰهُمَّ أَنْجِ الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ،

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 160/2. [2] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم العلي، ص: 132.

اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلٰى مُضَرَ، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا سِنِينَ كَسِنِي يُوسُفَ»

”اے اللہ! عیاش بن ابی ربیعہ، سلمہ بن ہشام، ولید بن ولید اور دیگر کمزور مسلمانوں کو (کفار کی قید سے) نجات عطا فرما۔ اے اللہ! قبیلۂ مضر پر اپنی پکڑ سخت کر دے اور ان پر ایسی قحط سالی مسلط کر دے جیسی یوسف علیہ السلام کے زمانے میں تھی۔“[1]

مسلمانوں نے حضرت عیاش رضی اللہ عنہ کو زبردستی واپس لے جانے کے واقعے کو یکسر بھلایا نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ٹھوس منصوبہ بندی کے تحت ایک صحابی کو ان کی بازیابی کے سلسلے میں مکہ روانہ کیا۔ اس نے اپنی پوری صلاحیت اور سمجھ داری سے کام لیا اور ان کے پاس پہنچ گیا، پھر ان کی بیڑیاں توڑ ڈالیں اور انھیں مدینہ منورہ لانے میں کامیاب ہو گیا۔[2]

مسلمانوں سے مال و اسباب چھین لینا

حضرت صہیب بن سنان النمری رضی اللہ عنہ قبیلہ نمر بن قاسط سے تعلق رکھتے تھے۔ رومیوں نے اس قبیلے پر حملہ کیا اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو جو ابھی بچے تھے، قیدی بنا لیا۔ انھوں نے رومیوں کے ہاں پرورش پائی اور ان کی زبان سیکھی۔ دریں اثنا ایک دن وہ عبداللہ بن جدعان کے ہاتھ فروخت ہوئے جس نے انھیں خرید کر آزاد کر دیا۔ صہیب اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ایک ہی دن مسلمان ہوئے۔[3]

سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ ایمانی پختگی کی عمدہ مثال اور اللہ کے راستے میں مال قربان کرنے کی عظیم داستان تھے کیونکہ انھوں نے توحید و ایمان کے علمبرداروں میں شامل ہونے کی خاطر اپنی ساری جائیداد اللہ اور اس کے رسول کے راستے میں نچھاور کر دی۔[4]

حضرت ابو عثمان نہدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 1006، و مسند أحمد: 418/2. [2] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 135. [3] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 119.
[4] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 120.

نے جب ہجرت کا ارادہ کیا تو اہل مکہ نے کہا: ”جب تو مکہ میں آیا تھا تو تو حقیر اور فقیر تھا۔ ہماری سرزمین میں رہتے ہوئے تجھے مال نصیب ہوا اور تو پروان چڑھا۔ اب تو اپنے مال کے ہمراہ یہاں سے کیسے جا سکتا ہے؟ اللہ کی قسم! یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔“ صہیب رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ”اگر میں اپنا مال تمھیں دے دوں تو کیا میرا راستہ چھوڑ دو گے؟“ انھوں نے کہا: ”ہاں!“ یوں صہیب رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا مال انھیں دے دیا اور خود ہجرت کی۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا: «رَبِحَ صُهَيْبٌ! رَبِحَ صُهَيْبٌ» ”صہیب نفع مند ہوا۔ صہیب نفع مند ہوا۔“[1]

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: ”صہیب رضی اللہ عنہ بغرض ہجرت روانہ ہوئے تو اہل مکہ ان کے پیچھے ہو لیے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے اپنے ترکش سے تقریباً چالیس تیر نکالے اور کہا: ”تم مجھ تک اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک میرا ہر تیر ایک آدمی میں پیوست نہ ہو جائے، پھر میں تلوار سے مقابلہ کروں گا اور تم میری مردانگی کو بخوبی جانتے ہو۔ میری دو لونڈیاں مکہ میں ہیں وہ تم لے سکتے ہو۔“[2]

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”انھی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝﴾

”اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو (اس کے ہاتھ) بیچ ڈالتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر بہت شفیق ہے۔“[3]

جب انھیں رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: «أَبَا يَحْيٰ! رَبِحَ الْبَيْعُ!» ”اے ابو یحییٰ! تیری تجارت فائدہ مند ہے۔“④ پھر آپ ﷺ نے مذکورہ آیت تلاوت فرمائی۔“

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 121/2، والمطالب العالية لابن حجر، رقم: 4063، روایت مرسل ہے۔ [2] المستدرك للحاكم: 398/3. [3] البقرة 2:207. [4] المستدرك للحاكم: 398/3.

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے اس عمل سے مادہ پرست لوگوں کی کم عقلی اور بے وقوفی کے خلاف دلیل ملتی ہے جو اسلامی تاریخ کو مادی پیمانوں سے جانچتے ہیں اور انھیں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا عمل نظر نہیں آتا جنھوں نے ہجرت کی خاطر اپنا سارا مال قربان کر دیا۔ کیا یہ سوچا جا سکتا ہے کہ اس عمل کے عوض اللہ کے رسول ﷺ انھیں کسی منصب یا مدینہ طیبہ میں شاندار زندگی کی نوید سنانے والے تھے؟ نہیں! بلکہ صہیب رضی اللہ عنہ نے ایمانداروں کی صف میں اس لیے شامل ہونا چاہا کہ اللہ تعالیٰ کو یہی پسند تھا۔ انھوں نے رضائے الٰہی کے حصول کے لیے ہر قسم کی قربانی دی۔ عالم اسلام کے نوجوانوں کے لیے بامقصد اور بلند مقام پانے کی غرض سے قربانیوں کی عظیم مثال قائم کی تا کہ وہ بھی اس راستے پر چلیں اور ان کے آثار کی پیروی کریں۔[1]

یقیناً یہ ایمان کی پختگی کی عمدہ مثال ہے لیکن ہجرت مدینہ میں صرف یہی عظیم مثال قائم نہیں کی گئی بلکہ اس سلسلے میں عظمت، قربانی اور اللہ و رسول کی خاطر مال و جان قربان کرنے کی عظیم داستانیں رقم کی گئیں جن سے امت اسلامیہ کے لیے عزت و عظمت حاصل کرنے کا عظیم سبق حاصل ہوتا ہے۔[2]

انصاری بابرکت گھرانے

انصار مدینہ کا منیٰ کی گھاٹی میں ایمان لانا، بیعت کرنا اور رسول اللہ ﷺ کی حمایت و نصرت کا پختہ عہد و پیمان کرنا یہ وہ اسباب تھے جنھیں مدنظر رکھ کر رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ہجرت مدینہ کا حکم دیا۔ اس ہجرت کے نتیجے میں مسلمانوں کے درمیان نصرت و کفالت کا ماحول پیدا ہوا۔ انصار نے مہاجرین کے لیے اپنے دلوں اور گھروں کے دروازے کھول دیے اور تمام مرد اور عورتیں مہاجرین کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔ مہاجر و انصار مرد ہوں یا عورتیں ایک ہی چھت تلے زندگی گزارنے لگے۔ مال، گھر اور کھانا تک تقسیم کر لیا گیا

---

[1] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 121. [2] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص:119.

اوراسلامی ذمہ داریاں نبھائی جانے لگیں۔ مہاجرین کے خیرخواہ مندرجہ ذیل گھرانے تھے:

① قباء میں مُبَشِّر بن عبدالمنذر بن زنبر کا گھرانہ جہاں عورتوں اور مردوں پر مشتمل مہاجرین کا ایک گروہ تشریف لایا جن میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، ان کی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا اور ان کے خاوند خنیس بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ اور عیَاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ کچھ دیگر افراد قوم بھی شامل تھے۔

② بنونجار کے اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کا گھرانہ وہاں سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے قیام کیا۔

③ مقام سُنح (یثرب) میں بنوحارث بن الخزرج کے بھائی خُبَیب بن اِساف کا گھرانہ، وہاں طلحہ بن عبیداللہ بن عثمان، ان کی والدہ اور صہیب بن سنان رضی اللہ عنہم اقامت گزیں ہوئے۔[1]

④ بنونجار ہی سے تعلق رکھنے والے سعد بن خَیثمہ رضی اللہ عنہ کا گھرانہ جسے بیت العُزّاب (کنواروں کا گھر) بھی کہا گیا۔ وہاں مہاجرین کا ایک گروہ ٹھہرا جو سب کنوارے تھے۔

⑤ قبا ہی میں بلعجلان کے بھائی عبداللہ بن سلمہ رضی اللہ عنہ کا گھرانہ، جس میں عبیدہ بن حارث، ان کی والدہ محترمہ سُخیلہ، مِسطح بن اُثاثہ بن عباد بن مطلب، طفیل بن حارث، طُلیب بن عُمیر اور حُصَین بن حارث رضی اللہ عنہم اقامت گزیں ہوئے۔

⑥ بنو جَحْجَبي کا گھرانہ، وہاں زبیر بن عوام، ان کی بیوی اسماء بنت ابوبکر، ابوسبرہ بن ابورہم اور ان کی بیوی ام کلثوم بنت سُہیل ٹھہرے، جبکہ ان کے کفیل منذر بن محمد بن عُقبہ تھے رضی اللہ عنہم۔[2]

⑦ بنوعبدالاشہل کا گھرانہ جن کے ذمہ دار اور کفیل حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے۔ وہاں مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا نے رہائش اختیار کی۔

⑧ بنونجار کا گھرانہ جن کے سربراہ و ذمہ دار اوس بن ثابت بن منذر رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے پاس عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرے۔[3]

---

[1] المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص: 116. [2] المرأة في العهد النبوي للدكتور عصمة الدين، ص: 117. [3] السيرة النبوية لأبي شهبة: 469,468/1.

اِسی تقسیم اور باہمی تعاون ہی کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ اور بعد میں آنے والے تمام مہاجرین کو ایک اچھی اقامت گاہ میسر آگئی اور باہمی ایثار اور سچی مومنانہ اخوت ومحبت کی فضا پیدا ہوگئی۔[1]

اعلیٰ روحانیت، پختہ ایمان اور معاملات میں صداقت کی فضا میں مہاجرین وانصار کے درمیان مواخات قائم ہوگئی اور سب اتفاق ومحبت سے زندگی گزارنے لگے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کبھی سننے میں آیا یا کسی کتاب میں لکھا پایا کہ ان گھروں میں کبھی آپس میں اختلاف ہوا ہو یا کم ازکم عورتیں جن کی طبیعت میں تیزی ہوتی ہے ان کی آپس میں کوئی شکر رنجی ہوئی ہو؟

دراصل یہ دین برحق ہے جس کی بنیاد تقویٰ اور بلند پایہ اخلاقی اقدار پر ہے جن کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان اخوت اور دعوت دین کی مدد کا جذبہ اور رسول اللہ ﷺ کی بیعت اور اس کا اثر دلوں میں محسوس کیا گیا۔ یہ دین سچائی کا دین ہے جس میں اجتماعی مفاد مدنظر رکھنے، سزا کا خوف، آخرت کا ڈر، ثواب کی تمنا اور حصول جنت کی خواہش پائی جاتی ہے۔

یہ دین ایمان کی ترقی کے لیے گرمجوشی کے جذبات رکھتا ہے اور انسان کو صراط مستقیم پر گامزن رہنے کا درس اور نیتوں کو درست رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ مرد ہو یا عورت، دائرہ اسلام میں داخل ہوکر اور اس کی بیعت کرکے وہ شریعت کا ہر حکم تسلیم کرتا ہے، اس کے ہر قول میں اخلاص ہوتا ہے اور تنہائی میں ہو یا سب کے سامنے، وہ صرف اپنے اللہ سے ڈرتا ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں ایمان راسخ ہوگیا تھا، لہٰذا جب مہاجرین مدینہ پہنچے تو انصار نے ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اٹھائی۔ ان سب کی سوچ ایک اجتماعی معاشرے کی بہتری کے لیے وقف تھی۔ یوں اسلامی معاشرے میں باہمی ذمہ داریاں نبھانے کی ایسی پاکیزہ فضا پیدا ہوئی کہ تمام صحابۂ کرام حصولِ ثواب کے متلاشی رہتے تھے، یہاں تک

---

[1] المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص: 118.

کہ ان میں اکیلا آدمی سارا ثواب حاصل کرنے کے لیے بھی سرگرداں نظر آیا۔ [1]

اس موقع پر اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا ایسا مظاہرہ دیکھنے میں آیا جس سے موجودہ دور میں ہمیں قدم قدم پر رہنمائی ملتی ہے۔

ہجرت مدینہ کے تناظر میں اپنا جائزہ لیں تو یقیناً موجودہ حالات میں اور خصوصاً اسلامی معاشرے میں باہمی طور پر رہتے ہوئے چند ہی دنوں میں کئی قسم کے عیوب، تکلیف دہ باتیں اور بدگمانیاں ظاہر ہوتی ہیں مگر ایک وہ معاشرہ تھا کہ ابھی رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف نہیں لائے تھے لیکن اسلامی معاشرے کی تشکیل نو کا کام شروع ہو چکا تھا۔ نئے آنے والوں کے لیے گھروں کے دروازے کھلتے چلے گئے اور یہ ایک آدھ فرد کا معاملہ نہیں تھا بلکہ اجتماعی پیمانے پر امداد و تعاون کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ یہ وہ اسلامی معاشرہ تھا جو باہمی ربط وضبط اور الفت و محبت میں عروج کو پہنچ گیا تھا۔ مہاجرین نے مہینوں ان گھروں میں قیام کیا اور انصار مسلسل اپنا مال، محبت اور خدمات اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے پیش کرتے رہے، حالانکہ مہاجرین بنیادی طور پر فقراء نہیں تھے۔ وہ بھی صاحب جائیداد اور گھروں کے مالک تھے، تاہم وہ صدقہ و خیرات کے میدان میں انصار کے لیے اسوہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے سب کچھ اللہ کی رضا کے لیے خرچ کر ڈالا اور مکہ چھوڑ آئے۔ قرآن کریم ان کے اوصاف اس طرح بیان کرتا ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيٰرِهِمْ وَاَمْوٰلِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمٰنَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾

---

[1] المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص: 132.

> ”(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں اور (ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“[1]

مدینہ طیبہ کا یہ جدید معاشرہ بارہ نقیبوں کی نگرانی میں ایمان اور تقویٰ کی بنا پر پروان چڑھ رہا تھا، جبکہ نبی ﷺ ابھی تک مدینہ نہیں پہنچے تھے۔ یہ نقیب اپنی اپنی قوم کے اسی طرح نگران تھے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری نگران تھے۔ اس معاشرے کی نگرانی وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی کر رہے تھے جو ہجرت کر کے مدینہ پہنچ چکے تھے۔ وہ سب مل کر نبوی چشمے سے سیراب اور آپ ﷺ کی سیرت سے فیضیاب ہوئے۔[2]

اس جدید معاشرے کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ ان کی جاہلی عصبیت پگھل چکی تھی جیسا کہ امامت کے فرائض ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے غلام سالم رضی اللہ عنہ سرانجام دیتے تھے کیونکہ دوسروں کی نسبت قرآن کریم کا زیادہ حصہ انھیں یاد تھا۔ اس معاشرے میں مہاجرین و انصار کے بلند مرتبہ افراد، قریشی سرداراور اوس و خزرج کے نمایاں افراد موجود تھے لیکن امامت کا شرف کتاب اللہ کے ایک قاری اور عالم کو حاصل ہوا۔ اسلامی معاشرے میں قاری قرآن امام ہونے کے ساتھ ساتھ غزوات میں جھنڈے کا حق دار بھی ٹھہرتا تھا۔ حفاظ قرآن اور مجاہدین کے درمیان جس فرق کا آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں وہ ان کے درمیان موجود نہیں

---

[1] الحشر 59:8,9. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 2/171,172.

تھا۔ معرکۂ یمامہ میں ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے یہی غلام سالم رضی اللہ عنہ ہی جھنڈا تھامے ہوئے تھے اور اس دن ان کا کوڈ ورڈ تھا: «بِئْسَ حَامِلُ الْقُرْآنِ»

''اے اللہ کی راہ میں لڑنے والے! تو بھاگ گیا تو سمجھ لے تو برا حامل قرآن ہے۔''

پہلے ان کا دایاں ہاتھ کٹا تو انھوں نے بائیں ہاتھ سے جھنڈا تھام لیا اور جب وہ بھی کٹ گیا تو اپنی گردن سے تھام لیا یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔[1]

اس جدید اسلامی معاشرے کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ مسلمانوں کو دعوتِ دین کی آزادی نصیب ہوئی۔ سب جانتے تھے کہ یثرب کے بڑے بڑے سردار اس دین میں داخل ہو چکے ہیں، لہٰذا عام نوجوان، عورتیں اور مرد سب دعوت اسلامی کے میدان میں سرگرم ہو گئے اور اب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ آمد بھی تھی۔

حبشہ میں قائم اسلامی معاشرے اور مدنی معاشرے میں فرق

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم حبشہ میں قائم اسلامی معاشرے اور مدنی معاشرے کا تقابلی جائزہ لیں۔ حبشہ میں ایک مکمل اسلامی معاشرہ قائم نہ ہوا تھا بلکہ اس تحریک کو زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی پناہ حاصل ہوئی تھی۔ اس اجنبی معاشرے میں غیر مسلموں کی اکثریت اتنی زیادہ تھی کہ اسلامی برادری کا نقش وہاں نہیں جم سکتا تھا، یہ درست ہے کہ وہ آزادی سے اپنے رب کی عبادت میں مصروف تھے لیکن وہ اس نصرانی معاشرے سے الگ تھلگ تھے اور ان میں قابل ذکر طور پر نفوذ نہیں کر سکے تھے۔ اگرچہ مکہ کے ماحول میں، جہاں دعوت و عبادت کی زیادہ آزادی نہیں تھی، ہجرت حبشہ آزادی کی طرف پہلا قدم تھا مگر حبشہ میں دعوت و عبادت کی آزادی بہر حال مدینہ کی نسبت کم تھی جہاں اسلامی برادری کثیر تعداد میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب مہاجرین حبشہ نے ہجرت مدینہ کی خبر سنی تو فوراً مدینہ یا براستہ مکہ مدینہ پہنچنا شروع ہو گئے۔ مدینہ منورہ جو کئی صدیوں سے شرک و بت پرستی کے چنگل میں

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 1/ 174، 175.

گرفتار رہنے کے بعد اب اسلام کے سایۂ عاطفت میں آ چکا تھا۔ اور حبشہ میں صرف وہ لوگ باقی رہ گئے جنھیں اعلیٰ قیادت (نبی ﷺ) کی طرف سے وہیں ٹھہرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

بیعت عقبہ کے بعد بارہ مبارک نفوس کی محنت سے مدینہ اسلامی بنیادوں پر بالفعل اتنی ترقی کر گیا کہ ایک مکمل اسلامی معاشرے کی تشکیل شروع ہوگئی اور اس سلسلے میں سرفہرست جلیل القدر صحابی اَسْعَد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کا نام آتا ہے جنھوں نے شروع میں سیاسی رہنمائی اپنے ذمے نہیں لی بلکہ صرف دعوتی ذمہ داری اٹھائی۔ اور دعوتی میدان میں بھی انتہائی عروج حاصل کیا۔ جب ستر آدمی دوسری بیعت عقبہ کے بعد مدینہ لوٹے، جو مدینہ میں سیاسی اور معاشرتی امور کو کنٹرول کرتے تھے، تو انھوں نے طے کر لیا کہ ان کا شہر اس کرۂ ارض پر اسلام کا پہلا دارالحکومت بنے گا۔ اور انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ نبی ﷺ کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے میسر قیادت کی رہنمائی میں ہر بیرونی دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے جس مستحکم اسلامی مرکز کے قیام اور تربیت کے لیے وقت اور محنت صرف کی تھی، آج وہ مدینہ طیبہ کے جدید معاشرے کی شکل اختیار کرنے کے بعد ثمر آور ہو چکا تھا اور عقیدے اور دینی اخوت کے رنگ میں رنگا جا چکا تھا، گویا نبی ﷺ نے پہلے افراد تیار کیے، پھر انھیں ایک جماعت کی شکل میں مضبوط کیا اور ایک مضبوط مرکز بنا دیا۔ بیعت عقبہ کے بعد ایک ایسے اسلامی معاشرے کی تشکیل شروع ہوگئی تھی جس پر اسلامی مملکت کا قیام عمل میں آنا تھا، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ اس وقت قائم ہوا جب اس سرزمین میں حمایت دین کے لیے ایک مناسب قوت فراہم ہو چکی تھی۔[1]

یوں پہلے ایک مضبوط اور منظّم جماعت مدینہ پہنچی اور پھر انصار سے مل کر اسلامی معاشرہ تشکیل دیا اور اب قائد اعلیٰ نبی ﷺ کا انتظار ہو رہا تھا کہ آپ تشریف لا کر ایک ایسی جدید مملکت کے قیام کا اعلان فرمائیں جو جلد از جلد ایک ایسا تمدن وجود میں لائے جس کی نظیر

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان:1/147,146.

تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔

دار الحکومت کے لیے مدینہ منورہ کا انتخاب؟

اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ مدینہ منورہ کو دار الحکومت اور دعوتی مرکز کی حیثیت حاصل ہو۔ ایک طرف تو مدینہ کا یہ مقام اہل مدینہ کے لیے شرف و عزت کا باعث تھا، دوسری طرف اس میں کئی اسرار و رموز پنہاں تھے۔ دراصل مدینہ طیبہ جنگی نقطۂ نظر سے ایسا مستحکم تھا کہ جزیرہ نمائے عرب میں ایسا کوئی اور مقام نہ تھا۔ مدینہ غربی جانب سے حرہ وبرہ اور شرقی جانب سے حَرّہ واقم کے ذریعے قدرتی طور پر محفوظ تھا۔ صرف شمالی جانب ہی ایسی تھی کہ کوئی رکاوٹ موجود نہ تھی، اس لیے 5 ھ میں غزوۂ خندق کے موقع پر اسی جانب خندق کھودی گئی۔ دیگر اطرافِ مدینہ میں کھجور کے گھنے درخت اور کھیت تھے جہاں سے کوئی لشکر آسانی سے نہ گزر سکتا تھا اور نہ جنگی امور اور صفوں کی ترتیب ممکن تھی۔ وہاں موجود چھوٹے چھوٹے قدرتی مورچے عسکری یلغار کو ناکام بنانے کے لیے کافی تھے۔ ابن اسحاق رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''مدینہ کی ایک طرف کھلی اور باقی تمام اطراف میں آبادی اور کھجور کے باغات تھے اور دشمن کے لیے وہاں سے حملہ تقریباً ناممکن تھا۔''[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں حکمت الٰہیہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے صحابہ کو بتایا: ''مجھے تمھارا دار ہجرت دکھایا گیا ہے۔ وہ دو سیاہ پتھریلی زمینوں کے درمیان واقع ہے۔''[2]

بعد ازاں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی اور مہاجرین حبشہ کے اکثر افراد بھی مدینہ پہنچ گئے۔

مدینہ کی اکثر آبادی اوس و خزرج پر مشتمل تھی جو طبعاً فخر مند، اڑیل، شہسوار قوت اور غرور والے تھے۔ وہ ہمیشہ آزاد تھے نہ کسی کے مطیع ہوئے نہ کسی قبیلے یا حکومت کو تاوان یا ٹیکس ادا کیا۔ ابن خلدون کہتے ہیں: ''یہ دونوں قبیلے یثرب کی اکثر آبادی پر حاوی تھے۔

---

[1] السيرة النبوية لأبي الحسن الندوي، ص: 157. [2] صحيح البخاري، حديث: 2297.

شان و شوکت اور قوت کے لحاظ سے معروف تھے اور ان کے اردگرد بسنے والے قبائل مضر بھی ان کے دین و مذہب کو اختیار کیے ہوئے تھے۔''[1] بنو عدی بن نجار رسول اللہ ﷺ کے ننھیال تھے کیونکہ عبدالمطلب بن ہاشم کی والدہ بنو عدی بن نجار سے تعلق رکھتی تھیں۔ چنانچہ ہاشم نے عمرو کی بیٹی سلمیٰ سے شادی کی تھی اور عمرو کا تعلق بنو عدی بن نجار سے تھا۔ انھی سلمیٰ کے بطن سے عبدالمطلب پیدا ہوئے۔ ہاشم نے اپنے بیٹے عبدالمطلب کو ماں کے پاس رہنے دیا۔[2] جب وہ سن شعور کو پہنچے تو ان کے چچا مطلب انھیں مکہ لے آئے۔ عرب کے معاشرے میں اَرحام (ننھیال) کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ نبی ﷺ نے بھی ہجرت مدینہ کے موقع پر اپنے دادا عبدالمطلب کے ننھیال کو اہمیت دی تھی۔ چنانچہ مدینہ پہنچنے پر انصار کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ ہر شخص آپ ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَنْزِلُ عَلٰى بَنِي النَّجَارِ، أَخْوَالِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ أُكْرِمُهُمْ بِذٰلِكَ»

''میں اپنے دادا عبدالمطلب کے ننھیال بنو نجار کے ہاں ٹھہروں گا۔ میں یہ شرف اور عزت انھیں دینا چاہتا ہوں۔''[3]

ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی اسی قبیلے بنو نجار سے تھے جن کے گھر نبی ﷺ نے قیام فرمایا۔

مدینہ طیبہ کے باسی اوس و خزرج قحطانی تھے جبکہ مہاجرین اور دیگر مکی مسلمان بنو عدنان سے تعلق رکھتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی اور انصار نے آپ ﷺ کی نصرت و حمایت کی تو گویا کہ قحطان اور عدنان ایک جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور ایک

---

[1] تاریخ ابن خلدون: 289/2. [2] بلاذری لکھتے ہیں: ''ہاشم کے بیٹے شیبۃ الحمد (عبدالمطلب) تھے۔ شیبہ کی ولادت سے پہلے ہاشم اپنی اہلیہ سلمیٰ کو وضع حمل کے لیے باپ کے پاس چھوڑنے گئے۔ بیوی کو یثرب چھوڑ کر وہ تجارت کے لیے شام چلے گئے اور وہیں غزہ (فلسطین) میں ان کا انتقال ہو گیا۔ سلمیٰ کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تو انھوں نے اس کا نام شیبۃ الحمد رکھا کیونکہ اس کے سر کے کچھ بال سفید تھے۔'' (أنساب الأشراف: 71/1) [3] صحیح مسلم، حدیث: 2009 بعد الحدیث: 3014.

جان ہوگئے۔ جاہلیت میں ان دونوں قبائل میں مسابقت کی جنگ جاری رہتی تھی مگر اب شیطان ان کے درمیان پرانے فتنے ابھارنے اور غیرت کے نام پر جاہلی زخم تازہ کرنے میں ناکام ہوگیا۔

اس لحاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے مدینہ طیبہ بہتر علاقہ ثابت ہوا جہاں انھیں سکونت بھی ملی اور ایسا مرکز نصیب ہوا جس سے اسلام کو تائید حاصل ہوئی اور اتنی ترقی ملی کہ نہ صرف جزیرہ نمائے عرب بلکہ اردگرد کی ترقی یافتہ سلطنتوں پر بھی فتح حاصل ہوگئی۔ [1]

فضائل مدینہ

مدینہ طیبہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی بدولت سوائے مکہ کے تمام کرۂ ارض پر فضیلت حاصل ہوئی۔ اس کے فضائل مندرجہ ذیل ہیں:

ناموں کی کثرت: کسی بھی خطۂ ارض کے زیادہ نام اس سرزمین کے باعزت ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور جتنے نام مدینہ منورہ کے ہیں کسی اور شہر کے نہیں یہاں تک کہ ان ناموں کا نصف یا چوتھائی حصہ بھی کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ علماء نے اس دھرتی (مدینہ منورہ) کے تقریباً سو نام بیان کیے ہیں۔ [2]

ان ناموں کا تذکرہ امام زرکشی رحمہ اللہ نے إعلام الساجد بأحكام المساجد میں، مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی نے القاموس المحيط میں، نورالدین السمہودی نے وفاء الوفاء بأخبار دارالمصطفىٰ میں اور محمد بن یوسف الصالحی نے سبل الهدىٰ والرشاد فی سيرة خير العباد میں کیا ہے۔ [3]

مدینہ کے مشہور نام مندرجہ ذیل ہیں:

یثرب: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

[1] الأساس في السنة لسعيد حوّى: 333/1. [2] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 155. [3] الضوء اللامع للسخاوي: 1/79-86.

﴿وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا﴾

''اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا تھا: اے اہل یثرب! (آج) تمھارے لیے (لشکر کے ساتھ) کوئی قیام گاہ نہیں، لہٰذا تم لوٹ چلو۔''[1]

شرعی طور پر مدینہ کو یثرب کہنا درست نہیں اور مذکورہ آیت میں صرف منافقین کا قول بیان کیا گیا ہے۔

طابہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ سَمَّى الْمَدِينَةَ يَثْرِبَ فَلْيَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ، فَإِنَّمَا هِيَ طَابَةُ»

''جو مدینہ کو یثرب (خارزار، ویران جگہ) کہتا ہے وہ اللہ سے استغفار کرے وہ تو طابہ (پاکیزہ) ہے۔''[2]

ایک اور روایت میں تین دفعہ یہ الفاظ ہیں کہ وہ طابہ ہے، وہ طابہ ہے، وہ طابہ ہے۔

المدینہ: یہی اس کا مشہور نام ہے۔ جب مطلق طور پر المدینہ کا لفظ استعمال کیا جائے تو صرف اور صرف مدینہ منورہ ہی مراد ہوگا۔ اس نام کے ساتھ بہت سی آیات بھی موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ﴾

''اور تمھارے آس پاس جو دیہاتی ہیں ان میں بعض منافق ہیں اور بعض اہل مدینہ بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔''[3]

مدینہ کو عموماً المبارکۃ (برکت والا)، المنوّرۃ (روشن)، المشرّفۃ (عزت والا) جیسے اوصاف حمیدہ سے متصف کیا جاتا ہے۔[4]

---

[1] الأحزاب 13:33. [2] مسند أحمد: 285/4. موسوعہ حدیثیہ کے محققین نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، دیکھیے: فتح القدیر: 268/4. [3] التوبۃ 101:9.

[4] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 156.

نبی ﷺ کی مدینہ سے محبت اور اس کی وبا دور کرنے کے لیے دعا: رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی محبت کے لیے یوں دعا فرمائی:

«اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِينَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ!»

”اے اللہ! ہمارے دلوں میں مدینہ کی محبت مکہ جیسی یا اس سے بھی زیادہ ڈال دے۔“[1]

حضرت انس ؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر سے واپس تشریف لاتے اور مدینہ طیبہ کے در و دیوار دیکھتے تو سواری تیز بھگاتے اور جس جانور پر سوار ہوتے اسے مدینہ کی محبت کی وجہ سے (تیز بھگانے کے لیے) حرکت دیتے۔[2]

حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں: ”جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو ابوبکر اور بلال ؓ دونوں کو بخار ہو گیا۔ ابوبکر ؓ کو جب بخار ہوا تو انھوں نے یہ شعر کہے:

كُلُّ امْرِىءٍ مُّصَبَّحٌ فِي أَهْلِهِ وَالْمَوْتُ أَدْنٰى مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ

”ہر آدمی اپنے گھر میں صبح (وشام) کرتا ہے، حالانکہ موت اس کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے۔“

اور جب بلال ؓ کو بخار ہوتا تو بلند آواز سے چند شعر کہتے اور (ایک موقع پر) انھوں نے دعا کی: ”اے اللہ! شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف پر لعنت برسا جنھوں نے ہمیں ہماری زمین (مکہ) سے وبا والی زمین کی طرف نکال دیا۔“ تب اللہ کے رسول ﷺ نے دعا فرمائی:

«اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِينَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ! اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَ فِي مُدِّنَا وَ صَحِّحْهَا لَنَا وَانْقُلْ حُمَّاهَا إِلَى الْجُحْفَةِ»

”اے اللہ! مدینہ کی محبت ہمارے دلوں میں مکہ کی محبت کی طرح یا اس سے بھی زیادہ

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 1889. [2] صحيح البخاري، حديث: 1802.

ڈال دے۔ اے اللہ! ہمارے پیمانوں صاع اور مُد میں برکت عطا فرما اور مدینہ طیبہ کی فضا ہمارے لیے موافق فرما دے۔ اور اس کا بخار جحفہ منتقل کر دے۔“[1]

مدینہ کے لیے دوگنی برکت کی دعائے نبوی: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ بِالْمَدِينَةِ ضِعْفَيْ مَا جَعَلْتَ بِمَكَّةَ مِنَ الْبَرَكَةِ»

”اے اللہ! مدینہ میں مکہ مکرمہ سے دوگنی برکت عطا فرما۔“[2]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب لوگ (کھجور وغیرہ کا پکا ہوا) پہلا پھل دیکھتے تو وہ نبی ﷺ کے پاس لاتے، نبی ﷺ اسے اپنے ہاتھ میں لیتے اور دعا فرماتے:

«اَللّٰهُمَّ! بَارِكْ لَنَا فِي ثَمَرِنَا، وَبَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِي مُدِّنَا، اَللّٰهُمَّ! إِنَّ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَبْدُكَ وَ خَلِيلُكَ وَ نَبِيُّكَ وَ إِنِّي عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ وَ إِنَّهُ دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَ إِنِّي أَدْعُوكَ لِلْمَدِينَةِ بِمِثْلِ مَا دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَ مِثْلِهِ مَعَهُ»

”اے اللہ! ہمارے شہر، پھل، صاع اور مد میں برکت عطا فرما۔ اے اللہ! ابراہیم علیہ السلام تیرے عاجز بندے، خلیل اور نبی تھے اور میں بھی تیرا عاجز بندہ اور نبی ہوں۔ انھوں نے مکہ کے لیے برکت کی دعا کی اور میں تجھ سے مدینہ کے لیے مکہ سے دوگنی برکت کی دعا کرتا ہوں۔“

پھر آپ ﷺ وہ پھل حاضرین میں سب سے چھوٹے بچے کو عطا فرماتے۔[3]

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 1889. [2] صحيح البخاري، حديث: 1885، وصحيح مسلم، حديث: 1369. [3] صحيح مسلم، حديث: 1373، و جامع الترمذي، حديث: 3454، وسنن ابن ماجه: 3329، و عمل اليوم والليلة للنسائي، حديث: 302، و عمل اليوم والليلة لابن السني، حديث: 278.

نبی ﷺ کی برکت سے مدینہ طیبہ کا دجال اور طاعون سے محفوظ ہونا: اللہ تعالیٰ نے مدینہ طیبہ کی حفاظت کے لیے فرشتے مقرر فرمائے ہیں جو وہاں دجال اور طاعون کو داخل نہیں ہونے دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «عَلٰی أَنْقَابِ الْمَدِينَةِ مَلَائِكَةٌ، لَا يَدْخُلُهَا الطَّاعُونُ وَلَا الدَّجَّالُ» ”مدینہ کے تمام راستوں پر اللہ کے فرشتے مقرر ہیں۔ طاعون اور دجال مدینہ میں داخل نہیں ہوسکیں گے۔“[1]

مدینہ کی سختی پر صبر کرنے کی فضیلت: رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی شدت اور تنگی گزران پر صبر کرنے والے کو قیامت کے دن اپنی شفاعت کا مستحق قرار دیا۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> «اَلْمَدِينَةُ خَيْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ، لَا يَدَعُهَا أَحَدٌ رَغْبَةً عَنْهَا إِلَّا أَبْدَلَ اللّٰهُ فِيهَا مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنْهُ، وَ لَا يَثْبُتُ أَحَدٌ عَلَى لَأْوَائِهَا وَجَهْدِهَا، إِلَّا كُنْتُ لَهُ شَفِيعًا، أَوْ شَهِيدًا، يَّوْمَ الْقِيَامَةِ»
>
> ”مدینہ لوگوں کے لیے بہتر ہے اگر وہ سمجھ سے کام لیں۔ کوئی آدمی جو مدینہ چھوڑ کر چلا جائے تو اللہ تعالیٰ مدینہ میں اس کا نعم البدل بھیج دیتا ہے اور جو بھی مدینہ کی سختی اور مفلسی پر ثابت قدمی دکھاتا ہے، میں قیامت کے دن اس کا سفارشی یا گواہ ہوں گا۔“[2]

مدینہ طیبہ میں موت کی فضیلت: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> «مَنِ اسْتَطَاعَ أَنْ يَّمُوتَ بِالْمَدِينَةِ فَلْيَمُتْ بِهَا فَإِنِّي أَشْفَعُ لِمَنْ يَّمُوتُ بِهَا»
>
> ”جو شخص استطاعت رکھتا ہو کہ اسے مدینہ میں موت آئے تو اسے یہ کوشش کرنی

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 1880، وصحيح مسلم، حديث: 1379. [2] صحيح مسلم، حديث: 1363.

چاہیے۔ میں اس کے لیے قیامت کے دن سفارش کروں گا جو مدینہ میں فوت ہو گا۔“①

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دعا کرتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي شَهَادَةً فِي سَبِيلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِي فِي بَلَدِ رَسُولِكَ»

”اے اللہ! مجھے اپنے رسول کے شہر میں شہادت کی موت نصیب فرما۔“②

اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعا قبول فرمائی، وہ مسجد نبوی میں نماز فجر پڑھا رہے تھے کہ انھیں رسول اللہ ﷺ کے محراب میں شہید کر دیا گیا۔

ایمان کی پناہ گاہ اور پلیدی سے پاک: ایمان چاہے دنیا کے ہر خطے میں ناپید ہو جائے لیکن مدینہ میں موجود رہے گا۔ کسی قسم کی وبا مدینہ میں آسکتی ہے نہ ٹھہر سکتی ہے اور کوئی بھی مدینہ چھوڑ کر چلا جائے تو اللہ تعالیٰ سچے مومنین میں سے اس کا نعم البدل عطا فرما دیتا ہے۔③

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ الْإِيمَانَ لَيَأْرِزُ إِلَى الْمَدِينَةِ كَمَا تَأْرِزُ الْحَيَّةُ إِلٰى جُحْرِهَا»

”ایمان مدینہ میں اس طرح سمٹ آئے گا جس طرح سانپ اپنے بل کی طرف سمٹتا ہے۔“④

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَا يَخْرُجُ مِنْهَا أَحَدٌ رَّغْبَةً عَنْهَا إِلَّا أَخْلَفَ اللّٰهُ فِيهَا خَيْرًا مِّنْهُ، أَلَا! إِنَّ الْمَدِينَةَ كَالْكِيرِ تُخْرِجُ الْخَبِيثَ، لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَنْفِيَ الْمَدِينَةُ شِرَارَهَا كَمَا يَنْفِي الْكِيرُ خَبَثَ الْحَدِيدِ»

---

① جامع الترمذي، حديث: 3917، وسنن ابن ماجه، حديث: 3112، وصحيح ابن حبان، حديث: 3733، وشعب الإيمان للبيهقي، حديث: 4184، و مسند أحمد: 74/2 و 104. ② صحيح البخاري، حديث: 1890. ③ الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 161. ④ صحيح البخاري، حديث: 1876، و صحيح مسلم، حديث: 147.

"قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! کوئی آدمی مدینہ چھوڑ کر نہیں جاتا مگر اللہ تعالیٰ مدینہ میں اس سے بہتر آدمی بھیج دیتا ہے۔ خبردار! بے شک مدینہ بھٹی کے مانند ہے جو اپنا میل کچیل نکال باہر کرتا ہے۔ اور قیامت نہیں آئے گی جب تک کہ مدینہ اپنے برے لوگوں کو اس طرح نکال باہر نہ کرے جس طرح بھٹی لوہے کا میل باہر نکال دیتی ہے۔"[1]

مدینہ برے لوگوں کو ختم کرنے والا ہے: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّهَا طَيْبَةُ تَنْفِي الْخَبَثَ كَمَا تَنْفِي النَّارُ خَبَثَ الْفِضَّةِ»

"بے شک مدینہ پاکیزہ شہر ہے۔ یہ برے لوگوں کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جس طرح آگ چاندی کا میل صاف کر دیتی ہے۔"[2]

اللہ تعالیٰ کا مدینہ طیبہ کو ہر برے آدمی کے شرّ سے محفوظ رکھنا: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَا يَكِيدُ أَهْلَ الْمَدِينَةِ أَحَدٌ إِلَّا انْمَاعَ، كَمَا يَنْمَاعُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ»

"اگر کوئی شخص اہل مدینہ سے مکر کرے گا تو اس طرح پگھل جائے گا جس طرح نمک پانی میں حل ہو جاتا ہے۔"[3]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْمَدِينَةُ حَرَمٌ، فَمَنْ أَحْدَثَ فِيهَا حَدَثًا، أَوْ آوٰى مُحْدِثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لَا يُقْبَلُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَدْلٌ وَّلَا صَرْفٌ»

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 1381، ومسند أحمد: 2/439. [2] صحيح البخاري، حديث: 4589، وصحيح مسلم، حديث: 1384. [3] صحيح البخاري، حديث: 1877، وصحيح مسلم، حديث: 1387.

”مدینہ حرمت والا ہے، پس جس نے وہاں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، قیامت والے دن اس کی کوئی فرضی یا نفلی عبادت قبول نہیں کی جائے گی۔“[1]

مدینہ طیبہ کی حرمت: رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مدینہ کو حرم قرار دیا۔ وہاں نہ کسی کا خون بہایا جائے گا، نہ ہتھیار اٹھانے کی اجازت ہے، نہ کسی کو گھبراہٹ میں مبتلا کیا جائے گا، نہ درخت کاٹا جائے گا اور نہ کسی کی گری پڑی چیز اٹھانے کی اجازت ہے، سوائے اس شخص کے جو اس کا اعلان کرنا چاہتا ہو۔

مذکورہ بالا امور کے علاوہ بھی کچھ امور احترام مدینہ میں شامل ہیں جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَ دَعَا لَهَا، وَ حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ كَمَا حَرَّمَ إِبْرَاهِيمُ مَكَّةَ وَ دَعَوْتُ لَهَا فِي مُدِّهَا وَ صَاعِهَا مِثْلَ مَا دَعَا إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ لِمَكَّةَ»

”بے شک ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا اور اس کے لیے دعا کی اور میں نے مدینہ کو حرم قرار دیا اور میں نے اس کے صاع اور مد میں اسی طرح برکت کی دعا کی جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لیے دعا فرمائی تھی۔“[2]

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«هٰذَا جَبَلٌ يُّحِبُّنَا وَ نُحِبُّهُ، اَللّٰهُمَّ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَ إِنِّي حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ مَا بَيْنَ لَابَتَيْهَا»

”یہ احد کا پہاڑ ہم سے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ اے اللہ! ابراہیم علیہ السلام نے

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 1371. [2] صحيح البخاري، حديث: 2129، وصحيح مسلم، حديث: 1360.

مکہ مکرمہ کو حرم قرار دیا اور میں دو حروں کی درمیانی زمین مدینہ کو حرم قرار دیتا ہوں۔"[1]

آپ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا:

«لَا يُخْتَلٰى خَلَاهَا، وَلَا يُنَفَّرُ صَيْدُهَا وَلَا تُلْتَقَطُ لُقَطَتُهَا إِلَّا لِمَنْ أَشَادَ بِهَا، وَلَا تُقْطَعُ مِنْهَا شَجَرَةٌ إِلَّا أَنْ يَّعْلِفَ رَجُلٌ بَعِيرَهُ، وَلَا يُحْمَلُ فِيهَا السِّلَاحُ لِقِتَالٍ»

"اس کی تر گھاس نہ اکھاڑی جائے، اس کا شکار نہ بھگایا جائے اور اس کی گری پڑی چیز سوائے اعلان کرنے والے کے نہ اٹھائی جائے۔ اور نہ اس کا کوئی درخت کاٹا جائے سوائے اونٹ کے چارے کے اور نہ اس میں کسی سے لڑائی کے لیے ہتھیار اٹھایا جائے۔"[2]

یہ وہ عظیم فضائل تھے جن کی وجہ سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ سے شغف رکھتے تھے اور اس کی طرف ہجرت اور وہاں مستقل قیام کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ یہاں امت مسلمہ کی قوت جمع ہوگئی اور شرک کی ہر قسم اور کفر کی ہر شکل کو ختم کر دیا گیا یہاں تک کہ کرۂ ارض کے مشرق و مغرب مسلمانوں کے زیر نگیں ہوگئے۔

—— الحمد للہ پہلی جلد مکمل ہوئی ——

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 4084، وصحيح مسلم، حديث: 1362.

[2] مسند أحمد: 119/1.

سیرت النبی ﷺ

جلد اوّل

نبی امی ﷺ کی سیرت مبارکہ کو امت نے ہر دور میں نئے سے نئے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ سیرت کا موضوع ہر مؤلف، مترجم اور ناشر کے لیے حصول سعادت کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت کی کتب اپنے اندر ندرت وحکمت کے کئی پہلو لیے ہوئے منصۂ شہود پر آتی اور داد تحسین وصول کرتی ہیں۔

زیر نظر کتاب بھی ندرت کے کئی پہلوؤں کی حامل ہے۔ سیرت مبارکہ اور قرآن مجید کے باہمی ربط کا اظہار، واقعات سیرت کے بیان میں اختلاف کا حل، اسلوب میں ادبی چاشنی اور سطر سطر سے نبی کریم ﷺ سے محبت کے جھلکتے آثار اس کتاب کی نمایاں خوبیاں ہیں مگر اس میں جس پہلو کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے وہ ہے واقعاتِ سیرت کو متعدد قدیم مراجع سے اخذ کر کے انھیں موجودہ حالات پر منطبق کرنا اور ان سے دروس وعبر اور اسباق و نصائح کشید کر کے دورِ جدید سے ہم آہنگ کرنا ہے۔

علاوہ ازیں مؤلف کتاب ڈاکٹر علی محمد صلابی ﷾ سیرت طیبہ پر مستشرقین کے رکیک حملوں کا دندان شکن جواب دیتے ہیں اور اصولِ روایت کا دامن بھی نہیں چھوڑتے۔ اس طرح 350 قدیم وجدید مصادر ومراجع کی روشنی میں مرتب کردہ یہ کتاب سیرت اعلیٰ ترتیب، عمدہ اسلوب، دلکش پیرائے، انتہائی جامعیت، عبرتوں، حکمتوں اور اسباق سے لبریز، عمدہ طباعت کے ساتھ ایک عظیم شاہکار بن گئی ہے۔

دارالسلام
کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
9786035000925